قادیانی کلچر سے متعلق ہوش رُبا مشاہدات و تجربات کا آنکھوں دیکھا حال

ربوہ و قادیان جو ہم نے دیکھا!

تہلکہ خیز انکشافات، ناقابل یقین حقائق، چشم کُشا واقعات

ترتیب و تحقیق
محمد متین خالد

قادیانی کلچر سے متعلق ہوش رُبا مشاہدات و تجربات کا آنکھوں دیکھا حال

ربوہ و قادیان جو ہم نے دیکھا!

تہلکہ خیز انکشافات، ناقابل یقین حقائق، چشم کشا واقعات

ترتیب و تحقیق
محمد متین خالد

انٹرنیشنل انسٹیٹیوٹ آف تحفظ ختم نبوت، لاہور

فہرست

✿	انتساب		5
✿	قادیان اور ربوہ	محمد متین خالد	7
❑	قادیان کی وجہ تسمیہ	مولانا ابوالقاسم رفیق دلاوری	11
❑	قادیان	قاضی فضل احمد گورداسپوری	15
❑	میں اور قادیان	سیّد عبدالمجید شاہ امجد بخاری	24
❑	مشاہدات قادیان	مولانا عنایت اللہ چشتی	46
❑	قادیان اور قادیانی زندگی	پروفیسر محمد الیاس برنی	114
❑	قادیان کی گمنام حالت	دوست محمد شاہد قادیانی	137
❑	میں نے قادیان دیکھا	پروفیسر محمد اسلم	139
❑	قادیانی ریاست کا نقشہ	عبداللہ	150
❑	تاریخ قادیان	خواجہ عبدالحمید بٹ آف قادیان	156
❑	مرزا قادیانی کا کارنامہ	نور محمد قریشی ایڈووکیٹ	174
❑	لفظ ''ربوہ'' کا تحقیقی مطالعہ	ڈاکٹر سیّد محمد اعزازالحسن شاہ	189
❑	قادیان سے چناب نگر تک	مولانا منظور احمد چنیوٹی	199
❑	ربوہ، مرکز کفر وارتداد	مولانا منظور احمد الحسینی	206
❑	ربوہ کا طلسم ہوشربا	عمر پیام	213

☐	ربوہ کی شرمناک یادیں	کلمۃ اللہ خاں	218
☐	طاغوت نگر کی باتیں	عالم کباب	225
☐	ہم نے بھی ربوہ دیکھا	مولانا عبدالحیٔ جامپوری	228
☐	ربوہ کے بازار میں	رفیق ڈوگر	236
☐	مرزائیوں کی روحانی شکارگاہ	عبدالرزاق مہتہ	242
☐	ربوہ کی کہانی، مرزا طاہر کی زبانی	محمد حنیف ندیم	264
☐	شہر نامراد	محمد سلیم اختر	270
☐	فردوس ابلیس	صالح نور	295
☐	شہر سدوم	شفیق مرزا	306
☐	دام ہمرنگ زمین سے رہائی	زیڈ۔اے۔سلہری	354
☐	شریک جرم نہ ہوتے تو......	حافظ بشیر احمد مصری	366
☐	احمقوں کی جنت	جی آر اعوان	378
☐	جنس پرستوں کی نگری	مولانا اللہ وسایا	405
☐	قادیانی اخلاقیات	محمد نوید شاہین	411
☐	ڈھلتے سائے	منیر الدین احمد	420
☐	پیغمبرانہ پناہ گاہ، ربوہ؟	علامہ خالد محمود	478
☐	یادگار نظمیں		483
✿	مآخذ		495

✿......✿......✿

انتساب!

صاحب علم و دانش، سفیر محبت، مجاہد ختم نبوت

حضرت مولانا صاحبزادہ عزیز احمد صاحب مدظلہ

(جگر گوشہ حضرت اقدس خواجہ خان محمد دامت برکاتہم العالیہ، کندیاں شریف)

کے نام

دمِ عارف نسیم صبحدم ہے
اِس سے ریشہ معنی میں نم ہے
اگر کوئی شعیبؑ آئے میسر
شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

قادیان اور ربوہ

قادیان

شہر ارتداد
ابلیسیت کا شہکار
جو جھوٹے نبی آنجہانی مرزا قادیانی کی جنم بھومی ہے۔
جو ایمانی سمگلروں کی آماجگاہ ہے۔
جو مصنوعی اخلاق، کذب بیانی، دھوکہ دہی اور خرافات کا طاغوت نگر ہے۔
جو عصمت فروشوں اور جنس پرستوں کی منڈی ہے۔
جو اسلام اور پاکستان کے خلاف بھیانک سازشوں کا مرکز ہے۔
جہاں ہمہ وقت بغض، فسق اور حرص کا بازار گرم رہتا ہے۔
جہاں چہروں پر تقدس کا غازہ سجا کر ہر کلی کو مسلا جاتا ہے۔
جہاں ہر مکیں کے دل میں کینہ اور جبیں پہ نفرت لکھی ہوئی ہے۔
جہاں ہر وقت بزم قمار بازی اور شغل بادہ خوری جاری رہتا ہے۔
جہاں قلوب صدق و وفا سے، نگاہیں شرم و حیا سے اور ضمیر خوفِ خدا سے خالی ہیں۔
جہاں عصیاں کے دستِ جور سے ایمانوں کا قتل ہوتا ہے۔

ربوہ

شہر نامراد
گمراہیت کا جوئبار
جو جھوٹے نبی کی باقیات کا مسکن ہے۔
جو عیش و عشرت اور لہو و لعب پر مبنی ایک فردوسِ ابلیس ہے۔
جہاں ہر مرد فساد اور ہر عورت فتنہ ہے۔
جہاں محرم و غیر محرم میں کوئی تمیز روا نہیں رکھی جاتی۔

جہاں مکر و دغا، کذب و ریا اور جرم و خطا کا سکہ چلتا ہے۔
جہاں عزتیں، عصمتیں اور عظمتیں نیلام ہوتی ہیں۔
جہاں مذہب کے نام پر حسن کا بازار لگتا ہے۔
جہاں حاملانِ جبہ و دستار اپنی نحوستوں اور ہوسناکیوں کے باوجود محترم ٹھہرتے ہیں۔
جہاں دشمنانِ نور، مردانِ روسیاہ، سوداگرانِ ہوس اور دائمی خزاں کے فرستادگانِ نحس رہتے ہیں۔
جو اللہ اور رسول ﷺ کے باغیوں کی بستی ہے۔
جہاں وطن عزیز پاکستان میں تخریبی کارروائیاں اور فرقہ وارانہ فسادات بھڑکانے کی ناپاک سازشیں تیار ہوتی ہیں۔
جہاں آزادی اظہار اور آزادی ضمیر کا تصور تک نہیں۔
جہاں نام نہاد خلیفہ اور اس کے فسطائی نظام کے خلاف ایک لفظ بھی کہنا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔
جہاں قادیانیت کے دام فریب سے نکل کر اسلام کی آغوش میں آنے والے حق کے متلاشیوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا جاتا ہے۔
جہاں شعائر اسلامی کا تمسخر، آئین سے بغاوت اعلیٰ، عدالتی فیصلوں کا مذاق اور قانون کی خلاف ورزی کرنا ہر قادیانی اپنا حق سمجھتا ہے۔
جہاں ہر گھر کی چوکھٹ پر ذلت و رسوائی کی نیم پلیٹ لگی ہوئی ہے۔
جہاں اہل اسلام سے کدورتوں کے جہنم اور عداوتوں کے ظلمت کدے موجود ہیں۔
جہاں گمراہی و ارتداد کے مریضانِ سرطان رہتے ہیں۔
جہاں فرعونیت کی روح قریہ بہ قریہ محو رقص رہتی ہے۔
ان دونوں شہروں کے بارے میں حالات و تاریخ پر گہری نظر رکھنے والے دانشوروں کے تہلکہ خیز انکشافات، ناقابل یقین حقائق اور چشم کشا واقعات پر مشتمل ہوش رُبا مشاہدات و تجربات کا آنکھوں دیکھا حال پیش خدمت ہے...... آیئے حیرت کی آنکھ سے ملاحظہ فرمائیں۔

محمد متین خالد

ربوہ و قادیان
جو ہم نے دیکھا!

مولانا محمد رفیق دلاوری

قادیان کی وجہ تسمیہ

مرزا غلام احمد قادیانی کا مولد و منشاء موضع قادیاں تحصیل بٹالہ ضلع گورداسپور تھا۔ وجہ تسمیہ کے متعلق مرزا قادیانی اور ان کے پیروؤں کے بیانات کا ماحصل یہ ہے کہ شاہ دہلی کی طرف سے مرزا قادیانی کے بزرگوں کو بہت سے دیہات بطور جاگیر ملے تھے۔ انھوں نے ان دیہات کے وسط میں ایک قصبہ اپنی سکونت کے لیے آباد کیا چونکہ منصب قضا بھی ان کے سپرد تھا، انھوں نے اس قصبہ کا نام اسلام پور قاضی ماجھی رکھا۔ جب قضا چھوٹ گئی تو صرف قاضیاں رہ گیا۔ پھر ضاد کا تلفظ دال سے بدل کر قادیاں بن گیا۔ اس کے متعلق گزارش ہے کہ قادیاں صرف اسی ایک گاؤں کا نام نہیں جو مرزا غلام احمد قا، یانی کا مولد و منشا تھا بلکہ پنجاب میں قادیاں کے نام سے اور بھی متعدد گاؤں آباد ہیں، خود ضلع گورداسپو ر میں مرزا قادیانی کے قادیاں کے علاوہ ایک اور قادیاں موجود ہے اور مرزا قادیانی اور ان کی امت نے قادیاں کے لفظی ارتقا کے متعلق جو موشگافیاں کی ہیں، سرکاری یا غیر سرکاری طور پر ان کی کوئی تصدیق نہیں ہوتی۔ ورنہ ماننا پڑے گا کہ قادیاں کے نام پر جو دوسرے دیہات آباد ہیں، وہ بھی اسی لفظی ارتقا کے بوتہ میں تحلیل ہوتے ہوتے قادیاں بنے ہیں حالانکہ اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ ان دیہات میں بھی اسی قسم کے واقعات پیش آئے ہوں جنھوں نے ان کے نام میں تبدیلیاں کرتے کرتے انھیں قادیاں سے موسوم کر دیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ ساری سخن تراشی محض مرزا قادیانی کے رشحۂ فکر اور قوت اختراع کا نتیجہ ہے۔

قادیاں کو دمشق کا لباسِ مجاز پہنانے کی ناکام کوشش

مرزا قادیانی نے اپنی کتاب ''کشتی نوح'' کے صفحہ 47 پر ایک خیالی و ذہنی حمل کے ذریعہ سے اپنے عیسیٰ ابن مریم بن جانے کی صراحت فرما دی ہے۔ جب یہ خیال آفرینی ان کو عیسیٰ ابن مریم بنا چکی اور حضرت مرزا قادیانی شب و روز اپنی مسیحیت کا ڈھنڈورا پیٹنے لگے تو ان علمائے امت نے، جن کے دل حب اسلام کے جذبہ سے معمور تھے، اعتراض کیا کہ حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام تو دمشق میں نازل ہونے والے تھے جو ملک شام کا صدر مقام ہے اور خلفائے بنی امیہ کا دارالخلافہ رہ چکا ہے اور تم ہندوستان کی ایک سونی اور مبتذل سی بستی میں ظاہر ہوئے ہو تو رئیسِ قادیاں نے جواب دیا

کہ دمشقی روایت، جس میں حضرت مسیح کے دمشق میں نازل ہونے کا ذکر ہے، وہ حدیث ہے جو صحیح مسلم میں امام مسلمؒ نے لکھی ہے جس کو ضعیف سمجھ کر رئیس المحدثین امام محمد اسمٰعیل بخاری نے چھوڑ دیا ہے۔ (ازالہ اوہام، مولفہ مرزا غلام احمد قادیانی، طبع پنجم، ص 93) جب علماء نے اس کے جواب میں فرمایا کہ ساری امت مرحومہ اس امر پر متفق ہے کہ صحیح بخاری کی طرح صحیح مسلم کی بھی تمام حدیثیں صحیح ہیں بلکہ امام نوویؒ نے صحیح مسلم کو بعض حیثیتوں سے صحیح بخاری پر ترجیح دی ہے تو حضرت ''مسیح موعود'' نے اپنے زندقہ و باطنیت کے پٹارے میں سے تحریف بازی کی چند نظر فریب گڑیاں نکال پھینکیں اور بولے کہ اگر آپ لوگ نہیں مانتے تو میں ابھی تمہارے سامنے قادیاں ہی کو دمشق ثابت کیے دیتا ہوں۔ سنو دمشق کے لفظ کی تعبیر میں میرے پر من جانب اللہ ظاہر کیا گیا ہے کہ اس جگہ ایسے قصبہ کا نام دمشق رکھا گیا ہے جس میں ایسے لوگ رہتے ہیں جو یزیدی الطبع اور یزید پلید کی عادات و خیالات کے پیرو ہیں۔ دمشق پایہ تخت یزید رہ چکا ہے، اس لیے دمشق کا لفظ بطور استعارہ کہا گیا۔ یہ قصبہ بوجہ اس کے کہ اکثر یزیدی الطبع لوگ اس میں سکونت رکھتے ہیں، دمشق سے مشابہت رکھتا ہے اور ظاہر ہے کہ تشبیہات میں پوری پوری تطبیق کی ضرورت نہیں ہوتی۔ سو خدا تعالیٰ نے اسی عام قاعدہ کے موافق اس قصبہ قادیاں کو دمشق سے مشابہت دی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قادیاں کا نام پہلے نوشتوں میں استعارہ کے طور پر دمشق رکھ کر پیش گوئی کی گئی ہوگی (ملتمس از ازالہ اوہام، مولفہ مرزا غلام احمد قادیانی، طبع پنجم، ص 30-33) اس ملحدانہ تحریف کا تو مرزا قادیانی نے 1891ء میں ارتکاب فرمایا لیکن چونکہ خود حضرت ''مسیح موعود'' قادیانی کا دل بھی اس خرافات نگاری پر مطمئن نہیں تھا اس لیے اسلامی تعلیمات کے روشن چہرہ کو مسخ کرنے کا نامبارک ولولہ لے کر دوبارہ اٹھے اور مزید دماغی کدو کاوش شروع کر دی۔ آخر بارہ سال کی دماغ سوزی کے بعد حضرت مہبط وحی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد مبارک کو اپنی زندیقانہ تحریف کا تختہ مشق بنا کر اپنا نام پہنائے عالم میں روشن کیا۔ اس سلسلہ میں کتاب ''تذکرۃ الشہادتین'' میں جو 1903ء میں شائع کی، یہ لکھ کر لوگوں کو دعوت خندہ و تضحیک دی کہ ''صحیح بخاری میں میرا تمام حلیہ لکھا ہے اور پہلے مسیح کی نسبت جو بڑا مرکز مشرق یعنی ہند قرار دیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ مسیح موعود دمشق سے مشرق کی طرف ظاہر ہوگا، سو قادیاں دمشق سے مشرق کی طرف ہے۔'' (تذکرۃ الشہادتین، مولفہ مرزا غلام احمد قادیانی، ص 38) یہاں یہ جتلا دینا ضروری ہے کہ نہ تو صحیح بخاری میں مرزا غلام احمد قادیانی کا کوئی تذکرہ موجود ہے اور نہ یہ لکھا ہے کہ مسیح موعود دمشق سے مشرق کی طرف کسی دور دست گاؤں میں ظاہر ہوگا۔'' یہ توہمات قادیانی کے نظام حواس کی برہمی کے عملی ثبوت ہیں۔ اس قسم کی مہمل نگاری کے اصل بانی اُن کے بے بصر عقیدت مند تھے جو ان کے ہر سیاہ و سپید پر آمنا و صدقنا کہہ کر ان کو ایسی روز افزوں غلط بیانوں کی جرأت دلاتے رہتے تھے۔

حضرت مہدی علیہ السلام کا مولد ومظہر

امیر المومنین علی مرتضٰی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت مہدیؑ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت میں سے ہوں گے۔ ان کی ولادت مدینہ منورہ میں ہوگی اور بیت المقدس کی طرف ہجرت فرمائیں گے۔ اخرجہ نعیم بن حماد اور شیخ علی متقی ؒ نے رسالہ ''البرہان فی احوال مہدی آخرالزمان'' میں لکھا ہے کہ حضرت مہدی علیہ السلام مدینہ منورہ میں متولد ہوں گے۔ مکہ مکرمہ میں ظہور فرمائیں گے۔ بیت المقدس کی طرف ہجرت کریں گے اور اسی جگہ انتقال فرمائیں گے۔ (حجج الکرامہ، ص 358) لیکن اس کے برخلاف امام مستغفری نے ''دلائل النبوۃ'' میں عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کی ہے کہ حضرت مہدی علیہ السلام کرعہ نامی ایک گاؤں میں پیدا ہوں گے۔ (ایضاً) اسی طرح میزان الاعتدال میں کامل ابن عدی سے نقل کیا ہے کہ مہدی ایک گاؤں سے ظاہر ہوں گے جس کا نام کرعہ ہوگا۔ (میزان الاعتدال، جلد 2، ص 161) غرض مہدی علیہ السلام کی جائے ولادت میں روایات مختلف ہیں۔ میرے خیال میں اگر صحیح ہیں تو وہی روایات صحیح ہوسکتی ہیں جن میں صاحب الزمان مہدی علیہ السلام کا مدینہ منورہ میں متولد ہونا مذکور ہے۔ رہی کرعہ میں پیدا ہونے کی موخرالذکر روایتیں سو وہ پایہ اعتبار سے ساقط ہیں کیونکہ ان کا ایک راوی عبدالوہاب بن ضحاک ضعیف ہے۔ نسائی نے اس کو متروک الحدیث اور دارقطنی نے منکر الحدیث لکھا ہے اور ابو حاتم نے اسے کاذب بتایا ہے۔ (میزان الاعتدال، جلد 2، ص 160)

کرعہ کو کدعہ میں تبدیل کرنے کی مرزائی شعبدہ گری

حضرات! آپ نے پڑھا کہ کرعہ والی روایت ایک جھوٹے راوی عبدالوہاب بن ضحاک کا من گھڑت افسانہ ہے۔ لیکن مسیح قادیاں کو اس سے کوئی سروکار نہ تھا کہ کوئی روایت صحیح ہے یا سقیم۔ بلکہ وہ تو ہمیشہ یہ دیکھا کرتے تھے کہ کس چیز سے ان کے آشیانہ مہدویت ومسیحیت کے لیے کوئی تنکا فراہم ہوسکتا ہے؟ جب کوئی روایت خلاف مدعا ہوتی تھی تو صحیحین کی متفق علیہ حدیث سے بھی، جس کی صحت ساری دنیا کے علماء اور ہر زمانہ کے مسلمانوں کے نزدیک مسلم رہی ہے، روگرداں ہوجاتے اور اگر مفید مطلب ہوتی تو چاہے کیسی ہی مبتذل روایت کیوں نہ ہو اسے صحیح قرار دے کر اپنے پروپیگنڈا کا آلہ کار بنا لیتے۔ کرعہ والی روایت کو بھی انھوں نے مفید مطلب سمجھ کر لے لیا اور بساط زندقہ پرستی پر قدم رکھ کر اس سے اپنی خانہ ساز مہدویت پر استدلال کرنے لگے۔ اگر محض کسی ضعیف روایت کو اپنے دعویٰ کی تائید میں پیش کرتے تو کوئی انوکھی بات نہیں تھی کیونکہ دنیا میں تقدس کے جتنے جھوٹے دکاندار گزرے ہیں انھوں نے موضوع اور مجروح روایات کی آڑ لے کر خلق خدا کو گمراہ کیا

ہے لیکن قادیاں کے ''مسیح موعود'' میں تو یہ کمال تھا کہ لغو روایات سے مطلب براری تو ایک طرف رہی، موضوع یا ضعیف روایتوں میں بھی حسب دلخواہ تصرف کر کے ان کو اپنے سانچے میں ڈھال لیتے تھے، چنانچہ مندرجہ ذیل تحریروں سے آپ کو معلوم ہوگا کہ انھوں نے کرعہ کو کدعہ میں تبدیل کر کے کس طرح مطلب براری کی نامراد کوشش کی۔ لکھتے ہیں: ''ایسا ہی احادیث میں یہ بھی بیان فرمایا گیا ہے کہ وہ مہدی موعود ایسے قصبہ کا رہنے والا ہوگا جس کا نام کدعہ یا کدیہ ہوگا۔ اب ہر ایک دانا سمجھ سکتا ہے کہ یہ لفظ کدعہ دراصل قادیاں کے لفظ کا مخفف ہے۔'' (کتاب البریہ، مولفہ مرزا غلام احمد قادیانی، ص 225-226) دوسری جگہ لکھتے ہیں: ''میری نسبت قرآن کریم نے اس قدر پورے پورے قرائن اور علامات کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ ایک طور سے میرا نام بتلا دیا ہے اور حدیثوں میں کدعہ کے لفظ سے میرے گاؤں کا نام موجود ہے۔'' (تذکرۃ الشہادتین، مؤلفہ مرزا غلام احمد قادیانی، ص 38)

لوگ معترض ہیں کہ مرزا نے اپنا ابو سیدھا کرنے کے لیے کرعہ کو کدعہ میں تبدیل کر کے اپنے دامنِ تقدس پر بددیانتی کا داغ لگایا۔ لیکن میرے نزدیک بددیانتی کا الزام کسی حد تک بے محل ہے۔ ''بوقت ضرورت'' ایک آدھ حرف کو دوسرے حرف سے تبدیل کر لینے میں کوئی لمبی چوڑی بددیانتی لازم نہیں آتی۔ بلکہ سچ پوچھو تو یہ مرزا قادیانی کا بہت بڑا احسان ہے کہ انھوں نے کرعہ کی جگہ کدعہ اور کدیہ لکھ کر لغاتِ عرب میں دو لفظوں کا اضافہ فرما دیا۔ ع: ایں چہ احسان است قربانت شوم۔ البتہ میں اس بات کا قائل ہوں کہ حضرت ''مسیح موعود'' صاحب نے آسان طریق چھوڑ کر سنگلاخ راستہ اختیار کیا۔ اگر کرعہ کی روایتوں کے بجائے ان روایات سے مطلب براری کی کوشش فرماتے جن میں حضرت مہدی علیہ السلام کا مدینہ طیبہ میں متولد ہونا مذکور ہے تو ان کے لیے مہدی بننے میں زیادہ سہولت رہتی۔ کیونکہ مدینہ اور قادیاں میں حرف دال مشترک ہے۔ کرعہ کو کدعہ بنا کر قادیاں قرار دینے میں جو تکلف کیا گیا، وہ مدینہ کو قادیاں بنا لینے کی صورت میں نہ کرنا پڑتا۔ موخر الذکر طریق استدلال میں صرف اتنا کہنے کی ضرورت تھی کہ ''مدینہ سے قادیاں مراد ہے کیونکہ دونوں میں حرف دال موجود ہے۔'' لیکن یہ پیرایہ کیوں نہ اختیار کیا؟ اس لیے کہ یہ بقعہ مطہرہ اسلامی عظمت کا اولین گہوارہ جناب حبیب رب العالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دارالہجرت اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آخری آرام گاہ ہے۔ یہیں سے اسلامی علم و عمل کے سرچشمے پھوٹے اور دنیا حلاوت اندوزِ رشد و سعادت ہوئی۔ مرزا قادیانی سمجھتے تھے کہ مسلمان ان کی تمام تعلیوں اور لن ترانیوں کو برداشت کر لیں گے لیکن مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توہین و تفضیح ہرگز گوارا نہ کریں گے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ قادیانی نے کرعہ کو تو اپنی توجہ کا مرکز بنایا لیکن مدینہ منورہ کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہ ہوئی۔

قاضی فضل احمد گورداسپوری

قادیان

مرزا صاحب نے جواہر الاسرار کے حوالہ سے اپنی کتاب میں ایک حدیث نقل کی ہے جس میں انھوں نے بزعم خود یہ ثابت کیا ہے یعنی۔

(الف) مہدی اس گاؤں سے نکلے گا جس کا نام کدعہ ہے۔

(ب) خدا اس مہدی کی تصدیق کرے گا۔

(ج) دور دور سے اس کے دوست جمع کرے گا، جن کا شمار اہل بدر میں سے ہوگا۔ یعنی تین سو تیرہ ہوں گے اور ان کے نام بقید مسکن و خصلت چھپی ہوئی کتاب میں درج ہوں گے۔ یہ پیشگوئی بھی میرے حق میں پوری ہوئی۔

حضرات ناظرین! اوّل یہ حدیث شریف کسی حدیث کی کتاب سے نقل نہیں کی گئی، جس کی پڑتال ہو سکے۔ اربعین جس کا حوالہ جواہر الاسرار میں اور نیز اربعین فی احوال المہدین مطبوعہ 1268ھ کلکتہ مصری گنج جس میں یہ حدیث بالضرور ہونی چاہیے، دیکھی گئی مگر کوئی حدیث درج نہ پائی۔

دوم: راویانِ حدیث کے نام درج نہیں جس سے صحت اور ضعف معلوم ہو سکے لیکن خیر، مرزا صاحب کی ہی تحریر پر اعتبار کر کے عرض کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں: مہدی اس گاؤں سے نکلے گا جس کا نام کدعہ ہے۔ (کدعہ معرب ہے قادیان کا) یعنی قادیان کسی عجمی زبان کا لفظ ہے۔ اس کا عربی میں کدعہ بنایا گیا ہے۔ اس کی تصدیق کی دلیل مرزا صاحب کے الہام یا وہم اور خیال میں ہوگی۔ کسی کتاب مستند سے تو مرزا صاحب نے نقل نہیں کیا۔ قادیان کے لفظ کا عجمی یا کسی دیگر زبان کا ہونا بھی مرزا صاحب ثابت نہیں کر سکے بلکہ الٹا ان کے الہامِ قطعی اور یقینی سے لفظ قادیان خاص عربی زبان معلوم ہوتا ہے۔ عربی بھی ایسی کہ مرزا صاحب کے خدا کی زبانِ خاص سے نکلا ہوا، جیسے مرزا صاحب کے خدا کا الہام ہے: "انا انزلناہ قریباً من القادیان" جب مرزا صاحب کا خدا قادیان اپنی عربی زبان سے نکال کر الہام کرتا ہے تو پھر اپنے الہامِ قطعی اور یقینی سے مخالفت کر کے کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ کدعہ قادیان کا معرب ہے جبکہ قرآن شریف میں بھی قادیان کا نام درج ہے جیسے مرزا

صاحب لکھتے ہیں کہ کشفی طور پر میں نے دیکھا کہ میرے بھائی مرحوم غلام قادر قرآن شریف بلند آواز سے پڑھ رہے ہیں اور اس میں یہ آیت انا انزلناہ قریباً من القادیان لکھی ہوئی پڑھی۔ اور مجھ کو دکھلائی تو میں نے نظر ڈال کر جو دیکھا تو فی الحقیقت قرآن شریف کے دائیں صفحہ میں شاید نصف کے موقعہ پر یہی عبارت لکھی ہوئی موجود ہے۔ تو میں نے کہا کہ تین شہروں کا نام اعزاز کے ساتھ قرآن شریف میں لکھا گیا ہے مکہ، مدینہ، قادیان۔" (ازالہ اوہام صفحہ 76-77)

لیجئے یہ خاص آیت قرآن شریف میں درج ہے اور اعزاز کے ساتھ بمثل مکہ معظمہ و مدینہ منورہ کے قادیان کا نام بھی قرآن شریف میں ثبت ہے۔ پھر فرمایئے قادیان کے معرب کدعہ بنانے کی کیا ضرورت پڑی اور کیوں؟ مگر افسوس مرزا صاحب کے حافظہ پر جو پہلے خود لکھتے ہیں "قادیان کا نام پہلے نوشتوں میں استعارہ کے طور پر دمشق رکھ کر پیشگوئی بیان کی گئی ہوگی۔ کیونکہ کسی کتاب حدیث یا قرآن شریف میں قادیان کا نام لکھا ہوا پایا نہیں جاتا۔ (ازالہ اوہام ص 74)

حضرات! خیال فرمایئے مرزا صاحب کے الہامی حافظہ پر، پہلے کہتے ہیں کہ قادیان کا نام کسی کتاب حدیث یا قرآن شریف میں پایا نہیں جاتا، پھر کہتے ہیں کہ قرآن شریف میں قادیان کا نام درج ہے۔ پھر ایک حدیث میں بھی باوجود قادیان لفظ اور زبان عربی ہونے اور قرآن شریف میں بھی موجود ہونے کے کدعہ کے لفظ کو قادیان کا معرب بنا دیا۔ مرزا صاحب کی کس بات یا الہام پر اعتبار کیا جائے۔

ہاں! مجھے یہاں پر ایک ضروری امر کا اظہار بھی کرنا ہے کہ مرزا صاحب کا اعتقاد ہے کہ یہ عبارت انا انزلناہ قریباً من القادیان آیت قرآنی ہے اور قرآن شریف میں موجود ہے اور قرآن شریف میں قادیان کا نام بھی لکھا ہوا ہے۔ مرزا صاحب سے دریافت فرمایئے گا کہ وہ ٹھیک ٹھیک پتہ دیویں کہ کس پارہ یا سورہ یا رکوع میں یہ عبارت درج ہے جہاں آپ نے پتہ دیا ہے کہ نصف کے موقع پر دائیں صفحہ پر قرآن شریف کے ہے، تلاش کیا گیا ہے مگر افسوس ملا نہیں۔ مرزا صاحب اور تین سو تیرہ مرزائی قرآن شریف سے نکال کر دکھائیں۔ ہرگز دکھلا نہ سکیں گے۔ اگر نہ دکھلائیں تو اس کی وجہ بتلائیں کہ کہاں گئی۔ اس سے نعوذ باللہ قرآن شریف کا کم و بیش اور ترمیم و تنسیخ ہونا ثابت ہوتا ہے اور تحریف۔ جس پر تمام اہل اسلام کا اتفاق ہے کہ قرآن شریف کا ایک شعشعہ بھی کم و بیش نہیں ہو سکتا۔ خلاف حکم خداوندی انا لہ لحافظون کے مرزا صاحب کی یہ کارروائی ہے۔ حالانکہ مرزا صاحب خود پہلے لکھ چکے ہیں۔ ان کا الہامی حافظہ اس طرح پر ہے۔ ہم پختہ یقین کے ساتھ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ قرآن شریف خاتم کتب سماوی ہے۔ ایک شعشعہ یا نقطہ اس کی شرائع اور حدود اور احکام

اور اوامر سے زیادہ نہیں ہوسکتا اور نہ کم ہوسکتا ہے، اور اب ایسی وحی یا ایسا الہام منجانب اللہ نہیں ہوسکتا جو احکام قرآنی کی ترمیم یا تنسیخ یا کسی ایک حکم کی تبدیل یا تغیر کرسکتا ہو۔ اگر کوئی ایسا خیال کرے تو وہ ہمارے نزدیک جماعت مومنین سے خارج اور ملحد اور کافر ہے۔ (ازالہ اوہام صفحہ 138)

لیجئے حضرات! یہاں پر مرزا صاحب اپنے ہی اعتقاد اور تحریر الہامی سے جماعتِ مومنین سے خارج اور ملحد اور کافر ہو گئے۔ کسی مولوی صاحب کے فتوے کی بھی ضرورت نہ رہی کیونکہ تمام اہل اسلام و اہل سنت والجماعت کا یہ اعتقاد ہے کہ اگر کوئی شخص یہ اعتقاد رکھتا ہو کہ قرآن شریف کی ایک آیت یا ایک نقطہ میں بھی کمی وبیشی ہوسکتی ہے، یا ہوئی ہے یا ہوئی تھی، وہ ضرور کافر ہوگیا۔ اس کے کسی مسلمان کو انکار نہیں لیکن برخلاف اس کے مرزا صاحب کا عقیدہ ہے کہ **انا انزلناہ قریباً من القادیان** قرآن شریف کی آیت ہے اور قرآن شریف میں موجود ہے **نعوذ باللّٰہ من الحور بعد الکور**. جملہ معترضہ ختم ہوا۔ اب میں پھر اسی لفظ کدعہ کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ افسوس کہ کتاب جواہر الاسرار باوجود تلاش کے دستیاب نہیں ہوئی۔ تلاش درپیش ہے۔ لیکن میں یہ دعویٰ سے کہتا ہوں کہ وہ لفظ کدعہ کا ک۔د۔ع۔ہ سے اصل حدیث میں ہرگز نہیں۔ یہ محض دھوکہ مرزا صاحب کا ہے۔ بفرض محال اگر ہو بھی تو بھی اس میں کوئی شک نہیں کہ کاتب کی غلطی ہے، بہرحال لفظ کدعہ حدیث کا لفظ نہیں ہے۔ ہاں البتہ تحقیق سے صحیح لفظ حدیث کا کرعہ ک۔ر۔ع۔ہ سے ثابت ہوا یعنی بجائے حرف دال مہملہ کے ر، مہملہ ہے۔ بوجوہات ذیل۔

اوّل: مولوی حافظ محمد لکھنوی اپنی کتاب پنجابی زبان احوال الآخرت نام میں (جو 1277ھ میں تالیف ہوئی اور 1291ھ میں بارششم محمدی پریس لاہور میں طبع ہوئی) لکھتے ہیں:

حضرت علی امام حسنؓ نون اک دینہ ویکھ الایا
لکھ بیٹا میرا سید ہے جویں پیغمبر فرمایا
پشت اِس دی تھیں مرد ہوسی اک نام محمد والا
خُو اُس دی جویں خو نبی دی صورت فرق نرالا
عدلوں بھری خوب زمین نُوں مہدی ایہو جانو
آمنہ نانو مائی دا بھی عبداللہ باپ پچھانو
کرعہ نام یمن وچہ وستی اُس دا جمال پیارے
بولن لگا اَڑ کر بولے پٹان تے ہتھ مارے

(کتاب احوال الآخرت صفحہ 23 پنجابی مطبوعہ مطبع محمدی لاہور 1891ء)

ترجمہ نظم زبان پنجابی: یعنی حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ایک دن حضرت امام حسنؓ کو دیکھ کر فرمایا کہ حضرت رسول اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ اس میرے بیٹے کی پشت سے ایک مرد پیدا ہوگا جس کا نام میرا نام ہوگا اور اس کے ماں باپ کا نام میرے ماں باپ کے مطابق آمنہؓ، عبداللہؓ ہوگا۔ عدل سے زمین کو بھر دے گا۔ جیسا کہ ظلم سے بھری ہوئی ہوگی۔ یمن میں ایک بستی جس کا نام کرعہ ہے پیدا ہوگا۔ ان کی زبان میں لکنت ہوگی۔ پس اس سے یہ ثابت ہوا کہ یمن میں ایک قریہ ہے جس کا نام کرعہ ہے، جو حضرت ﷺ کے وقت میں موجود اور آباد تھا اور اب بھی موجود ہے۔ جس کی تصدیق اس طرح پر ہے۔

دوم: کراع الغمیم وادی ہست میان مکہ و مدینہ بدو مرحلہ۔ (صفحہ 349 منتخب اللغات مطبوعہ نولکشور لکھنو 1877ء مطابق 1294ھ)

سوم: **کراع الغمیم علی ثلاثة امیال من عسفان.** یعنی کراع الغمیم عسفان سے تین میل کے فاصلہ پر ہے۔ (قاموس رفع ثالث صفحہ 23 کالم اول)

چہارم: (الف) **کراع الغمیم ھو اسم موضع** یعنی کراع الغمیم ایک جگہ کا نام ہے۔ (صفحہ 207 مجمع بحارالانوار جلد سوم)

(ب) **موضع علی مرحلتین من مکة عند بیر عسفان** یعنی کراع موضع ہے مکہ معظمہ سے دو میل چاہ عسفان کے پاس۔ (حاشیہ صفحہ 207 مجمع بحارالانوار جلد سوم)

پنجم: **کراع ھو شیٔ موضع بین مکة والمدینة** یعنی کراع ایک چھوٹا موضع ہے درمیان مکہ اور مدینہ کے۔ (مجمع بحارالانوار صفحہ 207 جلد سوم)

ششم: **عسفان قریة بین مکة والمدینة** یعنی عسفان ایک گاؤں یا شہر ہے درمیان مکہ اور مدینہ کے۔ (مجمع بحارالانوار جلد دوم صفحہ 386)

ہفتم: رسالہ الفصل الخطاب لرد مسیح الکذاب مصنفہ مولوی خدا بخش واعظ مندرانوالہ ضلع امرتسر میں لکھا ہے جہاں حضرت مہدیؓ کی پیشگوئی درج کی ہے۔ (صفحہ 11 سطر 17)

عمر انہاندی چالی برسان سیرت حضرت والی
کرعہ جمن بھون انہاندی کہیا محمد عالیؐ

پس ان سب کتب معتبرات سے یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ کرعہ یا کراع ایک جگہ یا شہر یا گاؤں کا نام ہے جو درمیان مکہ معظمہ و مدینہ منورہ کے ہے اور وہ گاؤں یا بستی حضرت رسول خدا ﷺ کے زمانہ میں موجود اور آباد تھی اور اب بھی موجود ہے۔ مرزا صاحب کے دو اعتراض اس میں نکلتے

ہیں ایک تو یہ کہ بعض جگہ کرعہ لکھا ہے اور کسی جگہ کراع، اگرچہ ہر دو ناموں میں چار چار ہی حروف ہیں، حروف ہا ہوز اور الف کا آپس میں فرق ہے دوسرا یہ کہ کرعہ یا کراع ایک بستی بیان کی گئی ہے جو درمیان مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے ہے۔

پہلے اعتراض کے جواب میں گذارش ہے کہ بہت سے شہر یا قصبات اور بستیات اس قسم کی اس وقت موجود ہیں کہ جن کے نام اول اول میں کچھ تھے اور بعد میں بدل کر کچھ کا کچھ ہو گئے بلکہ بعض جگہوں یا شہروں کی صورت ہی مغائر ہوگئی۔ مثال کے لیے چند نام پیش کرتا ہوں۔

1- بکہ ب۔ک۔ہ تھا جس کو اب مکہ م۔ک۔ہ کہتے ہیں۔ اس میں ب اور م کا کتنا بڑا فرق ہے۔ (دیکھو منتخب اللغات صفحہ 69) اگر کراع کو کرعہ لکھ دیا یا ہو گیا تو کوئی عجیب بات نہیں ہے۔

2- مدینہ منورہ کے بھی کئی نام ہیں۔ جیسے طابۂ، طیبہ، طائبہ وغیرہ ہیں اور محاورہ عرب میں مدینہ منورہ کہ المدینہ الف اور لام سے بولتے ہیں۔ لیکن عام بول چال میں المدینہ کوئی نہیں کہتا، صرف مدینہ بولا جاتا ہے۔ (دیکھو جذب القلوب الی دیار المحبوب مصنفہ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ)

3- کشمیر کا اصل نام کاشمیر تھا۔ لیکن اس کا مخفف کشمر یا کشمیر ہو گیا۔

(دیکھو غیاث اللغات ص 361)

4- بغداد کا اصل نام باغداد تھا۔ اب الف اس میں سے نکل گیا، صرف بغداد رہ گیا جو اس وقت مشہور ہے۔

5- دہلی کا نام اول اندر پرست تھا۔ پھر شاہجہان آباد ہوا۔ اب اکثر بول چال میں دلی مشہور ہے۔

6- امرتسر کو اکثر لوگ انبر سر بولتے ہیں۔

7- لودھیانہ، یعنی لودھی افغانوں کا آباد کیا ہوا۔ مگر اس کو کوئی لودیانہ، کوئی لودہانہ، کوئی لدہیانہ، کوئی لدہانہ وغیرہ لکھتا ہے۔ اسی طرح مرزا صاحب نے خود لودہیانہ کو کئی طرح سے لکھا ہے دیکھو مرزا صاحب کا ازالہ اوہام صفحات 122، 707، 708، 709 و دیگر تالیفات۔

8- مرزا صاحب کے قادیان کو ہی دیکھئے بقول ان کے پہلے اس کا نام اسلام پور قاضی ماجھی تھا اب قادیان ہے۔ صفحہ 122 ازالہ اوہام۔ اب اسی قادیان کو کئی لوگ کادیان کاف

کتے سے لکھتے ہیں بلکہ یہاں لودہیانہ کی کتاب ڈائرکٹری (فہرست دیہات) میں کادیان ایک گاؤں کا نام درج ہے جو خاص لودہیانہ سے تین کوس کے فاصلہ پر آباد ہے جس کا ذکر مرزا صاحب نے اپنی کتاب ازالہ اوہام کے صفحہ 709 میں کیا ہے۔ اس گاؤں میں بھی ایک شخص غلام احمد معروف غلام گوجر موجود ہے۔ پس انھیں چند دیہات سے کراع کا کرعہ ہو جانا نہایت ہی اغلب اور یقینی امر ہے۔ مرزا صاحب کا اعتراض مرزا صاحب کی ہی طرف عود کر گیا۔

دوسرے اعتراض کے جواب میں واضح رہے کہ (الف) ملک عرب یا حجاز جس میں مکہ معظمہ و مدینہ منورہ زاد اللہ شرفاً وتعظیماً آباد ہیں، وہ اقلیم اول میں ہیں۔ اور ملک یمن بھی اقلیم اول اور دوم میں ہے۔ اور ملک یمن کا نام اس واسطے یمن ہے کہ وہ کعبۃ اللہ شریف یا مکہ معظمہ کے داہنے طرف ہے جیسا کہ غیاث اللغات میں ہے۔ یمن بفتحتین ملکیست معروف در اقلیم اول و دوم چون آن ملک بجانب یمین کعبہ است لہٰذا یمن گفتند۔

(ص 517 غیاث اللغات)

(ب) پہلے بھی عرض ہو چکا ہے کہ کعبۃ اللہ شریف و مدینہ منورہ ہی یمن ہے جیسا کہ کتاب لغت شرح احادیث مسلمہ مرزا صاحب میں لکھا ہے لان الایمان بدأمن مکه وهي من تهامة وهي من ارض اليمن ولذا يقال الكعبة اليمانية یعنی تحقیق ایمان شروع ہوا کہ مکہ شریفہ سے اور وہ تہامہ میں سے ہے اور تہامہ یمن کی زمین سے ہے۔ اسی واسطے کعبۃ الیمانیہ بولا جاتا ہے۔ (مجمع بحار الانوار جلد سوم صفحہ 503 سطر 2)

(ج) حدیث شریف میں ہے الایمان یمان والحکمة یمانیه رواہ جامع ترمذی۔ یعنی ایمان یمن سے ہے اور حکمت بھی یمن سے ہے۔

(مجمع بحار الانوار ص 503 سطر 2 جلد سوم)

پس ثابت ہو گیا کہ حضرت مہدی رضی اللہ عنہ یمن کے ملک یعنی کعبۃ اللہ مکہ معظمہ و مدینہ منورہ کے درمیان میں پیدا ہوں گے۔ اگرچہ کئی حدیثوں میں یہ بھی آیا ہے کہ حضرت مہدیؓ مدینہ شریف میں پیدا ہوں گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ کرعہ یا کراع بستی میں جو مکہ اور مدینہ شریف کے درمیان میں ہے (جیسے کہ بیان ہو چکا ہے) پیدا ہوں اور پھر مدینہ شریف میں تشریف لے آئیں اور عین ظہور کے وقت کعبۃ اللہ شریف میں تشریف فرما ہوں۔ اعتراض ثانی بھی باطل ہوا۔

معیار شناخت کرعہ وکدعہ

میں کہتا ہوں کہ مرزا صاحب اس بستی کا نام جس میں حضرت مہدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ پیدا ہوں گے، کدعہ بتلاتے ہیں اوراس پر اپنی طرف سے بے موجب معرب قادیان لکھتے ہیں۔ اور یہ نام ایک حدیث میں آیا ہے پس اس کی تصدیق کے لیے ہم کو کسی حدیث کی کتاب میں تلاش کرنا ہوگا یا کسی حدیث کی لغت میں۔ کتب احادیث کی لغت یا شرح نہایت مشہور اور مستند کتاب مرزا صاحب کی بھی مسلمہ مجمع بحارالانوار ہے، اس میں سے مرزا صاحب یا ان کے حواری یہ نام نکال کر دکھلائیں اگر سچے ہیں؟ یا کسی اور ہی کتاب سے نکال کر پیش کریں۔ لیکن یہ یقینی ہے کہ وہ ہرگز نکال کر پیش نہیں کرسکیں گے (جیسے کہ میں نے چند کتب معتبرات سے نکال کر پیشِ ناظرین کر دیا ہے کہ وہ بستی کرعہ (ک۔ر۔ع۔ہ) یا کراع (ک۔ر۔ا۔ع) ہے جس میں حضرت مہدی رضی اللہ عنہ پیدا ہوں گے، خواہ تمام عمر تلاش کریں اور تین سو تیرہ ہی مرزائی معہ مردوں کے شامل ہو کر کوشش کریں۔ اور مرزا صاحب بھی اپنے بیت الفکر میں بیٹھ کر الہاموں کا زور لگائیں اوراپنے خدا عاجی سے بھی بزاری والحاح دعائیں کر کے مدد لیں۔

الغرض یہ ہرگز نہیں ہوگا کہ حضرت مہدی رضی اللہ عنہ مرزا صاحب کے کدعہ معربِ قادیان یا کادیان جو کعبۃ اللہ شریفہ سے جانب مشرق ہے، پیدا ہو کر ظہور فرمائیں، بلکہ معاملہ برعکس ہے کیونکہ اکثر احادیث صحیحہ میں ہے کہ دجال مشرق سے نکلے گا۔ احادیث نقل کرنے کی ضرورت اس لیے نہیں کہ مرزا صاحب خود اس امر کو مانتے ہیں جیسے وہ لکھتے ہیں کہ:

(الف) دجال مشرق کی طرف سے خروج کرے گا یعنی ملک ہند سے کیونکہ یہ ملک ہند زمین حجاز سے مشرق کی طرف ہے۔ (ازالہ اوہام ص 729)

(ب) حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ دجال ہندوستان سے نکلنے والا ہے۔ (ازالہ اوہام ص 841)

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ مرزا صاحب کا گاؤں قادیان ملک ہندوستان میں ہے اور عین ملک حجاز سے مشرق کو ہے۔ پس مرزا صاحب کا دعویٰ محض غلط ہی نہیں بلکہ بالکل جھوٹا نکلا۔ جھوٹ بھی ایسا کہ گویا خود دجال ہی ثابت ہو گئے اگر چہ وہ بڑے دجال نہیں۔ لیکن خلیفۂ دجال ہونے میں تو اس کتاب رسالہ انجام آتھم کی تالیف کے وقت (1896ء) کوئی شک نہیں رہا۔ (جیسا کہ میرے جیسے ہیچمدان کو بھی القا ہوا ہے کہ هٰذَا خَلِيْفَةَ الدجال جس کے حروف کے اعداد سے پوری تاریخ 1896ء نکلتی ہے) کیونکہ کسی حدیث میں نہیں ہے کہ حضرت مہدی رضی اللہ عنہ ملک مشرق یا ہندوستان سے ہوں گے۔ تمام احادیث میں ہے کہ وہ حضرت ملک یمن عرب میں پیدا ہوں گے۔

سوم: مرزا صاحب لکھتے ہیں کہ ''مہدی اس گاؤں سے نکلے گا جس کا نام کدعہ ہے۔ بلفظہ اس سے یہ بات ثابت ہے کہ یہ گاؤں کرعہ ہے جس کو مرزا صاحب کدعہ لکھتے ہیں۔ حضرت رسول خدا ﷺ کے زمانہ میں موجود تھا اور اب بھی موجود ہے۔ اور خود مرزا صاحب کے ترجمہ حدیث شریف اور اصل الفاظ سے ثابت ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ قادیان حضرت رسول خدا ﷺ کے وقت میں ہرگز موجود نہیں تھا کیونکہ مرزا صاحب خود لکھتے ہیں کہ ''بابر بادشاہ کے وقت میں یہاں پنجاب میں ہمارے مورث اعلیٰ آئے اور میدان میں ایک قصبہ آباد کیا اس کا نام اسلام پور قاضیان ماجھی رکھا۔''

(صفحہ 122 ازالہ اوہام)

تواریخ کے دیکھنے سے ثابت ہوتا ہے کہ بابر بادشاہ نے 1526ء سے 1530ء تک بادشاہی ہندوستان وغیرہ میں کی ہے جس کو اس وقت 1897ء کو تین سو اکہتر سال ہوئے ہیں اور حضرت رسول اکرم ﷺ کی حدیث شریف کو تیرہ سو سال کا عرصہ گزر گیا اور اس وقت وہ کرعہ گاؤں موجود تھا اور مرزا صاحب کی قادیان یا کادیان ہرگز موجود نہیں تھی۔ اس لیے حدیث شریف کا مصداق قادیان ہرگز نہیں ہوسکتا۔ یہ نرا دھوکہ ہے۔

موضع یا قصبہ قادیان کی تحقیق

مرزا صاحب نے قادیان کی کوئی وجہ تسمیہ بیان نہیں کی کہ کیوں اس کا نام قادیان رکھا گیا، اس لیے میں اس کی وجہ تسمیہ ظاہر کر کے ثابت کرتا ہوں کہ دراصل اس کا نام قادیان بھی نہیں ہے۔ اسلام پور قاضیان تھا۔ جب روز بروز شریر لوگ پیدا ہوتے گئے حتیٰ کہ بقول مرزا صاحب اس قصبہ کے باشندے یزیدی ہو گئے تو اسلام پور دور ہو گیا۔ محض قاضیان رہ گیا۔ عربی تلفظ میں ض کو د سے مشابہت ہے اس لیے قاضیان کا قادیان بن گیا کیونکہ اصل میں آباد کیا ہوا قاضی ماجھی صاحب کا ہے جو مرزا صاحب کے مورث اعلیٰ معلوم ہوتے ہیں۔ جیسے مرزا صاحب لکھتے ہیں۔

(الف) ان دیہات کے وسط میں انھوں نے قلعہ کے طور پر ایک قصبہ اپنی سکونت کے لیے آباد کیا جس کا نام اسلام پور قاضی ماجھی رکھا۔ یہی اسلامپور ہے جو اب قادیان کے نام سے مشہور ہے۔ (ص 122 ازالہ اوہام)

(ب) اور اس جگہ کا نام جو اسلام پور قاضی ماجھی تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ ابتداء میں شاہان دہلی کی طرف سے اس تمام علاقہ کی حکومت ہمارے بزرگوں کو دی گئی تھی اور منصب قضا یعنی رعایا کے مقدمات کا تصفیہ کرنا ان کے سپرد تھا۔ (صفحہ 123 ازالہ اوہام)

حضرات ناظرین: مرزا صاحب کے مورث اعلیٰ قاضی ماجھی نے اس قادیان کا نام اپنے

نام پر اسلام پور قاضی ماجھی رکھا تھا اسی واسطے اسلامپور قاضیان کہلاتا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ اسلام پور دور ہو گیا، نرا قاضیان رہ گیا۔ قاضیان کا حرف ض بہ تلفظ عربی د سے مشتبہ الصوت ہے اس لیے قادیان بن گیا۔ مرزا صاحب اب لفظ کرعہ اور کراع میں بھی غور کریں۔ اور قادیان کی وجہ تسمیہ اگر اس کے سوا کچھ اور ہے تو بیان کریں۔ لیکن ہرگز بیان نہیں کر سکیں گے۔ کیونکہ اس کی تصدیق اور طور پر بھی ہوتی ہے کہ قاضی ماجھی صاحب ضرور سکندر شاہ لودھی کے زمانہ میں جو (وہی زمانہ بابر بادشاہ کا بھی ہے) موجود تھے۔ جس کی تصدیق ایک کتبہ سے (جو میں نے خود ایک مسجد واقعہ قصبہ ماچھی واڑہ ضلع لودھیانہ میں دیکھا) اور یہ مسجد بھی قاضیان کی کہلاتی ہے اور فتح ملک بنت قاضی ماجھی کی تعمیر ہے) ہوتی ہے۔ کتبہ یہ ہے **قد بناء المسجد بندگی بی بی فتحملک بنت ملا ماجھی فی عهد بندگی اعلیٰ حضرت سلطان سکندر شاہ ابن بھلول شاہ خلد اللّٰہ ملکہ من شھر رجب المرجب 933ھ** یعنی تحقیق یہ مسجد تعمیر کی گئی ہے (یہاں دو تین لفظ ٹوٹے ہوئے ہیں) بی بی فتحملک بنت ملا ماجھی کی طرف سے اعلیٰ بندگی حضرت سلطان سکندر شاہ بن بہلول شاہ خلد اللہ ملکہ کے زمانہ ماہ رجب المرجب 933ھ ہجری مقدس میں۔

اس سے صاف ثابت ہو گیا کہ یہ ملا ماجھی صاحب وہی قاضی ماجھی مورث اعلیٰ مرزا صاحب کے ہیں جن کا ذکر آپ نے ازالہ اوہام صفحات 122-123 وغیرہ میں کیا ہے اور وہی 933ھ سلطان سکندر شاہ لودھی قریب بابر بادشاہ کے زمانہ کے ہے جس کو اس وقت 1314ھ میں تین سوا کانوے سال ہوتے ہیں۔ اگرچہ اس کتبہ سے مرزا صاحب کی کسی قدر تکذیب بھی ہوتی ہے کیونکہ ملا ماجھی صاحب سلطان سکندر شاہ لودھی کے وقت میں تھے اور بابر بادشاہ ابراہیم شاہ لودھی کے زمانہ میں کابل سے آیا تھا، اس نے اس ملک کو فتح کر کے ابراہیم شاہ کو شکست دی۔ یہ واقعہ 1524ء کا ہے جس کو تین سو تہتر برس ہوتے ہیں۔ اس میں اٹھارہ سال کا فرق ہے۔ سو خیر تاریخی جھگڑوں سے درگزر کر کے ثابت کرتا ہوں کہ یہ قصبہ قادیان چار سو سال کے اندر کا آباد شدہ ہے۔ اس لیے حدیث شریف مذکور سے ذرہ بھر بھی لگاؤ اس کا نہیں ہے۔

سیّد عبدالمجید شاہ امجد بخاری بٹالوی

مَیں اور قادیان

ابھی میری عمر قریباً چھ یا سات برس کی تھی کہ مجھے پہلی دفعہ اپنے تایا صاحب سیّد نظام الدین رحمتہ اللہ علیہ کے ہمراہ قادیان جانے کا اتفاق ہوا۔ میرے تایا صاحب اور مرزا غلام احمد قادیانی کے درمیان بہت گہرے تعلقات تھے اور اس موقع پر مرزا قادیانی نے میرے تایا صاحب کو اپنے فرزندِ ارجمند کے عقیقہ کی تقریب پر مدعو کیا تھا جو غالباً مرزا بشیرالدین کے بڑے بھائی تھے۔ میرے تایا صاحب اپنی اہلیہ کو اور مجھے ساتھ لے گئے۔ مرزا قادیانی کی اہلیہ بحالت زچگی زنانہ کمرے میں آرام فرما تھیں اور میرے تایا صاحب اور مرزا غلام احمد قادیانی دیوانخانہ میں مصروف گفتگو رہے۔ گھر میں میری عمر کا ایک لڑکا تھا جو شاید ڈاکٹر اسماعیل تھا۔ ہم دونوں آپس میں اکٹھے کھیلا کرتے تھے۔ چنانچہ چند روز قادیاں میں گزار کر ہم واپس بٹالہ آ گئے۔

تایا صاحب مرحوم نے دہلی میں دینی تعلیم حاصل کی تھی اور وہاں علمائے کرام اور بزرگان دین سے فیوض ظاہری اور باطنی حاصل کیے تھے۔ مرزا قادیانی کو جب کبھی قادیان سے باہر جانا ہوتا تو وہ عام طور پر بٹالہ میں تایا صاحب سے مل کر ہی جاتے کیونکہ ان دنوں بٹالہ ہی سے گاڑی پر سوار ہونا پڑتا تھا۔ یہ ملاقاتیں اسی وقت تک تھیں جب تک کہ مرزا قادیانی نے ابھی کسی قسم کا کوئی دعویٰ مسیحیت وغیرہ نہ کیا تھا۔ دعویٰ مسیحیت کے بعد جب وہ تایا صاحب کی ملاقات کے لیے آئے تو تایا صاحب نے فرمایا کہ مرزا صاحب! جب تک آپ مبلغ اسلام یا مناظرِ اسلام تھے، مجھے آپ سے اتفاق تھا۔ مگر اب چونکہ آپ حدود شریعت سے تجاوز کر رہے ہیں، اب آپ کی اور میری آپس میں نبھتی معلوم نہیں ہوتی۔ مرزا قادیانی نے جواب دیا کہ میں نے مثیلِ مسیح ہونے کا دعویٰ کیا ہے، اور اس سے میری مراد یہ ہے کہ جس طرح مسیح علیہ السلام مُردوں کو زندہ کیا کرتے تھے، اسی طرح میں ان مردہ دلوں کو جو اسلام سے دور جا رہے ہیں، اپنی وعظ و نصیحت سے زندہ کرتا ہوں۔ تایا صاحب نے فرمایا کہ مجھے آپ کی اس تاویل سے الحاد کی بو آ رہی ہے اور شاید یہ فتنہ قیامت بن کے رہے۔ اس روز سے تایا صاحب نے مرزا قادیانی سے ملنا جلنا ترک کر دیا۔

اس کے بعد میرا طالب علمی کا زمانہ شروع ہوا۔ مڈل پاس کرنے کے بعد جب میں انٹرنس میں داخل ہوا تو میرے رشتے کے بھائی محترم سید شاہ چراغ قادیانی بھی بٹالہ تشریف لائے اور میرے ساتھ ہی انٹرنس میں داخل ہوئے۔ ان کی رہائش بھی ہمارے ہاں ہی تھی۔ دو چار دفعہ رخصتوں کے موقع پر ان کے ساتھ بھی وہاں جانے کا اتفاق ہوا۔ اس کے بعد میری ابتدائی ملازمت سپرنٹنڈنٹ ڈاکخانہ امرتسر ڈویژن کے دفتر سے شروع ہوئی اور ملازمت کا کچھ عرصہ سپرنٹنڈنٹ کے دفتر میں ہی گزارا۔

مرزا قادیانی کی وفات

جس روز مرزا قادیانی لاہور میں فوت ہوئے، اس دن میں اتفاق سے رخصت پر بٹالہ آیا ہوا تھا۔ اسی روز صبح چھ بجے کے قریب تایا صاحب غریب خانہ پر تشریف لائے اور فرمایا کہ میں تمھیں ایک بات بتاتا ہوں مگر تم کہو گے کہ تایا سترا بہترا گیا ہے۔ اس وقت ان کی عمر ایک سو پانچ برس کی تھی۔ میں نے عرض کی کہ نہیں آپ وہ بات ضرور بتا دیں۔ فرمایا کہ مجھے رات ایسا معلوم ہوا ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی لاہور سے بخیریت قادیاں واپس نہیں جائے گا۔ میرے چہرے پر کچھ مسکراہٹ کے آثار دیکھ کر فرمانے لگے کہ وہی بات ہوئی نا۔ میرے ایک اور بزرگ پاس بیٹھے تھے۔ انھوں نے فرمایا کہ یہ ابھی بچہ ہے۔ اسے کیا معلوم کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ایسے اسرار سے مطلع کر دیتا ہے۔ چنانچہ ابھی دن کے ساڑھے دس بجے تھے کہ شیخ عبدالرشید صاحب کو جو ہمارے پڑوسی اور مرزا قادیانی سے عقیدت رکھنے والے تھے، لاہور سے تار آیا کہ مرزا قادیانی کا لاہور میں دن کے نو بجے انتقال ہو گیا ہے۔ ان کی نعش کو رات کی گاڑی سے بٹالہ لایا جا رہا ہے۔ اسے قادیان لے جانے کے لیے انتظام کر چھوڑیں۔

قادیان میں ملازمت

1910ء میں محکمہ کی طرف سے مجھے قادیان کی سب پوسٹماسٹری کا حکم ملا۔ میں نے سپرنٹنڈنٹ سے گزارش کی کہ قادیان کی فضا میری طبیعت اور حالات کے موافق نہیں، میرا وہاں کا تبادلہ منسوخ کیا جائے کیونکہ پہلے تو امرتسر میں صبح کو استاذی حضرت حاجی الحرمین الشریفین مولانا مولوی نور احمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے درس میں شامل ہوا کرتا تھا اور شام کو جب وہ طالب علموں کو حدیث و فقہ کی تعلیم دیا کرتے تھے، اس میں شامل ہو جایا کرتا تھا۔ اس کے بعد حضرت مولانا مولوی غلام محی الدین صاحب نے مسجد خیر الدین میں صبح کے وقت درس قرآن کے علاوہ حدیث و فقہ کی تعلیم بھی شروع کر دی تھی اور مولانا مولوی محمد حسن صاحب اس درس گاہ میں نائب مدرس تھے۔ ایسے

حالات میں مجھے امرتسر چھوڑنا گوارا نہ تھا۔ مگر حکمِ حاکم مرگِ مفاجات سے کم نہیں ہوتا۔ مجھے دسمبر 1910ء کو امرتسر چھوڑنا پڑا۔

امرتسر سے فارغ ہو کر میں نے دو چار روز بٹالہ میں گزارے اور پھر بال بچوں کو ہمراہ لے کر قادیان پہنچا۔ وہاں سید عبدالغنی شاہ صاحب سب پوسٹماسٹر تھے، ان کو فارغ کیا۔ ان دنوں مولوی حکیم نورالدین صاحب گھوڑی سے گر کر صاحب فراش تھے۔ ان کو چوٹوں کی وجہ سے بہت تکلیف تھی۔ ڈاکٹر محمد حسین، ڈاکٹر یعقوب بیگ اور مرزا کمال الدین وغیرہ ان کی تیمارداری کرتے تھے۔ ایک روز میں بھی فرصت نکال کر بیمار پرسی کے لیے گیا کہ بیمار پرسی کا ثواب حاصل کر سکوں۔ مگر ڈاکٹر صاحبان نے مولوی صاحب کو اطلاع کرنے کی معذوری کا اظہار کیا۔ چنانچہ میں واپس لوٹ آیا۔

مولوی نورالدین صاحب سے پہلی ملاقات

جناب مولوی صاحب کی حالت روز بروز بہتر ہونے لگی۔ چنانچہ ایک روز انھوں نے اپنے مریدین سے دریافت کیا کہ ہم نے عرصہ سے سب پوسٹماسٹر کو نہیں دیکھا، کیا بات ہے، چونکہ سید عبدالغنی شاہ سب پوسٹماسٹر ہر روز بلاناغہ مولوی صاحب کی خدمت میں جایا کرتے تھے اور ''چونکہ ان کے بال بچے وہاں نہ تھے، اس لیے روٹی بھی انھیں لنگر سے جایا کرتی تھی۔'' مریدین نے عرض کیا کہ پہلا سب پوسٹماسٹر یہاں سے تبدیل ہو گیا ہے اور اس کی جگہ ایک نیا شخص آیا ہوا ہے۔ چنانچہ مولوی صاحب نے ایک خاص آدمی میری طرف بھیجا کہ حضرت صاحب آپ کو یاد فرماتے ہیں۔ مجھے چونکہ سرکاری کام کی زیادتی تھی، میں نے کہلا بھیجا کہ اس وقت تو معذور ہوں، کل شام چھ بجے حاضر ہونے کی کوشش کروں گا۔ دوسرے روز حسب وعدہ مولوی صاحب کی خدمت میں پہنچا۔ اس وقت مولوی صاحب صحن میں چارپائی پر بیٹھے تھے۔ مرزا محمود صاحب ان کے پاس تشریف فرما تھے۔ علیک سلیک کے بعد مولوی صاحب کمال مہربانی سے کھڑے ہو گئے۔ مصافحہ کیا، مرزا محمود قادیانی چارپائی کی پائنتی کی طرف ہو گئے اور مولوی صاحب نے مجھے اپنے پاس بٹھالیا۔ باقی اکابرین و حاضرین نیچے فرش پر بیٹھے تھے۔ مزاج پرسی کے بعد مولوی صاحب نے فرمایا آپ کو قادیان میں آئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟ اور یہاں کسی قسم کی کوئی تکلیف تو نہیں؟ اگر کوئی تکلیف ہو تو بلا تامل بتادو کہ اسے رفع کیا جا سکے۔

میں نے بعد از شکریہ عرض کی کہ میرے دو عزیز یہاں ہی رہتے ہیں۔ ایک تو برادر محترم سید شاہ چراغ صاحب، دوسرے میرے بزرگ محمد علی شاہ صاحب، چونکہ یہ دو گھر میرے اپنے ہی ہیں، اس لیے میں اپنے آپ کو اپنے گھر میں ہی سمجھتا ہوں۔ مولوی صاحب کو محمد علی شاہ صاحب کا سن کر مسرت ہوئی کیونکہ وہ ان کے خاص مریدین سے تھے۔

مولوی نورالدین قادیانی کا درس

مکمل صحت ہونے پر مولوی صاحب نے حسب دستور درس قرآن حکیم شروع کیا۔ میرے مہربان دوست مجھے ہر روز مجبور کرتے کہ کسی روز مولوی کا درس سنوں۔ میں نے انھیں ہر چند ٹالا کہ میں بڑے بڑے علماء کا درس سن چکا ہوں اور دوسرے مجھے فرصت بھی کم ہے۔ مگر ان کے زیادہ اصرار پر ایک روز میں ان کے ہمراہ درس میں شامل ہوا۔ اس وقت مولوی صاحب حضرت زکریا علیہ السلام کا بیان فرما رہے تھے کہ جب حضرت زکریا علیہ السلام بوڑھے ہو گئے تو دعا کی کہ یاالٰہی میں بوڑھا ہو گیا ہوں، قویٰ کمزور ہو چکے ہیں، ہڈیاں سست پڑ گئی ہیں اور سر کے بال بھی سفید ہو چکے ہیں۔ تو اپنے رحم و کرم سے مجھے فرزند عطا فرما جو میرا اور یعقوب کی اولاد کا وارث ہو۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم دن رات تسبیح و تحلیل کرو۔ میں تم کو فرزند عطا کروں گا، اس کا نام یحییٰ علیہ السلام رکھنا اور اس نام کا پہلے کوئی پیغمبر نہیں گزرا۔ چنانچہ مولوی صاحب نے یہ تمام قصہ بیان کر کے فرمایا کہ میری طرف دیکھو کہ جب میں جوان تھا مجھے اولادِ نرینہ نصیب نہ ہوئی مگر اب بڑھاپے میں مرزا قادیانی پر ایمان لا کر تسبیح و تحلیل کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے مجھے دو فرزند عطا فرمائے۔ مولوی صاحب نے اسے مرزا قادیانی کا معجزہ ثابت کیا، جس سے تمام حاضرین کے ایمان میں ایک تازگی محسوس ہونے لگی اور سب جھومنے لگے۔ میں نے اپنے ہمراہی سے کہا کہ قرآن حکیم میں صاف الفاظ ہیں کہ ”کانت امراتی عاقر“ (میری بیوی بھی بانجھ ہے) مگر مولوی صاحب کی اہلیہ تو ماشاء اللہ ابھی نوعمر ہیں۔ اگر اس کا بانجھ ہونا تم ثابت کر دو تو میں آج ہی تمہارا ہم خیال ہونے کو تیار ہوں۔ مگر ایسا ثابت کون کرتا، اس کا مجھے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ پھر انھوں نے درس میں جانے کے متعلق کبھی گفتگو نہ کی اور مجھے معلوم ہو گیا کہ مولوی صاحب کس قدر غلط بیانیوں سے کام لیتے ہیں اور یہ کہ ان کو اپنے معتقدین کی کم علمی اور خوش فہمی کا خوب اندازہ ہے۔

قادیان میں پہلی نمازِ جمعہ

جمعہ کے روز جب میں مسلمانوں کی مسجد میں نماز جمعہ کی ادائیگی کے لیے گیا، تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ جمعہ مسجد میں صرف پانچ نمازی ہیں اور قاضی عنایت اللہ صاحب جو اس مسجد کے امام ہیں، مولوی عبدالکریم سیالکوٹی کے مطبوعہ خطبہ کے اشعار پڑھ رہے ہیں۔ نماز ختم ہونے پر ایک بڑے میاں کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ بھائیو! جب تک دس نمازی نہ ہوں نماز جمعہ جائز نہیں۔ میں دو تین جمعہ سے یہی حالت دیکھ رہا ہوں۔ بہتر ہے کہ آئندہ سے نماز جمعہ ملتوی کر دو (یہ بڑے میاں مرزا سلطان احمد افسر مال کے منشی تھے، جو مرزا قادیانی کی پہلی بیوی سے تھے اور مرزا قادیانی پر

عقیدہ نہ رکھتے تھے۔ ان کے مرنے کے بعد یہ مشہور کیا گیا کہ آخر وقت وہ مرزا پر ایمان لے آئے تھے۔ واللہ اعلم)

میں نے بڑے میاں سے عرض کیا کہ ہم سے تو حقہ نوش بھنگی اور شرابی ہی اچھے ہیں کہ چندروز میں کئی اپنے ہم خیال پیدا کر لیتے ہیں۔ کیا ہم میں سے ہر شخص دو دو چار چار نمازیوں کو ساتھ نہیں لاسکتا کہ تعداد پوری ہو جائے۔ اس وقت قادیان میں سوائے ڈاکخانہ کے کوئی دوسرا سرکاری محکمہ نہ تھا۔ نمازیوں کے لیے میری یہ عرض گویا ایک سرکاری حکم یا ان کی حوصلہ افزائی کا سبب ہوا کیونکہ قادیان کے غریب مسلمانوں پر قادیانی بھائیوں نے مختلف قسم کے دباؤ ڈال کر انھیں قریب قریب بے حس کر دیا ہوا تھا۔ الحمدللہ کہ میری یہ آواز ضائع نہ گئی۔ اگلے جمعہ چھ سات آدمی میں ہمراہ لے گیا۔ باقی مقتدی بھی چند ایک مسلمانوں کو ہمراہ لے آئے۔ میں نے قاضی عنایت اللہ صاحب امام مسجد کی اجازت سے وہاں جمعہ میں ختم نبوت اور دعویٰ مسیحیت پر تقریر کا سلسلہ شروع کر دیا۔

تیسرے چوتھے جمعہ میں مسجد نمازیوں سے کھچا کھچ بھر گئی۔ اہل حدیث بھائی جو علیحدہ مسجد میں جمعہ پڑھا کرتے تھے وہ بھی سب ادھر آنا شروع ہو گئے کیونکہ میں فروعی مسائل میں نہ پڑتا تھا۔ چند جمعوں کے بعد یہ حالت ہو گئی کہ ہمیں مسجد کی توسیع کرنی پڑی اگرچہ اس میں بھی قادیانی دوستوں نے بہت سی رکاوٹیں پیدا کیں۔ مگر الحمدللہ کہ مسلمانوں کو اس میں کامیابی ہوئی۔

نانا جان

مرزا غلام احمد قادیانی کے خسر میر ناصر نواب عجب بامذاق انسان تھے۔ تمام قادیانی انھیں نانا جان کے لقب سے پکارتے تھے۔ اُن دنوں انھوں نے دارالضعفاء کے لیے اپنی جماعت والوں سے چندہ کی اپیل کر رکھی تھی اور باہر سے چندہ کافی مقدار میں آ رہا تھا۔ ڈاک کی تقسیم کے وقت آپ بنفسِ نفیس ڈاکخانہ کی کھڑکی پر تشریف لاتے اور فرماتے کہ سائل حاضر ہے، کچھ ملے گا؟ چونکہ ڈاک خانہ کی عمارت ان کی صاحبزادی یعنی مرزا قادیانی کی بیوی کے نام پر تھی جس کا کرایہ بھی وہ خود اپنے دستخطوں سے وصول کیا کرتیں تھیں اس لیے میں بھی اکثر یہ کہہ دیا کرتا تھا کہ آپ تو ڈاک خانہ کے مالک ہیں۔ ایک دفعہ آپ نے ایک شعر بطور نصیحت مجھے لکھوایا، جو میں نے نہ ان سے پہلے کسی سے سنا تھا اور نہ ان کے بعد، جس سے اس جماعت کی ذہنیت پورے طور پر نمایاں ہوتی ہے۔ وہ شعر یہ ہے ؎

خوک باش و خرس باش یا سگِ مردار باش
ہرچہ خواہی باش لیکن اندکے زر دار باش

یعنی سور بن یا ریچھ بن اور کتے کی طرح مردار بن۔ جو کچھ دل چاہے بن لیکن تھوڑا بہت زر دار ضرور ہو۔ ایک دن میں نے بھی ان سے مذاق ہی میں کہا کہ نانا جان آپ کو ضعیفوں کا فکر کیوں دامنگیر ہے۔ چندہ کافی آ رہا ہے۔ بجائے دارالضعفاء کے آپ ناصر آباد یا ناصر گنج کی بنیاد رکھیں اور یہ میری بھی ایک پیشین گوئی ہے کہ آپ اس قطعہ کا نام ان دونوں ناموں میں سے کوئی ایک رکھیں گے اور آپ ہی اس کے والد مالک ہوں گے۔ چنانچہ بعد میں ایسا ہی ہوا۔

ماسٹر محمد یوسف صاحب ایڈیٹر "نور"

ماسٹر صاحب (جہاں کہیں بھی وہ ہوں، اللہ انھیں خوش رکھے) بڑے خوش اخلاق، سنجیدہ مزاج اور صاف گو آدمی تھے۔ میری زیادہ تر نشست و برخاست ان کے ساتھ ہی تھی۔ صبح و شام اکثر سیر کو اکٹھے ہی جایا کرتے تھے۔ نانا جان اکثر انھیں کہتے کہ یوسف تمھیں سیر کے لیے کوئی اور دوست نہیں ملتا؟ جس کا جواب وہ اکثر یہی دیتے کہ آپ کو یہ برا کیوں محسوس ہوتا ہے؟ آخر سب پوسٹ ماسٹر میں کون سا عیب ہے کہ آپ مجھے اس سے ملنے سے منع کرتے ہیں۔ بہر حال وہ کسی نہ کسی طریقے سے انھیں خاموش کر دیتے۔ ماسٹر صاحب کی پہلی بیوی مولوی نورالدین صاحب کی ایک پروردہ لڑکی تھی۔ میری اہلیہ اور ماسٹر صاحب کی بیوی میں بھی آپس میں خاصی انسیت تھی۔ جب مرحومہ کا آخری وقت قریب تھا تو مرزا قادیانی کی بیوی تشریف لائیں اور کچھ اس انداز سے مرحومہ کو کہا کہ کیوں گھبرا رہی ہو تم ابھی نہیں مرتی۔ میری اہلیہ اور مرحومہ دونوں کو یہ بات خاص طور پر بری محسوس ہوئی۔ چنانچہ چند ہی منٹ کے بعد وہ اس دارفانی سے رخصت ہوگئی۔ میری اہلیہ اس کے بچوں آصف، موسیٰ اور آمنہ کو گھر لے آئی کہ ان کا دل بچوں میں بہلا رہے اور وہ والدہ کی مفارقت کو محسوس نہ کریں۔

مولوی نورالدین قادیانی کا زنانہ درس

مولوی صاحب مستورات کو بھی درسِ قرآن دیا کرتے، اس کے بعد وہ لیٹ جاتے اور مستورات ان کی ٹانگیں دباتیں اور ساتھ ہی خاوندوں کی شکایات شروع کر دیتیں۔ اس پر مولوی صاحب ان کے خاوندوں کو بلوا کر اکثر تو اپنے موعظہ و پند سے سمجھاتے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ عورتیں تمہاری امانتیں ہیں، ان کا خیال رکھو اور کبھی کبھار ڈانٹ ڈپٹ سے بھی کام لیتے۔ چنانچہ ایک دن ماسٹر صاحب کی بھی باری آئی۔ انھیں بلوا کر فرمایا کہ دیکھو میں نے تمھیں اپنی لڑکی دی ہے، مگر تم اس کی قدر نہیں کرتے اور اسے طرح طرح کی تکلیفیں دیتے ہو مگر ماسٹر صاحب نے اپنی صاف گوئی سے کام لیا اور کہا کہ حضرت آپ میاں بیوی کے معاملات میں دخل نہ دیا

کریں۔ عورتیں اکثر غلط بیانی سے کام لے کر ہم کو آپ سے برا بنواتی ہیں۔ اس سے ہمارے تعلقات اور بھی خراب ہو جاتے ہیں۔ اگر واقعی آپ میری بیوی کو اپنی لڑکی ہی سمجھتے ہیں، تو آپ فرما دیں کہ جتنا جہیز آپ نے اپنی لڑکی کو دیا تھا، کیا اسے بھی اسی قدر ہی دیا ہے؟ مرزا قادیانی کو تو ہم نے مسیح موعود تسلیم کیا۔ مگر خلافت تو ہماری قائم کردہ ہے، خدا کی طرف سے نہیں۔ چنانچہ اس کے بعد مولوی صاحب نے ان کے کسی معاملہ میں دخل نہ دیا۔ اور اس کے بعد ان میاں بیوی کے تعلقات بھی آپس میں بہت اچھے رہے۔

اخبارات

قادیان میں اخبارات تو کثرت سے نکلتے تھے۔ ان کا عشر عشیر بھی تمام ضلع گورداسپور سے نہ نکلتا تھا اور یہی اخبارات اور رسالے مرزائیوں کو تبلیغ کا کام دیتے ہیں۔ وہ لوگ جن کو پہلے دین کا کچھ علم نہیں ہوتا، وہ ان کو پڑھ کر اکثر اس جماعت میں شامل ہو جاتے۔ میرے ایک مہربان شیخ یعقوب علی جو کسی زمانہ میں امرتسر میں وکیل اخبار میں کام کیا کرتے تھے، انھوں نے قادیان جا کر الحکم اخبار جاری کیا اور یہی ان کا سب سے پہلا اور معتبر اخبار تھا۔ اس کے صفحہ اوّل پر یہ شعر تحریر ہوتا تھا ؎

بیا در بزم رنداں تا بہ بینی عالمے دیگر
بہشتے دیگر و ابلیس دیگر آدمے دیگر

بجائے بہشت کے بہشتی مقبرہ تو قادیان میں میں نے بھی دیکھا۔ باقی ابلیس و آدم یہ شیخ صاحب بہتر جانتے ہوں گے۔ یا شاید قارئین اس کا کچھ اندازہ کر سکیں۔ بہر کیف وہاں کا باوا آدم نرالا ہی تھا۔ مرزا قادیانی پیغمبر ہوئے۔ مولوی نور الدین قادیانی خلیفۂ اوّل ابوبکر ثانی مرزا بشیر الدین محمود فضل عمر خلیفۂ ثانی۔ اب دیکھیں خلیفہ سوئم اور چہارم کون ہوتا ہے اور جنگِ جمل کب شروع ہوتی ہے۔

حرمتِ رمضان شریف اور قادیان

مرزا قادیانی کا قول ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ قادیانی خاندانِ نبوت کا یہ حال تھا کہ نانا جان تو ہمیشہ رمضان شریف میں مسافر بن جاتے اور چندہ وصول کرنے کے لیے باہر چلے جاتے۔ مرزا قادیانی اور ان کی اہلیہ محترمہ اتفاق سے اسی مہینہ میں بیمار ہو جاتے۔ کبھی آشوبِ چشم کی شکایت ہو جاتی۔ کبھی دردِ سر ہو جاتا اور کسی دن دو چار چھینکیں آ جاتیں تو مولوی محمد عارف صاحب امام مسجد اقصیٰ کو آرام ہو جاتا کہ دونوں وقت مرغن غذا میسر ہو جاتی۔ ادھر دھرت رام بالائی کی برف والا دعائیں دیتا کہ نبوت خانہ میں اس کی برف کی خوب مانگ رہتی اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں

کیونکہ خود مرزا قادیانی بھی روزہ تو کجا مسافری میں رمضان شریف کا احترام تک بھی نہ فرماتے تھے۔ چنانچہ امرتسر میں رمضان مبارک کے مہینے میں تقریر فرماتے ہوئے پانی کا گلاس چڑھا جانا ایک تاریخی واقعہ ہے جب خود جناب مرزا قادیانی کا یہ حال تھا تو اہل بیت اور امتی تو جو کچھ بھی کریں جائز ہے۔

مولانا محمد علی صاحب ایم۔اے

مولانا محمد علی صاحب جو کبھی ریاضی کے پروفیسر تھے، قادیان میں آ کر اور مولوی نورالدین قادیانی کے درس میں باقاعدہ شامل ہوتے رہنے کے باعث اب مولانا کا لقب حاصل کر چکے تھے۔ پہلے تو ریویو آف ریلیجنز (Review of Religions) کے ایڈیٹر رہے۔ پھر قرآن شریف کا انگریزی ترجمہ شروع کیا۔ ان دنوں وہ مولوی نورالدین قادیانی کے درس کے نوٹ چند انگریزوں اور مسلمانوں کے جو قرآن کریم کے انگریزی میں ترجمے کیے تھے، ان کی اور مختلف قسم کی ڈکشنریوں کی مدد سے ایک علیحدہ کوٹھی میں جو سکول کے پاس تھی، ترجمہ میں مصروف تھے۔ مولوی صاحب نے اپنے ترجمہ میں معجزات انبیاء کا جا بجا انکار کیا ہے حالانکہ خود مرزا قادیانی بھی تمام انبیاء کے معجزات کے قائل تھے اور ان کے اس قسم کے اشعار بھی موجود ہیں کہ معجزات انبیاء کا جو انکار کرے وہ اشقیاء سے ہے۔ چنانچہ مولوی صاحب نے حضرت ایوب علیہ السلام کے متعلق لکھا ہے کہ ارکض برجلک کے معنی گھوڑے کو ایڑی لگانا ہے۔ یعنی خدا نے حضرت ایوب علیہ السلام کو حکم دیا کہ اپنے گھوڑے کو ایڑی لگاؤ، آگے چل کر پانی ملے گا۔ حالانکہ حضرت ایوب علیہ السلام جب اپنے امتحان میں ثابت قدم رہے تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ "ارکض برجلک" یعنی اپنی ایڑیاں زمین پر مارو، یہاں سے پانی نکلے گا" جو ٹھنڈا ہوگا اور پینے اور غسل کے کام آئے گا۔ چنانچہ مولوی صاحب نے یہاں بھی اپنا رنگ نہ چھوڑا۔ حضرت موسیٰ کے عبور دریا کے معجزہ کی نسبت تحریر کرتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام فن انجینئری میں ماہر تھے۔ انھیں اسی علم سے معلوم ہوگیا کہ اس جگہ دریا میں پانی کم ہے۔ وہاں سے اپنے ہمرائیوں کو لے کر دریا عبور کر گئے۔ مگر فرعون کو چونکہ اس کا علم نہ تھا، اس نے اپنے اور اپنے لشکر کو گہرے پانی میں ڈال دیا اور غرق ہوگیا۔

به بیں تفاوف راہ از کجاست تا بکجا

مولوی محمد علی صاحب تو ترجمہ میں مصروف رہے اور مرزا محمود احمد قادیانی جو کچھ عرصہ مصر وغیرہ میں گزار آئے تھے، جمعہ کو خطبہ دیا کرتے اور چونکہ وہ ریویو آف ریلیجنز کے ایڈیٹر بھی رہ چکے تھے، اس لیے انھیں تقریر و تحریر میں خاصی دسترس حاصل ہو چکی تھی۔ اس کے برعکس مولوی صاحب ایک قسم کے گوشہ نشین ہی ہو چکے تھے۔ مولانا کا خیال تھا کہ مولوی نورالدین قادیانی کے بعد وہ

خلافت کی گدی پر متمکن ہوں گے، کیونکہ ایک خاص پارٹی ان کی پشت پر تھی۔ مگر ان کی گوشہ نشینی، قرآن کا ترجمہ اور دفتر محاسب کی منیجری ان کے کسی کام نہ آئی اور مرزا محمود احمد قادیانی اپنے زورِ تقریر وتحریر نیز نانا جان کی فراست وسیاست کے باعث اپنا کام نکال لے گئے۔ اس کا مفصل ذکر بعد میں آئے گا۔

قادیان سے میرا تبادلہ

چونکہ میں قادیان میں عارضی طور پر لگا ہوا تھا، اس لیے چھ سات ماہ کے بعد میرا تبادلہ پھر امرتسر کا ہوگیا۔

بعثتِ ثانی

چونکہ قادیان میں میرے کام سے افسر بھی خوش تھے، اور قادیان کے اکثر اصحاب سے میرے تعلقات بھی اچھے تھے، اس لیے 1916ء میں جب قادیان کی جگہ خالی ہوئی تو مجھے مستقل طور پر وہاں جانے کا حکم ہوا۔ یعنی چھ سات سال کے انتقال کے بعد قادیان میں پھر بعثتِ ثانی ہوئی۔ مولوی نورالدین قادیانی وفات پا چکے تھے اور مرزا محمود تختِ خلافت پر متمکن تھے۔ ان کے خلافت حاصل کرنے کا قصہ بھی لطف سے خالی نہیں۔ نانا جان جو پرانے سیاستدان اور دور اندیش آدمی تھے، انھوں نے مولوی محمد احسن صاحب امروہوی کو ان کے لڑکے محمد یعقوب کی شادی پر کافی روپیہ بطور قرض دے کر اپنا مرہون احسان کر رکھا تھا کہ یہ وقتِ ضرورت کام آئے گا کیونکہ مرزا قادیانی کا الہام تھا کہ ''آسمان سے میرا نزول دو فرشتوں کے کندھوں پر ہوا ہے جن میں سے ایک مولوی نورالدین اور دوسرا مولوی محمد احسن امروہوی ہے'' اور یہ تھا بھی درست کیونکہ مرزا قادیانی کا نزول و صعود ان دونوں مولویوں کا مرہون منت ہے۔ ورنہ نبوت تو کجا وہ ایک معمولی عالم کی حیثیت بھی نہ رکھتے تھے۔ خیر! مولوی نورالدین صاحب کے انتقال کے بعد جب خلافت کا جھگڑا شروع ہوا تو لاہوری پارٹی مولوی محمد علی صاحب کے حق میں تھی اور جو لوگ میاں محمود احمد کے خطبات وغیرہ سن چکے تھے، وہ میاں صاحب کے حق میں تھے۔ اس وقت نانا جان نے مولوی محمد احسن صاحب کو اپنا احسان جتایا اور مدد کی درخواست کی۔ مولانا محمد احسن صاحب نے غنیمت سمجھا کہ اس صورت میں قرض کی بلا تو سر سے ٹلے گی۔ چنانچہ وہ ایک سبز رنگ کا کپڑا لے کر جلسہ عام میں تشریف لے آئے اور فرمایا کہ بھائیو! تم کو مبارک ہو، رات حضرت مرزا قادیانی نے مجھے یہ فرمایا ہے کہ یہ سبز دستار میاں محمود احمد کے سر پر باندھ دو۔ وہ ہی ہمارا جانشین ہوگا۔ اب کون تھا جو اس فرشتہ کی بات کا انکار کرتا۔ مولوی محمد علی صاحب اور ان کے رفقاء کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ حیران تھے یہ کیا ہوگیا مگر

اے زر تو خدا نہیں ولے بخدا
ستار العیوب و قاضی الحاجاتی

نانا جان کی دی ہوئی رقم کام کرگئی۔ اب مولوی محمد علی صاحب کو اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا کہ اپنے رفقاء کو ساتھ لے کر قادیان سے رخصت ہوتے۔ چنانچہ وہ دفتر محاسب کے کچھ کاغذات اور کچھ روپیہ لے کر لاہور پہنچے اور امیر المومنین کا لقب حاصل کر کے لاہور کو اپنا دارالخلافہ بنایا اور وہاں سے اخبار پیغامِ صلح جاری کر کے اپنا علیحدہ سلسلہ شروع کر لیا۔ مرزا قادیانی کی نبوت کا انکار کر کے انھیں مجدد ثابت کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ نانا جان کی سیاست سے مرزا محمود احمد قادیانی کے لیے قادیان کا میدان صاف ہو گیا۔ اب دونوں پارٹیوں میں جنگِ زرگری جاری ہے۔ اس دفعہ میرے قادیان آنے پر یہاں کا نقشہ بدل چکا تھا۔ مولوی نورالدین کی وفات کے بعد مرزا محمود احمد ہز ہولی نس کا خطاب حاصل کر کے تختِ خلافت پر جلوہ افروز ہو چکے تھے۔ گھر سے باہر نکلنا موقوف ہو چکا تھا۔ کسی غیر آدمی کو بغیر اجازت ملنا دشوار تھا، اور پوری شانِ خلافت سے قادیان میں حکومت کر رہے تھے۔ میرے جانے پر انھوں نے میرے پرانے رفیق ماسٹر محمد یوسف کو بھیج کر مجھے بلوایا۔ ہم دونوں وہاں پہنچے۔ مرزا محمود قادیانی مکان کی دوسری منزل پر تشریف فرما تھے۔ علیک سلیک کے بعد آپ نے فرمایا: میں نے سنا ہے کہ آپ پہلے بھی یہاں رہ چکے ہیں۔ میں اس تجاہلِ عارفانہ پر حیران تھا کیونکہ مرزا قادیانی صاحبزادگی کی حالت میں کئی مرتبہ ڈاک خانہ تشریف لائے اور کئی کئی منٹ تک میرے پاس بیٹھے تھے۔ مگر اب آپ کی کچھ عجب ہی شان تھی۔ پہلی ہی بات جو آپ نے مجھ سے دریافت کی، یہ تھی کہ کیا قادیان میں بجائے ایک دفعہ کے ڈاک دو دفعہ نہیں آ سکتی؟ میں نے جواب دیا کہ ڈاک کا ٹھیکیدار اب 80 روپے لیتا ہے۔ امید نہیں محکمہ اور خرچ برداشت کر سکے۔ دوسری بات یہ دریافت کی کہ کیا یہاں تار گھر نہیں بن سکتا۔ میں نے کہا کہ آپ کی تمام مہینے میں بمشکل دس بارہ تاریں آتی ہیں، مگر آپ محکمہ کو لکھ دیں شاید وہ دونوں باتوں کا انتظام کر دیں۔ ان دو باتوں کے علاوہ آپ نے تیسری بات کوئی نہیں کی۔ چنانچہ میں اور ماسٹر محمد یوسف صاحب واپس آئے۔ راستہ میں میں نے ماسٹر صاحب سے کہا کہ آپ مولوی نورالدین قادیانی اور مرزا محمود قادیانی کی ملاقات کا اندازہ کریں کہ کتنا فرق ہے۔ انھوں نے جتنی باتیں کی تھیں سب میرے فائدہ کی تھیں اور مرزا قادیانی نے سوائے اپنے مطلب کی بات کے کوئی اور بات ہی نہیں کی۔ مرزا قادیانی ایک بادشاہ کی سی زندگی بسر کر رہے تھے۔ صرف بعد دوپہر مسجد میں درس دینے آتے، اس میں قصبہ کی جماعت کے آدمی مدرسہ دینیات اور ہائی سکول کے طلباء شامل ہوتے۔ سکول کے طلباء اکثر ایک ہندو سے مٹھائی وغیرہ خرید کرتے تھے اور کئی ایک کا ادھار بھی چلتا تھا۔ چنانچہ ایک روز حلوائی نے کسی طالب علم سے

اپنے ادھار کا تقاضا کیا۔ طالب علم بھی سختی سے پیش آیا۔ جانبین کے حمایتی اکٹھے ہو گئے۔ آپس میں لڑائی ہوئی، جس سے دونوں طرف کے چند آدمی زخمی ہوئے۔ اطلاع میاں صاحب تک پہنچی۔ میاں صاحب نے فوراً حکم جاری فرما دیا کہ کوئی مرزائی کسی غیر مرزائی سے سودا نہ خریدے اور اگر کوئی سودا خریدتا ہوا پایا گیا تو اسے پانچ روپیہ جرمانہ کیا جائے گا۔ اب چونکہ ان کی جماعت کی اتنی دوکانیں نہ تھیں کہ ان کی ضروریات پوری ہوسکتیں اور ادھر میاں صاحب کے نادر شاہی حکم سے سرتابی کی جرأت نہ تھی۔ لہٰذا وہ چوری چھپے اپنے غیر مرزائی دوستوں کے ذریعے سے اشیاء منگوا کر ضرورت پوری کرتے۔ میرے اکثر دوست میرے پاس آتے اور میں انھیں بازار سے اشیاء منگوا دیتا۔

دفتر محاسب میں چٹھی رساں کو زدوکوب

جمعہ کے روز قادیان کے دفاتر اور خصوصاً دفتر محاسب دو بجے تک بند رہتا تھا۔ دفتر والوں نے اپنے طور پر چٹھی رساں سے فیصلہ کر رکھا تھا کہ وہ دفتر کے منی آرڈر وہاں چھوڑ آتا اور دو ڈھائی بجے جا کر واپس لے آتا۔ اکثر اوقات دفتر کا کلرک دیر سے آتا تو چٹھی رساں کی واپسی میں تاخیر ہو جاتی جس کی وجہ سے ہمیں بھی دقت ہوتی۔ چنانچہ میں نے دو تین دفعہ چٹھی رساں کو تنبیہ کی کہ وقت پر واپسی دیا کرے۔ ایک جمعہ کو وہ تقریباً ساڑھے تین بجے روتا ہوا دفتر میں آیا اور بتایا کہ کلرک دفتر محاسب منی آرڈروں کو واپسی میں دیر کرتا ہے۔ آج میں نے اسے جلد واپس کرنے کو کہا، جس پر اس نے مجھے دفتر میں سب سٹاف کے روبرو مارا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اس دفتر کا کوئی آدمی تمہاری شہادت دے سکتا ہے؟ اس نے کہا مجھے امید نہیں کہ اس کلرک کے خلاف کوئی سچی شہادت بھی دے۔ میں نے اس سے تحریری بیان لے کر ناظم دفتر محاسب کو بھیج دیا۔ چونکہ محکمانہ کارروائی تو بغیر شہادت کے فضول تھی۔ میں نے یہ سوچا کہ ان کی دیانت وتقویٰ کا ہی امتحان ہو جائے گا۔ ڈاکٹر رشیدالدین مرزا محمود قادیانی کے خسر ان دنوں دفتر کے انچارج تھے۔ بیان کے ساتھ میں نے یہ بھی لکھ دیا کہ جب آپ اس معاملہ کی تحقیقات کریں تو چٹھی رساں کو اور مجھے بھی بلوالیں۔ چند روز تک اس کا کوئی جواب نہ آیا۔ میری دوبارہ یاددہانی پر مجھے جواب ملا کہ میں خود تفتیش کر کے جواب دوں گا، اور تم یہ بتلاؤ کہ تم اس مقدمے میں کس حیثیت سے پیش ہو سکتے ہو؟ نہ ہی تو تم موقع کے گواہ ہو اور نہ ہی کوئی قانون دان کہ چٹھی رساں کی وکالت کر سکو لہٰذا تمھارے آنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس تحریر کے لہجہ سے میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ سرکاری عدالتوں میں بھی اتنی سختی سے کام نہیں لیا جاتا کہ سوائے گواہوں اور وکیلوں کے کوئی کمرۂ عدالت میں نہ جائے۔ مگر یہ قادیانی عدالت تھی میں نے اس کا جواب ''خاموشی'' سے دیا اور غریب چٹھی رساں کا بھی کچھ نہ بنا۔

قادیان میں انجمن حمایت الاسلام

اس دفعہ بھی مسجد میں جمعہ میں ہی پڑھایا کرتا اور مسجد میں بھی اب خاصی رونق ہو جاتی تھی۔ مسلمانوں میں بیداری کے کچھ آثار پیدا ہو چکے تھے۔ ہم نے وہاں انجمن حمایت الاسلام کی بنیاد ڈالی۔ قاضی عنایت اللہ صاحب صدر مقرر ہوئے۔ مہرالدین سیکرٹری علیٰ ہذا القیاس خزانچی وغیرہ۔ عیدالاضحیٰ کا موقع قریب تھا۔ خیال ہوا کہ اس موقعہ پر چندہ اکٹھا کر کے اپنے علماء کو بلوا کر جلسہ کیا جائے کہ وہ ہمیں ہمارے صحیح عقائد سے آگاہ کریں۔ عید کے روز نصف شب سے بارش ہوئی اور متواتر صبح تک ہوتی رہی۔ ہماری مسجد چھوٹی تھی، جس میں عید کی نماز کی گنجائش مشکل تھی۔ مرزا محمود قادیانی نے بارش کی وجہ سے بجائے اس ہماری عیدگاہ کے جس پر انھوں نے جابرانہ قبضہ کر رکھا تھا، عید مسجد اقصیٰ میں پڑھائی۔ ان کا عید کی نماز پڑھنا تھا کہ زور کی آندھی آئی، بادل چھٹ گئے موسم نہایت خوشگوار ہو گیا۔ لہٰذا ہم نے اسی عیدگاہ میں نماز پڑھی۔ بیرون جات سے اس قدر نمازی اکٹھے ہوئے کہ مسلمانوں کا اتنا ہجوم قادیان میں اس سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ چنانچہ میں نے عید کی نماز پڑھائی اور انجمن کے مقاصد بیان کر کے چندہ کی اپیل کی۔ قریباً ایک سو روپیہ تو وہاں اکٹھا ہو گیا۔ چند روز کی کوشش سے تقریباً چار صد روپیہ جمع ہو گیا۔ حسن اتفاق سے گورداسپور میں، ایک جلسہ منعقد ہو رہا تھا، جس میں علاوہ علمائے کرام کے اور بزرگان دین بھی شمولیت کر رہے تھے۔ مجھے احباب نے مجبور کیا کہ میں ان کے ساتھ وہاں چلوں اور وہیں قادیان کے جلسہ کے متعلق بھی ان لوگوں سے مشورہ کر کے ان کو دعوت دی جائے۔ میں نے محکمہ سے پانچ روز کی رخصت لی اور دوستوں کے ساتھ گورداسپور پہنچا، وہاں پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ میرے محسن و کرم فرما حاجی حرمین الشریفین جناب پیر جماعت علی شاہ صاحب علی پوری بھی تشریف فرما ہیں۔ جب میں امرتسر میں دسویں جماعت میں تعلیم پاتا تھا، میرے بزرگ اور رشتہ دار مولانا سید احمد علی صاحب مسلم ہائی سکول میں شعبہ دینیات کے مدرسِ اعلیٰ تھے۔ ان کے تعلقات حضرت موصوف سے بہت گہرے تھے۔ اُن کی وجہ سے حضرت صاحب مجھ سے خاص انس رکھتے تھے، بلکہ جب کبھی کہیں دعوت پر تشریف لے جاتے تو اپنے خلیفہ خیر شاہ صاحب کو بھیج کر مجھے بلوا لیا کرتے تھے۔ غرضیکہ ان کی گورداسپور میں تشریف آوری کا سن کر مجھے یک گونہ اطمینان ہو گیا۔ نمازِ عصر کا وقت تھا، آپ مسجد حجاماں میں تشریف فرما تھے۔ میں اور میرے ساتھی ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ مجھے عرصہ کے بعد دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور پوچھا کہ آج کل کہاں ہو؟ میں نے عرض کیا کہ قادیان میں۔ مسکرا کر فرمایا کہیں مرزائی تو نہیں ہو گئے؟ میں نے عرض کی ابھی سوچ رہا ہوں۔ آپ فرماتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ آسمان سے ابھی اتریں گے اور وہاں

عیسیٰ موجود ہے۔ نقد کو چھوڑ ادھار کون لے۔ خیر میں نے ان سے عرض حال کی۔ آپ نے اپنی حاضری کی تو معذرت فرمائی اور اسی وقت اپنے چند خلفاء کو تحریر کر دیا کہ جس وقت قادیان سے انجمن حمایت الاسلام کی دعوت پہنچے وہ ضرور وہاں پہنچیں اور جلسہ کی کامیابی کے لیے دعا فرمائی۔ وہاں سے ہم حضرت مولانا سراج الحق صاحب کی قیام گاہ پر گئے۔ حضرت سراج الحق صاحب سے بھی میرے نیاز مندانہ تعلقات تھے۔ جب آپ کے والد صاحب بٹالہ میں تحصیلدار تھے تو آپ کے چھوٹے بھائی اور میں ہم جماعت تھے اور ہم دونوں اکثر ان کے حلقۂ ذکر واذکار میں شامل ہوتے تھے۔ اس لیے وہ مجھے بھی اپنے بھائی جیسا ہی سمجھتے تھے۔ چنانچہ آپ نے بھی مولوی حامد علی صاحب گمٹالوی اور ایک مولوی صاحب جو وہاں موجود تھے، انھیں تاکید فرمائی اور مولوی نواب دین صاحب کو کہلوا بھیجا کہ قادیان سے اطلاع آنے پر وہ شاملِ جلسہ ہوں۔ گورداسپور سے فارغ ہو کر میں امرتسر پہنچا اور اپنے محسن و مربی استاذی حاجی الحرمین الشریفین جناب مولانا مولوی نور احمد صاحب نور اللہ مرقدہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت مولانا قادیان میں جلسہ کا سن کر بہت خوش ہوئے اور فرمایا اللہ تعالیٰ یہ نیک کام تم سے لینا چاہتے ہیں۔ میں نے کچھ رقم بطور کرایہ پیش کی۔ آپ نے فرمایا عزیز تمھیں معلوم ہے کہ میں خود صاحب زکوٰۃ ہوں۔ میں صرف اس نیت سے وہاں جانا چاہتا ہوں کہ شاید میری وعظ و نصیحت سے کوئی راہِ راست پر آ جائے تو میری بخشش کا باعث ہو۔ پھر آپ نے فرمایا کہ اب مولوی ثناء اللہ صاحب کے پاس جاؤ۔ میرا سلام عرض کرو اور کہنا کہ وہ اس موقع پر ضرور قادیان پہنچیں کیونکہ انھیں مرزا قادیانی کی تصانیف پر مکمل عبور ہے۔ مولوی صاحب میرے بھی مہربان تھے۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا، حضرت مولانا کا پیغام بھی دیا۔ مولوی صاحب فرمانے لگے کہ میں تو عرصہ سے اس بات کا خواہاں ہوں کہ قادیان جا کر تقریر کروں۔ عرصہ ہوا بٹالہ سے ایک پولیس کا سپاہی ساتھ لے کر وہاں گیا تھا کہ مرزا قادیانی سے کچھ بات چیت کروں مگر مجھے مرزا قادیانی نے روبرو گفتگو کا موقع نہ دیا اور صرف دو ایک باتیں تحریری دریافت کرنے کی اجازت دی۔ اور میں وہاں سے بے نیل و مرام واپس لوٹا۔ چونکہ میں نے مرزا قادیانی سے مباہلہ بھی کیا تھا، جس کی وجہ سے اب تک مرزائیوں سے میری چھیڑ چھاڑ ہے۔ مجھے خطرہ ہے کہ وہ مجھ پر حملہ نہ کریں یا کھانے میں کسی قسم کا زہر نہ ملا دیں۔ میں نے ان کی تسلی کی کہ اس بات کی ذمہ داری میں لیتا ہوں۔ آپ کے لیے کھانا میں اپنے گھر سے پکواؤں گا، بلکہ خود آپ کے ساتھ کھایا بھی کروں گا۔ امرتسر سے فارغ ہو کر اگلے دن میں لاہور گیا۔ میرے بزرگ سید احمد علی شاہ صاحب جن کا ذکر میں نے پہلے بھی کیا ہے، ان دنوں لاہور اسلامیہ کالج کے عربی کے پروفیسر اور بادشاہی مسجد کے خطیب بھی تھے۔ ان سے سارا معاملہ بیان کیا۔ آپ بہت خوش ہوئے۔ فرمایا کہ اس بہانہ سے مجھے بہشتی مقبرہ دیکھنے کا موقع بھی مل جائے گا

اور بچوں کو بھی دیکھ آؤں گا۔ وہاں سے فارغ ہو کر میں اپنے مہربان پیر بخش صاحب پوسٹل پنشنر سے ملنے چلا گیا۔ آپ اس وقت اپنے ماہوار رسالہ جو قادیان ہی کے متعلق ہوتا تھا، تحریر کرنے میں مصروف تھے، مل کر بہت خوش ہوئے اور قادیان آنے کا وعدہ کیا اور مجھے اپنا ایک رسالہ بھی دیا، جس میں مرزا قادیانی کے نکاحِ آسمانی کا سارا پول کھولا ہوا تھا۔ اس میں مرزا قادیانی کے تمام دعاوی جو محمدی بیگم کے رشتہ داروں کو تحریر کیے تھے کہ اگر محمدی بیگم کا مجھ سے نکاح کر دو گے تو تم پر یہ یہ برکات نازل ہوں گی۔ اور اگر انکار کرو گے تو عذابِ الٰہی میں گرفتار ہو گے اور اپنے فرزند سلطان احمد (جو پہلی بیوی سے تھا) اس کے نام خطوط تھے کہ اگر محمدی بیگم کے رشتہ دار محمدی بیگم کا مجھ سے نکاح نہ کریں تو تم اپنی بیوی کو (جو محمدی بیگم کی قریبی رشتہ دار تھی) طلاق دے دو، ورنہ تمھیں عاق کر دیا جائے گا۔ اور بھی بہت سے ایسے راز ہائے درونِ پردہ کا انکشاف کیا ہوا تھا۔ بہرکیف وہاں سے فارغ ہو کر میں اور محترمی مولانا احمد علی صاحب بعد دوپہر قاضی حبیب اللہ صاحب خوش نویس کے ہاں پہنچے۔ قاضی صاحب نہایت خوش مذاق آدمی تھے۔ وہاں ان کے ہاں ہی جلسہ کی تاریخ مقرر کر کے اشتہارات کی لکھائی چھپوائی اور جہاں جہاں اشتہارات ارسال کرنے تھے سب انتظامات مکمل کر کے ہم واپس گھر آئے۔ دوسرے روز ہم مولانا ظفر علی خاں صاحب کے ہاں پہنچے۔ اندر اطلاع کی گئی۔ ملازم نے ہم کو کرسی پر بٹھا دیا۔ چند منٹ بعد مولانا تشریف لائے۔ ان دنوں مولانا کی عجب شان تھی۔ نیلے رنگ کی سرج کا سوٹ زیبِ تن تھا۔ کالر ٹائی، ڈاسن کا بوٹ، بل دار مونچھیں۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کیونکہ میرے ذہن میں مولانا کے متعلق مولویوں کا سا نقشہ تھا کہ وہ جبہ و دستار سے آراستہ ہوں گے۔ بہرحال مولانا حضرت مولوی احمد علی صاحب سے خوش عقیدتی سے پیش آئے۔ مولوی صاحب نے تمام حال بیان کیا کہ اسے اپنے اخبار میں شائع کر دیں۔ مولانا نے فرمایا کہ مجھے اس کے متعلق کوئی عذر نہیں مگر میرا اخبار زمیندار چند دنوں سے بند ہے۔ اس کی جگہ میں ''صبح ستارہ'' نکال رہا ہوں اور وہ بھی سنسر ہوتا ہے۔ محکمہ سنسر میں چند مرزائی بھی ہیں۔ میں مضمون دے دوں گا، اگر کسی نے کاٹ نہ دیا۔ بہرحال میں وہاں سے واپس قادیان آیا۔ چند روز کے بعد مولانا کا مضمون جلسہ کے متعلق اخبار ستارۂ صبح میں شائع ہو گیا۔ جس کا جواب اخبار ''الفضل'' قادیان میں بدیں مضمون شائع ہوا ''کہ ہم کو اخبار ستارۂ صبح میں قادیان میں جلسہ ہونے اور یہاں علمائے کرام کے تشریف لانے کا پڑھ کر بہت خوشی ہوئی کہ ہم تبلیغ کے لیے اپنے آدمی دور دراز کے ملکوں میں بھیجتے ہیں۔ یہ تو ہماری خوش قسمتی ہو گی کہ علمائے کرام یہاں آویں اور ہم ان سے تبادلہ خیالات کریں مگر ہم نے قادیان کی گلی گلی اور کوچہ کوچہ چھان مارا ہے کہ وہ ہستیاں ہمیں نظر آویں جو قادیان میں جلسہ کرا رہی ہیں مگر شاید وہ ابھی عالم بالا میں پرورش پا رہی ہیں۔ یہ مضمون ہمارے لوگوں کی نظر سے گزرا۔ مگر ہم خاموش تھے۔

یہاں تک کہ ہمارے اشتہارات جگہ جگہ پہنچ گئے، اور قادیان کے بازاروں میں چسپاں کر دیے گئے۔ اشتہارات دیکھ کر مرزائی صاحبان کے اوسان خطا ہو گئے۔ خصوصاً جب انھوں نے مولانا ثناء اللہ صاحب، مولانا محمد ابراہیم صاحب سیالکوٹی اور ستارۂ ہند مولانا مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی کے اسمائے گرامی دیکھے۔ اب انھیں فکر لاحق ہوئی کہ کسی طرح سے یہ جلسہ بند کرا دیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے مجلس شوریٰ بلوائی جس میں یہ طے ہوا کہ چند معزز مرزائی ڈپٹی کمشنر کو ملیں اور اسے اپنی جماعت کی سرکار انگلشیہ سے وفاداری کے احسانات جتا کر اسے بتائیں کہ اس جلسہ میں ہر فرقہ کے علماء آ رہے ہیں۔ اس لیے خطرہ ہے کہ قادیان میں کسی قسم کا ہنگامہ نہ ہو جائے۔ چنانچہ مرزائیوں کا ایک وفد گورداسپور پہنچا۔ ڈپٹی کمشنر نے اس معاملہ پر غور کرنے کا وعدہ کیا۔ ہمارے آدمیوں کو بھی علم ہو گیا۔ وہ لوگ بھی گورداسپور گئے۔ ڈپٹی کمشنر نیک دل اور پادری منش انگریز تھا۔ اس سے ملے اور قادیان کے حالات سنا کر بتایا کہ ہمارا عقیدہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام آسمان پر زندہ ہیں۔ مگر مرزا قادیانی اپنے آپ کو مسیح موعود کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آسمان پر کوئی مسیح نہیں وہ مسیح میں ہی ہوں۔ ڈپٹی کمشنر نے حیران ہو کر پوچھا کہ کیا واقعی مرزا قادیانی اپنے آپ کو مسیح کہتا ہے؟ ہم نے اس کی کتابوں کے حوالے دیے اور کہا کہ ہم یہی اپنے علماء سے سننا چاہتے ہیں کہ کیا واقعی مرزا قادیانی مسیح ہیں یا جسے ہم اور آپ مانتے ہیں۔ ڈپٹی کمشنر نے بڑے وثوق سے کہا کہ تم جا کر جلسہ کرو تمھیں کوئی نہیں روک سکتا۔ قادیانیوں کو جب یہ معلوم ہوا تو ان کو اور زیادہ تشویش ہوئی۔ جلسہ کا دن قریب آ رہا تھا۔ دوبارہ ان کا وفد ڈپٹی کمشنر سے ملا۔ اور اسے بتایا کہ یہ باہر کے لوگ محض فساد کرنے کی غرض سے آ رہے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ ڈپٹی کمشنر نے کہا کہ میں نے سپرنٹنڈنٹ پولیس کو حکم دے دیا ہے کہ وہ پولیس کی کافی تعداد وہاں بھیج دے۔ اگر اس پر بھی تمھیں خطرہ ہے تو ایڈیشنل مجسٹریٹ کو بھی بھیج دوں گا اور اگر وقت ملا تو شاید میں خود بھی آؤں۔ مرزائی اپنا سا منہ لے کر واپس آ گئے۔ یہاں آ کر انھوں نے جلسہ کو ناکام بنانے کے لیے باقاعدہ پروپیگنڈا شروع کر دیا، کیونکہ انھیں خطرہ تھا کہ قرب و جوار کے مسلمانوں پر جو انھوں نے مختلف قسم کے دباؤ ڈال رکھے تھے، یہ سب لوگ ان سے باغی نہ ہو جائیں۔

جلسہ سے چند روز پہلے قادیان کے ہندوؤں اور سکھوں نے مہمانوں کے لیے اپنے رہائشی مکان خالی کر دیے اور خود دو دو تین تین کنبوں نے مل کر گزارا کیا کیونکہ ان پر بھی مرزائیوں نے بہت رعب ڈال رکھا تھا۔ سکھوں نے قادیان کے قصبہ کے قریب ہی اپنی جگہ پر جلسہ کا انتظام کیا، اور سٹیج وغیرہ بھی انھوں نے خود بنائی۔ ہمیں بٹالہ سے دریوں اور شامیانوں کا بندوبست کرنا پڑا۔ خدا خدا کر کے جلسہ کا دن آیا۔ تاریخ مقررہ سے ایک روز قبل میرے استاد حضرت مولانا نور احمد صاحب اپنے دوست میاں نظام الدین صاحب میونسپل کمشنر امرتسر اور اپنے چند شاگردوں کے ساتھ تشریف لے

آئے۔ مولوی عبدالعزیز صاحب گورداسپوری اسی روز آ گئے۔ دوسرے روز علی الصبح میاں نظام الدین صاحب کی صدارت میں جلسہ کی کارروائی شروع ہوئی۔ قادیانیوں کا اور تو کوئی جادو نہ چل سکا، جلسہ کے ایک روز پہلے انھوں نے قادیان کے اطراف میں اپنے آدمی دوڑا دیے اور مشہور کر دیا کہ جلسہ نہیں ہوگا، گورنمنٹ نے جلسہ کو روک دیا ہے۔ اس لیے حاضرین کی تعداد بہت کم تھی۔ جناب مولانا نور احمد کے ارشاد پر مولوی عبدالعزیز صاحب نے تلاوت قرآن کریم کے بعد اپنی تقریر شروع کی۔ مرزائی مذاق اڑاتے تھے کہ یہ جلسہ نہیں جلسی ہے۔ مگر جوں جوں قرب و جوار کے مسلمانوں کو علم ہوتا گیا کہ جلسہ ہو رہا ہے وہ محض مرزائیوں کی شرارت تھی تو لوگ جوق در جوق آنے شروع ہو گئے۔ دوپہر کو لاہور سے جناب مولانا احمد علی صاحب، ماسٹر پیر بخش صاحب اور تین چار اور عالم جو اُن کے دوست تھے، آ گئے۔ دھاریوال سے مولوی نواب دین صاحب، امرتسر سے مولوی ابوتراب صاحب، غرض کہ علماء کی آمد آمد شروع ہو گئی۔ جلسہ میں اس قدر رونق ہوگئی جس کی ہمیں بھی توقع نہ تھی۔ دور دور سے لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی۔ مجسٹریٹ سری کرشن، انسپکٹر و سب انسپکٹر پولیس معہ کافی عملہ کے موجود تھے۔ مرزائیوں نے کئی دفعہ جلسہ میں گڑبڑ ڈالی اور فساد کی کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ آخر انھوں نے اس خوف سے کہ کلمۂ حق کسی کے کان میں نہ پڑ جائے، اپنے لوگوں کو جلسہ میں آنے سے روکنا شروع کر دیا۔ سکول کے مسلمان طلباء کو بھی جلسہ میں شریک نہ ہونے دیا، حالانکہ تعلیم الاسلام ہائی سکول میں غیر حاضری کا کوئی جرمانہ نہ ہوتا تھا۔ مگر ایام جلسہ میں آٹھ آنہ فی غیر حاضری جرمانہ رکھ دیا۔ سقوں اور خاکروبوں کو مجبور کیا کہ وہ جلسہ کا کام نہ کریں۔ مگر ؎

دشمن چہ کند چو مہربان باشد دوست

جو اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا ہے، ہو کے ہی رہتا ہے۔ قادیان کے مسلمانوں نے سب کام بڑی مستعدی سے کیے۔ تیسرے روز علی الصبح مولوی ثناء اللہ صاحب بھی تشریف لے آئے۔ مرزا قادیانی کے مباہلہ وغیرہ کی وجہ سے لوگ اُن کو دیکھنے اور ان کی تقریر سننے کے بڑے شائق تھے۔ یہ خبر ہوا کے ساتھ قادیان کے اطراف میں پھیل گئی۔ پھر تو جلسہ گاہ میں اس قدر ہجوم تھا کہ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ بعد دوپہر مولوی صاحب نے اپنے خاص انداز میں تقریر شروع کی اور مرزا قادیانی کا الہام پیش کیا کہ میں نے دیکھا کہ زمین اور آسمان میں نے بنایا ہے۔ اُن دنوں قادیان میں ریل نہیں جاتی تھی اور بٹالہ سے قادیان تک کچی سڑک تھی۔ قادیان سے میل ڈیڑھ میل کا ٹکڑا نہایت خستہ حالت میں تھا، جس کا نام ہی پہلو توڑ سڑک رکھا ہوا تھا کہ تین روز تک پسلیاں ہی درد کرتی رہتی تھیں اور واقف کار لوگ اکثر یہ حصہ پیدل ہی طے کیا کرتے تھے۔ مولوی صاحب نے یہ الہام پیش کر کے فرمایا

کہ مجھے یہ الہام پڑھ کر تو بہت خوشی ہوئی کہ میرے ایک مہربان نے آسمان اور زمین بنائے مگر یہ دیکھ کر بہت رنج ہوا کہ قادیان کی سڑک نہ بنائی۔ شاید انھیں معلوم تھا کہ مولوی ثناء اللہ اس سڑک پر سفر کرے گا، اس لیے دانستہ ہی اسے چھوڑ دیا ہو۔ پھر مرزا محمود کے سفر ہندوستان سے واپسی پر اور دریائے گنگا کا پل عبور کرنے پر جو مضمون الفضل نے شائع کیا تھا کہ گنگا نے مرزا قادیانی کے پاؤں چومے، لہریں ان پر نثار ہوتی تھیں۔ اس پر بڑی پُرلطف تنقید کی۔ پھر نکاحِ آسمانی اور محمدی بیگم کا قصہ شروع کیا۔ مرزائی صاحبان حسبِ عادت ذرا ذرا سی بات پر مجسٹریٹ کو توجہ دلاتے کہ مولوی صاحب کو یہ بات کرنے سے روکا جائے۔ اس سے ہمارے جذبات مجروح ہوتے ہیں۔ مگر مولوی صاحب جو ان کے نبی سے دال روٹی بانٹتے تھے، بھلا اُن کو خاطر میں کب لاتے۔ انھوں نے مجسٹریٹ کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ یہ دین کا معاملہ ہے۔ مرزا قادیانی نے مسلمانوں کے عقیدہ کے خلاف دعویٰ نبوت کیا۔ اب ہمیں حق ہے کہ ہم اس دعویٰ کو پرکھ کر دیکھیں۔ اس وقت جلسہ کے صدر میرے ماموں جناب شیخ محمد صاحب وکیل گورداسپور تھے، ان کو مخاطب کر کے مولوی صاحب نے کہا: جب عدالت میں کوئی دعویٰ کرتا ہے تو کیا فریقِ ثانی کو قانون یہ حق نہیں دیتا کہ جوابِ دعویٰ پیش کرے۔ پھر ہمیں جوابِ دعویٰ سے کوئی روک نہیں سکتا اور اگر دعویٰ باطل ہو جائے تو مقدمہ خارج ہوتا ہے۔ مرزا قادیانی نے دعویٰ نبوت کر کے ہمیں چیلنج دیا۔ اب ہمیں اس کی تردید میں دلائل پیش کرنے کا پورا حق پہنچتا ہے۔ اس بات سے نہ ہی تو ہمیں اخلاق روک سکتا ہے اور نہ ہی قانون۔ مگر مرزائی تھے کہ واویلا کر رہے تھے۔ آخر مجسٹریٹ کو مجبوراً یہ کہنا پڑا کہ اگر آپ نے اسی طرح شور مچائے رکھا تو مجھ کو سختی کرنا پڑے گی۔ مولوی صاحب نے محمدی بیگم کے نکاح کو کچھ ایسے پیرایہ میں بیان کیا کہ سننے والوں کے پیٹ میں بل پڑ پڑ جاتے تھے۔ خیر جلسہ بخیر و خوبی ختم ہوا۔ دورانِ جلسہ پندرہ بیس دیہاتی مرزائی تائب ہوئے اور جن کے دلوں میں کچھ شبہات تھے، انھوں نے بھی توبہ کی۔ اگرچہ میں ملازمت کے باعث منظرِ عام پر نہ آیا تھا اور نہ آ سکتا تھا مگر۔

کجا ماند آں رازے کزو سازند محفلہا

ہر جگہ یہ خبر پھیل گئی کہ اس جلسہ کا بانی یہاں کا پوسٹ ماسٹر ہے۔ باہر سے احباب کے مبارک باد کے خطوط آنے شروع ہو گئے مگر ان تمام خطوط میں ایک خط ایسا تھا، جس کو میں عمر بھر نہیں بھول سکتا۔ یہ خط جناب حضرت مولوی محمد علی صاحب سجادہ نشین مونگھیر شریف کا تھا، جنھوں نے مرزا قادیانی کے متعلق چند رسالے بھی شائع کیے تھے۔ اصلی خط تو دورانِ تقسیم بٹالہ ہی رہ گیا، مگر اس کا مضمون قریب قریب یہ تھا۔ مجی! السلام علیکم ورحمتہ اللہ و برکاتہٗ مجھے یہ معلوم کر کے بہت خوشی حاصل

ہوئی کہ آپ نے قادیان میں مسلمانوں کے جلسہ کی بنیاد رکھی ہے۔ خداوند کریم آپ کو اس کا اجر خیر دے۔ اگرچہ میں اب ضعیف ہوں مگر جب مرزا قادیانی کے خلاف قلم اٹھاتا ہوں تو اپنے آپ کو جوان پاتا ہوں۔ امرتسر میں میرے دوست مولوی نور احمد صاحب اور مولوی ثناء اللہ صاحب موجود ہیں، انھیں میری جانب سے سلام عرض کریں اور وقت بے وقت اگر کسی قسم کی امداد کی ضرورت ہو تو انھیں کہہ دیا کریں۔ یہ خط میرے لیے باعث اطمینان وفخر تھا کہ ایسی قابلِ قدر ہستی نے جس پر ہر دو مولوی صاحبان کو بھی ناز تھا، احقر کو یاد فرمایا۔

مجھے اس بات کا یقین ہے کہ اس تمام تگ و دو کی پشت پر میرے آقا مرشدی حضور حضرت خواجہ اللہ بخش صاحب تونسویؒ کی روحانی امداد اور جناب پیر جماعت علی شاہ صاحب علی پوری اور دیگر بزرگان دین کی دعائیں تھیں۔ ورنہ میرے جیسے کم علم، بے بضاعت اور ملازمت میں جکڑے ہوئے شخص کی اتنی ہمت وجرأت کب تھی کہ سرکار انگلشیہ کے خود کاشتہ پودے کے خلاف کچھ کر سکے۔ هذا من فضلِ ربی.

اب مرزائیوں کو بھی پورے طور پر یقین ہو چکا تھا کہ پردۂ زنگاری کے پیچھے سب پوسٹماسٹر کا ہاتھ ہے۔ قصر خلافت میں مشورے شروع ہوئے کہ سب پوسٹماسٹر کو قادیان سے تبدیل کرایا جائے۔ چنانچہ یہ طے ہوا کہ پوسٹ ماسٹر جنرل کی شملہ سے واپسی پر ایک وفد اس کے پاس جائے۔ اس دوران میں نانا جان جو ضرورت سے زیادہ حریص تھے، یہ خیال پیدا ہوا کہ مولوی محمد احسن سے جو کام لینا تھا وہ تو لے لیا، اب مرزا محمود کی خلافت کو کسی قسم کا خطرہ بھی نہ تھا کیونکہ اسے ایک عرصہ گزر چکا تھا۔ چنانچہ انھوں نے مولوی صاحب سے اپنی رقم کا تقاضا کیا اور ایک لمبی چوڑی چٹھی لکھی کہ مولوی صاحب آپ نے جو روپیہ اپنے صاحبزادہ محمد یعقوب کی شادی پر بطور قرضِ حسنہ لیا، واپس کریں۔ مولوی صاحب اپنی دانست میں اس کا معاوضہ اس سے زیادہ ادا کر چکے تھے۔ مرزا محمود صاحب کو تخت نشین کرنا انہی کی کرامت تھی۔ انھوں نے نانا جان کو بہت سمجھایا کہ اب اس تقاضا کو چھوڑ دیں کہ میں کئی گنا زیادہ حق خدمت ادا کر چکا ہوں۔ نانا جان نے نہ ماننا تھا نہ مانے اور الٹی سیدھی سنانا شروع کیں۔ مولوی صاحب نے بھی تنگ آ کر اخبار پیغامِ صلح اور دیگر اخبارات کا سہارا لے کر مرزا قادیانی کی قلعی کھولنا شروع کی اور مرزا قادیانی کے مبلغ علم کا سب کچا چٹھا لکھ مارا، جس پر انھیں منافق ومرتد کے خطاب ملنے شروع ہو گئے۔

کچھ عرصہ بعد پوسٹماسٹر جنرل شملہ سے واپس آئے۔ مرزائی اکابرین کا وفد ان کی خدمت میں حاضر ہوا، اور گورنمنٹ برطانیہ سے اپنی وفاداری اور خدمات کا تذکرہ کر کے میرے قادیان سے

تبادلہ کا مطالبہ کیا۔ پوسٹ ماسٹر جنرل کے لیے یہ معمولی بات تھی۔ اس نے سپرنٹنڈنٹ ڈاکخانہ جات کو فوراً لکھ دیا کہ عبدالمجید پوسٹ ماسٹر کا تبادلہ قادیان سے کر دیا جائے۔ چنانچہ میری تبدیلی قادیان سے شکر گڑھ کر دی گئی۔ مجھے اس تبادلہ کا ذرا بھی احساس نہ تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے جو کام لینا تھا وہ لے لیا۔

ملازمت میں تبدیلیاں ہوتی ہی رہتی ہیں۔ چنانچہ گورداسپور کا ڈپٹی کمشنر بھی تبدیل ہو گیا، یا کرا دیا گیا۔ دوسرے ڈپٹی کمشنر سے جو اُس کی جگہ آیا، مرزائیوں نے اپنا اثر ورسوخ قائم کر کے یہ احکام جاری کروا لیے Anti-Ahmadia meeting should not be held in Qadian in future. کہ آئندہ کے لیے قادیان میں غیر احمدیوں کا کوئی جلسہ نہ ہو چونکہ اب قادیان کے مسلمانوں میں خاصی بیداری پیدا ہو چکی تھی اور میرے امرتسر، بٹالہ اور دیگر شہروں کے احباب کو بھی اس معاملہ سے خاص دلچسپی تھی، انھوں نے اعلیٰ حکام سے مل کر یہ احکام منسوخ کرا دیے چنانچہ دو ایک دفعہ ایسا ہی ہوا کہ مرزائی اپنے اثر ورسوخ سے جلسہ کو بند کرا دیتے اور فریق ثانی اسے منسوخ کرا دیتا۔ آخر دو تین جلسے اس کے بعد نہایت دھوم دھام سے ہوئے، جن میں دو ایک میں مرزائیوں نے منظم فساد بھی کیے۔ رفتہ رفتہ مجلسِ احرار نے اپنے قدم وہاں جمائے۔ ایک دینی مدرسہ قائم کیا۔ ایک دو مستقل مبلغ مقرر کر دیے، پھر جو اجلاس وہاں ہوئے ان کے روح رواں سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری تھے۔ میں نے اللہ کا شکر کیا کہ ایک بخاری نے جلسہ کی بنیاد رکھی اور دوسرے نے اس کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔

مجھے مرزائی صاحبان سے کوئی ذاتی عداوت نہ تھی اور نہ ہے۔ میرا قادیان جا کر یہ خیال پختہ ہو گیا کہ میرے جو عزیز جماعتِ مرزائیہ میں داخل ہوئے، ان کو اپنے دین سے کچھ واقفیت نہ تھی۔ انگریزی سکولوں میں دینی تعلیم مفقود تھی اور ہے۔ طالب علمی کا زمانہ گزار کر ملازم ہونے پر بھی یہ لوگ علم دین سے بے بہرہ رہے اور مرزا قادیانی کی تعلیم ان نوجوانوں کے مزاج کے مطابق تھی۔ مثلاً یہ کہ آسمان صرف حد نگاہ ہے۔ جب یہ کوئی چیز ہی نہیں تو پھر انسان اس میں کس طرح رہ سکتا ہے۔ نیز لفظ متوفی سے انھوں نے اس بے علم طبقہ کو خوب دھوکا دیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فوت ہو چکے ہیں۔ وہ تو آنے سے رہے۔ جس مسیح کے متعلق آنے کا وعدہ تھا وہ میں ہوں۔

اینک منم کہ حسب بشارات آمدم
عیسیٰ کہ کجاست تا بہ منہد پابہ ممبرم

نوجوان اس دامِ تزویر میں پھنس کر صراط مستقیم سے بھٹک گئے پھر انھیں اپنے خود ساختہ دین کے رنگ میں پوری طرح سے رنگ دیا۔

پہلے جو پیغمبر آیا کرتے تھے، وہ اس زمانہ کے فاسد و باطل خیالات وعقائد کی مخالفت کر کے اور تکلیفیں برداشت کر کے لوگوں کو راہِ راست پر لاتے۔ مگر جناب مرزا قادیانی نے زمانہ کی ہوا کا رخ دیکھا اور اس کے مطابق اپنی تعلیم کو جاری کیا تا کہ بڑے بڑے سرکاری عہدیداروں پر قابو پایا جا سکے اور وہ حصولِ زر کا باعث بن سکیں۔ چنانچہ قادیاں میں بہشتی مقبرہ کہ اس میں دفن ہونے والے ہر شخص سے اس کی جائیداد کا دسواں حصّہ وصول کرنا اور تنخواہ سے تادورانِ ملازمت دسواں حصّہ وصول کرتے رہنا۔ اس بہشتی رشوت کے علاوہ، زکوٰۃ، نذرانہ، وغیرہ کی وصولی حصولِ زر کے ادنیٰ کرشمے ہیں۔

چنانچہ ایک معمر مرزائی جس کے سات لڑکے تھے اور ساتوں مسلمان، جب وہ مرا تو اس نے وصیت کی کہ مجھے بہشتی مقبرہ میں دفن کیا جائے۔ وہ ملازمت کے دوران تنخواہ کا دسواں حصّہ ادا کرتا رہا۔ جب وہ مر گیا تو لڑکوں نے مرزا محمود قادیانی سے کہا کہ یہ آپ کا مرید ہے۔ اس نے اپنی تنخواہ سے ہمارا پیٹ کاٹ کر بھی دسواں حصّہ ادا کیا ہے۔ اب جائیداد اتنی نہیں کہ ہم بھائیوں کی گزران ہو سکے اس لیے اس کی وصیت کے مطابق بہشتی مقبرہ میں دفن کیا جائے مگر دربارِ خلافت سے حکم ہوا کہ یہ ہمارے آئین کے خلاف ہے۔ اگر اسے بہشتی مقبرہ میں داخل کرنا ہے تو جائیداد کا دسواں حصّہ لازمی دینا پڑے گا۔ اسی تکرار میں میت کو تین روز گزر گئے۔ گرمیوں کا زمانہ تھا، میت میں سڑاند پیدا ہو گئی مگر مرزا محمود نے اپنے خدائی آئین کو نہ توڑا۔ آخر لڑکوں نے مجبور ہو کر جائیداد کا دسواں حصّہ دے کر باپ کی وصیت کو پورا کیا۔

قادیان میں جلسہ کرانے سے میرا مقصد صرف اس قدر تھا کہ وہ لوگ جن کے کانوں میں ابھی اسلام کے اصل عقائد کی آواز نہیں پہنچی، ممکن ہے ہمارے علمائے کرام کے وعظ اور نصیحت سے فائدہ اٹھا کر راہِ راست پر آ جائیں۔ چنانچہ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے، جلسہ میں چند اصحاب نے اپنے عقائد سے توبہ کی اور قرب و جوار میں اس کا بہت اچھا اثر ہوا۔

کادیاں سے قادیاں

1904ء سے پہلے قادیان کو کادیاں کہا جاتا تھا، جس کے معنی مکار اور فریبی کے ہیں اور ڈاک خانہ کی مہروں پر بھی لفظ "Kadian" کادیاں ہوتا تھا جس کا اکثر اخبارات مذاق اڑایا کرتے تھے۔ آخر مرزائیوں نے تنگ آ کر اس کے متعلق قلمی جہاد شروع کیا اور بالآخر ڈاک خانہ کی مُہروں پر لفظ K کی بجائے Q لکھوانے میں کامیاب ہو گئے۔ قادیان ایک اجنبی شخص کے لیے بظاہر بڑا دل خوش کن اور دلفریب تھا۔ ہائی سکول اور بورڈنگ کی خوشنما عمارت، ہیڈ ماسٹر کا بنگلہ قصبہ کے

اندر مدرسہ دینیات، لنگر، ظاہری اخلاق کی یہ حالت کہ ہر وقت جزاک اللہ زبان زد، صبح وشام زنانہ و مردانہ درس گویا یہ چیزیں ایک نو وارد کو اکثر متاثر کر دیتی تھیں، مگر افسوس کہ اندرونی حالات کچھ اچھے نہ تھے اور مرزا محمود کے وقت کے واقعات تو کچھ ایسے تھے، جس کا تذکرہ کرتے ہوئے بھی شرم محسوس ہوتی ہے۔

حکومتِ وقت سے دھوکا

پہلی جنگ عظیم جو 1914ء میں شروع ہوئی اور پانچ سال تک جاری رہی۔ اس جنگ کے دوران میں حکومتِ انگلشیہ نے عوام سے قرضہ لینے کا اعلان کیا، جس کی وصولی کے لیے ڈاک خانہ سے کیش سرٹیفکیٹ اجرا کیے جاتے تھے۔ تمام افسرانِ ضلع کو ہدایت تھی کہ وہ اپنے اثر ورسوخ سے قرضہ وصول کریں۔ بڑے افسر جب دورہ پر جاتے تو ڈاکخانہ سے پوچھتے کہ یہاں کے لوگوں نے کتنے روپے کے کیش سرٹیفکیٹ خریدے ہیں؟ قادیان میں کسی متنفس نے کوئی کیش سرٹیفکیٹ نہ خریدا۔ کچھ عرصہ کے بعد ڈپٹی کمشنر ضلع گورداسپور نے اپنی منزل قادیان میں رکھی۔ مرزائیوں کو یہ معلوم ہوا تو ڈاکٹر خلیفہ رشید الدین نے جو ان دنوں انچارج دفترِ محاسب تھے، قریباً پانچ ہزار کے کیش سرٹیفکیٹ دفترِ محاسب کے نام کے خرید لیے جو ڈپٹی کمشنر کے آنے پر اسے بڑے فخر سے دکھائے گئے۔ مگر اس کی واپسی کے چند روز بعد ان کا روپیہ وصول کر کے خزانہ دفترِ محاسب میں داخل کر دیا۔ جو قوم اپنے پروردگار سے ایسا دھوکا کرے، اس پر کسی اور شریف آدمی کو کیا اعتبار ہوسکتا ہے۔ بہرحال گندم نما جو فروشی میں انھوں نے کمال کی انتہا کر دی۔ سیدھے سادھے مسلمانوں کے دین وایمان اور جیبوں پر شریفانہ ڈاکہ زنی میں انھیں خاصی مہارت حاصل ہے ؎

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ سلطانی بھی عیاری ہے درویشی بھی عیاری

قادیان سے ربوہ

یہ ایک مشہور روایت ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول دمشق کے ایک مینار سے ہوگا۔ چنانچہ مرزا قادیانی نے قادیان کو دمشق سے تشبیہ دی اور مینار سے یہ تاویل کی کہ عیسیٰ علیہ السلام صاحب منارہ ہوں گے۔ مسجد کا نام تو انھوں نے مسجد اقصیٰ رکھ ہی لیا تھا۔ اب سوال تھا مینار کا۔ چنانچہ انھوں نے مسجد اقصیٰ میں منارہ کی بنیاد بھی رکھ دی۔ مسجد کے مشرق کی طرف جدھر منارہ شروع کیا، ہندو برہمنوں کے چند مکانات تھے، جن میں ایک مکان ایک ہندو ڈپٹی کا بھی تھا۔ اس نے حکومت میں

درخواست گزار دی کہ اس مینار کے بننے سے ہمارے تمام گھر بے پردہ ہو جائیں گے۔ لہٰذا اسے روک دیا جائے چنانچہ حکومت نے مرزا قادیانی کی اس پیشین گوئی میں رکاوٹ ڈال دی اور اس کی تعمیر بند ہو گئی۔ مرزا محمود کے وقت میں مرزائیوں نے ہندوؤں کو تنگ کرنا شروع کیا۔ چونکہ ان غریب ہندوؤں کے کچے مکانات کی چھتیں مسجد کی تہ زمین کے برابر تھیں، اس لیے نمازی شرارت سے اوپر چلے جاتے۔ بعض اوقات عورتیں بے پردہ نہا رہی ہوتیں تو انھیں تکلیف ہوتی۔ دربار خلافت میں کئی بار پکار ہوئی مگر وہاں تو ارادے ہی دوسرے تھے۔ چنانچہ ان کی عرض کا نتیجہ یہ نکلا کہ گائے کے گوشت کی ہڈیاں اوپر پھینکی جانے لگیں۔ آخر ان غریبوں نے مکانات مرزائیوں کے ہاتھوں میں بیچ دیے۔ ڈپٹی کی اولاد سری رام وغیرہ بھی نالائق نکلے۔ وہ مکان بھی قادیانی دفتر بن گیا۔ اب کوئی رکاوٹ باقی نہ تھی۔ منارہ کے ساتھ مسجد بھی فراخ ہو گئی۔ گو صاحب منارہ کو منارہ دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ مگر

پدر نتواند پسر تمام خواہد کرد

انقلابِ زمانہ سے قادیانیوں کو بھی بادل نخواستہ دارالامان اور بہشتی مقبرہ کافروں کے سپرد کرنا پڑا۔ اگرچہ اب بھی ان کا بس چلے تو بھارت سے ساز باز کر کے شاید وہ جانے سے نہ رکیں مگر چونکہ یہ امر فی الحال انھیں محال نظر آ رہا ہے، اس لیے اب انھوں نے چنیوٹ کے قریب سستے داموں پر زمین خرید کر ربوہ یعنی بلند جگہ کی تعمیر شروع کر دی ہے۔ عام مسلمانوں کو تو فی الحال اس نام کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں مگر مرزا محمود اپنے باپ کی طرح دور اندیش ہیں۔ چند سال کے بعد اپنے مریدوں کو قرآن حکیم کے اٹھارہویں پارہ کی اس آیت کی طرف توجہ دلائیں گے۔ **وجعلنا ابن مریم و امه آیةً و اوینهما الی ربوةٍ ذات قرارٍ و معین.** (المومنون:50) یعنی ''ہم نے مریم کے بیٹے عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی ماں کو بڑی نشانیاں بنایا اور ہم نے ان دونوں کو ایک بلند زمین پر لے جا کر پناہ دی جو ٹھہرنے کے قابل اور شاداب جگہ تھی۔'' اس آیت کا حوالہ دے کر مریدین کو فرما دیں گے کہ خداوند تعالیٰ نے پہلے ہی مجھے بشارت دے دی تھی کہ تم قادیان چھوڑ کر ربوہ جاؤ گے اور یہ ربوہ وہی جگہ ہے جس کے متعلق قرآن کریم میں صاف آ چکا ہے کہ عیسیٰ اور اس کی والدہ یہاں پناہ لیں گے۔ عیسیٰ کی بجائے ابن مرزا اور والدہ کا بھی غالباً وہ کوئی لطیف نکتہ پیدا کر لیں گے اور شاید مرزا قادیانی کا کوئی الہام بھی چسپاں ہو جائے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ اس نیت کو عمل میں کب لاتے ہیں۔

مولانا عنایت اللہ چشتی

مشاہداتِ قادیان

1- میری عمر کے سن وشہور کوئی چوراسی منزلیں طے کر چکے ہیں۔ میں جب اپنی عمر رفتہ پر نظر دوڑاتا ہوں اور اس کا جائزہ لیتا ہوں تو دل بیٹھ جاتا ہے اور نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس کا بڑا حصّہ اکارت گیا۔ صرف وہی ایام حاصل زندگی ہیں جو قادیان میں بسر ہوئے۔ سبحان اللہ کیا کیفیتِ جہاد تھی۔ ان ایام کو اس سپاہی کے مماثل کہا جا سکتا ہے جو میدانِ جنگ میں دشمنوں سے گھرا ہوا ہو اور اس کی آنکھیں دشمن کو سامنے دیکھ رہی ہوں کہ فلاں جانب اتنے فاصلہ پر دشمن کا مورچہ ہے جو اس کی تاک میں ہے کہ جب موقع ملے تو حملہ کر کے اس کی زندگی کا خاتمہ کر دے اور اسے صاف نظر آ رہا ہو کہ وہ دشمن اُس کی گھات میں بیٹھا ہے۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس سپاہی کے لحات حیات کس کیفیت میں بسر ہو رہے ہوں گے؟ وہ سپاہی کیا کھاتا ہوگا؟ کیا پیتا ہوگا؟ اور اس کے سونے اور آرام کرنے کی کیا صورت ہوگی؟ اس کا کھانا اس سے زیادہ نہیں ہوگا کہ کوئی چیز پیٹ میں جائے جس سے زندگی قائم رہ سکے اور بس اسی طرح اس کا سونا اور آرام کرنا ہوگا جس سے تقاضۂ حیات پورا ہو سکے۔ اس سے زیادہ نہ تو اسے کھانے کا خیال ہو سکتا ہے اور نہ ہی اسے اپنے آرام کا تصور آ سکتا ہے...... ہماری قادیانی زندگی بھی اسی نوعیت کی تھی۔ ہم نے

دریں دریائے بے پایاں دریں طوفانِ موج افزا
بسم اللہ مجریہا و مرسہا

کہہ کر ہلاکت خیز طوفان میں کشتی ڈال دی تھی۔ میں اور میرے رفقاء رات بارہ بجے تک اس انتظار میں ہوتے تھے کہ کہیں سے کوئی ناخوشگوار اطلاع تو نہیں آ جاتی؟ اور اگر کوئی اطلاع آئے تو ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ مرزائی جماعت اس جدوجہد میں مصروف تھی کہ "کادیان" کا نواحی علاقہ یا تو پورے کا پورا "مرزائیت" قبول کر لے؟ یا کم از کم

"اکثریت" ہمنوا ہو جائے، اس لیے انھوں نے نواحِ قادیان میں اپنے مشن قائم کر رکھے تھے اور لوگوں کو 'مرزائی' بنانے میں کسی بھی حربہ کے استعمال کرنے سے گریز نہ کرتے تھے۔ ان کے پروگرام میں تشدد بھی تھا اور ترغیب و ترہیب بھی۔ مقدمات میں معاونت یا مخالفت بھی۔ کاروبار میں تعاون یا عدم تعاون، ملازمتوں میں امداد یا مخالفت غرض کہ وہ کون سا جائز یا ناجائز ہتھیار تھا جو استعمال نہ کیا جاتا تھا؟

-2 ہم نے بھی ان کے ہر مشن کو اپنی نظروں میں رکھا ہوا تھا اور ان کی ہر کارروائی سے باخبر رہتے تھے اور حسبِ استطاعت موقع محل کے اعتبار سے مناسب کارروائی کرتے تھے۔ قادیان خاص کا معاملہ ہمارے لیے بڑا کٹھن تھا۔ ہمیں ان کے ایک ایک عمل سے باخبر رہنا پڑتا تھا اور ایسی اطلاعات حاصل کرنے کے لیے کبھی رات کے ایک دو بج جاتے تھے۔ خدا شاہد ہے کہ ہمیں اس دوران نہ کھانے کی پرواہ تھی اور نہ ہی آرام و راحت کا خیال۔ ہم نے ان کی کامیابی کے ہر راستے میں رکاوٹیں کھڑی کر رکھی تھیں اور وہ بری طرح حیران و پریشان ہو گئے تھے۔ اگر ان کا بس چلتا تو وہ بڑے سے بڑا اقدام کر گزرتے؟ وہ اس وقت فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ کا مصداق بنے ہوئے تھے۔ اگر ان کے پہلے سے حالات ہوتے تو ان کے لیے ہمارے جیسے ناتوانوں کو قتل کر کے بغیر ڈکار کے ہضم کر لینا کوئی بڑی بات نہ تھی؟ اور ہم ہر خطرے کا سامنا کرنے کے لیے آمادہ تھے کہ جو ہو سو ہو۔ زندگی موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ مگر حالات بدل چکے تھے اور مرزائیوں کے لیے ایسا اقدام ممکن نہ تھا کیونکہ اس سے پہلے جب کبھی وہ قتل و آتش زنی جیسا اقدام کرتے تو صرف وہی شخص گرفتار یا مجرم گردانا جاتا جو اپنے ہاتھ سے جرم کرتا۔ اصل مجرموں کو کوئی پوچھتا تک نہ تھا، جن کے ایماء اور شہ پر جرم سرزد ہوتا۔ ان کا جو ملزم سزا پاتا تو اسے قربانی سے تعبیر کیا جاتا۔ سزا پانے والوں کی میت پر پھول نچھاور کیے جاتے اور اسے اعزاز کے ساتھ سپردِ خاک کیا جاتا۔ فخر و مباہات سے اس کی مردار قربانی کے تذکرے ہوتے جس سے جماعت کے حوصلے اور بلند ہو جاتے۔ اب صورتِ حال یہ تھی کہ جماعت احرار جس کے ممبر اپنی طلاقتِ لسانی کی وجہ سے ملک کے طول و عرض میں پھیلے اور چھائے ہوئے تھے اور وہ قادیان میں اپنے دفتر کے قیام اور دفتر کے ارکان کو پیش آنے والے ممکنہ مصائب سے قادیان سے باہر کے عوام کو آگاہ کر رہے تھے اور لوگوں کو تلقین کر رہے تھے کہ قادیان میں مرزائی تاریخ خدشات سے پُر ہے۔ ہمیں اسے

نظر انداز کر کے غافل نہیں ہونا چاہیے اور قادیان میں احرار کے کارکنوں کی زندگیوں کے تحفظ کے لیے عوام کو تیار رہنا چاہیے۔ مرزائی بھی ان حالات سے غافل نہ تھے اور انھیں خطرہ تھا کہ اگر ہم نے قادیان میں احرار کے کارکنوں کے ساتھ کوئی ایسا ویسا معاملہ کیا تو سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری اور ان کے رفقاء کی زبانیں ہمیں گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیں گی اور انگریز بہادر ہمیں بچانے میں کامیاب نہ ہوگا اور سارے ملک میں ہم پس کر رہ جائیں گے۔ یہ مرزائی کی دور اندیشی تھی، جس نے مرزائیوں کو بے بس کر رکھا تھا۔ وگرنہ ان کے لیے مستری محمد حسین بٹالوی اور فخر الدین ملتانی کا سا معاملہ کرنے میں کوئی امر مانع نہ تھا۔ وہ اپنی معلومات کی بناء پر مشاہدہ کر رہے تھے کہ احرار نے ملک میں ایسے حالات پیدا کر دیے ہیں کہ اب مستری محمد حسین کا قاتل اکیلا پھانسی نہ پائے گا بلکہ ممکن ہے کہ پوری قادیانی جماعت جہاں جہاں ہو، اس کا بھی جھٹکا ہو جائے۔

ماسٹر تاج الدین انصاری جن دنوں میرے ہمراہ قادیان میں مقیم تھے، انھوں نے ایک بڑا اقدام (جو بہ ظاہر مصلحت کے قطعاً خلاف تھا) کر ڈالا، اور وہ اقدام اتنا سخت تھا کہ اگر مرزائیوں کے حالات پہلے کی طرح سازگار ہوتے تو اس اقدام کے بدلے اگر ہم سب کو قتل کر دیا جاتا تو بھی ان کی تسکین نہ ہوتی۔ لیکن ہماری طرف کسی نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا اور قادیانیوں کے غصہ کا نشانہ وہی ایک شخص بنا رہا جس نے ارتکاب جرم کیا تھا۔ یہ اس لیے تھا کہ اگر وہ اِدھر اُدھر تجاوز کرتے تو ہزاروں قادیانیوں کو اس کا نشانہ بننا پڑتا اور یہ سودا ان کے لیے مہنگا تھا، اب اس اقدام کی تفصیل سنیے:

ماسٹر تاج الدین صاحب نے یہ کیا کہ اندر ہی اندر ایک نوجوان کو خفیہ طور پر تیار کر لیا کہ ''جب مرزا شریف احمد ہمارے محلّہ سے گزر رہا ہو تو اسے دو ڈنڈے مار کر سائیکل سے گرا دے''— مرزا شریف احمد جو مرزا غلام احمد قادیانی کا چھوٹا بیٹا اور مرزا محمود کا چھوٹا بھائی تھا، اس کے دفتر جانے کا راستہ ہمارے محلّہ شیخانوالے میں سے تھا اور وہ ہر روز بلاناغہ سائیکل پر سوار ہو کر دفتر کو جاتا تھا۔ چنانچہ اس نوجوان نے مرزا شریف احمد پر ڈنڈے رسید کیے اور اسے سائیکل سے گرا دیا۔ قادیان میں مرزائیوں کے لیے یہ حادثۂ عظیمہ تھا اور ایسا حادثہ مرزائیت کی تاریخ نے اپنے جنم دن سے آج تک کبھی نہ دیکھا تھا۔ اس حادثہ نے مرزائیت میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک تزلزل برپا کر دیا۔ چودھری ظفر اللہ خان اس وقت وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر تھے۔ قادیانی جماعت ہر

طرف سے واویلا کر رہی تھی اور چشمِ عبرت مسکراتے ہوئے دل ہی دل میں کہہ رہی تھی کہ ''تم نے انسانی جانوں کو بیدردی سے ذبح کیا ہے، مخالفوں کے مکانات نذرِ آتش کیے، وہ تمھارے لوحِ قلب سے ذہول ہو کر رہ گئے۔ اگر عدالتوں نے مجرموں کو سزائیں دیں تو ان کی مردار لاشوں کو تمھارے پیشوا نے کندھا دیا اور پھول چڑھائے اور انھیں اپنے ''بہشتی مقبرہ'' میں دفن کیا۔ ان ڈنڈوں سے آج اگر تمھارے صاحب زادہ کو چند خراشیں آ گئی ہیں تو آسمان سر پر اٹھا رہے ہو؟ چودھری ظفر اللہ خان نے خود تو جو واویلا کیا سو کیا، مزید برآں اپنی بوڑھی والدہ کو لیڈی وائسرائے کے پاس بھیج دیا تھا اور اس نے گلے میں کپڑا ڈال کر لیڈی وائسرائے کے قدموں پر سر رکھ کر زار و قطار رو کر فریاد کی تھی کہ ''ہمارے نبی زادہ کی سرِ بازار بے عزتی ہو گئی اور ہم کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔'' انگریز مرزائیت کا بڑا حامی تھا اور اپنے خود کاشتہ پودے کی ہر طرح آبیاری کر رہا تھا لیکن وہ حکومت کے اصول جانتا تھا کہ ادھر یہ خراشیں اور ادھر ذبحِ عظیم، ایک نہیں، دو نہیں کوئی نصف درجن۔ انگریز یہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری اور ان کے رفقاء کی زبانیں بے نیام ہو کر نکل آئیں گی اور جرائم کا موازنہ کرنے کے لیے جہاں وہ حکومت کو مجبور کریں گی وہاں عوام میں آتشِ انتقام بھڑکا کر مرزائیوں کا چلنا پھرنا دوبھر بنا دیں گی۔ یہی وجہ تھی کہ مرزائیوں نے اصل مجرم کے بغیر کسی دوسرے احراری یا غیر مرزائی کی جانب آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا اور قلمی یا لسانی احتجاج سے آگے ایک قدم بھی نہ بڑھایا، حالانکہ اس سے پہلے ایسے بیسیوں واقعات رونما ہوئے جنھیں سرزمینِ قادیان نے ہضم کر دیا تھا اور عوام کے کانوں تک ان کی بھنک بھی نہ پہنچی تھی اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے طعمۂ سرزمینِ قادیان ہو گئے تھے۔

میرا قادیان جانا

لاہور میں میری مسجد کے سامنے ایک مرزائی ڈاکٹر کی دکان تھی۔ کبھی کبھار اس سے دل لگی کی باتیں ہو جاتی تھیں اور بیچ بچاؤ کے انداز میں ''مذہبی گفتگو'' بھی ہو جاتی تھی۔ ماہ دسمبر میں ایک دن وہ کہنے لگا کہ قادیان میں ہمارا جلسہ عنقریب ہونے والا ہے۔ آپ تنگ دل ہیں اور یہاں بیٹھ کر باتیں بناتے ہیں۔ میں تب مانوں کہ ہمارے جلسہ میں قادیان آؤ اور وہاں کے تاثر سے بچ جاؤ۔'' میں نے کہا ''ڈاکٹر صاحب وہاں کیا رکھا ہے؟ جادۂ استقامت سے بھٹکے ہوئے منحوس چہرے ہی نظر آئیں گے۔ میں نے ان سے کیا تاثر لینا ہے؟'' ڈاکٹر نے کہا ''میں زیادہ کچھ نہیں کہتا اور نہ ہی بحث

کرتا ہوں، آپ ایک بار میرے ساتھ قادیان آئیں اور وہاں کی ''برکات'' سے متاثر نہ ہوں تو میں ہارا اور آپ جیتے۔'' میں نے کہا ''چلو میں تمھارے ساتھ قادیان جانے کو تیار ہوں!'' چنانچہ ہم لوگ قادیان پہنچ گئے۔ میں نے جب اپنی رہائش گاہ دیکھ لی اور تکانِ سفر بھی دور ہوئی تو مجھے جستجو ہوئی کہ یہاں کی تمام کائنات ''مرزائی'' ہے یا کہ مسلمان عنصر بھی یہاں موجود ہے؟ معلوم ہوا کہ یہاں دو مساجد ایسی ہیں جو ''قادیانی رسوخ'' سے آزاد اور خالص سنی مسلمانوں کے قبضہ میں ہیں۔ ایک ''مسجدِ ارائیاں'' جہاں زیادہ ارائیں قوم رہتی ہیں اور وہ تمام کے تمام ''سنی'' ہیں، ان میں سے کوئی ایک خاندان بھی مرزائی نہیں۔ دوسری مسجد ''مسجد شیخاں'' کے نام سے موسوم ہے اور شیخ قوم کی اکثریت سنی ہے۔ سوائے ایک آدھ خاندان کے جو مرزائی ہوا ہے ورنہ تمام سنی ہیں اور مسجد شیخاں مسلمانوں کے زیر اثر اور قبضہ میں ہے۔ میں مرزائی ڈیرے سے اٹھ کر پوچھتا پچھاتا ''مسجد ارائیاں'' میں پہنچ گیا۔ دیکھا تو مسجد مسلمانوں سے بھری پڑی ہے لیکن سب افسردہ حال بیٹھے ہیں۔ افسردگی کی وجہ پوچھی تو انھوں نے بتایا کہ ''ہم نے آج کے لیے ایک مولوی صاحب کو دعوت دے رکھی ہے، اس کے انتظار میں ہم لوگ افسردہ بیٹھے ہیں۔ کافی وقت گزر چکا ہے اور مولوی صاحب تشریف نہیں لائے۔'' میں نے کہا کہ: ''اگر اجازت ہو تو میں ہی کچھ خدمت کر دوں۔'' وہ بڑے خوش ہوئے اور کہنے لگے: ''کیا آپ مولوی ہیں؟'' میں نے کہا ''میں مولوی تو نہیں ہوں، لیکن مولویوں کا خادم ہوں!''

چنانچہ میں نے مرزائیوں کے خلاف بڑی بے باکی سے ایک زناٹے دار تقریر کر دی۔ مجمع بڑا خوش ہوا اور میں رخصت ہو کر اپنے مرزائی ڈیرے پر آ گیا۔ دوسرے دن جلسہ دیکھا اور پھر واپس لاہور (مزنگ) آ گیا۔ متاثر تو کیا ہونا تھا؟ الٹا مخالفت میں شدت کا پہلو لے کر واپس آیا۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جبکہ مشہور تائب مرزائی مبلغ و کارکن ''عبدالکریم مباہلہ'' قادیان سے لُٹ پٹ کر امرتسر آ گئے تھے۔ قادیانیوں کا ستایا ہوا کوئی انسان اس کے پاس آتا، وہ امداد کے قابل تھے یا نہیں تھے لیکن وہ مشورہ ضرور صائب دیتے تھے۔ میں کوئی ایسا اچھا مقرر تو نہیں تھا کہ کوئی سامع میری تقریر سے غیر معمولی متاثر ہوتا، لیکن میری قادیان والی تقریر اس لیے غیر معمولی موثر ثابت ہوئی کہ کوئی دوسرا آدمی قادیان آ کر اس قدر بے باکی اور بے خوفی کی جرأت نہ کر سکتا۔ میری بے باکی سے وہ حیرت زدہ ہو گئے اور ان کے دل میں یہ بات پیدا ہوئی کہ یہ شخص اگر قادیان آ جائے تو کیا ہی اچھا ہو؟ کیونکہ وہ لوگ قادیانیوں کے ظلم و ستم کے ستائے ہوئے تھے اور میری حق گوئی و بے باکی سے بے حد متاثر ہوئے تھے۔ میرے ذہن میں یہ تصور تک نہ تھا کہ میں نے قادیان میں کوئی غیر معمولی موثر بات کی ہے، لیکن میری اس تقریر کا یہ اثر ہوا کہ قادیان کے مسلمان باشندوں کی یہ زبردست خواہش ہو گئی

کہ ''اگر یہ شخص قادیان آ جائے تو ہمارے لیے بڑا مفید ثابت ہوگا۔'' اس لیے وہ لوگ بصورتِ وفد مولوی عبدالکریم مباہلہ کے پاس آئے اور خواہش ظاہر کی کہ ''اگر مولوی عنایت اللہ کو قادیان لانے میں آپ ہماری امداد کریں تو ہم آپ کے بڑے شکر گزار و ممنون ہوں گے۔ میں یہاں مزنگ میں بالکل بے خبر تھا کہ ایک روز اچانک مولوی عبدالکریم مباہلہ میرے پاس تشریف لائے۔ مولوی صاحب ان ایام میں امرتسر سے اخبار ''مباہلہ'' نکالا کرتے تھے جو ''تردید مرزائیت'' کے لیے سرگرمِ عمل تھا۔ اسی اخبار کی وساطت سے مولوی صاحب سے معمولی واقفیت تھی۔ علیک سلیک کے بعد دریافت کیا کہ کیسے آنا ہوا؟ مولوی صاحب بڑے منجھے ہوئے گھاگ قسم کے آدمی تھے۔ زمانہ کے نشیب و فراز سے واقف تھے۔ میٹرک کے علاوہ مولوی فاضل تھے۔ ایک عرصہ تک قادیانیوں کے مبلغ کے فرائض انجام دے چکے تھے۔ طویل تمہید کے بعد انھوں نے اپنا مدعا ظاہر کیا کہ ''اگر آپ قادیان آنا قبول کر لیں تو اس میں دینی و مذہبی فائدہ ہوگا۔ وہاں کے لوگوں کی خوشنودی خدا کی خوشنودی کے مترادف ہے اور وہ لوگ آپ کو چاہتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کفرستان میں اِعلائے کلمۃ الحق رحمتِ خداوندی کا باعث ہے۔'' غرض کہ مولوی صاحب کی اس سحر انگیز اور حقیقت آمیز تقریر سے میں بے حد متاثر ہوا اور اس شرط پر آمادگی کا وعدہ کر لیا کہ اگر ''مجلس احرارِ اسلام'' اور خصوصاً سید عطاء اللہ شاہ بخاری مجھے کہیں اور پھر مجھ سے بے تعلق نہ ہو جائیں، دکھ سکھ میں میرے شریکِ حال رہیں۔'' کیونکہ شنید ہے کہ ''مرزائی'' انسان کو ایسے طریق سے قتل کر دیتے ہیں کہ پھر اُن کا پتا لگانا مشکل ہو جاتا ہے۔ میرا مقصد یہ نہیں کہ میں موت سے خوف زدہ ہوں، بلکہ میرا مقصد یہ ہے کہ میرا کوئی رفیق کار تو ہوتا کہ میرے مارے جانے کے بعد وہ اس مشن کو جاری رکھ سکے۔ مولوی صاحب مطمئن ہو کر اٹھے اور سیدھے دفتر مجلس احرار اسلام میں پہنچے۔ چونکہ مولوی صاحب کی پیدائش اور پھر تعلیم و پرورش مرزائی گھرانے میں ہوئی تھی اور وہ تمام ہتھکنڈوں سے بخوبی واقف تھے، انھوں نے ''احرار لیڈروں'' سے گفتگو کی اور قادیان میں ''دفتر احرار'' کھولنے کی ضرورت پر زور دیا۔ پہلے تو چودھری افضل حق نے جو بڑے زیرک اور نشیب و فراز سے واقف تھے انھوں نے ''مرزائیوں کے گھر'' میں بیٹھ کر ان کی مخالفت کو اچنبھا اور ناقابل عمل خیال کیا اور خصوصاً اس صورت میں کہ انگریز ان کی ترقی کا خواہاں ہے اور مخالفت کرنے والے احرار جو انگریز کے ''صفِ اوّل کے دشمن'' ہیں اور انگریزی ''حکومت کا ستارہ بلند ترین اوج پر چمک رہا ہے، یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ قادیان میں مرزائیوں کے خلاف مہم کامیاب ہو سکے؟ لیکن حضرت مباہلہ بھی بڑے ''منطقی آدمی'' تھے آخر کار انھوں نے چودھری صاحب کو قائل کر لیا۔ چودھری صاحب نے احرار ''ورکنگ کمیٹی'' کی میٹنگ طلب کی اور منظوری کے لیے یہ مسئلہ پیش

کیا۔ چودھری صاحب جماعت کا دل و دماغ تھے اور جماعت پر چھائے ہوئے تھے۔ آخر کار ورکنگ کمیٹی نے منظوری دے دی اور متفقہ طور پر ریزولیوشن پاس کیا کہ قادیان میں احرار کا دفتر قائم کرنا چاہیے۔"

منظوری کے بعد یہ سوال ابھر کر سامنے آیا کہ "ہم میں سے کون ہے جو موت کے گھر خود پہنچ کر اسے دعوت دے؟" مولوی عبدالکریم نے کہا کہ "وہاں دفتر سنبھالنے کے لیے آدمی میں مہیا کروں گا۔" انھوں نے کہا "آدمی تو شاید مل جائے مگر وہاں کے لیے تو ایسا آدمی چاہیے جو وہاں کے لیے موزوں بھی ہو اور وہاں کے سنی مسلمان اسے پسند بھی کریں تا کہ وہاں برائے نام دفتر نہ ہو بلکہ کامیابی کی امید بھی اس دفتر سے وابستہ ہو سکے؟ ورکنگ کمیٹی کے ممبروں میں سے تو کوئی بھی قادیان کی رہائش کے لیے آمادہ نہ تھا اس لیے ریزولیوشن کے بعد یہ بڑا اہم مسئلہ تھا اور موزوں آدمی کے لیے سب کو تشویش تھی۔ مولوی صاحب نے میرا نام لیا تو سب حیران تھے کہ "وہ کیسے جائے گا؟" گو تحریکِ کشمیر کی دارو گیر میں وہ لوگ مجھ سے واقف ہو چکے تھے۔ انھوں نے کہا: "آدمی تو ٹھیک ہے، لکھا پڑھا بھی ہے۔ دلیر بھی ہے۔ لیکن اسے "حصارِ قادیان" میں جانے پر آمادہ کیسے کیا جا سکتا ہے؟ تو مولوی صاحب نے سارا قصہ بیان کر دیا کہ قادیان کے مسلمانوں کا مطالبہ بھی اسی کے لیے ہے اور میں اسے آمادہ بھی کر آیا ہوں، بشرطیکہ ورکنگ کمیٹی اس سے رابطہ قائم کر کے اس کو اپنے فیصلہ سے آگاہ کرے۔" چنانچہ ورکنگ کمیٹی نے مجھ سے رابطہ قائم کر کے مجھے اپنے فیصلہ سے مطلع کیا اور میں رختِ سفر باندھ کر "دارالفساد قادیان" پہنچ گیا اور وہاں جا کر اپنا کام شروع کر دیا۔ مفکرِ احرار چودھری افضل حق مرحوم اپنی کتاب "تاریخِ احرار" میں فرماتے ہیں:

"مرکزی احرار ورکنگ کمیٹی کا فیصلہ"

امرتسر میں ورکنگ کمیٹی ہوئی فیصلہ ہوا کہ "جو ہو سو ہو، احرار کا قادیان میں مستقل دفتر کھولنا چاہیے۔ معلوم کیا کہ ہم میں کون ہے جو علم میں پورا اور عمل میں پختہ ہو؟ جو موت کی مطلق پرواہ نہ کرے اور اللہ کا نام لے کر کفر کے غلبہ کو مٹانے کے عزم سے اس جگہ اقامت اختیار کرے؟ اور مرزائیوں کی "ریشہ دوانیوں" کی نگرانی کرے؟ خدا نے مولانا عنایت اللہ کو توفیق دی، وہ شادی شدہ نہ تھے، اس لیے جماعت کو یہ غم نہ تھا کہ ان کی شہادت کے بعد کنبے کا بوجھ اٹھانا ہے اور بچوں کی پرورش کا سامان کرنا ہے۔"

''مولانا عنایت اللہ''

غرض خطرات کے ہجوم میں مولانا کو''دفاعِ مرزائیت کا کام سپرد کیا گیا۔''دارالکفر'' میں اسلام کا جھنڈا گاڑنا معمولی اولوالعزمی نہ تھی۔ افسوس مسلمانوں نے دنیا کے لیے زندہ رہنا سیکھ لیا ہے اوران کے سارے تبلیغی ولولے سرد پڑ گئے ہیں۔ اب جبکہ فتنہ مرزائیت نے سر اٹھالیا تو انھوں نے کوئی مصلحت اختیار کی باوجودیکہ مرزائی مسلمانوں کو صریح کافر کہتے ہیں، یہاں تک کہ جنازہ پڑھنے کے روادار نہ تھے۔ لیکن لوگ انھیں انگریز کا''خود کاشتہ پودا'' سمجھ کر منہ نہ آتے تھے۔ تعلیم یافتہ مسلمانوں نے تو حد کر دی تھی۔ وہ''اس خانہ بر انداز'' قوم کا تعاون حاصل کرنے کو حصولِ ملازمت کا ضروری ذریعہ خیال کرتے تھے۔ بہت ہیں جنھوں نے دنیا حاصل کرنے کے لیے دین کو فروخت کر دیا۔ دین فروشوں کا گروہ ہر زمانہ میں موجود رہا ہے! قوموں کے زوال میں اس گروہ کا بہت بڑا حصّہ ہوتا ہے۔ ''مرزائی'' لوگ انسانی فطرت کی اس کمزوری سے پورا فائدہ اٹھاتے رہے۔ ضلع گورداسپور کے سارے حکام ان کا اس وجہ سے پانی بھرتے تھے کہ''مرزائی گمراہوں'' کی رسائی انگریزی سرکار تک ہے۔ ضلع کے حکام کے ذریعہ عوام کو مرعوب کرنا، سرکار کا وفادار فریق بتا کر تعلیم یافتہ لوگوں کو ملازمتوں کے سبز باغ دکھانا ان کا کام تھا۔

انگریزی سلطنت کی مضبوطی دیکھ کر اور سرکار سے مرزائیوں کا گٹھ جوڑ دیکھ کر کسی تبلیغی جماعت کا حوصلہ نہ تھا کہ وہ خم ٹھونک کر کفر کے مقابلہ میں نکلے۔ مرزائی متعدد قتل کر چکے تھے۔ قادیان میں انھیں کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ مولانا عنایت اللہ کو دفتر لے دیا گیا، قادیان میں احرار کا جھنڈا لہرانے لگا۔''سرخ جھنڈے'' کو دیکھ کر''مرزائی روسیاہ ہو گئے۔''آہ'' ان کے سینوں کو توڑتی ہوئی نکل آئی۔ یہ ان کی آرزوؤں کی پائمالی کا دن تھا۔ مرزائیوں نے اپنی امیدوں کا جنازہ دیکھا تو سر پیٹنے لگے۔ سرکار کی دہلیز پر سر دھر کر پکارے''حضور! قادیان مرزائیوں کی مقدس جگہ ہے۔ احرار کے وجود سے یہ سرزمین پاک کر دی جائے۔''

جب''مرزائیت''''نصرانیت'' کا آسرا ڈھونڈنے نکلی تو ہم نصرانیوں اور قادیانیوں کے اتحاد سے ڈرے ضرور۔ مگر خدا کو حامی و ناصر سمجھ کر اس کے تدارک میں لگ گئے۔ ڈرنا اور ہمت ہار دینا عیب ہے۔ ڈرنا اور پہلے سے زیادہ چوکنا ہو کر مقابلہ کرنا بڑی خوبی ہے۔''بساطِ سیاست'' پر ''مہرہ'' کو بڑھا کر اس کو تنہا چھوڑنا غلطی ہوتی ہے۔ ہم نے اوّل ان احباب کی فہرست تیار کر لی تھی جو مولانا عنایت اللہ کی شہادت کے بعد یکے بعد دیگرے یہ سعادت حاصل کرنے کے لیے چوبیس گھنٹوں کے اندر قادیان پہنچ جائیں کیونکہ مرزائیوں نے قادیان کو قانونی دسترس سے پرے ایک

''دنیا'' بنا رکھا تھا، جہاں مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں پر بلا خطا مظالم توڑے جاتے تھے، قتل ہوتے تھے، مگر مقدمات عدالت تک نہ جاسکتے تھے۔ دوسرے ہم نے فوراً مولوی عنایت اللہ کے نام قادیان میں مکان خرید دیا تاکہ مرزائی اور حکام کا یہ عذر بھی جاتا رہے کہ مولوی صاحب موصوف ایک اجنبی ہیں اور ان کا قادیان سے کوئی تعلق نہیں۔ تیسرے قادیان کی تقدیس کے دعویٰ کو باطل کرنے کے لیے ہم نے ''احرار تبلیغ کانفرنس'' کا اعلان کر دیا (''تاریخ احرار'' ص 183 طبع ثانی شائع کردہ مکتبہ مجلس احرار اسلام پاکستان لاہور ملتان مطبوعہ اشرف پریس لاہور)

بہرحال میں قادیان پہنچ گیا۔ قادیان کی آبادی اس وقت دس بارہ ہزار کے لگ بھگ تھی جس میں سے مسلمان تین ہزار کے قریب اور قریباً اتنے ہی ہندو سکھ تھے۔ مسلمانوں میں پہلی اہم شخصیت سیّد محمد چراغ شاہ کی تھی۔ ان کا قادیان میں اپنا پختہ مکان تھا اور گاؤں کے متصل جانب جنوب ان کا باغیچہ اور کنوئیں کے علاوہ زرعی اراضی بھی تھی۔ گاؤں میں معزز ترین شخصیت کے مالک تھے۔ قادیانیوں کے شدید ترین مخالف اور مرنجاں مرنج انداز کے بزرگ تھے اور محتاط طریقہ سے زندگی بسر کر رہے تھے۔ سیّد قوم سے تھے اور قصبہ میں ان کا حلقۂ مریدین بھی تھا۔ باہر سے بھی لوگ ان کے پاس دعائے پناہ کے لیے آیا کرتے تھے۔ بڑے باغ و بہار مجلس آراء تھے۔ دوسری اہم شخصیت میاں مہر دین صاحب کی تھی۔ بہترین منشی اور لکھے پڑھے سفید ریش بزرگ تھے۔ ہمارے قادیان جانے سے پہلے بھی مرزائیوں کے خلاف جلسے کراتے تھے اور اسی طرح میاں عنایت اللہ بھی بڑے اہم اور لکھے پڑھے تھے۔ باقی لوگ ''شیخ برادری'' سے تعلق رکھتے تھے اور مرزائیت سے متنفر تھے۔

مرزا محمود نے اپنی ''مادی طاقت'' سے ''ہٹلری انداز'' میں ''فسطائی نظام'' قائم کر رکھا تھا اور غیر مرزائیوں سے سودا سلف تک خریدنے کی ممانعت کر رکھی تھی، اور ضرورت پڑنے پر تمام فسطائی ہتھکنڈے استعمال کیے جاتے تھے۔ اپنا رعب قائم رکھنے کے لیے مار پٹائی سے گریز نہیں ہوتا تھا۔ کوئی شخص ان کے نظریات کے خلاف نہ بول سکتا تھا اور نہ ہی کوئی تقریر کر سکتا تھا۔ بصورتِ دیگر اس کی مار پٹائی ہوتی اور اس کا مال لوٹا جاتا تھا۔ جھوٹے مقدمات بنائے جاتے، اور قتل تک کی نوبت پہنچتی اور کوئی پرسانِ حال نہ تھا۔ انگریز عدالتیں بے بس تھیں۔ مرزائیوں کے خلاف ''شہادت'' مہیا کرنا محال تھا، سب لوگ سہمے ہوئے تھے اور آہستہ آہستہ بات کرتے تھے خصوصاً سید شاہ چراغ بہت محتاط تھے اور چھپ کر میری ملاقات کو آتے تھے۔ ہاں مولوی مہر دین صاحب بڑے دلیر تھے اور کبھی کبھار کسی مولوی صاحب کو باہر سے بلوا کر تقریر کرا لیتے تھے لیکن وہ بھی کھل کر میرا ساتھ دینے سے کتراتے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ ''شاید چند دن رہ کر یہ شخص فتنہ کھڑا کر کے چلا جائے گا اور پھر مخالفت کا

خمیازہ ہمیں بھگتنا پڑے گا۔ اس لیے سمجھدار لوگ ابتداء میں محتاط تھے اور بچ بچا کر مجھے ملتے تھے لیکن مُرزائیت کی مخالفت ان کے رگ و ریشہ میں سرایت کیے ہوئی تھی۔

ابتداء میں میرے ساتھ تعاون نوجوان طبقہ نے کیا اور ہر طرح میری امداد و خدمت گزاری کے لیے تیار تھے۔ ایک شخص امان اللہ نامی زرگر تھا۔ مولوی مہر دین نے اس کا ہمیشہ ساتھ دیا تھا۔ جب میں قادیان گیا تو بوڑھا اور کمزور ہو چکا تھا۔ میرے لیے اس کی امداد یہ تھی کہ وہ بے جھجک میرے پاس آتا تھا اور مرزا غلام احمد کے چشم دید حالات سناتا تھا۔ اس کا چھوٹا لڑکا فیض اللہ میرا بازو بن گیا تھا اور اسی طرح ''مسجد شیخاں'' کے امام میاں عبداللہ نے بھی میرا بڑا ساتھ دیا اور یہ لوگ گئی رات تک میرے ساتھ رہتے اور مرزائیوں کے ہتھکنڈوں کا ذکر ہوتا رہتا۔ شیخ برادری میں غازی عبدالحق اور شیخ عبدالعزیز میرے بڑے معاون و مددگار تھے۔

وہاں جا کر یہ عجیب انکشاف ہوا کہ قادیان کے قدیم باشندوں میں سے سوائے دو یا زیادہ سے زیادہ تین گھرانوں کے کسی نے بھی مرزا غلام احمد کی ''نبوت و مہدیت'' کو قبول نہ کیا تھا۔ ایک گھر شیخ برادری سے اور ایک گھر سید برادری سے جماعت میں داخل ہوا۔ اس سید برادری سے جس نے مرزائی جماعت میں شمولیت اختیار کی تھی، میری کئی بار ملاقات ہوئی تو وہ بڑے احترام سے پیش آتا تھا اور جب بھی میں مرزائیت کا تذکرہ شروع کرتا تو وہ سر نیچا کر لیا کرتا تھا کہ: ''مولوی صاحب! اس بات کو نہ چھیڑیئے'' اور زبان حال سے کہتا ؎

نہ چھیڑو ہمیں ہم ستائے ہوئے ہیں
جدائی کے صدمے اُٹھائے ہوئے ہیں

اور ایک لفظ تک بھی ''مرزا یا مرزائیت'' کی تائید میں منہ سے نہ نکالتا تھا اور نہ ہی بحث کا انداز اختیار کیا کرتا تھا ورنہ کسی مرزائی کو کیسے گوارا تھا کہ وہ میرے ساتھ ملاقات کرتا یا میرے ساتھ احترام سے پیش آتا۔ مرزائیوں کی کیفیت تو یہ ہوتی تھی کہ گلے پڑ جاتے اور انٹ شنٹ دلائل سے ''مناظرہ'' شروع کر دیتے تھے۔ بات یہ تھی کہ یہ شاہ صاحب سید شاہ چراغ کے قریبی رشتہ دار تھے اور صاحب جائیداد تھے۔ ان کی اراضی کے چاروں طرف مرزائیوں کی جائیداد تھی اور یہ سفاک ایسی صورت میں کسی غیر مرزائی کو کیسے چین سے زندہ رہنے دیتے تھے۔ جائیداد تو پیر شاہ چراغ کی بھی مرزائیوں کے ساتھ ملی ہوئی تھی لیکن وہ دل کے مضبوط تھے اور ان کا ''حلقۂ مریدین'' بھی تھا اور وہ تھے بھی بڑے سمجھدار اور حوصلہ مند۔ پیر سید چراغ شاہ اپنے بزرگوں کا سالانہ عرس کرتے تھے، ہزاروں کا اجتماع ہوتا تھا۔ جالندھر سے چوٹی کے قوال منگاتے تھے۔ بٹالہ سے ہزاروں کی تعداد میں

لوگ ''محفلِ سماع'' میں شرکت کرتے تھے، ہم بھی شامل ہوتے تھے مگر وہ اس بھاری اجتماع میں قادیانیوں کے خلاف تقریر یا تردید کے روادار نہ تھے اور نہ ہی کسی کو تقریر کی اجازت دیتے تھے تاکہ جلسہ کی صورت نہ ہو جائے اور ''خالص عرس'' کا انداز قائم رہے۔ مرزائی ان سے اس لیے بھی زیادہ چھیڑ چھاڑ نہ کرتے تھے تاکہ مرزائیوں کی جارحیت قادیان سے باہر عوام میں نہ پھیلے۔

ہاں تو میں بتا رہا تھا کہ قادیان کے اصل باشندوں نے اس نئے مذہب کو قبول نہیں کیا تھا اور اگر کیا تھا تو بہت کم لوگوں نے۔ خود مرزا کے اپنے خاندان نے بھی مرزا کی دعوت کو قبول نہ کیا تھا، مثلاً مرزا نظام الدین جو مرزا غلام احمد قادیانی کے چچازاد بھائی تھے۔ مرزا کے سخت مخالف تھے۔ مرزا غلام احمد قادیانی نے مرزا نظام الدین کی مخالفت کا تذکرہ بہت دکھ بھرے انداز میں کیا ہے کہ: ''وہ ہمارے ''منارۃ المسیح'' کی تعمیر میں رکاوٹیں ڈالتے تھے!''

اصل بات یہ ہے کہ اپنے جس معبد میں مرزا غلام احمد قادیانی نے یہ مینار تعمیر کیا ہے، اس کی جائے وقوع تمام قصبہ سے بلند ہے اور پھر مینار کی بلندی سے تمام قصبہ اس کی زد میں آ جاتا ہے اور مینار پر چڑھنے والا تمام عورتوں کو جو گھروں میں بیٹھی ہوں، دیکھ سکتا ہے۔ اس لیے مرزا نظام الدین کہتا تھا کہ ''یہ شخص جس نے مذہبی جامہ اوڑھ رکھا ہے دراصل ''کنجر ذہنیت'' کا ہے اور لوگوں کی بے پردگی کرنا چاہتا ہے!'' مرزا غلام احمد قادیانی اپنی عبادت گاہ کی تعمیر کے ڈانڈے مسجد اقصیٰ سے ملانا چاہتا تھا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول جس مینار سے ہوگا، اپنے اس مینار کو دمشق کی جامع مسجد والے حدیث میں نامزد مینار کا مثیل بنانا چاہتا تھا اس لیے اس نے اپنے معبد کا نام (معاذ اللہ) ''مسجد اقصیٰ'' اور اپنے نو تعمیر مینار کا نام ''منارۃ المسیح'' رکھ چھوڑا تھا اور وہ اُس اصل کی ''نقل'' کر رہا تھا!

ادھر مرزا نظام الدین ''مرزائی مینار'' کی تعمیر کی تیاریوں کے دوران ہی مر گئے اور کوئی انھیں پوچھنے والا نہ رہا۔ مرزا نظام الدین ایک معصوم بچہ چھوڑ کر مرے تھے جس کا مرزا محمود کے سوا کوئی والی وارث نہ تھا، اسی کے رحم و کرم پر تھا۔ جائیداد تھی لیکن سب کچھ مرزا محمود کے تصرف میں تھا۔ اس بچے کا نام مرزا گل محمد تھا۔ راقم الحروف کی ملاقات مرزا گل محمد سے بھی ہوئی۔ اس بچہ کی پرورش اس انداز میں ہوئی اور اُسے ایسی سوسائٹی کے حوالہ کیا گیا تھا کہ بیچارہ نہ ''مرزائی'' تھا نہ ''مسلم۔'' شراب میں دُھت رہنا اس کا معمول تھا، ورنہ بہ حیثیتِ انسان وہ بڑا منکسر المزاج انسان تھا۔ مجھے بڑے احترام سے ملتا تھا اور غالباً اب بھی زندہ ہے۔ لیکن اب وہ کوئی قابلِ ذکر انسان نہیں ہے، جس ڈگر پر اس کی پرورش ہوئی اسی پر چل رہا ہے۔ مرزا گل محمد کے دو چچا تھے ان میں سے ایک کا نام مرزا امام الدین تھا اور دوسرے کا نام مرزا کمال الدین تھا۔ یہ دونوں دنیا کے آدمی نہیں تھے بلکہ درویش منش،

اس دنیا سے الگ ایک دوسری دنیا میں بسیرا کرتے تھے اور اس وقت کائنات سے رخصت ہو چکے ہیں۔ ان میں سے ایک بالمیکیوں بھنگیوں کا ''پیر'' بن گیا تھا اور اس نے خاصا کام چلا لیا تھا۔ ملک بھر کے بالمیکی چوہڑے اس کے پاس جمع ہوتے تھے اور دوسرا الگ تھلگ گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتا رہا، اور اطراف واکناف سے عورتیں تعویذ گنڈے کے لیے اس کے پاس آتی تھیں۔ کسی نے طعنہ دیا کہ ''تو ان عورتوں پر گزارہ کرتا اور دل بہلاتا ہے۔'' تو اس بدعقل اور بدبخت نے مشتعل اور مخبوط ہو کر آلہ تناسل کاٹ کر دور پھینک دیا تھا۔ اس کے پاس 'ملنگوں' کا بڑا ہجوم رہتا تھا اور وہ اپنی جائیداد کی آمدنی انھیں کھلا پلا دیتا تھا۔ وفات سے پہلے ایک ملنگ کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا اور اپنی گدی اس کی سپردگی میں ''وقف'' کر دی تھی۔ شہر سے باہر آموں کا ایک باغیچہ تھا، وہاں کچے مکان بنا کر اس نے اپنی رہائش گاہ بنا رکھی تھی۔ وہ طبعاً تو ایک پاک نفس غازی انسان تھا، مگر غلط قسم کی فقیری کی وجہ سے اس کی یہ خلاف سنت حالت ہوگئی تھی! جمعہ میرے ہاں آ کر پڑھتا تھا اور انکسار اور تواضع سے ملتا تھا۔ کبھی میں بھی اس کے ڈیرے پر چلا جاتا تھا۔ وہ میری کچھ نہ کچھ مالی امداد بھی کرتا تھا۔ وہ بڑا نیک نام آدمی تھا۔ مرزائیت کے پنجہ سے بچا ہوا تھا۔ مختصر ملاقات میں جو گفتگو اس سے ہوتی تھی اس کی روشنی میں ''صحیح العقیدہ'' معلوم ہوتا تھا اور بڑا کم گو اور بے ضرر انسان تھا۔ شادی بیاہ کے جھنجٹ سے آزاد اور گوشہ نشین خلوت پسند آدمی تھا۔ گو وہ نماز جمعہ میرے ساتھ ادا کرتا تھا اور مرزائیت سے شدید نفرت کرتا تھا، لیکن مرزائی اس سے بہت کم تعرض کرتے تھے اور اس نے بھی کبھی ان کی شکایت نہیں کی تھی۔

سمال ٹاؤن کمیٹی قصبہ کا انتظام کرتی تھی اور اس پر مرزائیوں کا قبضہ وتصرف تھا۔ چھ وارڈ تھے مگر صرف تین میں مرزائیوں کی اکثریت تھی اور بقیہ تین وارڈ میں غیر مرزائی یعنی ہندو، سکھ اور مسلم بستے تھے۔ مگر بغیر مرزائیوں کی مرضی کے کوئی ممبر منتخب نہیں ہوسکتا تھا کیونکہ وہ ان محلوں کے مرزائی گھروں میں سینکڑوں فرضی ووٹ بنا دیتے تھے اور جعلی ووٹ بنانے اور ڈالنے سے انھیں کوئی دریغ نہیں تھا کیونکہ انھیں اقتصادی وسیاسی برتری حاصل تھی جسے وہ ہر موقع پر استعمال میں لاتے تھے، وہ کبھی کبھی جس ہندو یا سکھ کو اپنے ڈھب کا خیال کرتے اس کو بھی ممبر بنا دیتے تھے۔

پورے قصبہ کے گرد کسی زمانہ میں مٹی کی بنی ہوئی بڑی موٹی فصیل تھی اور پھر اس کے گرد خندق بھی تھی۔ فصیل کا زیادہ حصہ اب گر چکا تھا اور خندق صرف نشیبی انداز اختیار کر چکی تھی۔ عموماً تین ماہ بارش ہوتی اور وہ تمام نشیبی حصہ جو کبھی خندق تھی، پانی سے بھر کر بڑا جوہڑ بن جاتا تھا اور قصبہ میں داخل ہونے والے تمام راستے مسدود ہو کر رہ جاتے تھے۔ قصبہ میں داخلہ کے لیے کچی پلیاں بنانی پڑتی تھیں، اپنے راستوں میں تو مرزائی یہ پلیاں ''سمال ٹاؤن کمیٹی'' سے بنوا لیتے تھے اور دوسرے لوگ

برسات کے موسم میں بڑی مشکلات سے دو چار رہتے تھے۔ ایک دفعہ اس جوہڑ سے ایک ''انسانی کچا بچہ'' برآمد ہوا۔ پولیس کی تفتیش میں بچہ ''مرزائی خلیفہ'' کی ''کنواری لڑکی'' کا ثابت ہوا۔ میری جوانی کا زمانہ تھا اور ان کی حرکات کی وجہ سے طبیعت میں غصہ بھی تھا۔ میں نے جمعہ کے خطبہ میں اس کا تذکرہ کر دیا، پھر کیا تھا، مرزائیت کی دنیا میں ایک غضب کا شور برپا ہوگیا لیکن میرا کیا کر سکتے تھے، ان کے ''جن'' بڑے سمجھ والے تھے، سوچ سمجھ کر ایکشن لیا کرتے تھے۔ میری جماعت ''احرار'' نے اعلان کر رکھا تھا کہ: ''اگر ہمارے آدمی کو نقصان پہنچا تو دوسرا آدمی ان کی جگہ لینے کے لیے تیار بیٹھا ہے اور مزید برآں کہ پھر ملک بھر میں مرزائی خلیفہ سمیت کوئی عام مرزائی بھی احرار رضا کاروں اور مجاہدین کے ہاتھوں محفوظ اور مطمئن نہ رہ سکے گا۔'' اس لیے وہ مجھ پر ہاتھ اٹھانے سے پہلے نتائج پر غور کر لیتے تھے۔

تازہ اعلانات کے لیے مرزائیوں نے بورڈ نصب کر رکھے تھے اور وہ اپنے ''جماعتی اعلانات'' لکھ کر اپنی پوری مرزائی قوم کو باخبر رکھتے تھے۔ ہم نے بھی ایک مقام پر بورڈ نصب کر کے اپنی جماعت کو تازہ واقعات سے باخبر رکھنے کے لیے ''جماعتی اطلاعات'' لکھنی شروع کر دیں اور عموماً یہ اعلانات مرزائیوں سے تحفظ اور بچاؤ کے متعلق ہوتے تھے۔ ایک ''منچلا مرزائی'' آیا اور اس نے بورڈ پر سے ''مرزائی'' کا لفظ مٹا دیا۔ مجھے علم ہوا تو میں نے جا کر دوبارہ لکھ دیا۔ میں وہاں سے ہٹا تو اس نے مرزائی کا لفظ پھر مٹا دیا۔ مجھے علم ہوا تو میں نے پھر لکھ کر منادی کرا دی کہ ''ہم نے بورڈ لکھ دیا ہے۔ اب اگر کسی نے گڑبڑ کی تو پھر اسے کوئی ہمت والا ہی مٹائے گا۔'' چونکہ پولیس والوں نے بھی یہ منادی سنی تو اس بورڈ کی حفاظت کے لیے ایک ''پولیس سپاہی'' کی ڈیوٹی لگا دی اور اس کے بعد کسی کو بورڈ مٹانے کی ہمت نہ پڑی۔

مولوی عبدالکریم مباہلہ

ان کے والد مستری فضل کریم جالندھر سے ہجرت کر کے قادیان میں مستقلاً رہائش پذیر ہو گئے تھے۔ بڑے کاریگر مستری تھے۔ انھوں نے قادیان میں آ کر اپنے کاروبار کو شروع کیا۔ سوئیاں بنانے والی مشین ڈھال کر بناتے تھے۔ بڑا کاروبار چمکایا۔ ''بہشتی مقبرہ کے قریب زمین لے کر عالی شان مکان بنایا۔ خدا نے دو لڑکے دیے تھے، بڑے کا نام عبدالکریم تھا جو بعد میں ''عبدالکریم مباہلہ'' کے نام سے مشہور ہوئے اور دوسرے کا نام ''زاہد'' تھا۔ زاہد تو قادیان کی رہائش کے دنوں معصوم بچہ تھا۔ عبدالکریم کو لکھایا پڑھایا، پہلے میٹرک اور پھر ''مولوی فاضل'' ہوا اور ''مرزائیوں کی مبلغ ٹیم'' میں شامل ہوگیا، جو مسلمانوں کو ''مرزائی'' بنانے کا منحوس مشغلہ رکھتی تھی۔ مولوی عبدالکریم مرزائیوں کے

بڑے کامیاب مبلغ تھے۔ انھوں نے طول و عرضِ ملک میں جا کر مرزا غلام احمد کی ''نبوتِ کاذبہ'' کا پروپیگنڈہ کیا۔ جماعت اور خلیفۂ قادیان کا قرب اور اعتماد حاصل کیا اور ترقی کی راہ پر بڑی تیزی سے گامزن ہو کر جماعت میں امتیازی مقام حاصل کر لیا۔ مگر اللہ کی شان ہے کہ یکدم ان پر کوئی ناگہانی تودہ گرا اور ان کی دنیا ہی بدل گئی۔ غالباً خلیفۂ قادیان کے کریکٹر کی کمزوری انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لی تھی اور یکدم ان کے ظاہر و باطن کی کایا پلٹ گئی۔ نماز روزہ ترک کر دیا بلکہ خدائی وجود کے بھی منکر ہو گئے۔ وجہ یہ تھی کہ عبدالکریم مذہب کے بڑے متوالے، عبادت گزار اور تہجد خوان تھے۔ خلیفہ پر اس حد تک اعتقاد رکھتے تھے کہ اسے ''خدا کا نائب'' اور ''پیغمبر'' خیال کرتے تھے۔ اس اعتقاد کو جب اچانک شدید ٹھوکر لگی تو ان کے مذہب کا سارا محل پاش پاش اور زمیں بوس ہو گیا۔ اور وہ ہمارے کیمپ میں آ گئے۔ وہ بہ ظاہر ہمارا ساتھ دے رہے تھے اور ہمارے انداز میں گفتگو کرتے تھے اور ہماری طرح ختم نبوت اور دیگر مسائل پر مرزائیت کے خلاف تقاریر کرتے تھے اور ان تقاریر کا لبادہ ''سنی مسلمانوں'' کی طرح مذہبی ہوتا تھا، مگر وہ اندرونی طور پر مذہب سے بیزار تھے۔ خلیفہ محمود پر قیاس کر کے تمام مذہبی امور کو ایک فراڈ خیال کرتے تھے۔ مذہبی لبادہ انھوں نے اس ضرورت کے تحت اوڑھے رکھا کہ اس کے بغیر وہ ہمارے ساتھ چل نہیں سکتے تھے۔ مرزائیوں کی مخالفت ان کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے تھی۔ ایک عرصہ تک ان کی یہ کیفیت رہی، لیکن قیام پاکستان کے بعد آہستہ آہستہ ان میں تبدیلی شروع ہوئی اور اس کی تکمیل ''حضرت سیّد علی ہجویری'' گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ کے مزار پر حاضر ہونے سے ہوئی اور انھیں حضرت ہجویری کی باطنی توجہ سے دوبارہ اسلام نصیب ہوا۔ میرا ان سے بڑا گہرا تعلق رہا اور یہ کیفیت انھوں نے خود مجھے بتائی۔ اب ان کا انتقال ہو چکا ہے اور مرنے سے پہلے وہ ''صحیح العقیدہ سنی حنفی مسلمان'' ہو چکے تھے۔ اللہ تعالیٰ انھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور انھیں جنت الفردوس نصیب کرے۔ آمین، ثم آمین۔

خلیفہ محمود کے متعلق صحیح واقعات کا علم ہونے کے بعد مولوی صاحب خاموش بیٹھنے والے نہیں تھے۔ انھیں یہ خواہش بے چین کر رہی تھی کہ جس طرح ہو اور اس راہ میں خواہ کتنی ہی قربانی دینی پڑے، خلیفہ کے اصلی چہرہ کو بے نقاب کیا جائے۔ قادیان کے مسلمانوں سے رابطہ قائم رکھنا، احرار کا بحیثیت جماعت مرزائیوں کے خلاف جدوجہد کرنا، اور مجھے قادیان کی مستقل رہائش کے لیے اکسانا سب ان کے اس مقصد کے حصول کی ترتیب وار کڑیاں تھیں۔ پہلے انھوں نے انفرادی کوشش شروع کی اور مرزا محمود کے خلاف الزامات عائد کر کے اسے مباہلہ کا چیلنج دیا۔ مرزا محمود نے انٹ شنٹ جوابات سے ٹالا تو مولوی صاحب نے ''مباہلہ'' نامی اخبار نکالا جو اوّل سے آخر تک مرزائیت کے

خلاف ہوتا تھا اور اس میں الزامات کی فہرست کے بعد جلی قلم سے مباہلہ کے چیلنج کو دہرایا جاتا تھا۔ اسی باعث مولوی عبدالکریم صاحب ''مباہلہ'' کے نام سے مشہور ہو گئے۔

مولوی عبدالکریم کے قتل کی خفیہ سازش

یہ سب کچھ منظر عام پر آ چکا تھا اور مرزا محمود کی بدکرداری اور مولوی عبدالکریم کے الزامات کا چرچا ملک کے طول عرض میں پھیل کر عام گفتگو کا موضوع بن گیا تھا مگر مولوی صاحب کے مکان کی جائے وقوع ایسی تھی جہاں دور دور تک کسی مسلمان یا ہندو یا سکھ کا مکان نہ تھا اور وہ مکان خالص مرزائی آبادی میں گھرا ہوا تھا۔ اگر کسی غیر مرزائی کا مکان ان کے نزدیک بھی ہوتا تو پھر بھی ان کے لیے چنداں مفید نہ ہوتا، کیونکہ اس دور میں قادیان میں کسی مرزائی کے خلاف شہادت کا مہیا کرنا ناممکن تھا۔ خلیفہ نے یہ سکیم بنائی کہ مکان کو جلا کر مولوی صاحب کے پورے کنبے کو راکھ کر دیا جائے۔ حکام اپنے ہیں ہمیں پوچھنے والا کون ہے؟ چنانچہ ایک نامسعود رات کو مکان جلانے کا منصوبہ رات بارہ بجے کے بعد تھا مگر جس کو اللہ رکھے اسے کون چکھے؟ شنید ہے کہ مرزائیوں کے خلیفہ اوّل حکیم نورالدین کی بیوی جو مرزائی تھی اور ان کے ساتھ گھلی ملی ہوئی تھی اسے اس منصوبہ کا علم ہو گیا۔ یہ لوگ خود بھی خلیفہ سے بدظن تھے اور مولوی عبدالکریم کو ایک حد تک صحیح اور اس کے الزامات کو درست سمجھتے تھے۔ پڑوس میں ان کا مکان تھا اور عموماً ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا تھا۔ خدا نے اس کے دل میں القاء کیا کہ ''فوراً جاؤ اور میری مخلوق کو ہلاکت سے بچاؤ۔'' چنانچہ اس نے برقع سر پر لیا اور مولوی صاحب کے گھر جا کر مولوی عبدالکریم کے والد مستری فضل کریم کو بتایا کہ ''تم بے خطر بیٹھے ہو اور تمہاری موت کا منصوبہ تیار ہو چکا ہے۔ مال اسباب کی پرواہ مت کرو اور آہستہ سے جان بچانے کی فکر کرو۔'' مباہلہ خاندان کے لیے یہ عورت فرشتۂ آسمانی بن گئی، جس نے ان کے بچاؤ کا سامان مہیا کر دیا۔ دو بھائی تھے اور تیسرا بوڑھا باپ تھا۔ مرزائی پہریدار مطمئن تھے اور مکان سے دور بے خبر بیٹھے تھے۔ مولوی عبدالکریم ایسے انداز میں مکان چھوڑنے اور بچ نکلنے میں کامیاب ہوئے کہ کسی کو خبر تک بھی نہ ہوئی۔ مرزائیوں نے منصوبہ کے مطابق طے شدہ وقت پر مکان کو آگ لگا دی اور خود مکان کے اردگرد کھڑے ہو کر نگرانی کر رہے تھے تا کہ کوئی بھی فرد بچ کر نکلنے نہ پائے۔ مکان مکینوں سے سرِ شام خالی ہو چکا تھا۔ مکان جلتا رہا اور کسی مکین نے بچ نکلنے کی کوشش نہ کی تو انھیں اطمینان ہو گیا کہ پورا کنبہ جل کر راکھ ہو چکا ہے۔ دو تین دن کے بعد پتا چلا کہ مستری تو زندہ بخیر و عافیت امرتسر پہنچ چکے ہیں۔ خلیفہ کو جب ان کے زندہ بچ نکلنے کا علم ہوا تو وہ سٹ پٹایا اور منتظمین کو بلا کر سرزنش کی کہ: ''تمہارا کیا انتظام تھا کہ مستری زندہ مکان سے چلے گئے اور تمہارے پہرے ناکام ہوئے؟'' لیکن ان کم بختوں

کو پتا نہیں کہ مارنے رکھنے والا خدا ہے۔ خدا کے سامنے بندہ کی تدبیر کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ مکان جلنے کی خبر اخبارات میں آئی مگر حکومت نے کوئی ایکشن نہ لیا۔ وہ خود تو بچ نکلے مگر ہزاروں کا ''اثاث البیت'' مکان سمیت جل کر راکھ ہو گیا اور وہ ایک دفعہ تو کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گئے۔

مولوی عبدالکریم کے قتل کی دوسری کوشش

مولوی عبدالکریم کا اخبار مباہلہ امرتسر سے باقاعدہ طور سے ہفتہ وار نکل رہا تھا جو خلیفہ محمود اور مرزائیوں کے خلاف اپنا مشن پورا کر رہا تھا۔ قادیان میں ایک منصوبہ کے تحت اخبار میں عائد کردہ الزامات کے خلاف گورداسپور کی کچہری میں مولوی صاحب کے خلاف فوج داری استغاثہ دائر کیا گیا اور طے یہ پایا کہ جب وہ امرتسر سے تاریخ بھگتنے گورداسپور جائیں تو ایک آدمی لاری یا بس میں دن کی روشنی میں اور سواریوں کے سامنے مولوی صاحب کو قتل کر دے جس آدمی کی ڈیوٹی لگائی گئی اسے اطمینان دلایا گیا کہ ''ہم اسے مقدمۂ قتل سے بری کرا لیں گے۔''

چنانچہ ایک دن جبکہ مولوی صاحب اپنے ایک دوست الحاج مستری محمد حسین نامی کے ساتھ تاریخ بھگت کر بس میں واپس بٹالہ آ رہے تھے تو ایک پٹھان چھرے سے ان پر حملہ آور ہوا۔ قاتل جلدی میں تھا یا اسے مولوی صاحب کی پوری شناخت نہ تھی۔ مولوی صاحب تو بچنے میں کامیاب ہو گئے اور ان کا ساتھی مستری محمد حسین قتل ہو گیا اور خلیفہ صاحب کا یہ وار بھی خالی گیا۔ مستری محمد حسین مرحوم حضرت امیر شریعت کا مرید تھا۔ اس کے بھائی بٹالہ کے رہنے والے تھے اور بڑے کارخانہ دار تھے۔ قتل کا کیس رجسٹرڈ ہوا اور ضروری کارروائی کے بعد جرم ثابت ہو جانے پر قاتل گرفتار ہو گیا۔ خلیفہ صاحب نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور قاتل کو چھڑانے کے لیے ''پریوی کونسل لندن'' تک اپیل کی اور ہزاروں روپیہ پانی کی طرح بہایا مگر اس کی سزائے موت بحال رہی اور وہ پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ مرزائیوں نے اس کی لاش کو بہشتی مقبرہ میں دفن کر کے سفاکی کا ایک ریکارڈ قائم کر دیا۔

یہ تھے مولوی عبدالکریم مباہلہ جنھوں نے ہمیں تحریک قادیان کے لیے آمادہ کیا، مگر افسوس ہے کہ جن حضرات نے اس تحریک میں بھرپور حصہ لیا اور قربانیاں دیں وہ تمام دوست ایک ایک کر کے اللہ کو پیارے ہو گئے اور انھوں نے تحریکِ ختم نبوت کی موجودہ کامیابی کو نہ دیکھا جبکہ تحریک کا بنیادی مطالبہ کافی حد تک پورا ہوا اور مرزائیوں کو جداگانہ اقلیت قرار دے کر ''مسلمانوں کی صف'' سے باہر نکال دیا گیا۔ ان دوستوں میں سے صرف میں ہی زندہ ہوں اور تحریک کی کامیابی کو دیکھ کر پھولے نہیں سماتا۔ جب قادیان میں باقاعدہ کام شروع ہو گیا تو جماعت نے ایک ''غیر سیاسی تبلیغی شعبہ'' قائم کر دیا جس کے جنرل سیکرٹری مولوی عبدالکریم مباہلہ قرار پائے اور بہت سے مبلغ جن کو شعبہ تبلیغ باقاعدہ

ماہانہ تنخواہ دیتا تھا، ان سب کا کنٹرول مولوی عبدالکریم مباہلہ کے ہاتھ میں تھا۔ باقاعدہ حساب کی چیکنگ ہوتی تھی۔

قادیان میں ''احرار'' تبلیغ کانفرنس

احباب جماعت کے عام جذبہ کے تحت خصوصی مشورہ کے ساتھ یہ قرار پایا کہ قادیان میں ایک عظیم الشان تبلیغ کانفرنس بلائی جائے جس میں ہر مکتب فکر کے علماء کو دعوت دی جائے۔ مرزائیوں کو خبر ہوئی تو انھوں نے اپنے ''بابا انگریز'' کے دربار میں دہائی دی کہ ''قادیان ہمارا مقدس مقام ہے اور یہاں ہماری اکثریت ہے اس لیے یہاں احرار کانفرنس نہیں ہونی چاہیے۔'' ہمارا موقف یہ تھا کہ ملک میں ہمارے بیسوں مقدس مقامات ہیں اور یہ لوگ وہاں جا کر جلسے کرتے ہیں اور اسی طرح جہاں تک اکثریت کا سوال ہے قادیان کے سوا ہر جگہ ہماری اکثریت ہے اور ہر جگہ مرزائی اقلیت میں ہیں۔ پھر انھیں وہاں جلسے نہیں کرنے چاہئیں، حالانکہ وہ ہر جگہ بے روک ٹوک جلسے کرتے ہیں۔ انھیں ہماری اکثریت میں جلسے کرنے کی اجازت ہے تو پھر ہمیں بھی ان کی اکثریت میں جلسہ کرنے کی اجازت لازماً ملنی چاہیے۔'' انگریز بڑا ہوشمند حاکم تھا اور باوجودیکہ وہ مرزائیوں کا ''جنم داتا'' تھا اور ان کی سرپرستی بھی انگریز نے اپنے ذمہ لے رکھی تھی، مگر وہ ہمارے استدلال کے سامنے جھک گیا اور کانفرنس کی اجازت دے دی۔ انگریز کے سامنے اپنے پرائے کے سوال سے زیادہ اہمیت عوامی جذبات اور تیور کو تھی۔ وہ رائے عامہ کا بڑے غور سے مطالعہ کرتا تھا اور عموماً رائے عامہ کے مطابق عوامی فیصلے صادر کرتا تھا۔ عوام چاہتے تھے اس لیے انگریز کو چار و ناچار عوامی رائے کے سامنے جھکنا پڑا اور وہ مرزائیوں کے شور و غوغا کے باوجود ''احرار تبلیغ کانفرنس'' کی اجازت دینے پر مجبور ہو گیا۔

قادیان مرزائیوں کی واحد ملکیت تھی، وہ اپنی مملوکہ اراضی پر احرار کانفرنس کا انعقاد کب گوارا کر سکتے تھے؟ اگرچہ ہندوؤں اور سکھوں کی مملوکہ اراضی کے ٹکڑے بھی قادیان کی آبادی میں موجود تھے لیکن ایسا وسیع قطعۂ زمین کوئی بھی نہ تھا جہاں اتنی بڑی کانفرنس کا انعقاد ممکن ہو۔ قادیان کی آبادی کے عین متصل موضع ''رجادہ'' کے ایک سکھ ''ایشر سنگھ'' کا وسیع قطعۂ اراضی موجود تھا۔ یہ ایشر سنگھ میرا بڑا معتقد تھا اور میرے خطبۂ جمعہ میں عموماً حاضر ہو کر محظوظ ہوتا تھا۔ اس نے خود پیشکش کی کہ: ''میری اراضی آپ لوگوں کے لیے وقف ہے اور کوئی دوسری خدمت ہو تو میں حاضر ہوں۔'' بڑی مسرت ہوئی کہ یہ خطہ جلسہ کے لیے موزوں ترین جگہ ہے۔ مرزائیوں کو جب علم ہوا تو وہ تفکر اور سوچ میں ڈوب گئے کہ ''اب اس جگہ انعقادِ جلسہ میں کس طرح رکاوٹ ڈالی جائے؟'' چنانچہ انھوں نے پہلے تو ایشر سنگھ پر اپنی طاقت کا دباؤ ڈالا۔ جب وہ نہ مانا تو منت سماجت پر اتر آئے لیکن وہ چٹان کی

طرح مضبوط تھا۔ راضی تو کیا ہوتا، وہ تو رات دن انتظام جلسہ کے لیے ہماری معاونت کر رہا تھا اور مرزائیوں کی طاقت کو پرکاہِ کے برابر بھی خاطر میں نہ لاتا تھا۔ جب ان کا یہ حربہ بھی ناکام رہا تو انھیں ایک دوسری راہ سوجھی۔ ایشر سنگھ کی اراضی چاروں طرف سے مرزائیوں کی اراضی میں گھری ہوئی تھی۔ انھوں نے ایک رات میں ایشر سنگھ کی اراضی کے اردگرد اپنی اراضی پر دیوار کھڑی کر دی۔ صبح اٹھے تو نقشہ ہی بدلا ہوا تھا اور ابلیس کی سکیم کامیاب ہو چکی تھی۔ ایشر سنگھ کی اراضی میں داخلہ کے تمام راستے مسدود تھے اور اتنی جلدی میں کوئی قانونی کارروائی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لیے ہمیں ناچار ایشر سنگھ کی اراضی میں کانفرنس کا ارادہ بھی ترک کرنا پڑ گیا۔ مرزائیوں کی اس شیطانی حرکت کی جب ہندوؤں کو اطلاع ہوئی تو وہ آئے اور اپنی اراضی کی پیشکش کی جو قادیان سے جانب غرب فرلانگ، ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلہ پر واقع ہے اور وہاں سے لاؤڈ سپیکر کی آواز قصبہ میں بہ آسانی سنی اور سمجھی جا سکتی تھی۔ دراصل یہ اراضی بھی موضع رجادہ کے سکھوں کی ملکیت تھی اور آریا ہندوؤں نے اسے خرید کر وہاں اپنا ''ڈی۔اے۔وی ہائی سکول'' اور ایک مختصر سا ''گیسٹ ہاؤس'' تعمیر کر رکھا تھا۔ یہ سکول کی اراضی کئی ایکڑوں میں پھیلی ہوئی تھی اور اس پر ہائی سکول کی ''عالی شان'' عمارت تعمیر کی گئی تھی۔ ہندوؤں نے یہ اراضی مع بلڈنگ کانفرنس کے لیے استعمال کرنے کی پیشکش کی، جسے ہم نے نہایت خوشی اور شادمانی سے قبول کر لیا اور اس غیبی تائید کے ذریعہ انعقادِ جلسہ کا مسئلہ حل ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ کارساز ہے، اگر یہ سبب نہ بنتا تو بڑی جماعتی سبکی ہوتی اور سب سے زیادہ اعتراض مجھ پر ہوتا کہ ''جب جلسہ کے انعقاد کے لیے اراضی ہی نہ تھی تو پھر تم نے خواہ مخواہ جماعت کو انعقادِ کانفرنس پر کیوں آمادہ کیا کیونکہ یہ کانفرنس میری تحریک پر جماعت نے منظور کی تھی۔

خدا خدا کر کے یہ مسئلہ حل ہوا تو کانفرنس کے انتظامات شروع ہوئے۔ ایک بہت بڑا پنڈال تیار کیا گیا جس کے لیے امرتسر سے ٹینٹ اور خیمے منگائے گئے۔ پنڈال کے اردگرد مہمانوں کی رہائش کے لیے خیمے نصب کیے گئے تھے جو سینکڑوں کی تعداد میں تھے۔ پنڈال اتنا وسیع تھا کہ بیک وقت اس میں ایک لاکھ سامعین بیٹھ سکتے تھے اور اس کا وہ حصہ جو لیڈروں اور علماء کے بیٹھنے کے لیے مخصوص تھا وہ ذرا اونچا تھا اور اس پر قالین بچھائے گئے تھے۔ عوام کے بیٹھنے کے لیے دریوں کا معقول انتظام کیا گیا تھا۔ کانفرنس کے کاروبار کو صحیح اور منظم رکھنے کے لیے بڑے عمدہ طریق پر تقسیم کار کی شکل میں تمام کارکنوں کو الگ الگ ذمہ داریاں سونپی گئی تھیں۔ سٹیج سیکرٹری اور پنڈال کے انتظامات امرتسر کے مشہور عالم دین حضرت مولانا نور احمد صاحب پسروری نقش بندی مجددی رحمتہ اللہ علیہ کے صاحب زادگان کے سپرد تھا۔ مولانا کے ہونہار صاحب زادگان میں ایک کا نام محمد سلیمان اور دوسرے کا نام محمد

داؤد تھا۔ یہ دونوں بھائی اجلے لباس میں ملبوس اور سینہ پر ''ریشم سے بنے ہوئے گلاب کے پھول'' چسپاں کیے ہوئے کتنے بھلے معلوم ہوتے تھے۔ یہ دونوں بھائی امرتسر کی مسلم سوسائٹی میں بڑے معزز خیال کیے جاتے تھے اور دونوں زیورِ تعلیم سے آراستہ تھے۔ پنجاب یونیورسٹی کے بی اے اور دینی علوم میں بھی اچھی دسترس رکھتے تھے، خوبصورت نوجوان تھے اور ہمارے پنڈال کی زینت تھے۔ افسوس کہ آج وہ ہم میں نہیں ہیں اور اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ مولوی محمد داؤد تو لاولد فوت ہوئے اور صرف ایک لڑکی نشانی چھوڑی تھی۔ تقسیم کے بعد دونوں بھائی لاہور آباد ہوئے۔ امرتسر میں ان کا بڑا مقام تھا۔ لاہور آتے ہی صدمہ سے مولوی داؤد کا انتقال ہو گیا۔ (میرے خیال میں یہ سہو اور مغالطہ ہے۔ مولانا محمد داؤد مرحوم تقسیم سے کچھ پہلے امرتسر میں ہی اچانک اور حادثۃً انتقال کر گئے تھے۔ ابو معاویہ) مولوی محمد سلیمان نے لاہور میں انارکلی کے باہر والے حصہ میں کتابوں کی دکان کھولی تھی۔ وہاں ان سے راقم الحروف کی متعدد بار ملاقات ہوئی۔ بڑی شان دار دکان تھی مگر مولوی صاحب کے چہرہ پر افسردگی چھائی رہتی تھی۔ کچھ انتقالِ آبادی سے ہونے والے ہمہ قسم کا نقصانات کا صدمہ تھا اور سنا ہے کہ زیادہ پریشانی انھیں اولاد کی وجہ سے رہتی تھی کیونکہ اولاد نالائق تھی اور انھیں ہر وقت پریشانی میں مبتلا رکھتی تھی۔

میں کانفرنس کے مسئلہ کو چھوڑ کر جلسہ کے سیکرٹریوں کے حالات میں مصروف ہو کر ذرا دور چلا گیا تھا، اس لیے اب پھر اپنے مقصد کی جانب لوٹتا ہوں۔ انعقادِ کانفرنس کی جائے وقوع ایک کھلا وسیع میدان تھا مگر حاضری اتنی تھی کہ کھوے سے کھوا چھلتا تھا اور اگر کوئی شخص اپنے ساتھی سے ایک دفعہ جدا ہو جاتا تو پھر اس کا ملنا یا ڈھونڈھنا محال تھا۔ صحیح حاضری کی تعداد تو خدا کو معلوم ہے مگر میرے خیال میں ایک لاکھ سے کیا کم ہو گی۔ سی۔ آئی۔ ڈی جو حزبِ اختلاف کی اہمیت کو کم دکھانے کے لیے ازل سے عادی ہے، وہ بھی اپنی کمزور ڈائری میں پچاس ہزار لکھنے پر مجبور ہو گئی۔ صوبہ بھر سے سینکڑوں کی تعداد میں ہر مکتبِ فکر کے علماء آئے ہوئے تھے۔ مولانا ابوالحسنات خطیب مسجد وزیر خاں بھی بچ بچا کر محتاط انداز میں تشریف لائے تھے کیونکہ انھیں احرار سے کچھ مسلکی اختلاف تھا۔ وہ میرے مہمانِ خصوصی تھے۔ وجہ یہ تھی کہ وہ میرے ہم مسلک تھے۔ کانفرنس میں شامل ہونے والے علمائے کرام بے شمار تھے۔ ان میں سے بعض کی تقاریر بھی ہوئیں۔ مولانا ظفر علی خان نے بھی دھواں دھار تقریر کی لیکن سید الاحرار امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریر کا بہت چرچا ہوا اور اسے بہت پسند کیا گیا۔ عشاء کی نماز جلدی پڑھ کر وہ سٹیج پر تشریف لائے۔ پنڈال اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھا۔ آپ نے تلاوت شروع کی، سناٹا چھا گیا، اور چاروں طرف خاموشی کا دلنواز سماں چڑھ گیا۔ شاہ صاحب نے پہلے پارہ کا دوسرا رکوع تلاوت فرمایا:

"وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ آمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ."

اِدھر وہ قرآن سنا رہے تھے، اُدھر یہ محسوس ہو رہا تھا کہ قرآن آج نازل ہو رہا ہے اور صفا مروہ کی پہاڑیوں میں گونجی ہوئی سورۃ، قادیان کے افق سے اُتر رہی ہے۔ شاہ صاحب نے پورا رکوع تلاوت فرمایا اور اس عمدہ خوش الحانی سے پڑھا کہ گویا ایک لاکھ کا مجمع شاہ صاحب سے آرزو کر رہا ہے کہ "حضرت تقریر کی بجائے ہماری روحانی تسکین کے لیے آپ صرف تلاوت کرتے رہیں۔" بہرحال تلاوت ختم ہوئی اور تقریر شروع ہوئی تو ایک ایک فقرہ دل کے پار اتر رہا تھا۔ راقم الحروف سٹیج پر حضرت شاہ صاحب کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ دماغی حالت یہ تھی کہ گویا ہوش و حواس گم ہیں اور ایک ایسا حظ محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی کیفیت بیان کرنے سے قلم قاصر ہے اور چاہت یہ تھی کہ عمر گزر جائے مگر اس حظ کا سلسلہ منقطع نہ ہو۔ تقریر کیا تھی، گویا منافقینِ نبوت کا تیرا صد سالہ گزشتہ اندازِ زندگی آنکھوں کے سامنے مجسم کھڑا تھا اور ہم ان گزشتہ نقوش کو نہایت آسانی سے پڑھ رہے ہیں۔ گویا زمانہ تیرہ صد سال پیچھے چلا گیا اور ہم وہ دور برأی العین دیکھ رہے ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صبر و استقامت کو دیکھ کر عش عش کر رہے ہیں، اور نبوت سے اپنا تعلق مضبوط کر کے اپنے ایمان کو تازہ کر رہے ہیں، اور ہمارے ایمان و ایقان میں اضافہ ہو رہا ہے۔ آپ جب ترجمہ وتفسیرِ قرآن سے فارغ ہوئے تو قادیانی مسائل کا سلسلہ شروع ہوا۔ "قادیانی ٹُرل مینارہ" جسے وہ "منارۃ المسیح" کہہ کر حقیقت کا منہ چڑاتے ہیں، شاہ صاحب کی آنکھوں کے سامنے نظر آ رہا تھا۔ قادیانی مسائل میں اس مذہب کا بانی شاہ صاحب کا مخاطب تھا۔ شاہ صاحب کی زبان سے علم و عرفان کے چشمے اُبل رہے تھے اور ایک لاکھ کا مجمع ہمہ تن گوش ہو کر بیٹھا سن رہا تھا۔ کیا مجال کہ کہیں سے کوئی پتا بھی سرک جائے؟ یا کسی کی آنکھ سے نیند کا گزر ہو۔ یہ سلسلہ صبح کی اذان تک جاری رہا۔ جب صبح کی اذان ہوئی تو شاہ صاحب کی زبان رکنے اور ختم کرنے کے موڈ میں آئی تو مجمع نے زبانِ حال سے پکار کر کہا ۔

مؤذن بانگ بے ہنگام برداشت

اور شاہ صاحب کی تقریر ختم ہو گئی۔ شاہ صاحب کی تقریر کی تسوید ممکن نہیں اور نہ ہی کسی کا حافظہ اس حد تک کامیابی کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ تقریر کے مخصوص حصص مسٹر جی۔ ڈی۔ کھوسلا سیشن جج نے اپنے فیصلہ میں درج کیے ہیں۔ میں وہ فیصلہ من و عن نقل کر دوں گا۔ اسے پڑھ کر قارئین محظوظ ہو سکتے ہیں۔

چودھری افضل حق مرحوم جو ہماری جماعت کا دل و دماغ تھے، گڑھ شنکر ضلع ہوشیار پور کے ایک معزز راجپوت خاندان کے فرد تھے۔ پولیس میں تھانیدار بھرتی ہوئے تھے، آج سے ساٹھ برس

پہلے انگریز کے دور میں ایسی ملازمت خاندانی اہمیّت کا پتا دیتی تھی۔ چودھری صاحب کے بڑے بھائی پولیس میں سپرنٹنڈنٹ تھے اور یہ عہدہ اس دور میں عموماً انگریزوں کے سپرد ہوتا تھا۔ ملک میں خاص خاص خاندان ہی اس اہم عہدہ کے قابل سمجھے جاتے تھے۔ چودھری صاحب نے تھانیداری دور کے کچھ واقعات اپنی کتاب ''میرا افسانہ'' میں سپردِ قلم کیے ہیں۔ شائقین حضرات انھیں پڑھ کر حظ اٹھا سکتے ہیں۔ ''تحریکِ خلافت'' کا دور آیا اور انگریزی حکومت تھانیداروں سے تحریک کے خلاف کام لینے لگی تو چودھری صاحب کی رگِ حمیت پھڑکی اور وہ لدھیانہ میں اپنی ملازمت اور ڈیوٹی کے دوران حضرت امیرِ شریعت کی ایک جدت نوعیت اور تاثیر کا شہکار تقریر سن کر انگریز کے باغی بن گئے اور تھانیداری چھوڑ کر خلافِ توقع خود ایک باغیانہ تقریر کر کے جیل چلے گئے اور زندگی بھر انگریزوں کے خلاف برسرِ پیکار رہے مگر افسوس کہ 8 جنوری 1942ء میں آپ کا انتقال ہوگیا اور وہ اپنی آنکھوں سے اپنے دشمن کا زوال نہ دیکھ پائے لیکن اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ سکیم انہی کی تیار کردہ تھی جس نے انگریز کو دور پھینک کر خلاصی حاصل کرلی۔ آپ مرزائیوں کے شدید دشمن تھے، اور ان کے خلاف چلنے والی تحریک کی نہایت ذمہ داری سے رہنمائی کرتے رہے جو آخرکار کامیاب ہوئی اور قادیانی ''راندۂ درگاہ'' قرار پائے۔ اے کاش! کہ وہ اس کامیابی کو دیکھ سکتے مگر افسوس کہ وہ کامیابی سے قبل ہی اللہ کو پیارے ہوگئے۔ اس تحریک کے جو مجاہد پہلی صف میں کھڑے آمادۂ جہاد رہے، ان میں سے میرے سوا اب شاید کوئی زندہ نہیں رہا۔

کانفرنس سے بعد کے حالات

الغرض بہت سی رکاوٹوں کے باوجود بھی اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور مدد کے ساتھ قادیان میں احرار کانفرنس ہوئی اور بڑی شان سے ہوئی۔ ''مرزائی ایوانِ تقدس واستحکام'' میں دراڑ پڑ گئی۔ مرزائی سراسیمہ ہوکر اپنے مربی انگریز کے دربار میں گئے اور آہ وفغاں اور نالہ وشیون کرتے ہوئے التجاء کی کہ ''ہمارا سہارا آپ کے بغیر کون ہے؟'' انگریز بہادر نے دستِ شفقت پھیرتے ہوئے کہا ''کہیے ہم اس معاملہ میں کیا کر سکتے ہیں؟'' تو انھوں نے کہا: ''حضور ساری دنیا کو تو نہیں مارا جا سکتا، البتہ بخاری پر مقدمہ چلا کر جیل بھیج دیا جائے تو ہمارے زخموں کا ایک حد تک مداوا ہوسکتا ہے۔'' یہ داستانِ فریاد چودھری افضل حق کی زبانی سنیے اور حظ اٹھایئے: چودھری صاحب تحریر فرماتے ہیں:

> ''کانفرنس کی کامیابی نے دوست دشمن کو حیران کر دیا۔ مرزائی تو جل گئے اور جلدی جلدی حکام کے پاس پہنچے کہ ''لو سرکار! بخاری نے دل کا بخار نکالا۔'' بڑے مرزا کی توہین کی۔ چھوٹے مرزا کے الگ بخیے ادھیڑے۔ اگر آپ

نے مدد نہ کی تو کب کام آؤ گے؟'' سرکار نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، بخاری صاحب کو گرفتار کر کے عدالت میں لا کھڑا کیا۔ خدا کی حکمت گناہگاروں کی عقل پر مسکراتی ہے، مرزائی تو احرار کو مرعوب کرنے کے لیے عطاء اللہ شاہ بخاری صاحب پر مقدمہ چلا رہے تھے، لیکن قدرت مرزائیت کے ڈھول کا پول کھولنے کے لیے بیتاب تھی! خدا کی مہربانی سے مرزائیت کے خلاف وہ ثبوت بہم پہنچے کہ کسی کو وہم وگمان بھی نہ تھا کہ ہم ایسے ثبوت مہیا کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ ہم نے اس مقدمہ میں مرزائیت کے مذہب و اعتقاد پر بحث نہیں کی بلکہ مرزائیت کے اعمال کو پیش کیا جس سے ابتدائی عدالت بھی متاثر ہوئی، اگر چہ اس نے سید عطاء اللہ شاہ کو چھ ماہ کی سزا دے دی، تاہم سننے والی پبلک پر گہرا اثر پڑا۔ سب کو یقین تھا کہ شہادتِ صفائی ایسی مضبوط ہے کہ یہ سزا بحال نہیں رہ سکتی! لیکن مرزائی ہیں کہ شاہ صاحب کی سزا یابی پر پھولے نہ سماتے تھے۔ ان کے گھروں میں گھی کے چراغ جلائے گئے لیکن سیشن جج کھوسلا نے مرزائیوں کی خوشیوں کو اپنے فیصلۂ اپیل میں ماتم سے بدل دیا۔'' (تاریخ احرار ص 184 طبع ثانی)

دراصل ابتدائی عدالت میں ایک گھٹیا سا مجسٹریٹ تھا جو انگریزی ایماء کے بغیر کوئی فیصلہ دینے کا اہل بھی نہ تھا۔ چودھری صاحب مزید لکھتے ہیں:

''لیکن کھوسلا نے وہ تاریخی فیصلہ لکھا جس سے اسے شہرتِ دوام حاصل ہو گئی، اس فیصلہ کا ہر حرف مرزائیت کی رگِ جان کے لیے نشتر ہے۔ اس فیصلہ میں مسٹر کھوسلا نے چند سطروں میں مرزائیت کی ساری اخلاقی تاریخ لکھ دی۔ اس کے فیصلہ کا ہر لفظ دریائے معانی ہے، اس کی ہر سطر ''مرزائیت کی سیہ کاریوں اور ریاء کاریوں کی پوری تفسیر ہے۔'' مسٹر کھوسلا کے قلم کی سیاہی مرزائیت کے لیے قدرت کا انتقام بن کر کاغذ پر پھیلی اور مرزائیت کے چہرے پر نہ مٹنے والے داغ چھوڑ گئی۔'' (تاریخ احرار ص 184، 185)

توضیح: اس مقدمہ کی پیروی کے لیے جالندھر کے محمد شریف نامی ایڈووکیٹ احرار نے بلائے تھے (یہ قیام پاکستان کے بعد لاہور ہائی کورٹ کے جج بھی رہے ہیں۔ اب وفات پا چکے ہیں) اور مرزائیوں کی طرف سے سر ظفر اللہ خان جو اس وقت کسی بڑے سرکاری عہدہ پر فائز تھے، سرکاری

وکیل کی امداد کر رہے تھے، اور ہم لوگ یہ تمام کارروائی آنکھوں سے دیکھ اور کانوں سے سن رہے تھے۔ دورانِ بحث سر ظفر اللہ خان کو بیجا مداخلت کی وجہ سے کئی بار خفت اٹھانی پڑی تھی خصوصاً مرزا محمود جو خصوصیت سے بلائے گئے تھے، ان کے خلاف جرح میں چودھری ظفر اللہ بے جا مداخلت کرتے تھے۔ چودھری محمد شریف کی جھڑکی کی وجہ سے خفت اٹھاتے رہے۔

مرزا محمود کے قادیان سے گورداسپور شہادت کے لیے آنے کے لیے انھوں نے محکمہ ریلوے سے کہہ کر سپیشل گاڑی کا انتظام کیا تھا۔ سپیشل گاڑی ہو یا ڈبا سواریوں کی تعداد معین ہوتی ہے۔ لیکن مرزائیوں نے سپیشل کا لفظ سن کر گاڑی کو ''دادا کی ملکیت'' سمجھ لیا تھا۔ بے تحاشا بغیر معین تعداد کے اس میں سوار ہو گئے تھے۔ محکمہ ریلوے نے گورداسپور ریلوے سٹیشن پر سب کو گرفتار کر لیا اور اس گرفتاری کا نظارہ مرزا محمود اپنی آنکھوں سے کر رہے تھے اور مارے شرم کے گڑے جاتے تھے۔ آخر کرایہ مع جرمانہ ادا کر کے انھوں نے خلاصی حاصل کی تھی۔

اس سلسلہ میں مزید تفصیلات چودھری افضل حق کی زبان سے سنیے:

> ''ہر چند انھوں نے ہائی کورٹ میں سر تیج بہادر سپرو جیسے مقنن کی معرفت چارہ جوئی کی تا کہ مسٹر کھوسلا کے فیصلہ کا داغ دھل جائے، مگر انھیں اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ مرزائی آج تک یہی سمجھتے تھے کہ قدرت ظلم ناروا کا انتقام لینے سے قاصر ہے۔ مگر اس فیصلہ نے ثابت کر دیا کہ خدا کے حضور میں دیر ہے، اندھیر نہیں!'' (تاریخ احرار ص 185)

یاد رہے کہ ہائی کورٹ میں مرزائیوں نے سر تیج بہادر سپرو کو الٰہ آباد سے بلایا تھا۔ موصوف کی قانونی قابلیت اور انگریزی زبان میں فصاحت و بلاغت کا بڑا شہرہ ہو رہا تھا اور ویسے سیاسی طور پر ان کی بڑی اہم پوزیشن تھی۔ سرکار انگریزی میں وہ بے پارٹی لیڈر مانے جاتے تھے اور بعض اوقات گاندھی اور وائسرائے کے اختلاف میں سر تیج بہادر سپرو ثالثی کے فرائض انجام دیتے تھے۔ کانگریس کو بھی موصوف پر اعتماد تھا اور انگریز بھی ان پر بھروسا کرتا تھا۔

اس مقدمۂ اپیل میں گولڈ سٹریم نامی ایک انگریز ہائی کورٹ کے جج تھے۔ گولڈ سٹریم کی عدالت میں سر تیج بہادر سپرو نے کئی گھنٹے تک فصیح انگریزی میں مرزائیوں کی صفائی میں تقریر کی تھی۔ کورٹ کا کمرہ تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور راقم الحروف بھی احرار دوستوں کی معیت میں ہائی کورٹ کے کمرے کے اندر اخیر تک موجود رہا۔ مگر ''ڈھاک کے وہی تین پات'' معمولی رد و بدل سے مرزائیوں کی اشک شوئی ہوئی اور اصل بنیاد بحالہا قائم و دائم رہی کیونکہ مثل مرزائی مظالم کی داستانوں

سے بھری پڑی تھی۔ اس میں سر تیج بہادر کیا کر سکتا تھا اور جج گولڈ سٹریم مثل کو کیسے چاٹ سکتا تھا؟
چوہدری افضل حق مزید تحریر فرماتے ہیں:

''اس فیصلہ کو تاریخ احرار میں خاص اہمیت حاصل رہے گی۔ دراصل یہ فیصلہ مرزائیت کی موت ثابت ہوا۔ جس غیر جانبدار نے اس کو پڑھا وہ مرزائیت کے نقش و نگار کو دیکھ کر اس سے نفرت کرنے لگا۔ علامہ سر محمد اقبال اور مرزا سر ظفر علی کے بیانات نے بھی تعلیم یافتہ طبقہ کے رجحان و خیال کو بدل دیا۔ پروفیسر محمد الیاس برنی نے ''قادیانی مذہب'' نامی جامع مانع کتاب لکھ کر مرزائیت کے مقابلہ میں اسلام کی بہت بڑی خدمت سرانجام دی لیکن سچ ہے کہ مسٹر کھوسلا نے جو مرزائیت کے قلعہ پر بم مارا، اس نے کفر کے اس قلعہ کی بنیادیں ہلا دیں اور ان ''قلعہ بندیوں'' کو مسمار کرنے میں آسانی ہو گئی۔ جہاں چار مرزائی بیٹھے ہوں ان میں کھوسلا کا فیصلہ پھینک دو۔ یہ بم پھینکنے کے برابر ہوگا، وہ سراسیمہ ہو کر بھاگ جائیں گے۔''

(تاریخ احرار ص 185)

مسٹر کھوسلا کے فیصلہ کا پورا متن

مسٹر کھوسلا کا فیصلہ انگریزی زبان میں لکھا گیا تھا۔ ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ فیصلہ کا پورا متن اردو میں ہدیۂ ناظرین کریں، تاکہ معلوم ہو کہ ایک غیر جانب دار سیشن جج کیا کچھ لکھنے پر مجبور ہوا، اور وہ کیا حقائق تھے جنھیں وہ جج کی حیثیت سے نظر انداز نہ کر سکتا تھا۔ اگر وہ ایسا کرتا تو اہل دانش کے نزدیک اس کے وقار کو شدید دھچکا لگتا۔ وہ مرزائیوں کی خاطر ایسا دھچکا برداشت کرنے پر آمادہ نہ ہوا اور حقائق و واقعات کو نوک قلم پر لے آیا۔ بہرحال اس نے جس نیت سے بھی ان حقائق کو آشکارا کیا ہم اس کے ممنون ہیں۔ چوہدری صاحب مرحوم نے اس انگریزی فیصلہ کا اردو میں خود ترجمہ کر کے اس کی وسیع اشاعت کی تھی! مسٹر جج اپنے فیصلہ کی یوں ابتداء کرتے ہیں:

''مرافعہ گزار سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو تعزیرات ہند کی دفعہ 152 الف کے تحت مجرم قرار دیتے ہوئے اس تقریر کی پاداش میں جو انھوں نے 11 اکتوبر 1934ء کو تبلیغ کانفرنس قادیان کے موقع پر کی چھ ماہ قید بامشقت کی سزا دی گئی۔''

لالہ ملاوامل

مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنی کتابوں میں لالہ ملا وہ مل کا تذکرہ کیا ہے اور اسے اپنی صداقت کا گواہ ٹھہرایا ہے۔ جب میں قادیان پہنچا تو وہ زندہ تھا، میں نے اس سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ اس کا لڑکا جو اپنی انجمن آریہ سماج کا آفس سیکرٹری تھا، اس نے ابتداءً میرے پاس آنا جانا شروع کر دیا تھا۔ اس نے بتایا کہ: ''لالہ صاحب بہت بوڑھے ہیں۔ زیادہ چل پھر نہیں سکتے۔ البتہ گھر سے نکل کر آہستہ آہستہ دکان پر آجاتے ہیں اور عموماً فلاں وقت دکان پر رہتے ہیں۔'' دوسرے دن میں دکان پر چلا گیا۔ لالہ صاحب بیٹھے تھے۔ بڑے احترام سے پیش آئے۔ مل کر بیٹھ گئے۔ پہلے تو میں مرزا قادیانی کے ابتدائی دور کے متعلق پوچھتا رہا اور وہ بتاتے رہے۔ نہایت آہستگی سے بات کرتے تھے۔ آخر میں نے مقررہ معینہ ان واقعات کے متعلق دریافت کیا جن میں مرزا قادیانی نے ملاوامل کو گواہ بنایا تھا تو اس نے سر ہلایا اور ہاتھ کے اشارہ سے انگلی ہلا کر انکار کیا اور کہا۔ ''غلط ہے۔ جھوٹ ہے میں نے کوئی ''معجزہ''، ''کرامت'' نہیں دیکھی۔ اگر میں کچھ دیکھتا تو اس کے ہاتھ پر مرزائی نہ ہو جاتا؟'' لالہ ملاوارام بڑا معقول اور مرنجاں مرنج عمر رسیدہ ہندو تھا۔

اکالی لیڈر سردار کھڑک سنگھ کی قادیان میں آمد

ان دنوں سکھوں میں سردار کھڑک سنگھ کا بڑا شہرہ ہو رہا تھا۔ قادیان کے نواح میں سکھوں کی آبادی بہت زیادہ تھی۔ گاؤں کے گاؤں سکھوں کے تھے۔ وہ لوگ مرزائیوں کی چیرہ دستیوں کی وجہ سے مرزائیوں کے خلاف تھے۔ انھوں نے قادیان میں ''یک روزہ سکھ کانفرنس'' کرنے کا اعلان کیا اور اس کی صدارت کے لیے سردار کھڑک سنگھ کا نام تجویز کیا۔ سردار صاحب بڑی شان سے قادیان آئے۔ ان کے ساتھ گیانی شیر سنگھ بھی تھے۔ قادیان میں سکھوں نے کھڑک سنگھ کا جلوس ہاتھی پر نکالا اور یہ جلوس قادیان کی گلیوں میں پھرایا گیا۔ جب جلوس مسلمانوں کے محلّہ سے گزر رہا تھا تو ہم نے پھولوں کی پتیاں نچھاور کیں اور کھڑک سنگھ زندہ باد کے نعرے لگائے۔ قادیان سے جانب مشرق فرلانگ ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلہ پر عظیم الشان پنڈال بنایا گیا تھا۔ اس کانفرنس میں تقریباً پچاس ہزار سکھوں کی حاضری تھی۔ راقم الحروف کو بھی شمولیت کی دعوت دی گئی تھی، میں شامل ہوا۔ دن کے گیارہ بجے مجھے تقریر کرنے کو کہا گیا۔ میں نے سٹیج پر جا کر ایک مختصر سی تقریر کی جس کا مفہوم یہ تھا کہ پنجاب میں مسلمان سکھ کا چولی دامن والا معاملہ ہے۔ اگر سکھ یہ خیال کریں کہ وہ مسلمانوں کو ختم کر دیں گے تو یہ ان کی خام خیالی ہوگی، اور اسی طرح اگر مسلمان یہ سوچیں کہ ہم سکھوں کو مٹا دیں گے تو یہ بھی غلط

خیال ہوگا۔ یہاں مسلمانوں نے بھی رہنا ہے اور سکھوں نے بھی رہنا ہے۔ یہ ایک الگ معاملہ ہے کہ کس انداز میں رہیں۔ اگر ہم ایک دوسرے کے ساتھ احترام، محبت اور پیار سے رہیں گے تو ہمارا وقت عمدہ بسر ہوگا اور اگر ضد و عناد ظاہر کر کے ایک دوسرے سے الجھے رہیں گے تو ہمارا وقت تلخ و بے مزہ بسر ہوگا۔ البتہ یہ مرزائی جو نہ ہمارے ہیں اور نہ تمھارے، اور قادیان میں ان کا ''سلوکِ بد'' ہم دونوں کے ساتھ ایک جیسا ہے'' اس کے بعد میں نے مرزائیوں کی چیرہ دستیوں کے چند واقعات بیان کر کے مشورہ دیا کہ: ''ہمیں مشترکہ پلیٹ فارم بنا کر ان کے مظالم سے عہدہ برآ ہونا چاہیے!'' میری اس تقریر سے سکھ بڑے خوش ہوئے اور انھوں نے ''احرار زندہ باد'' کے پرجوش نعرے لگائے۔ میرے بعد سردار کھڑک سنگھ سٹیج پر آئے اور سارے کا سارا وقت مرزائیوں کی مخالفت میں صرف کر دیا اور اپنے ''قومی سکھی مسائل'' پر ایک لفظ تک نہ کہا اور آخر میں اعلان کیا کہ: ''میں مرزائیوں کو وارننگ دیتا ہوں کہ اگر اس کے بعد مجھے کوئی شکایت پہنچی تو میں ان کے بہشتی مقبرہ کو بنیاد سے اکھیڑ کر دریائے بیاس میں بہا دوں گا۔''

مرزائی پہلے تو مصلحتاً چپ رہے۔ ان کے جلسہ یا جلوس کے خلاف کوئی احتجاج یا واویلا نہ کیا لیکن جلسہ ختم کر کے جب ہم اپنے گھروں کو واپس آئے تو شام سے پہلے ایک اشتہار تقسیم ہوا جو غالباً کھڑک سنگھ کی تقریر کے بعد لکھا گیا تھا۔ پریس تو ان کا اپنا ہی تھا، اسی وقت چھپ کر تقسیم ہوا جس میں واویلا تھا کہ: ''احراری ملا نے سکھوں کو بھڑکا دیا ہے اور کھڑک سنگھ نے یہ کہا وہ کہا!'' اور پھر کئی دن تک مرزائیوں کے اخبار ''الفضل'' میں واویلا ہوتا رہا۔

ماسٹر تاج الدین انصاری

موصوف لدھیانہ کے رہنے والے ''پارچہ باف شیخ انصاری'' خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ جماعت میں بڑے جوڑ توڑ کے آدمی تھے۔ بقولِ چودھری افضل حق: ''سوکھی مٹی سے محل تعمیر کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کرتب تھا۔'' بہت عمدہ لکھتے تھے اور برمحل بولنے کے بڑے مشاق تھے۔ جماعت سے اخلاص ان کی مٹی کا خمیر تھا۔ چودھری افضل حق مرحوم فرماتے ہیں: ''میں نے ماسٹر تاج الدین کو کام کے لحاظ سے محنتی چیونٹی اور تدبر کے لحاظ سے دشمن کو تاروں میں اُلجھا کر مارنے والی مکڑی پایا۔''

کام کی اہمیت کے پیش نظر جماعت نے میری امداد کے لیے انھیں قادیان بھیج دیا اور وہ کوئی دو برس تک قادیان میں رہ کر میری معاونت کرتے رہے۔ انھوں نے قادیان آ کر میری بھرپور امداد کی مگر کبھی لیڈر یا معتبر بننے کی کوشش نہ کی۔ ہر کام میں وہ میرے اصرار کے باوجود آگے نہ آتے تھے بلکہ ہر کام میں مجھے آگے کرتے تھے۔ میں جوڑ توڑ اور اندرون و بیرون کام کرنے کا اہل نہ تھا۔

ماسٹر صاحب داؤ پیچ کے دھنی تھے۔ میں انتہائی کوشش کرتا کہ ان کی رہنمائی میں کام کروں مگر وہ اپنی نوعیت کے خاص بزرگ تھے۔ بعض اوقات ان کے اندرونی منصوبہ کا مجھے بھی علم نہ ہوتا تھا۔ چنانچہ مرزائیوں کو مزید ذلیل اور عاجز کرنے کے لیے وہ اندر ہی اندر ایک ''سکیم'' بناتے رہے اور مجھے بالکل خبر تک نہ ہونے دی۔ اس علاقہ میں بھنگی، چرسی، فقیروں اور ملنگوں کے مرکز ''تکیے'' ہوتے ہیں جہاں پانی آگ تمباکو وغیرہ کا انتظام ہوتا ہے اور گاؤں کے لوگ آرام کرنے اور خوش گپیوں کے لیے فارغ اوقات میں وہاں چلے جاتے ہیں۔ تکیے میں صفائی وغیرہ دیگر ضروریات کے لیے ایک مستقل آدمی رکھا ہوتا ہے اس کو ''فقیر'' کہا جاتا ہے اور بعض تکیوں میں تو یہ فقیر ''پشتینی'' چلے آتے ہیں اور گاؤں کے لوگ ان کی خدمت کرتے ہیں۔ بعض تکیوں کے مکین جرائم پیشہ بھی ہو جاتے ہیں۔ قادیان میں بھی ایک تکیہ تھا جہاں ''پشتینی فقیر'' چلے آتے تھے۔ میرے وقت میں وہاں تکیہ میں دو نوجوان بھائی تھے، بڑا جرائم پیشہ تھا اور چھوٹا سلیم الطبع تھا۔ مرزائیوں نے ان پر بڑے ڈورے ڈالے مگر وہ ان کے قابو نہ آئے، اور ان کا ہمارے ہاں آنا جانا ہو گیا۔ چھوٹا بھائی عموماً ہمارے ہاں آتا اور ماسٹر تاج الدین صاحب کی گفتگو سے بہت محظوظ ہوتا تھا۔

میرے علم کے بغیر ماسٹر جی نے چھوٹے بھائی کو جس کا نام ''محمد حنیف'' تھا، ایک پٹی پڑھا کر اس پر عمل کے لیے آمادہ کر لیا۔ پٹی یہ تھی کہ محلہ شیخاں میں جو ہماری مسجد تھی، مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کے خاندان کا راستہ گھروں سے نکل کر دفتروں کو جانے کے لیے ہماری مسجد کے سامنے سے گزرتا تھا اور وہاں آبادی خالص ''سنی مسلمانوں'' کی تھی۔ ''مرزائی مکانات'' ذرا فاصلہ پر تھے۔ مرزا غلام احمد کا چھوٹا بیٹا جس کا نام ''شریف احمد'' تھا ہر روز سائیکل پر اسی راستہ آتا جاتا تھا اور اس کا آنا جانا بالکل اکیلا اور تن تنہا ہوتا تھا۔ ماسٹر صاحب نے یہ منصوبہ بنایا کہ ''جب اس راستہ سے مرزا شریف احمد گزر رہا ہو تو اس کے چوتڑوں پر دو چار ڈنڈے مار کر اسے سائیکل سے گرا دیا جائے، زخمی نہ کیا جائے تاکہ ان کا جھوٹا تقدس جو عوام کے ذہنوں پر مسلط ہے پائمال ہو جائے۔'' (کیونکہ مرزائیوں نے جھوٹی نبوت کا بھرم رکھنے کے لیے یہ بھی لکھا اور کہا ہوا تھا کہ مرزا کی ذات اور قادیان سے متعلقہ ہر چیز معاذ اللہ ''شعائر اللہ'' میں داخل ہے اور ان کا ویسے ہی احترام ضروری ہے۔'' اور ظاہر ہے کہ اس عقیدہ کو کسی درجہ میں بھی مان کر ان کے وجود تو درکنار وہاں کی کسی چیز کو بھی ٹھکورنا بہت بڑا گناہ شمار ہوتا۔ اس لیے ماسٹر جی مرحوم کے زرخیز دماغ نے یہ عجیب جوابی تجویز و ترکیب سوچ لی کہ انگریز کے بنائے ہوئے نبی اور اس کے متعلقین کی جب تک کچھ ٹھکائی پٹائی نہیں کی جائے گی، عوام کے دل و دماغ پر سے حضور نبی کریم علیہ السلام اور آپ کے اہل بیت کے مقابلہ اور اس کے ذریعہ اللہ کے

پورے دین کی زبردست توہین کا کچھ ازالہ نہیں ہو سکے گا۔ چنانچہ یہ فارمولا بالکل درست اور مطابق حال ثابت ہوا اور ''مرزائیوں کے مقاماتِ مقدسہ'' کی تھوڑی سی ''مرمت'' نے ان کے اس شیطانی منصوبہ اور ان کے غرور و تکبر کا کافی حد تک مناسب علاج کر دیا تھا (ابو معاویہ) چنانچہ ایک دن جبکہ میں قادیان میں موجود نہ تھا اور کسی ضروری کام کے لیے گورداسپور گیا ہوا تھا، یہ منصوبہ یوں تکمیل پذیر ہوا کہ...... مرزا شریف احمد اپنے گھر سے سائیکل پر سوار ہو کر دفتر کو جا رہا تھا کہ راستہ میں محمد حنیف فقیر صاحب نے اسے جا لیا اور دو چار ڈنڈے چلا کر سائیکل سے گرا کر جلدی سے کہیں روپوش ہو گئے۔ مرزا قادیانی کو کوئی بڑا زخم نہیں آیا تھا بلکہ معمولی خراشیں آئی تھیں، اس لیے مرزا قادیانی سنبھلے اور اُٹھ کر سائیکل پر سوار ہو کر سیدھے چوکی پولیس میں جا کر ''رپورٹ'' درج کرائی۔ اتنے میں قادیانیوں کو اطلاع ہوئی تو اُن کی پوری جماعت میں ایک عظیم ہیجان برپا ہو گیا اور ہزاروں مرزائیوں پر مشتمل ہجوم میں سے ایک مرزائی دفترِ احرار میں آ گیا اور حنیف کا پتا پوچھنے لگا۔ مرزائیوں نے دفتر احرار میں تو کوئی دست اندازی نہ کی اور حنیف کی تلاش کر کے ناکام واپس چلے گئے۔

لیکن اس واقعہ کے متعلق عرصہ تک اخبارات کے علاوہ سٹیج پر بھی شدید واویلا ہوتا رہا۔ حنیف ڈنڈے چلا کر فوراً ماسٹر صاحب کے پاس پہنچا۔ ماسٹر صاحب نے اسے ایک پڑوسی کے مکان میں چھپا دیا اور رات کے اندھیرے میں اسے بٹالہ پہنچا دیا گیا۔ حنیف کے خلاف پولیس نے پرچہ دیا۔ حنیف خود بخود کچہری میں حاضر ہو گیا۔ مقدمہ چلا اور وہ نو مہینے سزایاب ہوا۔ لیکن مرزائیوں نے اس معاملہ کو بڑا اچھالا اور انتہا یہ کہ چودھری ظفر اللہ کی والدہ وائسرائے کے پاس پہنچی اور رو رو کر کہا کہ: ''ہمارے لیے قیامت آ گئی ہے، احرار نے ہمارے لیے قادیان کی زندگی تلخ کر دی ہے۔ میرے نبی کے بیٹے کو سرِ بازار پیٹا گیا ہے۔ اب ہمارے لیے قادیان میں رہائش دوبھر ہو گئی ہے۔'' لیکن دانا انگریز اپنے ''خود کاشتہ پودے'' کی ہمدردی کے باوجود کوئی ایسا جوابی اقدام نہیں کر سکتا تھا جس سے ہندوستان بھر کی رعایا اس سے ناراض ہو جائے۔

واضح رہے کہ مرزا غلام احمد متنبی قادیان کے تین فرزند تھے۔ بڑے کا نام مرزا ''محمود احمد'' تھا۔ منجھلے کا نام مرزا ''بشیر احمد'' تھا جو ایم ایم احمد کا والد تھا اور تیسرے کا نام ''شریف احمد'' تھا جس کے ساتھ مذکورۂ بالا واقعہ پیش آیا۔

مولوی عبداللہ معمار امرتسری

مولوی عبداللہ معمار عجیب شخصیت کے بزرگ تھے۔ آخر تک ''معماری'' کا ہاتھ سے کام کرتے تھے۔ ''اہلِ حدیث مسلک'' سے تعلق رکھتے تھے۔ کہیں کسی دینی مکتب میں باقاعدہ تعلیم حاصل

نہیں کی تھی۔ والد معمار تھا اور معماری کا کام کرتا تھا اور یہی اس کا ذریعہ معاش تھا۔

مولوی عبداللہ نے ہوش سنبھالا تو والد مرحوم نے معماری کے کام پر لگا دیا۔ لیکن ان کے سینہ میں ایک تڑپ تھی جو باوجود مزدوری کے فرصت کے وقت انھیں اپنی جانب متوجہ رکھتی، وہ تھا ''مرزائیت کے خلاف جذبۂ تردید۔'' بچپن میں والد مرحوم نے معمولی حرف شناخت کرایا تھا اور اپنے پیشہ معماری میں انھیں لگا دیا تھا۔ مسلک اہل حدیث تھا اس لیے نامور عالم دین جناب ابوالوفا ثناء اللہ امرتسری کے ہاں آنا جانا تھا۔ اردو تو کسی حد تک جانتے تھے اس لیے مرزا قادیانی کی تصانیف کو پڑھنا شروع کیا۔ تعلیم کم تھی اس لیے مرزا قادیانی کی تصانیف کے بعض مقامات سمجھتے اور ان کی تردید میں مولانا موصوف سے امداد لیتے تھے۔ مولانا نے فرمایا۔ ''تمہارا یہ اشتیاق یوں پورا نہ ہوگا جب تک کچھ قواعد عربیہ سے واقف نہ ہو جاؤ۔'' دن بھر اپنی مزدوری کرو، اور فلاں وقت فرصت نکال کر میرے پاس آ جاؤ، میں تم کو باتوں باتوں میں قواعد عربیہ سے بھی واقف کرا دوں گا۔ اور مرزائیت کے متعلق مکمل معلومات حاصل کر کے مرزائیت کے خلاف تم مبلغ بن جاؤ گے۔'' چنانچہ دن بھر والد مرحوم کے ساتھ مزدوری کرتے اور فرصت پا کر مولانا ثناء اللہ صاحب کے ہاں حاضر ہو کر عربی قواعد بھی سیکھتے۔

اس زمانہ میں مرزائی مبلغ مرزائیت کی اشاعت میں شد و مد سے سرگرم تھے۔ انگریز کی شہ تھی اور انھیں جماعت سے باقاعدہ تنخواہ ملتی تھی۔ عوام میں مرزائیت کے خلاف کوئی جذبہ نہ تھا، اس لیے مرزائی مبلغ لوگوں کے گھروں میں گھس جاتے اور ''مرزا کی خانہ ساز نبوت'' کو منوانے کے لیے انھیں پریشان کرتے۔ رات کو کسی مکان کی چھت پر چڑھ جاتے اور گھر بیٹھے لوگوں کو مرزا کی نبوت تسلیم کرنے پر مجبور کرتے۔ عوام اَن پڑھ تھے اور لکھے پڑھے مولوی مرزائی ہتھکنڈوں سے ناواقف تھے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ مرزائی انھیں دلائل میں لاجواب کر دیتے تھے اور اس کا عوام پر بڑا اثر پڑتا تھا۔ مرزائی ہتھکنڈوں سے واقف گنتی کے چند علماء ملک میں تھے جنھوں نے مرزا غلام احمد قادیانی کی کتب کا مطالعہ کیا ہوتا، ورنہ عام مولوی مرزائیوں کے رٹے رٹائے دلائل ''وفاتِ مسیح'' یا ''اجرائے نبوت'' سے ناواقف تھے۔ ان حالات میں مولوی عبداللہ جو مولانا ثناء اللہ صاحب سے عربی میں دسترس حاصل کر چکے اور مرزائیوں کے دلائل اور ان کے جوابات کے ماہر ہو چکے تھے، وہ اپنے معماری کے کام میں کمی کر کے مرزائی مبلغین کے سامنے آئے اور انھیں ہر مقام پر شکست دی۔ مرزائی دلائل اگرچہ اتنے مضبوط نہ تھے کہ ان کے جوابات سے علماء عاجز تھے بلکہ وجہ یہ تھی کہ ہمارے علماء مرزائی لٹریچر سے ناواقف تھے اور جب تک مرزائی لٹریچر نہ پڑھا جائے، مرزائیوں سے مناظرہ میں عہدہ برآ ہونا ایک کٹھن کام تھا۔ مولوی عبداللہ نے جو دو ایک مقام پر مرزائی مبلغین کو پچھاڑا اور

دوسرے مواضع پر اس کا اثر ہو جانا لازمی تھا۔ خیر، ایک دفعہ وہ نمبردار قادیان میں ہمارے دفتر میں آیا اور کہا کہ: ''میں مرزائیوں سے مناظرہ کرانا چاہتا ہوں، اور میرا ارادہ ہے کہ اگر مناظرہ میں مرزائی غالب آ گئے تو میں بھی مرزائی ہو جاؤں گا اور دوسرے چند آدمی جو میری وجہ سے متأمل ہیں وہ سب مرزائی ہو جائیں گے۔ اب میرا مرزائی ہونا یا نہ ہونا تمھارے ہاتھ میں ہے۔'' ہم نے کہا: ''مطمئن رہو، ہم تمھیں مرزائی نہیں ہونے دیں گے۔ اگر مرزائی خفیہ خفیہ ہماری بے خبری میں کسی کو پھسلا لیں تو وہ ہمارے بس کا روگ نہیں، ورنہ یوں باخبری میں ہم کسی کو ہرگز مرزائی نہیں ہونے دیں گے۔ آپ کے سامنے میدانِ مناظرہ میں ہم انھیں ایسا پچھاڑیں گے کہ پھر وہ مناظرہ کا نام تک نہیں لیں گے۔'' وہ بڑا حیران ہوا اور کہنے لگا: ''اچھا یہ بات ہے، تو پھر مجھے کوئی فکر نہیں!'' وہ مطمئن ہو کر واپس چلا گیا۔

ہم نے مولوی عبداللہ کو امرتسر سے بلایا اور تاریخ مقرر کر کے موضع بیری پہنچ گئے۔ چونکہ وہ گاؤں مرزائیوں کا خیال کیا جاتا تھا اور خطرہ تھا کہ کہیں فساد نہ ہو جائے اس لیے پولیس بھی بھاری تعداد میں وہاں موجود تھی۔ دریائے بیاس کا کنارہ تھا اس لیے یہ علاقہ بیٹ کے نام سے مشہور تھا۔ مناظرہ کا شہرہ سن کر سارا بیٹ اکٹھا ہو رہا تھا۔ قادیان سے مشہور مرزائی مناظر ابو العطاء اللہ دتہ جالندھری ایک بھاری جماعتِ مرزائیت کے ساتھ قادیان سے موضع بیری یعنی مقامِ مناظرہ میں پہنچ گیا۔ مناظرہ شروع ہوا۔ مسلمانوں کی طرف سے مناظر عبداللہ معمار تھے اور صدر میں تھا اور مرزائیوں کی جانب سے مناظر اللہ دتہ جالندھری تھا اور صدر کوئی دوسرا مرزائی تھا۔

مناظرہ شروع ہوا۔ پہلی تقریر اللہ دتہ جالندھری نے کی تھی، اس نے ''صداقتِ مرزا غلام احمد'' پر بڑی زوردار تقریر کی کہ ''مرزا غلام احمد قادیانی اپنے ''دعاوی'' میں سچا ہے۔'' جب مرزائی مبلغ کی تقریر ختم ہوئی تو مولوی عبداللہ کی تقریر شروع ہوئی۔ موضوع تھا ''صدق و کذبِ مرزا'' مولوی عبداللہ نے مرزا کی ''درثمین'' سے ایک شعر پڑھا اور کہا کہ ''آپ کو تسلیم ہوگا کہ یہ شعر آپ کے مرزا غلام احمد قادیانی کا ہے؟'' وہ شعر یہ تھا۔

''کرمِ خاکی'' ہوں مرے پیارے نہ ''آدم زاد'' ہوں
ہوں بشر کی جائے نفرت اور انسانوں کی عار

(درثمین۔ اردو مجموعہ اشعار مرزا قادیانی ص116)

''خلاصہ یہ کہ میں ''آدم زاد نہیں'' بلکہ آدمی کے جسم کا وہ حصّہ ہوں جس سے نفرت کی جاتی ہے اور مزید کہا کہ: ''آدمی کے جسم میں دو ہی مقام ایسے ہیں جن سے دیکھنے والا نفرت کرتا ہے، وہ قابلِ نفرت حصّہ یا ''اگلی جانب'' ہے یا ''پچھلی جانب۔'' اب آپ ہی بتائیں کہ مرزا قادیانی

انسانی نفرت گاہ کا اگلا حصہ تھے یا پچھلا......؟''

اس گاؤں میں تو مرزائیوں کی اکثریت تھی مگر مجمع میں مسلمانوں کی بھاری اکثریت جمع ہو گئی تھی۔ مولوی عبداللہ کی مختصر تقریر کے بعد مجمع میں سے ایک شور اٹھا کہ مزید بحث کی ضرورت نہیں، ہم سمجھ گئے مرزا قادیانی کیا تھے اور مجمع کامیابی کے نعرے لگاتا ہوا منتشر ہو گیا۔ پولیس کی بھاری تعداد موجود تھی، کوئی دنگا فساد نہ ہوا اور مرزائی مبلغ اللہ دتہ اپنے ساتھیوں سمیت اپنا سا منہ لے کر قادیان واپس آ گیا اور مناظرہ بخیر و عافیت ''مرزائی شکست'' پر منتج ہوا۔

مولوی عبداللہ معمار لکھنے کے بھی دھنی تھے۔ انھوں نے ''محمدیہ پاکٹ بک'' لکھ کر ملتِ اسلامیہ پر بڑا احسان کیا ہے۔ اس میں انھوں نے تمام متنازعہ فیہ مسائل پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اُس کا پہلا ایڈیشن اس وقت چھپا تھا جبکہ میں قادیان میں تھا۔ اس کے بعد آج تک اس کے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ مولوی صاحب ''اہلِ حدیث'' تھے۔ اس لیے محمدیہ پاکٹ بک کے حقوق بھی انھوں نے ''جماعتِ اہل حدیث'' کو دے دیے تھے۔ اب سنا ہے وہ فوت ہو چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں جوارِ رحمت میں عمدہ مقام عنایت فرمائے۔ آمین!

فخر الدین ملتانی

فخر الدین ملتان کا رہنے والا تھا۔ اٹھتی جوانی میں قادیانیوں کے ہتھے چڑھ گیا اور مرزا غلام احمد سے بیعت کر لی۔ بڑا ہونہار نوجوان تھا۔ اپنی قابلیت سے قادیانیوں میں بہت جلد مقام حاصل کر لیا۔ اس کا والد زندہ تھا، اس نے بہت سمجھایا مگر وہ ان سے دائمی قطع تعلق کر کے قادیان آ بسا تھا۔ والد نے بھی مجبوراً بظاہر بھلا دیا اور اس نے پھر کبھی ملتان یا والدین یا خویش قبیلہ کی جانب ادنیٰ توجہ بھی نہ کی اور ہمیشہ کے لیے قادیانیوں کا ہو کر رہ گیا۔ والد کو جب اس کے قتل کی اطلاع پہنچی تو شفقت پدری نے پھر کروٹ لی اور وہ بیچارہ ملتان سے گورداسپور پہنچا۔ فخر الدین ابھی زندہ تھا۔ والد نے ازراہِ شفقت مرزا غلام احمد قادیانی سے بیزاری کی تلقین کی، مگر بے سود۔ وہ ''غلام احمد کی نبوت کا ذبیہ'' کو ساتھ لے کر مرا۔ راقم الحروف بھی ازراہِ انسانی ہمدردی گورداسپور گیا اور فخر الدین کی زندگی بچانے کے لیے ہر طرح کی کوشش کی۔ مگر آئی موت کو کون ٹال سکتا ہے؟ ڈاکٹروں کی پوری کوشش کے باوجود وہ جانبر نہ ہو سکا اور کل نفس ذائقة الموت کا پیالہ پینے پر مجبور ہو گیا۔ اس نے قادیانی ماحول میں اکتیس برس کا طویل عرصہ بسر کیا۔ اپنی معاش کا انتظام کیا اور اچھی بھلی معاشی پوزیشن حاصل کر لی۔ خالص مرزائیوں کے علاقہ میں ایک وسیع قطعۂ اراضی حاصل کر لیا اس پر بہت عمدہ دو منزلہ مکان تعمیر کیا جو چاروں طرف سے دور دور تک قادیانیوں میں گھرا ہوا تھا۔ راقم الحروف نے یہ مکان اس وقت

دیکھا جبکہ فخر الدین قتل ہو چکا تھا اور اس کے لڑکے مظہر الدین ملتانی کا ہمارے ہاں آنا جانا شروع ہو گیا تھا اور ہماری جماعت ہر طرح سے اس کی اخلاقی وقانونی امداد کر رہی تھی۔ مظہر کے علاوہ اس کے دو بچے اور بھی تھے جو بالکل معصوم تھے۔ اس کی بیوہ تقریباً دماغی توازن کھو بیٹھی تھی اور دن رات زار و قطار روتی رہتی تھی اور اردو زبان میں کچھ کہتی بھی تھی۔ میرا خیال ہے یہ عورت ہندوستانی تھی جو اردو بولتی تھی۔ فرالدین قرآن مجید کی طباعت کا کاروبار کرتا تھا اور مختلف سائز اور ڈیزائن میں قرآن مجید چھاپ کر بیچا کرتا تھا۔ اس کا بڑا عمدہ کاروبار تھا۔ شیخ عبدالرحمٰن مصری اور فخر الدین کا ایک ہی زمانہ تھا جبکہ انھوں نے جماعت کو چھوڑ کر خلیفہ محمود کے خلاف ''قومی کمیشن'' کا مطالبہ کیا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ ''اگر ایک آزاد کمیشن مقرر ہو جائے تو ہم ثابت کر دیں گے کہ خلیفہ محمود ایک بدکردار انسان ہے۔ اگر ہم ثابت نہ کر سکے تو اسی کمیشن کو اختیار ہونا چاہیے کہ وہ جو سزا مناسب سمجھے ہمیں دے۔'' ہم لکھ دیتے ہیں کہ وہ سزا ہمیں قبول ہوگی اور کمیشن کے لیے ہماری یہ شرط نہیں ہوگی کہ وہ غیر قادیانی ہو۔ البتہ ضروری ہے کہ اس کے اراکین بے داغ ہوں اور کم از کم ہمیں ان کے سابقہ اعمال کے پیش نظر اعتماد ہو۔''

فخر الدین کو ابتداءً جب خلیفہ محمود کے بدکردار ہونے کا علم ہوا تو اس نے آہستہ آہستہ اپنے جلیسوں اور ہم نشین لوگوں میں اس کا تذکرہ شروع کر دیا۔ شیخ مصری بھی اسی زمانہ میں جماعت سے بدک رہا تھا لیکن دونوں کا اشتراک بعد میں جا کر ہوا کیونکہ شیخ مصری ایک نومسلم بڑا عالم تھا لیکن سابقہ ہندو ذہنیت کے پیشِ نظر خلیفہ محمود کا خوشامدی اور اعتمادی تھا۔ فخر الدین کا معاملہ بالکل مختلف تھا، وہ کوئی زیادہ پڑھا لکھا نہ تھا بلکہ معمولی پڑھا ہوا تھا اور خلیفہ کی خواہ مخواہ چاپلوسی کر کے بے ضرورت تقرب کا خواہاں نہ تھا، بلکہ مشکل اوقات میں جماعت کی خاطر جان پر بھی کھیل سکتا تھا۔ اس نے اپنا تعارف ایک اشتہار میں ان الفاظ سے کرایا ہے:

> ''میں اتنا مخلص ہوں کہ کئی دینی اور سیاسی کاموں میں سر ہتھیلی پر رکھ کر خدمات انجام دیں اور جماعت اس کی گواہ ہے۔''

خلیفہ محمود کے بھائی مرزا بشیر احمد نے بھی اس کا یوں تعارف کرایا ہے:

> ''انھوں (فخر الدین) نے ''مسیح موعود'' خلیفہ اوّل اور ''مصلح موعود'' (خلیفہ ثانی) کے زمانہ میں اکتیس سال گزارے۔ میرے ساتھ بھی ان کا قریباً شروع سے تعلق تھا اور میرے ساتھ محبت رکھتے تھے۔ سوائے اپنی عمر کے آخری تین سالوں کے میں نے ان میں ہمیشہ اخلاص کا جذبہ پایا۔ کچھ عرصہ قبل خلیفہ صاحب کے متعلق شبہات پیدا ہونے شروع ہو گئے جو آپ

(خلیفۂ قادیانی) کی ذات اور طریق کار دونوں کے متعلق تھے اور بالآخر خلیفۂ وقت کی طرف سے خطرناک طور پر مسموم ہو کر اسی حالت کو پہنچ گئے جبکہ ایک شاخ خشک ہو کر اپنے درخت سے کاٹ دیے جانے کے قابل ہو جاتی ہے۔" ("الفضل" 25 اگست 1937ء)

اس کے ساتھ جو سلوک روا رکھا گیا اس کا نقشہ فخر الدین نے اپنے ایک اشتہار میں یوں کھینچا ہے:

"یہ ناکہ بندیاں، یہ خلاف تہذیب و شرافت گالیاں، ہمارے نان و نفقہ کی بندش، ہمارے بچوں اور عورتوں کو ایذاء رسانی، یہ لٹھ بند اور ہاکی سٹک بند، سڑکوں کے مظاہرے یا قتل و غارت کی دھمکیاں، ہمارے گھروں اور ہماری ڈاک پر ڈاکہ زنیاں، اور ہمارے شیر خوار بچوں کے دودھ بند کرنے، اور یہ ٹارچ زنیاں اور دوربین بازیاں کر کے ہماری لڑکیوں اور عورتوں کی بے پردگی کے کمینہ ارتکاب، اور طرح طرح کے مقدموں میں پھنسانے کی کوشش کرنا، ہمارے قرض داروں کو قرض ادا کرنے سے روکنا اور ہمارے قرض خواہوں کو مقدمہ بازی پر آمادہ کرنا، وغیرہ وغیرہ۔" ہمیں ان پاک ارادوں اور قیام قادیان سے باز نہیں رکھ سکیں گے۔ قادیان خدا کے مرسل کا تخت گاہ ہے ہم اسے ایک آن کے لیے بھی ویران نہیں دیکھ سکیں گے۔"

(اشتہار "صدائے فخر الدین ملتانی")

یاد رہے کہ فخر الدین ملتانی مرزا غلام احمد قادیانی کے دام تزویر میں پھنس چکا تھا اور آخر تک اسیر رہا، باوجودیکہ مرزا محمود کی کارستانیوں سے وہ کماحقہٗ واقف ہو چکا تھا اور پھر جماعت کا سلوک جس کا اشتہار میں تذکرہ ہو چکا ہے لیکن مرزا غلام احمد کے دام تزویر سے اسے مرتے دم تک خلاصی نصیب نہیں ہوئی۔ ہماری اس سے یا اس کے بچوں سے ہمدردی انسانی بنیاد پر تھی اور اس کا بڑا لڑکا مظہر الدین بیزاری کا اظہار کرتا تھا۔ حقیقتِ حال خدا جانتا ہے لیکن مرتدین کی اصلاح مشکوک رہی رہتی ہے، کیونکہ مرتدین میں کئی قسم کی اعتقادی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

بالآخر فخر الدین کے قتل سے مرزائیوں کی آتش انتقام ٹھنڈی ہوئی۔ دن کا وقت تھا، میں اپنے دفتر احرار میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایک آدمی بھاگا بھاگا آیا اور اطلاع دی کہ دن کی روشنی میں کوئی اڑھائی تین بجے کا وقت ہوگا، فخر الدین پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے اور زخم کاری ہے، اس کا جانبر ہونا مشکل

ہے۔ اس سے پہلے فخر الدین کا اندرونی یا بیرونی طور پر ہمارے ساتھ کوئی رابطہ نہ تھا اور رابطہ ہو بھی کیسے سکتا تھا؟ ہم نے مرزا غلام احمد اور اس کے بیٹے کی ایک سطح پر چھاڑ شروع کر رکھی تھی اور رات دن دونوں کو ملاحیاں سناتے تھے بلکہ ہمارے نزدیک اصل مجرم باپ غلام احمد تھا اور فخر الدین اخیر دم تک غلام احمد کے دامِ تزویر کا شکار رہا۔ فخر الدین قادیان میں اب اکیلا تھا دوسرا کوئی بھی اس کی لاش تک سے ہمدردی کرنے والا نہ تھا۔ فخر الدین کے بعض ہم خیال لوگ قادیانیوں میں ضرور تھے مثلاً شیخ عبدالرحمٰن مصری، حکیم عبدالعزیز، محمد صادق شبنم، عبدالرب برہم وغیرہ جو علانیہ خلیفہ کے خلاف ہو رہے تھے اور اندرونِ جماعت قاضی اکمل وغیرہ بیسیوں بلکہ سینکڑوں ہوں گے، مگر ان کی خلیفہ سے مخالفت اور فخر الدین کے ساتھ ہمدردی صرف اذہان اور خیالات تک محدود تھی اور آج ان سب کو اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ کسی کو اظہارِ ہمدردی کے لیے لاش کے قریب جانے کی ہمت نہیں تھی۔ میں نے فوری طور پر اپنے احباب کو بلایا اور زخمی فخر الدین کو خاک و خون میں لتھڑا اُٹھایا، پولیس میں رپورٹ لکھوائی، پھر زخمی کو میڈیکل ایڈ کے لیے گورداسپور ہسپتال پہنچایا۔ وہ ہسپتال میں تین دن زندہ رہ کر راہیٔ ملکِ عدم ہو گیا۔ مقدمہ چلا، ملزم کو سزا ہوئی اور تختۂ دار پر کھینچا گیا۔ یہ سب جماعتِ احرار کی برکت تھی ورنہ ایسے لاوارث کو قادیان میں تڑپتا دیکھ کر کون سہارا دے سکتا تھا؟ پھر مقدمہ لڑ کر ملزم کا سزایاب ہونا کسی کے خواب و خیال میں نہ آ سکتا تھا۔ قادیان میں پادری محمد علی امیر جماعتِ مرزائیہ لاہور کو لاہور بھاگنے میں اپنی سلامتی نظر آئی، حالانکہ قادیانی جماعت میں اس کا مرتبہ اور پایہ اتنا بلند اور ارفع تھا کہ بانی سلسلہ مرزا غلام احمد قادیانی، محمد علی مذکور کا کھانا خود اپنے ہاتھ سے لایا کرتا تھا اور یہ وقار قادیانی جماعت میں کسی ایک کو نصیب نہیں ہوا تھا، لیکن مرزا محمود کی مخالفت کی وجہ سے راتوں رات اسے قادیان سے بھاگنا پڑا۔

علاوہ ازیں کئی فخر الدین خاک و خون میں تڑپائے گئے جن کی خبر دینے یا لینے کا کسی کو یارا نہیں تھا۔ مقدمہ یا سزا تو اپنے مقام پر، ان کا نام لینا بھی جرم قرار دیا گیا اور دھرتی انھیں نہایت آسانی سے نگل گئی۔ فخر الدین کے قاتل کا جو فیصلہ سیشن جج نے لکھا اور جو ریمارکس اس نے دیے اور پھر ان ریمارکس کی جو تاویل ''خداوندان انگریزی'' نے کی۔ قارئین کے لیے یہ دو فیصلہ جات بھی ضرور دلچسپی کا موجب ہوں گے۔ سیشن جج ہندوستانی تھا۔ اس نے مثل مقدمہ کی شہادتوں کی روشنی میں نہایت دیانت داری سے فیصلہ لکھا۔ مثل اور سیشن جج کے فیصلہ کے مطابق مرزا محمود اس قتل میں برابر کا شریک و مجرم تھا۔ ہائیکورٹ کا جج انگریز تھا اسے کب گوارا تھا کہ اس کا خود کاشتہ پودا انگریزی عدالت کے کٹہرے میں بطورِ ملزم کھڑا ہو۔ انگریز جج نے انصاف کا خون کرتے ہوئے قادیانیوں کی

دور از کار اور فریب آمیز تاویلات کو قبول کر کے مرزا محمود کو عدالتی کٹہرے میں بطور ملزم کھڑا ہونے سے بچالیا۔ انصاف کا خون ہوتا ہے تو ہوتا رہے مگر خود کاشتہ پودا جرم کر کے بھی کیفر کردار تک نہ پہنچ سکے۔ میں قارئین سے اتنی معذرت کروں گا کہ سیشن جج گورداسپور کے فیصلہ کا پورا متن مجھے دستیاب نہیں ہوسکا۔ اس وقت میرے سامنے ہائیکورٹ پنجاب کے فیصلہ کے اقتباسات موجود ہیں جن کے خلاف ہائیکورٹ نے ملزم کی اپیل کی سماعت کی تھی جو اس نے اپنی سزائے موت کے خلاف کی تھی۔ اس اپیل کی سماعت اس وقت کے چیف جج نے خود کی تھی اور اسے ''فل بنچ'' کا نام دینے کے لیے ایک اور جج کو اپنے ساتھ بٹھایا تھا جس کا نام جسٹس عبدالرشید تھا۔ اس انگریز چیف جسٹس کا نام ''سر ڈگلس ینگ'' تھا۔ ہائیکورٹ کے اس فیصلہ سے سیشن جج گورداسپور کے ریمارکس پر کافی حد تک روشنی پڑتی ہے۔ ہائی کورٹ کے انگریز چیف جج نے جسٹس عبدالرشید کے اتفاق سے جو اس مقدمہ کا فیصلہ لکھا ہے اس کے چیدہ چیدہ اقتباسات یہ ہیں اور ان سے قادیانیوں کے طرزِ عمل پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ مثل میں مندرجہ شواہد سے انگریز جج معذور تھا کہ وہ ان شہادات کو نظر انداز نہ کرے جو مثل میں موجود تھیں اور سیشن جج گورداسپور نے انھیں صحیح تسلیم کر کے ان کی روشنی میں ملزم کو سزا دی تھی اور ساتھ ہی مرزا محمود اور اس کی جماعت کی کارستانیوں کا مکمل تذکرہ کیا تھا جس سے واضح ہوتا تھا کہ اس قتل کا ذمہ دار وہی صرف ایک فرد نہیں ہے جس نے یہ ارتکاب کیا تھا، بلکہ اس قتل میں مرزا محمود اور اس کی جماعت کا بھی اہم رول تھا لیکن انگریز چیف جسٹس نے سب کچھ درست قرار دے کر ملزم کی سزا کو بحال رکھا اور تھوڑے الفاظ بڑھا کر مرزا محمود کو قانونی شکنجہ سے بچالیا۔ اب جج کے تبصرہ اور فیصلہ کے فقرات ملاحظہ کریں۔

ہائی کورٹ کے فیصلہ کے اہم اقتباسات

''قریب زمانہ میں ہی فخر الدین قادیانی احمدیوں کے خلیفہ کا پیرو کار تھا۔ مقتول اور عبدالرحمٰن مصری کو خلیفہ سے اختلاف کرنے پر جماعت سے خارج کر دیا گیا یا وہ خود علیحدہ ہو گئے۔ انھوں نے ایک ''نئی انجمن'' کی بنیاد ڈالی جس کا بڑا مقصد خلیفہ کی مخالفت کرنا ظاہر ہوتا ہے۔ ان کا قیام قادیان میں تھا اور چونکہ قادیان میں زیادہ آبادی ''متشدد احمدیوں'' کی تھی اس لیے قدرتی طور پر ''آرتھوڈاکس گروپ'' (زیرِ زمین اور خفیہ رہ کر دہشت انگیز کاروائیاں کرنے والے گروہ) اور ان کے درمیان جھگڑے کی صورت پیدا ہوگئی جیسا کہ گواہوں کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ''مخالف انجمن کے ارکان'' کا بائیکاٹ کیا جائے اور ان کے گھروں پر پکٹنگ (ناکہ بندی) لگائی جائے اور یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ (خلیفہ کے مخالف) بہت ناخوشگوار حالت میں تھے۔ مقتول نے متعدد اطلاعات

مقامی پولیس چوکی میں دیں جو احمدیوں کی ان حرکات سے متعلق تھیں جو اس کے خلاف کر رہے تھے۔"

"22 جولائی 1937ء کو خلیفہ نے بذاتِ خود مسجد میں ایک اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے عبدالرحمٰن مصری اور اس کے رفقاء پر ایک طویل ذاتی حملہ کیا۔ چنانچہ یہ تقریر یکم اگست کے "الفضل" میں شائع ہوئی۔

توضیح (یاد رہے کہ انگریز چیف جسٹس خلیفہ محمود کے قابل اعتراض فقرات گول مول کر گیا جنھیں سیشن جج نے نوٹ کیا تھا) یہاں چیف جج مرزا محمود کے وہ فقرات نوٹ کرتا ہے جو کسی قدر خلیفہ کے جرم کو ہلکا کرتے ہیں اور وہ یہ ہیں:

> "لیکن اگر وہ یونہی گندے اعتراضات کرنے پر مصر رہے تو میں اعلان کرتا ہوں کہ احمدیت کا تو ذکر ہی کیا، عصمت بھی ان کے خاندانوں سے رخصت ہو جائے گی اور ان کے خاندان "فحش کا مرکز" بن جائیں گے۔ اس خطبہ کے جواب میں خصوصاً خلیفہ کے اس بیان کے خلاف یعنی "ان کے خاندان فحش کا مرکز بن جائیں گے۔" فخر الدین نے احتجاج کے طور پر 5 اگست کو (ایک) اشتہار چسپاں کیا جس کا آخری حصہ درج ذیل ہے:
>
> "اسی لیے تو ہم جماعت سے ایک آزاد تحقیقاتی کمیشن کا مطالبہ کر رہے ہیں تاکہ سب "حقائق"، "شہادت" اور "راز" فیصلہ کے لیے اس کے سامنے پیش کیے جائیں تاکہ وہ فیصلہ کرے کہ کون سا خاندان فحش کا مرکز ہے؟"

6 اگست کی صبح کو اور پھر شام کے وقت "آرتھوڈاکس احمدیہ" کے دو اجلاس منعقد ہوئے جن میں سب انسپکٹر لالہ کرم چند کی شہادت کے مطابق مقتول کے خلاف کئی تقاریر ہوئیں۔ اس دن فخر الدین نے ذیل کی رپورٹ چوکی میں درج کرائی:

> "جنابِ عالی! آج خلیفۂ قادیان نے جمعہ کی نماز میں نہایت اشتعال انگیز تقریر کے ذریعہ "جماعتِ احمدیہ" کو "ارکانِ مجلس احمدیہ" ("مقتول پارٹی") کے خلاف مشتعل کیا ہے جس کے نتیجہ میں حد درجہ کا اشتعال پھیلا ہوا ہے۔ اس لیے درخواست کی جاتی ہے کہ ان کی حفاظت کا فوری طور پر انتظام کیا جائے۔"

"7 اگست کو اپیل کنندہ نے فخر الدین کو قتل کیا، جبکہ وہ حکیم عبدالعزیز اور بشیر احمد کے ہمراہ پولیس چوکی جا رہا تھا تاکہ اپنی اور اپنے رفقاء کی حفاظت کے لیے درخواست کرے۔ (ہم) سیشن کا

فیصلہ سزائے موت بحال رکھتے ہوئے عزیز احمد کی اپیل مسترد کرتے ہیں''......اور ساتھ ہی لکھا ہے کہ ''مرزا محمود خلیفہ نے جہاں جہاں مقتول پارٹی کے لیے ''سزا'' کا لفظ استعمال کیا ہے اس سے مراد روحانی سزا ہے نہ کہ جسمانی سزا۔''

عدالت عالیہ نے خلیفہ کی تشدد پر اُکسانے والی تقریر کو تسلیم کیا اور اس کے نتیجہ میں اس کے پیرو قادیانیوں کے صلاح و مشورہ بھی تسلیم کیے اور مقتول کی قبل از وقت چوکی پولیس میں اطلاع کو بھی تسلیم کیا جو انھوں نے قتل کی سازش کے متعلق دی تھی۔ کیا ان حالات میں انگریز جج کا فیصلہ حیرت انگیز نہیں ہے؟ اور یہ انصاف کا خون نہیں کہ اس قتل کو صرف ''فرد واحد کا فعل'' قرار دے کر اسی اکیلے کو سزا دی جائے اور بقایا تمام عوامل و واقعات ثابتہ مشمولۂ مثل سے صرف نظر کر کے صرف فرد واحد کو سزا دے کر تقاضائے انصاف کو پورا خیال کیا جائے اور اہل دانش کے سامنے اپنے کو عادل تصور کر کے مطمئن ہو جائے، اس سے بڑھ کر اور بے انصافی اور بیہودگی کیا ہو سکتی ہے؟ اور جرم سے چھٹکارے کے لیے یہ دلیل گھڑی جائے کہ خلیفہ کی تقریر میں جو مشددانہ الفاظ ہیں یا انھیں سزا دینے کا جو تذکرہ ہوا ہے اس سے مراد ''روحانی سزا اور روحانی تشدد'' ہے! بھلا ان الفاظ کو روحانی سزا پر کیسے محمول کیا جا سکتا ہے، جبکہ اس کے نتیجہ میں جسمانی سزا کا ارتکاب عملاً موجود ہے؟ پھر تقریر کے نتیجہ میں جو مشورات اور سازشیں خلیفہ کے سامنے ہو رہی تھیں کیا وہ بھی روحانی سزا ہی تھیں؟ اس کی تمثیل تو یوں ہے کہ ایک شخص کسی کے ہاتھ میں تلوار دے کر کہتا ہے کہ: فلاں آدمی کو جا کر قتل کر دو۔ اور وہ اسے قتل کر دیتا ہے پھر جب باز پرس ہوتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ: یہ قاتل کا ذاتی فعل ہے اور یہ اس کی سمجھ کا قصور ہے۔ میں نے اسے کہا تھا کہ اسے جا کر روحانی طور پر قتل کر دو۔ اس نے مطلب سمجھنے میں غلطی کی اور جا کر جسمانی طور پر اسے قتل کر دیا۔'' اگر انصاف کا کچھ پاس ہوتا تو مرزا محمود قاتل کے ہمراہ عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہوتا۔ ہندوستانی جج نے تو اس لغو اور بیہودہ تاویل کو قبول نہ کیا، مگر انگریز نے ایک انتہائی بیہودہ اور پھوہڑ تاویل کو قبول کر کے اپنے خود کاشتہ پودے کو ارادہ و حکم قتل کی سزا سے صاف بچا لیا! مزید برآں یہ لوگ عوام میں یا جلسوں میں گالیاں نہیں دیتے تھے بلکہ وہ ایک آئینی مطالبہ کر رہے تھے جو ہر لحاظ سے جائز اور معقول تھا۔ مرزا محمود کی بیعت توڑنے والوں کا سرغنہ شیخ عبدالرحمٰن مصری تھا اور اسی نے مطالبہ کیا تھا کہ: خلیفۂ قادیانی ایک آزاد کمیشن مقرر کر دیں تاکہ اس کمیشن کے سامنے وہ لوگ ان الزامات کو پیش کریں اور کمیشن کے فیصلہ کے فریقین پابند رہیں۔ شیخ عبدالرحمٰن مصری کے مطالبہ کے الفاظ یہ ہیں:

''میں جماعت کو یقین دلاتا ہوں کہ جن نقائص کی وجہ سے بیعت سے علیحدہ

ہوا ہوں، وہ یقیناً خلیفہ میں موجود ہیں اور ان کے اثبات کے لیے میرے پاس کافی دلائل موجود ہیں۔'' (بیان شیخ عبدالرحمٰن مصری مندرجہ پیغام صلح 26 جولائی 1937ء)

شیخ عبدالرحمٰن مصری بڑا سنجیدہ انسان تھا، وہ یوں بازاری بک بک نہیں کرتا تھا بلکہ اشارات و کنایات سے بات کرتا تھا۔ قادیان میں ہمارے دفترِ احرار میں اس کا کئی دن تک قیام رہا۔ ہم تفصیلات دریافت کرتے تھے تو کہتا تھا کہ:

اگر کمیشن قائم ہوا تو میں الزامات ثابت کرلوں گا۔ وہ تفصیل سے الزامات کا تعین بھی عوام میں نہ کرتا تھا، الزامات کا تفصیلی تعین ہمیں خلیفہ محمود کے ایک خطبہ سے ہوا جو ''الفضل'' میں چھپ کر ہمارے سامنے آیا۔ خلیفہ محمود بیان کرتے ہیں:

''مصری نے خط میں لکھا ہے کہ: ''اگر آزاد کمیشن بیٹھے تو اس کے سامنے میرے خلاف لڑکوں اور لڑکیوں اور عورتوں کی گواہیاں وہ دلوا دیں گے بلکہ خود میری بھی گواہی دلوا دیں گے۔ میری گواہی سے میں سمجھتا ہوں، شاید ان کی مراد یہ ہو کہ وہ میری کوئی تحریر (جس سے الزام ثابت ہو) پیش کرنا چاہتے ہیں۔ واللہ اعلم۔'' (خطبۂ خلیفہ مندرجہ ''الفضل'' 20 نومبر 1937ء)

اگر انگریزی حکومت کھلم کھلا مرزائی خلیفہ محمود کو بچانے کی سعی نہ کرتی تو مرزا محمود کو ضرور عدالتی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کر دیا جاتا۔

حضرت امیر شریعت کے مقدمہ میں مسٹر جی۔ ڈی کھوسلا نے مرزا محمود اور اس کی جماعت کے خلاف مشمولہ قتل شہادتوں کی روشنی میں جو ریمارکس دیے تھے وہ ریمارکس مرزا محمود اور اس کی انتظامیہ کے متعلق تھے۔ ان کو سامنے رکھ کر کسی بھی انصاف پسند حکومت کے خلاف مقدمہ درج کر کے انھیں عدالت میں لے آتی مگر ہائیکورٹ کے ایک انگریز جج نے جس کا نام ''گولڈسٹریم'' تھا سیشن جج کے ان ریمارکس کو بے اثر بنا کر رکھ دیا اور یوں یہ ظالم و قانون شکن جماعت ''قانونی گرفت'' سے بچ گئی۔ اسی طرح فخرالدین ملتانی کے مقدمہ میں بھی سیشن جج گورداسپور نے قادیان کی مرزائی جماعت اور اس کے خلیفہ محمود کے خلاف شدید قانونی ریمارکس دیے تھے مگر ہائیکورٹ کے چیف جج جسٹس ڈگلس ینگ نے ان ریمارکس کی قادیانی تاویل کو قبول کر کے انھیں بے اثر کر دیا اور قادیان کی انتظامیہ سربراہ جماعت سمیت قانونی شکنجہ سے نکلنے میں کامیاب ہوگئی۔

قادیان میں میرے شب و روز

شام کے کھانے کے بعد دفتر میں تمام ہمدرد اصحاب ہر روز بلاناغہ جمع ہو جاتے تھے۔ کم و بیش رات کے گیارہ بجے تک بیٹھے اور لیٹے رہتے تھے۔ مرزائیوں کی سرگرمیوں اور منصوبوں پر بحث ہوتی رہتی تھی۔ جتنا کسی کو معلوم ہوتا وہ بیان کرتا اور دوسرے دن کے لیے پروگرام تیار کیا جاتا تھا۔ مرزائی امت اور خلیفہ کے ''تازہ اعمال و افعال'' کا تذکرہ بھی ہوتا تھا۔ صبح کے لیے کسی کی کسی کام پر ڈیوٹی لگانی ہوتی تو اسے بتا دی جاتی۔ کوئی ڈیوٹی دے کر آتا تو اس کی رپورٹ بھی سن لی جاتی اور اس کے متعلق مناسب کارروائی کا پروگرام بھی تیار کر لیا جاتا اور متعلقہ اصحاب کو بتا دیا جاتا تھا۔

قادیان مرکزی قصبہ تھا۔ نواح میں بہت سے دیہات تھے جنھیں ضروریاتِ زندگی کے حصول کے لیے قادیان آنا پڑتا تھا۔ ہم نے اپنے تمام دکان داروں کو کہہ رکھا تھا کہ: ''دیہات سے سودا سلف خریدنے کے لیے آنے والے دیہاتیوں سے دریافت کر لیا کریں کہ ''تمھارے گاؤں میں کوئی مرزائی گیا ہے تو وہ کون تھا؟ اس کا کیا نام تھا؟ اس نے وہاں جا کر کس آدمی سے ملاقات کی اور کیا کہتا تھا وغیرہ وغیرہ؟''— تمام دکاندار ہماری اس ہدایت سے آگاہ تھے۔ شام کے بعد آ جاتے اور اپنی اپنی اطلاعات بہم پہنچاتے اور ان پر غور و خوض ہوتا اور مناسب تدابیر اختیار کی جاتی تھیں۔

غازی عبدالحق، میاں عبداللہ، چودھری فیض اللہ وغیرہ احباب تو شام کے بعد ہمارے ہاں ضرور آتے تھے۔ ان کے علاوہ مختلف برادریوں کے لوگ بھی آ جاتے تھے۔ وہاں ایک قریشی خاندان بھی آباد تھا۔ مرزائیوں کا مخالف اور ہمارا مخلص و ہمدرد تھا۔ اس خاندان کے ایک فرد کا نام ہدایت علی شاہ تھا۔ قریشی صاحب نے عمدہ گھوڑی پال رکھی تھی جو ہمارے لیے وقف تھی۔ ہمیں کبھی دیہات میں جانا ہوتا تو اس کے گھر پیغام بھجوا دیتے۔ گھوڑی آ جاتی۔ نمازِ جمعہ مسجد آرائیاں میں ادا ہوتی تھی۔ دیہات سے ہزاروں آدمی آ جاتے تھے۔ ہندوؤں اور سکھوں کی بھی خاصی تعداد موجود ہوتی تھی۔ خطبۂ جمعہ میں ہفتہ بھر کا جائزہ لیا جاتا۔ کوئی واقعہ ہو جاتا تو عوام کو اس سے مطلع کیا جاتا تھا۔ حکومت کا ''ڈائری نویس ہیڈ کانسٹیبل پولیس'' موجود ہوتا جو مکمل ڈائری نوٹ کرتا تھا۔ ڈپٹی کمشنر گورداسپور جمعہ کی ڈائری کا منتظر رہتا تھا۔ قیامِ امن کے لیے پولیس کی مسلح گارد مسجد کے باہر موجود ہوتی تھی۔ مسجد کی جانب شرق ایک مرزائی کا مکان تھا۔ وہاں مرزائی ڈائری نویس موجود ہوتا اور مکمل ڈائری لے کر خلیفہ محمود کو پہنچاتا تھا۔ ہم نے بھی انتظام کر رکھا تھا کہ مرزا محمود کے خطبۂ جمعہ کی ڈائری ہمیں پہنچ جائے۔ مرزا محمود کی ڈائری ہمیں زبانی پہنچتی تھی۔ ہم نے یہ ڈیوٹی ان مرزائیوں کی لگا رکھی تھی جو مرزا محمود سے ذاتی طور پر ناراض تھے اور ہمیں خفیہ آ کر ملتے تھے۔ بعض اوقات ہم ان کی مالی امداد بھی کرتے تھے۔

مرزائیوں کا خاصا عنصر مرزا محمود کے تشدد سے نالاں تھا اور وہ بچ بچا کر ہمارے پاس آتا رہتا تھا، اور ''جماعتی راز'' بہم پہنچاتا تھا۔ اسی عنصر کے ذریعہ مرزا محمود کے خطبہ کی تازہ ڈائری ہمیں پہنچ جاتی تھی۔ نواحی دیہات میں بھی مجھے ضرور جانا پڑتا تھا، کیونکہ جہاں کہیں مرزائیوں کے اثر انداز ہونے کی اطلاع پہنچتی، اس کے ازالہ کے لیے ہمیں وہاں پہنچنا ضروری ہو جاتا تھا۔ جوانی تھی، صحت تھی، رفقاء کو ساتھ لیا اور وہاں پہنچ جاتا۔ سواری میسر آئی تو فبہا ورنہ پیدل مارچ ہوتا۔ غازی عبدالحق، چودھری فیض اللہ عموماً میرے ہم سفر ہوتے تھے۔

فطرت کے مقتضیات اختیاری نہیں ہوتے۔ بھوک، پیاس، انسان کے اختیار میں نہیں ہے۔ لباس انسانی اختیار کا معاملہ ہے۔ سفید؟ یا سیاہ؟ یا سبز؟ جو چاہے استعمال کرے یہ اس کے اختیار میں ہے۔ البتہ فطری تقاضیات کا اظہار یا انہیں پورا کرنا انسانی شعور و عقل پر موقوف ہے۔ عقل مند فطری تقاضے کا اظہار، یا اس کے حصول کی کوشش اپنے معیارِ عقل و شعور کے مطابق کرے گا اور کم عقل انسان اس کا اظہار یا حصول اپنے شعوری انداز کے مطابق عمل میں لائے گا مثلاً بھوک ایک فطری تقاضا ہے اور اس سے کوئی بھی ''صحت مند انسان'' مستثنیٰ نہیں، لیکن اسے پورا کرنے کے طریق مختلف ہیں۔ ایک ''چوری'' کر کے اسے مٹائے گا تو دوسرا ''محنت مزدوری'' یا ''تجارت'' سے کما کر اس خواہش کو پورا کرے گا اور اسی طرح ایک تیسرا آدمی ''ڈاکہ'' ڈال کر بھوک دور کرنے کی کوشش کرے گا۔

اسی طرح ''جنسی تقاضا'' فطری ہے اور ہر صحت مند انسان میں پایا جاتا ہے۔ اس تقاضے کا وجود ہر انسان کی فطرت میں گندھا ہوا ہے۔ یہ الگ معاملہ ہے کہ کسی وجود میں کم، اور کہیں زیادہ۔ اس تقاضے کا وفور ''رومان'' کہلاتا ہے اور لوگ اسے ''دل پھینکنے'' سے بھی تعبیر کرتے رہتے ہیں۔ اس تقاضے کا اظہار و حصول بھی شعوری مقدار کے تحت ہوتا ہے۔ کم عقل انسان اس کا اظہار و حصول یوں کرتا ہے کہ کسی راہ جاتی ''معصومہ'' پر ہاتھ ڈال دیتا ہے اور رسوائی کے ساتھ ساتھ بعض اوقات شدید زدوکوب کا شکار ہو جاتا ہے، اور ایک دوسرا انسان جس کا شعور پہلے سے مختلف ہے پیسے دے دلا کر ''سودا بازی'' کر لیتا ہے اور ایک تیسرا انسان جس کا شعور پہلے دونوں سے مختلف ہے باوجود انتہائی خواہش کے صبر و تحمل کا دامن تھامے رکھتا ہے اور بعض اوقات وہ بڑے ایمان آزما حالات سے دوچار ہوتا ہے مگر ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیتا اور معاشرہ کے معمول کے مطابق جائز و معقول راہیں تلاش کرنے میں مصروفِ کار رہتا ہے۔ تقاضا ایک ہے، ابتدائے آفرینش سے فطرت میں گندھا گیا ہے لیکن اس کے اظہار و حصول کی راہیں مختلف ہیں جو ہر انسان اپنے شعور کے مطابق اختیار کرتا ہے۔

مرزا غلام احمد قادیانی میں قدرت نے ''جنسی تقاضے'' بڑی ''فیاضی'' سے ''ودیعت''

فرمائے تھے اور اس کے اظہار اور حصول کا جو طریق مرزا نے اختیار کیا تھا، مکمل ثبوت کے ساتھ ہدیۂ قارئین ہے۔ ''معقولیت'' یا ''غیر معقولیت''؟ یا ''اندازِ فکر و شعور'' کی جانچ قارئین خود کریں گے۔

یاد رہے کہ ''معاشی عسر'' یا ''یسر'' انسانی عقل و شعور اور فطری مطالبات پر بڑا اثر انداز ہوتا ہے۔ ابتدائی ایام میں مرزا ''معاشی تنگی'' کا بری طرح شکار تھا۔ اس نے خود لکھا ہے: ''معاشی تنگی اور عسرت کی وجہ سے میں اس مردے کی مانند تھا جسے مرے ہوئے مدت گزر گئی ہو اور کوئی نہ جانتا ہو کہ یہ کس کی قبر ہے؟'' اس دور میں مرزا نے اپنے ''مغل خاندان'' میں شادی کی تھی اور جس طرح بن پڑا گزر اوقات کرتا رہا۔ مرزا سلطان احمد اور فضل احمد دو لڑکے بھی ہوئے اور کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی اور نہ آپس میں کبھی ''رنجش'' ہوئی۔ یہ دور ''دورِ عسر'' تھا اور اس میں تمام مطالبات بھی ٹھپ رہے لیکن جب دوسرا دور آیا اور ''ٹھگی'' سرک پڑی اور ''روپیہ ملنا'' شروع ہو گیا تو فطری مقتضیات بھی جاگ اٹھے اور انھوں نے ''رومانی انداز'' اختیار کر لیا۔ اس زمانہ میں قادیان کے قریب سے نہر کی کھدائی ہو رہی تھی اور ایک ''اوورسیئر'' یا ''سرویئر'' جس کا نام ''ناصر'' تھا، نہر کی کھدائی کا نگران تھا۔ اسے مرزا نے اپنے گھروں کے ساتھ ہی مکان دے رکھا تھا۔ یہ شخص صبح کام پر چلا جاتا اور شام کو واپس گھر آ جاتا۔ جہاں مرزا صاحب کی معیشت کروٹ لے رہی تھی، وہاں ان کی فطری قوت جو قدرت نے انھیں فراخ دلی سے ودیعت فرمائی تھی مگر معاشی عسرت نے اسے تھپکی دے کر سلا رکھا تھا، اب معاشیات میں تبدیلی آئی تو وہ قوت بھی آہستہ آہستہ بیدار ہو کر ''رومانی انداز'' اختیار کرنے لگی۔

ناصر اوورسیئر جو مرزائیوں کے گھر میں بسیرا کیے ہوئے تھا اس کے ہاں ایک ''نوخیز غزالہ صفت لڑکی'' آہستہ آہستہ ''قتالہ'' کا انداز اختیار کر رہی تھی۔ تھوڑے عرصہ کے بعد وہ ''سن شعور'' کو پہنچ گئی اور نگاہوں کو ''خیرہ'' کرنے لگی۔ ''نصرت'' نام تھا۔ ہندوستانی انداز اور وہی ہندوستانی ''چلبلا پن'' صاف اردو بولتی تھی اور سننے والوں کے دل ''موہ'' لیتی تھی۔ مرزا نے ابتدائی ایام میں ہی جب کہ وہ ''بچی'' تھی مگر اس کے انداز سے بھانپ لیا تھا کہ اس نے آگے چل کر کیا ہونا ہے؟ مرزا کی للچائی ہوئی نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ ''ناصر اوورسیئر'' ان کے گھر رہتا تھا اور اس کے ساتھ حسن سلوک تو مرزا نے بڑے عرصہ سے شروع کر رکھا تھا اور وہ ان کا ممنونِ احسان تھا۔ آپ جانتے ہیں ایک اوورسیئر کی اس زمانہ میں کیا تنخواہ ہوتی تھی؟ یہی پچیس، تیس روپے، ان کے گھر بار کا کسی کو علم نہ تھا اور نہ کبھی وہ گھر گیا تھا!

مرزا ابھی بوڑھا تو نہ تھا، مگر جوان بھی نہ تھا، یہی چالیس پینتالیس کا پیٹا تھا۔ ممکن ہے ناصر ''اوورسیئر'' پہلے ہی انداز سے اس کے عزائم بھانپ رہا تھا۔ مرزا نے خواہش کا اظہار کیا تو وہ

راضی ہو گیا اور لڑکی ''نصرت جہاں بیگم'' بن کر مرزا کے ''حرم'' میں داخل ہو کر ''ام المؤمنین'' کہلائی اور اس کا باپ ''میر ناصر نواب'' کے نام سے مشہور ہوا اور مرزا غلام احمد کے قلم نے اسے خواجہ ''میر درد'' دہلوی کی اولاد سے قرار دے کر اسے بڑی شہرت دی۔ اس شادی کا بڑا چرچا ہوا۔ ''میر ناصر نواب'' کا ''وطن مالوف'' کسی کو معلوم نہ تھا۔ وطن تو ضرور ہوگا مگر وہاں ان کی کوئی قابل ذکر حیثیت نہ تھی۔ ماں باپ نے کوشش کر کے تھوڑا بہت پڑھایا اور اس نے ''اوورسیئر'' یا ''سرویئر'' کا کورس کر لیا۔ اس وقت موجودہ دقتیں نہ تھیں اور نہ ہی ''مانگ'' زیادہ تھی اور لکھے پڑھے لوگ بہت کم دستیاب ہوتے تھے۔ نتیجۃً وہ ملازمت کے بعد زندگی بھر کے لیے قادیان کے ہو کر رہ گئے۔ ابتداء میں مرزا کے ''دعاوی'' پر ایمان نہ لائے تھے۔ چونکہ اپنی لڑکی مرزا کے نکاح میں دے چکے تھے اس لیے زیادہ دیر تک استقامت نہ رکھ سکے اور آخر مرزا سے ''بیعت'' ہو گئے۔

میں 32-1931ء میں جب قادیان گیا اس وقت ''میر ناصر نواب'' زندہ موجود تھے مگر دماغی توازن کھو بیٹھے تھے اور لوگ ان سے مذاق کیا کرتے تھے۔ قادیانی محلوں میں عموماً پھرتے رہتے تھے۔ مرزا صاحب نے اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے دی تھی اور اس کے بڑے بیٹے مرزا سلطان احمد کو ''عاق'' کر کے ''جائداد'' سے ''محروم'' کر دیا تھا مگر مرزا سلطان احمد پر اس کا زیادہ اثر نہ ہوا کیونکہ وہ سرکار انگریزی میں اچھے عہدہ پر ملازم تھا اور مرزا غلام احمد کے بڑے بھائی مرزا غلام قادر نے اسے اپنا متبنّٰی بنا کر اپنی جائداد کا ''وارث'' بنا دیا تھا جبکہ وہ جائداد مرزا غلام احمد کی جدی جائداد سے نصف تھی یعنی نصف کا حصہ دار غلام احمد اور دوسرے نصف کا مالک مرزا سلطان احمد ہو گیا۔ اس بیوی یعنی ''نصرت جہاں بیگم'' سے مرزا کے تین لڑکے ہوئے اور دو لڑکیاں ہوئیں۔ بڑے لڑکے کا نام مرزا ''محمود احمد'' تھا جو بعد میں ''بشیر الدین محمود احمد خلیفہ قادیان'' کے نام سے مشہور ہوا۔ دوسرے لڑکے کا نام مرزا ''بشیر احمد'' تھا جس نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔ اے کیا تھا۔ ''ایم۔ ایم۔ احمد (''مظفر احمد'') جو پاکستان گورنمنٹ میں بڑے اعلیٰ عہدہ پر فائز رہا ہے خلیفہ محمود کا بھتیجا اور مرزا بشیر احمد کا لڑکا ہے۔ میانوالی کا ایک ''نیازی پٹھان'' جو پشاور میں رجسٹرار تھا، ''مرزائی'' ہو گیا تھا اس نے اپنی لڑکی مرزا بشیر احمد کو دی تھی۔ ایم۔ ایم۔ احمد اس کا لڑکا تھا۔ گویا ایم۔ ایم۔ احمد کے ''ننہال'' میانوالی کے ''نیازی پٹھان'' ہیں۔ مرزا غلام احمد کے مرنے کے بعد وہ مرزا محمود کو چھوڑ کر محمد علی لاہوری کا ''پیرو'' ہو گیا تھا اس کے بیٹے یعنی ایم۔ ایم۔ احمد کے ماموں ''قادیانیت'' اور ''لاہوریت'' دونوں کو چھوڑ بیٹھے ہیں اور بڑے باعزت اور برسر روزگار ہیں۔

تیسرے بیٹے کا نام ''شریف احمد'' ہے وہ زیادہ پڑھا لکھا نہ تھا اس لیے قابل ذکر لوگوں کی

صف میں اس کا نام کبھی نہیں سنا۔ مرزا غلام احمد کی اس بیوی سے دو لڑکیاں تھیں بڑی کا نام ''مبارکہ بیگم'' تھا اور چھوٹی کا نام ''حفیظہ بیگم'' یا ''امتہ الحفیظ'' تھا۔

نواب مالیر کوٹلہ کے خاندان میں سے ایک شخص ''محمد علی'' تھا۔ جسے خاندانی نسبت سے ''نواب محمد علی'' کہا جاتا تھا۔ وہ عقیدۃً ''شیعہ'' تھا! ''مرزائیت سے متاثر ہوا تو اس نے مرزا غلام احمد کو لکھا کہ: ''میں شیعہ ہوں اور آپ کی تحریک سے متاثر ہوں۔ کیا کوئی شیعہ بھی آپ کی جماعت میں شامل ہو سکتا ہے!'' تو مرزا نے اسے لکھا کہ: ''داخل ہو سکتا ہے! تم مجھے آ کر ملو!'' چنانچہ وہ مرزا کو ملا تو مرزائی ہو گیا اس کا ایک بیٹا بھی تھا جو نواب ''عبداللہ'' کہلاتا تھا۔ دونوں باپ بیٹا مرزائی ہو کر قادیان آ گئے۔ مرزا غلام احمد کی دو لڑکیاں تھیں۔ ''مبارکہ بیگم'' اور دوسری کا نام غالباً ''امتہ الحفیظ بیگم'' تھا۔ مرزا نے اپنی دونوں لڑکیاں دونوں باپ بیٹوں کے نکاح میں دے دیں۔ مبارکہ بیگم نواب محمد علی کے نکاح میں آئی اور امتہ الحفیظ بیگم نواب عبداللہ کے نکاح میں آئی اور دونوں قادیان آ گئے اور میرے قیام قادیان کے دوران میں یہ لوگ مستقلاً قادیان میں ہی قیام پذیر تھے۔

مرزا کی معیشت میں جوں جوں اضافہ ہوتا گیا اس کی ''رومانی قوت'' جوان ہوتی گئی۔ مرزا کی عمر جب پچاس سے متجاوز ہوئی اور اس کی ''معاشی حالت'' ''بام عروج'' پر پہنچ کر بلند معیاروں کو چھونے لگی تو اس کی رومانی خواہش کب خاموش رہنے والی تھی؟ اس نے بھی بڑی تیزی سے سر اٹھایا مگر جسمانی حالت روبہ زوال تھی اس لیے اس نے حکیم ''نورالدین'' کو خط لکھا۔ حکیم نور الدین بھیرہ کا رہنے والا، خاندانی پیشہ کے لحاظ سے ''نائی'' اور علم و حکمت میں ''یکتائے زمانہ'' تھا اور ''مہاراجا کشمیر کے معالج خصوصی کی حیثیت'' سے وہاں مقیم تھا۔ مرزا کا سودا برطانوی حکومت سے مہاراجا پٹیالہ نے کرایا تھا اور انگریزی حکومت مہاراجا کی بڑی شکر گزار ہو رہی تھی۔ مہاراجا کشمیر کو رشک آیا کہ: ''کاش یہ سودا میرے ذریعہ سے ہوتا؟'' مہاراجا اس تاک میں تھا کہ کوئی موقع میسر آئے تاکہ میں حکومت کو خوش اور ممنون کرنے والی ''خدمت'' سرانجام دے کر مہاراجا پٹیالہ کا ''ہم پلہ'' ہو جاؤں۔

انگریزی حکومت کا سودا تو مرزا غلام احمد سے ہو چکا اور اس نے کام بھی شروع کر دیا تھا اور انگریز اس کے کام سے خوش اور مطمئن بھی تھا مگر ''انگریز بچہ'' مسلمان پر اتنا اعتماد کرنے والا نہ تھا کہ وہ مطمئن ہو کر بیٹھ جاتا۔ اسے کھٹکا لگا ہوا تھا کہ مرزا غلام احمد کسی غلط فہمی کی وجہ سے کسی مرحلہ پر اس سے پیچھے نہ ہٹ جائے کیونکہ حکومت کو چار جانب نگاہ رکھنی پڑتی ہے اور علانیہ اور کھلم کھلا کسی ایک فریق کو ہمیشہ اپنا معتمد نہیں بنا سکتی۔ اس لیے اس نے ضرورت محسوس کی کہ کوئی ایسا ''قابل ترین آدمی''

ہو جس کا اسلام میں علمی مقام اونچا اور ''قابل اعتماد'' ہو اور وہ کسی ''قابل اعتماد شخصیت'' کے ذریعہ سے ہی ہمیں ملے تا کہ ہم اسے مرزا غلام احمد کے ساتھ نتھی کر دیں اور وہ مرزا کو پھسلنے نہ دے۔ یہ ''ضمانت'' کسی بڑے قابل اعتماد آدمی کی ہو۔

مہاراجا کشمیر اسی تاک میں تھا، اس ضرورت کے احساس کی خبر پاتے ہی اس نے وائسرائے سے ملاقی ہو کر ''اپنا آدمی'' اس کام کے لیے پیش کر دیا اور وہ آدمی تھا ''حکیم نور الدین بھیروی'' جو مہاراجا کا ''معالج خاص'' اور ہر طرح سے موزوں ''علم و فضل میں پختہ''، ''طب'' میں ''ماہر'' اور بڑا ''قابل اعتماد'' تھا۔ انگریز نور الدین کی ''موزونیت و قابلیت'' کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اب مہاراجا کشمیر اور پٹیالہ انگریزی حکومت کے لیے دونوں ایک دوسرے کے ہم پلہ تھے اور یوں مہاراجا کشمیر کی ''حسرت'' پوری ہو گئی۔

حکیم نور الدین کا مرزا سے رابطہ اور اس کی معاونت کا قصہ بیان کرنے میں میرا بہت وقت صرف ہوا ہے۔ مگر اس ''رابطہ'' کا سمجھنا کہ حکیم نور الدین مرزا سے کیوں ''منسلک'' ہوا؟ بہت ضروری تھا کیونکہ حکیم صاحب مرزا سے علم و فضل میں برتر اور ارفع تھے نیز اس بات کا سمجھانا بہت ضروری تھا کہ ''فاضل''، ''مفضول'' کا کیوں تابع ہوا؟ یہی وجہ ہے کہ حکیم نور الدین ''مرزا کی اصلیت و قابلیت'' کا پوری طرح علم رکھنے کے باوجود آخر تک مرزا سے چمٹے رہے۔ مجھے ایک قابل اعتماد آدمی نے بتایا ہے کہ: ''حکیم نور الدین کو کہا جاتا تھا کہ: اللہ کی قسم کھا کر کہو کہ مرزا غلام احمد اپنے ''دعاوی'' میں سچا ہے تو وہ کہتے: ''دلائل سے تو ثابت کروں گا کہ مرزا اپنے دعاوی میں سچا ہے مگر قسم نہیں اٹھاتا۔'' چنانچہ حکیم صاحب کو اس ''رفاقت'' کا ''صلہ'' مل گیا کہ وہ مرزا کے ''جانشین'' قرار دیے گئے مگر حکیم صاحب کی بیوی اور ان کی اولاد مرزائیت سے ایک حد تک ''بیزار'' رہی۔ کیونکہ خود حکیم صاحب دل کی گہرائیوں میں مرزا کے دعاوی سے متفق نہ تھے اور گھروں میں باتیں وہی جاتی ہیں جو دراصل دل کی آواز ہوتی ہیں اور وہی قلوب سامعین پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اگر حکیم نور الدین کی بیوی ''خدا ترسی'' نہ کرتی؟ تو مباہلہ والے عبدالکریم جلا دیے جاتے۔ البتہ ان کا اپنا یہ نقصان ضرور ہوا کہ نہ مسلمانوں کا ان پر اعتماد رہا اور نہ ہی مرزائیوں کا ''ع'' نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم؟ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ!

''مرزا کی ''رومانی کہانی'' کچھ ادھر ادھر کی باتوں'' میں لمبی ہو گئی۔ دراصل میں یہ بتا رہا تھا کہ مرزا غلام احمد نے دوسری شادی کے بعد حکیم نور الدین کو خط لکھا کہ: ''جب میں نے دوسری شادی کی تھی تو مدت تک مجھ کو یقین رہا کہ میں ''نامرد'' ہوں۔ صبر کیا اور دعا کرتا رہا جو قبول ہو گئی۔''

(مکتوبات احمدیہ جلد پنجم 5)

''صبر'' کا دعویٰ کرنا غلط ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مرزا حکیم نور الدین سے ادویہ منگا کر رات دن استعمال کرتا رہا۔ کیونکہ دراصل دوسری شادی کے دوران مرزا کی عمر ڈھل چکی تھی۔ بڑے ''شوق کی شادی'' تھی۔ ذرہ اوور ہو کر پریکٹس کرتا رہتا؟ ''ڈھلتی جوانی'' میں ''اعتدال'' کو ملحوظ نہ رکھا جائے تو کمزوری ایک ضروری لازمہ ہے اور بروقت ''احساس'' کر لیا جائے تو ''مقوی ادویہ'' کچھ نقصان کر دیتی ہیں چنانچہ مرزا کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ پیش آیا کہ...... ''مقوی ادویہ'' کے استعمال سے ''نقصان'' ہو گیا اور صحت بحال ہو گئی جیسا کہ مرزا نے خود تحریر کیا ہے کہ:

''محمد یوسف سامانہ نے کئی دفعہ مجھے ایک معجون بنا کر بھیجی جس میں ''کچلہ مدبر'' تھا۔ ''تقویت دماغ'' اور ''قوت باہ'' کے لیے ''فائدہ مند'' ہے۔ مدت سے میرے استعمال میں ہے''!

(مکتوبات احمدیہ حصہ پنجم 5 ص 25)

مرزا پر یہ دور ''خوش حالی'' کا تھا اس کے بعد مزید دولت کی ''ریل پیل'' ہو گئی اور ''نبوت'' و ''مسیحیت'' کا تیر نشانہ پر بیٹھا۔ ''مقوی ادویہ'' نے اثر کیا تو مرزا نے حکیم صاحب کو لکھا کہ:

''اب زیادہ تر ''الہام'' اس بات کے ہو رہے ہیں کہ عن قریب ایک اور ''نکاح'' تمہیں کرنا پڑے گا اور جناب الٰہی نے یہ بات ''قرار'' پا چکی ہے'' (مکتوبات احمدیہ جلد پنجم خط 2)

اس کے بعد مرزا نے ایک ''اشتہار'' دیا جو آٹھ صفحات پر مشتمل تھا اور اس کا عنوان تھا ''نئی شادیوں کی پیشین گوئی''، جس کا مضمون یہ تھا۔

''خداوند کریم نے مجھے ''بشارت'' دے کر کہا ہے کہ ''خواتین مبارکہ'' سے جن خواتین کو اس اشتہار کے بعد تو پائے گا تیری بہت ''نسل'' ہو گی'' (''آئینہ کمالات اسلام'' ص 648)

اس کے بعد ایک اور اشتہار دیا جو پہلے اشتہار کی وضاحت میں تھا اس اشتہار کے الفاظ یہ ہیں:

''اس عاجز نے 20 فروری 1886ء کے اشتہار میں جو ''پیشین گوئی'' خدائے تعالیٰ کی طرف سے بیان کی تھی کہ اس نے مجھے بشارت دی کہ بعض بابرکت عورتیں اس اشتہار کے بعد بھی تیرے نکاح میں آئیں گی اور اولاد پیدا ہو گی۔'' (''مندرجہ تبلیغ رسالت'' جلد اوّل ص 89)

اور ساتھ ہی الہام ہوا۔ ''بستر عیش'' (''حمامۃ البشریٰ ص 88)

معلوم ہونا چاہیے کہ ان دو اشتہارات کے بعد مرزا کے نکاح میں کوئی ''عورت'' نہیں آئی اور اس کا خدا اسے ''جھوٹی اور بے اصل بشارات'' دے دے کر مرزا کا ''دل پرچارا'' کرتا رہا مگر مرزا

کے جب تک دم میں دم رہا ''مایوس'' ہونے والا نہ تھا۔ تلاش جاری رکھی اور اس سلسلہ میں حکیم نور الدین کو جو اس کا ''راز دان'' تھا۔ خط لکھا کہ: ''دو رشتے مل رہے ہیں مگر ایک ان میں سے ''بدصورت'' ہے اور دوسری استخارہ میں ''بدبخت'' معلوم ہوئی ہے۔''

حیرانی تو اس امر پر ہے کہ یہ انداز پیغمبرانہ ہے یا اوباشانہ ہے؟ کیا ''بستر عیش'' کی جستجو خدا کے مقبول بندے بھی کرتے ہیں؟ اس کے ماننے والوں پر حیف ہے کہ ان کا پیغمبر ''بستر عیش'' تلاش کرتا ہے اور اس کا خدا توقع دلا دلا کر مکر جاتا ہے۔ یہ ''خدا'' ہے یا کوئی ''مسخرہ''؟ نعوذ باللہ من ذالک۔

باوجودیکہ حالات مایوس کن ہیں کہ اس کی عمر پچاس برس سے تجاوز کر رہی ہے۔ ''قویٰ مضمحل'' ہو رہے ہیں اور بیماریوں کی آماجگاہ بنے ہوئے ہیں مگر ''رومان'' ''جوان سے جوان تر'' ہو رہا ہے اور اسے چین سے بیٹھنے نہیں دیتا۔ وہ برابر جستجو اور تلاش میں منہمک ہے۔

نظریں ایک ایسی ''دوشیزہ'' پر جمی ہوئی ہیں جو رشتہ میں مرزا کی بھتیجی بنتی ہے اور وہ مرزا کے ''حقیقی ماموں زاد بھائی کی ''لڑکی'' ہے، وہاں جا کر مرزا تیر چلاتا ہے۔ عمر میں اتنا تفاوت ہے کہ وہ لڑکی مرزا کی پوتیوں کی عمر کے برابر ہے۔ خود مرزا نے لکھا ہے کہ:

''كُنْتُ جَاوَزْتُ الْخَمْسِيْنَ وَ هِيَ جَارِيَةٌ حَدِيْثَةُ السِّنِّ.''

''میری عمر پچاس برس سے تجاوز کر رہی تھی اور وہ ایک نوخیز لڑکی تھی۔''

شاید ابھی ''بلوغت'' کے قریب ہو۔ مرزا کے ماموں زاد بھائی کا نام ''احمد بیگ'' تھا اور وہ ہوشیار پور کا رہنے والا تھا۔ وہ بڑا بدبخت ہوتا اگر اس معصومہ کو اس ''ہوس ناک بوڑھے'' کے حوالہ کرنے پر راضی ہو جاتا مگر اس نے ایسا نہیں کیا اور صاف انکار کر دیا۔ اس دوران لڑکی کے باپ کو ایسی مشکل کا سامنا کرنا پڑا اور ممکن تھا کہ وہ اس مشکل سے خلاصی حاصل کرنے کے لیے ''زہر کا پیالہ'' پی لینے پر مجبور ہو جاتا، مگر کوئی بھی مشکل اسے یہ ''زندہ مکھی'' نگلنے پر مجبور نہ کر سکی اور وہ ثابت قدم رہا!

وہ مشکل مرحلہ یہ آیا کہ مرزا احمد بیگ کی ہمشیر مرزا غلام احمد کے چچا زاد بھائی سے بیاہی گئی تھی۔ جس کا نام ''غلام حسین'' تھا اور وہ عرصہ پچیس برس سے مفقود الخبر تھا اور اس کی جائداد جو اس وقت کے نرخوں کے مطابق چار پانچ ہزار روپیہ کی قیمت کے برابر تھی وہ جائداد ''کاغذاتِ مال'' میں اس کی بیوی کے نام منتقل ہو چکی تھی اور اس کی کوئی اولاد نہ تھی۔ ''انگریزی قانون'' میں ایسی جائداد عورت اپنی زندگی میں تصرف میں رکھ سکتی تھی اور اس سے استفادہ کر سکتی تھی مگر اس کو یہ اختیار نہ تھا کہ وہ اس جائداد کو فروخت کرے یا کسی دوسرے طریقہ سے وہ جائداد کسی کے نام منتقل کرے۔

اس کے مرنے کے بعد وہ جائداد پسماندہ وارثان کو مل جاتی تھی۔ وارثانِ بازگشت میں مرزا غلام احمد بھی تھا کیونکہ محمد حسین جو مفقود الخبر تھا، وہ مرزا غلام احمد کا چچازاد بھائی تھا۔ یہ عورت مرزا احمد بیگ ہوشیار پوری کی بہن اور اس کے بیٹے "محمد بیگ" کی پھوپھی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ یہ جائداد میرے بھتیجے کو منتقل ہو جائے اور یہ انتقال بغیر وارثانِ بازگشت کی مرضی کے نہ ہو سکتا تھا جس میں مرزا غلام احمد حصہ دار تھا اس لیے مرزا احمد بیگ مرزا غلام احمد کے پاس آیا اور کہا کہ: اس انتقال پر آپ دستخط کر دیں کیونکہ آپ وارثانِ بازگشت میں سے ایک ہیں۔ مرزا کے وارے نیارے ہو گئے اور یہ امید پختہ ہو گئی کہ: "اب یہ لڑکی ضرور مجھے مل جائے گی کیونکہ ان کا کام میری رضا مندی کے بغیر نہیں ہو سکتا اور انھیں کام کرانا ضروری ہے اور چار پانچ ہزار روپے کا معاملہ ہے اس لالچ میں آ کر وہ ضرور مجھے لڑکی دیں گے۔" مرزا سیدھا ہاتھ کان کو لگانے والا نہ تھا۔ کہا۔ ذرا ٹھہر جاؤ۔ میں "استخارہ" کر لوں پھر تمہارا کام کر دوں گا۔" استخارہ کیا تھا؟ ایک دھوکا تھا۔ تھوڑی دیر بعد کہا میں نے استخارہ کیا ہے اور خدا نے جو کچھ مجھے کہا ہے۔ سن لو۔

مرزا صاحب خود ایک اشتہار میں تحریر کرتے ہیں۔

"احمد بیگ کے اصرار پر حسب عادت استخارہ کیا وہ تو آسمانی نشان نکلا۔ یعنی اس قادر مطلق نے مجھے فرمایا کہ اس ضمن میں احمد بیگ کی دختر کلاں "محمدی بیگم" کے نکاح کے لیے سلسلہ جنبانی کر اور ان کو کہہ دے کہ تمام سلوک و مروت اس سے اسی نکاح پر کیا جائے گا اور یہ نکاح تمھارے لیے موجب برکت و رحمت ہوگا۔ ان تمام برکتوں اور رحمتوں سے حصہ پاؤ گے جو اشتہار 20 فروری 1882ء میں درج ہیں۔ اگر نکاح سے انحراف کیا تو اس لڑکی کا "انجام" نہایت ہی برا ہوگا۔

(اشتہار مرزا مندرجہ "تبلیغ رسالت" جلد اوّل و "آئینہ کمالات اسلام" ص 286)

مرزا کو یقین تھا کہ جائداد کا معاملہ ہے وہ ضرور لالچ میں آ کر لڑکی کا نکاح کر دیں گے۔ اس یقین پر بڑے پر امید اعلانات شروع کر دیے۔ ملاحظہ ہو نمونہ اعلانات۔

اشتہار دہم جولائی 1988ء میں خدا کی جانب منسوب کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"ہم...... (خدا) نے خود اس سے تیرا نکاح باندھ دیا ہے میری باتوں کو کوئی بدلا نہیں سکتا۔"

("فیصلہ آسمانی تبلیغ رسالت" جلد دوم ص 85)

اور پھر بڑے وثوق سے اعلان کیا۔

"یہ پیشین گوئی خدائے بزرگ کی طرف سے "تقدیر مبرم" (اٹل) ہے۔ عنقریب اس کا "وقت" آئے گا۔ قسم خدا کی یہ پیشین گوئی بالکل "سچ" ہے۔ تم جلدی نتیجہ دیکھ لو گے۔" ("انجام آتھم"

ص223)

یہ شخص خدا پر جھوٹ اور افتراء باندھ رہا تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ یہ اپنے ''نوشتہ قلم'' سے ہی ذلیل وخوار ہو جائے۔ اس لیے وہ احمق ایسی باتیں لکھتا رہا جو انہونی تھیں اور آخر تک نہ ہوئیں۔ مرزا نے ان کو اپنے ''صدق وکذب'' کا معیار ٹھہرایا تھا اور اعلان کیا۔

''اور میں اس ''خبر کو اپنے سچ وجھوٹ'' کا ''معیار'' بناتا ہوں اور میں نے جو کہا ہے خدا سے ''خبر'' پا کر کہا ہے!'' (''انجام آتھم'' ص223)

اس لڑکی کے ''وصال'' کے لیے کون سی کوشش تھی جو مرزا نے اٹھا نہیں رکھی؟ پہلے لالچ دیا اور ''فرمایا'':

''خدا نے مجھ پر عیاں کیا کہ احمد بیگ سے کہہ دے کہ ''پہلے وہ تمھیں اپنی دامادی میں قبول کرے اور تمھارے نور سے روشنی حاصل کرے'' اور اس سے کہہ دے کہ ''مجھے اس زمین کے ''ہبے'' کا حکم مل گیا ہے جس کے تم خواہش مند ہو بلکہ اس کے ساتھ اور زمین بھی دی جائے گی اور احسانات بھی کیے جائیں گے بہ شرطے کہ تم نکاح کر دو!'' (آئینہ کمالات اسلام ص572)

جب اس سے کام نہ بنا تو ''دھمکی'' پر اتر آئے اور کہا:

''مجھے اللہ نے یہ بھی بتلایا ہے کہ اگر کسی اور ''شخص'' سے اس لڑکی کا نکاح ہوگا تو نہ اس لڑکی کے لیے یہ ''مبارک'' ہوگا؟ اور نہ تمھارے لیے۔ ''مصائب'' نازل ہوں گے جن کا نتیجہ ''موت'' ہوگا۔ یہ حکم اللہ کا ہے تم کو ''نصیحت'' کر دی۔''! (''آئینہ کمالاتِ اسلام'' ص286)

وہ لوگ بڑے مضبوط دل ودماغ کے مالک تھے اس لیے اپنی معصومہ کو ''مرزا کے جہنم'' میں جھونکنے کے لیے آمادہ نہ ہوئے۔ جب انھیں نہ ''ترغیب'' اور نہ ''تہدید'' آمادہ کر سکی تو مرزا ''پہلی تنخواہ پر کام کرنے والے'' کی طرح ''منت ساجت'' اور ''الحاح وزاری'' پر اتر آیا۔ ملاحظہ ہو مرزا کا ''نیا جال'' لکھتا ہے:

''اے عزیز! آپ کو کیا ہو گیا ہے کہ میری ''سنجیدہ بات'' کو لغو سمجھتے ہو؟ اور میرے ''کھرے'' کو ''کھوٹا'' خیال کرتے ہو؟ بخدا میرا یہ ارادہ نہیں کہ آپ کو تکلیف دوں آپ مجھے احسان کرنے والوں میں سے پائیں گے۔ اگر آپ نے مان لیا تو مجھ پر ''مہربانی'' ''احسان'' اور ''نیکی'' ہوگی میں اپنی زمین اور باغ میں سے بھی آپ کو حصّہ دوں گا۔ ساری عمر شکر گزار رہوں گا۔ آپ کی درازیٔ عمر کے لیے ارحم الراحمین کی جناب میں دعا کروں گا اور آپ سے ''وعدہ'' کرتا ہوں کہ آپ کی لڑکی کو اپنی زمین واپنی مملوکات کا ایک تہائی (1/3) حصّہ دوں گا اور میں سچ کہتا ہوں کہ اس میں سے

جو کچھ مانگیں گے میں دوں گا۔ آپ مجھے مصیبتوں میں اپنا دستگیر اور بار اٹھانے والا پائیں گے اس لیے ''انکار'' میں اپنا وقت ضائع نہ کیجئے۔ یہ خط پروردگار کے حکم سے لکھ رہا ہوں۔'' (''آئینہ کمالات اسلام'' ص 573)

آپ مرزا کے خط کو پڑھیں اور بار بار پڑھیں اور دیکھیں کہ: ایک ''بوڑھے'' کو ''عشق و محبت'' نے کتنا پریشان کر رکھا ہے؟ بیوی موجود ہے؟ اولاد پانچ لڑکے اور دو لڑکیاں موجود ہیں؟ عمر پچاس سال سے تجاوز کر چکی ہے؟ لیکن وہ ایک ''لڑکی'' کے ''رومان'' میں ''ہلکان'' ہو رہا ہے اور اس کے بعد بھی ''نبوت'' ''مسیحیت'' اور ''مہدویہ'' کا دعویٰ؟ العجب ثم العجب؟

سچ ہے ''عشق'' میں ''مایوسی'' کی کوئی ''گنجائش'' نہیں چنانچہ مرزا نے اسی اصول پر کاربند ہوتے ہوئے پھر ایک طویل خط لکھا اور اس میں ''نیا رنگ بھرا'' اور ''نیا لالچ'' پیش کیا۔ مرزا کے سینہ میں ''عشق و محبت'' کی آگ سلگ رہی ہے اور ایک ''نوخیز چھوکری'' کی یاد نے اسے ''بے چین'' کر رکھا ہے۔ ''عشق'' اور ''بڑھاپا''؟ خوب۔ ''اجتماع نقیضین'' ہے!

یوں تو اس کائنات میں مشاہدہ ہوتا ہے کہ ان ''نوخیز حسین جلادوں'' نے بڑے بڑے لوگوں کو ''اسیر زلف'' کیا اور انھوں نے جان کی بازی لگا کر ان کے ''وصال'' کی کوشش کی مگر اس ''قادیانی مغل بچہ'' نے ''بالکل'' نیا طریقہ'' اختیار کیا اور ہر جگہ ''خدائے قدوس'' کے ''نام'' اور ''الہام'' کو درمیان میں گھسیڑنے کی سراسر ''ناروا'' ''الحادی رسم'' ایجاد کی۔ خط کو پڑھیے اور حظ اٹھایئے۔ مرزا لکھتا ہے:

''خدا کی طرف سے ''حکم'' ہوا کہ احمد بیگ (لڑکی کے والد) کو ''مطلع'' کر دے کہ وہ ''رشتہ'' منظور کر لے۔ یہ اس کے حق میں ''خیر و برکت'' اور ''ہمارے انعام و اکرام'' کی ''بارش'' کا ''سبب'' بنے گا ورنہ وہ ''موردِ عتاب'' ہوگا اور ہمارے ''قہر'' سے نہ بچ سکے گا۔ میں نے خدا کا حکم پہنچا دیا۔ اپنی طرف سے تو میں یہی عرض کرتا ہوں کہ میں آپ کا ہمیشہ ''ادب و لحاظ'' ہی ملحوظ رکھتا ہوں؟ اور آپ کے حکم اپنے لیے ''فخر'' سمجھتا ہوں اور ہبہ پر جب لکھو ''حاضر'' ہو کر دستخط کر جاؤں۔ اس کے علاوہ میری ''املاک'' خدا کی ہے یا ''آپ'' کی۔ عزیز ''محمد بیگ'' (احمد بیگ کے لڑکے اور محمدی بیگم کے بھائی) کے لیے پولیس میں ''بھرتی'' کرانے کی اور ''عہدہ'' دلانے کی ''خاص کوشش'' اور ''سفارش'' کر لی ہے تاکہ وہ کام میں لگ جائے اور اس کا ''رشتہ'' میں نے اپنے ایک عقیدت مند سے جو بہت امیر آدمی ہے۔ تقریباً کر دیا ہے۔'' (رسالہ ''نوشتہ غیب'' ماخوذ از ''قادیانی مذہب کا علمی محاسبہ'')

خط کو پڑھنے سے واضح ہوتا ہے کہ یہاں مرزا ''بردہ فروشی'' کی ''حوصلہ افزائی'' کر رہا ہے،

اور ساتھ ہی محمد بیگ کی ''ملازمت'' اور ''رشتہ'' کا ''لالچ'' بھی دے رہا ہے۔ مقام شرم ہے کہ دعویٰ ''تقدس'' ''نبوت'' اور ''مسیحیت'' کا؟ اور یہ لچھن اور کرتوت؟ اللہ تعالیٰ ایسی ''روحانی آتش'' سے محفوظ رکھے (آمین)

مرزا اس سلسلہ میں حکیم نورالدین سے بھی ''امداد'' کی خواہش کرتا رہا ہے مگر انداز وہی ''سراسر مکر اور فریب'' مرزا نے جو خط حکیم نورالدین کو لکھا وہ بھی پڑھ لیجئے۔ وھوہذا۔

''محمد بیگ (احمد بیگ کا لڑکا) جو آپ کے پاس ہے اس کے والدین بوجہ ''بے سمجھی'' مجھ سے ''عداوت'' رکھتے ہیں۔ خدائے تعالیٰ نے اس لڑکے کی ہمشیرہ کی نسبت وہ ''الہام'' فرمایا تھا جو شائع ہو چکا ہے لیکن ان لوگوں کے دلوں میں ''مخالفت کا جوش'' ہے۔ معلوم نہیں وہ امر (نکاح) کیوں کر؟ اور کس راہ سے ''وقوع'' میں آئے گا؟ محمد بیگ کے کتنے خطوط اس مضمون کے پہنچے کہ: ''حکیم صاحب سے سفارش کریں کہ وہ مجھے پولیس کے محکمہ میں نوکر کرا دیں۔'' بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ''نرمی''، ''کارگر'' نہیں ہوگی تاہم کیا مضائقہ ہے کہ ان لوگوں کی ''سختی'' کے عوض ''نرمی'' برت کر دیکھ لیں آپ اس کے ذہن نشین کرا دیں کہ ''تیری نسبت انھوں (مرزا) نے بہت کچھ سفارش لکھی ہے اور تیرے لیے جہاں تک ''گنجائش'' اور ''مناسب وقت'' ہو کچھ فرق نہ ہوگا اگر محمد بیگ یہاں آئے تو ساتھ لیتے آئیں۔'' (خلاصہ مکتوب مندرجہ ''مکتوباتِ احمدیہ'' جلد پنجم 5 مکتوب نمبر 73)

اس خط سے واضح ہوتا ہے کہ مرزا کس ''قماش'' کا ''بزرگ'' تھا؟ جب ان ''حربوں'' میں کامیابی نہ ہوئی تو اس نے ''نیا طریق کار'' ایجاد کیا۔ سچ ہے ''ضرورت'' ''ایجاد'' کی ''ماں'' ہے۔ مرزا آخر تک مایوس نہیں ہوتا۔ البتہ خط کا انداز بدل کر نیا زاویہ پیش کر دیتا ہے کہ شاید ان پر کوئی چیز اثر انداز ہو جائے؟ یہ خط بہت لمبا ہے میں اس کے ضروری حصے نقل کرنے پر اکتفا کرتا ہوں لیکن پھر بھی کافی طوالت ہے۔ ملاحظہ ہو۔

مرزا قادیانی لکھتا ہے:

''کن لفظوں میں بیان کروں؟ تا میرے دل کی ''محبت''، ''خلوص'' اور ''ہمدردی'' جو آپ کی نسبت مجھ کو ہے۔ وہ آپ پر ظاہر ہو جائے؟ خدائے تعالیٰ کی قسم میں اس بات میں بالکل ''سچا'' ہوں کہ ''الہام'' ہوا تھا کہ آپ کی ''دختر کلاں'' کا ''رشتہ'' اس ''عاجز'' سے ہوگا اور اگر دوسری جگہ ہوگا تو خدائے تعالیٰ کی ''تنبیہات'' وارد ہوں گی اور آخر اسی جگہ ہی ہوگا کیونکہ آپ میرے عزیز و پیارے ہیں اس لیے میں نے ''عین خیر خواہی'' سے آپ کو بتلایا کہ دوسری جگہ اس کا رشتہ کرنا ہرگز ''مبارک'' نہ ہوگا۔ میں نہایت ظالم طبع ہوتا کہ اگر آپ کو اس الہام کی خبر نہ دیتا اور میں اب بھی ''عاجزی'' اور

''ادب'' سے آپ کی ''خدمت'' میں ''ملتمس'' ہوں کہ اس رشتے سے ''انحراف'' نہ فرمائیں؟ شاید آپ کو معلوم ہے یا نہیں؟ کہ دس لاکھ سے زیادہ آدمی اس ''پیشین گوئی'' پر اطلاع رکھتے ہیں اور ایک جہان کی اس طرف نظریں لگی ہوئی ہیں۔ ہزاروں پادری ''حماقت'' سے منتظر ہیں کہ یہ پیشین گوئی جھوٹی نکلے تو ہمارا پلہ بھاری ہو۔'' لیکن خدا ان کو رسوا کرے گا اور اپنے ''دین'' کی مدد کرے گا۔ لاہور جا کر دیکھا کہ ہزاروں مسلمان اس کے ''پورا'' ہونے کی ''دعائیں'' کر رہے ہیں۔ ویسے یہ عاجز تو خدائے تعالیٰ کے ''الہامات'' پر جو تواتر سے اتر رہے ہیں ''ایمان'' لایا ہوا ہے۔ آپ سے التماس ہے کہ آپ اپنے ''ہاتھ'' سے اس پیشین گوئی کے پورا ہونے کے لیے ''معاون'' بنیں تاکہ خدائے تعالیٰ کی برکتیں آپ پر نازل ہوں۔ خدائے تعالیٰ سے کوئی بندہ لڑ نہیں سکتا اور جو ''امر'' (مرزا کا نکاح) آسمان پر پڑھا جا چکا ہے؟ زمین پر ہرگز نہیں ''بدل'' سکتا۔ خدا وہ بات آپ کے دل میں بھی ڈال دے جس کا اس نے مجھے الہام کیا ہے۔ اس خط میں کوئی نا ملائم بات ہو تو معاف کر دیں۔''

(خاکسار احقر العباد غلام احمد عفی عنہ 17 جولائی 1892ء بروز جمعہ منقول از ''کلمہ فضل ربانی'' ص 123)

اس خط میں مرزا ''نئی بات'' یہ لایا ہے کہ: ''ہزاروں پادری منتظر ہیں'' اور ''لاہور کے لوگ دعائیں مانگ رہے ہیں۔'' احمد بیگ پر اس کا کیا اثر ہونا تھا؟ کچھ بھی نہ ہوا بلکہ الٹا اثر یہ ہوا کہ یہ ''خط و کتابت پرائیویٹ تھی۔'' ''خفیہ تھی۔'' لیکن مرزا احمد بیگ نے اسے شائع کر دیا۔ اب مرزا کو احمد بیگ کی جانب سے پوری طرح مایوسی ہوگئی۔ مگر اصل ''مقصد یعنی ''محمدی بیگم'' کے نکاح میں آنے سے مایوس نہ ہوا اور ایک دوسرا ہتھیار استعمال کرنے کی ٹھانی۔ وہ یہ کہ ایک شخص ''مرزا علی شیر بیگ'' یہ جو مرزا احمد بیگ والد محمدی بیگم کا بہنوئی تھا اور اس کی لڑکی ''عزت'' بی بی مرزا غلام احمد کے بیٹے فضل احمد سے بیاہی ہوئی تھی۔ مرزا غلام احمد کے پہلی بیوی سے دو لڑکے تھے ''سلطان احمد''، ''فضل احمد'' مرزا فضل احمد مرزا کی پہلی بیوی کا چھوٹا لڑکا تھا اس کے نکاح میں علی شیر بیگ کی لڑکی تھی جو احمد بیگ کی ''بھانجی'' تھی۔ مرزا کو یہ نئی ترکیب سوجھی اور اس نے علی شیر کو خط لکھا، مرزا کے خط میں تو وہی محمدی بیگم کے نکاح کا رونا تھا مگر علی شیر نے مرزا کو جو خط لکھا وہ ضرور پڑھنے کے قابل ہے اور اس میں بہت ''پتے کی باتیں'' ہیں۔ اب ہم وہ خط درج کرتے ہیں جو مرزا نے علی شیر بیگ کو لکھا تھا! مرزا لکھتا ہے کہ:

''میں آپ کو ''غریب طبع''، ''نیک خیال'' اور ''اسلام پر قائم'' سمجھتا ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ عید کی تیسری تاریخ کو محمدی بیگم کا ''نکاح'' ہونے والا ہے۔ اس مشورے میں آپ کی ''بیوی'' بھی شریک ہے۔ دوسری جگہ نکاح کے مشورے میں شریک لوگ ''میرے دشمن'' بلکہ ''دین اسلام کے

سخت دشمن'' ہیں۔ ''عیسائیوں'' اور ''ہندوؤں'' کو خوش کرنا چاہتے ہیں۔ ''اللہ اور رسول کے دین'' کی کچھ ''پرواہ'' نہیں کرتے۔ چاہتے ہیں کہ مجھے ''ذلیل اور رسوا'' کریں۔ اب اگر میں ''خدا کا'' ہوں تو وہ مجھ کو ''ذلت'' سے بچائے گا۔ آپ کے گھر کے لوگ میری طرف داری کرتے۔ بھائی کو سمجھاتے تو وہ کیوں نہ سمجھ جاتا؟ کیا میں ''چوہڑا'' ''چمار'' تھا؟ جو مجھ کو لڑکی دینا ''عار'' یا ''ننگ'' تھی؟ جن کو میں خویش سمجھتا تھا اور چاہتا تھا کہ ان کی لڑکی سے میری اولاد ہو اور وہ میری ''وارث'' ہو وہی میری ''عزت کے پیاسے'' ہیں۔ میں نے خط لکھے کہ ''پرانے رشتے مت توڑو'' جواب تک نہ آیا؟ سنا ہے کہ آپ کی بیوی نے یہاں تک کہہ دیا کہ: ''میں اپنی بہو (آپ کی بیٹی) کو اپنے بیٹے فضل احمد سے طلاق دلانا چاہتا ہوں تو طلاق دلا دے پرواہ نہیں۔'' میں نے آپ کی بیوی کو رجسٹری کر کے خط بھیجا کہ: اگر میں ''ذلیل'' ہوں تو آپ کی بیٹی عزت بی بی کو فضل احمد کے نکاح میں رہنے کی کیا ضرورت ہے؟ اگر آپ کی بیوی نے اپنے بھائی کو نکاح سے نہ روکا تو ادھر محمدی بیگم کا نکاح ہوگا ادھر عزت بی بی کو طلاق، اس خط کا جواب بھی نہیں آیا۔ اگر میرے ساتھ نکاح کرا دیں تو ہر ''خدمت'' کے لیے ''بہ دل و جان حاضر'' ہوں۔ میرا مال ان کا ''مال'' آپ کو بھی لکھتا ہوں کہ: احمد بیگ پر زور ڈلوائیں ورنہ ہمیشہ کے لیے رشتے ناطے توڑ دوں گا۔'' (ماخوذ از ''قادیانی مذہب'' خط محررہ 1891ء)

اس خط کا جو جواب مرزا علی شیر بیگ نے دیا وہ ''قابل دید و شنید'' ہے اور اعلیٰ اخلاقی جرأت کا نادر نمونہ ہے اور ''ایثار قربانی کا بلند پایہ مرقع'' مرزا کی گراوٹ کی یہ حد ہے کہ وہ اپنی ''ہوس نفسانی'' کے پورا نہ ہونے کی صورت میں معصومہ عزت بی بی کو جو علی شیر بیگ کی بیٹی اور مرزا غلام احمد کی بہو ہے، طلاق کی دھمکی دے رہا ہے؟ اگر علی شیر بیگ کی فطرت میں کمزوری ہوتی تو وہ کہتے کہ: ''محمدی بیگم جائے جہنم میں۔ وہ ایک بوڑھے مریل (جو متعدد بیماریوں کا گھر ہے) کے گلے ''مڑھی'' جا رہی ہے تو میرا کیا؟ میں اپنی معصومہ بیٹی کو جو اپنے خاوند کے ساتھ بہ خیر و خوشی آباد ہے اسے طلاق دلوا کر اس کی زندگی کو کیوں اجیرن بنا دوں؟ لیکن علی شیر ''حق و انصاف'' اور ''انسانی ہمدردی'' کے پیش نظر اپنی بیٹی کی قربانی پر تو آمادہ ہو جاتے ہیں مگر محترمہ محمدی بیگم کو عذاب میں ڈالنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ مرزا علی شیر بیگ کا خط درج ذیل ہے ملاحظہ کریں۔

''مجھے غریب طبع'' یا ''نیک'' جو کچھ بھی آپ خیال کریں آپ کی مہربانی ہے۔ ہاں ''مسلمان'' ضرور ہوں۔ مگر آپ کی ''خود ساختہ نبوت'' کا قائل نہیں۔ خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے ''سلف صالحین'' کے طریقہ پر ہی رکھے اور اسی پر میرا خاتمہ بالخیر کرے۔

باقی رہا تعلق چھوڑنے کا معاملہ؟ تو بہترین تعلق خدا کا ہے وہ نہ چھوٹے اور باقی عاجز

مخلوق کا تعلق ہوا تو پھر کیا؟ اور نہ ہوا تو پھر کیا؟ احمد بیگ کے متعلّق میں کر ہی کیا سکتا ہوں؟ نہ فضول ''ایمان گنواتے؟'' اور نہ ''الہام بازی'' کرتے اور نہ وہ کنارہ کش ہوتا؟

یہ ٹھیک ہے آپ نے خویش ہونے کی حیثیت سے رشتہ طلب کیا مگر آپ خیال فرمائیں کہ اگر آپ کی جگہ احمد بیگ ہو اور احمد بیگ کی جگہ آپ ہوں تو خدا لگتی کہنا کہ تم ''کن کن باتوں کا خیال'' کر کے رشتہ دیتے؟ اگر احمد بیگ تمہاری لڑکی کے لیے ''سوال'' کرتا اور وہ ''مجمع الامراض'' ہونے کے علاوہ پچاس سال سے زیادہ عمر کا ہوتا اور اس پر وہ ''مسیلمہ کذاب'' کے کان بھی کتر چکا ہوتا؟ آپ کو خط لکھتے وقت آپے سے باہر نہیں ہونا چاہیے۔ ''لڑکیاں'' سبھی کے گھروں میں ہیں۔ یہی نظام عالم ہے۔ آپ میری بیٹی کو بلاقصور طلاق دلوائیں گے تو یہ بھی ''جھوٹی پیغمبری'' کی ''نئی سنت'' قائم کر کے ''بدزبانی کا سیاہ داغ'' ''مول'' لیں گے!

باقی روٹی تو خدا اس کو بھی کہیں سے دے گا۔ ''تر'' نہ سہی؟ ''خشک'' سہی؟ مگر وہ خشک بہتر ہے جو ''پسینہ کی کمائی'' سے پیدا کی جاتی ہے؟ میری بیوی کو کیا حق ہے کہ وہ اپنی بیٹی کو ''طلاق سے بچانے کے لیے'' ''بھائی کی لڑکی کو دائم المریض آدمی'' جو ''ہراق سے خدائی تک'' پہنچ چکا ہے، دینے کے لیے بھائی سے لڑے؟'' (مکتوب محررہ 4 مئی 1891ء منقول از ''قادیانی مذہب کا محاسبہ'')

قارئین دونوں خطوط کو غور سے پڑھیں۔ ایک خط ''مدعی نبوت'' و ''مسیحیت'' و ''مہدویت'' کا ہے اور دوسرا خط ایک ''مسلمان'' کا ہے جسے کوئی بھی ''دعویٰ'' نہیں۔ مرزا غلام احمد کی ''ہٹ دھرمی'' اور مرزا علی شیر بیگ کے ''استدلال'' پر بھی غور ضروری ہے اور خصوصاً اپنی قربانی دے کر بھی وہ ایک معصومہ کی تباہی پر راضی نہ ہوا۔ مرزا کو اگر شرافت سے کچھ بھی ''حصّہ'' ملا ہوتا؟ تو وہ علی شیر بیگ کی بیٹی کو ''طلاق'' نہ دلواتا؟ مگر یہاں شرافت کا کام ہی کیا تھا؟ یہاں تو دل میں شیطان نے بسیرا کر رکھا تھا اور مرزا غلام احمد کو ہر ''بدی'' پر آمادہ کر رہا تھا اور وہ اس کے ''داؤ'' میں آ چکا تھا اور اس کا ہر ''حکم'' ماننے کے لیے چشم براہ تھا۔''

الحاصل مرزا غلام احمد کا یہ ''تیر'' بھی خطا گیا اور مرزا علی شیر بیگ اس کے ''نامعقول مطالبہ'' سے متفق نہ ہوا تو ایک اور تیر ترکش سے نکالا اور مرزا علی شیر بیگ کے سینہ میں پیوست کیا۔ وہ نیا تیر یہ ہے کہ اپنی بہو سے جو مرزا فضل احمد کی بیوی تھی اس کی والدہ کے نام خط لکھوایا۔ وہ خط ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ وہ اپنی ماں کو لکھتی ہے:

''اس وقت میری تباہی و بربادی کا خیال کرو۔ مرزا صاحب مجھ سے کسی طرح کا فرق نہیں کرتے تم اپنے بھائی (میرے ماموں محمدی بیگم کے والد) کو سمجھاؤ تو سہی؟ اگر نہیں تو پھر مجھے

طلاق ہوگی اور رسوائی ہوگی۔ اگر منظور نہیں تو پھر کسی کو بھیج کر یہاں سے بلوا لو!'' (منقول از ''قادیانی مذہب کا محاسبہ'')

مرزا کا منجھلا لڑکا مرزا بشیر احمد اپنی کتاب ''سیرت المہدی'' میں لکھتا ہے کہ: ''اس شادی کے سلسلہ میں مرزا صاحب نے شادی کرا دینے والے سے انعام کا وعدہ کیا تھا۔'' مرزا بشیر احمد لکھتا ہے۔

''بیان کیا مجھ سے میاں عبداللہ سنوری نے کہ محمدی بیگم کے ماموں مرزا امام دین کو رشتہ کرانے پر انعام کا وعدہ بھی کیا تھا۔'' (''سیرت المہدی'' حصہ اوّل ص 193)

یاد رہے کہ مرزا ''امام دین'' مرزا غلام احمد کا چچا زاد بھائی تھا اور مرزا احمد بیگ کی بیوی اس کی بہن تھی۔ باپ کا نام ''غلام محی الدین'' تھا جو مرزا غلام احمد کا حقیقی چچا تھا۔

آخر کار مرزا کی بدبختی سے اس کے تمام ''حربے'' ناکام اور سارے ہتھیار کند ہو گئے اور محمدی بیگم کا نکاح 17 اپریل 1892ء کو موضع ''پٹی مغلاں'' ضلع امرت سر کے ایک نوجوان مرزا ''سلطان محمد'' صاحب سے ہو گیا۔ جب اس نکاح کی خبر مرزا کو ملی تو وہ شدید غیظ و غم کے باعث دماغی توازن کھو بیٹھا اور ہارے ہوئے جواری کا پارٹ ادا کرنے پر مجبور ہوا اور شرافت و نجابت سے گری ہوئی ایسی حرکات کا ارتکاب کیا کہ انسانیت سر پیٹ کر رہ گئی اور آسمان نے مسکراتے ہوئے اس کی نبوت و مسیحیت کا مذاق اڑایا! اب ذرہ وہ ''حرکاتِ سفلیہ'' بھی سن لیجئے جو مرزا سے سرزد ہوئیں۔

اوّل: یہ کہ اپنی خاندانی بیوی جو مرزا سلطان احمد و مرزا فضل احمد کی ماں تھی، اسے طلاق دے کر گھر سے نکال دیا اس کا قصور اس سے زیادہ کچھ نہ تھا کہ وہ ''محمدی بیگم کی رشتہ دار'' تھی ورنہ مرزا کے ساتھ محمدی بیگم کے رشتہ نہ ہونے میں اس کا کوئی قصور یا پارٹ نہیں تھا۔

دوم: یہ کہ مرزا علی شیر بیگ کی لڑکی کو جو مرزا فضل احمد کے نکاح میں تھی بلا قصور طلاق دلوا دی۔ حالانکہ یہ لڑکی جس کا نام عزت بی بی تھا آخر دم تک اپنے خسر مرزا غلام احمد کے حق میں رہی اور اس نے اپنے والدین کو خط لکھے کہ: ''رشتہ ہو جانے کی کوشش کرو ورنہ میری بربادی ہو جائے گی جب کہ میں اپنے خاوند سے خوش و خرم وقت گزار رہی ہوں۔''!

سوم: یہ کہ مرزا سلطان احمد کو اپنی جائداد سے محروم کر کے ''عاق'' کر دیا۔ اس کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ ''چراغ بی بی'' کا بیٹا تھا اور چراغ بی بی محمدی بیگم کی رشتہ دار تھی۔

ان ''انسانیت سوز حرکات'' اور بے گناہوں کی زندگیاں منغص کر کے بھی مرزا کی ''آتش رومان'' فرو نہ ہوئی بلکہ ایک اور اشتہار شائع کر کے اعلان کر دیا کہ:

''محمدی بیگم کے دوسری جگہ نکاح کے بعد تمام تعلقات خویشی و قرابت و ہمدردی دور! کسی

''نیکی بدی'' ''رنج و راحت'' ''شادی اور ماتم'' میں شرکت ختم۔ اب ان سے تعلق رکھنا ''قطعاً حرام'' اور ''ایمانی غیوری'' کے برخلاف ایک ''دیوثی'' کا ''کام'' ہے۔'' (خلاصہ اشتہار مندرجہ تبلیغ رسالت جلد دوم ص 6)

مرزا کے منجھلے لڑکے مرزا بشیر احمد نے محمدی بیگم سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جانے پر اپنے غیظ و غضب کی یوں ترجمانی کی ہے۔

''حضرت صاحب نے یہاں تک اعلان کر دیا کہ: ''جن رشتہ داروں نے (مرزا کے) ''نکاح کی مخالفت'' کی ہے اب ان کی ''قبریں'' بھی ہمارے ساتھ ''اکٹھی'' نہیں بنیں گی۔''

(''سیرۃ المہدی'' جلد اوّل ص 26)

آپ حیران ہوں گے کہ ''بڑھاپے کا رومان'' ایسی بری بلاء ہوتی ہے کہ آخر دم تک انسان اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اگر واقعی کوئی ''الہام'' یا ''آوازِ غیبی'' اس بارہ میں سنائی دی تھی تو اس مرحلہ پر وہ اس سے مایوس ہو کر یقین کر لیتا کہ وہ آواز جس نے ''محمدی بیگم کے وصال'' کی ''توقع'' دلائی تھی؟ یا کوئی الہام جس نے محمدی بیگم کے وصال کی جانب ''اشارہ'' کیا تھا؟ ''وہ شیطانی آواز'' اور ''ابلیسی الہام'' ہے۔ اس لیے ایسے الہام کنندہ سے ہمیشہ کے لیے خبردار ہو جاتا جبکہ قرآن مجید میں ہے کہ:

ان الشیطین لیوجون الی اولیائھم لیجادلوکم.

شیاطین اپنے دوستوں کو آوازیں دیتے اور انھیں جھوٹے الہام اور وحی بھیجتے ہیں تاکہ تم کو لڑاتے رہیں۔ (121:6)

حقیقت اور اصلیت یہ ہے کہ مرزا کو روزِ روشن کی طرح عیاں تھا کہ کوئی الہام نہیں ہوا اور نہ ہی کوئی ''غیبی آواز'' آئی ہے جس نے ''محمدی بیگم کے وصال'' کی جانب اشارہ کیا ہو۔ یہ خالصتہً اور یقیناً ''بڑھاپے کا رومان'' اور ''مقوی ادویہ'' سے ''عارضی قوت باہ'' کا ''ابال'' تھا اور کچھ نہیں؟ البتہ شیطان نے مرزا کی یہ رہنمائی ضرور کی تھی کہ ''اس ''رومانی خواہش'' کے اظہار کو ''الہامی جامہ'' پہناؤ تاکہ شاید ''حصولِ مقصد'' میں کچھ ''معین و مددگار'' ثابت ہو۔'' ورنہ مرزا کو پورا پورا علم تھا کہ محمدی بیگم کے وصال کی خواہش نہ کسی الہام کی رہینِ منت ہے؟ اور نہ ہی کسی ''غیبی آواز'' کی ممنون؟ بلکہ یہ سب کچھ ''مقوی باہ ادویہ'' کے استعمال سے بڑھاپے میں عارضی شہوت کا ابال اور جوش تھا اور بس۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود اتنی ناکامیوں کے مایوس و ناامید نہ ہوا اور محمدی بیگم کا مرزا سلطان محمد سے نکاح ہو جانے کے بعد بھی نہایت ڈھٹائی سے نیا پینترا بدلا اور اعلان کیا۔

''خدائے تعالیٰ نے پیشینگوئی کے طور پر اس عاجز پر ظاہر فرمایا کہ: ''مرزا احمد بیگ کی دختر

کلاں انجام کار تمھارے نکاح میں آئے گی اور وہ لوگ بہت عداوت کریں گے اور بہت مانع آئیں گے اور کوشش کریں گے کہ ایسا نہ ہو۔ لیکن آخر کار ایسا ہی ہوگا" اور فرمایا کہ: "خدائے تعالیٰ" "ہر طرح" اس کو تمہاری طرف لائے گا۔ "باکرہ" ہونے کی حالت میں؟ یا "بیوہ" کر کے؟ اس کام کو وہ ضرور پورا کرے گا اور کوئی نہیں جو اس کو روک سکے" ("ازالہ اوہام" ص 198)

مرزا نے ساتھ ہی یہ بھی اعلان کیا کہ:

"محمدی بیگم جس کسی دوسرے شخص سے بیاہی جائے گی وہ روزِ نکاح سے اڑھائی سال تک فوت ہو جائے گا۔" ("آئینہ کمالاتِ اسلام" ص 572)

مگر مرزا کی الٹی تقدیر اور کھوٹی قسمت کے اثر سے ہوا یہ کہ نکاح کے بعد اڑھائی سال بھی گزر گئے اور محمدی بیگم کے خاوند مرزا سلطان محمد کی وفات بھی نہ ہوئی اور اس پر بھی پورے ملک میں ہنسی اڑی تو مرزا آپے سے باہر ہو گیا اور اس نے ایک نہایت ہی غضب آلود اعلان کیا کہ:

"بدفطرتو! اپنی فطرتیں دکھاؤ؟ لعنتیں بھیجو! ٹھٹھے کرو؟ صادقوں کا نام کاذب اور دروغ گو رکھو؟ لیکن عنقریب دیکھو گے کہ کیا ہوتا ہے؟ سلطان محمد کے "خوف" اور "رجوع" سے اس کی موت ٹل گئی لیکن نفس پیشینگوئی یعنی اس "عورت" کا اس "عاجز کے نکاح" میں آنا: "تقدیر مبرم" ہے جو کسی طرح ٹل نہیں سکتی۔ "الہام الٰہی" میں یہ فقرہ موجود ہے۔ "لاتبدیل لکلمَاتِ اللّٰہِ" اللہ کی بات ہرگز نہیں ٹل سکتی۔ پس ٹل جائے تو خدا کا کلام باطل ہوتا ہے۔" (اعلان مرزا مندرجہ "تبلیغ رسالت" جلد سوم ص 166)

پھر اس اعلان کی "تائید" میں ایک اور "بڑا زور دار" اعلان کیا کہ: "محمدی بیگم ضرور میرے نکاح میں آئے گی۔" مرزا صاحب تحریر کرتے ہیں:

"اس عاجز کو ایک سخت بیماری آئی یہاں تک کہ قریب موت تک نوبت پہنچ گئی بلکہ موت سامنے دیکھ کر وصیت بھی کر دی۔ اس وقت یہ پیشینگوئی آنکھوں کے سامنے آ گئی اور معلوم یہ ہو رہا تھا کہ اب آخری دم ہے اور کل "جنازہ" نکلنے والا ہے تب میں نے اس پیشین گوئی کی نسبت خیال کیا کہ شاید اس کے اور معنی ہوں گے جو میں نہیں سمجھ سکا؟ تب اس حالت میں قریب الموت مجھے الہام ہوا۔ "الحقُّ من رَبِّکَ فَلا تکُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ" یعنی "یہ بات تیرے رب کی طرف سے سچ ہے۔ تُو کیوں شک کرتا ہے" خدا نے "تازہ یقین" دلا دیا کہ تُو ناامید مت ہو۔" ("ازالہ اوہام" ص 298)

یہ تھے "مرزائے قادیان کے الہام" اور اس کے خدا کی طرف سے مرزا کو بار بار یاد دہانی اور یقین دہانی؟ مگر وائے ناکامی مرزا کو 1908ء میں اچانک "ہیضہ" نے آ دبوچا اور وہ اس دارِ فانی سے رخصت ہونے پر مجبور ہو گیا لیکن اس کا "مد مقابل" جوڑا مرزا سلطان محمد اور اس کی بیوی محمدی

بیگم اللہ کے فضل وکرم سے زندہ اور حین حیات تھے اور مرزا کی موت کے بعد بھی ایک عرصہ زندہ رہے۔ (بلکہ 1968ء میں ہفت روزہ ''چٹان'' لاہور) کی عمارت کے اندر رئیس الکتابت سیّد ''نفیس الحسینی'' صاحب کے کمرے میں اسی خاندان کے ایک نوجوان سے ملاقات ہوئی جس نے دوران گفتگو بتایا تھا کہ ''محمدی بیگم'' صاحبہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مرزا کی ازلی وابدی تکذیب وتذلیل کی خاطر ابھی تک زندہ موجود ہیں گو اب بہت معمر اور ضعیفہ ہیں۔ ابو معاویہ دنیا جہانِ فانی ہے وقت آنے پر اپنی طبعی عمر پورا کر کے مرزا سلطان محمد تو فوت ہو گئے اور محترمہ ''محمدی بیگم'' خاوند کے فوت ہو جانے کے بعد بھی قیام پاکستان تک زندہ رہی۔

جس زمانہ میں میرا قیام قادیان میں تھا تو ہم ملک کے تمام اطراف میں اپنے مبلغ بھیجتے تھے تو وہ پٹی مغلاں (جو محمدی بیگم کا وطن تھا) میں بھی جایا کرتے تھے۔ محمدی بیگم ان کی بڑی خدمت کرتی تھی۔ البتہ اس کی یہ خواہش ضرور ہوتی تھی کہ: ''مرزا غلام احمد کی تردید کے بڑے موضوع ہیں۔ اس نکاح والی پیشین گوئی کا ذکر نہ کیا جائے تو کیا فرق پڑتا تھا؟'' چنانچہ ہمارے مبلغ پٹی مغلاں کے اجتماعات میں اس پیشین گوئی کا تذکرہ نہیں کرتے تھے۔ پٹی مغلاں کے رہنے والے ایک بزرگ ''مرزا شجاع بیگ'' تھے جو کسی زمانہ میں حکومت کی جانب سے پٹی میں ''آنریری مجسٹریٹ'' بھی تھے۔ کبھی کبھی قادیان آیا کرتے تھے، ان کا قیام مرزائیوں کے مہمان خانہ میں ہوتا تھا اور وہ مجھے اپنے ہاں بلا بھیجتے تھے اور غلام احمد کے ''عقائد ونظریات'' کے خلاف دیر تک گفتگو ہوتی رہتی تھی۔

''اطالوی حسینہ'' ''مس روفو''

آج کل رواج ہو گیا ہے کہ ''بڑے ہوٹلوں، پر مالکان ہوٹل ''خوبصورت اور حسین لڑکیاں، ملازم رکھ لیتے ہیں۔ یہ لڑکیاں ''نازک اداؤں'' اور ''چلبلے اندازوں'' کے ساتھ گاہکوں کے سامنے کھانا رکھتی ہیں اور انھیں خوش کرنے کے لیے ''محبانہ گفتگو'' کرتی ہیں وہ لوگ جاتے وقت انھیں بھی کچھ دے جاتے ہیں اور مالکان ہوٹل پر بھی ان کا زیادہ بوجھ نہیں پڑتا۔ انھیں معمولی تنخواہ اور کھانا دینا پڑتا ہے۔ ویسے وہ خود اچھی بھلی کمائی کر لیتی ہیں۔ ''سسل ہوٹل'' والوں کو ایک ''اطالوی لڑکی'' مل گئی جو نہایت خوبصورت تھی۔ مولانا ظفر علی خان اس کے تعارف میں یوں ارشاد فرماتے ہیں ؎

''روما'' سے ڈھل کے ''برق کے سانچے'' میں آئی تھی
اب کس ''حریم ناز'' میں ''جان جہاں'' گئی؟

عموماً ''دل پھینک حضرات'' پوچھ لیتے ہیں کہ: ''کس ہوٹل میں رونق زیادہ ہے؟'' تو وہاں چلے جاتے ہیں۔ کسی نے مرزا محمود خلیفہ قادیانی سے کہہ دیا کہ: ''آپ یوں بدنام ہوتے پھرتے

ہیں۔ سسل ہوٹل منٹگمری روڈ لاہور میں ''ایک پری'' روما سے آئی ہے۔ آپ اگر اسے دیکھ پائیں گے تو آپ کو یہ ''سیاہ برقعے'' جنھیں آپ الٹ کر بدنام ہو رہے ہیں؟ سب کچھ بھول جائیں گے!''
خلیفہ صاحب نے یہ ''مژدۂ جاں فزا'' سن کر ''رخت سفر'' باندھا اور سسل ہوٹل لاہور پہنچ گئے۔ اطالوی حسینہ کو دیکھا تو ''لٹو'' ہو گئے پہلے تو اسے آمادہ کیا کہ: ''وہ قادیان میرے ساتھ آئے''! مگر وہ آمادہ نہ ہوئی تو ''سیر و سیاحت کے بہانہ'' سے کار میں بٹھایا اور قادیان لے آئے۔ چونکہ سسل ہوٹل والوں کا بڑا نقصان ہو گیا تھا۔ انھوں نے واویلا کیا۔ اس اطالوی حسینہ کی ڈیوٹی صرف گاہکوں کے سامنے کھانا لا رکھنا نہ تھا؟ بلکہ اس کے ذمہ کچھ انتظامی ذمہ داریاں بھی تھیں۔ ''رقص و سرود'' اور دیگر ''سامانِ تعیش'' کے کمروں کی ''چابیاں'' بھی اس کے پاس رہتی تھیں! اس وجہ سے بھی ہوٹل والوں کو پریشانی ہوئی! اخبارات میں چھپا؟ عوام میں واویلا ہوا؟ ساتھ ہی مرزا محمود نے محسوس کیا کہ ملک میں واویلا ہو رہا ہے اور بدنامی ہو رہی ہے۔ سب سے بڑھ کر بات یہ تھی کہ وہ حسینہ قادیان ''خوشی'' سے نہیں آئی تھی؟ اور وہ ''قادیان کی رہائش'' پر ''راضی نہیں ہو رہی تھی؟ مرزا محمود نے مجبور ہو کر اسے واپس لاہور بھیج دینے پر ''رضا مندی'' کا اظہار کیا اور اسے مبلغ پانچ ہزار روپیہ دے کر اپنی کار کے ذریعہ لاہور بھیج دیا۔ لاہور پہنچ کر اس نے مرزا محمود کے خلاف عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا چاہا کہ مجھے ''جبراً قادیان لے جا کر میری آبروریزی کی گئی؟'' قانونی مشیر نے اسے مشورہ دیا کہ: ''تم پیشہ ور لڑکیاں ایسا الزام عدالت میں ثابت نہیں کر سکتیں؟ اور عدالت تمہاری اس بات کو بہ مشکل تسلیم کرے گی؟'' تو اس حسینہ نے اپنے وکیل کو کہا کہ: ''مجھے زیادہ غصہ اس بات پر ہے کہ جس وقت خلیفہ قادیان میں میری آبروریزی کر رہا تھا تو اس وقت اس نے اپنی لڑکی کو 'پاس بٹھا رکھا تھا؟'' تو وکیل نے کہا: ''ممکن ہے تم سچ کہتی ہو؟ مگر عدالت اسے تسلیم نہیں کرے گی؟ اس لیے وہ مجبوراً چپ ہو کر رہ گئی۔

جب یہ خبر اخبارات میں آئی اور ملک میں عام شہرہ ہوا تو مرزا محمود کی اپنی قادیانی جماعت بھی ''برے تاثر'' سے نہ بچ سکتی تھی؟ اس لیے اسے ضرورت پڑی کہ وہ اپنی جماعت کو ''مطمئن'' کرے۔ اس لیے خلیفہ نے ایک خطبہ جمعہ میں بتایا کہ: ''یہ میرے خلاف جھوٹا پروپیگنڈا ہو رہا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ میں ایک یورپین لیڈی کو اپنے ساتھ قادیان لایا تھا کہ ''میری لڑکیوں کی اتالیق'' ہو اور انھیں ''انگریزی لہجہ'' سکھائے۔ دشمنوں نے خواہ مخواہ مجھے بدنام کرنے کے لیے میرے خلاف پروپیگنڈا کر دیا ہے۔''

لیکن سوال یہ ہے کہ مرزا محمود کا مقصد اگر انگریزی سکھانے کے لیے ''اتالیق'' رکھنا ہوتا تو وہ کسی ''برطانوی لیڈی'' کی تلاش کرتا؟ اور یہ کہ بجائے ''نوخیز خوبصورت لڑکی'' کے وہ ''عمر رسیدہ'' یا

''ادھیڑ عمر کی خاتون'' ہوتی؟ نہ کہ ''خوبصورت'' ''دل رُبا'' ''نوخیز لڑکی'' ہوتی؟ علاوہ ازیں ایک ''اطالوی'' کے لیے ''انگریزی زبان'' ایسی ہے؟ جیسے ہمارے لیے ہے جیسا کہ ''انڈین'' ''محنت شاقہ'' اور ایک مدت دراز کے بعد ''انگریزی میں مہارت'' حاصل کر سکتے ہیں۔ بعینہ اسی طرح ایک ''اطالوی نژاد'' کو بڑی ''محنت شاقہ'' سے ''انگریزی'' سیکھنی پڑتی ہے اور جو ایک مدت صرف کرنے کے بعد انگریزی میں مہارت حاصل کر لیتا ہے تو وہ خود ''مرد'' ہو؟ یا ''عورت''؟ ہوٹلوں کی گھٹیا ''ملازمت'' کیسے اختیار کر سکتا ہے؟ اس کے لیے تو کئی ''باعزت روزگار'' موجود ہیں۔

یہ ''ایک ''کھلی'' اور ''ناقابل تردید حقیقت'' ہے کہ مرزا محمود اس حسینہ کو اپنی ''ہوس رانی'' اور ''عیش پرستی'' کے لیے لایا تھا مگر وہ قادیان آنے پر ''راضی'' نہ تھی؟ اور جب ''بہ جبر'' قادیان لائی گئی تو وہاں ''رہائش پذیر'' ہونے پر ''راضی'' نہ ہوئی؟ ادھر عوام میں ''شور اٹھا' تو خلیفہ گھبرا گیا اور اسے واپس لاہور بھیجنے پر راضی بلکہ ''مجبور'' ہوا اور ساتھ ہی اس کا منہ بند کرنے کے لیے' مبلغ پانچ ہزار روپیہ دے کر اپنی کار کے ذریعہ اسے واپس لاہور پہنچا دیا مگر وہ پانچ ہزار روپیہ پر راضی نہ ہوئی اور خلیفہ کے خلاف عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا چاہتی تھی لیکن اسے ''خلیفہ کا جرم' ثابت کرنا مشکل نظر آیا اور وکیل سے مشورہ کے بعد ''بہ امر مجبوری'' ''خاموش'' ہوگئی۔ اطالوی حسینہ کی یہ خبر لاہور کے تمام اخبارات میں چھپی مگر ''زمیندار'' نے اس میں بہت زیادہ ''دل چسپی'' لی اور خوب ''نمک مرچ'' لگا کر ''خلیفہ کے ذلیل اور سیاہ کردار کو عوام میں ''اجاگر'' کیا۔ اور اس سلسلہ میں کئی نظمیں بھی اخبار ''زمیندار'' میں شائع ہوئیں۔ قارئین کی دل چسپی کے لیے میں یہاں مولانا ظفر علی خان کی دو نظمیں درج کیے دیتا ہوں۔

اطالوی حسینہ

اے کشورِ اطالیہ کے باغ کی بہار
لاہور کا دمن ہے تیرے فیض سے چمن
پیغمبر جمال تیری دِل رُبا ادا
پروردگار عشق ترا چُلبلا چلن
الجھے ہوئے ہیں دل تری زلف سیاہ میں
ہیں جس کے ایک تار سے وابستہ سو فتن
پروردۂ فسوں ہے، تری آنکھ کا خمار
آوردۂ جنوں ہے تیری بوئے پیرہن

پیمانۂ نشاط تیری ساق صندلی
بیعانۂ سرور ترا مرمری بدن!
رونق ہے ہوٹلوں کی ترا حسن بے حجاب
جس پر فدا ہے شیخ تو لٹو ہے برہمن
جب قادیاں پہ تیری نشیلی نظر پڑی
سب نشہ نبوت ظلی ہوا ہرن
میں بھی ہوں تیری چشم پر افسوں کا معترف
جادو وہی ہے آج جو ہو قادیاں شکن

دوسری نظم یہ ہے۔

ہوٹل سسل کی رونق عریاں

عشاق شہر کا ہے ''زمیندار'' سے سوال
ہوٹل سسل کی رونق عریاں کہاں گئی
اس کے جلو میں جاں گئی ایمان کے ساتھ ساتھ
کیا کیا نہ تھا جو لے کے وہ جان جہاں گئی
خوفِ خدائے پاک دلوں سے نکل گیا
آنکھوں سے شرم سرورِ کون و مکاں گئی
بن کے خروش حلقہ رندان لم یزل
لے کر گئی وہ حشر کا ساماں جہاں گئی
رومہ سے ڈھل کے برق کے سانچے میں آئی تھی
اب کس حریم ناز میں وہ جانِ جاں گئی
یہ چیستان سنی تو ''زمیندار'' نے کہا
اتنا ہی جانتا ہوں کہ وہ قادیاں گئی

اطالوی حسینہ مس روفو

تمہیں مشی فی النوم کی بھی خبر ہے؟
زمانے کے اے بے خبر فیل سوفو!

ملے گا تمہیں یہ سبق قادیاں سے
جہاں چل کے سوتے میں آئی ہے روفو
دبستان میں جانا نہیں چاہتے ہو
تو پہنچو شبستان میں اے بے وقوفو
بہار آ رہی ہے خزاں جا رہی ہے
ہنسو کھل کھلا کر دمشقی شگوفو!
کرشن اور خورسند کیا اس کو سمجھیں
تمہیں داد دو اس کی عبد الرؤفو!
جب اوقات موجود ہے قادیاں کی
کہاں مر رہی ہو تفو اور زوفو!

31مارچ1924ء

فتنہ آخر زماں

اے قادیاں، اے قادیاں تیرے بڑے لنگور کو
لپٹا لیا کرتا ہے جو ہر شب نئی اک حور کو
جس نے ہنسایا ناچ کر کشمیر اور میسور کو
جس کی ترش روئی ملی نیبو کو اور اچور کو
لکھوں دمشقی گورخہ یا اندلس کی مادیاں
اے قادیاں اے قادیاں اے فتنۂ آخر زماں
پیسہ ترا ایمان ہے، گالی تری پہچان ہے
جنس نفاق و کفر سے چمکی تری دکان ہے
بہتاں خدا پر باندھنا تیرے نبی کی شان ہے
الہام جو بھی ہے ترا آوردۂ شیطان ہے
یہ بھی خدا کا آخری اسلام پر احسان ہے
نقاش کی مٹھی میں گر پوشیدہ تیری جان ہے
اے قادیاں اے قادیاں اے دشمن اسلامیاں
اے فتنہ آخر زماں

اس اطالوی حسینہ کا نام ''مس روفو'' تھا اور لوگ بازار میں مس روفو کے گیت گاتے تھے اور مزہ لے لے کر ''روفو اور مرزا محمود کا تذکرہ'' کرتے تھے۔ اخبار زمیندار کا شدت سے انتظار ہوتا تھا جب زمیندار آتا تو ہجوم اس پر پل پڑتا تھا۔ بازار میں بیٹھ کر ایک شخص بلند آواز سے وہ اخبار پڑھتا تھا اور بیسیوں سامعین اس کے گرد بیٹھے سن رہے ہوتے تھے۔

مس روفو کا یہ ''تمام واقعہ'' میرے قیام قادیان کے دوران ''ظہور پذیر'' ہوا۔ مرزائیوں کا بازار سے گزرنا دو بھر ہو رہا تھا۔ اگر بہ امر مجبوری کسی مرزائی کا ادھر سے گزر ہوتا؟ وہ بے چارہ سر جھکائے جلدی سے گزرنے کی کوشش کرتا تھا! ان تمام ''واقعات'' کی ''رپورٹیں'' مرزا محمود کو ''قصر خلافت'' میں پہنچ رہی ہوتی تھیں اور ''مرزائی دنیا'' میں ایک ''زلزلہ'' سا ''ہنگامہ'' برپا تھا۔ ''نہ جائے ماندن'' ؟ ''نہ پائے رفتن'' ؟ آخر مجبور ہو کر اور ''رونی صورت'' بنا کر مرزا محمود نے ''خطبہ'' دیا اور کہا کہ: ''دیکھو! کتنا بڑا ظلم ہے میں ایک ''یورپین لیڈی'' کو لاہور سے لایا تھا تاکہ وہ میری ''لڑکیوں'' اور ''بیویوں'' کو ''انگریزی لب و لہجہ'' سکھائے؟ مگر ''دشمنوں'' نے ''پر کاہ'' کو ''انبار'' بنا کر میرے خلاف ہنگامہ برپا کر دیا؟ میں نے کون سی بری بات کی ہے کہ اس قدر ہنگامہ اٹھایا جا رہا ہے؟'' اس خطبہ میں بیٹھے باخبر سامعین ہنسی اڑا رہے تھے کہ ایک ''اطالوی نوخیز حسینہ'' اور ''انگریزی لب و لہجہ'' اطالوی لوگ تو انگریزی کے بعض الفاظ سکھائے جانے سے بھی نہیں ادا کر سکتے تھے؟ تو بھلا ایک نوخیز اطالوی لڑکی کیا خاک انگریزی لب و لہجہ کسی کو سکھائے گی؟ بہر حال وہ ایک ''دل چسپ دور تھا۔ ایک وہ زمانہ کہ مرزا محمود کے ''تقدس کا سایہ'' ہر انسان پر ''چھایا'' ہوا تھا خواہ وہ کسی بھی ''مکتب فکر'' سے تعلق رکھتا ہو؟ اور ایک وہ دور بھی ہم نے دیکھا؟ کہ ''سر عام بازار میں مرزا محمود کا ''مذاق'' اُڑایا جا رہا تھا؟ اور احرار نے وہاں وہ ''فضاء پیدا کر دی تھی کہ مرزائی یہ سب کچھ دیکھتے اور ''ٹس'' سے ''مس'' نہ ہوتے۔ ''انگریزی حکومت'' جو مرزائیت کو اپنا ''خود کاشتہ پودا'' تصور کرتی تھی؟ وہ ''مجبور'' تھی کہ قادیان میں ''امن'' قائم رکھے اور ''مرزائی جبر و تشدد'' کا ''سدباب'' کرے اس لئے اس نے ''پولیس کی سپیشل گارڈیں'' متعین کر رکھی تھیں اور ''مرزائی ڈکٹیٹر شپ'' کا ''دست تطاول'' ''شل'' ہو رہا تھا۔

حکیم عبدالعزیز

حکیم عبدالعزیز قادیان میں رہائش پذیر تھا۔ مرزائی ہونے کے بعد اپنے وطن مالوف سے ہجرت کر کے مستقلاً قادیان آ گیا تھا۔ بڑا سمجھ دار اور مرزائیت کا اہم ممبر تھا اور قادیانی ذیلی شاخ ''انصار الاحمدیہ'' کا سیکرٹری تھا۔ طب یونانی سے بھی اچھی واقفیت رکھتا تھا اور جماعت کا اہم معزز فرد

تھا۔ مرزا محمود کے متعلق جب کریکٹر کی کمزوریوں کے انکشافات ہونے شروع ہوئے تو خلیفہ کے قریب ہونے کے باوجود اسے بھی حقیقت حال معلوم کرنے کی جستجو ہوئی۔ آدمی بڑا عقل مند اور ذکی الفہم تھا اور آخر کار صحیح نتیجہ پر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا اور اسے حق الیقین ہو گیا کہ مرزا محمود کے خلاف الزامات درست ہیں اور حقائق نفس الامر یہ کے عین مطابق ہیں تو جماعت سے علیحدہ ہونے کا اعلان کر کے ہمارے پاس آ گیا اس کے ساتھ تین پڑھے لکھے نوجوان اور بھی تھے۔ جنھوں نے حکیم صاحب کے ساتھ جماعت سے جدا ہونے کا اعلان کیا تھا۔ کچھ عرصہ تو وہ لوگ قادیان میں اقامت پذیر رہے۔ حکیم صاحب نے اپنا مطب ہماری آبادی میں بنا لیا تھا۔ بعد میں حکیم صاحب لاہور آ کر لاہوری جماعت سے منسلک ہو گئے۔ آدمی بڑے قابل فہیم اور اعتمادی تھے اس لیے جماعت لاہور نے انھیں اپنے کسی کام پر لگا لیا اور وہ مستقلاً لاہور آ گئے۔ ان کے تین دوسرے ساتھی تھے جن میں سے ایک کا نام ''عبدالرب برہم'' تھا اور دوسرا ''شبنم'' کے نام سے مشہور تھا۔ تیسرے کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔

حکیم صاحب نے خلیفہ محمود کی قادیانی جماعت سے علیحدہ ہونے کا اعلان 40-1939ء میں کیا تھا جبکہ برطانیہ دوسری جنگ عظیم میں الجھا ہوا تھا۔ خلیفہ محمود نے اپنے ایک خطبہ میں حکومت برطانیہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ: ''اگر گورنمنٹ مجھ سے دعا کی درخواست کرے تو میں دعا کروں گا اور گورنمنٹ کو یقیناً فتح و نصرت ہوگی۔'' خلیفہ صاحب کا یہ خطبہ اخبار ''الفضل'' میں چھپا تو حکیم صاحب نے اس خطبہ کے جواب میں ایک طویل بیان دیا جو بہت سے حقائق کو اپنے اندر لیے ہوئے تھا اور ساتھ ہی مرزا محمود کو مباہلہ کا چیلنج دے دیا۔ حکیم صاحب کا یہ بیان رسالہ ''شمس الاسلام'' بھیرہ کے 11 اگست 1940ء کے شمارہ میں شائع ہوا تھا۔ میں قادیان میں تھا اور سب کارروائی میری آنکھوں کے سامنے ہوئی تھی۔ قارئین کی آگاہی کے لیے وہ بیان ذیل میں من وعن درج کیا جاتا ہے۔

''جناب خلیفہ صاحب نے اپنے خطبہ میں زور دار الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ: ''اگر حکومت برطانیہ مجھ سے درخواست دعا کرے تو میری دعا کے سبب حکومت برطانیہ کو یقیناً فتح ہوگی۔'' ''وابستگانِ خلافت'' بھی جناب خلیفہ صاحب کے اس دعویٰ کو بڑی اہمیت دے رہے ہیں تاکہ جناب خلیفہ صاحب کا تعلق باللہ اور دعاؤں میں غیر معمولی مقبولیت ثابت ہو لیکن ہم اس معمے کو سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ایک طرف تو خلیفہ صاحب ''برٹش امپائر'' کی وفاداری کا راگ الاپا کرتے ہیں اور دوسری طرف یہ حال ہے کہ ان کی کامیابی کے لیے سچے دل سے دعا تک کرنے کو بھی تیار نہیں جبکہ رعایا کا بچہ بچہ گورنمنٹ سے ہمدردی رکھتا ہے اور ان کے عدل و انصاف کو مدنظر رکھتے ہوئے دلی

اخلاص سے فتح کی دعائیں مانگ رہا ہے؟ اس وقت خلیفہ صاحب حکومت کے مصائب میں اور اضافہ کرنے کا باعث بن رہے ہیں اور انھیں الٹا اپنے سامنے جھکانا چاہتے ہیں اور ان کی کامیابی کو مشکوک نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ حالانکہ ہمارے بادشاہ کی کامیابی یقینی ہے ہمیں تو ان کی وفاداری کی سمجھ نہیں آئی کہ وہ کیوں مشکلات کی گھڑیوں میں بھی بغیر گورنمنٹ کی درخواست کے دعائیں نہیں کرتے؟ لیکن دیکھنا تو یہ ہے کہ خلیفہ صاحب کے اس بلند بانگ دعویٰ میں کہاں تک صداقت ہے؟ اور ان کی دعاؤں کو کہاں تک مقبولیت حاصل ہے؟ اگر ان کی دعاؤں میں ایسی ہی قبولیت ہے جیسا کہ انھوں نے دعویٰ کیا ہے تو میں پوچھتا ہوں کہ:

1- جب آپ نے ''احمدیہ سٹور'' قوم کے ہزاروں روپیہ سے جاری کیا تھا اور اس میں آپ نے اپنی ذمہ داری پر لوگوں سے روپیہ لیا تھا کیا اس میں کامیابی کے لیے دعائیں نہ کی تھیں؟ اگر کی تھیں تو سٹور کیوں تباہ و برباد ہوا؟ جس کے صدمہ سے کئی احمدی پاگل ہو گئے؟ اور بہت سارے اپنی تمام عمر کی کمائی سٹور میں تباہ و برباد کر کے مفلس و قلاش بن کر رہ گئے؟

2- ''ایسٹرن ٹریڈنگ کمپنی'' میں قوم کا کس قدر روپیہ برباد ہوا؟ ''گلوب ٹریڈنگ کمپنی'' کا کس قدر روپیہ تباہ ہوا؟ ''گٹ فیکٹری'' کا کیا حشر ہوا؟ پھر قومی سرمایہ سے قائم شدہ ''بک ڈپو'' کا سرمایہ کہاں گیا؟ یہ تمام کام جو قومی سرمایہ سے قائم ہوئے اور آپ کی سرپرستی میں جاری رہے اور آپ ان کی ترقی اور کامیابی کے لیے دعائیں فرماتے رہے کیا پھر ان کا انجام ناکامی نہ ہوا؟ اس وقت آپ کی دعائیں کیوں کارگر نہ ہوئیں؟

3- کیا جناب کو یاد نہیں جب آپ کے قیمتی گھوڑے چور لے گئے اور آپ نے ان کی واپسی کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ گھوڑے تو واپس کیا آنے تھے؟ الٹا آپ سے ''بھونگے کی رقم'' بھی کھا گئے۔ اس وقت آپ کی دعاؤں کو کیا ہوا؟

4- کیا آپ کو علم ہے کہ آپ نے ''دلکشا پرفیومری کمپنی قادیان'' جس کے آپ واحد مالک تھے کی ایک شاخ کٹڑہ ''جیمل سنگھ'' امرت سر میں کھولی؟ جس کا افتتاح آپ نے خود اپنے ہاتھوں سے وہاں پہنچ کر لمبی چوڑی دعاؤں کے بعد کیا۔ اس کے بعد اس کا جو حشر ہوا کیا آپ بھول سکتے ہیں؟ اس وقت آپ کی دعائیں کیوں بے اثر ہو گئیں؟

5- ''سٹار ہوزری قادیان'' کے لیے، آپ نے احمدی احباب پر کس قدر زور ڈال کر سرمایہ وصول کیا ان کا جو حشر ہو رہا ہے وہ کسی تشریح کا محتاج نہیں۔ کیا اس کے لیے دعائیں

نہیں فرماتے؟

6- قاضی ''محمد علی'' نوشہروی کو ''سزائے پھانسی'' سے بچانے کے لیے آپ نے نہ صرف خود ہی دعائیں فرمائیں بلکہ تمام جماعت سے بھی دعائیں کروائیں اور روزے رکھوائے اور قوم کا ہزاروں روپیہ خرچ کر کے ''پریوی کونسل'' تک اپیلیں بھی کی گئیں۔ کیا اس وقت آپ کی دعائیں؟ روزے؟ اور اپیلیں اکارت نہ گئیں؟ اور قاضی محمد علی کو پھانسی نہ ہوئی؟

7- کیا قادیان میں ''احرار کانفرنس'' کو روکنے کے لیے ایڑی چوٹی تک کا زور نہ لگایا؟ اور ہر رنگ میں اسے روکنے کی کوششیں نہیں ہوئیں؟ پھر احرار کانفرنس قادیان میں منعقد ہوئی یا نہ؟ اس وقت آپ کی دعائیں کہاں گئیں؟

8- کیا احرار کانفرنس کے بعد سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری کو پھنسانے کے لیے کوئی کسر باقی رکھی؟ نتیجہ کیا ہوا؟ ''مقدمہ بخاری کا فیصلہ'' آپ کے خلاف ہوا جس کی اپیلوں وغیرہ پر قوم کا کم از کم چالیس ہزار روپیہ کا خرچہ بتایا جاتا ہے۔ اس وقت آپ کی دعائیں کہاں جا چھپیں؟

9- چودھری ''فتح محمد'' سیال (جو آپ کے ناظر اعلیٰ ہیں) کو جب آپ نے الیکشن کے لیے کھڑا کیا تھا کیا ان کی کامیابی کے لیے دعائیں نہ کی تھیں؟ جبکہ ظاہری طور پر قوم کا پسینہ کی جگہ لہو بہا کر کمایا ہوا روپیہ ہزاروں کی تعداد میں بے دریغ بہایا گیا اور صبح سے لے کر شام تک آپ خود بڑی عرق ریزی سے قادیان پولنگ پر ووٹ گزارتے رہے۔ کیا پھر بھی اس میں ناکامی کا منہ دیکھنا نہ پڑا؟ اس وقت آپ کی دعائیں کیوں رد ہوئیں؟

10- کیا ''عزیز احمد'' قلعی گر کو پھانسی سے بچانے کے لیے آپ نے دعائیں نہ کیں؟ اور قوم کا ہزاروں روپیہ برباد کر کے پریوی کونسل تک اپیلیں نہ کی گئیں؟ اور کیا آپ کی دعاؤں کا الٹا اثر یہ نہ ہوا؟ کہ جب آپ نے قلعی گر کو بچانے کے لیے لاہور ہائیکورٹ میں اپیل کرائی تو ہائیکورٹ نے قاتل کو تو کیا بری کرنا تھا؟ الٹا آپ کے خلاف بھی ریمارکس دے دیے جس پر آپ نے ایک بیان کے دوران میں تسلیم کیا کہ: ''ان ریمارکس سے جو آگ آپ کے دل کو لگی ہوئی ہے اس کو کوئی پانی ٹھنڈا نہیں کر سکتا۔'' اب آپ خدارا فرمائیں کہ اب بھی آپ کی دعاؤں کی قبولیت پر یقین کیا جا سکتا ہے؟

11- پھر آپ نے اس آگ کو بجھانے کے لیے تین قابل وکلاء کی خدمات حاصل کر کے ہائیکورٹ میں ریمارکس حذف کرنے کی درخواست دی جس کے بالمقابل یہ خاکسار

معمولی سے وکیل کو ہی لے کر پیش ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کی تمام دعائیں اور کوششیں بے اثر ثابت ہوئیں اور اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے مجھ جیسے کمزور و بیکس انسان کو فتح دی اور آپ کی اپیل خارج ہو گئی؟

''حسن ابن صباح'' کی پیروی

اسی قسم کے اور بیسیوں واقعات ہیں جن کی تفصیل کی اس جگہ گنجائش نہیں لیکن حقیقت یہی ہے کہ آج تک آپ کی دعائیں الٹا اثر ہی دکھاتی رہیں۔ اس کے بالمقابل آپ کے بعض سادہ لوح مریدوں کا یہ لکھ دینا کہ: ''ہمارا فلاں کام آپ کی دعاؤں سے ہوا'' کچھ حقیقت نہیں رکھتا کیونکہ ایسے اتفاقی واقعات دنیا میں ہوتے رہتے ہیں اور سادہ لوح مرید ایسے واقعات کو ''اپنے پیروں کی کرامات'' ہی ظاہر کیا کرتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ امور جن میں پوری کوشش، توجہ اور انہماک سے دعائیں کیں اور قوم سے بھی کروائیں، ان میں ناکامی کیوں ہوئی؟ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ کے حضور قطعاً کوئی خاص مرتبہ حاصل نہیں اور نہ ہی آپ کی دعاؤں میں غیر معمولی مقبولیت ہے۔ اس وقت آپ کا گورنمنٹ کو دعا کی درخواست کرنے کے لیے مائل کرنے کی کوشش کرنا۔ ''حسن ابن صباح'' والی چال ہے ورنہ کیا وجہ ہے کہ آپ نے اپنے معترضین کے خلاف ہمیشہ دعا کا پاکیزہ ہتھیار استعمال کرنے کی بجائے ''کفار و الاحربہ'' ''بائیکاٹ'' استعمال کیا؟

''مباہلہ کا چیلنج''

اگر آپ یہ فرمائیں کہ: اس وقت آپ کو یہ مقام حاصل نہ تھا جو اب ہوا ہے تو اب بھی ہماری طرف سے آپ کو کھلا چیلنج ہے کہ اگر آپ کو یقین ہے کہ آپ خدا کے برگزیدہ اور مقرب بن چکے ہیں اور وہ الزامات جو آپ کی ذات پر آئے دن لگ رہے ہیں غلط اور بے بنیاد ہیں تو آ ؤ اللہ تعالیٰ کے حضور میں مل کر دعا کریں اور میدان مباہلہ میں نکلیں تا کہ روز روز کا جھگڑا ختم ہو کر حق و باطل میں فیصلہ ہو اور وہ تمام احمدی جو اس تنازعہ کی وجہ سے تذبذب میں پڑ چکے ہیں اور وہ تمام مخلصین جماعت جو منافق قرار دیے جا چکے ہیں راہ راست پر آئیں اور وہ تمام اعتراضات جو آئے دن ان حالات کی وجہ سے سلسلہ پر لگ رہے ہیں ختم ہوں۔

''مباہلہ میں پوزیشن کا سوال''

اگر آپ فرمائیں کہ: ''ہماری پوزیشن ہی کیا ہے کہ آپ ہمارے بالمقابل مباہلہ کے لیے نکلیں؟'' تو آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ جس پر اس قسم کے الزامات لگ جائیں تو اس کی تو اپنی پوزیشن

ہی خطرہ میں پڑ جاتی ہے جب تک وہ الزامات سے بریت ثابت نہ کرے؟ یہی وجہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام پر چند ذلیل عورتوں نے ہی اسی قسم کا الزام لگایا تھا تو وہ (حضرت یوسف علیہ السلام) جیل خانہ سے باہر نہیں نکلے جب تک بریت ثابت نہ کر دی؟ اسی طرح حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہؓ پر جب بعض منافقین نے الزام لگایا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عائشہ صدیقہؓ سے ''سلام کلام'' بند کر دیا جب تک اللہ تعالیٰ نے بریت نہیں فرمادی؟ اور شہنشاہِ اسلام حضرت عمرؓ نے خطبہ تک بند کر دیا جب تک ایک معمولی معترض کے اعتراض کا تسلی بخش جواب نہ دے لیا وغیرہ؟ کیا ان معترضین میں سے کسی ایک معترض کی پوزیشن ان بزرگوں جیسی تھی؟ اگر نہیں تھی؟ اور یقیناً نہیں تھی تو پھر ان بزرگوں نے کیوں ان معترضین کے جواب دینے ضروری سمجھے؟ اور الزامات سے بریت ثابت کی؟''

''مکرر چیلنج''

بالآخر میں امید کرتا ہوں کہ آپ ضرور ''میدانِ مباہلہ'' میں نکلیں گے اور اگر آپ نے میدان مباہلہ میں آنے کی جرأت کی تو میں نہ صرف اکیلا ہی نہیں بلکہ کم از کم بیس افراد کو اپنے ہمراہ لاؤں گا جو ''دعا مباہلہ'' میں شریک ہوں گے اور کم از کم دو ہزار ایسے اشخاص کو بھی ساتھ لاؤں گا جو ہمیشہ کے لیے اس ''نشان'' کے ''زندہ گواہ'' ٹھہریں گے! لیکن اگر آپ اللہ تعالیٰ کے وعید "ولن یتمنوہ أبدا بما قدمت ایدیھم" سے ڈر گئے اور میدان مباہلہ میں نہ نکلے؟ تو یاد رکھیں کہ آپ کے وہ تمام دعاوی جن کو آپ آئے دن پیش کرتے رہتے ہیں غلط اور بے بنیاد ٹھہریں گے؟ اور ماننا پڑے گا کہ آپ کو اللہ تعالیٰ کے حضور ہرگز ہرگز کوئی مرتبہ حاصل نہیں! اور آپ کا آپ کی طاقت کے نشہ میں ''ہم کمزور و بیکس احمدیوں'' کو ''منافق'' قرار دینا غلط اور ظلم عظیم ہے۔ ورنہ کسی ایک خدا کے برگزیدہ کی مثال پیش کرو جو منافقوں کے بالمقابل میدان مباہلہ میں نہ نکلا ہو؟ وَالسَّلَامُ عَلَى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى. (حکیم ''عبدالعزیز'' سیکرٹری ''انجمن انصار احمدیہ'' قادیان)

پروفیسر محمد الیاس برنی

قادیان اور قادیانی زندگی

قادیانی جماعت قادیان کو بھی قادیانی جماعت لاہور سے سخت بدگمانی اور نفرت ہے کہ گویا وہ ان کے بدترین دشمن ہیں مثلاً:

"اگر (قادیانی جماعت قادیان کا) ایک بدترین دشمن ہندوؤں سے لیا جائے اور ایک بدترین دشمن عیسائیوں سے لیا جائے، اور ایک بدترین دشمن دہریوں سے لیا جائے اور ایک بدترین دشمن پیغامیوں سے لیا جائے (یعنی قادیانی جماعت لاہور سے لیا جائے) تو یقیناً پیغامی دشمنی اور بغض میں دہریہ، عیسائی اور ہندو سے بڑھا ہوا ہوگا۔ ان کے (یعنی قادیانی جماعت لاہور کے) غالی ممبر بغض کے مجسمے ہیں۔ اگر کسی نے زمین پر چلتی پھرتی دوزخ کی آگ دیکھنی ہو تو ان لوگوں کو دیکھ لے، میں نہیں سمجھتا ان سے زیادہ بغض و کینہ رکھنے والے لوگ کبھی دنیا میں ہوئے ہوں...... جہاں تک تاریخ کا پتہ چلتا ہے، ان لوگوں کا بغض سب سے بڑھا ہوا ہے۔" (یہ تو سراسر مبالغہ بلکہ غلو معلوم ہوتا ہے، البتہ دونوں جماعتوں کی مخالفت اور رقابت تو مسلم ہے۔ للمؤلف برنی)

(میاں محمود احمد قادیانی خلیفۂ قادیان کا خطبہ بابت 1931ء مندرجہ اخبار الفضل قادیان ج29 نمبر 222 مورخہ 28 ستمبر 1941ء)

مزید برآں قادیانی جماعت قادیان، قادیانی جماعت لاہور کی اندرونی حالت بھی قابل شرم سمجھتی ہے مثلاً اس کا ایک حوالہ ملاحظہ ہو:

"مجھے احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور کی نرالی دنیا کا بھی ذکر کرنا ہے۔ اس انجمن کا مرکز احمدیہ بلڈنگس میں ایک گڑھے کے اندر بنا ہوا ہے۔ وہاں رہنے والے ذمہ دار اراکین جن میں مولانا محمد علی کو سب کے اوپر فوقیت حاصل ہے اور پھر ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ صاحب وائس پریذیڈنٹ، خان صاحب محمد منظور الٰہی صاحب جائنٹ سیکرٹری، سیّد غلام مصطفیٰ شاہ صاحب ہیڈ ماسٹر ہیں۔ یہ عجیب قماش کے لوگ ہیں۔ ان کا جو برے سے برا نام رکھو صحیح ہے۔ یہ آنکھوں سے چھپے ہوئے اس زمانہ کے جن ہیں...... یہ لوگ نہ اخلاق کو جانتے ہیں، نہ شریعت کو، نہ اپنے قواعد کو، نہ ملکی

آ ئین کو اور نہ انسانی حقوق کو، بلکہ سب کو پانی میں حل کر کے سالم نگل چکے ہیں۔ ان کے منہ کی باتیں سنو، شکلیں دیکھو، کتابیں دیکھو، تو ملائکہ اور فرشتے نظر آتے ہیں۔ لیکن اعمال میں اور اندر مخفی گندوں کی نالیاں بہہ رہی ہیں۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح ان کے محلّہ میں زمین کے بہت نیچے چھپ کر گندی نالی بہتی ہے...... ان کی اولادیں احمدیت یا دین سے ہرگز اچھا تعلق نہیں رکھتیں...... بلکہ قریباً قریباً بے دین ہیں۔ اس لیے خدا کے الہام میں یہ سب روحانی حقیقت میں لاولد ہیں...... یہ (مندرجہ بالا) الفاظ اس شخص کے ہیں، جسے مولوی غلام حسین خاں صاحب پشاوری، جن کا غیر مبائعین (یعنی قادیانی جماعت لاہور) میں مولوی محمد علی صاحب کے بعد دوسرا درجہ ہے یعنی وہ نائب صدر اور لائف ممبر انجمن اشاعت اسلام (لاہور) میں نہایت پاکباز اور قابل احترام سمجھے جاتے ہیں اور تحریری، زبانی اور مالی امداد دیتے رہتے ہیں۔ مولوی محمد علی صاحب کو چاہیے کہ اس گھر کے بھیدی نے جو حالات بیان کیے ہیں، سب سے پہلے ان کی اصلاح کی فکر کریں، اور پھر کسی اور طرف کا رخ کریں۔"

(اخبار الفضل قادیان ج 27 نمبر 54 ص 3 مورخہ 7 مارچ 1939ء)

قادیان اور قادیانی زندگی

لیکن خود قادیان اور قادیانی زندگی بھی پستی کا منظر پیش کرتی ہے، مثلاً چند اعتراضات ذیل میں ملاحظہ طلب ہیں:

"پس اساتذہ، افسرانِ تعلیم اور خدام الاحمدیہ کا یہ فرض ہے کہ بچوں سے آوارگی کو دُور کریں۔ یہ آوارگی کا ہی اثر ہے کہ ہم ادھر نماز پڑھ رہے ہوتے ہیں، اور ادھر گلی میں بچے گالیاں بک رہے ہوتے ہیں۔ اگر تو وہ نماز ہی نہیں پڑھتے تو دوہرے مجرم ہیں، نہیں تو یہی جرم کافی ہے، فحش گالیاں ماں بہن کی وہ بکتے ہیں۔ کسی شریف آدمی کو خیال نہیں آتا کہ ان کو روکے، مسجد مبارک کے سامنے کھیلنے والے بچے 95,90 فیصد احمدیوں کے بچے ہی ہو سکتے ہیں۔ تھوڑے سے غیروں کے بھی ہوتے ہوں گے۔ مگر میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے۔ احمدیوں کے بچے گالیاں دے رہے ہوتے ہیں اور ان کے ماں باپ اور اساتذہ کو احساس تک نہیں ہوتا کہ ان کی اصلاح کریں۔ پھر میں نے دیکھا ہے، مدرسہ احمدیہ کے طلبہ گلیوں میں سے گزرتے ہیں تو گاتے جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ وقار کے سخت خلاف ہے اور اس کے یہ معنی ہیں کہ شرم وحیا جو دین کا حصّہ ہے، بالکل جاتی رہی ہے۔ پھر میں نے دیکھا ہے نوجوان ایک دوسرے کی گردن میں باہیں اور ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چلے جا رہے ہیں، حالانکہ یہ سب باتیں وقار کے خلاف ہیں...... میں نے دیکھا ہے کہ نوجوانوں کو اسلامی آداب سکھانے کی طرف توجہ ہی نہیں کی جاتی۔ دو جوان بے تکلفانہ ایک دوسرے کی گردن میں باہیں ڈالے

پھر رہے ہوتے ہیں، حتیٰ کہ میرے سامنے بھی ایسا کرنے میں انھیں کوئی باک نہیں ہوتا، کیونکہ ان کو یہ احساس ہی نہیں کہ یہ کوئی بری بات ہے۔ ان کے ماں باپ اور اساتذہ نے ان کی اصلاح کی طرف کبھی کوئی توجہ ہی نہیں کی۔ حالانکہ یہ چیزیں انسانی زندگی پر بہت گہرا اثر ڈالتی ہے۔" (اثر تو صاف ظاہر ہے۔ للمؤلف برنی)

(میاں محمود احمد قادیانی خلیفۂ قادیان کا خطبہ مندرجہ اخبار الفضل قادیان ص 6-7 ج 7 نمبر 58 مورخہ 11 مارچ 1939ء)

جب بچپن میں آوارگی عام ہو تو لامحالہ نوجوانی میں صحت کمزور ہو جائے گی۔ اگرچہ پنجاب کی تندرستی و توانائی ہندوستان میں اعلیٰ مانی جاتی ہے، تاہم وہاں کے قادیانی نوجوانوں کی صحت بہت خستہ معلوم ہوتی ہے، اور یہ آوارگی کا لازمی نتیجہ ہے۔ مثلاً ملاحظہ ہو:

"اور جیسا کہ میں بتا چکا ہوں، ہماری جماعت کے سینکڑوں نوجوانوں نے شوق سے اس (بھرتی) میں حصہ لیا، اور اپنے آپ کو اس خدمت کے لیے پیش کر دیا ہے، لیکن اس بھرتی میں ہمیں ایک اور فائدہ بھی حاصل ہوا ہے۔ اور وہ یہ کہ ہماری توجہ ایک اور اہم معاملہ کی طرف پھر گئی ہے۔ اگر یہ بھرتی کا موقع نہ آتا، تو نہ معلوم وہ بات کب تک ہماری نظروں سے اوجھل رہتی۔ وہ بات یہ ہے کہ اس فوجی بھرتی کے نتیجہ میں یہ نہایت ہی افسوس ناک امر بھی معلوم ہوا ہے کہ احمدی نوجوانوں کی صحتیں خطرناک طور پر گری ہوئی ہیں۔ اگر بھرتی کا یہ موقع نہ ملتا تو شاید ہمیں اس کا علم دیر تک نہ ہوتا۔ احمدی نوجوانوں کے وزن بالعموم اس وزن سے کم ہیں، جتنا وزن اس عمر میں نوجوانوں کا ہوا کرتا ہے۔ احمدی نوجوانوں کی نظریں بالعموم ان نظروں سے کم ہیں، جتنی نظریں اس عمر میں نوجوانوں کی ہوا کرتی ہیں اور احمدی نوجوانوں کی کمریں بالعموم اس معیار سے بہت کمزور ہیں جتنی اس عمر میں نوجوانوں کی کمروں میں طاقت ہوا کرتی ہے اور یہ امر ایسا خطرناک ہے، جس کی جتنی جلد اصلاح ممکن ہو، اتنی ہی جلد کرنی چاہیے۔ پس اگر اس فوجی تربیت میں شریک ہونے کے اعلان سے کوئی اور فائدہ نہ بھی ہو، تب بھی اس ذریعہ سے ہمیں یہ فائدہ حاصل ہوا ہے، اور یہ خود اپنی ذات میں بہت اہم ہے۔ اور میں غور کر رہا ہوں کہ آئندہ نوجوانوں کے لیے ایسے قواعد تیار کیے جائیں جن کے نتیجے میں ان کے تمام قویٰ کی حفاظت ہو۔"

(میاں محمود احمد قادیانی خلیفۂ قادیان کا ارشاد مندرجہ اخبار الفضل قادیان مورخہ 6 اکتوبر 1939ء)

آوارگی اور کمزوری کا مزید نتیجہ بزدلی ہوتا ہے۔ چنانچہ خلیفہ صاحب قادیان نے اپنی جماعت کی بزدلی سے بیزار ہو کر ان کو خُنثوں کا خطاب دیا، مثلاً:

''تمہاری حالت یہ ہے کہ جب تم سے بعض، دشمن سے کوئی گالی سنتے ہیں، تو ان کے منہ میں جھاگ بھر آتی ہے۔ اور وہ کود کر اس پر حملہ کر دیتے ہیں، لیکن اسی وقت ان کے پیر پیچھے کی طرف پڑ رہے ہوتے ہیں۔ تم میں سے بعض تقریر کے لیے کھڑے ہوتے ہو، اور کہتے ہو ''ہم مر جائیں گے مگر سلسلہ کی ہتک برداشت نہ کریں گے'' لیکن جب کوئی ان پر ہاتھ اٹھاتا ہے تو پھر ادھر ادھر دیکھنے لگتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ''بھائیو! کچھ روپے ہیں، جن سے مقدمہ لڑا جائے۔ کوئی وکیل ہے جو وکالت کرے۔'' بھلا ایسے خُنثوں سے بھی کسی قوم کو فائدہ پہنچا ہے۔''

(میاں محمود احمد کا ارشاد مندرجہ اخبار الفضل قادیان ج 25 نمبر 129 ص 6 مورخہ 5 جون 1937ء)

خیر آوارگی، کمزوری اور بزدلی جو کچھ سہی، ذہنی اور تعلیمی حالت بھی ابتر بتائی جاتی ہے۔ مثلاً ملاحظہ ہو:

''مجھے نہایت ہی افسوس سے معلوم ہوا کہ جامعہ احمدیہ (قادیان) میں جو طلبہ تعلیم پاتے ہیں، انھیں کنوؤں کے مینڈکوں کی طرح رکھا گیا ہے۔ ان میں کوئی وسعتِ خیال نہ تھی۔ ان میں کوئی شاندار امنگیں نہ تھیں، اور ان میں کوئی روشن دماغی نہ تھی۔ میں نے کرید کرید کر ان کے دماغ میں داخل ہو جانا چاہا، مگر مجھے چاروں طرف سے ان کے دماغ کا راستہ بند نظر آیا، اور مجھے معلوم ہوا کہ سوائے اس کے کہ انھیں کہا جاتا ہے کہ وفاتِ مسیح کی یہ آیتیں رٹ لو، یا نبوت کے مسئلہ کی یہ دلیلیں یاد کر لو، انھیں اور کوئی بات نہیں سکھلائی جاتی...... میں نے جس سے بھی سوال کیا، معلوم ہوا کہ اس نے کبھی اخبار نہیں پڑھا اور جب کبھی میں نے ان سے امنگ پوچھی تو انھوں نے جواب دیا کہ ''ہم تبلیغ کریں گے۔'' اور جب سوال کیا کہ ''کس طرح تبلیغ کرو گے۔'' تو یہ جواب دیا کہ ''جس طرح بھی ہوگا تبلیغ کریں گے'' یہ الفاظ کہنے والوں کی ہمت تو بتاتے ہیں، مگر عقل تو نہیں بتاتے۔ الفاظ سے یہ تو ظاہر ہوتا ہے کہ کہنے والا ہمت رکھتا ہے، مگر یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ کہنے والے میں عقل نہیں اور نہ وسعتِ خیالی ہے ''جس طرح ہوگا، تو سور کیا کرتا ہے۔ اگر سور کی زبان ہوتی اور اس سے پوچھا جاتا کہ تو کس طرح حملہ کرے گا تو وہ یہی کہتا کہ ''جس طرح ہوگا، کروں گا'' پس سور کا یہ کام ہوتا ہے کہ وہ سیدھا چل پڑتا ہے۔ آگے نیزہ لے کر بیٹھو تو نیزہ پر حملہ کر دے گا۔ بندوق لے کر بیٹھو تو بندوق کی گولی کی طرف دوڑتا چلا جائے گا۔ پس یہ تو سوروں والا حملہ ہے کہ سیدھے چلے گئے، اور عواقب کا کوئی خیال نہیں کیا۔''

(خطبہ میاں محمود احمد مندرجہ اخبار الفضل قادیان ج 22 نمبر 89 ص 8 مورخہ 24 جنوری 1938ء)

جب لڑکپن سے اخلاق و عادات خراب ہو جائیں تو بڑے ہو کر دوسری خرابیاں نمودار

ہوں گی مثلاً ملاحظہ ہو:

''کسی دوسری جگہ خلیفہ صاحب قادیان کے ایک خطبہ کے چند اقتباسات درج کیے گئے ہیں، جن میں انھوں نے اپنے مبلغین کی ریشہ دوانیوں، مرکزی کارکنوں کی دوست نوازی اور اقرباء پروریوں اور دینی مدارس کی تعلیم و اخلاق کا رونا روتے ہوئے اس حقیقت کو واضح طور پر بیان کیا ہے کہ نہ مبلغین اپنے افسروں کا حکم مانتے ہیں، نہ مرکزی کارکن اپنی ذمہ داریوں اور فرائض کو پورا کرتے ہیں بلکہ ذاتی تعلقات کو سلسلہ کے مفاد پر ترجیح دیتے ہیں اور خود خلیفہ صاحب کے احکام کو ٹرخا جاتے ہیں۔ ایسا ہی ان کا بیان ہے کہ دینی مدارس کی تعلیم و اخلاق کا ستیاناس ہو رہا ہے اور دین داری کی تعلیم دینے والے ادارے بے دین ثابت ہو رہے ہیں۔ انھوں نے ان مدارس کے اساتذہ اور مبلغین کو اور ان کی اولاد تک کو ''لعنتی'' اور ہلکا کتا تک کہنے سے دریغ نہیں کیا۔''

(قادیانی جماعت لاہور کا اخبار پیغام صلح لاہور ج 73 نمبر 9 مورخہ یکم مارچ 1950ء)

خلیفہ صاحب قادیان کے فسانے

قادیان اور قادیانی زندگی کا جو سرسری خاکہ اوپر پیش ہوا، اس سے ہزار درجہ بڑھ کر خود خلیفہ صاحب قادیان کی زندگی کے بعض پہلو غور طلب ہیں کہ ان کو اپنی جماعت میں بجا طور پر مضبوط مرکزیت اور مقبولیت حاصل ہے۔ میاں بشیر الدین محمود احمد قادیانی کے امتیازات سے کون واقف نہیں۔ مرزا غلام احمد قادیانی کے بڑے صاحبزادے، جماعتِ قادیان کے خلیفہ ثانی، جو اپنے رتبہ اور اپنی اولوالعزمی کی بنا پر اپنی جماعت میں امیر المؤمنین اور فضل عمر کہلاتے ہیں، اور جن کے مراتب اور فضائل اپنے اپنے محل پر اس کتاب میں بھی درج ہیں، جو قابل دید ہیں۔ تاہم خلیفۂ قادیانی کی زندگی کے انسانی پہلو جن سے خود قادیانی چونکتے چمکتے ہیں، نفسیاتی اعتبار سے ضرور قابل مطالعہ ہیں کہ وہ ایک بارسوخ شخصیت سے متعلق ہیں، اور مریدین اور متبعین پر ان کا موافق یا ناموافق اثر پڑنا الاابد ہے، چنانچہ ایک سرسری خاکہ از ابتداء ملاحظہ طلب ہے۔ حکیم نور الدین قادیانی خلیفہ اوّل کو مرزا غلام احمد قادیانی کے خاندان میں بہت رسوخ حاصل تھا، خاص کر میاں محمود احمد قادیانی پر تو بچپن ہی سے خاص نظر تھی، بہت محبت تھی، پیار کی شدت تھی۔ چنانچہ اس کی جھلک صاف نظر آتی ہے، مثلاً:

1- ''ملک غلام فرید صاحب بیان کرتے ہیں، کہ ایک دفعہ مولوی عبدالحیٔ قادیانی (پسر حکیم نور الدین قادیانی) اور حضرت خلیفۃ المسیح الثانی (میاں محمود احمد قادیانی) حضرت خلیفہ اوّل (حکیم نورالدین قادیانی) کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ حضرت خلیفۃ المسیح اوّل نے مولوی عبدالحیٔ قادیانی کو مخاطب کر کے فرمایا: بچے تم مجھے بہت پیارے ہو، بہت پیارے،

بہت پیارے ہو، مگر" حضور کی طرف اشارہ کر کے فرمایا "محمود ہمیں تم سے بہت زیادہ پیارا ہے۔" (الفضل قادیان ج 25 نمبر 178۔ 4 اگست 1937ء)

"خاندانِ نبوت میرا ہے۔ وہ مطیع و فرمانبردار ہے۔ (عجب دعویٰ ہے! للمؤلف برنی) خصوصاً میرا پیارا محمود تو سب سے زیادہ میری اطاعت کرتا ہے" (حکیم نور الدین قادیانی) پیارا اور اطاعت، اس سے بڑھ کر حسنِ ربط کیا ہو سکتا ہے للمؤلف برنی)

میرا خیال تھا کہ محمود خلیفہ بنے، اس لیے اس کی تعلیم و تربیت کے لیے کوشاں بھی رہا۔"

(حکیم نور الدین قادیانی الفضل قادیان ج 25 نمبر 178 ص 4۔ 4 اگست 1937ء)

"محمود کی کوئی کتنی ہی شکایتیں ہمارے پاس کرے، ہمیں اس کی پرواہ نہیں۔ (پیار، محبت میں ایسا ہی ہوتا ہے للمؤلف برنی) ہمیں تو اس میں وہ چیز نظر آتی ہے، جو اس کو نظر نہیں آتی۔ یہ لڑکا بہت بڑا بنے گا، اور اس سے خدا تعالیٰ عظیم الشان کام لے گا۔"

(حکیم نور الدین قادیانی اخبار الفضل قادیان ج 25 نمبر 179 ص 4-5 مورخہ 4 اگست 1937ء)

-2 "1903ء میں مَیں (شوق محمد) قادیان میں بغرض تعلیم مقیم تھا۔ میں نے اپنے زمانہ قیام دارالامان میں متعدد بار دیکھا کہ حضرت امیر المومنین خلیفۃ المسیح الثانی (میاں محمود احمد قادیانی) بچپن میں ہی چلتے وقت نہایت نیچی نظریں رکھا کرتے تھے اور چونکہ آپ کو آشوبِ چشم کا عارضہ عموماً رہتا تھا، اس لیے کئی بار میں نے حکیم الامت مولانا نور الدین قادیانی خلیفۃ المسیح اوّل کو خود اپنے ہاتھ سے آپ کی آنکھ میں دوائی ڈالتے دیکھا۔ وہ دوائی ڈالتے وقت عموماً نہایت محبت اور شفقت سے آپ کی پیشانی پر بوسہ دیا کرتے تھے اور رخسار مبارک پر دست مبارک پھیرتے ہوئے فرمایا کرتے "میاں تو بڑا ہی میاں آدمی ہے۔ اے مولا! اے میرے قادر مطلق مولا! اس کو زمانہ کا امام بنا دے۔" (محبت و شفقت میں تو کلام نہیں۔ لیکن دعا پیار کی آڑ معلوم ہوتی ہے۔ للمؤلف برنی) خاکسار شوق محمد۔ (اخبار الفضل قادیان ج 26 نمبر 59 ص 3 مورخہ 13 مارچ 1938ء)

-3 "مجھے یاد ہے، میرا ایک دوست تھا، بچپن میں ایک دفعہ ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے بیٹھے تھے کہ حضرت خلیفہ اوّل نے دیکھا۔ میری تو آپ بہت عزت کیا کرتے تھے، اس لیے مجھے تو کچھ نہ کہا، لیکن اس کو اس قدر ڈانٹا کہ مجھے بھی سبق حاصل ہو گیا۔" (حکیم قادیانی کی نظر واقعی تیز تھی اور محبت میں نظر تیز ہی رہتی ہے۔ پھر تعلیم و تربیت کا بھی سوال تھا۔ للمؤلف برنی)

(میاں محمود احمد قادیانی خلیفۂ قادیان کا ارشاد مندرجہ اخبار الفضل قادیان ج 27 نمبر 58 ص 7 مورخہ 11 مارچ 1939ء)

بچپن اور لڑکپن تو بہرحال حکیم نورالدین قادیانی خلیفہ اوّل کی محبّت، شفقت، نگرانی اور تعلیم وتربیت میں گزرا، اور خوب گزرا کہ میاں قادیانی، حکیم قادیانی کے بہت پیارے تھے۔ لیکن بعد میں طبیعت کا جو رنگ ابھرا اور جو روایات غلط یا صحیح پھیلیں، ان سے حکیم قادیانی کا اخلاقی اثر توقع کے برعکس ظاہر ہوتا ہے۔ مشتے نمونہ از خروارے، چند روایتیں پیش ہیں۔ لیکن جب تک تحقیق کامل اور ثبوت محکم نہ ہو، ایسی روایتیں قابلِ اعتبار کم ہوتی ہیں، بلکہ وہ بغض وعناد کی ایجاد ہوسکتی ہیں، یا مغالطہ ومبالغہ ہوسکتی ہیں۔ غرض کہ خواہ مخواہ ان پر یقین نہیں ہوسکتا۔ البتہ آثار وقرائن سے قیاس کو مدد مل سکتی ہے۔ بہرحال چند روایات ملاحظہ ہوں:

-1 ''بڑا الزام یہ لگایا جاتا ہے کہ خلیفہ (میاں محمود احمد قادیانی) عیاش ہے۔ اس کے متعلق میں کہتا ہوں۔ میں ڈاکٹر ہوں اور میں جانتا ہوں کہ وہ لوگ جو چند دن بھی عیاشی میں پڑ جائیں وہ وہ ہو جاتے ہیں جسے انگریزی میں ریک (Wreck) کہتے ہیں۔ ایسے انسان کا نہ دل دماغ کام کا رہتا ہے، نہ عقل درست رہتی ہے، نہ حرکات صحیح طور پر کرتا ہے۔ غرض سب قویٰ اس کے برباد ہو جاتے ہیں اور سر سے لے کر پیر تک اس پر نظر ڈالنے سے فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ عیاشی میں پڑ کر اپنے آپ کو برباد کر چکا ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں الزنا یخرج البناء کہ زنا انسان کو بنیاد سے نکال دیتا ہے، مگر ہمارا خلیفہ نعوذ باللہ اگر عیاش ہوتا تو وہ اولوالعزمی، وہ بلند ہمتی، وہ دانشمندی وہ فہم وفراست، وہ ذکاوت، وہ تدبر جو آپ کو عدیم المثال طور پر حاصل ہے، حاصل ہوسکتا ہے؟''

(میر محمد اسمٰعیل کی تقریر مندرجہ اخبار الفضل قادیان ج25 نمبر 158 ص6 مورخہ 10 جولائی 1937ء)

-2 ''مکرم ومعظم جناب میاں صاحب، خلیفہ جماعت قادیان! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ میرے کانوں نے احمدیہ بلڈنگس (لاہور) میں آپ کے متعلق ایک ایسی بات سنی ہے جس نے میرے وجود میں ایک لرزہ ڈال دیا ہے اور وہ ایسی خطرناک بات ہے کہ جسے میں چھپا نہیں سکتا۔ اگر وہ صحیح ہے تو آپ کے لیے زلزلہ نمونۂ قیامت ہے۔ اور اگر غلط ہے تو اس بات کے پروپیگنڈا کرنے والے پر آسمان سے غضب کا زلزلہ وارد ہوگا......

چنانچہ اس غرض کے لیے میں یہ خط آپ کو بھیج رہا ہوں، اور اب وہ بات لکھتا ہوں جو میں نے اپنے کانوں منہ در منہ سنی ہے:

''کچھ عرصہ ہوا کہ ڈاکٹر اللہ بخش صاحب لاہوری احمدی اور مولوی آفتاب الدین مسلم مشنری ووکنگ قادیان گئے تھے، انھوں نے وہاں آپ سے ملاقات کا انتظام کیا۔ آپ

نے ان کو دو تین گھنٹہ کے وقفہ سے ملاقات کا موقع دیا۔ مجھے اس ملاقات کے متعلق میرے دفتر میں پہلے چودھری محمد سعید صاحب بھٹہ اوورسیر نے اور پھر مولوی آفتاب الدین صاحب نے یہ سنایا کہ ڈاکٹر اللہ بخش صاحب نے اپنی ڈاکٹری سے دورانِ ملاقات میں یقینی طور پر یہ اندازہ کیا کہ آپ نے شراب پی ہوئی تھی۔ اس لیے آپ نے دو تین گھنٹہ کا وقفہ لیا (یہ کوئی دلیل نہ ہوئی للمؤلف برنی) اور پھر آپ نے جو خوشبوئیں لگا کر ملاقات کی، انھوں نے آپ کے منہ سے شراب کی بو کو بہر حال محسوس کر لیا۔ مجھے اسی طرح دو گواہوں نے یہ بات سنائی اور سنانے والوں نے اپنے حلقہ میں، مجھے خیال ہے کہ دور دور تک اسے پھیلا دیا ہے۔" (الزام شدید ہے، تحقیق مقدم ہے۔ للمؤلف برنی)

(شیخ غلام محمد قادیانی کا مکتوب مندرجہ رسالہ تصنیفات محمد یہ ج یازدہم ص 9 مطبوعہ لاہور)

-3 "شبنم صاحب! آپ کا خط محررہ 37-8-7 مجھے مل گیا ہے...... دوسرا امر آپ کے خط میں حضرت امیر المومنین خلیفۃ المسیح الثانی (میاں محمود احمد قادیانی خلیفۂ قادیان) کے خاندان کے متعلق اتہامات ہیں۔ آپ نے بڑی دیدہ دلیری سے بغیر شرعی ثبوت کے اور بغیر عینی شاہد ہونے کے ایسی فحش باتیں خط میں تحریر کی ہیں کہ جن کی اشاعت آپ کو مروجہ قانون کی رو سے مجرم بناتی ہے۔ یہ محض حضرت امیر المومنین (مرزا محمود) کی فراخ حوصلگی ہے کہ آپ ازالہ حیثیت عرفی کے جرم کے مرتکب ہوتے ہوئے بھی اس کی سزا سے بچے ہوئے ہیں۔ ہم آپ کے خط میں مندرجہ امور سب غلط اور نتیجۂ عناد سمجھتے ہیں۔"

(محمد صادق صاحب شبنم قادیانی کے خط کا جواب منجانب مرزا محمد علی بیگ قادیانی

مندرجہ اخبار الفضل قادیان ج 25 نمبر 223 ص 4-5 مورخہ 25 ستمبر 1937ء)

-4 "نیز میں خدا کی قسم کھا کر یہ بھی لکھتا ہوں کہ اس نے (یعنی میاں فخر الدین ملتانی قادیانی نے) ایک دن اپنے مکان کے پاس کھڑے ہو کر یہ کہا تھا کہ تحریکِ جدید (کے بورڈنگ) کا ایک فائدہ ضرور ہوا ہے کہ پہلے تو لڑکوں کو تلاش کرنا پڑتا تھا، اور اب (لڑکے) جمع شدہ مل جاتے ہیں۔ اس جگہ اس کا مفہوم نہایت ہی گندہ تھا اور حضور (میاں محمود احمد قادیانی خلیفۂ قادیان) پر کمینہ حملہ تھا۔"

(مہاشہ محمد عمر قادیانی کا حلفیہ بیان مندرجہ اخبار الفضل قادیان ج 25 نمبر 165 ص 21 مورخہ 18 جولائی 1937ء)

-5 "اس شہادت میں ایک اور بات بھی بیان کی گئی ہے جو تحریکِ جدید کے بورڈنگ کے متعلق ہے، اور اس تحریکِ جدید کے وقف کنندگان کے متعلق ہے۔ اس میں جس قدر

شرمناک حملہ مجھ پر کیا گیا، وہ میں نہیں سمجھتا کہ احراریوں کے حملوں سے یا دوسرے دشمنانِ سلسلہ کے حملوں سے کم ہو۔ اگر ایسے لوگ احمدیت میں رہ سکتے ہوں تو میں سمجھتا ہوں کہ خلافت اور نظام سلسلہ سے بدتر اور بے معنی لفظ دنیا میں کوئی نہیں ہوسکتا۔ اس سے یہ بہتر ہوگا کہ جماعت بے خلافت رہے تاکہ لوگوں کو ایسے بے معنی نظام پر ہنسی اڑانے کا موقع تو نہ ملے۔"

(میاں محمود احمد قادیانی خلیفۂ قادیان کی تقریر مندرجہ اخبار الفضل قادیان ج 25 نمبر 165 ص 21 مورخہ 18 جولائی 1937ء)

6- "پھر جماعت میں بدی اور بے حیائی کی باتوں کا چرچا کر کے فحش کی اشاعت کی جاتی ہے، اور گندی باتیں کر کر کے کمزور طبیعت لوگوں میں گندے جذبات کو ابھارا جا رہا ہے...... اور ثبوت پوچھو تو سوائے اس کے کچھ پیش نہیں کر سکتے کہ فلاں مرد یہ کہتا ہے (مرد بھلا کیا گواہی دے سکتا ہے۔ للمؤلف برنی) اور فلاں عورت یہ سناتی ہے، اور فلاں لڑکا یہ گواہی دیتا ہے۔ لا حول و لا قوۃ الا باللہ! کیا معصوم لوگوں (مثلاً خلیفۂ قادیان، للمؤلف برنی) کے چال چلن کی اتنی ہی قیمت رہ گئی ہے کہ زید و بکر کی بیہودہ بکواس سے انھیں داغدار کرنے کی کوشش کی جائے۔ کیا اس شخص کا کریکٹر جس کے ہاتھ میں آپ نے چہارم صدی تک (مراد چوتھائی صدی معلوم ہوتی ہے، یعنی 25 سال، للمؤلف برنی) اپنا بیعت کا ہاتھ دے رکھا ہے، اس معیار پر تولنے کے قابل ہے کہ آوارہ مزاج اور آزاد منش نوجوان اس کے متعلق کیا کہتے ہیں۔ افسوس، صد افسوس! اتنا بھی نہیں سوچا گیا کہ یہ شہادت دینے والے کس قماش کے لوگ ہیں۔ (ایسی شہادت تو اسی قماش کے لوگ دے سکتے ہیں کہ خود مبتلا رہتے ہیں۔ للمؤلف برنی) اور جس کے متعلق شہادت دی جا رہی ہے وہ کس پوزیشن کا انسان ہے۔" (یعنی خلیفۂ قادیان ہے اور اس پر خلقت حیران ہے۔ للمؤلف برنی)

(صاحبزادہ بشیر احمد قادیانی برادر خلیفۂ قادیان کا بیان مندرجہ اخبار الفضل قادیان ج 25 نمبر 197 ص 6 مورخہ 25 اگست 1937ء)

7- مندرجہ ذیل اقتباسات کا جامع حوالہ سب سے آخر میں درج ہے، یعنی مولوی محمد علی قادیانی امیر جماعتِ لاہور کا رسالہ):

"پھر کیا کبھی آپ حضرات نے یہ بھی غور فرمایا کہ ہم نے کون سا قصور کیا، جس کی پاداش میں ہمیں ان انسانیت سوز مظالم کا تختۂ مشق بنایا جا رہا ہے، جن کے سننے سے بھی ایک شریف انسان

کی روح کانپ اٹھتی ہے اور بدن میں کپکپی پیدا ہوتی ہے...... کیا ہمارا صرف یہی قصور نہیں کہ ہم نے خلیفہ صاحب کی ذات میں ایسے نقائص دیکھے جن کی موجودگی میں کوئی شخص خلیفہ چھوڑ احمدی بھی نہیں کہلا سکتا۔ پس ہم نے حضرت سعدؓ کی طرح جرأت ایمانی سے کام لے کر خدا اور اس کے رسول کے احکام پر عمل پیرا ہو کر اپنے اور اپنے بال بچوں کے آرام کو قربان کرتے ہوئے ہر قسم کی تکالیف و مصائب اٹھاتے ہوئے خلیفہ صاحب کو ان نقائص کی طرف توجہ دلائی اور ہر رنگ میں فیصلہ کے لیے آمادگی ظاہر کی، چنانچہ میرے ایک خط کے جواب میں خلیفہ صاحب فرماتے ہیں۔ (جو ذیل میں ملاحظہ ہو۔للمؤلف برنی)

''مذکورہ بالا خط میں یہ بھی لکھا ہے کہ اگر کوئی آزاد کمیشن بیٹھے تو اس کے سامنے میرے (یعنی خلیفۂ قادیان کے للمؤلف برنی) خلاف لڑکوں، لڑکیوں اور عورتوں کی گواہیاں وہ دلوا دیں گے۔ (جب لڑکے لڑکیاں، عورتیں، گواہ بنیں تو الزامیت کی نوعیت ظاہر ہے۔للمؤلف برنی) بلکہ خود میری گواہی بھی وہ دلوا دیں گے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں میری اپنی گواہی سے لکھنے والے کی مراد شاید یہ ہے کہ وہ کوئی میری تحریر پیش کرنا چاہتے ہیں۔ واللہ اعلم اور کوئی معنی اس فقرہ کے میرے ذہن میں نہیں آئے۔ (ممکن ہے خدانخواستہ یہی معنی ہوں۔ واللہ اعلم۔للمؤلف برنی) مگر ایسا ہو تو بھی خلفائے سابق سے میری ایک اور بھی مماثلت ثابت ہوگی۔ (اپنے عیوب اکابر کے سر تھوپنا خاص قادیانی سنت ہے۔ مرزا قادیانی بھی اپنی خامیاں انبیاء پر چسپاں کرنے کی کوشش کرتے تھے، گویا ہم تو ڈوبے ہیں مگر ان کو بھی لے ڈوبیں گے، نعوذ باللہ، للمؤلف برنی)

(اخبار الفضل قادیان ج 25 نمبر 271 ص 12 مورخہ 20 نومبر 1937ء)

''حالانکہ میں نے اپنے خط میں یہ لکھا تھا کہ لوگوں سے سنا ہے کہ جناب چار گواہوں کا مطالبہ فرماتے ہیں۔ اگرچہ ہم سے تو آپ نے یہ بھی نہیں فرمایا، تاہم اگر یہ بات درست ہے تو پھر آپ اسی کے لیے تیاری فرمالیں، ہم صرف چار ہی نہیں بلکہ بہت سی شہادتیں علاوہ عورتوں، لڑکیوں اور لڑکوں کی شہادت کے خود جناب والا کی اپنی شہادت بھی پیش کر دیں گے۔ اگر ہم ثبوت نہ پیش کر سکیں تو آپ کی بریت ہو جائے گی اور ہم ہمیشہ کے لیے ذلیل ہونے کے علاوہ ہر قسم کی سزا بھگتنے کے لیے بھی تیار ہیں۔'' (واقعی چیلنج بہت زوردار ہے، گویا کہ بالکل صحیح ہے۔للمؤلف برنی)

(حکیم عبدالعزیز قادیانی سیکرٹری انجمن انصار احمدیہ کا رسالہ نمبر 3 بعنوان ''خلیفۂ قادیان کا بائیکاٹ و مقاطعہ'')

''الزام کے الفاظ جو خلیفۂ قادیانی اپنے اخبار الفضل (قادیان) میں خود شائع کرا چکے ہیں، حسب ذیل ہیں، اور وہ بحوالہ شیخ عبدالرحمٰن مصری قادیانی فیصلۂ عدالت العالیہ ہائیکورٹ لاہور

میں بھی درج ہیں:

''موجودہ خلیفہ (میاں محمود احمد قادیانی خلیفۂ قادیان) سخت بدچلن ہے۔ یہ تقدیس کے پردہ میں عورتوں کا شکار کھیلتا ہے اس کام کے لیے اس نے بعض مردوں اور بعض عورتوں کو بطور ایجنٹ رکھا ہوا ہے۔ ان کے ذریعہ یہ معصوم لڑکوں اور لڑکیوں کو قابو میں کرتا ہے۔ اس نے ایک سوسائٹی بنائی ہوئی ہے جس میں مرد اور عورتیں شامل ہیں اور اس سوسائٹی میں زنا ہوتا ہے۔''

(الفضل قادیان ج 26 نمبر 272 ص 2 مورخہ 25 نومبر 1938ء)

شاید مخالف یہ کہیں کہ ۔

نہاں کے ماند آں رازے کز وسازند محفلہا

یا یہ کہیں کہ ۔

تا نہ باشد چیز کے مردم نہ گویند چیز ہا

تاہم الزامات بہت سنگین ہیں۔ کافی تحقیق اور ثبوت کے بغیر قابل تسلیم نہیں ہیں۔ واللہ اعلم للمؤلف)

(محمد علی امیر جماعتِ لاہور کا رسالہ بعنوان ''میاں محمود احمد پر ان کے مریدین کے الزامات'' مورخہ 9 دسمبر 1938ء)

چال چلن کے الزامات کی اصلیت جو کچھ بھی ہو، واللہ اعلم تاہم میاں قادیانی خلیفۂ قادیان کی طبیعت تجسس پسند ضرور ہے۔ خواہ تجسس ان کے حق میں حدِ مناسب سے بھی تجاوز کر جائے۔ چنانچہ فرانس میں بہ مقام پیرس برہنہ عورتوں کی جو سیر کی گئی، وہ بہت پُر لطف ہے کہ خود میاں قادیانی کا بیان بھی اس میں شریک ہے، چنانچہ ملاحظہ ہو:

''سیدنا وامامنا حضرت اقدس امیر المومنین المصلح الموعود خلیفۃ المسیح الثانی''

''السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ''

حضور بعض بدباطن اور خبیث فطرت غیر احمدی مناظرہ میں یہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ تمہارے خلیفہ صاحب چودھری ظفر اللہ خاں صاحب کو ساتھ لے کر پیرس میں ننگی میموں کا ناچ دیکھنے کے لیے گئے۔ مندرجہ ذیل حوالہ وہ تائید میں پیش کرتے ہیں:

''جب میں (میاں محمود احمد قادیانی خلیفۂ قادیان) ولایت گیا تو مجھے خصوصیت سے خیال تھا کہ یورپین سوسائٹی کا عیب والا حصہ بھی دیکھوں، (یہ خیال تھا بھی خصوصیت کے لائق للمؤلف برنی) مگر قیام انگلستان کے دوران میں مجھے اس کا موقع نہ ملا۔ (موقع کیونکر ملتا کہ وہاں کسی قدر تعارف حاصل تھا للمؤلف برنی) واپسی پر جب ہم فرانس آئے تو میں نے چوہدری ظفر اللہ خان

صاحب سے، جو میرے ساتھ تھے، کہا کہ مجھے کوئی ایسی جگہ دکھائیں جہاں یورپین سوسائٹی عریانی سے نظر آئے (پیرس کا انتخاب بھی بہتر تھا کہ وہاں سوسائٹی خوب عریاں نظر آتی ہے۔ چنانچہ اس خصوصیت کو شہرتِ عامہ حاصل ہے اور میاں صاحب کو مشاہدہ سے اس کی تصدیق ہو گئی۔ للمؤلف برنی) وہ (چوہدری ظفر اللہ خان صاحب) بھی فرانس سے واقف تو نہ تھے۔ (معلوم ہوتا ہے کہ چوہدری صاحب کو کافی مواقع حاصل ہونے کے باوجود میاں صاحب کی طرح سوسائٹی کی عریانی دیکھنے کا خیال کبھی خصوصیت سے پیدا نہ ہوا تھا۔ للمؤلف برنی) مگر مجھے اوپیرا میں لے گئے، جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ اوپیرا سینما کو کہتے ہیں۔ چوہدری صاحب نے بتایا کہ یہ اعلیٰ سوسائٹی کی جگہ ہے، جسے دیکھ کر آپ اندازہ کر سکتے ہیں۔ میری نظر چونکہ کمزور ہے، اس لیے دور کی چیز اچھی طرح نہیں دیکھ سکتا۔ (لیکن بہرصورت میاں صاحب کی دور بینی مسلم ہے۔ للمؤلف برنی) تھوڑی دیر کے بعد میں نے جو دیکھا تو ایسا معلوم ہوا کہ سینکڑوں عورتیں بیٹھی ہیں۔ میں نے چوہدری صاحب سے کہا کہ کیا یہ ننگی ہیں؟ انھوں نے بتایا یہ ننگی نہیں ہیں، بلکہ کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ مگر باوجود اس کے وہ ننگی معلوم ہوتی تھیں۔'' (جب عورتیں ننگی معلوم ہوں، خواہ تصور ہی سہی تو مشاہدہ کافی ہے۔ نظر کمزور ہونے یا تن پر کپڑا ہونے میں کیا مضائقہ ہے۔ مقصد تو حاصل ہو گیا کہ یورپین سوسائٹی کی عریانی نظر آئی۔ للمؤلف برنی) (اخبار الفضل قادیان مورخہ 28 جنوری 1934ء)

''حضور ہم مخالفین کو بتاتے ہیں کہ اس حوالہ میں یورپین سوسائٹی کی عریانی کا ذکر ہے۔ ننگی میموں کے ناچ کا ذکر نہیں۔ حضور کا منشاء یہ نہ تھا، جو تم اپنی اندرونی تصویر کے مطابق پیش کرتے ہو۔ حضور کو جب یہ محسوس ہوا کہ وہ اس قدر باریک لباس پہنے ہوئے ہیں۔ تو حضور اسے ناپسند کر کے اٹھ کر چلے آئے۔ (چلے کیوں نہ آتے، جانے کا مقصد ہی یہ تھا کہ سوسائٹی کی عریانی دیکھیں۔ للمؤلف برنی) مگر وہ اسے تسلیم نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ یہ تمہارا اپنا خیال ہے، وہ سینما میں پورا شو دیکھ کر اٹھے تھے۔ حضور! اگر ازراہِ نوازش اس واقعہ پر کسی وقت مجلس علم و عرفان میں روشنی ڈال دیں تو مخالفین کو اس اعتراض کا جواب دینے میں انشاء اللہ مدد ملے گی...... یہ سوال جب خاکسار نے حضور کی خدمت میں پیش کیا تو حضور نے اس وقت اپنے قلم سے مندرجہ ذیل جواب تحریر فرمایا:

جواب: یہ درست نہیں کہ میں اٹھ کر آ گیا، میں تو اسی بات کو دیکھنے کے لیے گیا تھا۔ باقی وہ عورتیں ننگی نہ تھیں، بلکہ ان کے چست لباس سے بوجہ نظر کی کمزوری کے میں نے خیال کیا کہ وہ ننگی ہیں۔ (نظر کی عجب کمزوری تھی کہ لباس کے باوجود عورتیں ننگی نظر آئیں۔ پھر میاں صاحب نے خیال بھی یہی کیا کہ وہ ننگی ہیں۔ غرضیکہ عریانی کا تصور بہت غالب تھا۔ اور نظر تیز بھی ہوتی تو کیا فائدہ۔

عریانی ایسی بے تکلف نظر نہ آتی، بلکہ چوہدری صاحب کی طرح کپڑے بھی نظر آتے۔ مشاہدہ کا لطف مکدر ہو جاتا۔ یعنی سوسائٹی اس درجہ عریاں نظر نہ آتی کہ گویا عورتیں بلا لباس ننگی معلوم ہوں۔ للمؤلف برنی) یہ تو تماشائی عورتوں کا ذکر ہے۔ جو ایک طرف گیلری میں تھیں۔ ممکن ہے میری ان پر نظر ہی نہ پڑتی۔ اس قسم کے لباس کی عورتیں صبح اور شام مال (یعنی لاہور کی مشہور سڑک) پر دوڑتی پھرتی ہیں (یہ مبالغہ تو ہندوستانی مستورات پر بڑا ظلم ہے۔ للمؤلف برنی) اس پر اعتراض اور تعجب کی کونسی بات ہے۔ لباس کا نیا فیشن جنگ کے بعد ہی تھا۔ بوجہ اس سے ناواقفیت کے میں نے دھوکا کھایا اور اب ہندوستان میں بھی یہی ہے۔ میں نے تو یہ نہیں لکھا کہ گانے والے لوگ ننگے تھے وہ سینما نہ تھا بلکہ ورائٹی شو تھا، جس میں بعض خاص ماہر گاتے ہیں یا بعض ہتھکنڈے دکھاتے ہیں۔ مگر وہ سب لوگ لباسوں میں تھے۔ صرف سوسائٹی کی عورتیں ایسے تنگ اور چست لباس میں تھیں۔ جیسا کہ اب ہر شہر اور ہر ملک میں ہے۔ میں نے اس وقت ناواقفی اور عینک نہ ہونے کی وجہ سے انہیں ننگا سمجھا۔ (عینک بھی عادت کے باوجود اچھے وقت غائب ہوئی کہ سوسائٹی کی عریانی بھی نظر آ گئی اور عذر بھی ہاتھ آ گیا۔ یک کرشمہ دو کار۔ للمؤلف برنی) پہلے معترض مال روڈ پر چلنا ترک کر دے۔" (جہاں گویا لباس پہن کر عورتیں کمزور نظروں میں ننگی معلوم ہوتی ہیں۔ جواب میں بناوٹ، گریز، مبالغہ اور جھنجلاہٹ صاف ظاہر ہے، لیکن کیا کیا جائے اور کوئی مفر بھی نہیں۔ للمؤلف برنی)

(سوال جواب مندرجہ اخبار الفضل قادیان ج 34 نمبر 156 ص 3 مورخہ 5 جولائی 1946ء)

خلیفۂ قادیان کے عجب عجب خواب

میاں بشیر الدین محمود احمد قادیانی خلیفۂ قادیان چونکہ روحانیت میں اعلیٰ مقام پر فائز سمجھے جاتے ہیں، عجیب عجیب باتیں سوجھنے کے سوا ان کو خواب بھی عجب عجب نظر آتے ہیں۔ چنانچہ ذیل میں چند نمونے درج ہیں۔ ایک الہام مرزا قادیانی کا اپنے متعلق، دو خواب خود خلیفۂ قادیانی کے اپنے متعلق اور ایک خواب ان کے معزز آنریبل چوہدری سر محمد ظفر اللہ خاں بالقابہ کے متعلق، چنانچہ ملاحظہ ہو:

میاں بشیر الدین محمود احمد قادیانی خلیفۂ قادیان نے مندرجہ ذیل رؤیا اور کشف اپنے قلم سے لکھ کر بھیجا جو اخبار الفضل قادیان میں شائع ہوا۔

1- "ایک رات میں نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ کو مخاطب کر کے شدید محبت اور عشق کے جذبہ کے ماتحت کہ اس کی نظیر نہیں ملتی مخاطب ہو کر کہہ رہا ہوں کہ "اے میرے رب! تو مجھے اپنی گود میں اٹھا لے، اور اپنی برکتوں سے مجھے چاروں طرف سے ڈھانپ لے۔ یہ دعا اللہ تعالیٰ کو مخاطب کر کے بار بار کر رہا ہوں کہ آنکھ کھل گئی اور اوپر کے الفاظ الہاماً بھی

زبان پر جاری تھے۔'' (میاں صاحب کی دعا کہ مجھے اپنی گود میں اٹھالے، بچپن کے شوق کی نفسیاتی یادداشت معلوم ہوتی ہے کہ آپ اس زمانہ میں اردگرد کے سب لوگوں کو بہت عزیز تھے اور خاص کر حکیم نورالدین قادیانی خلیفۂ اوّل تو حد درجہ محبت کرتے تھے۔ بہرحال جذبۂ محبت کا تقاضا کہ گود میں اٹھالیا جائے، خواب میں، بیداری کا کوئی نفسیاتی عکس معلوم ہوتا ہے۔ خواب میں بھی اکثر یا کبھی کبھی دل کے قدیم یا جدید جذبات منعکس ہو جاتے ہیں، جو خواب دیکھنے والے کی نفسیات کے آئینہ دار ہوتے ہیں، جیسا کہ زیر بحث خواب میں میاں قادیانی اپنے تقرب اور بے تکلفی کا اظہار فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی گود میں جانا چاہتے تھے۔ للمؤلف برنی)

(میاں محمود احمد کا خواب رقم فرمودہ خود مندرجہ اخبار الفضل قادیان ج 33 نمبر 188 ص 1 مورخہ 11 اگست 1945ء)

2- ''اللہ تعالیٰ حضرت مسیح موعود کو فرماتا ہے یاشمس یا قمر! اے سورج، اے چاند۔ سورج کی خاصیت یہ ہے کہ وہ چاند کو روشنی دیتا ہے، اور چاند کی خاصیت یہ ہے کہ وہ سورج سے روشنی لیتا ہے گویا اس میں اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح موعود کو سورج کہا اور خود چاند بنا۔ اسی طرح عورت مرد سے نطفہ لیتی ہے اور مرد نطفہ دیتا ہے سورج کا قائم مقام مرد ہے، اور چاند کا قائم مقام عورت ہے۔ اس وقت بھی لوگوں نے حضرت مسیح موعود پر اعتراض کیا کہ خود سورج بنے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو چاند بنایا ہے (اس اینچ پیچ کا منشاء صاف ظاہر ہے۔ نعوذ باللہ! علیٰ ہذا ایک موقع پر مرزا قادیانی اس کے برعکس عمل اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے اوپر محسوس کر چکے ہیں۔ چنانچہ اسی کتاب (قادیانی مذہب) میں دوسری جگہ اس کا ذکر سورج ہے، للمؤلف برنی) اور اب بھی لوگ اعتراض کر سکتے ہیں (میں نے) اللہ تعالیٰ کو عورت دیکھا۔'' (الفضل 20 مارچ 1947ء ص 2)

3- ''آخر ایک ایسی جگہ میں پہنچا ہوں جہاں ایک میدان ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہاں ایک باغ ہے جس میں میرا مکان ہے۔ میرے پیچھے پیچھے وہ عورت بھی وہاں پہنچ گئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ جنت میں میرے ساتھ رہنے کے لیے آئی ہے۔ وہ بہت ہی خوبصورت عورت ہے، میں اس کی ٹھوڑی پکڑ کر کہتا ہوں کہ کیا تم بھی میرے ساتھ جنت میں رہوگی، اس نے کہا ہاں میں آپ کے ساتھ جنت میں رہوں گی۔ میں نے اسے کہا کہ تمھیں میری بیویوں کے ساتھ رہنا پڑے گا۔'' (رہنا پڑے گا؟ للمؤلف برنی) وہ کچھ حیرت ظاہر کرتی ہے کہ بیویوں کے ساتھ!! مگر اس نے انکار نہیں کیا، اس وقت ایک دم

میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ یہ خوبصورت عورت اللہ تعالیٰ ہے اور اللہ تعالیٰ میرے ساتھ جنت میں رہے گا۔ اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔'' (خواب کے بیان کا اقتباس)

(میاں بشیرالدین محمود احمد کا خواب مندرجہ اخبار الفضل قادیان ج 35 نمبر 67 ص 2 مورخہ 20 مارچ 1947ء)

4- ''دوسرا یا تیسرا ہفتہ فروری 1946ء کا تھا کہ میں نے رؤیا میں دیکھا کہ میں مسجد مبارک میں ہوں اور محراب میں بیٹھا ہوں۔ چوہدری سر ظفر اللہ خاں بھی میرے پاس ہیں، کچھ مقتدی بھی ہیں، ان میں چوہدری صاحب کے ماموں چوہدری عبداللہ خان صاحب مرحوم و مغفور بھی بیٹھے ہیں۔ چوہدری صاحب سے ایک ناپسندیدہ حرکت ہوئی، جس پر میں جلدی سے نماز کے لیے کھڑا ہو گیا کہ لوگوں کی توجہ اس طرف سے ہٹ گئی (معلوم ہوتا ہے کہ وہ ناپسندیدہ حرکت ناقابلِ دید تھی۔ للمؤلف برنی) مگر چوہدری عبداللہ خاں صاحب مرحوم نے ان کو اپنے زمیندارہ طریق پر جیسا کہ ان کی عادت تھی، ایک طنز آمیز لہجہ میں تادیب کی اتنے میں میں نے نماز شروع کر دی۔ چوہدری صاحب اس وقت مسجد سے چلے گئے (عجب بےلطفی ہوگئی۔ للمؤلف برنی)

میں نماز پڑھ کر گھر آ گیا کہ وہ واپس آ گئے۔ اور میں نے انھیں کہا کہ آپ نماز پڑھ لیں، انھوں نے مسجد میں نماز شروع کر دی، اس وقت میں نے گھر سے جھانک کر دیکھا تو وہ نماز پڑھ رہے تھے۔ مگر منہ مشرق کی طرف تھا (گویا قبلہ کی طرف پشت تھی۔ للمؤلف برنی) رکوع کی حالت میں میں نے انھیں دیکھا۔ اور ان کے پہلو میں ان کی سالی زہرہ بیگم بھی نماز میں شامل تھیں، میں نے اسی وقت دیکھا کہ دونوں نے جوتیاں پہنی ہوئی ہیں جو دہلی کی طرف کے طلائی کام والی خوبصورت جوتیاں ہیں۔ ان کی خوبصورتی نہایت نمایاں ہے، اس کے بعد میں نے دیکھا کہ خواب میں ہی چوہدری صاحب کو میں یہ خواب سناتا ہوں، اور کہتا ہوں کہ خواب اچھا ہے۔ یعنی انجام اچھا ہو گیا۔'' (تو واقعی خواب میں بڑی جدت اور بشارت ہے۔ للمؤلف برنی)

(میاں محمود احمد کا خواب رقم فرمودہ خود مندرجہ اخبار الفضل قادیان ج 34 نمبر 58 ص 2 مورخہ 9 مارچ 1946ء)

قادیان کی آبادی اور بربادی

مرزا قادیانی کو بشارت ہوئی تھی کہ قادیانیت کی برکت سے قادیان کو بڑا فروغ حاصل ہوگا۔ وہ ایک بہت وسیع، خوشحال اور پُررونق شہر بن جائے گا۔ لیکن فی الحال ایسا ویران ہوا کہ بہت سے قادیانی بلکہ خود خلیفۂ قادیان مع اہل و عیال وہاں سے رخصت ہو گئے۔ اوّل لاہور میں نازل ہوئے اور اب ایک قادیانی آبادی ربوہ کے نام سے بسائی جا رہی ہے، جس کی تفصیل آئندہ بیان ہو

گی۔ ذیل میں قادیان کے متعلق مختصر کیفیت ملاحظہ طلب ہے:

1- ''اس زمانہ میں خدا تعالیٰ نے حضرت مسیح موعود (مرزا قادیانی) کو خبر دی کہ میں تیرے ذریعہ قادیان کو بڑھانے اور ترقی دینے والا ہوں۔ حضرت مسیح موعود (مرزا قادیانی) نے کشف میں دیکھا کہ ''قادیان ایک عظیم الشان شہر بن گیا ہے اور انتہائی نظر سے بھی پرے تک بازار نکل گئے۔ اونچی اونچی دو منزلی یا چومنزلی یا اس سے بھی زیادہ اونچے اونچے چبوتروں والی دوکانیں عمدہ عمارت کی بنی ہوئی ہیں۔ اور موٹے موٹے سیٹھ بڑے بڑے پیٹ والے جن سے بازار کو رونق ہوتی ہے۔ بیٹھے ہیں اور ان کے آگے جواہرات اور لعل اور موتیوں اور ہیروں اور روپیوں اور اشرفیوں کے ڈھیر لگ رہے ہیں اور قسما قسم کی دوکانیں خوبصورت اسباب سے جگمگا رہی ہیں، یکہ، بگھیاں، ٹم ٹم، فٹن، پالکیاں، گھوڑے، شکر میں اس قدر بازار میں آتے جاتے ہیں کہ مونڈھے سے مونڈھا بھڑ کر چلتا ہے اور راستہ بمشکل ملتا ہے۔'' (کتاب تذکرہ ص 419 طبع سوم)

(مرزا قادیانی کے زمانہ میں موٹروں، لاریوں اور ہوائی جہازوں کا رواج نہ تھا، ورنہ کہیں مرزا قادیانی ان کو دیکھ پاتے تو وہ بھی ضرور کشف میں نظر آتے۔ افسوس ہے اس کمی کے سبب سے قادیان انتہائی ترقی کرنے کے بعد بھی پرانا ہی شہر رہے گا کہ لوگ پالکیوں میں بیٹھ کر پھریں گے اور شکر میں چلائیں گے جن سے راستے رکیں گے۔ کم از کم سائیکلیں ہوتیں۔ کچھ تو کام چلتا۔ مگر وہ بھی مرزا قادیانی کے خیال اور کشف میں نہیں آئیں۔ للمؤلف برنی)

''نیز آپ کو بتایا گیا کہ قادیان بڑھتے بڑھتے بیاس دریا تک پہنچ جائے گا۔ یہ ایسی نرالی پیش گوئی ہے جس کی موجودہ زمانے میں کوئی مثال پیش نہیں کر سکتا۔ اس کی ایک ہی مثال ہے جو پہلے زمانے کی ہے اور وہ رسول کریم ﷺ کے ذریعہ مدینہ کی ترقی ہے پھر اس سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذریعہ مکہ کی وادی کا بڑھنا ہے جو غیر ذی زرع تھی۔ ان دو کے سوا اور کوئی مثال نہیں ملتی۔'' (جبکہ قادیان کو نبی کا تخت گاہ بنا کر مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی صف میں رکھا جائے تو طبعاً یہی دو مثالیں سوجھیں گی اور سوجھیں۔ منشاء یہ کہ حرمین شریفین سے مشابہت، بلکہ مساوات لوگوں کے دلوں میں بیٹھے لیکن عجب نہیں کہ قادیان کا بھی وہی حشر ہو جو جھوٹے مدعیان نبوت کی بستیوں کا ہوتا رہا ہے۔

تاریخ شاہد ہے۔ چنانچہ کچھ آثار نمودار معلوم ہوتے ہیں۔للمؤلف برنی)

(میاں محمود احمد قادیانی خلیفۂ قادیان کا ارشاد قادیان کی غیر معمولی ترقی کے متعلق
مندرجہ اخبار الفضل قادیان نمبر 156 ج 34 ص 1 مورخہ 5 جولائی 1946ء)

-2 ''26 مئی 1908ء منگل کا دن تھا، آسمانِ قادیان پرغم و آلام کے بادل چھائے ہیں (اسی دن مرزا قادیانی کا لاہور میں انتقال ہوا۔للمؤلف برنی) یہاں تک کہ قریباً چالیس سال کا لمبا عرصہ گزر گیا اور اگست 1947ء آیا۔ سرزمین ہندوستان دو حصوں میں تقسیم کر دی گئی۔ یقین تھا کہ قادیان مسلم اکثریت کے ضلع گورداسپور میں واقع ہونے کے باعث پاکستان میں آئے گا۔ مگر فیصلہ اس کے بالکل خلاف ہوا...... اور گورداسپور...... انڈین یونین میں شامل کر دیا گیا۔ فرقہ وارانہ تعصب حد سے زیادہ بڑھ گیا تھا اور ہندو مسلم سوال بہت زور پکڑ چکا تھا۔ اس لیے مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کو بے دریغ قتل کیا گیا اور اس کے مقابل مغربی پنجاب میں بھی ہندوؤں اور سکھوں کا قتل شروع ہوا اور حالات اس قدر بگڑ گئے کہ ظاہری صورت میں مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا اور مغربی پنجاب میں ہندوؤں اور سکھوں کا رہنا ناممکن ہو گیا۔

''جماعتِ احمدیہ چونکہ ایک مذہبی جماعت ہے اور سیاست سے بالکل الگ رہتی ہے۔ (حالانکہ انگریزی سیاست ہی قادیانیت کی جان تھی۔للمؤلف برنی) اور اپنے اصولوں کے ماتحت جس حکومت کے ماتحت بھی اس کے افراد ہوں، وہ اس کے فرمانبردار ہو کر رہتے ہیں۔ اس لیے ہم نے انڈین یونین کو اپنی پرانی روایات یاد دلاتے ہوئے کہا کہ قادیان ہمارا مذہبی مرکز ہے، ہم اسے چھوڑنا نہیں چاہتے اور عہد کرتے ہیں کہ ہم حکومت کے پورے پورے فرمانبردار رہیں گے مگر چند لاکھ کی چھوٹی سی مذہبی جماعت کی کون سنتا تھا۔ (یہی وہ اپنی چھوٹی سی جماعت ہے جس کی انگریز خوب سنتے تھے اور اس کو اپنے سیاسی رسوخ پر فخر اور گھمنڈ تھا (للمؤلف برنی) ''ہمارے یقین دلانے اور عہد کرنے کے باوجود ملٹری اور پولیس نے قادیان کے نواحی محلوں پر حملے شروع کر دیے اور مسلمانوں کو قتل کیا جانے لگا۔ حکومت کو بار بار توجہ دلائی گئی، مگر بے سود۔ یہاں تک کہ حالات اس قدر نازک صورت اختیار کر گئے کہ عاشقانِ احمد (قادیانیوں) کو ہجرت پر مجبور کر دیا گیا اور نہ صرف دوسرے شعائر اللہ، بلکہ ان کے پیارے اور محبوب آقا کے مدفن مبارک سے بھی محروم کر دیے گئے، وہ تو پہلے ہی اس محبوب کی جدائی کے صدمہ کے باعث ماہی بے

آب کی طرح زندگی گزار رہے تھے۔ اب آپ کے مزار مبارک کی جدائی کے خیال سے ان پر غم و آلام کے پہاڑ ٹوٹ پڑے اور اس قدر انھیں صدمہ ہوا کہ ہجرت کے بعد سلسلہ کے بزرگ اور حضرت مسیح موعود کے بعض صحابہ اس دار فانی سے کوچ کر کے اپنے مولیٰ حقیقی سے جا ملے۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون...... اے کاش انڈین یونین میری بات کو سمجھے کہ احمدیوں نے قادیان اور قادیان والے کی خاطر ساری دنیا کو چھوڑا تھا۔ اب وہ ان کو چھوڑ کر کیسے زندہ رہ سکتے ہیں۔'' **اللھم صلی علی محمد و علی آل محمد و علی عبدہ المسیح الموعود و بارک وسلم انک حمید مجید.''**

(مضمون مندرجہ اخبار الفضل لاہور نمبر 118 ج 2 ص 2 مورخہ 26 مئی 1948ء)

3- ''پس قادیان اور باہر کی اینٹوں میں فرق ہے۔ اس مقام کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ میں اسے عزت دیتا ہوں جس طرح بیت الحرام، بیت المقدس یا مدینہ و مکہ کو برکت دی ہے اور اب اگر ہماری غفلت کی وجہ سے اس کی تقدیس میں فرق آئے تو یہ امانت میں خیانت ہوگی۔ اس لیے یہاں کی اینٹیں بھی انسانی جانوں سے زیادہ قیمتی ہیں اور یہاں کے مقدس مقامات کی حفاظت کے لیے اگر ہزاروں احمدیوں (قادیانیوں) کی جانیں بھی چلی جائیں تو پھر ان کی اتنی حیثیت بھی نہ ہوگی جتنی ایک کروڑ پتی کے لیے ایک پیسہ کی ہوتی ہے۔ پس قادیان اور قادیان کے وقار کی حفاظت زیادہ سے زیادہ ذرائع سے کرنا ہمارا فرض ہے۔''

(میاں محمود احمد قادیانی خلیفۂ قادیان کا خطبہ مندرجہ اخبار الفضل ج 22 نمبر 72 ص 13,8 دسمبر 1934ء)

4- ''افسوس ہے قادیان کے حالات دن بدن زیادہ ابتر ہوتے جا رہے ہیں۔ تازہ اطلاع سے یہ معلوم کرنا حد درجہ افسوسناک ہے کہ جناب میاں محمود احمد قادیانی خلیفۂ قادیان کا مکان بیت الحمد اور چوہدری ظفر اللہ خاں صاحب کی کوٹھی لوٹ لی گئی۔ محلہ دارالرحمت اور دارالانوار میں قتل و غارت کا بازار گرم کیا گیا جس میں کہا جاتا ہے کہ ڈیڑھ سو آدمی شہید ہوئے۔ مسجد میں گرد و نواح کے ہندو مکانات سے بم پھینکے گئے جس سے دو آدمی شہید ہوئے۔'' (لاہوری جماعت کا اخبار پیغام صلح لاہور ج 35 نمبر 36 مورخہ 18 اکتوبر 1947ء)

5- ''ہمارے اکثر احباب قادیان کے حالات دریافت کرتے رہتے ہیں۔ ان کی اطلاع کے لیے لکھا جاتا ہے کہ جس دن سے قادیان کو مشرقی پنجاب میں شامل کیا گیا ہے وہاں کے حالات دن بدن خراب ہوتے جا رہے ہیں۔ پہلے تو سکھوں نے فوج کی مدد سے اردگرد

کے دیہات پر حملے کر کے مسلمانوں کو مار بھگایا اور ان کے مال و متاع کو لوٹ کر مکانات کو جلا دیا۔ پھر قادیان کا رخ کیا اور حکومت کی مدد سے رسل و رسائل کے تمام اسباب منقطع کرا دیے، یہاں تک کہ قادیان کے وہ ہوائی جہاز جو گرد و نواح کے حالات کی خبر لے آتے تھے اور مصیبت زدہ مسلمانوں کی کچھ نہ کچھ امداد کر دیتے تھے، ان کی پرواز بھی ممنوع قرار دے دی گئی۔ اس کے بعد قادیان کے دو سرکردہ آدمیوں چوہدری فتح محمد سیال اور سید ولی اللہ شاہ کو دفعہ (302) کے تحت گرفتار کر لیا گیا۔ قادیان میں کرفیو نافذ کر دیا گیا اور خلیفۂ قادیان کے مکان اور کئی دوسرے مکانات کی تلاشیاں لی گئیں اور لائسنس والے اسلحہ پر بھی قبضہ کر لیا گیا اور یہ مطالبہ کیا گیا کہ بغیر لائسنس کے جو اسلحہ کسی کے پاس ہو، وہ دے دے۔ ورنہ حکومت کے پاس ایسے آلات ہیں جن کے ذریعہ سے مدفون اسلحہ کا پتہ لگ سکتا ہے۔

''اسی اثناء میں سکھوں نے مختلف محلوں میں لوٹ مار شروع کر دی اور جن مکانات سے عورتوں اور بچوں کو نکال کر محفوظ مقامات پر پہنچا دیا گیا، ان پر قبضہ کر لیا۔ خان بہادر نواب محمد دین صاحب سابق ڈپٹی کمشنر و سابق وزیر جودھپور سٹیٹ کا گھر لوٹ لیا گیا۔ اور بھی کئی گھروں سے ہزاروں روپے کی مالیت کے زیورات نکال لیے گئے۔ ہندوؤں اور سکھوں کے مکانوں پر چاک کے نشان کر دیے گئے تاکہ پہچانے جا سکیں۔ غرض اس قسم کی اندھی نگری اور سکھا شاہی مچی ہوئی ہے جس کو روکنے والا کوئی نہیں۔ ان حالات کے پیش نظر خلیفۂ قادیان نے اپنا مرکز جودھامل بلڈنگ لاہور میں تبدیل کر لیا ہے اور اس کا نام احمدیہ پاکستان مرکز رکھا ہے۔ اس جگہ قادیان سے آئے ہوئے پناہ گزین فروکش ہیں اور الفضل اخبار یہیں سے شائع ہو رہا ہے...... جہاں تک احمدیہ مرکز پاکستان اور معاصر الفضل کی شائع کردہ اطلاعات سے معلوم ہوتا ہے، (قادیان میں) حالات روبہ اصلاح ہونے کی بجائے دن بدن اور لحظہ بہ لحظہ خراب ہو رہے ہیں جو بہت ہی تشویشناک امر ہے۔ اللہ تعالیٰ رحم کرے! ہمیں قادیان کے ساتھ بوجہ حضرت مسیح موعود کا مولد و مدفن ہونے کا اور بہت سے نیک لوگوں کی آرام گاہ ہونے اور اس نور کا سرچشمہ ہونے کے جو خدا کے مامور نے دنیا میں پھیلایا اور اسلام کو دنیا کا غالب مذہب ثابت کیا، دلی محبت ہے اور ہم خلیفۂ قادیان اور دوسرے تمام لوگوں سے جو مسیح موعود کے نام لیوا ہیں، دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس مقام کی حفاظت میں ان کی ہمتوں اور کوششوں میں برکت دے اور اسے ظالموں اور درندوں کی دست برد سے بچائے۔'' (قادیانی جماعت لاہور کا اخبار پیغام صلح لاہور ج 35 نمبر 35 مورخہ یکم اکتوبر 1947ء)

قادیان کا بدل ربوہ (موجودہ چناب نگر)

قادیان پر کس طرح کیسی تباہی و بربادی آئی کہ خود خلیفۂ قادیانی ترک قادیان پر مجبور ہوئے، اس کی مختصر کیفیت اوپر بیان ہو چکی ہے۔ لوگوں کو تو ان پیشگوئیاں کے ظہور کا انتظار اور اشتیاق تھا جو مرزا قادیانی نے قادیان کی آئندہ ترقی کے متعلق کی تھیں لیکن ؎

ما در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال

یہ جو قادیان پر سانحہ گزرا، تعجب ہے۔ مرزا قادیانی کی پیشگوئیوں میں اس کی کوئی اطلاع نہیں۔ شاید تلاش سے نکل آئے، مگر تخصیص اور توضیح کے ساتھ۔ ورنہ عام مبہم پیش گوئیوں کی تو کوئی کمی نہیں۔ جو پیش گوئی چاہو حسب موقع چسپاں کر دو۔ بہرحال قادیان چھوڑ کر خلیفۂ قادیانی نے ایک نئی قادیانی بستی کی بنیاد ڈالی ہے، جس کا نام ربوہ قرار پایا ہے۔ معلوم ہوتا ہے آئندہ اس کو قادیانیت کا مرکز بنانا مقصود ہے۔ چنانچہ ابھی سے اس میں قادیان پر فضیلت کی جھلک نظر آتی ہے کہ گویا ربوہ میں مکہ مدینہ کی مماثلت قادیان کے مقابل زیادہ نمایاں ہے۔ نبوت کا سلسلہ تو جاری ہے اور بقول مرزا قادیانی تیرہ سو سال بعد جاری ہوا ہے۔ پس کیا تعجب ہے کہ بطور تلافی مافات یہ سلسلہ تیز تر ہو جائے کہ قادیانی خلیفۂ خود بھی اس منصب نبوت پر فائز ہو جائیں اور وہ کمال دکھائیں کہ گویا ؎

اگر پدر نہ تواند پسر تمام کند

تو ایسی صورت میں ربوہ کو لازماً قادیان پر فضیلت حاصل ہو جائے گی اور یوں بھی فضیلت کا اشارہ شروع ہو چکا ہے جو کسی دور اندیشی کی خبر دیتا ہے۔ بہرحال دنیا بامید قائم:

1- ''جماعت احمدیہ کا نیا مرکز پاکستان کے ضلع جھنگ میں چنیوٹ سے پانچ میل کے فاصلے پر دریائے چناب کے پار ربوہ کے نام سے آباد کیا جا رہا ہے ربوہ کے معنی بلند مقام یا پہاڑی مقام کے ہیں۔ یہ نام اس نیک فال کے طور پر رکھا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس مقام کو حق و صداقت اور روحانیت کی بلندیوں تک پہنچنے کا ذریعہ بنا دے۔ آبادی کے لیے اس جگہ سردست دس سو چونتیس ایکڑ زمین خریدی گئی ہے۔ چنیوٹ سے جانے والی لائن اس زمین میں سے گزرتی ہے۔ یہ جگہ لائل پور اور سرگودھا کے عین وسط میں واقع ہے۔''

''20 ستمبر 1948ء بروز دوشنبہ حضرت امیرالمومنین ایدہ اللہ تعالیٰ (میاں محمود احمد قادیانی خلیفۂ قادیان) نے اس سرزمین میں آبادی کا افتتاح فرمایا۔ حضور لاہور سے بذریعہ کار روانہ ہو کر ربوہ پہنچے۔ حضور نے ایک بڑے مجمع کے ساتھ نماز ظہر ادا فرمائی اور پھر ایک موثر اور درد سے بھری ہوئی تقریر کے بعد ایک لمبی دعا فرمائی...... اس موقع پر ربوہ کی

سرزمین کے چاروں کونوں میں ایک ایک بکرا بطور صدقہ ذبح کیا گیا اور ایک بکرا زمین کے وسط میں حضور نے مسنون دعائیہ الفاظ پڑھتے ہوئے اپنے دست مبارک سے ذبح فرمایا۔ چار بج کر چالیس منٹ پر حضور واپس لاہور روانہ ہو گئے۔"

"25 مارچ 1949ء کے الفضل میں اعلان ہوا کہ ربوہ کے لیے ہالٹنگ ریلوے سٹیشن منظور ہو گیا ہے۔ چنانچہ یکم اپریل 1949ء کو صبح سات بجے سب سے پہلی گاڑی اس سٹیشن پر ٹھہری۔ اس موقع پر مکرم جناب قاضی محمد عبداللہ صاحب نے جو حضرت مسیح موعود کے تین سو تیرہ صحابہ میں سے ہیں، جملہ احباب سمیت لمبی دعا فرمائی۔ ربوہ کے سب سے پہلے سٹیشن ماسٹر ایک احمدی دوست مقرر ہوئے ہیں۔"

"15-16-17 اپریل 1949ء کو ربوہ میں جماعت احمدیہ کا پہلا جلسہ سالانہ منعقد ہوا جس کا افتتاح حضرت امیرالمومنین ایدہ اللہ تعالیٰ نے پندرہ اپریل کو نو بجے صبح لمبی دعاؤں کے ساتھ فرمایا۔ اس موقع پر حضور نے تقریر کرتے ہوئے اس امر پر زور دیا کہ ہمیں مل کر دعائیں کرنی چاہئیں کہ اللہ تعالیٰ ربوہ کو اسلام کی اشاعت کا مرکز بنائے (جس طرح پہلے اشاعت کا مرکز قادیان تھا۔ للمؤلف برنی) جلسہ میں دس ہزار مہمانوں کی شرکت کی توقع تھی، لیکن سولہ ہزار سے بھی زیادہ احباب تشریف لائے۔"

"10 اگست 1949ء کو ربوہ میں تار لگ گئی اور تاروں کی آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ 14 ستمبر 1949ء کو ربوہ میں ڈاکخانہ بھی باقاعدہ کھل گیا۔ ڈاکخانہ کے پہلے انچارج ایک احمدی دوست مقرر ہوئے ہیں۔"

"19 ستمبر 1949ء بروز دوشنبہ حضرت امیرالمومنین ربوہ میں مستقل سکونت اختیار کرنے کے لیے مع حضرت ام المومنین "دیگر اہل بیت رتن باغ لاہور سے بذریعہ کار ربوہ تشریف لے گئے۔ راستے میں حضور مع دیگر اہل قافلہ خصوصیت سے قرآنی دعا "رب ادخلنی مدخل صدق واخرجنی مخرج صدق واجعل لی من لدنک سلطانا نصیرا." پڑھتے رہے۔ جب ربوہ کی سرزمین شروع ہوئی تو حضور نے اتر کر یہ دعا پڑھی...... ربوہ پہنچ کر حضور نے سب سے پہلے نماز ظہر ادا فرمائی اور پھر تقریر فرمائی۔"

"اس وقت ربوہ کی آبادی ایک ہزار نفوس تک پہنچ چکی ہے۔ صدر انجمن اور تحریک جدید کے دفاتر کے علاوہ حضرت امیرالمومنین کی رہائش گاہ، لنگر خانہ، مہمان خانہ اور نور ہسپتال

کی عارضی عمارتیں تیار ہو چکی ہیں اور بازار بن چکے ہیں اور ایک مسجد تعمیر ہو چکی ہے۔"

(ربوہ کی روداد مندرجہ قادیانی اخبار الرحمت لاہور ج 1 نمبر 1 مورخہ 21 نومبر 1949ء)

2- "جب حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کے ذریعہ خدا تعالیٰ نے مکہ بنوایا تو اس وقت اس نے یہی کہا کہ یہاں توکل سے رہنا اور خدا تعالیٰ سے روٹی مانگنا، بندوں سے نہ مانگنا۔ اسی نیت اور ارادہ کے ساتھ ہمیں قادیان میں بھی رہنا چاہیے تھا۔"

(گویا وہاں قادیانی اس طرح نہیں رہے کہ توکل کرتے اور شاید اسی لیے قادیان ویران ہوا۔ عاقل را اشارہ کافیست للمؤلف برنی) مگر وہ احمدیت سے پہلے کی بنی ہوئی بستی تھی اور اس میں بہت سے لوگ اس سبق سے ناآشنا تھے۔ (یعنی توکل کے سبق سے ناآشنا تھے، اور بہت سے قادیانی صاحبان ناآشنا تھے، حالانکہ قادیان بقول خود رسول کا تخت گاہ تھا، اور قادیانی رسول کو وہاں خوب تموّل اور خوشحالی حاصل ہوئی۔ بہرحال قادیان میں نقص رہ گیا تھا، جو ربوہ میں وہ رفع ہو جائے گا۔ اصلیت تو جو کچھ ہے ظاہر ہے لیکن قادیانی تاویل کا فن ضرور قابل داد ہے۔ للمؤلف برنی)

"لیکن یہ نئی بستی یعنی ربوہ جہاں ایک طرف مدینہ سے مشابہت رکھتی ہے، اس لحاظ سے کہ ہم قادیان سے ہجرت کے بعد یہاں آئے، وہاں دوسری طرف یہ مکہ سے بھی مشابہت رکھتی ہے، کیونکہ یہ نئے سرے سے بنائی جا رہی ہے اور محض احمدیت کے ہاتھوں سے اللہ تعالیٰ نے مکہ معظمہ بنوایا۔ وہاں بھی خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کی نسل سے یہی کہا تھا کہ تم اپنی روٹی کا ذمہ دار مجھے سمجھنا، کسی بندے کو نہ سمجھنا، پھر میں تم کو دوں گا۔ اس طرح دوں گا کہ دنیا کے لیے حیرت کا موجب ہوگا۔ چنانچہ دیکھ لو ایسا ہی ہوا۔ مکہ والے بیشک محنت مزدوری بھی کرنے لگ گئے ہیں، لیکن میں سمجھتا ہوں اگر وہ محنت مزدوری چھوڑ دیں۔ تب بھی جس طرح بنی اسرائیل کے لیے خدا تعالیٰ نے جنگل میں من و سلویٰ نازل کیا تھا، اسی طرح مکہ والوں کے لیے بھی من و سلویٰ اترنے لگے کیونکہ وہاں پر رہنے والوں کے رزق کا اللہ تعالیٰ نے خود ذمہ لیا ہے۔" اسی طرح ہم کو بھی اس جنگل میں جس جگہ کوئی آبادی نہیں تھی، جس جگہ رزق کا کوئی سامان نہیں تھا، جو مکہ کی طرح ایک وادی غیر ذی ذرع تھی۔ (اگرچہ قرب و جوار میں خوب زراعت اور رزق کی فراوانی ہے اور جنگل جو آباد ہوا وہاں ہر طرح کی آسانی ہے۔ چنانچہ سب پہلو دیکھ کر ہوشیاری سے نئی آبادی کا مقام انتخاب ہوا، اور پھر بھی مکہ معظمہ سے بے سروسامانی سے مماثلت قائم رہی کہ قادیانی ذہنیت ہے۔ للمؤلف برنی) اور جہاں مکہ کی طرح کھاری پانی ملتا ہے اور جو اس لحاظ سے بھی مکہ سے ایک مشابہت رکھتا ہے کہ مکہ کی

طرح یہاں کوئی منبرہ وغیرہ نہیں اور مکہ کے گرد جس طرح پہاڑیاں ہیں اسی طرح اس مقام کے اردگرد پہاڑیاں ہیں (ان تشبیہات سے قادیانی کا زور ظاہر ہے کہ کس طرح ربوہ مکہ کے مشابہ نظر آنے لگا۔ للمؤلف برنی) اللہ تعالیٰ نے موقع دیا ہے کہ ہم ایک نئی بستی اللہ تعالیٰ کے نام کو بلند کرنے کے لیے بسائیں۔'' (خاص کر جب قادیان چھوٹ چکا ہو اور وہ بمقابل ربوہ ناقص بھی ہو کہ وہ احمدیت سے پہلے کی بنی ہوئی بستی تھی اور یہ نئے سرے سے بنائی جارہی ہے اور محض احمدیت کے ہاتھوں سے بنائی جارہی ہے۔ نتیجہ یہ کہ رسول کی تخت گاہ سے خلیفہ کی تخت گاہ سبقت لے گئی۔ مگر کیا مضائقہ ہے۔ گھر کی بات ہے ؂

اگر پدر نہ تواند پسر تمام کند

واقعی میاں محمود احمد قادیانی کا یہ کارنامہ بھی یادگار رہے گا کہ قادیان سے بہتر بستی آباد کی۔

(میاں بشیر الدین محمود احمد قادیانی کا خطبہ جمعہ قادیانی اخبار الرحمت لاہور ج 1 نمبر 1 مورخہ 21 نومبر 1949ء)

✿ ..... ✿ ..... ✿

دوست محمد شاہد قادیانی

قادیان کی گمنام حالت

اُس زمانہ میں قادیان ایک انتہائی بے رونق گاؤں تھا۔ چنانچہ پیر سراج الحق صاحب نعمانی کی چشم دید شہادت ہے کہ جب آپ 1882ء میں قادیان گئے تو یہ بستی ویران پڑی تھی جس کے بازار خالی پڑے تھے اور بہت کم آدمی چلتے پھرتے نظر آتے تھے۔ بعض دکانیں ٹوٹی پھوٹی اور بعض غیر آباد خالی پڑی تھیں اور دو تین یا کم وبیش دکانیں نون مرچ کی تھیں، وہ بھی ایسی کہ اگر چار پانچ آنے کا مصالحہ خریدنے کا اتفاق ہو تو ان دکانوں سے بجز دو چار پیسہ کے نہیں مل سکتا تھا، اور تھوڑی تھوڑی ضرورتوں کے واسطے بٹالہ جانا پڑتا تھا۔ علیٰ ہذا القیاس اور چیزوں کا بھی یہی حال تھا۔ دو دکان حلوائیوں کی بھی تھی لیکن ان کی بے رونقی اور کم مائیگی کا یہ حال تھا کہ شاید دو تین پیسہ کی ریوڑیاں گڑ کی جن سے دانتوں کے بھی ٹوٹنے کا احتمال ہو اگر کوئی خرید لے تو خریدے، ورنہ اور مٹھائی کے لیے مصالحہ کی طرح بٹالہ ہی یاد آئے۔ مجھے اب تک وہ دکان یاد ہے کہ جس میں کسی قدر نون مرچ اور کچھ تیل کے علاوہ دو چار تھان کپڑے کے بھی رکھے تھے، ایک تھان گاڑھے اور ادھوتر کا جس کو پنجابی میں کھدر کہتے ہیں اور ایک دو تھان کھٹیل قند سرخ کے جس کو الوان بھی کہتے ہیں اور شاید ایک دو تھان نکمی سی سوسی اور بھدی سی چھینٹ کے بھی رکھے ہوئے تھے جن کو جٹیوں کے سوا اور کوئی خریدنے کا نام تک نہ لے۔ اناج کی منڈی، سبزی کی منڈی یا اور کسی قسم کے فواکہ اور میوے کا تو ذکر کیا، گھی چاول دودھ کمیاب اور دیگر اشیائے ضروری مفقود۔ قصائی کی ایک دکان ایسی تھی کہ اگر قصاب کبھی شامت سے ایک بکرا ذبح کر لیتا تھا تو وہ بکرا اس کی جان کا وبال ہو جاتا تھا۔ اگر گرمیوں کا موسم ہے تو گل سڑ کر خراب ہو گیا اور جو سردیاں ہوئیں تو چار پانچ روز تک رکھ کر کچھ یہاں کچھ دیہات میں اناج کے بدلے بمشکل تمام بیچ کھوچ کر پورا کیا، جس میں نفع نقصان برابر سرابر...... جس طرف دیکھو کچے مکان اور بے مرمت مکان پڑے تھے۔ ہاں حضرت اقدس کا مکان پختہ تھا یا آپ کے بڑے بھائی کا لیکن وہ کچے مکانوں کی طرح مکان تھے، جو بعض حصہ ان کا زمین دوز تھا۔ اندر کا پانی باہر جانا برسات میں دشوار تھا جس کا نمونہ اب تک موجود ہے کہ حضرت اقدس کے مکان کے ملحق مرزا غلام قادر قادیانی

مرحوم کا مکان ہے۔ حضرتِ اقدس جس مکان میں جلوہ افروز تھے وہ ایک چھوٹا سا حجرہ تھا اور اب بھی ہے۔ اس میں دس پندرہ آدمیوں کے سوا زیادہ نہیں آ سکتے تھے، اس حجرہ کا نام بیت الفکر ہے۔ اس حجرے کے آگے ایک دالان تھا اور نیچے کے مکان میں بھی ایک دالان تھا اور ایک دو مکان اور مختصر سے تھے۔ اور ایک طرف کی عمارت خام تھی اور ایک گول کمرہ تھا جس کو تیار کرایا جاتا تھا یعنی کچھ حصّہ اس کا بن چکا تھا اور کچھ بن رہا تھا، اور مسجد مبارک بھی اس وقت ناتمام تھی۔ معمار مزدور لگ رہے تھے اور اب تو اس مکان میں بہت سے مکان بعمارت پختہ عالی شان بن گئے ہیں۔ آپ کے ہاں لوگوں کی آمد و رفت بہت کم تھی یہاں تک کہ بعض دو دو چار چار یا دس دس کوس کے آدمی بھی آپ سے کم واقفیت رکھتے تھے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ اس وقت دو چار نمازی آپ کے ساتھ ہوتے تھے۔ اکثر حضرتِ اقدس نماز پڑھایا کرتے تھے اور کبھی میں ایک ہی مقتدی ہوتا تھا اور آپ امام، اور کبھی میں امام اور آپ مقتدی۔ سیر کا بھی یہی حال تھا کہ کبھی ایک دو آدمی ساتھ ہوتے تھے اور کبھی آپ اکیلے ہی سیر کو تشریف لے جاتے تھے۔ ایک دو ہندو اُس زمانہ میں آیا کرتے تھے۔ وہ ہندو آپ کے الہامات کو جو خدا تعالیٰ کی طرف سے ہوتے تھے لکھا کرتے تھے اور ہمیشہ آپ کی پیشگوئیوں کی تگ و دو میں لگے رہتے تھے کہ آیا یہ پیشگوئی پوری ہوئی یا نہیں۔" (الحکم 30 اپریل 1902ء ص 9)

غرضیکہ اس وقت قادیان ایک ویرانے کا منظر پیش کر رہا تھا جس پر چاروں طرف غار کی سی تاریکی اور خاموشی مسلط تھی۔ اور 1880ء تک خود حضرتِ اقدس حد درجہ پردۂ گمنامی میں تھے اور آپ کا حلقۂ احباب نہایت محدود تھا۔

پروفیسر محمد اسلم

میں نے قادیان دیکھا

جب ہم لاری اڈے پر بس سے اترے تو مجھے دور سے ایک مینارہ نظر آیا۔ میرے دل میں یہ خیال آیا کہ ہو نہ ہو یہ مینارۃ المسیح ہے۔ ہم نے وہاں تک پہنچنے کے لیے راستہ پوچھا تو دکانداروں نے ہماری رہنمائی کی۔ جونہی ہم مینارۃ المسیح کو جانے والی گلی میں پہنچے ہمیں دور سے ایک لحیم شحیم قادیانی، قمیض اور پاجامے میں ملبوس، سر پر ٹوپی رکھے ہوئے اپنی جانب آتا دکھائی دیا۔ قریب پہنچ کر میں نے سلام کیا تو اس نے سلام کا جواب دیتے ہوئے اپنا تعارف ان الفاظ میں کرایا۔ میرا نام عبدالرحیم عاجز ہے۔ میں ریٹائرڈ گورنمنٹ آفیسر ہوں۔ میں نے ریٹائرمنٹ کے بعد دین کی خدمت کے لیے یہاں رہائش اختیار کر لی ہے اور میں انجمن احمدیہ کا سیکرٹری ہوں۔ میں نے بہشتی مقبرہ، اور ''مسجد اقصیٰ'' دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو اس نے کہا کہ وہ تو ہم دیکھ ہی لیں گے، پہلے جو کچھ وہ دکھانا چاہتا ہے، وہ تو دیکھ لیں۔

عبدالرحیم عاجز ہمیں مرزا غلام احمد قادیانی (م 1908ء) کا رہائشی مکان دکھانے لے گیا۔ اس نے ہمیں ایک کمرہ دکھایا جس کی چاروں دیواروں میں طاقچے بنے ہوئے تھے۔ عربی زبان میں ایسے طاقچے کو مشکوۃ کہتے ہیں۔ عبدالرحیم عاجز نے مجھے بتایا کہ مرزا قادیانی چل پھر کر لکھنے کے عادی تھے۔ ان چاروں طاقچوں میں دواتیں پڑی رہتی تھیں۔ قلم اور کاغذ مرزا قادیانی کے ہاتھ میں ہوتے تھے اور وہ ان دواتوں میں قلم ڈوب کر لکھا کرتے تھے۔ میں نے کہا کہ یہ تو مشائین کا طریقہ ہے۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا کہ آپ یہ سمجھتے ہیں تو ایسا ہی ہوگا۔ اس کمرے میں دو تین سیڑھیاں چڑھ کر ایک چھوٹا سا حجرہ آتا ہے جسے دارالحزن کہتے ہیں۔ ہمیں بتایا گیا کہ اس حجرے میں بیٹھ کر مرزا قادیانی امت کی حالت زار پر رویا کرتے تھے۔ اسی طرح کا ایک اور حجرہ تھا جو دارالفکر کہلاتا ہے۔ اس میں بیٹھ کر مرزا قادیانی امت کے بارے میں غور وفکر کیا کرتے تھے اور اسی میں سے گزر کر موصوف مسجد مبارک میں پہنچ جاتے تھے۔ یہ مسجد ان کے گھر سے ملحق تھی۔

اس مکان سے متصل ایک مکان میں مرزا غلام احمد کا پوتا مرزا وسیم احمد رہتا ہے۔ وہ

بھارت کے قادیانیوں کا سربراہ ہے۔ اُن دنوں وہ حیدرآباد دکن گیا ہوا تھا، اس لیے اس کے ساتھ ہماری ملاقات نہ ہو سکی۔ یہاں سے عبدالرحیم عاجز ہمیں ''مسجد اقصیٰ'' لے گیا۔ وہاں فرش پر پانی چھڑکا جا رہا تھا۔ ہمیں یہ بتایا گیا کہ نمازِ مغرب کے وقت قادیان کے تمام قادیانی مرد و زن اس مسجد میں جمع ہوتے ہیں اور درمیان میں پردہ ڈال دیا جاتا ہے۔ مغرب سے عشاء تک وعظ و تلقین کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اُن دنوں منارۃ المسیح کی مرمت ہو رہی تھی اور اس کی بیرونی سطح پر سنگ مرمر لگایا جا رہا تھا۔ عبدالرحیم عاجز نے مجھے کہا کہ میں اس مینارے پر چڑھ جاؤں۔ میں نے معذرت چاہی لیکن اس نے اصرار کیا۔ میں اس کے اصرار پر مینارے پر چڑھا تو میرا سانس پھول گیا۔ (اگر میں مر جاتا تو وہ مجھے وہیں بہشتی مقبرے میں دفن کر دیتے)۔ جب میرا سانس درست ہوا تو میں نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ میلوں تک کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ایک جانب میں نے درختوں کا جھنڈ دیکھا۔ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ ہو نہ ہو یہی بہشتی مقبرہ ہے۔ ''مسجد اقصیٰ'' کے صحن میں مرزا غلام احمد قادیانی کے والد مرزا غلام مرتضیٰ (م 1876ء) کی قبر ہے۔ تذکرۂ رؤسائے پنجاب میں سرلیپل ایچ گرفن اور کرنل میسی نے اس بات کی گواہی دی ہے کہ ''نونہال سنگھ، شیر سنگھ اور دربارِ لاہور کے دور دورے میں غلام مرتضیٰ ہمیشہ فوجی خدمات پر مامور رہا۔ 1841ء میں یہ جرنیل ونچورا کے ساتھ منڈی اور کلو کی طرف بھیجا گیا اور 1843ء میں ایک پیادہ فوج کا کمیدان بنا کر پشاور روانہ کیا گیا۔ ہزارہ کے مفسدے میں اس نے کارہائے نمایاں کیے اور جب 1848ء کی بغاوت ہوئی تو یہ اپنی سرکار کا نمک حلال رہا اور اس کی طرف سے لڑا۔ اس موقع پر اس کے بھائی غلام محی الدین نے بھی اچھی خدمات کیں۔ دوسری جگہ یہی دونوں مورخ لکھتے ہیں: ''اس خاندان نے غدر 1857ء کے دوران میں بہت اچھی خدمات کیں۔ غلام مرتضیٰ نے بہت سے آدمی بھرتی کیے اور اس کا بیٹا غلام قادر جنرل نکلسن صاحب بہادر کی فوج میں اس وقت تھا جبکہ افسر موصوف نے تریموگھاٹ پر نمبر 46 نیٹو انفنٹری کے باغیوں کو جو سیالکوٹ سے بھاگے تھے، تہ تیغ کیا۔ جنرل نکلسن صاحب بہادر نے غلام قادر کو ایک سند دی جس میں یہ لکھا ہے کہ 1857ء میں خاندانِ قادیاں ضلع گورداسپور کے تمام دوسرے خاندانوں سے زیادہ نمک حلال رہا۔ اسے کہتے ہیں ''جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔''

جب میں ''مسجد اقصیٰ'' دیکھ کر فارغ ہوا تو عبدالرحیم عاجز نے اپنے فرزند عبدالحفیظ سے کہا کہ وہ ہمیں بہشتی مقبرے لے جائے اور دربان سے کہے کہ ہمیں اس وقت بہشتی مقبرہ دیکھنے کی خصوصی اجازت دی گئی ہے۔ راستے میں ہمیں عبدالحفیظ نے بتایا کہ عصر سے مغرب تک وہاں صرف عورتوں کو جانے کی اجازت ہے۔ اس لیے ہمیں خصوصی اجازت ملی ہے۔ عبدالحفیظ کی معیت میں ہم خطۂ خاص میں پہنچے۔ اس خطے میں مرزا غلام احمد قادیانی (م 1908ء) اور اس کے خلیفہ اوّل حکیم نورالدین

بھیروی (م 1914ء) کے علاوہ مرزا قادیانی کے اعزہ و اقارب کی قبریں ہیں۔ مرزا قادیانی کے قدموں میں اس کی تین بہوئیں: سارہ بھاگلپوری، ام طاہر اور امتہ الحیی کی قبریں ہیں۔ سارہ صوبہ بہار کے ضلع بھاگلپور کے ایک قصبے پرینی کی رہنے والی تھی۔ وہ تعلیم الاسلام ہائی سکول قادیان کے ہیڈ ماسٹر عبدالقادر کی بہن اور میرے ایک استاد عباس بن عبدالقادر کی پھوپھی تھی۔ اس کی قبر کے کتبے پر یہ مرقوم تھا کہ اس کا نکاح مرزا بشیرالدین محمود کے ساتھ مرزا غلام احمد قادیانی پر ہونے والی ایک وحی کی بناء پر ہوا تھا۔ ام طاہر، قادیانیوں کے چوتھے خلیفہ طاہر احمد کی ماں تھی۔

مقبرۂ خاص ایک چار دیواری کے اندر ہے۔ اس میں دو جگہ سلاخیں لگا دی گئی ہیں تا کہ لوگ دور سے ان قبروں کی ''زیارت'' کر لیں۔ مقبرۂ خاص سے باہر چند قطاروں میں مرزا قادیانی کے ''صحابیوں'' کی قبریں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے لوح پر اس کی نمایاں خدمات درج ہیں۔ ایک لوح پر یہ کندہ تھا کہ صاحبِ قبر لدھیانہ کے مناظرے میں مرزا قادیانی کے ساتھ موجود تھا۔ دوسری لوح پر یہ مرقوم تھا کہ صاحبِ قبر مرزا قادیانی کی تجہیز و تکفین میں شریک تھا۔ ایک ''صحابی'' نے یہ وصیت کی تھی کہ اس کے لوحِ مزار پر یہ لکھ دیا جائے کہ وہ مرزا قادیانی کا خادمِ خاص تھا۔ انہی قبروں میں ایک قبر بھائی عبدالرحمٰن کی تھی۔ مجھے عبدالحفیظ نے بتایا کہ وہ پیدائشی سکھ تھا اور پیشے کے اعتبار سے وہ گرنتھی تھا۔ سکھوں کے ہاں گرنتھی کو بھائی جی کہتے ہیں اس لیے بھائی اس کے نام کا جزو بن گیا۔ جب اس نے مختلف ادیان کا مطالعہ کیا تو اسے قادیانیت میں ''صداقت'' نظر آئی اور وہ قادیانی ہو گیا۔ قیام پاکستان کے بعد وہ پاکستان چلا آیا۔ اس نے یہ وصیت کی تھی کہ اسے بہشتی مقبرے میں دفنایا جائے چنانچہ اس کی وصیت پر عمل کیا گیا۔ یہ واحد مرزائی تھا جس کا جسدِ خاکی پاکستان سے بھارت لے جا کر قادیان میں دفنایا گیا۔

اختر اورینوی (سیّد اختر احمد) پٹنہ یونیورسٹی میں اردو کا پروفیسر تھا۔ اس نے اردو زبان و ادب کی بڑی خدمت کی ہے۔ وہ بڑا سچا پکا قادیانی تھا۔ اس کا انتقال 31 مارچ 1977ء کو پٹنہ کے کرجی ہسپتال میں ہوا۔ اس کی وصیت کے مطابق اس کی میت پٹنہ سے قادیاں لے جا کر بہشتی مقبرے میں دفن کی گئی۔ 2 فروری 1994ء کو اس کی بیوی شکیلہ اختر بھی فوت ہو گئی ہے۔ وہ ایک اچھی افسانہ نگار تھی۔ اسے بھی یقیناً وہیں دفن کیا ہوگا۔

سیّد برکات احمد، خواجہ میر دردؔ کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ انڈین فارن سروس میں ملازم تھا۔ اس نے Muhammad and the Jews کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جس کا اردو ترجمہ ''رسول اکرم ﷺ اور یہودِ حجاز'' کے عنوان سے پروفیسر مشیر الحق (م 1990ء) نے

کیا تھا۔ ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد برکات احمد نے اپنی بیٹی کے پاس اندور میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اس کی وصیت کے مطابق اس کا جسد خاکی بھی قادیان لے جا کر بہشتی مقبرے میں سپرد خاک کیا گیا ہے۔

عبدالحفیظ نے ہمیں وہ جگہ بھی دکھائی جہاں مرزا غلام احمد قادیانی کی نمازِ جنازہ ہوئی تھی۔ اس کا یہ کہنا تھا کہ مرزا قادیانی کے جنازے میں نمازیوں کی سات صفیں بنی تھیں، اس لیے اب ان کے ہاں یہ روایت بن گئی ہے کہ نمازِ جنازہ کے وقت سات صفیں ہی بنائی جاتی ہیں۔

عبدالحفیظ ہمیں ساتھ لے کر اپنے گھر پہنچا، جہاں اس کے والد نے چائے تیار کر کے رکھی ہوئی تھی۔ اس نے ہمیں چائے پلائی اور اس کے بعد رخصت کیا۔ اس کا یہ تقاضا تھا کہ میں رات وہیں رہوں، لیکن میں نے معذرت چاہی۔ دو سال کے بعد مجھے دوبارہ امرتسر، بٹالہ اور قادیان جانے کا اتفاق ہوا۔ اس بار میں نے اکیلے ہی قادیاں میں گھوم پھر کر قصبے کا جائزہ لیا۔

وہاں اس وقت تیرہ صد قادیانی آباد تھے۔ ان میں اکثریت بہاریوں کی تھی۔ انھوں نے گزر بسر کے لیے تھوڑا بہت کام شروع کیا ہوا تھا۔ کوئی ریڈیو مرمت کرتا تھا۔ کسی نے بجلی کے سامان کی دکان کھولی ہوئی تھی۔ کوئی معمولی سا چائے کا ریسٹورنٹ چلا رہا تھا۔ ایک شخص بازار میں بیٹھا آئس کریم بیچ رہا تھا۔ ایک مرزائی سائیکلوں کو پنکچر لگا رہا تھا۔ غربت و افلاس کی جھلک ان کے چہروں سے نمایاں تھی۔ ان کا فقط یہی ''کارنامہ'' تھا کہ وہ قادیان میں آباد تھے۔ قادیان کی آبادی پندرہ ہزار نفوس پر مشتمل ہے جس میں تیرہ صد مرزائی ہیں اور وہ سمٹ سمٹا کر قادیاں کے ایک گوشے میں آ بسے ہیں۔ گلیوں اور بازاروں میں ہُو کا عالم تھا۔ کوئی ویرانی سی ویرانی تھی۔ مرزا قادیانی نے بر بنائے الہام و کشف یہ کہا تھا کہ:

> ''حضرتِ اقدس (مرزا غلام احمد قادیانی) ایک روز فرماتے تھے ہم نے کشف میں دیکھا کہ قادیان ایک بڑا عظیم الشان شہر بن گیا ہے۔ انتہائی نظر سے بھی پرے تک بازار نکل گئے۔ اونچی اونچی دو منزلی یا چومنزلی یا اس سے بھی زیادہ اونچے اونچے چبوتروں والی دکانیں عمدہ عمارت کی بنی ہوئی ہیں اور موٹے موٹے سیٹھ بڑے بڑے پیٹ والے جن سے بازار کو رونق ہوتی ہے، بیٹھے ہیں اور ان کے آگے جواہرات اور لعل اور موتیوں اور ہیروں، روپوں اور اشرفیوں کے ڈھیر لگ رہے ہیں اور قسما قسم کی دکانیں خوبصورت اسباب سے جگمگا رہی ہیں۔ یکے، بگھیاں، ٹمٹم، فٹن، پالکیاں، گھوڑے

شکر میں، پیدل اور اس قدر بازار میں آتے جاتے ہیں کہ مونڈھے سے مونڈھا بھڑ کر چلتا ہے اور راستہ بمشکل ملتا ہے۔"

(تذکرہ مجموعہ الہامات طبع دوم، ص 34-433)

مرزا قادیانی نے بر بنائے الہام یہ بھی کہا تھا کہ:

"حضرت خلیفۃ المسیح ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز فرماتے ہیں: مجھے یاد ہے اس میدان سے جاتے ہوئے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنا ایک رؤیا سنایا تھا کہ قادیاں بیاس تک پھیلا ہوا ہے اور مشرق کی طرف بھی بہت دور تک اس کی آبادی چلی گئی ہے۔" (تذکرہ مجموعہ الہامات طبع دوم ص 779)

میں قادیاں کے ویران بازار میں کھڑا اس الہام پر غور کر رہا تھا تو اس الہام کے تار و پود تارِ عنکبوت کی طرح ہوا میں ہچکولے کھاتے ہوئے نظر آتے تھے۔ یہاں بڑی بڑی توندوں والے جواہرات کا کاروبار کرنے والے سیٹھ تو کجا، خالی شکم مرجھائے ہوئے چہروں والے ٹٹ پونجیے دکاندار نظر آ رہے تھے جو قادیاں کے ایک گوشے میں سمٹ آئے تھے۔ قادیاں پھیلنے کی بجائے اب سمٹ چکا تھا۔

جون 1981ء کے دوسرے ہفتے مجھے ایک دوست کی بیٹی کی شادی کی تقریب میں شرکت کی غرض سے امرتسر جانے کا اتفاق ہوا۔ مورخہ 12 جون کو میں فرصت نکال کر امرتسر سے بٹالہ گیا اور وہاں خانقاہ قادریہ فاضلیہ میں حضرت ابوالفرح فاضل الدینؒ اور ان کے احفاد کے مزارات کی زیارت کی۔ میں بٹالہ سے کلانور جانا چاہتا تھا لیکن کافی انتظار کے باوجود بس نہ مل سکی۔ اتنے میں ایک خوبصورت بس، بس سٹینڈ میں داخل ہوئی۔ میرے استفسار پر ڈرائیور نے بتایا کہ وہ بس قادیان جا رہی ہے۔ میرا اس روز قادیان جانے کا کوئی ارادہ نہ تھا لیکن بس جاتی دیکھ کر طبیعت مچل گئی اور میں بٹالہ سے کوئی بیس منٹ میں قادیان پہنچ گیا۔

قادیان کے بس سٹینڈ کے قریب ہی ایک ادھیڑ عمر مرزائی سے مڈبھیڑ ہوئی۔ اس نے ایک ہاتھ میں رسید بک تھامی ہوئی تھی۔ شاید وہ بازار میں چندہ جمع کرنے نکلا تھا۔ میں نے اس سے انجمن احمدیہ کے دفاتر کی طرف جانے کا راستہ پوچھا تو اس نے پہلا سوال یہ کیا کہ آپ کہاں سے آئے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ علی گڑھ سے آیا ہوں۔ وہ فوراً بولا کہ وہاں ہمارے فلاں فلاں طالب علم پڑھتے ہیں آپ ان سے واقف ہیں؟ میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ کہنے لگا اگر میں کچھ دیر انتظار کر لوں تو وہ مجھے اپنے ساتھ لے جائے گا۔ میں نے کہا کہ میں ذرا عجلت میں ہوں اس لیے مجھے صرف راستہ بتا دو۔ اس نے راستہ بتایا تو میں پُرپیچ اور گندی گلیوں سے گزرتا ہوا انجمنِ احمدیہ کے

لشکر میں، پیدل اور اس قدر بازار میں آتے جاتے ہیں کہ مونڈھے سے مونڈھا بھڑ کر چلتا ہے اور راستہ بمشکل ملتا ہے۔''

(تذکرہ مجموعہ الہامات طبع دوم، ص 34-433)

مرزا قادیانی نے بر بنائے الہام یہ بھی کہا تھا کہ:

''حضرت خلیفۃ المسیح ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز فرماتے ہیں: مجھے یاد ہے اس میدان سے جاتے ہوئے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنا ایک رؤیا سنایا تھا کہ قادیاں بیاس تک پھیلا ہوا ہے اور مشرق کی طرف بھی بہت دور تک اس کی آبادی چلی گئی ہے۔'' (تذکرہ مجموعہ الہامات طبع دوم ص 779)

میں قادیاں کے ویران بازار میں کھڑا اس الہام پر غور کر رہا تھا تو اس الہام کے تار و پود تارِ عنکبوت کی طرح ہوا میں ہچکولے کھاتے ہوئے نظر آتے تھے۔ یہاں بڑی بڑی توندوں والے جواہرات کا کاروبار کرنے والے سیٹھ تو کجا، خالی شکم مرجھائے ہوئے چہروں والے ٹٹ پونجیے دکاندار نظر آ رہے تھے جو قادیاں کے ایک گوشے میں سمٹ آئے تھے۔ قادیاں پھیلنے کی بجائے اب سمٹ چکا تھا۔

جون 1981ء کے دوسرے ہفتے مجھے ایک دوست کی بیٹی کی شادی کی تقریب میں شرکت کی غرض سے امرتسر جانے کا اتفاق ہوا۔ مورخہ 12 جون کو میں فرصت نکال کر امرتسر سے بٹالہ گیا اور وہاں خانقاہ قادریہ فاضلیہ میں حضرت ابوالفرح فاضل الدینؒ اور ان کے احفاد کے مزارات کی زیارت کی۔ میں بٹالہ سے کلانور جانا چاہتا تھا لیکن کافی انتظار کے باوجود بس نہ مل سکی۔ اتنے میں ایک خوبصورت بس، بس سٹینڈ میں داخل ہوئی۔ میرے استفسار پر ڈرائیور نے بتایا کہ وہ بس قادیان جا رہی ہے۔ میرا اس روز قادیان جانے کا کوئی ارادہ نہ تھا لیکن بس جاتی دیکھ کر طبیعت مچل گئی اور میں بٹالہ سے کوئی بیس منٹ میں قادیان پہنچ گیا۔

قادیان کے بس سٹینڈ کے قریب ہی ایک ادھیڑ عمر مرزائی سے مڈبھیڑ ہوئی۔ اس نے ایک ہاتھ میں رسید بک تھامی ہوئی تھی۔ شاید وہ بازار میں چندہ جمع کرنے نکلا تھا۔ میں نے اس سے انجمن احمدیہ کے دفاتر کی طرف جانے کا راستہ پوچھا تو اس نے پہلا سوال یہ کیا کہ آپ کہاں سے آئے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ علی گڑھ سے آیا ہوں۔ وہ فوراً بولا کہ وہاں ہمارے فلاں فلاں طالب علم پڑھتے ہیں آپ ان سے واقف ہیں؟ میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ کہنے لگا اگر میں کچھ دیر انتظار کر لوں تو وہ مجھے اپنے ساتھ لے جائے گا۔ میں نے کہا کہ میں ذرا عجلت میں ہوں اس لیے مجھے صرف راستہ بتا دو۔ اس نے راستہ بتایا تو میں پُر پیچ اور گندی گلیوں سے گزرتا ہوا انجمنِ احمدیہ کے

دفاتر کے پاس پہنچ گیا۔ مرزائیوں کے مخصوص بازار میں دکانیں کھلی تھیں اور ان پر سائن بورڈ آویزاں تھے۔ ایک طبیب کے مطب پر نظر پڑی تو اس نے حکیم عبدالواحد درویش نمبر 52 کا بورڈ لگایا ہوا تھا۔ وہ شکل و شباہت سے پٹھان معلوم ہوتا تھا اور اس نے پٹھانوں کی طرز پر پیچدار مشہدی پگڑی باندھی ہوئی تھی۔ اسی جگہ میں نے ایک اور پٹھان کو اسی طرز کی پگڑی باندھے ہوئے سائیکل پر بہشتی مقبرے کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔

بازار میں دبلے پتلے سیاہ فام بہاری مرزائی آتے جاتے دکھائی دیے۔ ان کے چہروں پر فرنچ کٹ داڑھیاں اور کلونس ایک عجیب سماں باندھ رہے تھے۔ میں ان سے لاتعلق ہو کر جامعۂ احمدیہ کی طرف مڑ گیا۔

جامعۂ احمدیہ میں مرزائیت کی تبلیغ کے لیے مبلغ تیار کیے جاتے ہیں۔ دوپہر کا وقت تھا، اس لیے مجھے کوئی زیرِ تربیت مبلغ نظر نہیں آیا۔ جامعۂ احمدیہ والی گلی میں ایک مکان کے باہر ''خدام الاحمدیہ'' کا بورڈ آویزاں تھا اور ایک کوٹھڑی کے دروازے پر "لجنہ اماء اللّٰہ" کی تختی لگی ہوئی تھی۔ ایک مکان میں ''جماعت احمدیہ قادیان'' کا دفتر تھا۔ یہ جماعت صرف قادیان میں رہنے والے مرزائیوں کے مسائل حل کرتی ہے۔

اسی گلی میں تعلیم الاسلام ہائی سکول تھا، جو اب حکومت کی تحویل میں ہے۔ جس وقت میں وہاں سے گزرا، اس وقت ایک سکھ ماسٹر ایک غبی مرزائی طالب علم کا ردیف قافیہ درست کر رہا تھا۔ اسی گلی میں مہمان خانہ بھی ہے، جہاں مجھے گذشتہ سفرِ قادیان میں قیام کرنے کی دعوت ملی تھی۔

اسی گلی کے خاتمہ پر ایک بڑا سا جوہڑ ہے جسے عرفِ عام میں ''ڈھاب'' کہتے ہیں۔ اسی ڈھاب میں ہوس کا شکار معصوم لڑکیاں اپنے گناہوں پر پردہ ڈالنے کی غرض سے خودکشی کیا کرتی تھیں یا ان کا گلا گھونٹ کر رات کے اندھیرے میں ڈھاب میں پھینک دیا جاتا تھا۔

میں اسی خونی ڈھاب کے کنارے چلتا ہوا بہشتی مقبرے کی طرف بڑھا۔ ڈھاب سے بہشتی مقبرے کا فاصلہ بمشکل ایک فرلانگ ہوگا۔ مقبرے کے اردگرد ایک مضبوط اور بلند چار دیواری ہے۔ میں ایک آہنی پھاٹک سے گزر کر بہشتی مقبرے میں داخل ہوا۔ کلکتہ کے ایک مرزائی تاجر نے بہشتی مقبرے کی آرائش کے لیے کافی رقم خرچ کی ہے۔ میں پھاٹک سے گزر کر سیدھا جنازہ گاہ کی طرف بڑھا۔ اس کے قریب ہی درختوں کے ایک جھنڈ میں ایک پتھر نصب ہے جس پر ''ظہورِ قدرتِ ثانیہ'' کندہ ہے۔ اس پتھر پر منقوش ایک عبارت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی کی نماز جنازہ کے بعد اس مقام پر حکیم نورالدین بھیروی کے ہاتھ پر بیعت خلافت ہوئی تھی۔ اس روایت

دفاتر کے پاس پہنچ گیا۔ مرزائیوں کے مخصوص بازار میں دکانیں کھلی تھیں اور ان پر سائن بورڈ آویزاں تھے۔ ایک طبیب کے مطب پر نظر پڑی تو اس نے حکیم عبدالواحد درویش نمبر 52 کا بورڈ لگایا ہوا تھا۔ وہ شکل و شباہت سے پٹھان معلوم ہوتا تھا اور اس نے پٹھانوں کی طرز پر پیچدار مشہدی پگڑی باندھی ہوئی تھی۔ اسی جگہ میں نے ایک اور پٹھان کو اسی طرز کی پگڑی باندھے ہوئے سائیکل پر بہشتی مقبرے کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔

بازار میں دبلے پتلے سیاہ فام بہاری مرزائی آتے جاتے دکھائی دیے۔ ان کے چہروں پر فرنچ کٹ داڑھیاں اور کلونس ایک عجیب سماں باندھ رہے تھے۔ میں ان سے لاتعلق ہو کر جامعۂ احمدیہ کی طرف مڑ گیا۔

جامعۂ احمدیہ میں مرزائیت کی تبلیغ کے لیے مبلغ تیار کیے جاتے ہیں۔ دوپہر کا وقت تھا، اس لیے مجھے کوئی زیرِ تربیت مبلغ نظر نہیں آیا۔ جامعۂ احمدیہ والی گلی میں ایک مکان کے باہر ''خدام الاحمدیہ'' کا بورڈ آویزاں تھا اور ایک کوٹھڑی کے دروازے پر "لجنہ اماء اللہ" کی تختی لگی ہوئی تھی۔ ایک مکان میں ''جماعت احمدیہ قادیان'' کا دفتر تھا۔ یہ جماعت صرف قادیان میں رہنے والے مرزائیوں کے مسائل حل کرتی ہے۔

اسی گلی میں تعلیم الاسلام ہائی سکول تھا، جو اب حکومت کی تحویل میں ہے۔ جس وقت میں وہاں سے گزرا، اس وقت ایک سکھ ماسٹر ایک غبی مرزائی طالب علم کا ردیف قافیہ درست کر رہا تھا۔ اسی گلی میں مہمان خانہ بھی ہے، جہاں مجھے گذشتہ سفرِ قادیان میں قیام کرنے کی دعوت ملی تھی۔

اسی گلی کے خاتمہ پر ایک بڑا سا جوہڑ ہے جسے عرف عام میں ''ڈھاب'' کہتے ہیں۔ اسی ڈھاب میں ہوس کا شکار معصوم لڑکیاں اپنے گناہوں پر پردہ ڈالنے کی غرض سے خودکشی کیا کرتی تھیں یا ان کا گلا گھونٹ کر رات کے اندھیرے میں ڈھاب میں پھینک دیا جاتا تھا۔

میں اسی خونی ڈھاب کے کنارے چلتا ہوا بہشتی مقبرے کی طرف بڑھا۔ ڈھاب سے بہشتی مقبرے کا فاصلہ بمشکل ایک فرلانگ ہوگا۔ مقبرے کے اردگرد ایک مضبوط اور بلند چار دیواری ہے۔ میں ایک آہنی پھاٹک سے گزر کر بہشتی مقبرے میں داخل ہوا۔ کلکتہ کے ایک مرزائی تاجر نے بہشتی مقبرے کی آرائش کے لیے کافی رقم خرچ کی ہے۔ میں پھاٹک سے گزر کر سیدھا جنازہ گاہ کی طرف بڑھا۔ اس کے قریب ہی درختوں کے ایک جھنڈ میں ایک پتھر نصب ہے جس پر ''ظہورِ قدرتِ ثانیہ'' کندہ ہے۔ اس پتھر پر منقوش ایک عبارت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی کی نماز جنازہ کے بعد اس مقام پر حکیم نورالدین بھیروی کے ہاتھ پر بیعت خلافت ہوئی تھی۔ اس روایت

کے راوی ''بھائی عبدالرحمٰن قادیانی'' کا نام بھی پتھر پر درج ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں مرزا غلام احمد قادیانی کو الہام ہوا تھا کہ وہ مسیحِ موعود ہے۔ بھائی عبدالرحمٰن پیدائشی سکھ تھا لیکن بعد میں مرزائی ہو گیا تھا۔ اس کا شمار مرزا غلام احمد کے خواص میں ہوتا ہے۔ وہ اس بیعت کا عینی شاہد تھا، اس لیے اس کی روایت اور نشاندہی پر اس تاریخی مقام پر پتھر نصب کر دیا گیا ہے۔

بھائی عبدالرحمٰن آزادی کے بعد پاکستان آ گیا تھا۔ اس کا انتقال ربوہ میں ہوا اور اس کی میت تدفین کے لیے قادیان لے جائی گئی اور اسے بہشتی مقبرہ میں ''خواص'' کی صف میں دفن کیا گیا۔ یہ پہلی اور غالباً آخری مثال ہے کہ کسی مرزائی کی میت تدفین کے لیے پاکستان سے قادیان لے جائی گئی ہو، ورنہ مرزا بشیرالدین محمود اور ان کی ماں نصرت جہاں بھی اس ''سعادت'' سے محروم رہے ہیں۔ ربوہ میں بشیرالدین محمود کی قبر پر ایک تختی نصب ہے جس پر یہ لکھا ہوا ہے کہ اس کے معتقدین کا یہ فرض ہے کہ جب بھی موقع ملے اس کا تابوت ربوہ سے قادیان پہنچا دیا جائے۔ بہشتی مقبرہ میں غلام احمد متنبی کی قبر کے دائیں جانب حکیم نورالدین کی قبر ہے اور بائیں طرف نصرت کے لیے جگہ مخصوص ہے۔

نصرت سے یاد آیا۔ مولانا احمد سعید دہلویؒ بیان کیا کرتے تھے کہ جب نصرت کا غلام احمد کے ساتھ نکاح ہوا تو دلی والیاں اسے وداع کرنے آئیں۔ انھوں نے نصرت کو مخاطب کر کے کہا ''اری نصو سنا ہے کہ تمہارا نکاح کسی پنجابی نبی کے ساتھ ہوا ہے۔'' دلی میں پنجابی کو گنوار سمجھا جاتا ہے اور اس پر طرہ یہ کہ وہ متنبی بھی ہے۔ مولانا احمد سعید کی کرخنداری زبان میں یہ دلچسپ جملہ سن کر جو لطف آتا تھا، وہ بیان سے باہر ہے۔

میں جنازہ گاہ سے مرزا غلام احمد قادیانی کی قبر کی طرف چلا۔ مرزا اور اس کے رشتہ داروں اور خاص خاص دوستوں اور حواریوں کی قبریں ایک مخصوص احاطے کے اندر ہیں۔ اس احاطے کے باہر ایک ہینڈ پمپ نصب ہے جس کا پانی مرزائیوں کے نزدیک کوثر و سلسبیل کے پانی کا حکم رکھتا ہے۔ مجھے اس وقت پیاس محسوس ہو رہی تھی لیکن اس کے باوجود میں نے اس پمپ کا پانی پینا مناسب نہ سمجھا۔

مرزا غلام احمد اور حکیم نورالدین کی قبروں کے جانب غرب ایک ''مواجہہ'' بنایا گیا ہے اور ایک ایسا ہی مواجہہ جانب جنوب بھی ہے جسے میں اپنے پہلے سفر قادیان میں نہیں دیکھ سکا تھا۔ جنوبی مواجہے کے قریب مرزا بشیرالدین محمود کی تین بیویاں دفن ہیں۔ ان میں سے ایک بیوی ام طاہر موجودہ سربراہ طاہر احمد کی ماں ہے۔ دوسری بیوی سارہ کے بطن سے طاہر احمد کا حریف مرزا رفیع احمد ہے۔ تیسری بیوی کا نام اس وقت میرے ذہن میں نہیں رہا۔ وہ لجنہ اماء اللہ کی سیکرٹری تھی۔

ان میں سے ایک بیوی کی لوحِ مزار پر بشیرالدین محمود نے ایک طویل عبارت کندہ کروائی

ہے اور اس میں اس بات کا ادعا کیا گیا ہے کہ مرزا بشیر الدین محمود کے لیے اس کا انتخاب مرزا غلام احمد نے بذریعہ الہام کیا تھا۔ چند روز قبل میں نے اس کا ذکر مرزا شفیق سے کیا تو انھوں نے کہا کہ باپ کے لیے بذریعہ الہام جس خاتون (محمدی بیگم) کا انتخاب خالق کون و مکان نے کیا تھا، وہ تو اسے مل نہ سکی، بیٹے کو وحی کے ذریعہ کیسے مل گئی؟

بہشتی مقبرے میں مدفون لوگوں کی قبروں کے اندر جو حالت ہو گی وہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ امام حسن بصریؒ فرمایا کرتے تھے کہ لوگ جس خطۂ زمین کو شہر خموشاں کہتے ہیں، اگر انھیں یہ معلوم ہو جائے کہ وہاں مدفون لوگوں کے ساتھ کیا بیت رہی ہے تو لوگ مارے ڈر کے اپنے مردے وہاں لانے سے انکار کر دیں۔ بس ایسا ہی معاملہ بہشتی مقبرہ میں دفن مردوں کے ساتھ پیش آ رہا ہوگا۔

بہشتی مقبرے میں مخصوص خطے کے باہر جانب غرب ''مرزا کے خواص'' کی قبریں ہیں۔ جن کی الواح پر ان کی نمایاں خدمات منقوش ہیں اور جانب جنوب ان موصیوں کی قبریں ہیں جنھوں نے اپنی جائیداد میں سے 1/10 کی وصیت انجمن احمدیہ کے لیے کی تھی۔ کئی جگہ صرف الواح نصب ہیں اور قبروں کا نشان نظر نہیں آتا۔ ان پر اُن موصیوں کے نام کندہ ہیں جنھوں نے یہاں دفن ہونا تھا لیکن کسی وجہ سے ان کی میتیں یہاں نہیں پہنچ سکی ہیں۔ اب ان کے نام کی الواح درج ہیں اور جب زائرین بہشتی مقبرہ میں مدفون ''خوش قسمت'' مرزائیوں کے لیے مغفرت کی دعا کرتے ہیں تو وہ بھی دعا میں شامل ہو جاتے ہیں۔

''حواریوں'' کی قبروں کے سرہانے ایک لمبا چوڑا بورڈ نصب ہے جس پر یہ نوید لکھی ہوئی ہے کہ حضرت مسیح موعود (مرزا) کو یہ الہام ہوا تھا کہ بہشتی مقبرہ میں دفن ہونے سے کوئی شخص بہشتی نہیں ہو جائے گا بلکہ بہشتی ہی اس میں دفن ہوگا۔'' یہ ناک کو بجائے سیدھی طرح پکڑنے کے ہاتھ گھما کر پکڑنے کے مترادف ہے۔

مرزا غلام احمد قادیانی کے الہام اسی طرح کے ہوا کرتے تھے۔ ایک بار اس پر یہ وحی نازل ہوئی ''غثم۔ غثم۔ غثم'' حضرت اقدس فرماتے ہیں کہ وہ اس وحی کا مطلب نہیں سمجھ سکے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ نبی ہی کیا جو وحی کا مفہوم نہ سمجھ سکے۔ ایک بار حضرت کے پیٹ میں درد اٹھا۔ انھوں نے عالم رؤیا میں دیکھا کہ ایک فرشتہ غالباً ''ٹیچی ٹیچی'' جو ''حضرت اقدس'' پر وحی لے کر آیا کرتا تھا، ان کے سامنے کھڑا ہے اور اس کی مٹھی بند ہے۔ اس نے حضرت کے سامنے اپنی مٹھی کھولی تو اس کی ہتھیلی پر ایک میٹھی گولی پڑی تھی جس پر ''خاکسار پیپرمنٹ'' لکھا ہوا تھا۔

میٹھی گولی سے بات چلی ہے تو آیئے مرزا بشیر احمد ایم اے کی تصنیف ''سیرت المہدی''

بھی دیکھتے چلیں۔ فرزند ارجمند اپنے والد بزرگوار کے بارے میں لکھتے ہیں کہ حضرت کو گڑ کھانے کا بڑا شوق تھا اور ان کے کوٹ کی ایک جیب میں گڑ کی ڈلیاں پڑی رہتی تھیں۔ جس زمانے میں حضرت کو سلسل البول کی تکلیف لاحق ہوئی تو موصوف کوٹ کی دوسری جیب میں استنجے کے ڈھیلے رکھنے لگے۔ بارہا ایسا ہوتا کہ حضرت مسیح موعود گڑ کھانے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالتے اور بے دھیانی کے عالم میں مٹی کا ڈھیلا منہ میں ڈال لیتے۔'' سبحان اللہ جو شخص استنجے کے ڈھیلے اور گڑ کی ڈلی میں تمیز نہ کر سکے، وہ ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منہ آئے اور ہمسری کا دعویٰ کرے۔

میں جس وقت مرزا غلام احمد قادیانی کی قبر سے پھاٹک کی طرف روانہ ہوا تو ایک نئی بات مشاہدہ میں آئی۔ مخصوص احاطے سے جو سڑک پھاٹک کی طرف جاتی ہے، وہ منارۃ المسیح کی عین سیدھ میں ہے جس طرح فیصل آباد کے کسی بھی بازار میں کھڑے ہو کر دیکھیں تو گھنٹہ گھر بالکل سامنے نظر آتا ہے بعینہٖ اس سڑک سے منارۃ المسیح سامنے نظر آ رہا تھا۔ دو سال قبل پہلی بار جب میں قادیان گیا تھا، تو اس وقت اس منار کے گرد سنگ مرمر کی سلیں لگا رہے تھے۔ اب یہ کام مکمل ہو گیا ہے۔

مرزائیوں کے ذہن کا ایک پیچ ڈھیلا ہوتا ہے اس لیے ان کی ہر منطق نرالی ہوتی ہے۔ ''منارۃ المسیح'' کی تعمیر کے بارے میں عرض ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے مسیح موعود ہونے کا دعویٰ پہلے کیا اور جس منار پر مسیح نے نازل ہونا تھا وہ بعد میں بنایا گیا۔ مرزائی اس کی آرائش و زیبائش میں اس قدر دلچسپی لے رہے ہیں جیسے اب کوئی اور بلا نازل ہونے والی ہے، جس کے استقبال کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔

بہشتی مقبرے سے نکل کر میں سیدھا بس سٹینڈ کی طرف روانہ ہوا، راستے میں ایک اور بات مشاہدہ میں آئی کہ گلیوں میں موٹے تازے چوہے مرے پڑے تھے۔ میں نے دل میں سوچا کہ شاید اس مقہور بستی میں کوئی وبا پھوٹنے والی ہے کیونکہ طاعون پھیلنے سے پہلے چوہے مرنے لگتے ہیں۔

بس سٹینڈ پر پہنچتے ہی مجھے بس مل گئی اور میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں امرتسر پہنچ گیا۔

بہشتی مقبرہ

قادیاں میں بہشتی مقبرہ کے نام سے ایک قبرستان ہے جس کی تقدیس کے متعلق مرزائیوں کے عقائد درج ذیل ہیں:

تقسیم کے بعد انہی شرائط کے تحت موصی صاحبان کے لیے ربوہ میں ایک قطعہ خاص کر لیا گیا۔ ملک اور بیرونِ ملک سے مرزائیوں کی لاشیں لائی جاتی ہیں، اور اس قطعہ میں امانتاً دفن کی جاتی ہیں کیونکہ اصل جنت کا ٹکڑا قادیاں میں ہے اور خوشخبری دی جاتی ہے کہ جوں ہی متوفی کے ورثاء کو انجمن کے کارپردازان

مصالح قبرستان ربوہ کی طرف سے اجازت ہوئی ان لاشوں کو قادیاں پہنچا دیا جائے گا۔ جن لوگوں نے شرائط پوری نہیں کیں، وہ چاہے جنرل اختر حسین ملک ایسے جرنیل ہوں، بہشتی مقبرہ میں جگہ نہیں مل سکی۔ (مرتب)

''ایک جگہ مجھے دکھلائی گئی اور اس کا نام بہشتی مقبرہ رکھا گیا۔ اور ظاہر کیا گیا کہ وہ ان برگزیدہ جماعت کے لوگوں کی قبریں ہیں جو بہشتی ہیں چونکہ اس قبرستان کے لیے بڑی بھاری بشارتیں مجھے ملی ہیں اور نہ صرف خدا نے یہ فرمایا کہ یہ مقبرہ بہشتی ہے بلکہ یہ بھی فرمایا کہ **انزل فیھا کل رحمة**.اس لیے خدا نے میرا دل اپنی وحی خفی سے اس طرف مائل کیا کہ ایسے قبرستان کے لیے ایسی شرائط لگا دی جائیں کہ وہی لوگ اس میں داخل ہوسکیں جو اپنے صدق دل اور کامل راستبازی کی وجہ سے ان شرائط کے پابند ہوں۔''

-1 پہلی شرط یہ ہے کہ ہر ایک شخص جو اسی قبرستان میں دفن ہونا چاہتا ہے، وہ اپنی حیثیت کے لحاظ سے ان مصارف (تکمیلِ احاطہ وغیرہ) کے لیے چندہ داخل کرے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ تمام جماعت میں سے اس قبرستان میں وہی مدفون ہوگا جو یہ وصیت کرے کہ اس کی موت کے بعد وہ دسواں حصہ اس کے تمام ترکہ کا حسب ہدایت اس سلسلہ کے اشاعتِ اسلام اور تبلیغ احکام قرآن میں خرچ ہوگا کہ ایک صادق کامل الایمان کو اختیار ہوگا کہ اپنی وصیت میں اس سے زیادہ لکھ دے۔ تیسری شرط یہ ہے کہ اس قبرستان میں دفن ہونے والا متقی ہو، اور محرمات سے پرہیز کرتا ہو۔ سچا اور صاف مسلمان ہو۔ ہر ایک میت جو قادیان کی زمین میں فوت نہیں ہوئی، ان کو بجز صندوق قادیاں میں لانا ناجائز ہوگا اور نیز ضروری ہوگا کہ کم ازکم ایک ماہ پہلے اطلاع دیں۔ اگر کوئی صاحب خدانخواستہ طاعون کے مرض سے فوت ہوں ان کی نسبت یہ ضروری حکم ہے کہ وہ دو برس تک صندوق میں رکھ کر کسی علیحدہ مکان میں امانت کے طور پر دفن کیے جائیں۔ (کیونکہ طاعون سے متوفی پر دو برس تک بہشتی مقبرہ کی رحمتیں نازل نہیں ہوتیں۔ (مرتب)

اگر کوئی دسواں حصہ جائیداد کی وصیت کرے اور اتفاقاً ان کی موت ایسی ہو کہ مثلاً کسی دریا میں غرق ہوکر ان کا انتقال ہو یا کسی اور ملک میں وفات پائیں جہاں سے میت کو لانا معتذر ہو تو ان کی وصیت قائم رہے گی۔ اور خدا تعالیٰ کے نزدیک ایسا ہی ہوگا کہ گویا وہ اس قبرستان میں دفن ہوئے ہیں اور جائز ہوگا کہ ان کی یادگاریں اسی قبرستان میں ایک کتبہ اینٹ یا پتھر پر لکھ کر نصب کیا جائے اور اس پر واقعات لکھے جائیں۔ اگر خدانخواستہ کوئی ایسا شخص ہو جو رسالہ الوصیت کی رو سے وصیت کرتا ہے۔ مجذوم ہو جس کی جسمانی حالت اس لائق نہ ہو جو وہ قبرستان میں لایا جائے تو ایسا شخص حسب مصالح ظاہری مناسب نہیں ہے کہ اس قبرستان میں لایا جائے۔

''میری نسبت اور میرے اہل و عیال کی نسبت خدا نے استثناء رکھا ہے۔ باقی ہر ایک مرد ہو یا عورت ہو ان کو ان شرائط کی پابندی لازم ہوگی اور شکایت کرنے والا منافق ہوگا۔'' (خود غرضی اور حفظ ماتقدم) (مرتب) (الوصیۃ ص 11 تا 23 مصنفہ مرزا غلام قادیانی)

-2 مقبرہ بہشتی اس سلسلہ کا ایک ایسا مرکزی نقطہ ہے اور ایسا عظیم الشان انسٹی ٹیوشن یعنی محکمہ ہے، جس کی اہمیت ہر دوسرے محکمہ سے بڑھ کر ہے۔ (1/10 حصہ جائیداد ملنے سے اطراف ملک

میں جائیداد ہی جائیداد ہوگی۔) (مرتب)

یہ وہ نعمت ہے کہ جس کو آدم کے وقت سے اس وقت تک کے لوگ ترستے مر گئے۔ گویا یہ معلوم ہوتا ہے کہ آدم اول کو جب شیطان نے ایک عارضی بہشت سے نکالا تھا تو اس کی تلافی کے لیے چھ ہزار سال بعد پھر آدم ثانی کی معرفت یہ محکمہ دائمی جنت میں داخل ہونے کا اللہ تعالیٰ نے نسل انسانی کے لیے کھولا ہے۔ (فردوس اعلیٰ عارضی جنت، بہشتی مقبرہ دائمی جنت نعوذ باللہ)

اگلے زمانہ میں انبیاء اپنے بعض خاص خاص مقبروں کو بہشت میں داخل ہونے کی بشارت دیا کرتے تھے اور یہاں تو یہ نظر آتا ہے کہ بہشت کا دروازہ کھل گیا ہے۔ صرف ذرا کھڑا ہونے اور قدم اٹھانے کی ضرورت ہے۔

(اس میں بھی مرزا غلام احمد قادیانی کے سب نبیوں سے افضل ہونے کا اشارہ ہے) (مرتب)

(اخبار الفضل قادیان جلد 24 نمبر 65، 15 ستمبر 1936ء)

-3 آج تمھارے لیے ابوبکر و عمر سی فضیلت حاصل کرنے کا موقع ہے اور وہ بہشتی مقام موجود ہے جہاں تم وصیت کر کے اپنے پیارے آقا المسیح الموعود کے قدموں میں دفن ہو سکتے ہو۔ اور چونکہ حدیثوں میں آیا ہے کہ مسیح موعود رسول کریم کی قبر میں دفن ہوگا اس لیے تم اس مقبرہ میں دفن ہو کر خود رسول اکرم کے پہلو میں دفن ہو گے۔ اور تمھارے لیے اس خصوصیت میں ابوبکر کے ہم پلہ ہونے کا موقع ہے۔'' (شیدایان رسول اکرم غور فرمائیں)

(اعلان مندرجہ الفضل قادیان جلد 3 نمبر 299 فروری 1915ء)

(مولانا محمد شریف جالندھریؒ)

میں جائیداد ہی جائیداد ہوگی۔)(مرتب)

یہ وہ نعمت ہے کہ جس کو آدم کے وقت سے اس وقت تک کے لوگ ترستے مر گئے۔ گویا یہ معلوم ہوتا ہے کہ آدم اول کو جب شیطان نے ایک عارضی بہشت سے نکالا تھا تو اس کی تلافی کے لیے چھ ہزار سال بعد پھر آدم ثانی کی معرفت یہ محکمہ دائمی جنت میں داخل ہونے کا اللہ تعالیٰ نے نسل انسانی کے لیے کھولا ہے۔ (فردوس اعلیٰ عارضی جنت، بہشتی مقبرہ دائمی جنت نعوذ باللہ)

اگلے زمانہ میں انبیاء اپنے بعض خاص خاص مقبروں کو بہشت میں داخل ہونے کی بشارت دیا کرتے تھے اور یہاں تو یہ نظر آتا ہے کہ بہشت کا دروازہ کھل گیا ہے۔ صرف ذرا کھڑا ہونے اور قدم اٹھانے کی ضرورت ہے۔

(اس میں بھی مرزا غلام احمد قادیانی کے سب نبیوں سے افضل ہونے کا اشارہ ہے)(مرتب)

(اخبار الفضل قادیان جلد 24 نمبر 65، 15 ستمبر 1936ء)

-3 آج تمھارے لیے ابوبکر وعمر سی فضیلت حاصل کرنے کا موقع ہے اور وہ بہشتی مقام موجود ہے جہاں تم وصیت کر کے اپنے پیارے آقا المسیح الموعود کے قدموں میں دفن ہو سکتے ہو۔ اور چونکہ حدیثوں میں آیا ہے کہ مسیح موعود رسول کریم کی قبر میں دفن ہوگا اس لیے تم اس مقبرہ میں دفن ہو کر خود رسول اکرم کے پہلو میں دفن ہو گے۔ اور تمھارے لیے اس خصوصیت میں ابوبکر کے ہم پلہ ہونے کا موقع ہے۔" (شیدایان رسول اکرم غور فرمائیں)

(اعلان مندرجہ الفضل قادیان جلد 3 نمبر 299 فروری 1915ء)

(مولانا محمد شریف جالندھریؒ)

عبداللہ

قادیانی ریاست کا نقشہ

حال ہی میں قادیان اور مضافاتِ قادیان کا ایک نقشہ مرزا محمود کے برادر مرزا بشیر نے شائع کیا ہے جس میں تمام دیہات کے راستے، پُل، نہریں، سڑکیں، فاصلہ دکھاتے ہوئے ہندو، سکھ، مسلمان آبادی کا تناسب بھی درج کیا گیا ہے۔ اس نقشہ کو مرزا محمود کے خاندان نے ابتداءً انتہائی پرائیویٹ طریقہ سے فروخت کیا اور راز کھلنے کے بعد اسے ایک معمولی چیز ظاہر کر کے بذریعہ اشتہار فروخت کیا جا رہا ہے۔ اگر قادیان میں ان لوگوں کا وجود نہ ہوتا جنھیں مرزا محمود منافقین کے نام سے موسوم کرتا ہے، یعنی جو اپنی مجبوریوں سے بظاہر مرزائی ہیں، لیکن ان کے دل تائب ہو چکے ہیں، تو شاید یہ نقشہ ہم تک فوراً نہ پہنچتا، لیکن انھی اصحاب کی بدولت یہ قیمتی دستاویز ہم تک پہنچ گئی تھی۔

نواحِ قادیان کے دیہات اس سال آباد نہیں ہوئے جوان کی پیمائش کا خیال مرزا محمود کو آیا۔ یہ دیہات عرصۂ دراز سے آباد ہیں اور مرزائی پارٹی بارہا ان کی گشت کر چکی ہے۔ سوال یہ ہے کہ آخر اس نقشہ کی ضرورت کیا پیش آئی۔ کونسی وہ مہم ہے جو طے ہونے والی ہے۔

ہمیں خوب معلوم ہے کہ مرزا محمود کا دماغ اپنی پارٹی سے روپیہ جمع کرنے کے لیے خوب کام کرتا ہے۔ کہیں بہشتی مقبرہ ہے، کہیں کوئی تجارتی شعبہ، کہیں لنڈن میں مسجد (جو دراصل اپنے خاندان یا دوستوں کے لیے قیامگاہ ہے) کا اعلان ہے، کہیں ہجرت کا شوق دلا کر زمین فروخت کرنے کی تجارت ہے۔ غرضیکہ آئے دن نت نئے طریق سے روپیہ وصول کر کے سندھ میں جائیداد خریدنے کی فکر دامنگیر ہے کیونکہ آخر انھیں معلوم ہے کہ یہ پیری مریدی کتنا عرصہ قائم رہے گی۔ جناب شیخ عبدالرحمٰن صاحب مصری بی۔ اے جیسے مخلص علیحدہ ہو گئے تو اور کسی کا کیا اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ حکومت کے خواب والہام اور اپنے غلبہ کی پیشگوئیاں سناتے سناتے نصف صدی گزر گئی ہے اور مزید بھی یہ باتیں سنتے سنتے تھک گئے ہیں تو فوراً یہ نقشہ طبع ہو گیا۔ اگر یہی نقشہ کوئی اور شائع کرتا تو قیمت دو آنہ سے زیادہ نہ ہوتی مگر چونکہ یہ مرزا محمود کے خاندان نے شائع کیا ہے، اس لیے اس کی قیمت بھی چھ آنہ مقرر ہوئی ہے۔ بعینہٖ جس طرح مرزا محمود نے ایک روپیہ مرلہ کی زمین پچاس اور سو روپیہ مرلہ میں

مریدوں کے ہاتھ فروخت کی۔

نقشہ فروخت کر کے بھی روپیہ وصول کیا جا رہا ہے اور ساتھ ہی جو پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے اس کے ذریعہ بھی چندہ کافی وصول کیا جائے گا۔

یہ تو ہے اس نقشہ میں جلب زر کا پہلو رہا اس سوال کا جواب کہ آخر یہ نقشہ شائع کیوں ہوا؟ اس کا حل بھی وہ پروپیگنڈا ہے جو اس کی فروخت کے ساتھ ساتھ مریدوں میں کیا جا رہا ہے۔

جن اشخاص کے ذریعہ یہ نقشہ فروخت کیا جا رہا ہے وہ کہتے کیا ہیں، سنیے:

حضرت مرزا محمود خدا کے برگزیدہ خلیفہ ہیں۔ آپ کا زمانہ فتوحات کا زمانہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو سیاسی دماغ دیا ہے۔ سیاست کے صحیح معنی یہ ہیں کہ یہ وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتی ہے۔ مرزا غلام احمد قادیانی نے جہاد کو حرام قرار دیا لیکن اگر آپ کے خلیفہ بھی یہی اعتقاد رکھتے تو آج ہماری جماعت ختم ہو جاتی۔ ہم نے جہاد کر کے ہی کارکنانِ مباہلہ کے مکانات جلائے۔ فخر الدین ملتانی، محمد امین پٹھان، حاجی محمد حسین بٹالوی وغیرہ کو اس دنیا سے رخصت کیا۔ قادیان کی پاک بستی کو منافقین سے پاک رکھنے کے لیے لڑنا ہمارا فرض ہے۔ ہمارے خلیفۂ برحق کی فراست اور ان کی بشارتی خوابیں ہماری یہ رہبری کرتی ہیں کہ عنقریب قادیان اور نواحِ قادیان کے ہم مالک ہوں گے۔ یہ ہماری ریاست ہوگی جس میں کسی کا دخل نہ ہوگا۔ بس تیاری کی ضرورت ہے۔ اس نقشہ کو ملاحظہ کرو کس قدر محنت سے تیار کیا گیا ہے۔ وقت کا انتظار کرو جونہی حکم پہنچے فوراً ہماری فوج میں داخل ہو جاؤ۔ اگر سرکاری حکام نے ہماری مصنوعی وفاداری سے متاثر ہو کر تمھیں کوئی ہتھیار دے رکھا ہے تو ہمیں نوٹ کرا دو، تاکہ بوقت ضرورت کام آئے۔ ہمارے پیارے خلیفہ نے قادیان میں کافی تیاری کر لی ہے۔ ہر قسم کے ہتھیار جمع کر لیے ہیں۔ نوجوانوں کو فوجی ٹریننگ دے دی ہے۔ ہمارے آقا نے نہایت ہوشیاری سے حکومت کو دھوکہ دیا۔ اپنے بھائی کو فوجی ٹریننگ بھی حکومت سے دلائی۔ احمدیوں کی ٹریٹوریل فوج اسی غرض سے تو بنائی گئی تھی۔ حکومت پر بھی احسان رکھا اور اپنا کام بھی کر لیا۔

ہمارے رہنما نے نہایت زبردست پروپیگنڈا سے اپنی وفاداری کا انگریز کو یقین دلایا جس کی بدولت ہمارے بہت سے اشخاص بہترین اور پرائیویٹ کاموں پر مامور ہیں۔ ہمارے ذرائع معلومات بھی خاص ہیں۔ مگر دیکھو حکومت کی ظاہری وفاداری کا راگ الاپنے میں ہرگز سستی نہ کرنا۔ اچھا اب میں رخصت ہوتا ہوں۔ یہ باتیں سوائے اپنے خاص آدمیوں کے کسی سے نہ کہنا۔ لو خدا حافظ اب میں رخصت ہوتا ہوں۔ ہماری کامیابی کے لیے دعا کرنا۔ مصیبت کے دن ختم ہوئے۔ اب ہماری ریاست ہوگی، اپنی بادشاہت ہوگی۔ ہاں میں یہ بھول ہی گیا کہ حضور کا ارشاد ہے کہ روپیہ کے بغیر کوئی

کام نہیں ہوسکتا۔ اپنی پارٹی سے زیادہ سے زیادہ روپیہ آخری مرتبہ جمع کر کے حضرت کی خدمت میں منی آرڈر کر دو مگر خیال رہے کہ خط میں یا منی آرڈر کے کوپن پر میری کسی بات کا ذکر نہ کرنا۔ مبادا حکومت ہمارے کسی ارادہ سے واقف ہو جائے۔ خط میں صرف یہی ذکر کیا جائے کہ رقم تبلیغ اشاعت کے لیے بھیج رہا ہوں۔ کوئی بات اشارۃً بھی نہ لکھنا۔ قادیان میں تھانہ کا قیام بھی ہمیں برداشت نہیں لیکن اگر حکومت نے ذرا سا شبہ کر کے بھی ہمارے سر پر کوئی فوج بٹھا دی تو ہماری خیر نہیں۔ ہماری کامیابی کا انحصار مذہبی تبلیغ کے بہانہ سارے کام سرانجام دینا ہے۔ دیکھو میرے تھیلہ میں چند مذہبی کتب کے سوا کچھ بھی نہیں۔ حقیقی کام وہ ہے جو قانون کی گرفت سے بچ کر کیا جائے۔"

یہ وہ پروپیگنڈا ہے جو خفیہ طور پر پھیلایا جا رہا ہے۔ علانیہ تیاری میں بھی کوئی کسر باقی نہیں۔ لاٹھیوں کے گڈے قادیان پہنچ رہے ہیں۔ پختہ مرزائیوں کی فہرستیں تیار ہو رہی ہیں۔ خلیفۂ قادیان اب یہ بھی کہہ رہا ہے کہ "میرے پہلے حکم اختیاری ہوتے تھے (تمہاری مرضی ہوتی تو حصہ لیتے ورنہ نہ سہی) لیکن اب میرا حکم حکم ہوگا نہ ماننے والا جماعت میں نہ رہ سکے گا۔" (الفضل یکم اگست 1940ء) کہیں بٹالہ اور غازی کوٹ میں مسلح مرزائیوں کی نمائش سے مرزائیوں کو حملہ کرنے کی ٹریننگ دی جا رہی ہے۔

یہ نقشہ آج شائع ہوا ہے مگر ہم دس برس قبل اپنی تحقیقات شائع کر چکے ہیں۔ حکومت تک اپنی آواز پہنچا چکے ہیں۔ مگر حکومت نے کبھی ہماری آواز کو سننے کی تکلیف گوارا نہیں کی کیونکہ مرزائیوں نے اپنا ایک فنڈ دعوتوں اور ٹی پارٹیوں کا حکام سے ملاقاتوں کے لیے سفر کرنے کے لیے مقرر کر رکھا ہے۔ ایک طرف قانون شکنی کی جاتی ہے، دوسری طرف ظفر اللہ قادیانی حکام کو وفاداری کا یقین دلانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ آخر حکومت کی آنکھیں اس وقت کھلیں گی جب مرزائیوں کا رخ پبلک سے تبدیل ہو کر براہ راست حکومت سے ہوگا۔ آج پنجاب کے وزیر اعظم سر سکندر حیات خان بالقابہ ہیں۔ ہم ایک مرتبہ ان تک اپنی تحقیقات پہنچانا اپنا فرض سمجھتے ہیں کیونکہ وہ ہمارے لکھے ہوئے مضمون اور زبان کو بہ نسبت ایک انگریز حاکم کے زیادہ بہتر سمجھ سکتے ہیں۔

مرزائی تحریک کوئی مذہبی تحریک نہیں بلکہ خالص سیاسی تحریک ہے جس نے مذہب اور تبلیغ کے بہانہ ایک جتھہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس تحریک کی بنیاد ایک خاندان نے رکھی جو کسی وقت ایک ریاست کا مالک ہونے کا مدعی ہے۔ ہماری تحقیقات کی شہادت قادیانی لٹریچر سے بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ ملاحظہ ہو:

"مرزا غلام مرتضٰی (والد مرزا غلام احمد قادیانی) کے دماغ میں یہ بات سمائی

ہوئی تھی کہ تمام دیہاتِ مقصوبہ کو کسی طرح پھر حاصل کر کے اصلی ریاست قائم کرلیں۔ ان کے رات اور دن اسی دُھن میں گزرتے تھے۔ نہ دن آرام سے کٹتا اور نہ رات چین سے گزرتی۔ زندگی تلخ کامی اور تنگی سے کٹتی اور آئے دن مصیبت پر مصیبت سامنے آ جاتی۔ یہاں تک کہ ایک دفعہ ہندوستان کا پاپیادہ سفر کرنا پڑا۔ ہم لکھ چکے ہیں کہ سکھوں کا وحشی عہد ایک دوزخ تھا۔ آپ (مرزا قادیانی) کے والد اس کوشش میں لگے رہتے تھے کہ کسی طرح اپنے دیہات حاصل کریں اور اسی دھن کی پیروی میں چاہتے تھے کہ آپ (مرزائی قادیانی) ایسی تعلیم پائیں جس سے سرکار میں کوئی بڑا عہدہ لے سکیں۔ تاریاست لینے کا یہی ذریعہ ہو جائے۔ وہ (مرزا غلام مرتضٰی) کسی اور رنگ میں نصیب جاگنے کے خیالات میں سرشار تھے مگر یہاں معاملہ کچھ اور تھا۔

اُن دنوں آپ کے والد صاحب اپنے بعض دیہات کو واپس لینے کے لیے انگریزی عدالتوں میں مقدمات کر رہے تھے۔ انہی مقدمات میں آپ کو بھی لگا دیا اور ساتھ ہی اس کے زمینداری امور کی نگرانی بھی آپ کے ذمہ کر دی......مرزا غلام مرتضٰی کا حال یہ تھا کہ اس آبائی ریاست کے حاصل کرنے کے نقشہ نے انھیں ہمیشہ کے غم اور حزن اور تفکرات کے بحر میں حیران کر رکھا تھا۔ اپنی عمر کی ساری کمائی مقدموں پر لگا دی۔ پر کامیابی نہ ہوئی۔''

(حالاتِ مؤلف براہین احمدیہ ص 59)

یہ عبارت اس امر کے ثبوت کے لیے کافی ہے کہ اس خاندان کے دماغ میں ریاست حاصل کرنے کا تخیل ہے۔ برطانیہ کے متعلق مرزا محمود نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ ذیل میں ملاحظہ فرمائیے۔

''اس کے بعد انگریز آئے تو انھوں نے ہماری خاندانی جاگیر ضبط کر لی اور صرف سات سو روپیہ سالانہ کی ایک اعزازی پنشن نقدی کی صورت میں مقرر کر دی جو ہمارے دادا صاحب کی وفات پر صرف ایک سو اسی رہ گئی، اور پھر تایا صاحب کے بعد بالکل بند ہو گئی۔''

(سیرۃ المہدی ص 33 مصنفہ مرزا بشیر احمد پسر مرزا غلام احمد قادیانی)

’آپ کے دادا سکھوں کی طوائف الملوکی کے زمانہ میں ایک سکھ قبیلہ سے جنگ کرتے ہوئے اپنی ریاست کو کھو بیٹھے۔ گو مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ان کی جائیداد میں سے پچاس گاؤں واگذار کر کے اور اپنی فوج میں اعلیٰ عہدہ دے کر ان کے والد کو پھر دنیاوی لحاظ سے آسودہ حال بنا دیا۔ مگر خدا تعالیٰ چاہتا تھا کہ اس خاندان سے کچھ اور کام لے۔ پس اس نے سکھ حکومت کو تباہ کر کے برطانیہ کی حکومت کو پنجاب میں قائم کر دیا اور اس (حکومتِ برطانیہ) کی آمد کے ساتھ ہی اس ریاست کا خاتمہ ہو گیا جو اس خاندان کو سینکڑوں سال سے حاصل تھی۔ برٹش گورنمنٹ کے نمائندوں نے بڑے مرافعوں کے بعد صرف ایک گاؤں کی ملکیت اور تین گاؤں کی تعلقہ داری آپ کے لیے منظور کی اور باقی سب جائیداد ضبط کی گئی۔‘‘ (تحفہ شہزادہ ویلز ص 30 از مرزا محمود)

ان عبارتوں سے یہ معاملہ کسی وضاحت کا محتاج نہیں رہتا کہ برطانیہ سے بھی یہ خاندان خوش نہیں بلکہ ان کے موہوم جائز حق یا جائیداد کے ضبط کرنے والی یہی سلطنت ہے۔ بہر کیف اس خاندان نے جن خیالات میں پرورش پائی وہ خود ان کی تحریرات سے عیاں ہیں۔ دن رات دیہات یا ریاست کی واپسی کا خیال اور کوشش، مقدمات اور ان میں ناکامی، جائیداد کی ضبطی کا برطانیہ پر الزام۔ عدالتوں میں آئینی طریق سے ناکامی کے بعد اس خاندان نے یہ مذہبی تحریک جاری کر کے جتھ بنانے کی کوشش شروع کی۔ چنانچہ ایک انگریز نے اس جتھہ بندی کو مشکوک نگاہوں سے بھی دیکھا جس کی گواہی خود مرزا محمود کا بھائی مرزا بشیر حسب ذیل الفاظ میں دیتا ہے:

’’حضرت صاحب (مرزا قادیانی) نے کہا ڈپٹی کمشنر کے پاس جاؤ اور اس سے جا کر ساری حالت بیان کرو اور کہو کہ ہم لوگ دور دراز سے دین کی خاطر یہاں آئے ہیں۔ اُن دنوں میں قادیان کے قریب ایک گاؤں میں کوئی سخت واردات ہو گئی تھی اور ڈپٹی کمشنر اور کپتان پولیس سب وہاں آئے ہوئے تھے۔ چنانچہ ہم لوگ وہاں گئے اور ذرا دور یکے ٹھہرا کر آگے بڑھے۔ ڈپٹی کمشنر اس وقت باہر میدان میں کپتان کے ساتھ کھڑا باتیں کر رہا تھا۔ ہم سے ایک شخص آگے بڑھا اور کہا کہ ہم قادیان سے آئے ہیں اور اپنا حال بیان کرنا شروع کیا۔ مگر ڈپٹی کمشنر نے نہایت غصہ کے لہجہ میں کہا کہ تم بہت سے آدمی جمع ہو کر مجھ پر رعب ڈالنا چاہتے ہو۔ میں تم لوگوں کو خوب جانتا

ہوں اور میں خوب سمجھتا ہوں کہ یہ جماعت کیوں بن رہی ہے اور میں تمہاری باتوں سے ناواقف نہیں وغیرہ وغیرہ۔" (سیرۃ المہدی ص 120)

اس شبہ کا علم ہونے پر اس خاندان نے برطانیہ کی وفاداری پر زیادہ سے زیادہ زور دینا شروع کر دیا۔ انتہائی زور صرف کر کے انگریز کو یہ دھوکہ دینے کی کوشش کی کہ یہ خاندان اس کا انتہائی وفادار ہے۔ مگر اپنے اصل مقصد یعنی جتھہ پیدا کرنے اور وفاداری کے پردہ میں ترغیب قتل جیسے جرائم سے بھی پرہیز نہ کیا گیا۔ وفاداری کا راز بھی آج فاش ہو گیا۔ حکومت کی پریشانی میں اس کی امداد کی بجائے یہ احسان فراموشی کہ قادیان اور نواحِ قادیان کو ریاست بنانے کی سکیمیں تیار ہو رہی ہیں۔

ہم نے اختصاراً اپنی رائے کا اظہار کر دیا ہے۔ حکومت اپنے ذرائع سے بھی اس کی تصدیق کر سکتی ہے۔ اب بھی اگر وہ اپنے فرض کو قبل از وقت نہ پہچانے اور اپنی سلطنت میں قادیان ایسے ڈکٹیٹرانہ اور ظالمانہ نظام کے استحکام کی سکیموں کا سدباب نہ کرے گی تو یہ اس کی ایک فاش غلطی ہوگی۔ آج جبکہ برطانیہ جمہوریت عدل و انصاف کے مقاصدِ عظمٰی کے لیے میدان جنگ میں لڑ رہا ہے، کیا اس کے حکام کا یہ فرض نہیں کہ وہ اپنے ملک میں امن کے قیام کے لیے پوری سختی سے کارروائی کریں۔ غلط خبروں کی تشہیر کو روکیں۔ اس طرح حملے کرنے کے خفیہ پروپیگنڈا کو روکیں خواہ اس کا مرتکب وفاداری کا لباس پہن کر فتنہ و فساد پیدا کرنے کی کوشش کرنے والا کیوں نہ ہو۔

منارہ قادیاں

شایگاں گنجے کہ عمر رایگاں را حاصل است
قطرہ خونِ امیدستے کہ بنگاہش دل است
دیدہ منارہ برسر زمین قادیاں
آنکہ بنیادش زخشت اولین بابل است
باش تابینی کہ خاکش درجہاں برباد رفت
قادیاں دنیائے سفلی است و خاکش سافل است

(مولانا ظفر علی خانؒ)

خواجہ عبدالحمید بٹ

تاریخِ قادیان

فتنۂ قادیانیت کو مجھے بہت قریب ہو کر مطالعہ کرنے کا موقع ملا ہے کیونکہ میرا آبائی وطن خاص قادیان ہے۔ میرے باپ دادا کشمیری خاندان اور اہلسنت والجماعت فرقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ چنانچہ میری تعلیم و تربیت میرے والد مولوی امام الدین مرحوم کے زیر اثر ہوئی۔ میری ابتدائی تعلیم مرزائیوں کے سکول موسومہ ٹی۔ آئی (تعلیم الاسلام) ہائی سکول قادیان میں ہوئی، جہاں مرزائی لٹریچر جبراً پڑھایا جاتا تھا۔ اور مرزائی دینیات میں اس قسم کے سوالات آتے تھے: (1) مسیح موعود کی صداقت میں پانچ دلیلیں لکھو۔ (2) دس آیاتِ قرآنی سے اجرائے نبوت ثابت کرو۔ (3) وفاتِ مسیح پر بیس آیات لکھو۔ (4) جماعتِ احمدیہ کی کامیابی کے راز بیان کرو۔ بھلا ایک مسلمان طالب علم ایسے ماحول میں تعلیم پا کر اپنے ایمان کو کیسے بچا سکتا تھا، جبکہ اس کو پاس ہونے کے لیے نیم مرزائی نہ بننا پڑتا ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس کا فضل اور احسان ہر لحظہ میرے شاملِ حال رہا اور اپنے فضل کے ساتھ میرے ایمان کو محفوظ رکھا۔ جس طرح اس نے حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو فرعون کے گھر میں پرورش کیا۔ بعینہٖ مجھے مرزائی سکول میں ان کے سنہرے گمراہ کن فریب و لالچ اور جبری تعلیم مرزائیت کے جراثیم سے میرے ایمان کو محفوظ رکھا۔ 1931ء میں، میں نے پنجاب یونیورسٹی کا امتحان پاس کیا، بعدازاں میں نے مرزائی لٹریچر کو بغور پڑھا اور مرزائی جماعت کی اخلاقی حالت کو بھی دیکھا اور ان کے سرکردہ لوگوں مرزا محمود احمد خلیفۂ قادیان امیر جماعت احمدیہ، میاں بشیر احمد ایم اے، میاں شریف احمد ناظر کار خاص (یعنی انچارج محکمہ جاسوسی قادیان)، مفتی سرور شاہ، فتح محمد سیال ناظر اعلیٰ، سیّد ولی اللہ شاہ ناظر امور عامہ (وزیر داخلہ یعنی ہوم منسٹر) فرزند علی انصاری ناظر بیت المال (یعنی وزیر خزانہ) مفتی محمد صادق ناظر امور خارجہ، شیخ عبدالرحمٰن مصری ناظر تعلیم و تربیت و ہیڈ ماسٹر احمدیہ سکول قادیان، مولوی اللہ دتہ انصاری مبلغ سلسلہ احمدیہ، مرزا ناصر احمد پرنسپل جامعہ احمدیہ، مولوی ظفر محمد، مولوی جلال الدین شمس وغیرہ وغیرہ ''مقدسینِ'' قادیان کی گفتار کردار و معاشرت کو بخوبی و بغور مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ گروہ اسلام سے کوسوں دور ہے اور

یہ فرقہ مذہبی فرقہ نہیں بلکہ مذہب کی آڑ میں سیاسی اور اقتصادی تاجروں کی ایک کمپنی ہے جو بہشتِ قادیاں کی تجارت کرتی ہے اور یہ لوگ اس کے ڈائریکٹر اور شیئر ہولڈر ہیں۔ جن کو اسلام سے کوئی مناسبت نہیں ہے۔ ان لوگوں کا اخلاقی اور معاشرتی سلوک قادیان کے قریباً اڑھائی ہزار اہل سنت والجماعت مسلمان باشندوں سے نہایت متعصّبانہ تھا۔ یہ لوگ مقدمہ باز تھے اور دنیا جانتی ہے کہ کچہریوں میں آئے دن مقدمہ بازی کرنے والوں کی اخلاقی حالت کیسی ہوتی ہے۔ باوجود ان کی ناقابلِ برداشت تکلیفیں سہنے کے جب 1947ء میں ہندوؤں، سکھوں نے قادیان کو گھیر رکھا تھا تو بھی قادیان کے اہلسنّت والجماعت فرقہ نے اسلامی نمونہ کے مطابق فراخدلی سے ان کی حفاظت کی۔ مگر اس نازک وقت پُرآشوب زمانہ میں میاں محمود احمد خلیفۂ قادیاں سب سے پہلے موٹر کار کے پردوں میں بیٹھ کر لوگوں کو دھوکہ اور فریب دے کر نکل آئے اور مرزائی حضرات سرکاری ٹرکوں پر سوار ہو کر پاکستان پہنچ گئے اور غریب قادیاں اور اردگرد کے کثیر مسلمانوں کو پیدل چل کر قافلہ بنا کر پاکستان آنا پڑا اور اس طرح قادیانیت کی روحانیت کا بھانڈا جودھامل بلڈنگ میکلوڈ روڈ لاہور کے عین چوراہے میں پھوٹ گیا۔ اب یہ گروہ الاٹ منٹوں پر چھاپہ مار کر ربوہ کو مرکز بنا کر اپنے مخصوص پروگرام کی تکمیل کے لیے مختلف تدابیر تبلیغ کی آڑ میں سوچ رہا ہے اور اپنے رہن شدہ متروکہ قادیاں کے حصول کی خاطر اپنی من گھڑت پیشگوئیاں کر رہا ہے۔

قادیان کی سیاسی پوزیشن

قادیان بٹالہ شہر سے جانبِ شرق ایک معمولی قصبہ تھا، جس پر بٹالہ سے کچی سڑک پر ٹانگہ جات کے ذریعہ آمدورفت تھی۔ 1929ء میں اس کو ریل کے ذریعہ بٹالہ سے ملایا گیا تھا۔ جب سے منشی غلام احمد قادیانی نے قادیان میں دعویٰ نبوت کیا۔ تب سے قادیان کی بدنامی ہوئی۔ مرزائیوں کی چونکہ اکثریت ہوگئی تھی، اس کی وجہ یہ تھی کہ قادیان سے باہر کے مرزائی وہاں خصوصی طور پر آباد ہو گئے تھے، جو مختلف علاقوں سے آ کر یہاں بس گئے تھے اور بڑی جدوجہد کے بعد 1941ء کی مردم شماری کے مطابق ''جوسمال ٹاؤن کمیٹی'' کے ذریعہ (جس کا صدر اور سیکرٹری مرزائی تھے) کروائی گئی تو سات ہزار کے قریب تھی۔

پنجاب میونسپل ایکٹ 1911ء کی رو سے، جس قصبہ کی آبادی دس ہزار سے زائد ہو، وہاں میونسپل کمیٹی بن سکتی تھی۔ دس ہزار سے کم کی آبادی میں ٹاؤن کمیٹی یا سمال ٹاؤن کمیٹی قائم ہوسکتی تھی۔

قادیان کمیٹی کے کل چھ وارڈ تھے، جس میں 5 مرزائی ممبر بذریعہ انتخاب، ایک ہندو ممبر بذریعہ انتخاب، ایک سکھ ممبر بذریعہ نامزدگی ہوتا تھا۔

منتخب ممبر	:	6
نامزد	:	1
کل تعداد	:	7

مسلمان ممبر کو مرزائی کامیاب نہیں ہونے دیتے تھے، حالانکہ وارڈ نمبر 4 اور 6 میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ قادیان کے مسلمانوں کی تعداد ڈھائی ہزار کے قریب تھی۔ مگر وارڈوں کی تقسیم اس طرح کی گئی تھی کہ کوئی مسلمان کامیاب نہ ہو سکے۔ لیکن اس کے باوجود، اگر کوئی امکان بھی ہوتا تو مرزائی اپنی مختلف چالبازیوں اور سیاسی چالاکیوں کے ذریعہ اور انگریزی حکومت میں اثر و رسوخ کی وجہ سے مسلمان ممبر کو کامیاب نہیں ہونے دیتے تھے۔

قادیان کی مسجدِ اقصیٰ

مرزائیوں کی قادیان میں تقریباً دس بارہ مساجد تھیں، جن میں ''مسجدِ اقصیٰ'' اور ''مسجد مبارک کو مرزائی لوگ زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ باقی مسجدیں دور دور محلوں میں تھیں۔ مسجد اقصیٰ تو مسلمانوں کی دلآزاری کے لیے نام رکھا گیا تھا، جس میں منارہ بھی بعد میں بنوایا تھا، جبکہ مرزا غلام احمد قادیانی مر چکا تھا۔ اس منارہ کا نام منارۃ المسیح رکھا گیا تھا کہ مسیح نے اس منارہ پر نازل ہونا تھا، وہ مسیح جو منارہ بننے سے قبل ہی مر چکا تھا، منارہ بعد میں بنتا رہا۔ حالات کی یہ ترتیب آج تک ہماری سمجھ میں نہیں آ سکی۔

یہی حال مرزائیوں کے مسجد اقصیٰ کے متعلق نہایت دلآزار پروپیگنڈہ کا تھا کہ حضور نبی اکرم معراج شریف کے وقت قادیان تشریف لائے اور مسجد کو تقدس بخشا، حالانکہ آج سے تیرہ سو سال قبل قادیان آباد بھی نہیں ہوا تھا۔ **اعوذ باللّٰہ من ھذا الھفوات!**

مسجد اقصیٰ کا نام پہلے بڑی مسجد تھا، بعد میں مسجد اقصیٰ مرزائیوں نے رکھا۔ یہ مسجد ابتدائی طور پر منشی غلام احمد قادیانی کے دعویٰ نبوت سے پہلے مسلمانوں کی امداد سے بنی تھی ورنہ ہندو اس مسجد کو بننے نہیں دیتے تھے۔ کشمیری اور ارائیں مسلمانوں نے (جو وہاں آباد تھے) اس سلسلہ میں لٹھ کی امداد بھی کی تھی۔

مسجدِ اقصیٰ سے تقریباً 20 گز کے فاصلہ پر ہندوؤں کا چوک میں مندر تھا اور ان کا کنواں تھا۔ اس مندر میں ہندوؤں نے بہت بڑا بت رکھا ہوا تھا اور عمارت کے بیرونی حصوں میں بھی بتوں کی شکلیں بنی ہوئی تھی۔

قادیان میں بتوں کی پوجا!

اس چوک کے مندر کا مہنت پنڈت لبھو رام تھا، جو صبح شام اس مندر میں سنکھ بجاتا تھا اور صبح سورج چڑھے بتوں پر پانی ڈال کر ان کو نہلاتا تھا۔

ہندوؤں کا دوسرا مندر چھوٹے بازار کے اخیر پر اڈا خانہ کے قریب واقع تھا۔ اس میں بھی ہندوؤں کے بڑے بڑے بت تھے اور رات دن گھڑیال بجا کر اور سنکھ بجا کر اس کی پوجا ہوتی تھی۔

یہ بت پرستی اور سنکھ کا بجنا، منشی غلام احمد قادیانی کے دعویٰ کرشن کا بطلان تھا۔ منشی غلام احمد قادیانی نے دعویٰ کیا تھا کہ:

> ''میں بیس برسوں سے یا کچھ زیادہ برسوں سے اس بات کو شہرت دے رہا ہوں کہ میں ان گناہوں کو دور کرنے کے لیے جن سے زمین پُر ہو گئی ہے، جیسا کہ ابنِ مریم کے رنگ میں ہوں، ایسا ہی راجہ کرشن کے رنگ میں بھی ہوں، جو ہندو مذہب کے تمام اوتاروں میں سے ایک بڑا اوتار تھا، یا یوں کہنا چاہیے کہ روحانی حقیقت کی رو سے میں وہی (کرشن) ہوں۔'' (کتاب لیکچر سیالکوٹ 2 نومبر 1904ء، مصنفہ غلام احمد)
>
> ''ملک ہند میں کرشن نام ایک ہی گزرا ہے، جس کو ''رودر گوپال'' بھی کہتے ہیں (یعنی فنا کرنے والا اور پرورش کرنے والا)...... خدا تعالیٰ نے بار بار میرے پر ظاہر کیا ہے کہ جو کرشن آخری زمانہ میں ظاہر ہونے والا تھا، وہ تو یہی ہے، ''آریوں کا بادشاہ۔'' (ملاحظہ ہو تتمہ حقیقت الوحی ص 85، 1907ء)
>
> اس کے ساتھ ہی منشی غلام احمد قادیانی کے اس دعویٰ کو بھی نگاہ میں رکھیے:
>
> ''مسیح آ گیا ہے، اور وہ وقت آتا ہے بلکہ قریب ہے کہ زمین پر نہ رامچندر پوجا جائے گا، نہ کرشن، نہ عیسیٰ علیہ السلام!''
>
> (شہادت القرآن ص 15، مصنفہ غلام احمد)

مسیح کا نزول

''اس پر اتفاق ہو گیا ہے کہ مسیح کے نزول کے وقت اسلام دنیا میں پھیل جائے گا اور مآلِ باطلہ ہلاک ہو جائیں گے اور راست بازی ترقی کرے گی۔'' (ایام الصلح ص 126، مصنفہ منشی غلام احمد متنبی قادیان)

دنیا میں تو کیا، خاص قادیان میں منشی غلام احمد کے دعاویِ باطلہ نبوت، مسیح، کرشن وغیرہ وغیرہ کے بعد بت پرستی، شرک کی ترقی ہوئی، بڑے بازار میں آریہ سماج نے مندر بنا لیا اور بڑے بازار کے چوک میں گورداس مل برہمن نے مندر بنا لیا۔ جہاں یو۔ پی کے لوگ ''ملائی کی برف'' بناتے اور فروخت کرتے۔

مرزائیوں کے ٹی۔ آئی ہائی سکول کے مقابلہ میں ہندوؤں نے ڈی۔ اے۔ وی ہائی سکول بنایا اور اڈا خانہ میں آریہ سماج مندر ڈاکٹر جگن ناتھ کے ہسپتال کے ساتھ بنوایا اور منارہ کے مقابلہ پر پنڈت لبھو رام نے جو مندر کا پجاری تھا، 5 منزلہ دکان بنائی جہاں ان کے پرچارک آ کر ٹھہرا کرتے۔

سکھوں کے گُردوارے

مسجد مبارک کے قریب قصرِ خلافت کے ساتھ ڈاکٹر گوربخش سنگھ کا مکان سہ منزلہ تھا اور اس مکان کے ساتھ سکھوں کا گردوارہ تھا جہاں ہر روز رات کو سکھوں کا اکھنڈ پاٹھ ہوتا اور سکھ جمع ہو کر ڈھولکی اور چھینے کے ساتھ اپنے شبد پڑھتے۔

سکھوں کا دوسرا گردوارہ، چھوٹے بازار کے اختتام پر ہندوؤں کے مندر کے ساتھ تھا۔ یہ گردوارہ رام گڑھیہ سکھوں کا تھا جہاں آئے دن سکھوں کے جلسے ہوتے اور ساتھ ہی آریہ سماج والوں کے جلسے ہوتے۔

ربّ قادیان (Rub-e-Qadian) دا میلہ

پنڈت کنج لعل برہمچاری شرمانند کا مکان قصرِ خلافت (منشی غلام احمد، مصنوعی کرشن) جس میں منشی غلام احمد کا بیٹا محمود احمد خلیفہ و بشیر احمد، ایم۔ اے الگ الگ رہائش رکھتے تھے، اس کا نام قصر خلافت تھا۔ اس کے ملحقہ مکان پنڈت کنج لعل عرف ''ربّ قادیان'' کا مکان تھا۔

یہ ربّ قادیان ہر سال اپنا میلہ کرواتا تھا اور مصنوعی کرشن کی دھجیاں اُڑاتا تھا۔ مرزائی لوگ اس کو ربّ قادیان (Rib-e-Qadian) یعنی قادیان کی رب بمراد گندگی کہتے اور وہ منشی غلام احمد کا نام ''پونڈرو'' رکھتا تھا۔

رب قادیان کہتا تھا کہ منشی غلام احمد کرشن قادیانی کا الہام ہے کہ:

1- ''رب لنگڑاتا ہوا آیا۔''

2- ''وہ منارہ کے شرقی جانب ہوگا۔''

چنانچہ میں ایک ٹانگ سے لنگڑا ہوں اور میرا مکان منارہ کے ملحقہ مشرقی جانب ہے۔

علاوہ ازیں کرشن ہندو تھا اور میں بھی ہندو ہوں۔

لہٰذا منشی غلام احمد جھوٹا کرشن ہے جو ہندوؤں کا اوتار بنتا ہے...... مجھے رب العالمین کی طرف سے ربّ قادیان ہونے کا الہام ودعویٰ ہے، میں رب العالمین نہیں ہوں۔

پونڈرُو، ہندوؤں کا خاص دیوتا تھا، جس نے اپنی دُم کے ساتھ لنکا کو آگ لگائی تھی۔ ہندو قوم اس کو اچھا نہیں سمجھتی۔ رب قادیان کا کہنا تھا کہ مرزا غلام احمد ''کرشن'' کے نام پر ہندوؤں مسلمانوں میں دشمنی کی آگ بھڑکا رہا ہے تاکہ ہندو اس جھوٹے کرشن کی دشمنی میں مسلمانوں کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں گستاخی کریں اور ہندو مسلم میں نفرت بڑھے، ایک دوسرے کے گھروں کو آگ لگائی جائے اور قتل و غارت بڑھے۔ مجھے پرمیشور نے امن و شانتی پیدا کرنے کے لیے ''ربّ قادیان'' ہونے کا حکم دیا ہے۔

ربّ قادیان پر مقدمہ

چنانچہ اس نے رَب کا میلہ کیا۔ اپنے ہندو لیڈروں کو بلوا کر ''کرشن قادیانی'' کی تردید کروائی اور اشتہار شائع کیا، جس پر مرزائیوں نے احتجاج کیا اور حکومتِ انگریزی (جو مرزائیوں کی خود کاشتہ پودے کے طور پر پرورش کرتی تھی) نے ربِ قادیان کے نام پر اس کے خلاف مقدمہ چلایا۔ مقدمہ میں پنڈت کنج لعل نے یہ پوزیشن لی کہ منشی غلام احمد متنبّی قادیان و کرشن قادیانی نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ ہندوؤں کا پرمیشور ''ناف سے دس انگل نیچے ہے۔''

(Ten fingers down the navel)

اگر ہمارے پرمیشور کو آلہ تناسل کہا جا سکتا ہے، تو مجھے ربِ قادیان لکھنے اور منشی غلام احمد کا نام ''پونڈرو'' رکھنے سے کون روک سکتا ہے۔ اور میں عدالت جناب اے۔ ڈی۔ ایم صاحب گورداسپور میں بشیرالدین محمود احمد خلیفہ قادیان کو طلب کرتا ہوں۔ وہ تشریح کرے کہ ہندوؤں کا پرمیشور ناف سے دس انگل نیچے لکھنا دل آزاری ہے یا ''پونڈرو'' جس نے اپنی دُم کے ساتھ لنکا کو آگ لگائی۔

چنانچہ جب ربِ قادیان نے اپنی صفائی میں خلیفۂ قادیان کو عدالت میں طلب کرنے پر اصرار کیا تو حکومتِ انگریزی نے ربِ قادیان سے یہ مقدمہ واپس لے لیا اور پنڈت جی کو بری کر دیا گیا۔

اُس دن سے اُس نے اپنے ہمراہ لاٹھی رکھی جس پر ٹین کا پنجہ لگوایا، اس پنجہ پر موٹے

حروف میں بورڈ کی شکل میں دونوں طرف رب قادیان لکھوایا اور وہ ہر وقت اس لاٹھی کو اپنے ہمراہ بطور اپنے تعارف کے رکھتا، اور اس نے ہندوؤں اگنی دَل کی تحریک چلائی اور والنٹیرز کور بنائی۔

اس کور کے نعرے تھے: ربِ قادیان امر رہے، یعنی زندہ باد

اگنی میٹرے = ہر ہر مہادیو

ان والنٹیروں کے سر پر پیلے رنگ کی ٹوپیاں ہوتی تھیں۔

قادیان کے باغ

اس طرح سے وہ منشی غلام احمد قادیانی کے دعویٰ کرشن کا بطلان کرتا تھا۔ قادیان میں مرزائیوں کے دو باغ مشہور تھے:

(1) بڑا باغ یعنی بہشتی مقبرہ کا باغ (2) نواب محمد علی کا باغ

ہندوؤں کے تین باغ تھے: (1) باغ باویاں جو قادیان کے مشرقی جانب تھا۔ (2) باغ برہمتاں جو قادیان کے غربی جانب بٹالہ کی سڑک پر واقع تھا۔ اس باغ کے مقابل پر خاکروبوں کا باغ تھا۔ خاکروبوں کے باغ میں پیڑے شاہ خاکروب رہتا تھا، جو بازاروں میں عام طور پر بڑے زور کے ساتھ گاتا تھا:

اُگی بوٹی گھادی—یعنی گھاس کی بوٹی اُگی

پیڑے شاہ کی بیوی کا نام دیالی تھا۔ وہ اپنے باغ میں خاکروبوں کا میلہ کرواتا۔ مرزا امام الدین جو منشی غلام احمد قادیانی کے رشتہ داروں میں تھا، وہ خاکروبوں کا پیر بن گیا تھا۔ (3) تیسرا باغ ہندوؤں کا مغربی جانب اینٹوں کے اڈے کے قریب مسلمانوں کی عیدگاہ کے راستہ میں تھا، جہاں ہندوؤں کا مندر تھا اور اس مندر میں بہت بڑا بُت تھا، جس کو شولنگ (Shivling) کہتے تھے۔

مسلمانوں کے باغ

(1) قادیان میں دو باغ مسلمانوں کے تھے، جو بہت مشہور تھے۔

1- مرزا کمال الدین کا باغ جو بہشتی مقبرہ کے باغ کے مغربی جانب، برلب سڑک موضع کاہلواں تھا۔ مرزا کمال الدین، منشی غلام احمد قادیانی کے رشتہ داروں میں تھا۔ مرزا کمال الدین نے اپنا آلہ تناسل کٹوا دیا اور پیروں فقیروں میں شامل ہو گیا تھا۔

2- دوسرا باغ بہشتی مقبرہ کے متصل و بالمقابل برلب سڑک موضع ننگل کلاں تھا۔ جو پیر شاہ چراغ صاحب کے نام پر مشہور تھا۔ پیر شاہ چراغ صاحب مسلمانوں کے مقتدر خاندان

میں تھے۔ ختمِ نبوت کے جان نثاروں میں بہت بااثر اور مرنجان مرنج تھے۔ اب ضلع سیالکوٹ کی طرف ہجرت کر کے گئے جہاں ان کے مرید تھے۔ پیر صاحب پاکستان بننے کے بعد فوت ہو گئے۔ ان کے لڑکے کا نام میاں محمد اسلم ہے جو علاقہ سیالکوٹ کی طرف زمینداری کرتے ہیں۔

بوڑھی صاحب

مرزائیوں کے محلہ دار الانور ہیں، جو ایک طرح سے قادیان کا سول لائن تھا، جس میں مرزائی آفیسران کی کوٹھیاں تھیں اور سر ظفر اللہ کی میاں محمود احمد، میاں بشیر احمد، پسران منشی غلام احمد قادیانی کی کوٹھیاں تھیں، میاں ناصر احمد موجودہ خلیفۂ ربوہ کی بھی کوٹھی تھی۔ یہ جدید مغربی طرز جیسے فرانسیسی برطانوی طرز کی کوٹھیاں تھیں۔

جب مرزائیوں نے وہاں کوٹھیاں تعمیر کیں تو سکھوں نے وہاں ایک بوڑھی درخت پر اپنا گردوارہ بنا لیا اور بوڑھی صاحب مشہور کر کے اپنا سالانہ دیوان وہاں کرنے لگ گئے۔ چنانچہ 1935-36ء میں سکھوں نے بوڑھی صاحب کا میلہ کیا، اور سکھوں کے مشہور لیڈر سردار کھڑک سنگھ کو بلوایا اور اس کا ہاتھی پر جلوس نکالا۔ بے شمار سکھ لوگ دیہات سے جمع ہونے شروع ہو گئے۔ ڈپٹی کمشنر گورداسپور نے دفعہ 144 ضابطہ فوجداری مرزائیوں کے کہنے پر نافذ کر دی اور بازاروں میں پولیس فورس بھیج دی کہ سکھوں کے لیڈر سردار کھڑک سنگھ آئیں تو ان کو کہہ دیا جائے کہ قادیان میں دفعہ 144 نافذ ہے، یہاں سے نہ گزریں بلکہ قادیان شہر سے باہر ہو کر جائیں۔ سکھوں کو یہ بات ناگوار گزری، انھوں نے ڈپٹی کمشنر کو لکھ دیا کہ ہم قادیان کے بازار سے گزر کر جائیں گے۔ یہ عام راستہ ہے، یہ ریاست نہیں ہے۔ چنانچہ سکھوں نے دفعہ 144 توڑ دی اور مرزائیوں کی کوٹھیوں کے قریب سڑک پر ہوتے ہوئے بوڑھی صاحب (یہ بوہڑ کا درخت تھا) پہنچ گئے اور اپنا دیوان یعنی جلسہ کر لیا۔ اس کے بعد سکھ عام اس راستہ سے گزرتے تھے مگر کوئی روک نہیں تھی، اور ہر سال بوڑھی صاحب کا میلہ ہوتا اور منشی غلام احمد قادیانی کی نبوت جھوٹی ثابت ہوئی۔ جب یہ جماعت اپنے گھر میں اسلام کا غلبہ نہ قائم کر سکی تو یورپ میں تبلیغی ڈھونگ سے کیا فائدہ۔ بس سیاسی مفادات نبوت کے نام پر حاصل کرنے تھے جو انگریزوں سے حاصل کر لیے۔

ریاست قادیان

مرزا غلام احمد متنبی قادیان کے دعوائے نبوت، مہدویت، مسیحِ موعود، کرشن وغیرہ کو

قادیان کے مسلمانوں میں سے سوائے تین چار خاندانوں کے کسی نے قبول نہیں کیا۔ مرزا غلام احمد متنبی کے ماننے والے گمراہ لوگ نوے فیصدی باہر سے آ کر آباد ہوئے تھے، جن میں اکثریت سرکاری ملازمین کی تھی جو مختلف محکمہ جات کے لوگ تھے۔ چونکہ حکومت کرنے کی خو بوان کے دماغوں میں تھی، اس لیے یہ مثلِ اسرائیل قادیان کو ایک ریاست کی شکل دے رہے تھے۔ انھوں نے آتے ہی اپنے سرمایہ اور اقتدار کے زور پر غیر مرزائیوں پر تسلط جمانے کی کوشش کی، اور ایک قسم کی خانہ جنگی کو ہوا دی۔

مقاطعہ

''مقاطعہ'' ایک خاص نادر شاہی حکم ہوتا جو دربارِ خلافتِ محمودیہ سے جاری ہوتا اور اس کی تکمیل و تعمیل کے لیے کارِ خاص، خدام الاحمدیہ جو مرزا محمود خلیفۂ قادیان کی حفاظتی فوج تھی، مقرر تھی۔ مقاطعہ کا معنی قطع کلامی، یعنی مرزائیت کے دام سے نکلنے والے سے محلّہ کا کوئی شخص نہ بولے۔ رشتہ دار، بیوی، بچے، بھائی، ماں، باپ کوئی کلام نہ کرے۔ کوئی دکان دار اس کو سودا نہ دیوے۔ درزی، دھوبی، ڈاکٹر، حکیم، حجام، اس کے گھر سے تعلق نہ رکھے اور وہ شخص احساسِ کمتری میں مبتلا ہو کر مرزا محمود خلیفہ قادیان سے معافی در معافی مانگے تاکہ اس سے بولنے کی اجازت تو مل جائے۔ ڈاکٹر حکیم تک کو دوائی دینے کی اجازت نہ ہوتی تھی، ان کے ساتھ غیر اخلاقی حرکتیں کی جاتیں، توہین مذاق، طنز، چھیڑ خوانی کی جاتی اور مزید برآں یہ کہ ان لوگوں پر جھوٹے مقدمات دائر کر دیے جاتے تاکہ وہ غم، فکر، مصیبت، دہشت سے تنگ آ کر واپس مرزائیت کے آمر خلیفہ کے دامن میں منت وسماجت کر کے پناہ لیں۔

اس کا واضح ثبوت مرزائیوں کے اخبار ''الفضل'' کے سابق ایڈیٹروں کے ساتھ یعنی محفوظ الحق علمی، مہر محمد شہاب اور ماسٹر اللہ دتہ ہیڈ ماسٹر کے ساتھ جو بدسلوکی ہوئی، اس تکلیف سے تنگ آ کر ان کو قادیان چھوڑنا پڑا کیونکہ ان کی زندگیاں خطرہ میں پڑ گئیں تھیں، جب انھوں نے قبولِ اسلام کیا۔

مسٹر۔ جی۔ ڈی کھوسلہ سیشن جج گورداسپور کا فیصلہ

مرزائیوں اور مرزا محمود کے اس غیر قانونی، غیر اخلاقی، غیر سماجی بائیکاٹ، مقاطعہ اور تکلیف دہی کی پوری داستان پر مسٹر گوروودت، کھوسلہ، سیشن جج گورداسپور نے بمقدمہ سرکار بنام سیّد عطاء اللہ شاہ صاحب بخاریؒ، بجرم 153 تعزیراتِ ہند میں وضاحت سے کیا ہے۔ یہ فیصلہ مرزائیت کے قلعہ میں قصرِ خلافت شکن بم ثابت ہوا، جس سے انگریزی حکومت کی بھی آنکھیں کھل گئیں، اور چھ ماہ قید کی سزا کی بجائے تاعدالت برخواست سزا دی گئی۔ اس فیصلہ کو پڑھ کر بڑی آسانی سے پتہ

چل سکتا ہے کہ مرزا محمود نے قادیان کو ریاست کی ہم شکل بنا کر متوازی حکومت بنا رکھی تھی۔

ہائی کورٹ کا فیصلہ

اور آخر جب مرزائیوں کے مبلغ شیخ عبدالرحمٰن مصری (سابق رام ناتھ) نے، جو مرزائیوں کے احمدیہ سکول کا ہیڈ ماسٹر، ناظرِ تعلیم و تربیت، قادیان ٹاؤن کمیٹی کا ممبر اور بعض اوقات قائم مقام امیر جماعت احمدیہ قادیان مقرر کیا جاتا) جب مرزا محمود کے مظالم کے خلاف آواز اٹھائی تو اس کے ایک ساتھی فخرالدین ملتانی کو روز روشن دن دہاڑے سر بازار، ایک مرزائی عزیز احمد نامی قلعی گر نے قتل کیا جس کی پیروی سر ظفر اللہ خان نے کی اور عزیز احمد کو "شہید احمدیت" کا خطاب دیا گیا۔

اور شیخ عبدالرحمٰن مصری اور اس کے ساتھیوں پر زیر دفعہ 107/151 ضابطہ فوجداری مقدمہ قائم ہوا، جس کی اپیل شیخ عبدالرحمان مصری، امیر جماعت انجمن انصارِ احمدیہ قادیان نے ہائی کورٹ لاہور میں کی، جس میں مسٹر جسٹس سکیپ جج ہائی کورٹ پنجاب نے خلیفۂ قادیان مرزا محمود کے خلاف جو ریمارکس دیے وہ بھی قابل غور ہیں، اور خلیفہ محمود کی تقریروں کو اشتعال انگیز قرار دیا، "افسوسناک" کے الفاظ فیصلہ میں لکھے۔

انجمن انصارِ احمدیہ قادیان

مرزائیوں کی دو پارٹیاں تو مشہور تھیں۔ یعنی (1) قادیانی (2) لاہوری

اب قادیانی پارٹی دو حصوں میں بٹ گئی۔ انجمن احمدیہ قادیان جس کا امیر مرزا محمود تھا۔ دوسری پارٹی انجمن انصارِ احمدیہ قادیان جس کا امیر شیخ عبدالرحمٰن مصری تھا۔ ان دونوں میں جو پوسٹر بازی ہوئی، خدا کی پناہ! ایک دوسرے پر گندی گالیوں کی بوچھاڑ، الزامات تراشیاں، اخلاقی تہمتیں، سرکاری عدالتوں کے ریکارڈ ان سے بھرے پڑے ہیں۔

مرزا محمود خلیفہ قادیان نے شیخ مصری کے خاندان، لڑکیوں پر الزامات لگائے۔ جواب میں شیخ عبدالرحمٰن مصری امیر جماعت انصارِ احمدیہ قادیان نے خلیفہ قادیان پر الزامات لگائے، اور احمدیت کے مقدسین کا جو منظر سامنے آیا اور جس طرح سے اخلاقی حالت سے پردہ اٹھا، نمونہ ملاحظہ ہو۔ اس سے توبہ بھی توبہ توبہ کرتی ہے۔

الزامات اور مرزائی اخلاق

(1) "موجودہ خلیفہ (فرقۂ احمدیہ) سخت بدچلن ہے۔ یہ تقدس کے پردے میں عورتوں کا شکار کھیلتا ہے۔ اس کام کے لیے اس نے بعض مردوں اور بعض عورتوں کو ایجنٹ رکھا ہوا ہے۔ اس کے

ذریعہ یہ معصوم لڑکیوں اور لڑکوں کو قابو میں رکھتا ہے۔ اس نے ایک سوسائٹی بنائی ہوئی ہے اور اس سوسائٹی میں زنا ہوتا ہے۔ (بحوالہ شیخ عبدالرحمٰن مصری سابق ہیڈ ماسٹر احمدیہ سکول قادیان، بیان مشمولہ فیصلۂ عدالت العالیہ ہائی کورٹ لاہور، شائع کردہ مولوی محمد علی احمدی ایم اے امیر جماعت احمدیہ لاہور۔ مورخہ 9 دسمبر 1935ء)

قادیانیت کی بنیاد

(2) قادیانیت کی بنیاد ہی دجل، فریب کاری، کذب بیانی اور افترا پر ہے۔ مگر مولوی اللہ دتہ (عرف دتو بافندہ) مبلغ قادیانیت پر واضح ہو کہ قادیانیت کو موت سے بچانے کے لیے یہ حیلے انشاء اللہ کارگر نہ ہوں گے۔ (لاہوری مرزائیوں کا اخبار پیغام صلح، 12 جون 1937ء)

چار گواہ

(3) قادیان کی انجمن انصارِ احمدیہ کے سیکرٹری حکیم عبدالعزیز احمدی نے خلیفۂ قادیان مرزا محمود کے ایک خطبہ شائع شدہ اخبار الفضل قادیان کے جواب میں ایک پوسٹر شائع کیا۔ وہ بھی ملاحظہ ہو (جو خط وکتابت ہوئی):

''حالانکہ میں نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ لوگوں سے سنا ہے کہ جناب (مرزا محمود خلیفۂ قادیان) چار گواہوں کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اگرچہ ہم سے تو آپ نے نہیں فرمایا، تاہم اگر یہ بات درست ہے تو پھر آپ اسی کے لیے تیاری فرمالیں۔ ہم صرف چار گواہ ہی نہیں بلکہ بہت سی شہادتیں، علاوہ عورتوں، لڑکیوں اور لڑکوں کی شہادت کے ہم خود جنابِ والا کی بھی شہادت پیش کریں گے۔ اگر ہم جھوٹے ہوئے تو ہم ہمیشہ کے لیے ذلیل ہونے کے علاوہ ہر قسم کی سزا بھگتنے کے لیے تیار ہیں۔

(ٹریکٹ حکیم عبدالعزیز احمدی سیکرٹری انجمن انصارِ احمدیہ قادیان)

چیلنج تو بہت بڑا تھا۔ مگر خلیفۂ قادیانی نے چپ سادھ لی اور حکیم عبدالعزیز پر قاتلانہ حملہ ہو گیا۔ حکیم عبدالعزیز کو شدید زخم آئے۔ حکیم عبدالعزیز بچ گیا، مگر حکیم صاحب کا ایک ساتھی، مولوی فخرالدین ملتانی مالک احمدیہ کتاب گھر قادیان قتل ہو گیا۔ قاتل عبدالعزیز قلعی گر کو پھانسی کی سزا ہوئی۔ قاتل کی اپیل پریوی کونسل لنڈن سے بھی خارج ہوئی۔

ناظرین۔ اس قسم کے تاریخی واقعات سے قادیان کی زمین لبریز ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ مرزائی جماعت جو خود جہاد کی منکر ہے، اس کی حالت کیسی ہے جو دنیا کو اپنے دعویٰ نبوت کی طرف بلاتی ہے، دنیا کو اخلاقی معیار قائم کرنے پر اصلاح، امن، صبر اور تزکیۂ نفس کی تلقین کرتی ہے۔

اسلامیہ قادیان نے تبلیغی رنگ میں کیا۔ قادیان کے اہلسنّت مسلمانوں کے پاس اقتصادی بائیکاٹ کی وجہ سے سرمایہ نہ تھا۔ تاہم اہلسنّت اور اہل حدیث طبقہ نے یک جان ہو کر باہمی مل کر مقابلہ کیا۔ انجمنِ اسلامیہ قادیان کا صدر مولوی امانت اللہ صاحب زرگر اور مولوی مہر الدین صاحب آتش باز سیکرٹری تھا۔ مجلس عاملہ کے ممبران، مولوی امام الدین کشمیری، چوہدری نور محمد کشمیری، چوہدری امام الدین کشمیری، چوہدری نور محمد کشمیری، مولوی محمد یعقوب آف بھامڑی مبلغ اہل حدیث بھامڑی، مولوی محمد علی صاحب بھٹیاں، سائیں کالو شاہ درویش بھٹیاں، پیر سید شاہ چراغ شاہ صاحب، مولوی علی گوہر کمہار، مولوی رحمت اللہ، شیخ برکت علی بزاز، شیخ کمال الدین، چودھری غلام فرید گوجر، میاں محمد بخش قاضی اور اس کا پسر میاں محمد عبداللہ قاضی امام مسجد شیخان والی اور میاں عنایت اللہ قاضی، امام مسجد ارائیاں والی، چودھری پھلی ارائیں، میاں تراب علی خان راجپوت تھے۔ جو باہر سے مبلغ بلا کر تردیدِ مرزائیت کرواتے۔ باہر سے آنے والے ہمدردانِ اسلام میں سے حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب امرت سریؒ اور پیر مہر علی شاہؒ صاحب گولڑہ شریف کے خاص مقربین، اور حضرت مولانا عبداللہ صاحب معمار امرتسریؒ، حضرت مولانا حبیب اللہ صاحب کلرک محکمہ انہار امرت سریؒ، حافظ محمد شفیع صاحب مبلغ اسلام سنکھترہ، حافظ احمد الدین صاحب عرف پھانہ ٹھوک گکھڑوی، مہر ابراہیم صاحب ارائیں بھامڑی بٹالوی، چودھری غلام محمد صاحب شوخ بٹالوی، مولوی لعل الدین صاحب انصاری کھوجالہ تھے، جو تردید مرزائیت میں یدطولیٰ رکھتے تھے، یہ حضرات قادیان میں انجمنِ اسلامیہ کے جلسے میں شامل ہوتے اور تردیدِ مرزائیت کا فریضہ سرانجام دیتے اور علاقہ میں بھی مرزائیوں سے زبانی وتحریری مناظرہ کرتے۔ یہ قادیان کے مسلمانوں کی ابتدائی تردید مرزائیت کی جدوجہد تھی۔ جو غالباً 1929ء تک پوری قوت سے جاری رہی۔

مرزا غلام احمد متنبی قادیان کے دعوائے نبوت کے بعد اس کے بیٹے مرزا بشیرالدین محمود کے دماغ میں قادیان کو ریاست بنانے کا خبط سما چکا تھا۔ لہٰذا اس نے بجائے اپنے تبلیغی مقاصد کو فروغ دینے کے ریاست کی مضبوطی کے ذرائع اختیار کرنا شروع کر دیے اور مرزائی جماعت کو تبلیغی سانچے میں ڈھالنے کے ساتھ ساتھ سیاسی چالیں شروع کر دیں اور انگریز پرستی کے سایہ میں اپنا سیاسی نظام بھی متوازی حکومت کی طرح بنایا۔

مسلمانوں کا بائیکاٹ

سب سے پہلے اس نے مسلمانانِ قادیان کے سیاسی بائیکاٹ کی سکیم بنائی، ان سے تجارتی لین دین بھی ختم کیا اور اپنی جماعت کو حکم دیا کہ جس دوکان پر مرزائی انجمنِ احمدیہ کا بورڈ آویزاں نہ

ہو، اس دوکان سے کوئی سودا نہ خریدا نہ جائے اور جو مرزائی اس حکم کی خلاف ورزی کرے، اس کو جرمانہ کیا جائے۔

اس حکم کو مضبوط کرنے کے لیے مرزا غلام احمد کی کتب کے حوالہ جات ملاحظہ ہوں:

''حضرت مسیح موعود کے منہ سے نکلے ہوئے یہ الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے ہیں، انھوں نے فرمایا:

1- اللہ تعالیٰ کی ذات، رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، قرآن، نماز، روزہ، حج غرضیکہ آپ نے تفصیل سے بتایا کہ ایک ایک چیز میں ان (مسلمانوں) سے اختلاف ہے۔ (خطبۂ مرزا محمود احمد، پسر مرزا غلام احمد، اخبار ''الفضل'' قادیان جلد 19، نمبر 14، 30 جولائی 1930)

2- ''غیر احمدیوں کا کفر بینات سے ثابت ہے اور کفار کے لیے دعائے مغفرت جائز نہیں!'' (فتویٰ، مفتی سرور شاہ، اخبار ''الفضل'' 7 فروری 1921ء)

ریاست کی خواہش

''احمدیوں کے پاس چھوٹے سے چھوٹا ٹکڑا نہیں، جہاں احمدی ہی احمدی ہوں۔ کم از کم ایک علاقہ کو مرکز بنا لو، اور جب تک ایسا مرکز نہ ہو، جس میں کوئی ''غیر مسلمان'' نہ ہو، اس وقت تک تم اپنے مطالبہ کے امور جاری نہیں کر سکتے اور نہ ہی اخلاق کی تعلیم ہو سکتی ہے، نہ پورے طور پر تربیت کی جا سکتی ہے۔ اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا تھا کہ مکہ اور حجاز سے مشرکوں کو نکال دو۔

ایسا علاقہ جب تک ہمیں نصیب نہیں ہوتا جو خواہ چھوٹے سے چھوٹا ہو مگر اس میں ''غیر مسلمان'' نہ ہو، اس وقت تک ہمارا کام مشکل ہے، اور اگر یہ نہ ہو تو ہمارا کام اور بھی مشکل ہو جائے گا۔ (خطبۂ محمود، ''الفضل'' مارچ 1922ء)

بادشاہت کا خواب

''تم اس وقت تک امن میں نہیں ہو سکتے جب تک تمہاری اپنی بادشاہت نہ ہو۔ ہمارے لیے امن کی ایک ہی صورت ہے کہ دنیا پر غالب آ جائیں۔''

(خطبۂ محمود، ''الفضل'' 12 اپریل 1940ء)

ساری دنیا ہماری دشمن ہے

''ساری دنیا ہماری دشمن ہے۔ بعض لوگ، جب ان کو ہم سے مطلب ہوتا ہے تو ہمیں شاباش کہتے ہیں، جس سے بعض احمدی خیال کرتے ہیں کہ وہ ہمارے دوست ہیں، حالانکہ جب تک

ایک شخص خواہ وہ ہم سے کتنی ہمدردی رکھنے والا ہو، پورے طور پر احمدی نہیں ہو جاتا ہمارا دشمن ہے۔‘‘
(تقریر محمود، 25 اپریل 1930ء)

قائداعظم کی مخالفت

’’کیا مسٹر جناح ساری دنیا کے مسلمانوں کے نگران ہو سکتے ہیں؟ اور کیا مسٹر جناح اسلامی دنیا کے تمام نقائص اور خرابیوں کو دور کر سکتے ہیں؟ کیا مسٹر جناح یا کوئی مسلمان نمائندہ آج پھر ایمان کی پہلی حالت قائم کرسکتا ہے جو کہ قرونِ اولیٰ کی تھی؟‘‘ (اخبار الفضل، قادیان 28 اپریل 1940ء)

جب مرزائی جماعت اور اس کے خلیفہ کے یہ متعصبانہ خیالات اور رجحانات ہوں تو پھر قادیان کو ریاست بنانے کے لیے اور مسلمانوں یعنی غیروں کو قادیان سے نکالنے کا عملی پروگرام تو ان کے بنیادی مقاصد تھے۔ لہٰذا اس کی ابتدا تو قادیان کے مسلمانوں پر جبر و سختی سے شروع ہونی تھی۔

چنانچہ اس کی ابتدا بھی مرزائی جماعت نے قادیان سے ہی شروع کی اور مسلمانوں کا تجارتی بائیکاٹ شروع ہوا۔ مسلمان دکانداروں سے خرید و فروخت بند کی اور وہاں کے تجارتی لوگوں کو مجبور کیا کہ وہ قادیان میں اپنا کاروبار کرنا چاہتے ہیں تو مرزائی جماعت کے ہوم ڈیپارٹمنٹ سے لائسنس تجارت حاصل کریں۔ ہوم ڈیپارٹمنٹ کا نام ناظر امورِ عامہ قادیان تھا اور یہ ریاست کی ابتدا تھی۔ اس ہوم ڈیپارٹمنٹ کے تحت ایک جنرل پریزیڈنٹ تھا، جس کے تحت ہر محلّہ کے پریزیڈنٹ تھے۔ اس کا کام بائیکاٹ کی عملی نگرانی تھی۔

محکمۂ کارِ خاص

اس کی امداد کے لیے محکمہ کارِ خاص بنایا، جس کے فرائض سیاسی تھے اور ان میں ایک یہ بھی فرض تھا کہ وہ سارا دن بازاروں میں گھوم کر یہ رپورٹیں دے کہ کون سا مرزائی مسلمانوں سے میل جول رکھتا ہے یا ان سے سودا خریدتا ہے۔ ان کی رپورٹوں پر ان لوگوں کو سزا دی جاتی تھی۔ اس لائسنس کے شرائط ملاحظہ ہوں:

تجارتی معاہدہ

قادیان کی جماعتِ احمدیہ نے جو معاہدۂ ترقی تجارت تجویز کیا ہے، مجھے منظور ہے۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ ضروریاتِ جماعتِ احمدیہ کا خیال رکھوں گا اور نیز جو حکم ’’ناظر امورِ عامہ‘‘ دیں گے، اس کی بلا چون و چرا تعمیل کروں گا۔ نیز جو ہدایات وقتاً فوقتاً جاری ہوں گی، ان کی بھی پابندی کروں گا۔ اگر میں کسی حکم کی خلاف ورزی کروں تو جو جرمانہ تجویز ہوگا وہ ادا کروں گا۔ میں عہد کرتا ہوں کہ

میرا جو جھگڑا احمدیوں سے ہوگا، اس کے لیے امام جماعتِ احمدیہ قادیان کا فیصلہ میرے لیے قابلِ حجت ہوگا اور ہر قسم کا سودا احمدیوں سے خریدوں گا۔

معاہدہ کی خلاف ورزی کی صورت میں 20 روپے سے لے کر 80 روپے تک جرمانہ ادا کروں گا اور بیس روپے پیشگی جمع کرا دوں گا۔

اگر میرا جمع شدہ روپیہ ضبط ہو جائے تو مجھے اس کی واپسی کا حق حاصل نہ ہوگا۔ نیز میں عہد کرتا ہوں کہ احمدیوں کی مخالف مجلس میں شریک نہ ہوں گا۔

ناظرین! آپ غور فرمائیں کہ ریاستی لائسنس کی اجازت انگریزی حکومت نے مرزائی جماعت کو سیاسی غلبہ حاصل کرنے کے لیے کیوں دے رکھی تھی؟

پھر جس کے پاس یہ لائسنس نہ ہو، کیا وہ قادیان میں مرزائی جماعت سے کرایہ کی دوکان یا رہائشی مکان حاصل کر سکتا تھا؟

پھر اس پر طرہ یہ کہ محکمہ کارِ خاص کے والنٹیر، لائسنس حاصل نہ کرنے والوں کی دوکان پر کھلے بندوں پکٹنگ کرتے تھے کہ کوئی بھول چوک سے بھی کسی غیر مرزائی مسلمان دکاندار سے سودا نہ خرید سکے اور وہ سودا خریدنے والے ہر مرزائی کو روکتے، اور بھول چوک سے سودا خریدنے والوں کو ناظر امورِ عامہ جرمانہ کی سزا دیتے تھے۔

کیا یہ ریاست قادیان بنانے کا عملی پروگرام نہ تھا جو انگریزی حکومت کی خدمت کا صلہ تھا؟

محکمہ کارِ خاص کی سرگرمیاں

محکمہ کارِ خاص کا سربراہ مرزا محمود خلیفۂ قادیان کا برادرِ حقیقی خورد کیپٹن مرزا شریف احمد تھا، جس کا بیٹا مرزا ظفر احمد بار ایٹ لاء تھا۔ اس محکمہ کا انچارج مقامی مولوی عبدالعزیز آف بھامڑی تھا، جس کو عرفِ عام میں ''عزیز بھامڑی'' کہتے تھے۔ یہ ''عزیز بھامڑی'' وہی ہے جس نے ربوہ میں حالیہ فساد کروایا اور کالج کے مسلمان بچوں پر، ریلوے اسٹیشن ربوہ پر خون ریز حملہ کروایا، جو مرزا ناصر احمد خلیفۂ ثالث ربوہ کا یارِ غار ہے اور مرزا ناصر احمد، انجمنِ خدام الاحمدیہ قادیان کا پریزیڈنٹ تھا۔ ہر دو علاقہ میں مرزائیوں کے جلسہ میں مرزائی والنٹیرز کے نگران اور انچارج ہوتے تھے۔ محکمہ کارِ خاص کے ملازمین سفید کپڑوں میں، صبح شام ریلوے سٹیشن قادیان پر خصوصی فرائض سرانجام دیتے تھے۔ باہر سے آنے والے مسافروں کی نگرانی کرتے، اُن سے اتہ پتہ پوچھتے اور فوراً آ کر محکمہ میں رپورٹ دیتے۔ جس طرح حکومتِ برطانیہ کی سی۔ آئی۔ ڈی، ریلوے سٹیشن قادیان پر فرائض سرانجام دیتی تھی۔

محکمہ کارِ خاص کے کچھ کارکن بٹالہ ریلوے سٹیشن تک جاتے اور نئے مسافروں کی ہر طرح

سے خبر گیری رکھتے اور ہر طریق پر جاسوسی کرتے۔ یہ سب ہتھکنڈے نئے مسافروں کو مرعوب کرنے کے لیے ہوتے یا مرزائی جماعت کے رعب و دبدبہ سے کوئی ان کی مخالفت نہ کرے۔ اور وہ مسافر جس گھر میں جا کر قیام کرتے، ان کا پتہ نوٹ کر کے اپنے سربراہ کو اطلاع دیتے۔ علاقہ میں ہر قسم کے جلسے جو مرزائیوں کی طرف سے یا ان کے خلاف ہوں، کی بھی ڈائری نوٹ کرتے۔ غرضیکہ یہ محکمہ ہر طرح برطانوی محکمہ سی۔ آئی۔ ڈی کی طرح چاک و چوبند رہتا اور رپورٹیں لاتا کہ کونسا مرزائی ہندوؤں یا مسلمانوں سے میل ملاقات رکھتا یا کسی طرح بھی ان کی پرائیویٹ مذہبی یا سیاسی سوسائٹی میں شریک ہوتا ہے۔ مولوی عبدالعزیز بھامڑی کے علاوہ مولوی ظفر محمد، مولوی فاضل، مولوی نذر محمد، گل نور پٹھان، ابراہیم ماشکی شاعرِ احمدیت و مولوی عبدالرحمٰن عرف مولوی جٹ بھی اس محکمہ کے خصوصی امدادی کارکن تھے۔

نیشنل لیگ کا قائداعظم

اس کارِ خاص کے علاوہ، احمدیہ نیشنل لیگ کا سیاسی محکمہ تھا جو اس کارِ خاص کی برانچ تھا اور احمدیہ کور بھی اس کی برانچ تھی۔

نیشنل لیگ کے سربراہ کو قائداعظم کے الفاظ سے خطاب کرتے تھے جو سر ظفر اللہ خاں کا بھائی چوہدری اسد اللہ خاں بیرسٹر تھا اور محمد صادق شبنم سیکرٹری تھا۔ احمدیہ کور کا انچارج محمد حیات سرمہ فروش تھا جو کور کمانڈر کہلاتا تھا۔ اس کور کے الفاظ کوڈ ورڈ (Codeword) ہوتے تھے۔

اس طرح قادیان کے قصبہ پر مرزائی جماعت نے متوازی حکومت قائم کر رکھی تھی تاکہ مخالفین پر سیاسی دباؤ ڈال کر یا ان کو مرزائی بنایا جائے یا ان کو قادیان بدر کیا جا سکے۔ یہ لوگ بائیکاٹ کے ہر طرح سے انچارج تھے۔

چنانچہ حبیب الرحمٰن عرف خان کابلی کو قادیان بدر کیا گیا، اس کو قادیان میں آنے کی اجازت نہ تھی۔

مولوی عبدالکریم مباہلہ کو بھی قادیان بدر کیا گیا۔

ان لوگوں سے پہلے اخبار ''الفضل'' قادیان کے ایڈیٹر محفوظ الحق علمی اور مہر محمد شہاب سب ایڈیٹر، مولوی اللہ دتہ ہیڈ ماسٹر مبلغ کو بھی قادیان بدر کی سزا دی گئی اور ان کو جان بچانے کے لیے وہاں سے بھاگنا پڑا۔ چنانچہ یہ لوگ بہائی مذہب اختیار کر گئے۔

شاعرانِ احمدیت

مرزائی جماعت میں ایک ٹولہ مخصوص شاعروں کا بھی تھا جو مرزائی جماعت کی حمایت میں اسلام کے خلاف بدزبانی کرتے اور مسلمانوں کے بزرگوں کی شان میں گستاخانہ نظمیں بناتے، جن میں خصوصی طور پر قاضی اکمل، رحمت اللہ شاکر، روشن الدین تنویر، ثاقب زیروی، حسن رہتاسی، ڈاکٹر منظور سلانوالی، حافظ سلیم اٹاوی، ابراہیم عاجز ماشکی، میر قاسم علی قابل ذکر ہیں۔

قاضی اکمل کے اشعار نمونۃً ملاحظہ ہوں جو اس نے غلام احمد متنبی قادیاں کی شان میں لکھے ۔

محمد پھر اتر آئے ہیں ہم میں!!
اور آگے سے ہیں بڑھ کر اپنی شاں میں
محمد دیکھنے ہوں، جس نے اکمل
غلام احمد کو دیکھے قادیاں میں!

(معاذ اللہ، نقل کفر کفر نہ باشد۔ ناقل)

اس قسم کی ناقابلِ برداشت اور دل آزار نظمیں لنگر خانہ میں مشاعرے کروا کر پڑھی جاتیں اور مرزائی جماعت اور ان کے نام نہاد ''مقدسین'' ان کی داد دیتے اور انعام و اکرام سے نوازتے اور یہ سب انگریزی حکومت کے کھونٹے پر ناچ تھا۔

نور محمد قریشی ایڈووکیٹ

مرزا قادیانی کا کارنامہ

قادیان کو اُجاڑنا

مرزا غلام احمد قادیانی کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ مرزا قادیانی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے قادیاں کو اجاڑ دیا۔ لیکن اس کی تفصیل بیان کرنے سے قبل قادیاں کے بارے میں مرزا غلام احمد قادیانی کے کشوف ملاحظہ فرمالیں:

''حضرتِ اقدس (مرزا غلام احمد قادیانی) ایک روز فرماتے تھے ہم نے کشف میں دیکھا کہ قادیان ایک بڑا عظیم الشان شہر بن گیا ہے۔ انتہائی نظر سے بھی پرے تک بازار نکل گئے۔ اونچی اونچی دومنزلی یا چومنزلی یا اس سے بھی زیادہ اونچے اونچے چبوتروں والی دکانیں عمدہ عمارت کی بنی ہوئی ہیں اور موٹے موٹے سیٹھ بڑے بڑے پیٹ والے جن سے بازار کو رونق ہوتی ہے، بیٹھے ہیں اور ان کے آگے جواہرات اور لعل اور موتیوں اور ہیروں، روپوں اور اشرفیوں کے ڈھیر لگ رہے ہیں اور قسما قسم کی دکانیں خوبصورت اسباب سے جگمگا رہی ہیں۔ یکے، بگھیاں، ٹمٹم، فٹن، پالکیاں، گھوڑے، شکر میں، پیدل اور اس قدر بازار میں آتے جاتے ہیں کہ مونڈھے سے مونڈھا بھڑ کر چلتا ہے اور راستہ بمشکل ملتا ہے۔'' (تذکرہ مجموعہ الہامات طبع دوم، ص 34-433)

مرزا غلام احمد کا قادیاں کے بارے میں ایک اور کشف ملاحظہ فرمائیں:

''حضرت خلیفۃ المسیح ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز فرماتے ہیں: مجھے یاد ہے اس میدان سے جاتے ہوئے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنا ایک رؤیا سنایا تھا کہ قادیاں بیاس تک پھیلا ہوا ہے اور مشرق کی طرف بھی بہت دور تک اس کی آبادی چلی گئی ہے۔'' (تذکرہ مجموعہ الہامات طبع دوم ص 779)

مارچ 1940ء میں مسلم لیگ نے اپنے اجلاسِ لاہور میں ایک قرارداد کے ذریعہ تقسیم ہند

کا مطالبہ کر دیا۔ اس کے بعد 1947ء تک مسلم لیگ کی جد و جہد کا مرکز و محور تقسیمِ ہند ہی رہا۔ مسلم لیگ کا مطالبہ تھا کہ صوبہ سرحد، پنجاب، بلوچستان اور سندھ کو ہندوستان سے علیحدہ کر کے مسلم اکثریتی صوبوں پر مشتمل الگ ملک بنا دیا جائے۔ اس تجویز میں پنجاب کی تقسیم شامل نہیں تھی۔ 1947ء سے قبل ایک موقع ایسا بھی آیا کہ مسلم لیگ تقسیم سے کم تر ایک تجویز پر رضا مند ہو گئی۔ چودھری محمد علی (سابق وزیر اعظم پاکستان) نے اس کو بیان کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

''16 مئی کو کابینہ مشن اور وائسرائے نے ایک بیان شائع کیا جس میں انھوں نے اپنی طرف سے آئینی مسئلہ کا حل پیش کیا۔ ان کے منصوبہ کا مرکز و محور ایک ہی مملکت کو برقرار رکھنا تھا جسے انگریزوں نے بڑی محنت سے تعمیر کیا تھا۔ انھوں نے انتظامی، اقتصادی اور فوجی اسباب کی بنا پر دو آزاد اور خود مختار مملکتوں کی تجویز مسترد کر دی۔ کابینہ مشن کی نگاہ میں اس امر کا کوئی جواز نہیں تھا کہ پاکستان میں پنجاب، بنگال اور آسام کے وہ اضلاع شامل کیے جائیں جن کی بیشتر آبادی غیر مسلم تھی۔ اس کے برعکس ایک ایسے پاکستان کو جو فقط مسلم اکثریتی علاقوں تک محدود ہو مسلم لیگ نا قابلِ عمل قرار دیتی تھی۔ تاہم مشن نے مسلمانوں کے ان خدشات کے وزن کو محسوس کیا کہ ہندوؤں کے زیر غلبہ ایک ہی وحدانی ہند میں مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت اور ان کی سیاسی و معاشرتی زندگی دب کر رہ جائے گی۔ ان وجوہ کے پیش نظر انھوں نے تین درجات کے آئینی منصوبہ کی ترتیب ضروری سمجھی۔

اوّل: ایک اتحادیہ ہند (یونین آف انڈیا) ہونی چاہیے جو برطانوی ہند اور ریاستوں دونوں پر مشتمل ہو۔ اس کی تحویل میں امور خارجہ، دفاع اور مواصلات کے محکمے ہونے چاہئیں اور اس کے پاس بقدر ضرورت مالیہ وصول کرنے کے اختیارات بھی ہونے چاہئیں۔ اہم فرقہ وارانہ مسائل کو طے کرنے کے لیے دونوں بڑے فرقوں کے نمائندوں کی اکثریت درکار ہوگی اور رائے شماری میں حصّہ لینے والے کل حاضر ارکان کی اکثریت بھی ضروری ہوگی۔

دوم: صوبوں کے تین گروپ ہونے چاہئیں۔ حصّہ الف ہندو اکثریت کے چھ صوبوں پر مشتمل ہوگا۔ حصّہ ب شمال مغربی سرحدی صوبہ، سندھ، پنجاب

اور بلوچستان پر مشتمل ہوگا اور حصہ ج بنگال اور آسام پر۔
سوم: صوبے اور ریاستیں بنیادی اکائیاں ہوں گی۔ مرکزی امور کے سوا باقی تمام امور اور باقی ماندہ اختیارات صوبوں کی تحویل میں دیے جائیں گے۔ ریاستیں اپنے تمام امور اور اختیارات اپنے پاس رکھیں گی۔ ماسوا ان کے جو مرکزی حکومت کے سپرد کیے جائیں۔

آئین ساز اسمبلی کے تین حصوں میں سے ہر ایک حصہ (الف۔ ب اور ج) اپنے گروپ میں شامل صوبوں کے لیے آئین بنائے گا اور ساتھ ہی یہ فیصلہ بھی کرے گا کہ آیا بحیثیت مجموعی گروپ کے لیے آئین بننا چاہیے لیکن نئے آئین کے تحت پہلے عام انتخابات کے بعد کسی بھی صوبہ کی نئی مجلس قانون ساز کو گروپ سے باہر نکل آنے کا اختیار حاصل ہوگا۔

مشن کے بیان میں کہا گیا تھا کہ وہ ''ایک عبوری حکومت کے فوری قیام کو انتہائی اہمیت دیتے ہیں جس میں سب محکمے بشمول امورِ جنگ، ہند کے ایسے لیڈروں کے ہاتھ میں ہوں گے جنھیں عوام کا مکمل اعتماد حاصل ہے۔'' یعنی کابینہ مشن کے بیان میں دستور سازی کے طویل المیعاد منصوبہ کے ساتھ ہی ساتھ ایک عبوری مرکزی حکومت کا مختصر المیعاد منصوبہ بھی شامل تھا۔ اس بیان کی مزید تشریح لارڈ پیتھک لارنس اور وائسرائے نے اپنی نشری تقریروں اور سر سٹیفورڈ کرپس نے ایک بیان میں کی۔ 17 مئی کو مشن نے ایک پریس کانفرنس بھی منعقد کی۔

گاندھی نے کابینہ مشن کے 16 مئی کے بیان کے بارے میں ''اپنے قانونی دماغ کو بروئے کار لا کر'' اس کی دھجیاں اڑا دیں۔ اس کا موقف یہ تھا کہ کابینہ مشن پلان محض ''ایک اپیل اور مشورہ'' ہے، چونکہ آئین ساز اسمبلی خود مختار ہوگی، اس لیے وہ اس منصوبہ کو تبدیل کرنے کی مجاز ہوگی۔ مثلاً وہ مرکزی حکومت کے دائرہ اختیار میں توسیع کر سکے گی یا مسلمانوں اور غیر مسلموں میں امتیاز کو کالعدم قرار دے سکے گی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اسی طرح صوبوں کو آغاز کار میں ہی گروپ میں شامل ہونے یا نہ ہونے کی پوری آزادی حاصل ہوگی۔ گروپ سے نکل آنے کی آزادی تو ایک مزید

تحفظ ہے۔ گاندھی کے نزدیک ان ''تعبیروں کے ساتھ موجودہ حالات میں یہ بہترین دستاویز ہے جو برطانوی حکومت پیش کر سکتی تھی۔'' حالانکہ ان تعبیروں نے ساری سکیم کا حلیہ ہی بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ لارڈ پیتھک لارنس کا رویہ گاندھی کے بارے میں ایسا تھا کہ جیسے روحانیت پرور مشرق کے ایک گرو کے سامنے مادیت زدہ مغرب کے کسی چیلے کا ہو۔ انھوں نے کہیں لکھا تو نہیں کہ گاندھیانہ سوفسطائیت کے اس شاہکار پر ان کا کیا تاثر تھا لیکن اس بات کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ گاندھی کے ''تلاشِ حق کے تجربات'' اب کچھ کچھ ان کی سمجھ میں آ رہے تھے۔ اسی زمانہ میں جب گاندھی نے ریاستوں کے بارے میں کرپس کے الفاظ کو توڑ مروڑ کر کچھ اور معنی پہنائے تو لارڈ پیتھک لارنس بھی یہ دھیما احتجاج کیے بغیر نہ رہ سکا ''سر سٹیفورڈ نے جو کچھ کہا ہے، آپ اس کی غلط تاویل کر رہے ہیں۔''

گاندھی نے جس راستہ کی نشاندہی کی، 24 مئی کو کانگریس ورکنگ کمیٹی بڑی اطاعت شعاری سے اس پر گامزن ہو گئی اور مجلس قانون ساز کو اقتدار منتقل کرنے کا مطالبہ کر دیا جس میں ہندوؤں کو غلبہ تھا۔ اس نے بھی آئین ساز اسمبلی کے اختیارات پر جس میں ہندوؤں کی مستقل اکثریت ناگزیر تھی، کسی حد اور قید کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے نزدیک آئین ساز اسمبلی کابینہ مشن پلان میں جو چاہے، تبدیلی کرنے کی مجاز ہوگی۔ اس پلان میں مسلم نقطہ نظر کی رعایت ملحوظ تھی تو فقط محدود اختیارات کی مرکزی حکومت اور صوبوں کی گروپ بندی سے۔ لیکن کانگریس ورکنگ کمیٹی نے اپنی تعبیر سے انھیں صاف اڑا دیا۔

لارڈ پیتھک لارنس کے نام ایک خط میں صدر کانگرس نے اس اندیشے کا اظہار کیا کہ حصہ ب میں چونکہ پنجاب کو اور حصہ ج میں بنگال کو غالب حیثیت حاصل ہوگی اس لیے ممکن ہے کہ وہ ایسا صوبائی آئین وضع کر دیں جو شمال مغربی سرحدی صوبہ اور آسام کی خواہشات کے بالکل خلاف ہو اور شاید وہ ایسے قواعد وضوابط بھی مرتب کر ڈالیں جن کے تحت کسی گروپ سے ایک صوبے کے نکل آنے کی گنجائش باقی نہ رہے۔ ظاہر ہے کہ کانگریس کا

15 کی جو تعبیر کی گئی ہے کہ آغاز کار میں ہی صوبے یہ فیصلہ کرنے کے مجاز ہوں گے کہ وہ جس گروپ میں رکھے گئے ہیں آیا اس میں شامل ہوں یا نہ ہوں، یہ تعبیر مشن کے مقصد و غایت سے مطابقت نہیں رکھتی...... صوبوں کی گروپ بندی...... سکیم کا ایک لازمی حصّہ ہے، اور فریقین کی باہمی رضامندی سے ہی اس میں ترمیم کی جا سکتی ہے۔ آئین سازی کی تکمیل کے بعد گروپوں سے نکل آنے کا حق عوام خود بروئے کار لا سکیں گے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ نئے صوبائی آئین کے تحت جو پہلے عام انتخابات ہوں گے، ان میں گروپ سے باہر نکل آنے کے مسئلہ کو بہت اہمیّت حاصل ہوگی اور رائے دہی کے نئے نظام کے تحت جو لوگ ووٹ دینے کے مجاز ہوں گے، وہ پوری طرح حقیقی جمہوری فیصلہ میں شریک ہو سکیں گے۔"

بیان میں یہ بھی واضح کر دیا گیا کہ "موجودہ آئین کو عبوری دور میں جاری رہنا ہوگا۔ اس لیے عبوری حکومت کو قانونی طور پر مرکزی مجلسِ قانون ساز کے سامنے جوابدہ نہیں بنایا جا سکتا۔"

مسلم لیگ کونسل کا اجلاس اوائل جون میں منعقد ہوا اور اس میں بحث و غور کا سلسلہ تین دن جاری رہا۔ یہ بات تو بالکل واضح تھی کہ برطانوی حکومت نے دو آزاد و خود مختار مملکتوں کو قبول نہ کرنے کا پختہ ارادہ کر رکھا ہے۔ سالہا سال سے مسلمانوں نے اپنی قسمت کو پاکستان سے وابستہ کر رکھا تھا۔ لیکن اب یوں معلوم ہوتا تھا کہ یہ ان کے نصیب میں نہیں۔ اجلاس میں کئی لوگ تو از حد مایوس تھے اور بعض امید کی اس کرن سے اپنے آپ کو تسلی دے رہے تھے کہ یہ سکیم بالآخر ایک آزاد و خود مختار پاکستان کے قیام پر منتج ہوگی۔ برصغیر کی ایک واحد مملکت کے ڈھانچہ کے اندر کابینہ مشن کی سکیم اپنی سب پیشرو سکیموں سے بہتر تھی۔ اس میں پاکستان کو تسلیم تو نہیں کیا گیا تھا تاہم اس کے تحت مسلمانوں کو اپنے اکثریتی علاقوں میں اپنے سیاسی، ثقافتی، معاشرتی اور معاشی مفادات پر معقول اختیار حاصل ہوگا۔ لیکن کیا یہ منصوبہ بھی، جو مسلم مطالبہ سے بہت فروتر تھا، کانگریس کے حملوں کی تاب لا سکے گا......؟ اس سوال کا کوئی یقینی جواب نہیں دیا جا سکتا تھا۔

گاندھی اب تک اس بات کا دعویدار تھا کہ کابینہ مشن کے بیان کا وہی معنی ہوگا، جو اسے پسند ہو، خواہ اس بیان کے مصنف، اس کا مطلب کچھ اور ہی کیوں نہ بتائیں۔ وہ آسام کو حصہ ج سے باہر رہنے کے لیے اکسا رہا تھا۔ اس طرح شمال مغربی سرحدی صوبہ میں کانگریسی وزارتیں تھیں۔ سکھ بپھرے ہوئے تھے۔ ایک طرف ہندوأن کے ساتھ پینگیں بڑھا رہے تھے اور دوسری طرف انگریز ان کی فوجی خدمات کے پیشِ نظر ان کی ناز برداری کر رہے تھے۔ کانگریس کا آخری فیصلہ ابھی معلوم نہیں ہوا تھا لیکن چونکہ ان کا ایک ہی واحد مملکت کا بنیادی مطالبہ مان لیا گیا تھا اس لیے غالب گمان یہی تھا کہ وہ اس منصوبہ کو مسترد نہیں کرے گی۔ اپنی سابقہ پالیسی کے مطابق کہ مسلمانوں کو سیاسی اقتدار میں کوئی حصہ نہ ملے...... کانگریس نے انگریزوں پر دباؤ ڈالنے کے حربے بھی شروع کر دیے تھے اور ساتھ ہی ساتھ لیبر پارٹی کے مدبرین سے جذباتی نوعیت کی اپیلیں بھی کر رہی تھی۔

اتنی بات ضرور تھی کہ کانگریس نے 16 مئی کے بیان کی جو بالکل نامعقول تاویل کی تھی، وہ کابینہ مشن سے اسے منوا نہیں سکتی تھی۔ اس ضمن میں جو خدشات اور شکوک وشبہات تھے، وہ کابینہ مشن کے 25 مئی والے بیان نے دور کر دیے تھے۔ 4 جون کو وائسرائے نے قائداعظم کو ایک خط میں برطانوی حکومت کی طرف سے اس سے بھی زیادہ باوثوق ضمانت دی کہ وہ میزانِ عدل کو مستقیم رکھنے کا عزمِ صمیم رکھتی ہے۔ وائسرائے نے لکھا:

"آپ نے مجھ سے کل کہا تھا کہ میں حتمی طور پر آپ کو بتاؤں کہ اگر کابینہ مشن کے 16 مئی والے بیان کو ایک فریق نے قبول کر لیا اور دوسرے نے مسترد کر دیا، تو پھر کیا کیا جائے گا؟ کابینہ مشن کی طرف سے اور ذاتی طور پر میں خود بھی آپ کو پورا یقین دلاتا ہوں کہ ہر دو فریق کے ساتھ سلوک میں ہم کوئی امتیاز روا نہیں رکھیں گے۔ اگر کسی ایک فریق نے منصوبہ قبول کر لیا تو جہاں تک حالات نے اجازت دی، ہم منصوبہ پر عملدرآمد کریں گے، لیکن ہمیں امید ہے کہ دونوں فریق اسے قبول کر لیں گے۔"

کابینہ مشن اور وائسرائے کی اس یقین دہانی نے مسلم لیگی لیڈروں کے آخری موقف کو متعین کرنے میں فیصلہ کن کردار ادا کیا۔

مسلم لیگ کونسل نے تمام پہلوؤں کا اچھی طرح موازنہ کرنے کے بعد 6 جون کو کابینہ مشن پلان کو منظور کرنے کا فیصلہ کر دیا۔ اس فیصلہ کا اطلاق طویل المیعاد منصوبہ اور مختصر المیعاد منصوبہ دونوں پر ہوتا تھا۔ کونسل نے یہ توثیق بھی کر دی کہ مسلم لیگ آئین ساز اسمبلی میں شامل ہوگی۔ مجوزہ عبوری حکومت کے متعلق کونسل نے اپنے صدر کو وائسرائے کے ساتھ گفت و شنید کے اختیارات دے دیے کہ وہ جو موزوں اور مناسب سمجھیں، فیصلے اور اقدامات کریں۔ کونسل نے یہ حق محفوظ رکھا کہ حالات کی رفتار کا تقاضا ہوا، تو وہ اپنی اس پالیسی پر نظرثانی کر سکے گی۔

قائداعظم محمد علی جناح پر کانگریسی لیڈر اکثر یہ الزام دھرتے تھے کہ وہ کبھی قطعی طور پر اپنے آپ کو کسی چیز کا پابند نہیں کرتے۔ کہا جاتا تھا کہ وہ دوسروں کو پہل کرنے دیتے ہیں، جو ملے اسے قابو کر لیتے ہیں اور پھر اس سے بھی بڑا مطالبہ پیش کر دیتے ہیں۔ اس تاریخی مرحلے میں مسلم لیگ نے ان کی قیادت میں کابینہ مشن پلان کو منظور کرنے کا بہت ہی جرأت مندانہ اور دور رس فیصلہ اس وقت کیا جبکہ کانگریس اس بارے میں ابھی حیلہ حوالہ کر رہی تھی۔ بدرجہ آخر یہ یقین و ایمان کا معاملہ تھا، یقین و ایمان اس بات پر کہ شاید آزادی کا منظر ہندو لیڈروں کے دلوں کو قدرے وسعت اور فراخی عطا کر دے اور کلی اقتدار کی ہوس چھوڑ کر وہ مسلمانوں کے ساتھ شراکت سے رہنے کے لیے تیار ہو جائیں، یقین و ایمان انگریزوں کی آبرومندی اور عدل و انصاف کے احساس پر...... اور سب سے بڑھ کر یقین و ایمان اس بات پر کہ مسلمانوں کو اجتماعی زندگی میں معقول مساوات کا موقع ملا تو وہ ترقی کر کے اپنی روایات اور تہذیب و تمدن کے شایانِ شان عظمت اور قوت حاصل کر لیں گے۔ قائداعظم خاص طور پر محسوس کرتے تھے کہ زندگی بھر وہ ضمیر کی آزادی اور ہندو مسلم تعلقات میں منصفانہ مفاہمت کے لیے جو جدوجہد کرتے رہے تھے، وہ کامیابی سے ہمکنار ہونے والی ہے۔ برطانوی پریس نے بھی مسلم لیگ کے اس فیصلہ کو "دانش مندانہ اور مدبرانہ" قرار دیا۔ اس پر ملک بھر میں اطمینان کا اظہار کیا گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ بالآخر

ہندو مسلم اختلافات سلجھ گئے ہیں اور آزادی کی منزل سامنے نظر آنے لگی ہے۔ (ظہورِ پاکستان، صفحہ 76 تا 82)

قارئین کرام نے ملاحظہ فرما لیا کہ مسلم لیگ نے کابینہ مشن پلان کو منظور کر لیا تھا جس کے مطابق ہندوستان کی مرکزی حکومت کے ماتحت تین ذیلی وفاق قائم ہونا تھے اور دس سال بعد مشرقی اور مغربی ذیلی وفاق نے ریفرنڈم کے ذریعہ فیصلہ کرنا تھا کہ وہ مرکزی وفاق میں شامل رہنا چاہتے ہیں یا الگ ہونا چاہتے ہیں۔ اس تجویز کے مطابق مرکزی وفاق کے پاس صرف دفاع، امورِ خارجہ اور مواصلات کے محکمے ہی ہونا تھے اور باقی جملہ اختیارات ذیلی وفاق ہائے کے پاس ہونا تھے۔ ایک بات واضح ہے کہ مرکزی وفاق (جس کے ماتحت فوج کو بھی ہونا تھا) میں عددی اکثریت میں بہرحال ہندو ہی ہوتے۔ مرکزی وفاق میں وہی فیصلہ ہوتا جو ہندو پسند کرتے۔ اس صورت میں اس بات کی کوئی ضمانت نہ تھی کہ وہ دس سال یا اس سے قبل کسی ذیلی وفاق میں ریفرنڈم ہونے دیتے۔ ہندوستان نے تو اقوامِ متحدہ کے پلیٹ فارم پر یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ کشمیر میں ریفرنڈم کروائے گا لیکن اس نے اس وعدہ کو آج تک پورا نہیں کیا تو کسی نے اس کا کیا بگاڑ لیا اور آئندہ بھی اس بات کا کوئی امکان نظر نہیں آتا کہ ہندوستان کبھی کشمیر میں ریفرنڈم کروائے۔ انجام کار مرکزی اور ذیلی وفاق والی تجویز کامیاب نہ ہو سکی۔

اس مسئلہ کے بارے میں جسٹس محمد منیر (سابق چیف جسٹس آف پاکستان) نے بھی اپنے خیالات سے آگاہ کیا ہے۔ مناسب ہوگا کہ اسے بھی دیکھ لیا جائے۔

جسٹس محمد منیر لکھتے ہیں:

During the World War II, from March 26, 1946 to June 29, 1946, a special Mission composed of three members of the British Cabinet namely, Lord Pethwick Lawrence, Secretary of State for India, Sir Stafford Cripps, President of the Board of Trade and Alexander, the first Lord of the Admiralty, had visited India to find a compromise formula between the Congress and the Muslim League. Finding an agreement between the two impossible, the Mission had put forward its own scheme.

The Cabinet Mission Plan of 16th May 1946 was a complicated affair but its main feature was abvious to a

constitutional lawyer like Mr. Jinnah. It had rejected Pakistan as an unreality and proposed a federation for India with three sub-federations, often referred to as groups. According to that Plan, the provision of poting out of the sub-federation had placed Pakistan away 10 years after the elections were held under the constitution. For the federation it had reserved the subjects of defence, foreign affairs and communications; all other subjects had to be shared between the sub-federations and their constituent units. The federal constitution was to be framed by a Constituent Assembly which was composed of three sections. Section A was to consist of members, elected on a population basis, from the non-Muslim majority areas, section B of members, similarly elected, from Muslim majority areas and section C of members elected from Bengal and Assam. The Constitution for each sub-federation was to be made by the corresponding section of the Constituent Assembly. Ten years after the first general elections were held under the Consititution so made, any member of the sub-federation could vote to opt out. An interim government with Congress and Muslim members was to be set up at the Centre immediately.

The plan was accepted by the Muslim League first, because it gave to the units of the sub-federation the option to opt out, and by the Congress a month later. The meeting of the Congress Committee which accepted the Plan was presided over by Mr Nehru who was then the Congress President. Only three days later, My Nehru was asked by a press representative whether the Congress had accepted the Plan in its entirety and the reply was that the Congress was entering the Constituent Assembly completely unfettered by any agreement and would consider itself free to meet any situation

that might arise. Does this mean further asked the questioner, that the Congress will be at liberty to modify the Plan including the grouping part of it and the answer was Yes. With these replies vanished the Cabinet Plan and the last chance of a united India. Startled by this interpretaion, the Muslim League withdrew its acceptance of the Plan. Subsequent efforts by Lord Wavel, who was then the Governor-General, to obtain from Gandhi and Nehru the assurance that the Congress was accepting the Plan according to its plain terms and not as the Congress would interpret it, ended with a letter to him from Mr.Nehru that being a soldier he did not understand these legal subtleties and needed a lawyer to make him understand them. But Lord Wavel stuck to his guns and would not budge. Deadlock followed deadlock until by their influence on the Labour Government the Congress leaders succeeded in having Lord Wavel recalled. Long after this episode I had summed up the position in one of my articles in the following words:

"Possibly an unthought, more probably a disingenuous reply by Nehru to a pressmans question and a subsequent legal quibble to support it, an inchoate vision of Pakistan appeared to float on the horizon. Within less than fourteen months it had settled in a tangible form on the world-map, the largest Muslim State and the fifth largest country in the world.

''دوسری عالمی جنگ کے بعد برطانوی کابینہ کے تین ارکان پر مشتمل ایک خصوصی مشن نے 16 مارچ 1946ء تا 29 جون 1946ء ہندوستان کا دورہ کیا جن کے نام (1) لارڈ پیتھک لارنس وزیر ہند (2) سر سٹیفورڈ کرپس صدر بورڈ آف ٹریڈ اور (3) الیگزنڈر وزیر بحریہ تھے۔ اس مشن کی آمد کا مقصد کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان کسی مصالحتی فارمولا کی تلاش تھا۔ دونوں فریقین کے درمیان کسی مصالحت کو ناممکن دیکھتے ہوئے مشن نے اپنی سکیم پیش کی۔

کابینہ مشن کا 16 مئی 1946ء کا منصوبہ ایک پیچیدہ معاملہ تھا لیکن اس کے

اہم نکات مسٹر جناح جیسے آئینی وکیل پر واضح تھے۔اس سکیم نے پاکستان کی تجویز کو غیر حقیقی تصور کرتے ہوئے رد کر دیا تھا اور ایک فیڈریشن کی تجویز پیش کی جس میں تین ذیلی وفاق ہوں جنھیں گروپ کا نام دیا گیا تھا۔ اس منصوبہ نے کسی ذیلی وفاق کو فیڈریشن سے باہر نکلنے کے معاملہ کو آئین کے تحت پہلے الیکشن کے بعد دس سال کے لیے موخر کر دیا تھا۔ اس منصوبہ نے فیڈریشن کے پاس دفاع، مواصلات اور امور خارجہ کے باقی تمام امور کو ذیلی وفاق ہائے کے پاس رہنا تجویز کیا تھا۔ فیڈریشن کا آئین ایسی آئین ساز اسمبلی نے بنانا تھا جس کے تین سیکشن ہونا تھے۔ سیکشن اے اُن ممبران پر مشتمل ہونا تھا جنھوں نے آبادی کی بنیاد پر ان علاقوں سے منتخب ہونا تھا جہاں غیر مسلموں کی اکثریت تھی۔ سیکشن بی اسی طرح ان ممبران پر مشتمل ہونا تھا، جنھوں نے ان علاقوں سے منتخب ہونا تھا جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ سیکشن سی اُن ممبران پر مشتمل ہونا تھا جو بنگال اور آسام سے منتخب ہونا تھے۔ ہر ذیلی وفاق کا آئین متعلقہ سیکشن کے ممبران پر مشتمل آئین ساز اسمبلی نے تیار کرنا تھا۔ آئین کے تحت پہلے الیکشن کے دس سال بعد ذیلی وفاق میں سے کوئی بھی وفاق سے باہر نکل سکتا تھا۔ ایک عبوری حکومت کانگریس اور مسلم لیگ کے ممبران پر مشتمل مرکز میں فوراً ہی قائم ہونا تھی۔"

"مسلم لیگ نے اس منصوبہ کو پہلے ہی قبول کر لیا کیونکہ یہ ذیلی وفاق کو فیڈریشن سے باہر نکلنے کا حق دیتا تھا۔ کانگریس نے ایک ماہ بعد اس منصوبہ کو منظور کر لیا۔ کانگریس کمیٹی کی وہ میٹنگ جس نے اس کو منظور کیا، اس کی صدارت نہرو نے کی جو اس وقت کانگریس کے صدر تھے۔ صرف تین دن بعد ایک اخباری نمائندے نے نہرو سے سوال کیا کہ "کیا کانگریس نے اس منصوبہ کو مکمل طور پر قبول کر لیا ہے؟" جس کا جواب یہ تھا کہ "کانگریس اسمبلی میں داخل ہونے کے بعد ہر قسم کے معاہدے سے مکمل طور پر آزاد ہے اور جیسا بھی کوئی مسئلہ ہوگا آزادی سے فیصلہ کرے گی۔" اگلا سوال یہ تھا کہ "کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ کانگریس اس منصوبہ میں جس میں گروپ بندی کا معاملہ بھی شامل ہے، میں ہر قسم کی تبدیلی کرنے میں آزاد ہوگی؟" نہرو کا

جواب تھا "ہاں۔" اس جواب کے ساتھ کابینہ مشن منصوبہ ملیامیٹ ہو گیا اور ساتھ ہی ہندوستان کے متحدہ رہنے کا آخری موقع بھی۔ منصوبہ کی اس تعبیر سے پریشان ہو کر مسلم لیگ نے اپنی منظوری واپس لے لی۔ بعد میں لارڈ ویول جو گورنر جنرل تھے کی کوشش کہ وہ گاندھی اور نہرو سے کوئی ایسی یقین دہانی حاصل کر سکیں کہ کانگریس اس منصوبہ کو جیسا کہ وہ ہے قبول کر رہی ہے نہ کہ اس طرح کہ جس طرح کانگریس اس کی تعبیر کر رہی ہے۔ اس طرح انجام کو پہنچی کہ نہرو نے اسے خط لکھ دیا کہ وہ (لارڈ ویول) سپاہی ہونے کی وجہ سے ان قانونی نزاکتوں کو نہیں سمجھتا اور یہ کہ اسے ایک قانون دان کی مدد کی ضرورت ہے جو اُسے ایسی باتیں سمجھا سکے لیکن لارڈ ویول اپنے موقف پر قائم رہا اور اس نے کمزوری نہ دکھائی۔ ڈیڈلاک جاری رہا یہاں تک کہ کانگریس نے برٹش لیبر گورنمنٹ میں اپنے اثر ورسوخ کی بنا پر لارڈ ویول کو واپس بھجوا دیا۔ اس قصے کے کافی عرصہ بعد میں نے صورت حال کا خلاصہ اپنے ایک مضمون میں درج ذیل الفاظ میں تحریر کیا تھا:"

"ممکن ہے بے خیالی میں بلکہ زیادہ امکان یہ ہے کہ دوغلا پن کے زیر اثر نہرو کی طرف سے اخباری نمائندہ کے سوال کے جواب میں دیے گئے بیان اور بعد کی اس جواب کی تائید میں کی گئی سخن سازی کے نتیجہ میں پاکستان کا خاکہ افق پر تیرنا شروع ہو گیا تھا جو چودہ ماہ کے عرصہ کے اندر ایک حقیقت کے طور پر دنیا کے نقشہ پر سب سے بڑی اسلامی مملکت اور دنیا کا پانچواں بڑا ملک بن کر نمودار ہو گیا۔" (From Jinnah to Zia, pages 7 to 9)

جسٹس محمد منیر کے مندرجہ بالا اقتباس سے بھی یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اگرچہ مسلم لیگ نے کابینہ مشن کا منصوبہ قبول کر لیا تھا لیکن جب جواہر لال نہرو (جو اس وقت کانگریس کے صدر بن چکے تھے) نے اس کی من مانی تفسیر کی اور اس پر اصرار کیا تو مسلم لیگ نے بھی اپنی منظوری واپس لے لی۔

میں نے یہ طویل اقتباسات صرف یہ بتانے کے لیے نقل کیے ہیں کہ تقسیم ہند اور قیامِ پاکستان مشیتِ ایزدی تھا اور اس بات کا بہت کم امکان تھا کہ ہندوستان کی مرکزی حکومت کسی بھی ذیلی وفاق کو علیحدہ ہونے کی اجازت دیتی۔ اگر ہندوستان متحدہ حالت میں آزاد ہو جاتا تو اس امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا تھا کہ مرزا غلام احمد قادیانی کے کشف اور رؤیا کے مطابق قادیان ایک بارونق قصبہ بن ہی جاتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو یہ منظور نہیں تھا کہ وہ مرزا غلام احمد قادیانی کی کسی بھی بات کو سچا

ہونے دے۔ چنانچہ ہندوستان تقسیم ہو گیا۔ تقسیم کی صورت میں بھی اگر ضلع گورداسپور (جس میں قادیان واقع ہے) پاکستان میں شامل ہو جاتا (ابتداء میں یہی اعلان ہوا تھا کہ گورداسپور پاکستان میں شامل ہوگا) تو بھی یہ امکان تھا کہ قادیان ایک بارونق شہر بن جاتا، جیسا کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنے کشف میں بیان کیا تھا۔ لیکن یہ بھی اللہ کو منظور نہیں تھا اور گورداسپور کو ہندوستان میں شامل کرنے کی خدمت قادیانی امت کی ایک اہم شخصیت نے خود ہی انجام دی۔

ہوا یہ کہ باؤنڈری کمیشن میں اپنی نمائندگی کے لیے مسلم لیگ نے چودھری ظفر اللہ کی بطور وکیل خدمات حاصل کر لیں۔ غالباً چودھری ظفر اللہ بطور وکیل کے اچھی شہرت کے حامل ہوں گے لیکن باؤنڈری کمیشن کے سامنے مسلم لیگ کی وکالت کرتے ہوئے انھوں نے ایک پیشہ ورانہ بددیانتی کی اور قادیانی امت کی طرف سے ایک درخواست دے دی کہ ''قادیان'' کو ایک الگ Status دے دیا جائے، جس طرح کا اٹلی میں پاپائے روم کے شہر ویٹی کن کو حاصل ہے۔ وجہ اس کی یہ بیان کی کہ قادیانی مسلمانوں میں شامل نہیں ہیں۔ قادیانی امت کی اس درخواست نے گورداسپور ضلع میں مسلمانوں کی آبادی کو اکیاون فیصد سے کم کر کے انچاس فیصد کر دیا اور انگریزوں کو بہانہ مل گیا جس سے انھوں نے گورداسپور کو ہندوستان میں شامل کر کے ہندوستان کو کشمیر کے لیے راستہ دے دیا۔ اس مسئلہ پر قادیانی امت کے سربراہ مرزا ناصر احمد قادیانی سے قومی اسمبلی میں اُس موقع پر سوال کیا گیا جب وہ 1974ء میں اسمبلی کے سامنے قادیانی امت کا موقف بیان کر رہے تھے۔

قومی اسمبلی میں قادیانی امت کے دوسرے سربراہ مرزا محمود احمد کا 13 نومبر 1946ء کا ایک بیان مرزا ناصر احمد قادیانی کو پڑھ کر سنایا گیا جو اس طرح ہے:

> ''ایک سال قبل (پاکستان کی آزادی سے ایک سال قبل) میں نے اپنے ایک نمائندے کے ذریعہ ایک انتہائی ذمہ دار انگریز افسر کو کہلوا بھیجا کہ پارسی اور عیسائیوں کی طرح ہمارے بھی حقوق تسلیم کیے جائیں، جس پر اس افسر نے کہا کہ وہ تو اقلیتی مذہبی فرقے ہیں۔ اس پر میں نے کہا کہ پارسی، عیسائی مذہبی فرقے ہیں جس طرح ان کے حقوق کو علیحدہ تسلیم کیا گیا ہے اسی طرح ہمارے بھی کیے جائیں۔ تم ایک پارسی پیش کرتے جاؤ۔ میں اس کے مقابلے میں دو احمدی پیش کرتا جاؤں گا۔''

(ماخوذ از قومی اسمبلی میں قادیانی مقدمہ، تیرہ دن کی کارروائی، صفحہ 81-80)

جسٹس محمد منیر مرحوم (جو پاکستان کے چیف جسٹس بنائے گئے) باؤنڈری کمیشن کے ممبر

تھے اور ریڈکلف چیئر مین تھے۔ انھوں نے ایک مضمون لکھا جو پاکستان ٹائمز میں 21 جون 1964ء کو شائع ہوا۔ اس مضمون میں وہ لکھتے ہیں:

''معاملہ کے اس حصّہ کے متعلّق میں ایک ناخوشگوار واقعہ کا ذکر کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مجھے یہ بات کبھی سمجھ نہیں آئی کہ احمدیوں (قادیانیوں...... از راقم) نے الگ عرضداشت کیوں دی تھی۔ اس قسم کی عرضداشت تبھی ہوسکتی تھی جب احمدی (قادیانی...... از راقم) مسلم لیگ کے نقطہ نظر سے متفق نہ ہوتے جو کہ بذاتِ خود افسوس ناک صورت حال ہوتی۔ ہوسکتا ہے کہ احمدی (قادیانی...... از راقم) مسلم لیگ کے نقطہ نظر کی تائید کرنا چاہتے ہوں (ہرگز نہیں...... از راقم) مگر ایسا کرتے ہوئے انھوں نے گڑھ شنکر کے مختلف حصوں کے بارے میں اعداد و شمار دیے جن سے یہ بات نمایاں ہوئی کہ بین دریا اور بسنتر دریا کے مابین کا علاقہ غیر مسلم اکثریت کا علاقہ ہے اور یہ بات اس تنازعہ کی دلیل بنتی تھی کہ اگر اج دریا اور بین دریا کا درمیانی علاقہ ہندوستان کو مل جائے تو بین دریا اور بسنتر دریا کا درمیانی علاقہ خود بخود ہندوستان کو چلا جاتا ہے، جیسا کہ ہوا۔ احمدیوں (قادیانیوں...... از راقم) نے جو رویہ اختیار کیا تھا وہ ہمارے لیے گورداسپور کے بارے میں خاصا پریشان کن ثابت ہوا۔

مسلمان 51 فیصد تھے، ہندو 49 فیصد، قادیانی 2 فیصد۔ جب یہ مسلمانوں سے علیحدہ ہو گئے تو اس سے گورداسپور جاتا رہا اور کشمیر کا مسئلہ پیدا ہوگیا۔'' (ماخوذ از قومی اسمبلی میں قادیانی مقدمہ)

باؤنڈری کمیشن نے گورداسپور کو ہندوستان میں شامل کرنے کا اعلان کر دیا تو پوری قادیانی امت مع اپنے خلیفہ کے وہاں سے بھاگ کر پاکستان آ گئی لیکن پاکستان سے جو ہندو اور سکھ آبادی منتقل ہوکر مشرقی پنجاب گئی، اُن میں سے کسی نے بھی قادیان جا کر آباد ہونے کی ضرورت محسوس نہ کی کیونکہ قادیان کی واحد دلکشی تو مرزا غلام احمد قادیانی کی قبر ہے اور مرزا غلام احمد قادیانی کی قبر سے کسی ہندو یا سکھ کو کیا دلچسپی ہوسکتی تھی۔ قادیان نہ تو تجارتی مرکز تھا اور نہ ہی وہاں کوئی صنعت تھی کہ خالی جگہ کو پر کرنے کے لیے کوئی وہاں جا کر آباد ہوتا۔ قادیان کی واحد صنعت تو کشف و رؤیا تھے اور یہ صنعت پاکستان آ گئی تھی۔ چنانچہ جو مکانات قادیانی امّت خالی کر کے آئی تھی، وہ ابھی تک خالی پڑے ہیں۔

قادیان کو اجاڑنا بھی مرزا غلام احمد قادیانی کا ایک کارنامہ ہے، بشرطیکہ کوئی عبرت پکڑنے کی ضرورت محسوس کرے۔ اگر مرزا غلام احمد قادیانی نے قادیان کے بارے میں وہ کشف نہ دیکھا ہوتا جو میں نے اس مضمون کے شروع میں بیان کیا ہے تو قادیان نہ اُجڑتا۔ یہ اہلِ بصیرت کے لیے غور کا مقام ہے اور قادیانی امت کے لیے حجت!

ڈاکٹر سیّد محمد اعزاز الحسن شاہ

قرآن کریم کے لفظ ''ربوہ'' کا تحقیقی مطالعہ

قرآن مجید میں ربوہ کا لفظ دو دفعہ استعمال ہوا ہے۔

(1) کمثل جنة بربوة. (البقرہ:265)

(2) و اوینهما الی ربوة ذات قرار و معین. (المومنون:50)

1- لفظی ترجمہ

جو سطح زمین سے بلند جگہ پر ہو اور دوسری آیت میں ''عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ کو ایک ٹیلہ پر ٹھکانہ دیا۔ اس لفظ کا اصل مادہ ''ر ب و'' ہے جو کہ قرآن مجید میں مختلف جگہوں میں مختلف شکلوں کے ساتھ وارد ہوا ہے۔ ان تین حروف کو جب یکجا کریں تو یہ لفظ ''ربوا'' کی شکل اختیار کر جاتا ہے، جس کا قرآن مجید میں اس طرح ذکر ہوا ہے:

احل الله البیع و حرم الربوا. (البقرہ:275)

یعنی اللہ نے خرید و فروخت کو جائز کیا ہے جبکہ سود کو حرام کیا ہے۔ یہ دراصل ہر زیادتی کا نام ہے۔ پھر اس زیادتی پر جب مزید زیادتی ہوتی ہے تو اس میں سختی کا عنصر پیدا ہوتا ہے، تو اس پیرائے کی تعبیر کے لیے قرآن مجید نے لفظ رابیہ استعمال کیا ہے۔ فاخذهم اخذة رابیة. (الحاقہ 10)

ہم نے انھیں انتہائی سخت طرح پکڑ لیا۔ یہ رابیہ بھی ر ب و سے ہی ماخوذ ہے۔ اس کے مصدر کا فعل مضارع یربو اور یربی دونوں طرح قرآن مجید میں مستعمل ہیں۔

ربوہ لفظ کی قرات تین طرح کی جاتی ہے۔ عام مشہور قرات ''ربوہ'' ہے جبکہ ''رُبوہ'' اور ''ربوہ'' بھی ہے۔ پہلی دو قراتوں کا ذکر لسان العرب نے کیا ہے۔ (لسان العرب، مادہ ربا) جبکہ تیسری قرات کا ذکر امام راغب اصفہانی نے مفردات القرآن میں (مفردات القرآن مادہ ر ب و) امام راغب نے اس کا لفظ ''رباوۃ'' بھی پڑھا جانا ذکر کیا ہے جبکہ لسان العرب نے ''ربوہ'' پڑھنے کو ترجیح دی ہے اور ربوہ پڑھنا بنو تمیم کی لغت قرار دیا ہے اور اس کی جمع ر ب ی اور ربی بتلائی ہے۔ لسان العرب نے ''ربوہ'' پڑھنے کو شاید اس لیے راجح قرار دیا ہے کہ اہل عرب اپنی عام محاوراتی زبان میں

کہتے ہیں۔ موت بنا ربوہ من الناس (وھی الجماعة العظیم نحو عشرۃ الاف) یعنی لوگوں کی ایک بڑی جماعت کا ہم سے گزر ہوا (جس سے مراد تقریباً دس ہزار اور اسی طرح رباوۃ کا استعمال بھی اہل عرب اپنی زبان میں اس طرح کرتے ہیں فلاں فی رباوۃ قومہ یعنی اس کا شمار اپنی قوم کے معزز لوگوں سے ہے (اساس البلاغۃ مادہ ر ب و) لسان العرب میں مزید اس مادہ کا ماضی فعل مضارع اور مصدر اور اس کی توضیح اس طرح کی گئی۔

ربا الشئی یربو ربوا ورباء.

بمعنی زاد ونما یعنی کسی چیز کا بڑھنا اس کا مضارع یربوا اور مصدر ربوا اور رباہ بمعنی زیادہ ہونا اور بڑھنا اور اس سے ثلاثی مزید فیہ اربیتہ غیبتہ کہ میں نے اس کو زیادہ کیا اور بڑھایا قرآن مجید میں وارد ہوا ہے۔ یربی الصدقات یعنی صدقات میں اضافہ کرتے ہیں اور حدیث صدقہ میں یوں مذکور ہے۔ تربوا فی کف الرحمٰن حتی تکون اعظم من الجبل کہ صدقہ رحمٰن کے ہاتھوں میں بڑھ بڑھ کر پہاڑ سے بھی بڑا ہو جاتا ہے اور عام محاورہ میں کہتے ہیں ربا السویق یعنی ستو میں جب پانی ڈالا جاتا ہے تو وہ پھول جاتا ہے اس کے لیے یہ محاورہ بولا جاتا ہے۔ اسی طرح قرآن مجید میں زمین کی جو صفت بیان ہوئی ہے۔ مثلاً اھتزت وربت ای عظمت وانتفخت یعنی زمین پھول کر پھٹ پڑی۔ حدیث شریف میں ہے یہ لفظ اس طرح وارد ہے۔ الفردوس ربوۃ الجنۃ ای ارفعھا یعنی فردوس جنت کی اونچی جگہ ہے باقی جنتوں کے مقابلہ میں (لسان العرب مادہ ر ب و) رباہ اور ربوہ کے فرق کو اکثر لغات نے تو واضح نہیں کیا جبکہ ابن کثیر نے اس کتاب النہایہ فی غریب الحدیث والاثر میں یہ فرق کیا ہے۔ الربوہ بالضم والفتح والضم ما ارتفع من الارض یعنی ربوہ مضموم اور مفتوح دونوں طرح مگر اگر مضموم ہو تو اس کا معنی سطح زمین سے اونچی زمین، باقی اگر بالفتح ہو تو یہ زیادتی کے معنی میں ہوگا۔ جیسا حدیث طہفۃ کے حوالے سے مذکور ہے من ابی فعلیہ الربوہ یعنی جو زکوٰۃ کا انکاری ہو تو اس سے اصل زکوٰۃ کی رقم سے زائد وصول کیا جائے گا اور اس طرح من اقر بالجزیہ فعلیہ الربوہ یعنی جو اسلام اس لیے قبول نہیں کرتا کہ اس میں آ کر زکوٰۃ دینی پڑے گی تو اس کے اصل جزیہ کی رقم سے زائد جزیہ لیا جائے گا۔ (النہایہ فی غریب الحدیث والاثر ج 2 ص 192) اس فرق سے تو یہ قول راجح ٹھہرا کر قرآن مجید نے جن دو جگہوں میں اس لفظ کا استعمال کیا ہے۔ اسے "ربوہ" پڑھنا اولیٰ ہے۔ جیسا کہ صاحب لسان العرب کی ترجیح ہے۔ المعجم المفہرس للالفاظ الحدیث کے حوالہ سے ترمذی میں سورۃ المومنون کی تفسیر میں اس لفظ کے ذیل میں لکھا ہے۔ الفردوس ربوۃ الجنۃ و اوسطھا و افضلھا. یعنی فردوس یہ جنت کا ربوہ (اونچی جگہ) اور جنت

کا بہترین مقام ہے۔ اور مسند احمد میں منقول ہے۔ **الا ان عمل الجنة حزن بربوہ.**

(مسند احمد ص 327 ج 3 ص 360)

2- روایتی تجزیہ

اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ مریم علیہا السلام کو جس جگہ ٹھکانہ دیا اس کو ربوہ سے تعبیر فرمایا ہے۔ چنانچہ شاہ عبدالقادر موضح القرآن حاشیہ میں نقل فرماتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب ماں سے پیدا ہوئے تو اس وقت کے بادشاہ نے نجومیوں سے سنا کہ بنی اسرائیل کا بادشاہ پیدا ہوا ہے۔ وہ ان کی تلاش میں پڑا، ان کو بشارت ہوئی کہ اس کے ملک سے نکل جاؤ۔ وہ نکل کر مصر کے ملک گئے۔ وہ گاؤں تھا ٹیلے پر اور پانی وہاں کا خوب تھا۔

(شاہ عبدالقادر، ترجمہ قرآن مجید ص 571 تاج کمپنی)

(2) تفسیر جلالین نے بھی اسی نقطہ سے اتفاق کیا ہے۔

ذکر فی سبب ھذا الایواء ان ملک ذلک الزمان عزم علی قتل عیسی یعنی اس کے ٹھہراؤ کے سبب کے بیان میں کہ اس زمانے کے بادشاہ نے حضرت عیسیٰ کو قتل کرنا چاہا۔ (تفسیر جلالین کلاں حاشیہ ص 390 مطبوعہ نور محمد کراچی)

(3) تفسیر مظہری کا بھی اس سے اتفاق ہے کہ یہودی بادشاہ ہیرودس جب حضرت عیسیٰ کے قتل کے درپے ہو گیا تھا تو حضرت مریم بچہ کو لے کر مصر چلی گئی تھیں۔

(تفسیر مظہری ج 8 ص 191)

(4) تفہیم القرآن میں ہیرودس کے بعد ارخلاؤس کے عہد حکومت کا ذکر ہے کہ ان کی والدہ کو گلیل کے شہر ناصرہ میں پناہ لینی پڑی۔ (بحوالہ متی 132 تا 22، تفہیم القرآن ج 3 ص 281)

(5) تفسیر حسینی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جگہ رملہ فلسطین ہے انھوں نے کشاف کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ یہ ربوہ ہے جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ ٹھہرے۔ (قلمی نسخہ تفسیر حسینی ص 66 ج 3)

رملہ کا واحد الرمل ہے۔ فلسطین کا بہت بڑا شہر ہے اور یہ مسلمانوں کی فوجی چھاؤنی رہ چکی ہے۔ (معجم البلدان ج 3 ص 69)

(6) قلمی تفسیر۔ قرآن القرآن بالبیان مولفہ کلیم الدین نور اللہ 1127ھ کے حوالہ سے ربوہ، ارض مرتفعہ وہی بیت المقدس اودمشق او ایلیہ فلسطین اومصر) یعنی ربوہ یہ اونچی زمین کو کہتے ہیں یہ یا تو بیت المقدس یا دمشق یا ایلیا فلسطین یا مصر ہے۔ (تفسیر مذکور کا صفحہ

423) ایلیاء کے متعلق معجم البلدان میں مذکور ہے کہ اسم مدینہ بیت المقدس کہ یہ بیت المقدس کے کسی شہر کا نام ہے۔ (معجم البلدان ص 293 ج 1) دمشق کے وضاحتی نوٹ میں صاحب معجم البلدان آیت و آوینا هما نقل کر کے لکھتے ہیں کہ وہی دمشق ذات قرار ومعین وذات رفاء من العیش یعنی یہ دمشق ہے کہ جو زندگی کی نعمتوں سے مالا مال ہے۔ پھر آگے چل کر لکھتے ہیں کہ **ان عیسی ینزل عند المناره البیضاء من شرقی دمشق** کہ عیسٰی علیہ السلام کہ دمشق کے شرقی سفید مینار پر نزول فرمائیں گے اور **والمغارة التی فی جبل الیثرب یقال انها کان ماوی عیسی علیه السلام** اور جبل یثرب کو جو غار ہے اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ حضرت عیسٰی کی جائے پناہ تھی۔ (معجم البلدان ج 3 ص 464) اسی طرح اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں دمشق کے وضاحتی نوٹ کے سلسلہ میں مذکور ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ (یہاں) ایک پرسکون ٹیلہ (ربوہ) پر قیام فرمائے ہوئے تھے۔ (الی ربوہ ذات قرار 23: المومنون 50) اور دنیا کے خاتمے کے قریب دجال سے لڑنے کے لیے سفید مینار پر جسے کبھی تو مشرق مینار قرار دیا جاتا تھا اور کبھی مسجد جامع کا شرقی مینار نزول اجلال فرمائیں گے۔ (اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج 9 ص 3، 4 مادہ دمشق)

(7) مولانا ابوالکلام، ترجمان القرآن میں اس آیت کے زیر حاشیہ تحریر کرتے ہیں، ہم نے انھیں ایک مرتفع مقام پر پناہ دی جو بسنے کے قابل اور شاداب تھی۔ غالباً اس سے مقصود وادی نیل کی بالائی سطح ہے یعنی مصر کا بالائی حصہ۔ اناجیل سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح کی پیدائش کے بعد مریم (ترجمان القرآن ج 2 ص 53 مطبوعہ اسلامی اکادمی)

(8) امام قرطبی نے الجامع الاحکام القرآن میں تحریر کیا ہے کہ ابو ہریرہ کے ایک قول بموجب فلسطین اور رملہ ہے اور نبی علیہ السلام سے بھی مروی ہے۔ نیز ابن عباس، ابن المسیب اور ابن سلام کے نزدیک یہ دمشق ہے۔ کعب اور قتادہ کے نزدیک بیت المقدس اور ابن زید کے نزدیک مصر (الجامع الاحکام القرآن ج 12 ص 126 مطبوعہ ایران)

(9) البدایہ والنہایہ میں ضحاک عن ابن عباس روایت کرتے ہیں یہود کے خطرہ کے بموجب اللہ تعالٰی نے آپ کی والدہ کی طرف وحی کی کہ انھیں مصر کی طرف لے کر چلی جائے اور قرآن مجید میں **وجعلنا ابن مریم و امه**......... میں اس طرف اشارہ کر دیا ہے۔ (البدایہ ج 2 ص 7)

(10) تفسیر حسینی کے قلمی نسخہ میں ایک روایت یہ بیان کی گئی ہے ’’آوردہ اند کہ مریم باپسر عم خود یوسف بن ماثان دوازدہ سال درآن موضع بسر کردند‘‘ یعنی حضرت مریم اپنے لڑکے اور یوسف بن ماثان اپنے چچا کے صاحبزادہ کے ہمراہ 12 سال اس جگہ پر رہے۔ (تفسیر حسینی قلمی ص 660 محفوظ کتب خانہ جامعہ عربیہ چنیوٹ ضلع جھنگ)

(11) جلالین نے تفسیر صاوی کے حوالہ سے یہی بات نقل کی ہے کہ آپ کی والدہ اس ٹیلہ پر لے گئیں اور یہاں 12 سال رہیں، اتنے میں وہ بادشاہ مرگیا۔ (جلالین کلاں حاشیہ ص 290)

(12) مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی قصص القرآن میں جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالات و واقعات پر تبصرہ فرماتے ہیں، انھوں نے حضرت عیسیٰ کی جائے ولادت کی جگہ کو ٹیلہ (ربوہ) سے تعبیر کیا ہے اور یہ وہ جگہ ہے کہ آپ کی والدہ پیدائش کے قریب بیت المقدس سے دور تقریباً 9 میل وکوہ سراۃ (ساعیر) کے ایک ٹیلہ پر چلی گئیں جواب بیت اللحم کے نام سے مشہور ہے۔ (قصص القرآن ج 4 ص 42) بیت اللحم کے متعلق صاحب معجم البلدان نے یہ توضیح کی ہے۔ بیت المقدس کے آس پاس ایک پُررونق جگہ ہے۔ یہاں ایک جگہ مہد عیسیٰ کے نام سے مشہور ہے، اور اس کا محل وقوع بیت المقدس سے جبرین کی طرف ہے۔ جبرین بیت المقدس اور عسقلان کے درمیان ایک قلعہ ہے۔ اس کو عمرو بن العاص نے فتح کیا تھا اور اس کو اپنی جاگیر میں شامل فرمالیا۔ اس کا نام غلام کے نام پر عجلان رکھا۔ اور ایک روایت کے مطابق بیت اللحم دمشق اور بعلبک کے درمیان ایک بستی کا نام ہے۔ (معجم البلدان ص 102 ج 2) اسی ساعیر سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے ظہور کی پیشین گوئی سابقہ آسمانی کتابوں میں ہوئی۔ چنانچہ قصص القرآن میں مذکور ہے۔ تورات انجیل اپنی لفظی ومعنوی تحریفات کے باوجود آج بھی چند بشارات کو اپنے سینہ میں محفوظ رکھتی ہے جو مسیح علیہ السلام کی آمد سے تعلق رکھتی ہیں۔ تورات استثناء میں ہے اور اس موسیٰ نے کہا کہ خداوند سینا سے آیا اور شعیر (ساعیر) سے ان پر طلوع ہوا اور فاران کے پہاڑوں سے جلوہ گر ہوا۔ (باب 33 آیت 10) اس بشارت میں سینا سے خدا کی آمد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کی جانب اشارہ ہے اور ساعیر سے طلوع ہونا نبوت عیسیٰ علیہ السلام مراد ہے کیونکہ ان کی ولادت باسعادت اسی پہاڑ کے ایک مقام بیت اللحم میں ہوئی اور متی کی انجیل میں ہے۔ جب یسوع ہیرودس بادشاہ کے زمانہ میں یہودیہ کے بیت اللحم میں پیدا ہوا۔ (باب 3 آیات 16) اس سے

(10) تفسیر حسینی کے قلمی نسخہ میں ایک روایت یہ بیان کی گئی ہے ''آوردہ اند کہ مریم با پسر عم خود یوسف بن ماثان دوازدہ سال در آن موضع بسر کردند'' یعنی حضرت مریم اپنے لڑکے اور یوسف بن ماثان اپنے چچا کے صاحبزادہ کے ہمراہ 12 سال اس جگہ پر رہے۔ (تفسیر حسینی قلمی ص 660 محفوظ کتب خانہ جامعہ عربیہ چنیوٹ ضلع جھنگ)

(11) جلالین نے تفسیر صاوی کے حوالہ سے یہی بات نقل کی ہے کہ آپ کی والدہ اس ٹیلہ پر لے گئیں اور یہاں 12 سال رہیں، اتنے میں وہ بادشاہ مرگیا۔ (جلالین کلاں حاشیہ ص 290)

(12) مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی قصص القرآن میں جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالات و واقعات پر تبصرہ فرماتے ہیں، انھوں نے حضرت عیسیٰ کی جائے ولادت کی جگہ کو ٹیلہ (ربوہ) سے تعبیر کیا ہے اور یہ وہ جگہ ہے کہ آپ کی والدہ پیدائش کے قریب بیت المقدس سے دور تقریباً 9 میل وکوہ سراۃ (ساعیر) کے ایک ٹیلہ پر چلی گئیں جواب بیت اللحم کے نام سے مشہور ہے۔ (قصص القرآن ج 4 ص 42) بیت اللحم کے متعلق صاحب معجم البلدان نے یہ توضیح کی ہے۔ بیت المقدس کے آس پاس ایک پُررونق جگہ ہے۔ یہاں ایک جگہ مہد عیسیٰ کے نام سے مشہور ہے، اور اس کا محل وقوع بیت المقدس سے جبرین کی طرف ہے۔ جبرین بیت المقدس اور عسقلان کے درمیان ایک قلعہ ہے۔ اس کو عمرو بن العاص نے فتح کیا تھا اور اس کو اپنی جاگیر میں شامل فرمالیا۔ اس کا نام غلام کے نام پر عجلان رکھا۔ اور ایک روایت کے مطابق بیت اللحم دمشق اور بعلبک کے درمیان ایک بستی کا نام ہے۔ (معجم البلدان ص 102 ج 2) اسی ساعیر سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے ظہور کی پیشین گوئی سابقہ آسمانی کتابوں میں ہوئی۔ چنانچہ قصص القرآن میں مذکور ہے۔ تورات انجیل اپنی لفظی و معنوی تحریفات کے باوجود آج بھی چند بشارات کو اپنے سینہ میں محفوظ رکھتی ہے جو مسیح علیہ السلام کی آمد سے تعلق رکھتی ہیں۔ تورات استثناء میں ہے اور اس موسیٰ نے کہا کہ خداوند سینا سے آیا اور شعیر (ساعیر) سے ان پر طلوع ہوا اور فاران کے پہاڑوں سے جلوہ گر ہوا۔ (باب 33 آیت 10) اس بشارت میں سینا سے خدا کی آمد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کی جانب اشارہ ہے اور ساعیر سے طلوع ہونا نبوت عیسیٰ علیہ السلام مراد ہے کیونکہ ان کی ولادت باسعادت اسی پہاڑ کے ایک مقام بیت اللحم میں ہوئی اور متی کی انجیل میں ہے۔ جب یسوع ہیرودس بادشاہ کے زمانہ میں یہودیہ کے بیت اللحم میں پیدا ہوا۔ (باب 3 آیات 16) اس سے

معلوم ہوتا ہے کہ بیت المقدس کی سرزمین ہے جسے الی ربوۃ ذات قرار ومعین کہا گیا ہے۔

(13) ابن کثیر نے تفسیر میں لفظ معین کی تشریح میں لکھا ہے کہ معین سے نہر جاری مراد ہے اور یہ اس نہر کا ذکر ہے جس کو آیت **قد جعل ربک تحتک سریا** میں بیان کیا گیا ہے اور ضحاک اور قتادہ کا بھی یہی قول ہے کہ **الی ربوۃ ذات قرار ومعین** سے بیت المقدس کی سرزمین مراد ہے اور یہی قول زیادہ ظاہر ہے۔ (قصص القرآن ص 46 ج 44)

(14) جامعہ الملک عبدالعزیز مکہ مکرمہ کے نامور مفسر قرآن محمد علی الصابونی نے اپنی تفسیر صفوۃ التفاسیر میں آیت **و آویناھما** کے تحت ابن کثیر سے موافقت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں **ای وجعلنا منزلھما وما واھما الی مکان مرتفع من ارض بیت المقدس** (صفوۃ التفاسیر ص 310 ج 2) یعنی ان دونوں کی جائے رہائش اور ان کا ٹھکانہ بیت المقدس کی اونچی زمین پر بتائی۔ اور **ذات قرار و معین ای مستویه یستقر علیھا وما جاء ظاھرا للعیون قال الرازی، القرار، المستقر کل ارض مستوبه مبسوطة والمعین، الماء الظاھر الجاری علی الارض و عن قتادہ ذات ثمار وماء یعنی انه لاجل الشمار یستقر فیھا ساکنوہ.** یعنی ذات قرار ومعین سے مراد ہموار زمین اور پانی کا چل چلاؤ آنکھوں سے دکھائی دے رہا ہو۔ امام رازی کے حوالہ سے قرار سے مراد ہموار زمین ہے۔ اور معین سے مراد زمین پر چلتا ہوا پانی، قتادہ کے نزدیک پانی کے ساتھ پھیلی ہوئی۔ کیونکہ پانی اور پھلوں کی وجہ سے لوگوں کا وہاں رہائش پذیر رہنا ممکن ہوگا۔ (صفوۃ التفاسیر سابقہ حوالہ)

روایتِ تطبیق

اس توضیح نے تو ماں بیٹے (یعنی عیسیٰ اور ان کی والدہ) کی رہائش گاہ اور ٹھکانے کو ایک سبز و شاداب جگہ کو قرار دیا ہے، جہاں زندگی کی ضروریات خوب ہوں اور جنت نظیر جگہ ہو۔ صاحب معجم البلدان اس کو دمشق قرار دیتے ہیں (جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے) بیت اللحم دمشق اور بعلبک کے درمیان واقع ہے، اگر آپ کی پیدائش بیت اللحم میں ہوئی ہو تو دمشق سے ملحقہ ہونے کی وجہ سے اس کو دمشق کہہ دیا جائے تو عین ممکن ہے پھر صاحب معجم البلدان کے بقول کہ بیت المقدس کے آس پاس ایک جگہ "مہد عیسیٰ" سے مشہور ہے۔ اس جگہ کو اگر دمشق میں شامل کر لیا جائے تو یہ عین ممکن ہے اور چونکہ حضرت عیسیٰ کو دمشق سے خاصی مناسبت ہے کہ قرب قیامت وہ دمشق کی جامع مسجد کے شرقی مینارہ پر نزول فرمائیں گے۔ تو اس مناسبت سے آپ کی پیدائش جو کہ بیت المقدس کے قریب کوہ

ساعیر پر دمشق کا اطلاق کر دیا جائے تو یہ بھی خلافِ قیاس نہیں۔ چونکہ قرآن پاک نے خود اس کو مطلق چھوڑا ہے مقید نہیں کیا اس لیے اس کو ایک جگہ سے مقید تو نہیں کیا جا سکتا۔ اب ربوہ سے مراد روایات کی روشنی میں حضرت عیسیٰ کی جائے پیدائش کو لینا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اگلے زمانہ کے تغیرات کے بموجب آپ نے جو مختلف جگہوں پر سکونت اختیار کی ہو تو یہ معجزاتی رنگت اختیار نہیں کر سکتی۔ اللہ تعالیٰ نے جس خصوصیت سے بطور انجام جس جز کا آیت شریفہ میں بیان کیا وہ حضرت عیسیٰ کے زمانہ حمل سے لے کر زمانہ ولادت تک کے واقعات کا احاطہ اور بحفاظت دنیا پر ظہور پذیر ہونا ہے۔ اس مذکور بالا قول کی تائید مفسر قرآن علامہ شبیر احمد عثمانی کے تفسیری وضاحتی نوٹ سے ہوتی ہے جو انھوں نے آیت الی ربوہ ذات قرار و معین کے زیر فائدہ نمبر 12 تفسیر کے حاشیہ میں تحریر کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں شاید یہ وہی ٹیلہ یا اونچی زمین ہو جہاں وضع حمل کے وقت حضرت مریم تشریف رکھتی تھیں۔ چنانچہ سورہ مریم کی آیت فناداها من تحتها دلالت کرتی ہیں کہ وہ بلند جگہ تھی نیچے چشمہ یا نہر بہہ رہی تھی اور کھجور کا درخت نزدیک تھا لیکن عموماً مفسرین لکھتے ہیں کہ یہ حضرت مسیح کے بچپن کا واقعہ ہے۔ (پھر ہیرودس وغیرہ کا واقعہ نقل کیا) مزید آگے لکھتے ہیں۔ بعض نے ربوہ (اونچی جگہ) سے مراد شام یا فلسطین لیا ہے اور کچھ بعید نہیں کہ جس ٹیلہ پر ولادت کے وقت موجود تھیں وہیں اس خطرہ کے وقت بھی پناہ دی گئی ہو۔ (تفسیر عثمانی ص 4459 حاشیہ فائدہ نمبر 12)

اس جائے ولادت کی تصویر کشی کرتے ہوئے ابن بطوطہ کے حوالہ سے دائرہ معارف بستانی نے ربوہ Rabwah عنوان کے تحت یہ عندیہ دیا ہے۔ ''جبل فاس کے آخر پر حضرت مسیح علیہ السلام اور آپ کی والدہ کی رہائش گاہ کی جگہ ہے اور یہ جگہ دنیا کی تمام حسین جگہوں سے زیادہ حسین سیر گاہ ہے۔ اس میں خوبصورت پختہ محلات عمارتیں اور عجیب وغریب باغات ہیں اور حضرت عیسیٰ کی رہائش گاہ کی جگہ اس میں ایک چھوٹی غار نما جگہ ہے۔ اس کے سامنے حضرت خضر کا مصلی ہے پھر مزید یاقوت حموی کے حوالہ سے آبی گزرگاہوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ جگہ شمالی دمشق جبل فاس کے پہلو میں ہے۔ اس کے نیچے پروی دریا بہتا ہے اور یہ جگہ ایک اونچی مسجد کی شکل میں دریا ثوری پر ہے۔ اس جگہ سے اوپر دریا یزید گزرتا ہے۔ اس کا پانی مسجد کے حوض میں گرتا ہے، اس مسجد کے ایک کونہ میں ایک چھوٹی غار نما جگہ ہے جس کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ یہی وہ جگہ ہے جس کا آیت الی ربوہ ذات قرار و معین میں ذکر ہے۔ (دائرہ معارف بستانی ج 8 ص 538 مادہ ربوہ دارالمعرفہ بیروت) نیز صاحب معجم البلدان یاقوت بن عبداللہ الحموی جس کا حوالہ بھی گزرا ہے، فرماتے ہیں کہ اس سے مراد دمشق ہے۔ دمشق کے پہاڑ کے دامن میں دنیا کی جنت نظیر جگہ ہے۔ اس کے نیچے

سے حوالے اس کی تائید میں ملتے ہیں۔ قادیانی وڈیرے مرزا بشیر الدین کو مسلمانوں کی تاریخ سے کوئی حوالہ تو نہ مل سکا البتہ کندھم جنس باہم جنس پرداز کے مصداق اپنی کفار برادری سے اس کے تائیدی حوالے ملے۔ پھر دیانت داری یہ کہ ایک حوالہ بھی تحریر میں نہ لا سکے۔ اس طرح قرآنی ترجمہ نگار مولوی محمد علی نے بھی اس آیت کے ذیل میں اپنی کتاب ''بیان القرآن'' میں مسلم مورخین مفسرین اور ترجمہ اور تفسیر نگاروں کی جملہ آراء کو جھٹک کر رکھ دیا اور اپنے کشمیر کے نظریے کو پیش کرنے میں سعی لاحاصل کی۔ چنانچہ ملاحظہ ہو کتاب مذکورہ پر اس کا وضاحتی نوٹ (بیان القرآن ص 945) کشمیر تو پرانی تحقیق ہے۔ اب ربوہ نام کی بستی پاکستان ضلع جھنگ کے نقشہ میں موجود ہے تو اس کا مصداق قادیانیت کی نگاہ میں یہی وہ ربوہ ہے جو آیت میں مذکور ہے۔ اگر قادیانیت کو غیر مسلم قرار دینا ضروری تھا تو اس قرآنی اصطلاح اور لفظ کا تقدس اس بات کا متقاضی ہے کہ اس کو بھی تبدیل ہونا چاہیے اور اس کی جگہ چک ڈھکیاں اصل نام زبان خلق ہونا چاہیے۔ کفر اور مشعر بالکفر دونوں کا خاتمہ ضروری ہے۔ مسلمان علماء میں سے حضرت مولانا منظور احمد چنیوٹی دامت برکاتہم نے اس سلسلہ میں کافی کوشش کی ہے کہ اس (ربوہ) نام کو تبدیل کیا جائے اور اس کا غیر سرکاری نام صدیق آباد تجویز کیا جسے بلدیہ ربوہ نے اپنے ایک بل کے ذریعے اس تبدیلی کو پاس کرلیا ہے۔ مگر ہنوز عمل درآمد نہیں ہوا۔

حاصلِ بحث

بحث کا حاصل یہ ہوا کہ واقعات اور حقائق کے تناظر میں حضرت عیسیٰ کی پیدائش کی جگہ ''بیت اللحم'' ہے اور یہ جگہ ایک ٹیلہ ہے جیسا کہ الموسوعۃ الذھبیہ میں مذکور ہے۔ **وہی تقع علی تلال تنظیھا مزارع الکروم والزیتون** یعنی یہ ٹیلہ ہے جس کے گرداگرد زیتون اور انگور کے کھیت ہیں اور اس کتاب میں بیت اللحم کی تعریف میں ذکر کیا ہے۔ **وھی لیست بعیدۃ عن مدینۃ القدس لیست فی بیت اللحم سوی شارع واحد طویل یقود الی کنیسۃ المیلاد التی شیدت فی المکان الذی یعتقد ان المسیح ولد فیه** یعنی بیت اللحم **Bythlehem** قدس شہر سے زیادہ دور نہیں اور اس میں صرف ایک لمبی سڑک ہے جو کہ میلاد نامی گرجا کی طرف جاتی تھی جو اس جگہ تعمیر شدہ ہے جہاں عقیدہ کے مطابق حضرت عیسیٰ کی پیدائش ہوئی۔ (الموسوعہ الذھبیۃ ج 3 ص 232) اسی طرح مفسرین نے آیت **فحملته فانتبذت به مکانا قصیا** (مریم:22) یعنی حضرت عیسیٰ کی والدہ انھیں بوقت پیدائش ایک دور جگہ پر لے گئیں۔ کی نشان دہی بیت اللحم کی طرف کی ہے جیسا کہ علامہ طنطاوی کا قول ہے **بعیدا عن اھلھا ای اقصی الوادی وھو بیت اللحم** یعنی اپنے گھر والوں سے دور وادی کے آخر یعنی بیت اللحم میں (الجواہر فی تفسیر القرآن الکریم

للطنطاوی ج 10 ص 8) بیت اللحم کی تشریح پہلے ہم معجم البلدان کے حوالہ سے لکھ چکے ہیں کہ یہ دمشق اور بعلبک کے درمیان ہے یا بیت المقدس سے جبرین کی طرف ہے۔ یہ علاقہ فلسطین کا ہے جیسا کہ مقبوضہ فلسطین کے اس جغرافیائی نقشہ سے واضح ہے۔ ذرا نقشہ ملاحظہ ہو۔ اس نقشہ کی رو سے جہاں مفسرین نے فلسطین رملہ، فلسطین بیت المقدس اور مصر کے اقوال درج کیے ہیں وہ سب اپنی اپنی جگہ درست ہیں یعنی اس سارے علاقہ پر فلسطین کی چھاپ ہے اور اس کے اندر یہ سب علاقے آ جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ دمشق بھی اس نقشہ میں شامل ہے اور حضرت عیسیٰ کی رہائش شہر ناصرہ بھی اس میں ہے، جس کی وجہ سے آپ کو المسیح الناصری کہا جاتا ہے۔ لہٰذا اب تمام احتمالات اپنی اپنی جگہ پر درست ہیں۔ باقی غیر مسلم قرآنی ترجمہ نگاروں نے جو ''ربوہ'' اس صفاتی نام سے کشمیر کا قول کیا ہے حقائق اس کی نفی کرتے ہیں اور اس صفاتی نام سے کسی شہر کا حقیقی نام رکھنا یہ تحریف قرآنی کا ایک عملی ثبوت ہے جو کہ غیر مسلم کا داؤ پیچ ہے جو متشابہ آیات سے اپنی تاویل باطل کی راہ ہموار کرتا ہے۔ جیسا کہ عیسائیوں نے **و کلمة القاها الی مریم و روح منه** سے حضرت عیسیٰ کے ابن اللہ (اللہ کا بیٹا) کا دعویٰ کیا اور ان کی خدائیت کا قائل رہا۔ اور محکم آیت **ان هو الا عبد انعمنا علیه** کہ وہ اللہ کے بندوں میں سے ایک بندہ ہیں اور رسولوں میں سے ایک رسول ہیں۔ اسی طرح غیر مسلم قادیانی فرقہ نے ربوہ کے محکم معانی میں تشابہ پیدا کرنے کے لیے اس صفاتی نام کا اپنی بستی پر اطلاق کر دیا اس کو محض حادثاتی واقعہ یا ترکاتی نام قرار نہیں دیا سکتا بلکہ عمداً قصداً انھوں نے ایسا کیا ہے تاکہ اس جھوٹے مسیح موعود (غلام احمد قادیانی) کو اس سچے مسیح موعود کے بالمقابل لایا جائے۔ پس قرآن مجید کا یہ دعویٰ **فاما الذین فی قلوبهم زیغ فیتبعون ماتشابه من ابتغاء الفتنة و ابتغاء تاویله** (آل عمران:7) کیسے فٹ نظر آتا ہے کہ جن دلوں میں کجی ہے وہ متشابہ کی من پسند تاویل سے پیوستہ رہتے ہیں تاکہ لوگ شک وشبہ کا شکار ہوں اور ان کی باطل تاویل کا راستہ ہموار ہو جائے۔

مولانا منظور احمد چنیوٹیؒ

قادیان سے چناب نگر تک

قادیان ہندوستان میں مشرقی پنجاب کے ضلع گورداسپور کی تحصیل بٹالہ کا ایک قصبہ ہے جو مرزا غلام احمد مدعیٔ نبوت کی وجہ سے مشہور ہوا۔ اسی وجہ سے اس کے پیروکاروں کو قادیانی کہا جاتا ہے۔ اگرچہ قادیان میں اکثریت ہمیشہ ان لوگوں کی رہی ہے جو اس کے پیروکار نہ تھے، آج کل بھی یہ زیادہ سکھوں کی ہی ایک آبادی سمجھا جاتا ہے۔ مرزا قادیانی نے قادیان کی بڑی تعریف کی ہے اور اسے اللہ کے رسول کی تخت گاہ قرار دیا، اسے دارالامان قرار دیا اور (اس کے بیٹے نے) یہاں تک کہا کہ "اب مکہ اور مدینہ کی چھاتیوں سے دودھ خشک ہو چکا ہے۔ اب جو کچھ لینا ہے وہ قادیان سے ہی ملے گا۔" قادیان کے سالانہ جلسہ کو ظلی حج قرار دیا۔ اس کی تمام پرانی کتابوں اور اخبارات میں قادیان کو "دارالامان" لکھا ہوا ہے۔

قادیانیوں کی غداری

1947ء میں ملک دو حصوں میں تقسیم ہوا۔ پنجاب کی تقسیم کا فارمولا یہ تھا کہ جس ضلع میں اکیاون فیصد یا اس سے زیادہ مسلم آبادی ہوگی وہ پاکستان میں شامل ہوگا اور جس میں غیر مسلم آبادی اکیاون فیصد یا اس سے زیادہ ہوگی وہ بھارت میں شامل ہوگا۔ گورداسپور کا ضلع مسلم اکثریت کا ضلع تھا اور یہ ابتدا میں پاکستان کے نقشے میں شامل تھا مگر قادیانی مردم شماری میں اپنے علیحدہ تشخص پر مُصر تھے اور اپنے آپ کو احمدی لکھوانا چاہتے تھے۔ چنانچہ ریڈکیف کمیشن نے کہا کہ ہمارے پاس دو خانے ہیں، مسلم اور غیر مسلم۔ احمدی کے لیے کوئی تیسرا خانہ نہیں ہے، آپ کا شمار ان دونوں میں سے کسی ایک میں ہوسکتا ہے مگر قادیانیوں نے اس وقت اپنا شمار مسلمانوں میں نہ کرایا۔ انگریزی حکومت کے سامنے سازش سے ضلع گورداسپور کی مسلم آبادی اکیاون فیصد سے کم ظاہر کی گئی اور ضلع گورداسپور ہندوستان میں چلا گیا۔ اگر گورداسپور کا ضلع پاکستان میں شامل ہوتا جس طرح پاکستان کے پہلے مجوزہ نقشہ میں تھا تو آج کشمیر کا مسئلہ پیدا نہ ہوتا کیونکہ سری نگر اور جموں کو راستہ پٹھان کوٹ ضلع گورداسپور سے جاتا ہے جو اب بھارت کے زیر تسلط ہے۔ کشمیر میں گزشتہ پچاس سالوں سے جتنی قتل و غارت

گری، معصوم بیٹیوں، بہوؤں کی عصمت دری ہو رہی ہے، معصوم بچوں کے خون سے ہولی کھیلی جا رہی ہے، سہاگ اُجڑ رہے ہیں، بچے یتیم ہو رہے ہیں، بوڑھوں کے سہارے چھینے جا رہے ہیں، ہزاروں بلکہ لاکھوں قیمتی جانیں آزادی کی بھینٹ چڑھ رہی ہیں، اس کی تمام ذمہ داری اسی قادیانی جماعت پر ہے۔

جھوٹے پر خدا کی پھٹکار

جب گورداسپور کا ضلع ان کے غیر مسلم ہونے کے باعث ہندوستان میں شامل ہو گیا اور پنجاب میں ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے تو ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں کو قتل کرنا شروع کیا اور مسلمان وہاں سے ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے۔ تاہم قادیانیوں کو انھوں نے کچھ نہ کہا اور وہ بالکل محفوظ تھے لیکن انگریزی سیاست کا یہ تقاضا تھا کہ قادیانیوں کو پاکستان بھیج کر مسلمانوں کے لیے مسائل پیدا کیے جائیں۔ مرزا بشیر الدین محمود نے اپنے ان سفید فام آقاؤں کی اسی سیاست کو پروان چڑھانے کے لیے اپنی جماعت کو پاکستان جانے کا حکم دیا، حالانکہ سکھوں نے ان پر کوئی حملہ کیا تھا اور نہ ہی وہاں سے نکلنے پر انھیں مجبور کیا تھا۔ مگر یہ خود ترکِ وطن پر آمادہ ہوئے اور قادیان سے بھاگ کر لاہور آ کر پناہ لی۔ قادیان جسے یہ ''دارالامان'' کہتے تھے، اسے انھوں نے اپنے لیے ''دارالہلاک'' اور ''دارالفساد'' ٹھہرایا۔ اللہ تعالیٰ نے قادیانی دجال کو جھوٹا کر کے اس کو اور اس کی پوری جماعت کو ذلیل کر دیا۔ اگر خود اللہ تعالیٰ نے قادیان کو مکہ مکرمہ کی طرح دارالامان بنایا ہوتا تو یہ وہیں رہتے، کم از کم مرزا قادیانی کا تمام خاندان تو وہیں رہتا۔ ان کو تو وہاں امن حاصل تھا، دوسرے قادیانیوں کی طرح مرزا قادیانی کا تمام خاندان، اس کی بیوی نصرت جہاں بیگم، تینوں بیٹے مرزا بشیر الدین محمود، مرزا بشیر احمد، مرزا شریف احمد، مرزا کی بیٹیاں مع اپنے پورے کنبے کے قادیان سے بھاگ کر لاہور آئے اور بہت شور کیا کہ قادیان اب ''دارالامان'' نہیں رہا۔ حاصل یہ کہ ان کے جھوٹ کا پردہ چاک ہوا اور جھوٹ کی لعنت کا طوق ان کے گلے میں پڑا اور ان کے لیے قادیان دارالامان کی بجائے دارالفرار بن گیا۔

مرزا قادیانی کا ایک اور عجیب الہام

مرزا قادیانی کا الہام ہے:

"اخرج منه الیزیدیون" (تذکرہ ص 181)

(ترجمہ) قادیان سے یزیدی لوگ نکالے جائیں گے۔

مرزا کے جانشین اوّل حکیم نور دین کی 1914ء میں وفات ہوئی، اس کی جانشینی کے مسئلہ

پر اختلاف پیدا ہوا تو ایک طرف مرزا کا بڑا بیٹا بشیر الدین محمود امیدوار تھا اور دوسری طرف مولوی محمد علی لاہوری تھا۔ مرزا محمود غالب اکثریت سے کامیاب ہوگیا اس لیے کہ اس کی والدہ نصرت جہاں بیگم کا ووٹ بھی اپنے بیٹے کے حق میں تھا اور مرزا قادیانی کا خاندان بھی چاہتا تھا کہ جس طرح بھی ہو، اس جماعت کی سربراہی ہمیشہ اس خاندان میں رہے۔ مرزا بشیر الدین جانشین مقرر ہوگیا۔ مولوی محمد علی لاہوری اور اس کے ساتھیوں نے مرزا محمود کی بیعت نہ کی، اس کی جماعت کو قادیانی حضرات ''غیر مبایعین'' کہتے تھے۔ 1920ء تک چھ سال وہیں قادیان میں رہ کر کام کرتے رہے۔ جب محمد علی نے سمجھا کہ اب ہماری یہاں دال نہیں گلتی، مرزا محمود اچھی طرح جماعت پر قابو پا چکا ہے تو یہ قادیان چھوڑ آئے اور لاہور میں ''انجمن اشاعتِ اسلام احمدیہ'' کے نام سے ایک نئی تنظیم قائم کر لی اور اس کا پہلا امیر خود مقرر ہوگیا۔ جب دو دکانیں کھل گئیں تو اپنی دکانوں کو چمکانے اور کامیاب کرنے کے لیے دونوں میں اختلافات کا سلسلہ چل نکلا وگرنہ 1914ء تک تو دونوں ایک ہی تھے اور باہمی عقائد کا کوئی اختلاف نہ تھا۔ ایک دوسرے کے خلاف الزامات اور سب وشتم کا سلسلہ بھی جاری ہوگیا۔ 1935ء میں مرزا محمود نے محمد علی لاہوری کے الزامات و اعتراضات کے جواب میں ''آئینۂ صداقت'' نامی ایک کتاب لکھی اور دیگر باتوں کے علاوہ مرزا محمود نے اپنی اس کتاب کے صفحہ 202 پر محمد علی لاہوری اور اس کی پارٹی کو مرزا غلام احمد کے الہام "اخرج منه الیزیدیون" کا مصداق ٹھہرایا کہ محمد علی لاہوری اور اس کی پارٹی حضرت کے اس الہام کے مطابق یزیدی ہیں کیونکہ یہ خاندان رسالت کے خلاف ہیں۔

خدائی قدرت کا ظہور

خدا تعالیٰ کی قدرتِ قاہرہ کا ظہور اس وقت ہوا جب 1947ء میں ملک تقسیم ہوا اور ضلع گورداسپور ہندوستان میں چلا گیا اور مرزا بشیر الدین محمود اور اس کے پیروکاروں کو بھی قادیان چھوڑنا پڑا اور وہ بھی اسی شہر لاہور میں آکر پناہ گزین ہوئے جہاں ان کے پہلے یزیدی رہتے تھے تو محمد علی لاہوری نے مرزا قادیانی کا یہی الہام شائع کیا اور کہا کہ حضرت قادیانی کے اس الہام کا اصل مصداق، مرزا محمود اور اس کی پارٹی ہے کیونکہ یہ نکالے گئے ہیں، ہم تو خود اپنی مرضی سے نکلے تھے اور الہام کے الفاظ میں "اخرج" ہے جس کا معنی ہے ''نکالے جائیں گے۔'' ہم تو سرے سے اس الہام کو ہی نہیں مانتے۔ یہ شیطانی آواز مرزا نے کیسے سن لی اور اسے مرزائی الہام کہہ دیا۔ (استغفر اللہ) خیر یہ ان کے گھر کا معاملہ ہے کہ مرزا کے الہام کے مطابق محمد علی لاہوری اور اس کی پارٹی اصلی یزیدی ہیں یا مرزا محمود اور اس کی پارٹی، وہ گھر بیٹھ کر اس کا فیصلہ کر لیں۔ ہمارے نزدیک تو دونوں یزیدیوں سے بھی بدتر ہیں۔

مستقل نئے شہر کی خطرناک سازش

تقسیم ہند کے بعد مختلف مکتبہ ہائے فکر سے متعلق مسلمانوں نے ہجرت کی۔ جو لوگ پاکستان پہنچے، ان میں سے کسی نے یہ نہ سوچا کہ اپنا علیحدہ شہر بسائیں، مختلف شہروں میں جہاں کسی کو جگہ ملی، مقیم ہو گئے۔

مرزا بشیر الدین اپنی روایتی شاطرانہ اور عیارانہ فطرت کی بناء پر جب قادیان ''دارالامان'' سے بھاگ کر لاہور آئے تو ایک خاص منصوبہ کے تحت یہ فیصلہ کیا کہ کہیں کوئی جگہ تلاش کریں اور اپنا علیحدہ مستقل شہر بسائیں جس میں سوائے قادیانیوں کے اور کوئی باشندہ نہ ہو اور قادیانیوں کی ملک ہو۔ دراصل اس کا منصوبہ یہ تھا کہ اپنا علیحدہ شہر بنا کر عیسائیوں کی طرح ''ویٹی کن سٹی'' کی طرح امریکہ وغیرہ سے اپنا علیحدہ شہر منظور کرا کر اپنی چھوٹی سی علیحدہ حکومت قائم کر لیں گے جس میں تمام نظام ان کا اپنا ہوگا۔ یہ حکومت کے اندر ایک ''منی حکومت'' کا خطرناک منصوبہ تھا۔

جگہ کی تلاش

چنانچہ اس منصوبہ کے تحت مرزا بشیر الدین نے تین اضلاع سیالکوٹ، شیخوپورہ اور جھنگ کا انتخاب کیا اور ایک سروے ٹیم مقرر کی کہ ان اضلاع میں مناسب جگہ تلاش کرے جہاں پر وہ اپنے منصوبہ کے تحت نئے شہر کی بنیادیں رکھ سکیں۔ مرزا بشیر الدین کی ان تین ضلعوں کے انتخاب کی وجوہ درج ذیل تھیں:

ضلع سیالکوٹ

اس لیے کہ پنجاب میں بلکہ پورے پاکستان میں سب سے زیادہ قادیانی اس ضلع میں ہیں اور سر ظفر اللہ قادیانی (پاکستان کا پہلا وزیر خارجہ) کا تعلق بھی اسی ضلع سے ہے۔ اگر اس کے قرب و جوار میں ہم اپنا شہر بسائیں گے تو ہمیں وہاں سے سپورٹ اچھی ملے گی اور وہ بوقت ضرورت ہمارے کام آئے گا۔ نیز بارڈر نزدیک ہونے کی وجہ سے تخریبی سرگرمیوں میں آسانی ہوگی۔

ضلع شیخوپورہ

اس کا انتخاب اس نظریہ سے تھا کہ شیخوپورہ میں ننکانہ صاحب سکھ سٹیٹ ہے۔ اگر سکھ اپنا علاقہ چھوڑ کر بھارت چلے گئے تو ان کی جگہ ہم اپنی ریاست قائم کر لیں گے۔

ضلع جھنگ

اس لیے کہ وہ انتہائی پسماندہ اور جہالت کا ضلع ہے۔ اس میں اَن پڑھ لوگ زیادہ ہیں،

اُن کو ہم آسانی سے اپنا شکار بنالیں گے۔

سروے ٹیم نے تینوں اضلاع کا سروے کیا۔ انھیں چنیوٹ کے قریب دریائے چناب کے مغربی کنارے گورنمنٹ کی خالی پڑی ہوئی جگہ سب سے زیادہ پسند آئی کیونکہ دفاعی اعتبار سے بھی یہ جگہ ان کے لیے انتہائی موزوں تھی۔ مرزا محمود نے بھی اس سے اتفاق کیا۔ اس وقت گورنر پنجاب ایک انگریز فرانس موڈی تھا۔ اس انگریز گورنر نے ایک ہزار چونتیس (1034) ایکڑ زمین کا وسیع قطعہ برائے نام قیمت دس روپے فی ایکڑ کے حساب سے انھیں فروخت کر دیا۔

(تاریخ ربوہ ص 32 مولفہ خادم حسین قادیانی)

نئی بستی کی بنیاد اور اس کا نام

اس رقبہ پر 20 ستمبر 1948ء کو نئے قصبہ کی بنیاد رکھی گئی اور قادیان میں مرزا قادیانی کی ''مسجد مبارک'' جو وہاں سکھوں ہندوؤں کے لیے چھوڑ آئے تھے، اس نام سے موسوم مسجد کی بنیاد رکھی۔ اب اس نئی بستی کا نام زیرِ غور آیا۔ مختلف لوگوں نے مختلف نام تجویز کیے۔ کسی نے ''دارالہجرت'' کسی نے ''محمود آباد'' کسی نے ناصر آباد کی تجویز دی۔ مولوی جلال الدین شمس نے تجویز دی کہ اس کا نام ''ربوہ'' رکھیں کیونکہ ''ربوہ'' کا لفظ پارہ نمبر 18 سورہ مومنون آیت نمبر 50 میں سیدنا عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ محترمہ کی ہجرت کے ضمن میں آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ ''ہم نے عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ کو جب وہ ہجرت کر کے آئے تو انھیں ایک اونچی جگہ (ربوہ) میں جو قرار والی اور چشموں والی تھی، پناہ دی۔'' ''ربوہ'' کسی جگہ کا نام نہ تھا، یہ اس جگہ کی حقیقت تھی کہ وہ اونچی تھی۔ مفسرینِ کرام نے ''ربوہ'' سے مراد فلسطین لیا ہے کہ وہ اونچی جگہ پر واقع ہے۔

مولوی جلال الدین شمس نے کہا (تاریخ ربوہ ص 27) کہ ہم بھی مسیح موعود (مرزا غلام احمد قادیانی) کی امت ہیں اور ہجرت کر کے آئے ہیں تو اس شہر کا نام ''ربوہ'' رکھیں جو عیسیٰ علیہ السلام کے تذکرہ میں آیا ہے۔ ''ربوہ'' نام کا شہر دنیا میں کہیں موجود نہیں، جب اس شہر کا نام دنیا میں مشہور ہو جائے گا تو آئندہ چل کر ہر قرآن پڑھنے والا شخص یہی سمجھے گا کہ قرآن کریم میں جو ''ربوہ'' کا لفظ آیا ہے، اس سے مراد یہی ''ربوہ'' شہر ہے جو پاکستان میں موجود ہے اور یہی مسیح موعود کا مقدس شہر سمجھا جائے گا اور اس میں مرزا کی یہ پیشین گوئی بھی پوری ہو جائے گی کہ قرآن میں تین شہروں کا نام بڑے اعزاز سے ذکر کیا گیا ہے: ''مکہ، مدینہ اور قادیان'' کیونکہ ''ربوہ'' دوسرے لفظوں میں ایک نیا قادیان ہی تو ہوگا۔ اس گہری سازش کے ساتھ قرآن کریم میں یہ ایک خطرناک قسم کی تحریف کی گئی کہ لفظ تو یہی رہے لیکن اس کا محل اور مصداق بدل جائے۔ اسے کہا جاتا ہے: كَلِمَةُ حَقٍّ اُرِيْدُ بِهَا الْبَاطِلُ کہ

''کلمہ حق سے باطل کا ارادہ کرنا'' ورنہ یہ نام رکھنے کا کیا مطلب تھا؟ ''ربوہ'' اردو میں ''ٹیلہ'' اور پنجابی میں ''ٹبہ'' کو کہتے ہیں۔ آج کل نیا نام کسی عظیم شخصیت پر رکھا جاتا ہے جیسا ''لائل پور'' انگریز کے نام پر تھا، اس کا نام بدل کر ''فیصل آباد'' شاہ فیصل شہید کے نام پر رکھا گیا یا جیسے پاکستان میں دیگر نئے شہر آباد کیے گئے۔ مثلاً فاروق آباد، قائد آباد، جوہر آباد، لیاقت آباد وغیرہ۔ اگر قادیانیوں کی یہ تحریف قرآن کی مذموم اور خبیث غرض نہ ہوتی تو وہ اس کا نام مرزا محمود کے نام پر ''محمود آباد'' یا اس کے بیٹے ناصر کے نام پر ''ناصر آباد'' یا مرزا طاہر کے نام پر ''طاہر آباد'' رکھتے۔ آخر یہ نام رکھنے میں اس سازش کے علاوہ اور کونسی غرض تھی۔

ایک لطیفہ

آغا شورش کشمیری مرحوم سنایا کرتے تھے۔ 1973ء میں پاکستان کے دریاؤں میں بہت بڑا سیلاب آیا تھا، پنجاب کے بہت سے شہر متاثر ہوئے۔ ایک قادیانی میرے پاس آیا اور کہنے لگا: ''آغا صاحب! اب تو ہمارے حضرت پر ایمان لائیں'' میں نے کہا ''کون سے آپ کے حضرت؟'' کہا ''حضرت مسیح موعود مرزا غلام احمد قادیانی پر'' میں نے کہا ''کروڑ کروڑ لعنت انگریز کے اس آلہ کار جھوٹے دجال پر۔'' قادیانی کہنے لگا ''دیکھیں جی کتنا بڑا سیلاب آیا ہے، دریائے چناب کے کنارے چنیوٹ تباہ ہو گیا اور ''ربوہ'' بچ گیا، اس میں سیلاب نہیں آیا۔'' آغا صاحب نے کہا کہ ''اِدھر دریا راوی میں بھی بڑا سیلاب آیا لیکن لاہور کا ''ٹبی'' محلہ بچ گیا۔ وہاں سیلاب نہیں آیا، اُدھر آپ کے ٹبہ ''ربوہ'' پر سیلاب کا پانی نہیں آیا، وہ بچ گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ٹبی اور ٹبہ والے ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔'' معلوم رہے کہ ٹبی ایک خاص محلہ ہے جسے آپ لاہور والوں سے ہی پوچھ سکتے ہیں۔ ہمیں تو اس کی صراحت کرتے شرم آتی ہے) آغا صاحب کا یہ جواب سن کر وہ شرمندہ ہو کر چلا گیا۔ دریائے چناب کا مغربی کنارہ جہاں ''ربوہ'' آباد ہے، وہ اونچا ہے۔ ایک طرف پہاڑی سلسلہ ہے، وہاں اکثر سیلاب کا پانی نہیں آتا اس لیے اس میں کوئی کرامت کی بات نہ تھی۔

ربوہ نام رکھنے میں ایک دوسری مخفی حکمت

مرزا قادیانی نے اپنی مشہور کتاب ''ازالۂ اوہام'' صفحہ روحانی خزائن جلد 3 ص 121، 122 پر لکھا ہے کہ:

> ''قرآن کریم نے تینوں شہروں کا نام بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ ذکر کیا ہے مکہ، مدینہ اور قادیان۔''

اب مکہ اور مدینہ کے نام تو قرآن کریم میں موجود ہیں لیکن قادیان کا نام قرآن کریم میں کہیں بھی نظر نہیں آتا۔ قرآن کریم پر مرزا قادیانی کا یہ ایک ایسا جھوٹ ہے جس کا رہتی دنیا تک کوئی جواب نہیں ہے اور نہ کوئی اس کا جواب دے سکے گا۔

علمائے کرام قادیانیوں سے مطالبہ کرتے تھے کہ ہمیں قرآن کریم سے ''قادیان'' کا لفظ دکھاؤ یا تمھیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ مرزا قرآن پر جھوٹ بول کر لعنت کا مستحق ہوا ہے اور وہ اپنے ان تمام فتاویٰ کا مستحق ٹھہرے گا جو اس نے جھوٹ بولنے والوں پر لگائے ہیں۔ یعنی

☆ جھوٹ بولنا مرتد ہونے سے کم نہیں۔ (تحفہ گولڑویہ حاشیہ جلد 3 ص 56)

☆ جھوٹ بولنا اور گوہ کھانا ایک جیسا ہے۔ (حقیقت الوحی ص 206)

☆ وہ کنجر جو ولد الزنا کہلاتے ہیں وہ بھی جھوٹ بولتے ہوئے شرماتے ہیں۔

(تحفۂ حق جلد 2 ص 386)

لیکن افسوس کہ مرزا قادیانی کو قرآن، دیگر آسمانی کتابوں، انبیائے کرام و اولیاء پر اور خود خدا پر جھوٹ بولتے ذرا شرم نہ آئی۔ (اس کے ایسے جھوٹوں کے بے شمار حوالے موجود ہیں) اب قادیانی مرزا کے اس جھوٹ یعنی ''قرآن پاک میں تین شہروں کا بڑے اعزاز و اکرام سے ذکر ہے، سے بڑے لاچار اور پریشان تھے کیونکہ قرآن پاک میں کہیں قادیان کا نام نہیں ہے، چنانچہ انھوں نے سوچا کہ اب قادیان کا متبادل جو شہر آباد کیا جارہا ہے تو اس کا نام ایسا رکھا جائے جو قرآن میں موجود ہوتا کہ وہ تاویل کر سکیں کہ دراصل مرزا قادیانی کا مقصد یہ تھا کہ قادیان کے بدلے جو شہر آباد ہوگا اس کا نام قرآن مجید میں موجود ہے اور وہ ''ربوہ'' ہے جس کا ذکر بڑے اعزاز و اکرام سے قرآن کریم میں ہے لہٰذا ''ربوہ'' کا قرآنی نام رکھ کر اس جھوٹ پر ملمع کاری کرنا بھی مقصود تھا۔

منظور احمد الحسینی

ربوہ، مرکز کفر وارتداد

ربوہ کا قیام

14 اگست 1947ء کو پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ قادیانیوں نے سب سے پہلے اپنی جماعت کا مرکزی خزانہ بذریعہ ہوائی جہاز پاکستان منتقل کر دیا۔ پھر مستورات کو بسوں کے ذریعے لاہور بھجوایا۔ یہاں تک کہ اگست 1947ء میں مرزا بشیرالدین محمود بھی قادیان چھوڑ کر لاہور چلے آئے۔

مرزا بشیرالدین نے قادیان سے پاکستان روانہ ہوتے وقت نہایت اہم عہد کیا جو مختصراً درج ذیل ہے:

> ''قادیان چھوٹ جانے کا صدمہ لازماً طبیعتوں پر ہوا ہے۔ میری طبیعت پر بھی اس صدمہ کا اثر ہے...... ہم اپنے آنسوؤں کو روکیں گے، یہاں تک کہ ہم قادیان کو واپس لے لیں۔'' (تاریخ احمدیت ج 11 ص 5)

مرزا بشیرالدین کے لاہور پہنچنے سے پہلے قادیانیوں نے ہندوؤں کی متروکہ رہائش گاہوں میں سے چار بڑی بڑی عمارات پر قبضہ کر لیا۔ ان کوٹھیوں کے نام یہ تھے:

(1) رتن باغ (2) جودھامل بلڈنگ (3) جسونت بلڈنگ (4) سیمنٹ بلڈنگ۔ مرزا محمود اور اس کے خاندان کی رہائش کے لیے رتن باغ تجویز کیا گیا۔ دفاتر کے قیام اور کارکنوں کو ٹھہرانے کے لیے جودھامل بلڈنگ اور دیگر افراد کی سکونت کے لیے موخرالذکر کوٹھیوں کو موزوں سمجھا گیا۔

پاکستان آنے کے بعد قادیانیوں کی پہلی میٹنگ یکم ستمبر 1947ء جودھامل بلڈنگ کے صحن میں ہوئی۔ پھر روزانہ رتن باغ میں مشاورتی مجلس کا سلسلہ باقاعدہ شروع ہو گیا۔ ان دنوں ان کوٹھیوں میں 152 خاندانوں کے 801 افراد رہتے تھے۔

اسی دوران رتن باغ کی ''مجلسِ مشاورت'' میں قادیانی مرکز (پاکستان) کے لیے موزوں جگہ کی تلاش کے سلسلے میں چودھری عزیز احمد باجوہ قادیانی (سیشن جج سرگودھا) کو مشورہ طلب کرنے کے لیے بذریعہ تار لاہور بلوایا گیا۔ عزیز احمد باجوہ نے 25 ستمبر کو ایک یادداشت لکھی جس میں مرکز

کے لیے دس جگہوں کی نشاندہی کی گئی۔ اسی یادداشت میں انھوں نے نویں جگہ کے بارے میں لکھا۔

''9۔ چنیوٹ کے بالمقابل دریائے چناب کے پار۔ اس جگہ خیال ہے کہ کافی رقبہ گورنمنٹ سے مل سکے گا۔ جگہ ہر طرح سے موزوں ہے، سوائے اس کے کہ احمدی اردگرد کم ہیں۔''

(تاریخ احمدیت ج 11 ص 284)

یہ یادداشت اس مشاورتی مجلس میں سنائی گئی، چونکہ چودھری عزیز احمد تحصیل چنیوٹ کے تحصیلدار بندوبست رہے تھے اور یہ علاقہ ان کی نظر سے کئی دفعہ گزرا تھا لہٰذا انھوں نے اپنی رائے دی کہ قادیانی مرکز یہاں بننا چاہیے۔ چنانچہ اس رپورٹ کے سننے کے بعد آنجہانی مرزا بشیرالدین نے 18 اکتوبر 1947ء کو مجوزہ زمین ملاحظہ کرنے کے لیے اس علاقے کا سفر کیا۔ اس علاقہ کو پسند (کیونکہ اس کے تین اطراف پہاڑیاں اور ایک طرف دریا تھا۔ اس طرح سے یہ علاقہ ایک قلعہ کی مانند ہو گیا تھا۔ ناقل) کرنے کے بعد ڈپٹی کمشنر ضلع جھنگ کو اس اراضی کے خرید کرنے کے لیے درخواست دی گئی۔ اس درخواست میں ڈپٹی کمشنر سے یہ استدعا کی گئی کہ 1034 ایکڑ قطعہ اراضی انجمن احمدیہ پاکستان کو دے دیا جائے، بقول قادیانیوں کے ایک طویل کشمکش (کشمکش کی وضاحت نہیں کی گئی۔ ناقل) کے بعد 11 جون 1948ء کو حکومت پنجاب نے حسب ذیل الفاظ میں زمین کی منظوری دے دی۔

''دس روپیہ فی ایکڑ کے حساب سے مجوزہ فروخت اصولی طور پر منظور کی گئی۔'' (تاریخ احمدیت ج 11 ص 292) جبکہ زمین کی قیمت اس وقت دس ہزار روپے فی کنال تک پہنچ گئی تھی۔'' (تاریخ احمدیت ج 11 ص 293) اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے محدث العصر حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ نے لکھا تھا:

''قیام پاکستان کے وقت وہ اپنے روحانی مرکز کو چھوڑ کر پاکستان چلے آئے اور یہاں آ کر انھوں نے طے کیا کہ: (الف) پاکستان میں ایک عارضی مرکز قائم کیا جائے۔ چنانچہ ایک مستقل علاقہ پنجاب میں ''کوڑیوں کے مول'' لیا گیا اور وہاں ربوہ کے نام سے خالص مرزائی شہر آباد کیا گیا۔''

(فتنۂ قادیانیت ص 11)

حکومت پنجاب کی طرف سے درخواست منظور ہونے کے بعد قادیانیوں نے جلد ہی اس کی حقیر قیمت ادا کر کے رجسٹری مکمل کرائی۔ مورخِ قادیانیت لکھتا ہے:

''اراضی کی خرید کے بارے میں تمام مراحل طے ہونے کے بعد 22 جون 1948ء کو زمین کی قیمت اور اخراجاتِ رجسٹری وغیرہ کے لیے فوری طور پر بارہ ہزار روپے داخلِ خزانہ سرکار

کرائے.....اس طرح سے رجسٹری مکمل ہوئی۔ (تاریخ احمدیت ج 11 ص 294)

پہلے یہ زمین پنجاب کے آخری انگریز گورنر سے لیز پر لی گئی لیکن بعد میں ریکارڈ خرد برد کر کے اور بڑے بڑے سرکاری عہدوں پر فائز مرزائیوں نے ہیرا پھیری کر کے اس لیز کو مالکانہ حقوق میں بدل دیا۔ اب حالت یہ ہے کہ ملبہ مکان والے کا ہے اور زمین انجمن اور تحریکِ جدید کی ملکیت ہے۔ جس شخص کے متعلق ذرا شبہ یا شکایت ملتی ہے، اس سے زبردستی مکان خالی کرا لیا جاتا ہے یا اس کا سوشل بائیکاٹ کر کے اس پر ربوہ کی زمین تنگ کر دی جاتی ہے۔ آج حکومت ربوہ کے مکینوں کو ان کے مکانوں کے مالکانہ حقوق دے دے تو رائل فیملی کے شہزادوں کے ستائے اور دکھیا ربوہ کے آدھے لوگ مرزائیت چھوڑ کر اسلام کے دائرے میں داخل ہو جائیں گے۔

ربوہ کا سٹیٹ بنک

ربوہ میں غیر منظور شدہ بنک قادیانی نام نہاد خلیفہ کی زیرِ نگرانی چل رہا ہے، جسے ''امانت فنڈ'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس (بنک) کی طرف سے باقاعدہ چیک بک اور پاس بک جاری کی جاتی ہے جس کا ڈیزائن منظور شدہ بنکوں کی چیک بکوں اور پاس بکوں سے ملتا جلتا ہے۔

ربوہ کا اندرونی نظام

ربوہ ایک منی سٹیٹ کی حیثیت رکھتا ہے۔ قادیانیوں نے اس شہر میں ایک قسم کی متوازی نظامِ حکومت بھی قائم کر رکھا ہے، یہ اپنے سربراہ کو امیر المومنین کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک حکومتی نظام کی طرح الگ الگ شعبے اور نظارتیں (وزارتیں) موجود ہیں۔ اس وقت ربوہ میں صدر انجمنِ احمدیہ کی جو نظارتیں قائم ہیں، ان کا اجمالی خاکہ درج ذیل ہے۔

(1) ناظرِ اعلیٰ: اس سے مراد وہ ناظر ہے جس کے سپرد تمام محکمہ جات کے کاموں کی نگرانی ہو۔ وہ خلیفہ اور دیگر ناظروں کے درمیان واسطہ ہوتا ہے۔ (2) ناظر امور عامہ (ہوم سیکرٹری) اس کے سپرد مقدمات فوجداری کی سماعت، سزاؤں کی تنفیذ، پولیس اور حکومت سے رابطہ کا کام ہے۔ (3) ناظر امور خارجہ (وزیر خارجہ) اس کے ذمہ سیاسی گٹھ جوڑ کرنا، اندرونِ ملک و بیرونِ ملک کی کارروائیوں پر کڑی نگاہ رکھنا ہے۔ (4) ناضر ضیافت۔ (5) ناظر تجارت (6) ناظر حفاظتِ مرکز (وزیر دفاع) (7) ناظر صنعت (8) ناظر تعلیم (9) ناظر اصلاح وارشاد (وزیر پروپیگنڈہ ومواصلات) (10) ناظر بیت المال (وزیر خزانہ) (11) نظارت قانون (12) ناظر زراعت وغیرہ۔

''اس شہر میں مندرجہ ذیل وکالتوں کے دفتر اور محکمے قائم ہو چکے ہیں۔ وکالتِ علیا، وکالتِ

مال، وکالتِ تجارت و صنعت، وکالتِ تبشیر، وکالتِ قانون اور وکالتِ تعلیم۔" (الفضل 28 ستمبر 1951ء)

یہ یاد رہے کہ ان ناظران کے اختیارات و فرائض خلیفۂ ربوہ کی طرف سے تفویض ہوتے ہیں اور ان کا تقرر اور ان کی تعداد بھی خلیفۂ ربوہ مقرر کرتا ہے۔ بجٹ خلیفۂ قادیانی کی منظوری سے بنایا اور ان کی منظوری سے ہی جاری ہوتا ہے۔ صدر انجمنِ احمدیہ کے تمام فیصلہ جات قادیانی خلیفہ کے دستخطوں کے بغیر نافذ نہیں ہو سکتے۔ صدر انجمن احمدیہ اپنے خلیفہ کے تجویز کردہ قواعد و ضوابط میں تبدیلی نہیں کر سکتا۔ ناظروں کی تقرری اور برطرفی مکمل طور پر خلیفۂ قادیانی کے اختیار میں ہے۔ تمام مرزائی بدرجہ اوّل اپنے "امیر المومنین" اور اپنے نظام حکومت کے تابع ہوتے ہیں اور ملکی نظام حکومت کے کاموں میں اسی کے حکم اور اجازت سے حصہ لیتے ہیں۔ جب ان میں سے کوئی ملکی وزیر بنالیا جاتا ہے یا کسی بڑے عہدے پر فائز کیا جاتا ہے، فوج میں بھرتی ہوتا ہے یا کوئی اور ملازمت اختیار کرتا ہے تو معہود ذہنی کے ساتھ ایسا کرتا ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنے قادیانی امیر المومنین کا تابع فرمان ہے۔ یہ بات کہ مرزائی جماعت کے لوگ بدرجہ اوّل اپنے مرزائی امیر المومنین کے نظام حکومت کے تابع فرمان ہیں۔ اس امر سے ظاہر ہے کہ مرزائیوں کی حکومت اس شخص کو اپنی تنظیم سے خارج کر دیتی ہے جو امیر المومنین کی اجازت کے بغیر یا اس کے حکم کی پرواہ نہ کرتے ہوئے پاکستان کی کوئی ملازمت اختیار کر لیتا ہے۔ اس حقیقت کے شواہد مرزائیوں کے سرکاری گزٹ الفضل کی ورق گردانی سے بہت مل سکتے ہیں۔ مرزائیوں کے اس معہود ذہنی کا ثبوت حضرت علامہ اقبالؒ کے اس بیان سے بھی ملتا ہے جو انھوں نے 1933ء میں کشمیر کمیٹی کی صدارت سے مستعفی ہونے کے بعد دیا۔ اس بیان میں حضرت علامہ اپنے استعفیٰ کے وجوہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"بدقسمتی سے کمیٹی میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے مذہبی فرقہ کے امیر کے سوا کسی دوسرے کا اتباع کرنا سرے سے گناہ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ احمدی (قادیانی۔ ناقل) وکلاء میں سے ایک صاحب نے جو میر پور کے مقدمات کی پیروی کر رہے تھے، حال ہی میں اپنے ایک بیان میں واضح طور پر اس خیال کا اظہار کر دیا۔ انھوں نے صاف طور پر کہا کہ وہ کسی کشمیر کمیٹی کو نہیں مانتے اور جو کچھ انھوں نے یا ان کے ساتھیوں نے اس ضمن میں کہا وہ ان کے امیر کے حکم کی تعمیل تھی۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے ان کے اس بیان سے اندازہ لگایا کہ تمام احمدی (قادیانی۔ ناقل) حضرات کا یہی خیال ہوگا اور اس طرح میرے نزدیک کشمیر کمیٹی کا مستقبل مشکوک ہو گیا۔"

(پاکستان میں مرزائیت ص 36-37 مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش)

1974ء سے قبل کے حالات

''7 ستمبر 1974ء سے پہلے اس شہر ربوہ میں کسی مسلمان کو داخل ہونے کی اجازت نہ تھی، اگر کوئی بھولا بھٹکا مسافر مسلمان یہاں داخل ہو جاتا تو اس کو کئی کئی دن حبس بے جا میں رکھا جاتا تھا، یہاں کا ایک نام نہاد سکیورٹی افسر اس کو دردناک اذیتیں پہنچا کر انٹروگیٹ کرتا یہاں تک کہ کئی نوجوان بعض جاسوسی کے الزام میں قتل کر دیے گئے۔ مثال کے طور پر مولوی غلام رسول جنڈیالوی ایڈیٹر روزنامہ ایام کا جواں سال لڑکا اور اس کا ایک نوجوان ساتھی ربوہ دیکھنے کے شوق میں وہاں اتر گئے۔ ان کے دفاتر ان کی نام نہاد مساجد، نام نہاد قصر خلافت اور دوسرے بازاروں میں چند گھنٹے پھرتے رہے۔ جب وہ وہاں سے سرگودھا جانے کے لیے بس کے اڈہ کی طرف روانہ ہوئے تو قادیانیوں کی سی آئی ڈی نے انھیں پکڑ لیا، پہلے اذیتیں پہنچاتے رہے پھر ان کے باری باری ہاتھ پاؤں کاٹ کر انھیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ آج تک کوئی رپٹ، رپورٹ، پرچہ، گرفتاری اور کوئی کارروائی نہ ہو سکی، بالآخر حکومت نے ربوہ میں ایک پولیس چوکی قائم کی، وہاں پولیس کی نفری اور انچارج بٹھائے گئے، تین سال بعد جسٹس ہمدانی جب 29 مئی 1974ء کے واقعات کی انکوائری کے لیے ربوہ آئے تو انھوں نے چوکی پولیس کے انچارج سے دریافت کیا کہ تین سال میں یہاں کتنے مقدمے درج ہوئے؟ چوکی پولیس انچارج نے اپنے کورے رجسٹر جسٹس صاحب کو دکھاتے ہوئے نفی میں جواب دیا اور کہا کہ تین سال میں یہاں جتنے واقعات اور وقوعے ہوئے ان کی کوئی رپورٹ درج نہیں کرائی گئی بلکہ قادیانیوں کا اپنا ایک نظام ہے جو ان کی رپورٹیں درج کرتا اور ان پر کارروائیاں کرتا ہے۔

قادیانیوں کے نزدیک ''ربوہ'' کی مذہبی حیثیت

مکہ اور مدینہ سے مشابہت

مرزا بشیر الدین محمود نے 30 ستمبر 1949ء کو خطبہ جمعہ میں اعلان کیا کہ: ''یہ نئی بستی جہاں ایک طرف مدینہ سے مشابہت رکھتی ہے، اس لحاظ سے کہ ہم قادیان سے ہجرت کرنے کے بعد یہاں آئے، وہاں دوسری طرف یہ مکہ سے بھی مشابہت رکھتی ہے کیونکہ یہ نئے سرے سے بنائی جا رہی ہے۔'' (تاریخ احمدیت ج 14 ص 34، الفضل 6 اکتوبر 1949ء ص 3 بحوالہ کتاب ''ربوہ'' ص 86 مطبوعہ ربوہ)

ربوہ کے بارہ میں قادیانی شاعر قیس مینائی نے ''تاثرات ربوہ'' نامی کتابچہ لکھا جس میں اس نے مکہ و مدینہ کی توہین کی ہے۔ اس کا ایک شعر ملاحظہ ہوں ۔

(2) خدام الاحمدیہ: 16 سال سے 40 سال تک کے مردوں کے لیے۔ (3) اطفال الاحمدیہ: 15 سال تک کے بچوں کے لیے۔

عورتوں کی ذیلی تنظیمیں

(1) لجنۃ اماء اللہ: 15 سال سے اوپر تک کی مستورات کے لیے۔ (2) ناصرات الاحمدیہ: 15 سال تک کی بچیوں کے لیے۔

مجلس خدام الاحمدیہ 1938ء میں قائم کی گئی۔ لجنۃ اماء اللہ کی تنظیم 15 ستمبر 1922ء کو اور مجلس انصاء اللہ 26 جولائی 1940ء کو قائم کی گئی۔

ربوہ سے کافی کچھ قادیانیوں کے رسائل و جرائد نکلتے ہیں۔ الفضل (روزنامہ) کے علاوہ ماہنامہ خالد (خدام الاحمدیہ) ماہنامہ تشہید الاذہان (اطفال الاحمدیہ) انصار اللہ (مجلس انصار اللہ) مصباح (لجنۃ اماء اللہ) البشریٰ (عربی) ریویو آف ریلیجنز (انگریزی) تحریک جدید (اردو انگریزی) اور ایک ہفت روزہ بدر قادیان سے نکلتا ہے۔ (بحوالہ دینی معلومات مطبوعہ ربوہ)

عمر پیام

ربوہ کا طلسمِ ہوشربا

ساری دنیا میں پاکستان کے خلاف زہریلا پروپیگنڈہ کرنے اور اپنے بنیادی حقوق کی پامالی کا ڈھنڈورا پیٹنے والے مرزا غلام احمد قادیانی کے شاہی خاندان نے ربوہ میں اپنی تخلیق کردہ ''جنت'' میں اپنے پیروکاروں کے بنیادی حقوق کی جس طرح دھجیاں اڑائیں، اس نے قادیانی تحریک کے معصوم، نرم خو، ہمدردی اور نیک نامی کا مصنوعی نقاب اتار کر رکھ دیا ہے۔ برصغیر کی تقسیم کے بعد قادیانی جماعت کے دوسرے خلیفہ مرزا بشیرالدین محمود نے قادیان سے نقل مکانی کر کے پہلا پڑاؤ لاہور میں کیا اور جودھامل بلڈنگز اور رتن باغ کی عمارات اور زمین الاٹ کرالی۔ تعلیم اسلام کالج کے لیے ضلع کچہری کے شمال میں دومنزلہ عمارت پر قبضہ کیا گیا لیکن مرزا بشیرالدین محمود نے بھانپ لیا تھا کہ اگر اپنے پیروکاروں کو معاشرے سے الگ تھلگ مقام پر آباد نہ کیا گیا تو جھوٹی عقیدتوں اور محبتوں کا ہالہ مخالفت اور دلائل کی کڑی دھوپ میں بھاپ کی طرح معدوم ہو جائے گا، پنجاب کا تفصیلی سروے کرنے کے بعد چنیوٹ کے تاریخی شہر کے نواح میں دریائے چناب کے مغربی کنارے پر بنجر پہاڑی علاقے کو اس کے لیے منتخب کیا گیا۔ شورزدہ زمین پر ڈھیگیاں نامی گاؤں کے کھنڈرات پر ربوہ کے طلسماتی شہر کی بنیاد رکھی گئی جو پاکستان میں قادیانی ریاست کا درجہ اختیار کر گیا، جہاں ملکی قوانین کی بجائے نام نہاد خلیفہ اور اس کا خوشامدی ٹولہ اپنے پیروکاروں کی تقدیر کا فیصلہ کرتا تھا۔ دریائے چناب کے مغربی کنارے کا یہ علاقہ مسلمان فاتحین کی گزرگاہ رہا ہے، قدیم روایات کے مطابق بت شکن محمود غزنوی نے اس علاقے سے گزر کر بھارت پر 17 حملے کیے تھے، چناب پنجاب میں ہریالی اور خوشحالی کی علامت ہے، سوہنی مہینوال کے عشق کی لازوال داستان اسی دریا کے سرسبز و شاداب کنارے پر رقم ہوئی تھی لیکن اس علاقے کی تقدیر چناب کا حیات بخش پانی بھی نہیں بدل سکا تھا۔ برطانوی راج کے دوران مقامی جاگیرداروں نے اس علاقے کو آباد کرنے کی متعدد بار کوشش کی لیکن شورزدہ زمین میں زندگی کی نمونہ ہونے کی وجہ سے انھیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا جبکہ مرزا بشیرالدین محمود نے اپنے پیروکاروں کو اس بنجر علاقے میں آباد کرنے کے لیے مرزا غلام احمد کی ایک نظم کے مصرعے کا سہارا لیا

جس میں کہا گیا تھا ''پاؤں کے نیچے سے میرے پانی بہا دیا'' مرزا محمود احمد نے دعویٰ کیا کہ مرنے سے پہلے اس خود ساختہ الہام کے ذریعے مجھے مرزا غلام احمد نے اس جگہ شہر آباد کرنے کا حکم دیا تھا۔ سطح سمندر سے 613 فٹ بلند یہ ویران علاقہ اس لیے بھی بہت اہمیت رکھتا تھا کہ ہائی وے اور ریلوے لائن بھی اس علاقے سے گزرتی تھی اور یہیں دریائے چناب پر منفرد قسم کا دو منزلہ پل بنا کر سڑک اور ریلوے لائن کو گزارا گیا ہے۔ قبل ازیں قادیانی رہنما تقسیم برصغیر کو عارضی مرحلہ سمجھتے ہوئے اپنے پیروکاروں کو بھارت میں اپنی جائیدادوں کے کلیم داخل کر کے زمینیں الاٹ کرانے سے منع کر چکے تھے۔ مرزا محمود احمد کے اس احمقانہ فیصلے کی وجہ سے ہندوستان سے آنے والے قادیانیوں کو لاکھوں روپے مالیت کی جائیدادیں قربان کرنا پڑیں۔ لیکن دوبارہ ہندوستان میں اپنی جائیدادوں پر قبضہ کرنے کی پیش گوئی پوری نہ ہو سکی۔ 1948ء میں ایک ہزار ایکڑ سے زائد یہ رقبہ 10 روپے فی ایکڑ کے حساب سے 99 سال کی لیز پر لے لیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد اس کے مالکانہ حقوق بھی حاصل کر لیے گئے۔ فروری 1949ء میں لوکل گورنمنٹ ایکٹ 1911ء کے تحت صوبائی ٹاؤن پلانر پنجاب حبیب جے اے سوجی نے ربوہ کالونی کا نقشہ حکم نمبر پی ٹی پی 371 کے تحت منظور کر لیا اور ربوہ کی تعمیر کا ابتدائی مرحلہ شروع ہوا۔ ربوہ جس میں حکمرانی کا خواب مرزا بشیر الدین محمود دیکھ رہے تھے، ابتدائی نقشے میں 5 سو ایکڑ سڑکوں، گرین بیلٹس، مفاد عامہ کے پلاٹس، پارک، ریلوے سٹیشن اور دیگر مقاصد کے لیے مخصوص کر دیا گیا جبکہ باقی زمین کو 10 مرلے 4 کنال کے پلاٹس میں تقسیم کر دیا گیا۔ اس نقشے میں قادیانی سلطنت کے مرکزی سیکرٹریٹ کا کام کرنے والی انجمن احمدیہ ہسپتالوں اور تعلیمی اداروں کے لیے بھی جگہ مختص کی گئی تھی۔ اس کے بعد ٹاؤن پلاننگ کے لیے باقاعدہ قانونی مسودہ تیار کیا گیا جس کے تحت انجمنِ احمدیہ کو ربوہ کالونی کا ٹرسٹی قرار دیتے ہوئے تمام قوانین پر عملدرآمد کرنے کے لیے پابند کیا گیا جس کے مطابق کسی بھی قانونی شق کی خلاف ورزی پر حکومت اس کی گرانٹ بند کرنے اور زمین واپس لینے کی مجاز تھی اور انجمنِ احمدیہ نے سارا شہر بلڈوز کر کے زمین جوں کی توں واپس کرنے کی شرط بھی تسلیم کی تھی، جس کے بعد مئی 1949ء میں ربوہ کو ایریا کمیٹی قرار دے کر باقاعدہ نوٹیفکیشن جاری کر دیا گیا جس کے تحت ڈپٹی کمشنر جھنگ، تحصیلدار چنیوٹ سمیت ربوہ کے تین افراد پر مشتمل 5 رکنی کمیٹی کو ایریا کمیٹی ربوہ کا انتظام سپرد کر دیا گیا لیکن عملاً ربوہ کا کلی اختیار انجمن احمدیہ کے پاس رہا۔ ربوہ کو پاکستان میں یہ منفرد مقام حاصل ہے کہ سنگ بنیاد رکھنے سے پہلے ہی اسے ٹاؤن کمیٹی کا درجہ دے دیا گیا تھا، جس کے بعد انجمن احمدیہ نے ''آباد کاری'' کمیٹی بنا کر گاؤں پلاننگ بائی لاز اور لوکل گورنمنٹ ایکٹ کی صریحاً خلاف ورزی کرتے ہوئے کسی قسم کا ترقیاتی

کام کیے بغیر پلاٹس کی فروخت شروع کر دی۔ سڑکوں، ڈرینج اور سیوریج اور پانی کی سپلائی کے بغیر پہلے تین ماہ 50 روپے کنال پلاٹ فروخت کیے گئے لیکن اس میں پارکوں سڑکوں دفاتر وغیرہ کے لیے چھوڑی گئی زمین کی قیمت بھی شامل کر لی گئی۔ اس وقت وعدہ کیا گیا کہ بہت جلد ترقیاتی کام شروع کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد ہر تین ماہ بعد زمین کی قیمت میں اضافہ شروع کیا گیا اور 1950ء میں 50 روپے فی کنال فروخت ہونے والی زمین کی قیمت 1000 روپے کنال کر دی گئی۔ اس کے بعد یہ قیمت 50 ہزار روپے کنال ہوگئی۔ لیکن آج تک 47 سال گزرنے کے باوجود ربوہ میں ترقیاتی کام شروع نہیں ہو سکے اور نہ ہی اپنے مظلوم پیروکاروں کے لیے پانی کا انتظام کیا گیا جبکہ ایریا کمیٹی اور ٹاؤن کمیٹی کے تمام محصولات اور ٹیکس انجمن احمدیہ وصول کرتی رہی۔ 1967ء میں ٹاؤن کمیٹی کے ذریعے انجمن احمدیہ نے گول بازار میں خالی جگہ پر پانی کی ٹینکی بنوائی جس میں ٹیوب ویل کے ذریعے دریائے چناب کا میٹھا پانی پہنچایا جاتا تھا لیکن اس ٹینکی سے صرف قادیانیوں کا نام نہاد شاہی خاندان اپنی پیاس بجھاتا تھا، عام شہریوں کو قلتِ آب کا بہانہ بنا کر چناب کے میٹھے پانی سے محروم رکھا گیا جبکہ قادیانی قصر خلافت کے وسیع وعریض سوئمنگ پول اور تالاب میٹھے پانی سے بھرے ہوئے تھے اور ان تالابوں میں بطخیں تیرتی تھیں۔ تیسرے قادیانی خلیفہ مرزا ناصر احمد نے اہل ربوہ سے چار بار ان کی ضرورت کے لیے پانی کی ٹینکی بنوانے کا وعدہ کیا لیکن وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو گیا۔ یہ حقیقت ہے کہ 1974ء میں جب قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دے کر ربوہ کو شاہی خاندان کے تسلط سے نجات دلا کر کھلا شہر قرار دیا گیا تو جہاں مسلمانوں نے اطمینان کا اظہار کیا، وہاں مرزا غلام احمد قادیانی کے مظلوم پیروکاروں نے بھی سکھ کا سانس لیا۔ ٹاؤن کمیٹی کے مسلمان اہلکاروں نے شاہی خاندان کی مخالفت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے پینے کے میٹھے پانی پر ان کی اجارہ داری ختم کر دی اور اسی ٹینکی سے اہلیان ربوہ کو پانی کی سپلائی شروع کر دی اور یوں غیر مسلم قرار دینے سے پیدا ہونے والی تلخی کو چناب کے میٹھے پانی سے دور کر دیا۔ شاہی خاندان کے لیے مخصوص پانی کو استعمال کرنے سے کسی بھی قادیانی نے انکار نہیں کیا تھا۔ تیسرے قادیانی خلیفہ مرزا ناصر احمد کا دعویٰ تھا کہ شاہی خاندان کے لیے مخصوص ٹینکی سے ''قصر خلافت'' کو ناکافی پانی ملتا ہے جبکہ قصر خلافت کے تالابوں میں بطخیں میٹھے پانی کے تالابوں میں تیرتی تھیں اور اہلیانِ ربوہ شور زدہ زمین کا کھارا اور کڑوا پانی پیتے اور چپ رہتے تھے۔ بلدیہ ربوہ نے لوکل گورنمنٹ کے تعاون سے محلہ دارالنصر غربی کی ٹیلہ نما پہاڑی پر دوسری ٹینکی تعمیر کرنے کا منصوبہ بنایا تو انجمنِ احمدیہ کے بددماغ کرتا دھرتا سیخ پا ہو گئے اور اس ٹیلے کو اپنی ملکیت قرار دے کر ٹینکی بنانے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ لیکن بلدیہ کے انسان دوست مسلمان حکام نے اُن کے جھوٹے دعووں

کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اسی جگہ ٹینکی تعمیر کروادی جس کے بعد شہریوں کو وافر مقدار میں پینے کا پانی ملنے لگا۔ کھلا شہر قرار دینے کے بعد ربوہ میں سڑکیں بنائی گئیں، کمرشل بینکوں کی شاخیں قائم ہوئیں، پولیس سٹیشن تعمیر ہوا، ٹیلی فون ایکسچینج نے کام شروع کیا اور ریذیڈنٹ مجسٹریٹ نے عدالت لگانا شروع کر دی، جس کے بعد عقیدت کے مارے شہریوں نے سکھ کا سانس لیا اور حبس زدہ شہر میں بادنسیم کے تازہ جھونکوں نے زندگی کی نئی لہر دوڑا دی۔ اب اسی شہر میں مختلف شہری تنظیمیں قادیانی جماعت کے شاہی خاندان کی فسطائیت کے خلاف جدوجہد میں مصروف ہیں۔ ربوہ میں مقیم مختلف اخبارات کے نمائندوں نے بھی استحصال کے خلاف طویل جدوجہد کی جس میں بارہا قلم کاروں کی انگلیوں سے لہو بہا لیکن انھوں نے حوصلہ نہیں ہارا۔ 1974ء کے بعد ربوہ میں انقلاب آیا، 14 محلوں پر مشتمل اس شہر کو خوف و دہشت کے تاریک دور سے نجات ملی جس میں مذہبی عقیدت کی بنیاد پر اپنے پیروکاروں پر ظلم کے پہاڑ توڑے جاتے تھے، سانس بھی انجمنِ احمدیہ کے احکامات کے مطابق لینا پڑتا تھا۔ ریاست کے اندر اس ریاست میں شاہی خاندان کے احکامات کی معمولی خلاف ورزی پر شدید جسمانی سزائیں اور ربوہ بدری کی سزا دی جاتی تھی۔ اس کھلے ظلم پر حکومت نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ اگر کوئی سر پھرا ملکی قوانین کا حوالہ دے دیتا تو پھر اس پر مظالم کے پہاڑ توڑے جاتے، زیر عتاب شخص کو مار پیٹ کر بسوں کے اڈے پر لے جا کر سب سے پہلے بس پر بٹھا کر ربوہ بدر کر دیا جاتا۔ اگر زیر عتاب شخص کبھی چوری چھپے اپنے بیوی بچوں سے ملنے آ جاتا تو ان سب کو جماعت سے خارج کر کے ربوہ سے نکال دیا جاتا۔ 1974ء تک ربوہ آہنی پردوں میں محصور تھا اور اس کی آبادی چودہ محلوں تک محدود تھی لیکن اب وہ آسیب زدہ قصبہ 37 محلوں اور شمال مغرب میں بے شمار آبادیوں اور کالونیوں کی وجہ سے تیزی سے پھلتا پھولتا شہر بن چکا ہے۔ آمریت کے منحوس سائے اور جبر کا نظام کب کا رخصت ہو چکا لیکن قادیانی جماعت سے اخراج کا سلسلہ تادم تحریر جاری ہے۔ انجمن احمدیہ نے گسٹاپو کے انداز میں نظارت امور عامہ، لوکل انجمن احمدیہ اور تنظیم خدام الاحمدیہ کے ذریعے جاسوسی کا انتہائی مربوط جال بچھا رکھا ہے۔ ماضی میں کوئی شخص ان کی اجازت کے بغیر ربوہ میں کاروبار نہیں کر سکتا تھا، نہ کسی مسلمان رشتے دار کو اپنے گھر میں ٹھہرا سکتا تھا۔ انسانی مقدس رشتوں کو ان مذہبی اجارہ داروں نے اس طرح پامال کیا تھا کہ باپ بیٹے، بہن بھائی، میاں بیوی کو ایک دوسرے کی جاسوسی کے لیے مجبور کیا جاتا تھا۔ قادیانی جماعت کے بظاہر نرم خو، پرہیزگار اور ہر لمحے محبت کا درس دینے والوں نے ربوہ میں انسان دشمنی کی انتہاء کی ہوئی تھی۔ لاتعداد چندوں کے نام پر اپنے عقیدت مندوں کی لوٹ مار سے خاندان خلافت نے جس طرح عیاشیاں کی ہیں اس کی تفصیلات بھی بڑی المناک ہیں۔ یہ سلسلہ تو اب بھی

جاری ہے، ہر قادیانی کے لیے تحریکِ جدید، وقف جدید، سالانہ جلسہ، ویلفیئر، وصیت اور تمام تنظیموں کے نام پر چندہ دینا فرض ہے، آئے دن جاری ہونے والی نت نئی سکیمیں اس کے علاوہ۔ تنخواہ دار قادیانیوں کو 25 سے 30 فیصد رقم لازمی چندے کی مد میں جمع کرانا پڑتی ہے، صدقہ، خیرات، زکوٰۃ بھی انجمن احمدیہ کو جمع کرانا پڑتا ہے، کسی غریب یا مستحق کی براہ راست مدد کرنا بہت بڑا جرم ہے، ربوہ کی تمام عمارتیں اور عبادت گاہیں اپنے خوش عقیدہ پیروکاروں کی آرزوؤں کی لاشوں پر کھڑی کی گئی ہیں۔ بددیانت شاہی خاندان نے کبھی بھی چندے کی مد میں اکٹھی ہونے والی بھاری رقوم کو اپنے پیروکاروں کی حالت زارِ بہتر بنانے پر خرچ نہیں کیا۔ صد سالہ جوبلی منانے کا اعلان کر کے کروڑوں روپے اکٹھے کیے گئے اور صد سالہ گولڈن جوبلی کی تقریبات تو نہ ہوسکیں اور یہ ساری رقوم شاہی خاندان کے بیرون ملک اکاؤنٹس میں منتقل ہوگئیں۔ نادار قادیانیوں کو گھر بنا کر دینے کی سکیم ''بیوت الحمد'' کے نام پر بھی کروڑوں روپے اکٹھے کیے گئے لیکن صرف 80 خوشامدیوں کو معمولی کوارٹر دے کر یہ رقم بھی ہڑپ کر لی گئی۔ خلیفہ کا خاندان ساری دنیا میں عیاشیاں کر رہا ہے، اسی طرح مقامی انجمن احمدیہ کے افسر بھی دھوکہ دہی اور ہیر پھیر کر کے لاکھوں روپے کی رقم ہڑپ کر رہے ہیں۔ چندہ وصول کرنے والے صبح سویرے زبردستی ہر دروازے پر دستک دے کر مال اکٹھا کرنے میں مصروف ہیں لیکن غربت یا فاقہ کشی چندے کی وصول کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتی لیکن اپنے پیروکاروں کے تمام بنیادی حقوق سلب کرنے والے ربوہ کی گرین بیلٹس پر قبضے کر کے اپنی عمارتیں بنانے والے آج ساری دنیا میں قادیانیوں کے بنیادی حقوق کی پامالی کی بے بنیاد داستانیں سنا کر مال اکٹھا کر رہے ہیں۔ ان کی انسانی ہمدردی کا عالم یہ ہے کہ خاندان خلافت نے تو سرکاری ہسپتال اور پانی کی ٹینکی کے لیے بھی جگہ مہیا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ انجمن احمدیہ کے زیر اہتمام چلنے والے فضل عمر ہسپتال میں علاج کرانا کسی غریب کے لیے ممکن نہیں ہے۔ ان عالمی مظلوموں نے گزشتہ 47 سال میں ربوہ کے مکینوں پر جتنے مظالم کیے ہیں ان کی نظیر ملنا مشکل ہے۔

کلمۃ اللہ خاں

ربوہ کی شرمناک یادیں!

بچپن کی یادیں انسان کا سرمایہ ہوتی ہیں، اگر یادیں حسین ہوں تو دل ان کو اپنے اندر سمو کر ہمیشہ مسرور رہتا ہے اور اگر یادیں تلخ ہوں تو کانٹا بن کر دل میں کھٹکتی رہتی ہیں۔ میرا بچپن ربوہ میں گزرا جس کو مرکزِ توحید بھی کہتے ہیں۔ جہاں تھی رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے۔ جہاں کی زندگی ہاتھی کے دانت تھے جو کھانے کے لیے اور ہوتے ہیں اور دکھانے کے لیے اور۔ ربوہ جو غلاموں کا شہر تھا، جہاں مساجد، مدرسوں اور اجتماعوں، جلسوں میں آدابِ غلامی سکھائے جاتے تھے۔ جو زبان بلند ایوانوں سے ٹکراتی، کاٹ دی جاتی تھی۔ جو کوئی حق کی بات کرتا اسے بیوی بچوں سمیت صبح کا سورج طلوع ہونے سے قبل علاقہ بدر ہونے کا حکم سنا دیا جاتا تھا۔ جو کوئی حق و صداقت کی بات اونچی زبان میں کرتا یا تو اپنی ٹانگیں تڑوا بیٹھتا یا پھر اس کی لاش کسی پہاڑی پر ایسی حالت میں پائی جاتی کہ جس کو دیکھ کر انسانیت شرما جاتی۔ یہ وہ شہر تھا جہاں حکمرانوں نے اپنے لیے اور عام لوگوں کے لیے الگ الگ قانون بنا رکھے تھے۔ ربوہ میں رہنے والے عزیز بھامڑی (یہ کینیڈا کے بدنامِ زمانہ امیر مشنری نسیم مہدی کا پہلا سُسر تھا۔ ناقل) اور اس کے عقوبت خانوں کو کبھی نہیں بھول سکتے۔ کہنے کو تو یہ محکمہ امور عامہ کے نام سے تھا مگر حقیقی طور پر اس محکمے کا مقصد لوگوں کے دلوں میں ڈر اور خوف پیدا کرنا تھا۔ 1974ء تک یہ محکمہ اپنے مقاصد میں کامیاب رہا، جہاں امور عامہ عام آدمی کے لیے ایک خوف کا مقام تھا، وہاں اسی کی سرپرستی میں مغلیہ خاندان (مرزا محمود کی نسل بیٹے بیٹیاں۔ ناقل) عیاشیاں بھی کرتا تھا۔ مئی 1974ء کو جب مرکزی اشارے پر جماعت کے غنڈوں نے مسافر گاڑی (چناب ایکسپریس۔ ناقل) پر حملہ کیا اور اس کے بعد کے حالات نے حکومت پاکستان کے ذریعے اس شہر کو کسی حد تک جماعتی تسلط سے آزاد کرایا تو اس دوران کتنے وہ لوگ تھے جو ''تاریک راہوں میں مارے گئے'' مظلوموں کی آہیں کبھی رائیگاں نہیں جاتیں۔ جماعت کے خلفاء آخری ایام میں جب بکریوں کی طرح منمناتے ہیں یا نمازوں کے دوران عجیب و غریب حرکتیں کرتے ہیں تو اس کی کوئی تو وجہ ہوگی، یہی تو ہے اوپر والے کی بے آواز لاٹھی کہ دکھانے کا انتظام بھی اپنا ''ٹی وی'' (ایم۔ ٹی۔ اے۔ ناقل)

کر رہا ہے۔ قادیان چھنا، ربوہ چناب نگر بنا، افریقہ پر حکومت کرنے کا خواب دیکھنے والے، سینگال میں حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش پکڑے جانے میں ذلیل وخوار کر کے ملک سے دھکے دے کر نکالے گئے۔ اب بھی دنیا پر غلبہ کا دعویٰ ایسے ہی ہے کہ "رہنے کو گھر نہیں ہے سارا جہاں ہمارا" ربوہ میں چند آنکھوں دیکھے ایسے واقعات قلمبند کر رہا ہوں جن کو یاد کر کے اب بھی روح کانپ جاتی ہے۔ یہ ربوہ کی شرمناک یادوں میں سے چند ایک ہیں۔

آج سے تقریباً پینتیس برس پہلے کی بات ہے، میری عمر اس وقت چودہ سال ہوگی۔ دارالصدر ربوہ میں جہاں کبھی ڈاکٹر راجہ ہومیو پیتھک والے رہا کرتے تھے ان کے گھر کے پاس ہی ایک بزرگ امیر ولی صاحب رہائش پذیر تھے، ربوہ میں رہنے والی ایک خدا ترس خاتون بتایا کرتی تھیں کہ انڈیا میں پاکستان بننے سے قبل انھوں نے ہی ان کے خاندان کی دینی تربیت کی تھی، جذبے کا یہ شوق تھا کہ نماز ظہر ان کے گاؤں میں پڑھا کر دوڑ لگا دیا کرتے تھے کہ چند کوس دوسرے گاؤں میں جہاں چند احمدی رہتے ہیں نماز عصر با جماعت ان کو پڑھا سکیں۔ ان بزرگ کی ایک نہایت خوبصورت بیٹی تھی، بدقسمتی سے ایک مغل شہزادے مرزا نعیم احمد (مرزا طاہر احمد کا بھائی اور بدکردار خلیفۂ ثانی مرزا محمود کا بیٹا۔ ناقل) کی نظر اس معصوم بچی پر پڑ گئی اور انجام کار شہزادے نے بچی کی عزت لوٹ لی۔ گھر والوں کو جب علم ہوا تو بہت دیر ہو چکی تھی، بچی کی مار پٹائی کے بعد بزرگ حصولِ انصاف کے لیے قصر خلافت دوڑے مگر قسمت کے ساتھ ساتھ قصر خلافت کے دروازے بھی ان کے لیے بند ہو چکے تھے۔ یہ وہاں چیختے رہے مگر ان کی نحیف آوازیں محل کی اونچی دیواروں سے ٹکرا کر واپس آتی رہیں۔ اب محکمہ امورِ عامہ بیدار ہوا، بچی اور اس کے والدین پر دباؤ ڈالا کہ ناجائز اولاد کو جنم ہی نہ لینے دیا جائے، انکار پر یہ تجویز آئی کہ ناجائز بچے کا گناہ مرزا نعیم صاحب پر نہیں بلکہ کسی اور پر (داؤد جنرل سٹور گولبازار ربوہ والے داؤد کے سر) ڈال دیا جائے، جب گھر والے یہ بھی نہ مانے تو انھیں شہر چھوڑ کر جانے کا کہا گیا مگر وہ بوڑھا شخص نہ مانا۔ بچے کی ولادت قریب تھی اس لیے ظلم کی ایک نئی داستان رقم کی گئی۔ گھر کے باہر خدام الاحمدیہ کا پہرہ لگا دیا گیا کہ کوئی بھی شخص نہ تو گھر سے باہر نکلے اور نہ ہی گھر کے اندر داخل ہو، اب وہ حالات کہ جہاں روزمرہ کی ضروریات زندگی کی اشیاء روزانہ خریدی جاتی ہیں، اس پہرے سے ان کو بھوکا گھر میں محبوس کر دیا گیا، نہ دائی، نہ دوائی، نہ کھانا، کم عمر بچی جو کہ ایک ناجائز بچے کو جنم دے رہی ہے، والدین کا واویلا اور فریادیں...... یہ سب خدا اور اس کے فرشتوں نے بھی دیکھا ہوگا۔ اگر دروازہ اندر سے کھلتا ہے تو باہر بیٹھے غنڈے ان پر جھپٹتے ہیں، لہٰذا پھر دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ لوگ ایسے باہر کھڑے ہیں جیسے اندر کوئی تماشہ ہو رہا ہو، جماعتی کارندے باہر کھڑے بچی

کے کردار پر کیچڑ اچھال رہے ہیں اور ایسے میں مغل شہزادے کا گناہ ایک نہایت خوبصورت بچے کی شکل میں وجود میں آتا ہے اور بچے کو جنم دینے والی بن بیاہی ماں سارے شہر کی پھٹکار برداشت کر رہی ہے، شہر میں چہ مگوئیاں شروع ہونا لازمی امر تھا۔ جتنے منہ اتنی باتیں، ان کے گھر سے پہرہ تو اٹھا لیا گیا مگر ایک اور گھناؤنا کھیل شروع کر دیا گیا۔ لڑکی کا باپ جب گھر سے باہر نکلتا تو وہ اصلیت کا شور مچا کر حقیقت بیان کرتا اور مظلومیت کا رونا روتا، وہ مرزا نعیم احمد کا نام لے کر مطالبہ کرتا کہ میری بچی کو اپنی بیوی بناؤ اور بچے کو اپنا نام دو۔ جماعت کی طرف سے مامور کیے گئے لوگ محلے کے بچوں کو پتھر دیتے اور کہتے کہ بوڑھا پاگل ہے اسے مارو۔ بچے یہ عمل شروع کر دیتے اور بوڑھا سڑکوں اور گلیوں میں خون سے لت پت بھاگتا رہتا اور بچے اس کے پیچھے اس وقت تک بھاگتے اور مارتے رہتے جب تک وہ کسی پناہ گاہ میں نہ چلا جاتا، اس بزرگ کا نام جو کبھی مولوی امیر ولی تھا اب بابا ''اوئی اوئی'' ہو گیا، اس لیے کہ جب اسے پتھر لگتا تو شدت درد سے وہ اوئی اوئی کی آواز نکالتا۔ ایک بار میں اور میرے چند محلے دار دوست نماز جمعہ پڑھنے رحمت بازار سے مسجد مبارک کی طرف جا رہے تھے کہ اچانک وہی بابا جی سامنے آ گئے۔ اب وہ آگے آگے چل رہے تھے اور ہم پیچھے، اچانک ایک جیپ آئی اور ہمارے پہلو میں رکی، اس میں سے مرزا ناصر احمد خلیفۂ وقت کے ڈرائیور صلاح الدین باہر نکلے، پاس ہی سڑک پر پڑے ہوئے چند پتھر اٹھائے اور ہمیں دیتے ہوئے کہنے لگے کہ اس بڈھے کے مارو اور سر میں مارو۔ وہ اپنا فرض ادا کر کے چلے گئے اور ہم نے وہ پتھر سڑک پر ہی پھینک دیے۔
رحمت بازار کی پہلی دوکان ڈاکٹر محمد احمد صاحب کی ہوا کرتی تھی اور شام کو اکثر عزیز بھامڑی، میاں انور (میاں انور، مرزا طاہر احمد کے بھائی) اس وقت غالباً چیئرمین ٹاؤن کمیٹی تھے، اور چند اور احباب گپ شپ کے لیے بیٹھا کرتے تھے۔ ایک روز محفل جمی ہوئی تھی کہ سامنے ریلوے لائن کو عبور کرتے ہوئے وہ بزرگ خون میں لت پت کبھی گرتے کبھی اٹھتے درد سے چیختے بھاگے آ رہے ہیں اور بچوں اور نوجوانوں کا جم غفیر پتھروں کی بارش ان پر کر رہا ہے۔ وہ کوشش میں تھے کہ جہاں یہ تکبروں سے بھرے بت محفل سجائے بیٹھے ہیں ان کے ساتھ ہی گھر کا جو دروازہ ہے اس تک پہنچ جائیں۔ اچانک عزیز بھامڑی صاحب مسکرائے اور اس گھر والے کا نام لے کر اسے کہنے لگے کہ سنبھالو بھئی تمہارا رشتہ دار آ رہا ہے۔ اتنے میں گھر کا دروازہ کھلا اور وہ نیک سیرت عورت جس کا ذکر میں نے شروع میں کیا تھا، اس زخمی کو گھر آنے کا اشارہ کرنے لگی اور وہ نڈھال دروازے پر آ کر یہ کہتے ہوئے گر پڑا کہ ''مجھے ان خنزیروں سے بچاؤ''۔ ایک صبح میں اپنے والد صاحب کے ساتھ نماز فجر پڑھنے کے لیے مسجد مبارک گیا تو نماز کے بعد اچانک وہ بزرگ کھڑے ہو گئے اور خلیفۂ وقت مرزا ناصر احمد جو کہ امامت

کرا چکے تھے انھیں مخاطب کر کے بولے کہ کل میرے گھر میں جماعت کے عام کارکنوں کی طرح عیدی بھجوائی گئی جو کہ میں نے واپس کر دی تھی، میرے گھر عیدی یا تو آپ خود لے کر آئیں یا میاں انس (مرزا ناصر کا بیٹا۔ ناقل) کو بھیجیں۔ مرزا ناصر احمد قادیانی نے اس کی بات کو سنا اور خاموشی سے مسجد سے باہر نکل گئے۔ پھر جب اس بزرگ میں مار کھانے کی ہمت نہ رہی تو وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ملتان چلے گئے اور خبر یہی ملی کہ اس ناجائز بچے کو کسی طرح مروا دیا گیا۔

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو!

یہ بھی غالباً پینتیس سال قبل کا واقعہ ہے کہ گولبازار ربوہ میں ریلوے پھاٹک کے پاس ہی ایک غریب نوجوان محمد علی نامی فروٹ کا ٹھیلہ لگایا کرتا تھا۔ ایک مغل شہزادے کی کارستانیوں سے وہ واقف ہوا تو گاہے بگاہے اپنی زبان پر اس کا ذکر کرتا رہتا، اسے متعدد بار تنبیہ کی گئی مگر جوان عمر تھی سمجھ نہ پایا۔ دفتر امور عامہ میں بلا کر انجام بتایا گیا چند روز منہ بند رہا مگر پھر باز نہ آیا۔ ایک روز صبح ہم محلے کے چند دوست سکول جا رہے تھے اکثر ریلوے لائن کے درمیان چلا کرتے تھے جب گولبازار کا ریلوے پھاٹک کراس کیا تو ساتھ ہی دائیں طرف پہاڑی پر ایک ہجوم دیکھا، کچھ لوگ اوپر جا رہے تھے اور جو واپس نیچے اتر رہے تھے ان کے رنگ خوف سے اڑے ہوئے تھے۔ ہم بھی اوپر چلے گئے دیکھا تو دماغ مفلوج ہو گیا اور آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، محمد علی کی لاش برہنہ حالت میں ایسے پڑی تھی کہ اس کا عضو تناسل کاٹ کر اس کے منہ میں دیا ہوا تھا، لاش چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ:

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو!

اس بات کا گواہ کم از کم آدھا شہر تو ہوگا۔ ایک اور واقعہ جو میرے لیے ناقابلِ فراموش ہے! یہ تقریباً 1967ء کی بات ہے، ہم رحمت بازار (غلہ منڈی) میں رہتے تھے، گرمیوں کے دن تھے گھر کی چھتوں پر سونے کا رواج تھا، ایک رات تقریباً بارہ ایک بجے کے قریب ریلوے لائن کے پار دارالصدر سے چور چور کی آوازیں بلند ہوئیں، اس وقت قصبے کی آبادی کم تھی اور کھلی جگہ زیادہ تھی اس لیے دور کی چیز بھی آسانی سے نظر آ جاتی تھی، چنانچہ ایسے میں چوروں کا بچ کر بھاگنا مشکل تھا آوازوں کی وجہ سے اردگرد کی آبادی ڈنڈے لاٹھیاں لیے گھروں سے باہر نکل آئی، چار چوروں کا گروہ تھا جس میں دو احمدی نعمت اللہ اور غلام ربانی نامی تھے اور دو ربوہ سے متصلہ چمن عباس نامی گاؤں کے تھے، ایک کا نام شیرا اور دوسرے کا برکھا تھا۔ احمدی دونوں احباب تو پچھلی طرف بھاگ گئے مگر دوسرے دونوں ظاہر ہے چمن عباس کی طرف بھاگے تاکہ گھر تک جا سکیں مگر دونوں دھر لیے گئے، شیرا کو ریلوے سٹیشن کے پاس کھلی گراؤنڈ میں زمین پر لٹا دیا گیا اور اس کی ہڈی پسلیاں توڑ دی گئیں، برکھا

کو فیکٹری ایریا کے قریب گرا لیا گیا اور اس کی ٹانگوں کے نیچے اینٹیں رکھ کر اوپر سے دوسری اینٹیں مار کر اس کی ٹانگیں توڑ دی گئیں۔ اب ان کے اردگرد لوگوں کی ٹولیاں منظم طریق سے بیٹھی تھیں جن کو جماعت کے عہدیدار ہدایات دے رہے تھے جیسے کہ کوئی بڑی جنگ لڑی جانی ہو، اچانک چند نوجوان منج کی رسیاں لے کر آئے اور شیرے کے پاؤں سے شروع کر کے رانوں تک بڑی مہارت سے رسیاں کس دی گئیں، پھر ان پر لوٹے سے پانی ڈالا جاتا اور شیرے کی چیخیں آسمانوں تک جاتیں، امور عامہ کا عملہ بمعہ قیادت کے کھڑا تھا اور کھسر پھسر کے علاوہ کسی خاص حکم کا منتظر معلوم ہوتا تھا، ایک صاحب نے بتایا کہ پولیس آ رہی ہے اسی دوران ایک اور صاحب بھاگتے ہوئے آئے امور عامہ والوں سے کچھ بات ہوئی اور اشارہ کر دیا گیا، اس کے ساتھ ہی جماعت کے سدھائے ہوئے خداموں کی لاٹھیاں اٹھیں اور شیرے کا سر کچل دیا گیا، یہی لوگ بھاگ کر دوسری طرف گرائے گئے برکھے کی طرف گئے اور اسے بھی ہلاک کر دیا گیا، جو احمدی چور تھے بقول جماعت کے وہ پولیس سٹیشن تک پہنچ گئے جنھیں حراست میں لے لیا گیا اور یوں وہ بچ گئے، میری اس وقت چھوٹی عمر تھی، شیرے کا انجام میری آنکھوں کے سامنے ہوا تھا، ڈر ذہن میں ایسا بیٹھا کہ اکثر رات کو میں چیخیں مار کر جاگ اٹھتا۔ ایک لمبے عرصہ تک مجھے سونے سے قبل ٹانگ میں ایک کپڑے سے چارپائی کے ساتھ باندھ دیا جاتا تھا کہ کہیں رات کو ڈر سے میں بھاگ کر چھت سے نہ گر جاؤں، میرے علاوہ اس داستان کا پورا شہر گواہ ہے جس کے سامنے یہ قتل ہوئے۔

حقیقی اسلام کے دعویداروں کا اندازِ تربیت!

غالباً 1969ء کی بات ہے کہ رحمت بازار کے آخر میں بادی علی چوہدری کے والد چوہدری فرزند علی صاحب کی آٹے کی ایک چکی تھی جو کہ تین غیر احمدی بھائیوں، خان، عاشق اور سائیں نے ٹھیکہ پر لے رکھی تھی۔ جرم مجھے معلوم نہیں، بس اتنا پتہ ہے کہ امور عامہ کے کرتا دھرتا چند سائیکل سواروں کے ساتھ ہاکیاں اور لاٹھیاں ہاتھوں میں لیے تیزی سے وہاں آئے چکی میں داخل ہو کر سب گاہکوں کو باہر نکالا، دو بھائیوں خان اور عاشق کو بھی باہر نکالا اور سائیں کو اندر رکھ کر چکی کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ بس پھر کیا تھا ہاکیوں، ڈنڈوں اور گالیوں کے ساتھ سائیں کی دردناک چیخیں باہر کھڑے لوگوں کے سینے پھاڑ رہی تھیں، باہر دونوں بھائی دوہتڑیں مار مار کر رحم کی بھیک مانگ رہے تھے مگر بے سود۔ مشن مکمل کرنے کے بعد جب دروازہ کھولا گیا تو تمام کے چہرے پسینے سے شرابور تھے، اور ڈیتھ سکواڈ یہ کہتے ہوئے روانہ ہو گیا کہ اس کی تربیت کر دی گئی ہے۔ دونوں بھائیوں نے اپنے بھائی کی ادھ موئی لاش چارپائی پر ڈالی اور بین کرتے ہوئے چلے گئے۔ سائیں کی چوٹیں

اندرونی اور گہری تھیں، کچھ عرصہ بعد وہ مر گیا، اور اس کے بھائی ربوہ چھوڑ کر چمن عباس چلے گئے۔ اس بات کے بھی گواہ رحمت بازار کے بیسوں لوگ ہیں۔

میاں رفیع احمد!

میاں رفیع احمد خلافت کے مضبوط اور حقیقی حقدار کو جب دیوار سے لگا دیا گیا تو کئی بے گناہ اس ایک شخص کی وجہ سے شہر بدر کر دیے گئے۔ ایک ایسا وقت بھی آیا کہ جس شخص سے میاں رفیع احمد کی تعریف سنی گئی یا جس جگہ پر اس کا ذکر ہو گیا اس شخص پر مصیبتوں کے پہاڑ توڑ دیے گئے۔ ایک چھوٹی سی مثال دے رہا ہوں: رحمت بازار ربوہ میں ایک بیوہ عورت اپنے دو بیٹوں محمد اسلم اور محمد اشرف کے ساتھ رہ رہی تھی، غریب عورت تھی لوگوں کے گھروں میں برتن دھو کر اس نے بیٹوں کو پالا بڑا کیا۔ بیٹے بڑے ہوئے، ہمت اور محنت والے تھے، اسی بازار میں ایک پھٹے پر گرمیوں میں برف اور سردیوں میں کوئلہ بیچنے لگے۔ خدا نے ان کی سنی اور تھوڑی سی خوشحالی گھر میں آئی، ماں بھی خوش تھی کہ دن پھر گئے۔ ایک روز کسی نے ان کی برف کی دوکان پر میاں رفیع کی چند باتیں کر دیں، رپورٹ ہوئی اور خلیفۂ وقت کا حکم بذریعہ امور عامہ آ گیا کہ صبح کا سورج طلوع ہونے سے قبل شہر چھوڑ دو ورنہ جماعت کے اہلکار یہ خدمات انجام دیں گے۔ بیوہ عورت جس نے بڑی مشکل سے اچھے دن دیکھے تھے اور اکیلی احمدی تھی (اپنے خاندان میں) بہت روئی، پیٹی، چلائی، فریادیں کیں، سر پٹخا مگر بادشاہ سلامت کا حکم آخری تھا، چارو ناچار جو کچھ اٹھا سکے اٹھا کر فیصل آباد چلے گئے اور وہاں سے کراچی۔ جماعت سے قطع تعلق ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمتیں ان پر نچھاور کیں۔ بڑا بھائی دوبئی میں سپیئر پارٹس کا بزنس کر رہا ہے اور چھوٹا بھائی ''پی۔آئی۔اے'' میں ملازمت بھی اور کرکٹ کا شاندار کھلاڑی بھی۔ مجھے یہ بات آج تک سمجھ نہیں آئی کہ میاں رفیع احمد کا کردار اگر ایسا تھا کہ جو کوئی بھی اس کے ساتھ نظر آیا شہر بدر ہوا تو اتنے خاندانوں کو اجاڑنے کی بجائے (آپ کتنے بھولے ہیں میاں! وہ خاندان کا فرد ہے اور آپ سب جماعت کے غلام اور کمی کمین۔ ناقل) اس اکیلے رفیع کو شہر بدر کیوں نہ کر دیا گیا؟ پانی کے سینکڑوں ڈول کنویں سے نکال پھینکے گئے مگر کتا کنویں کے اندر ہی رہا۔ کوئی ہے جو اس پر روشنی ڈالے؟

یہ جو چند واقعات میں نے آنکھوں دیکھے بیان کیے ہیں، ایسی سینکڑوں داستانیں ربوہ کے رہنے والے جانتے ہیں۔ ظلم کی وہ کہانیاں جن کو سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں موجود ہیں۔ ایسے میں جماعت کے سربراہ جب ربوہ سے بھاگے اور لندن پناہ گزیں ہوئے تو ہر پریس کانفرنس اور میڈیا کے سامنے بڑے معصوم، مظلوم بن کر مگرمچھ کے آنسو بہاتے رہے۔ جب یہاں قدم جمے تو وہی

کارستانیاں یہاں بھی شروع کر دیں۔ کاش کہ یہ نہ بھولیں کہ اللہ تعالیٰ کی لاٹھی ان کو قادیان سے ہانکتی ہوئی براستہ ربوہ سے لندن لے آئی ہے اس سے آگے اب آپ کے لیے کوئی راستہ نہیں، بہتر ہے کہ اپنے آخری ایام میں اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کریں۔ ان ہزاروں لوگوں کو جنھیں آپ نے ذلیل کیا، بے گناہ قتل کرایا اور قتل کیا، ظلم اور زیادتیاں کی ہیں، معصوم بچیوں کو حرامی مغل شہزادوں نے تباہ کیا ہے، گھر بیٹھی ماؤں، بہنوں کو ایک حکم سے شہر بدر کیا ہے، اپنی جھوٹی انا کی خاطر لوگوں کا خون نچوڑا ہے ان سے معافی مانگیں اور خدا سے بھی، اپنی طرف سے اور اپنے بڑوں کی طرف سے بھی، ہے تو مشکل مگر ہو سکتا ہے اوپر والا رحم کر ہی دے۔ ثاقب زیروی کے چند اشعار حاضر خدمت ہیں شاید آپ ہی کے لیے اس نے لکھے تھے!

فرصت ہے کسے جو سوچ سکے پس منظر ان افسانوں کا
کیوں خواب طرب سب خاک ہوئے کیوں خون ہوا ارمانوں کا
تاریخ کے سینے میں اب تک ہیں دفن وہ سارے ہنگامے
انسان کے ہاتھوں دنیا میں کیا حال ہوا انسانوں کا
طاقت کے نشے میں چور تھے جو توفیق نظر جن کو نہ ملی
مفہوم نہ سمجھے جو ناداں قدرت کے لکھے فرمانوں کا
پستے ہیں بالآخر وہ اک دن اپنے ہی ستم کی چکی میں
انجام یہی ہوتا آیا فرعونوں کا ہامانوں کا!

❁……❁……❁

عالم کباب

طاغوت نگر کی باتیں

یہ اُن دنوں کی باتیں ہیں جب ربوہ (چناب نگر) میں جماعت احمدیہ کی حکومت تھی اور جماعت کے حکمران وہاں کے بے تاج بادشاہ تھے۔ انسان تو دور کی بات کوئی پرندہ بھی ان کی مرضی کے بغیر سانس نہیں لے سکتا تھا۔ کتنے ہی بے گناہ لوگ ان کے غیر انسانی سلوک کی وجہ سے ذلیل و خوار ہوئے بلکہ کچھ تو ملکِ عدم بھی سدھار گئے، کچھ ایسے بھی تھے جو زندہ بھی رہے تو نشان عبرت بن کر۔ ڈر اور خوف کی فضا حکمرانوں نے جان بوجھ کر بنائی ہوئی تھی کہ غلام کہیں آدابِ غلامی نہ بھول جائیں۔ میرا بچپن چونکہ اسی شہر میں گزرا اس لیے ان باتوں کی یادیں ہر وقت دل میں سمائی رہتی ہیں جو کہ بعض اوقات بے چین کر دیتی ہیں۔ شکر خداوند کریم کا کہ جماعت کے ناخداؤں سے 1974ء میں غلطی ہوگئی اور وہ سرکاری ٹرین پر حملہ کر بیٹھے، نتیجے طالب علموں کا خون ان کے وارثوں نے ضائع نہیں ہونے دیا اور پاکستان میں دور دراز بسے ہوئے احمدیوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی اور آخرکار اس شہر کو جماعتی حکمرانوں کے خونی پنجوں سے چھٹکارا مل گیا۔ حکمرانوں کو مظلوم احمدیوں کے جس شکار کی عادت پڑ چکی تھی وہ اب بھی ان کی رگوں میں موجود ہے اور وہ کبھی کبھی یورپ، امریکہ اور کینیڈا جیسے مہذب ممالک میں اب بھی اپنی اس فرعونیت کا مظاہرہ انسانیت کی تذلیل کر کے لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں۔ ایسی ہی ایک انسانیت کی تذلیل کا نظارہ چند سال قبل جلسۂ سالانہ جرمنی کے موقع پر اس وقت دیکھنے کو ملا جب سابق نیشنل نائب امیر جماعت جرمنی شکور اسلم جنھیں کہ شہنشاہِ وقت نے اپنا شوق پورا کرتے ہوئے نظام جماعت سے اخراج کی سزا دیتے ہوئے یہ اعلان کر رکھا تھا کہ احبابِ جماعت اس کی بری صحبت سے پرہیز کریں، اپنے گلے میں تختی لٹکائے گھومتے پھرتے نظر آئے جس پر جلی حروف میں لکھا ہوا تھا کہ احباب میرے لیے دعا کریں، اس نے ایسا اس لیے کیا کہ وہ نائب امیر رہ کر شہنشاہِ عالم کی منشاء اچھی طرح جانتا تھا اور بالآخر اس کی سرعام ذلالت سے خوش ہو کر بادشاہ سلامت نے اسے بہت جلد معاف کر دیا۔

جماعت کے پہلے خلیفہ حکیم نورالدین کے فرزند عبدالمنان عمر صاحب کے بارے میں

میاں محمود احمد قادیانی کو خیال پیدا ہوا کہ کہیں میرے بیٹے میاں ناصر احمد کے بجائے یہ خلیفہ نہ بن جائے، چنانچہ ان کا بائیکاٹ کر دیا گیا، بازار والوں کو سودا دینے سے منع کر دیا گیا، دودھ دینے والے کو روک دیا گیا، ان کے مکان کے اردگرد خدام (غنڈے) بٹھا دیے گئے جو عشاء کے بعد دیواریں پھاند کر ان کے صحن میں اتر کر رقص کرتے، شور شرابہ کرتے، غرض ہر طرح سے ان کا ناطقہ بند کر دیا گیا، ان کی اس کسمپرسی کے عالم کو دیکھ کر اللہ یار بلوچ نامی ایک شخص کے دل میں کچھ ہمدردی پیدا ہوئی اور جب وہ اپنا سودا لینے بازار جاتا تو ان کے لیے بھی کچھ لے آتا اور چوری چھپے ان کے گھر پہنچا دیتا۔ احمدیت یعنی حقیقی اسلام کے ٹھیکیداروں کو جب اس کی اس غیر اسلامی حرکت کی خبر پہنچی تو انھوں نے دن دہاڑے بھرے بازار میں مار مار کر اس کی پسلیاں توڑ دیں جب اس واردات کی پولیس میں اطلاع ہوئی تو مومنین کی اس بستی نے اپنی شانِ ایمانی کا اظہار یوں کیا کہ سب لوگ اس وقوعہ سے ہی منکر ہو گئے کہ ہمیں تو علم ہی نہیں کہ اس جگہ کوئی ایسا واقعہ ہوا ہے۔

جماعت کے تیسرے خلیفہ میاں ناصر احمد جب ربوہ میں تعلیم الاسلام کالج کے پرنسپل تھے تو خوبصورتی کے لیے بعض پھولدار پودے منگوا کر کالج میں لگوائے گئے، اتفاق ایسا ہوا کہ ایک روز ربوہ کے ایک فیروز نامی دھوبی کا بکرا وہاں آ نکلا اور اس نے ایک آدھ پودا خراب کر دیا یا کھا لیا۔ میاں صاحب نے اسے وہیں ذبح کروا کر اس کا گوشت تقسیم کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد دھوبی بھی بکرے کی تلاش میں ادھر آ نکلا اور دیکھا کہ بکرے کی روح اللہ تعالیٰ کے حضور اور اس کا گوشت میاں صاحب اور اردگرد کے لوگوں کا توشہ بن چکا ہے۔ وہ گم سم کھڑا تھا کہ میاں صاحب نے اسے ہلا کر پوچھا کہ یہ بکرا تمہارا تھا؟

اُس نے ڈرتے ڈرتے اثبات میں جواب دیا تو میاں صاحب جلالِ الٰہی کا مظہر بن کر اس پر برس پڑے اور پھر اسے دفتر امور عامہ بھجوا دیا، دفتر والوں نے اس کی خاطر تواضع کے بعد اسے مزید ستر روپے جرمانہ کر دیا۔ زمین کا کونہ کونہ چھان ماریئے، چراغ ہاتھ میں لیے اکنافِ عالم میں گھوم جایئے اس قسم کے اولیاء اللہ آپ کو احمدیت یعنی حقیقی اسلام کے دعویداروں کے سوا اور کہیں نہیں مل سکیں گے۔

آج مجھے ربوہ کا وہ ہونہار طالب علم رفیق باجوہ بھی یاد آ رہا ہے جس کا قصور صرف یہ تھا کہ بھٹو حکومت نے جب پرائیویٹ تعلیمی ادارے قومی تحویل میں لیے تو یہ اس وقت تعلیم الاسلام کالج ربوہ میں زیر تعلیم تھا، کالج تو حکومت نے اپنی تحویل میں لیا مگر ربوہ نے اپنی آہنی گرفت کالج پر مضبوط کی ہوئی تھی اور وہ قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کوئی بھی سہولت طالب علموں کو دینے سے

انکاری تھے۔ اس احمدی ہونہار طالب علم نے اس ناانصافی کے خلاف آواز بلند کرنا چاہی تو جماعتی اہلکاروں نے کالج میں ہی اسے پیٹ ڈالا۔ ساتھی طلبہ مشتعل ہو گئے اور انھوں نے ہڑتال کر ڈالی، معاملہ بڑھتا ہی گیا، یہ 12 دسمبر 1972ء کی سرد شام تھی کہ چار پانچ سو کے قریب لٹھ بردار خدام نے ان کے مکان کو گھیرے میں لے لیا جن کی قیادت ناظر امور عامہ ظہور باجوہ پروفیسر تعلیم الاحمدیہ کالج رشید غنی، پرنسپل طبیہ کالج عزیز ساجد، سمیع اللہ سیال، صدر خدام الاحمدیہ مرکزیہ حمید اللہ کر رہے تھے۔ خدام الاحمدیہ کو حکم دیا گیا کہ رفیق باجوہ جو کہ گھر کے اندر ہی موجود ہے اسے باہر نکالو اور نشانِ عبرت بنا دو، گھر والوں نے دروازہ نہ کھولا تو دوبارہ حکم ہوا کہ دیواریں پھلانگ جاؤ۔ خدام حکم بجا لاتے ہوئے گھر کی چار دیواری پر چڑھ گئے، گھر کی خواتین نے چیخ و پکار کے ساتھ مقابلہ کرنے کی کوشش کی، بھلا وہ کیسے اپنے جگر کے ٹکڑے کو قصابوں کے حوالے کرتیں! خدام دیواروں سے اتر کر پھر باہر کھڑے ہو کر شکار کا انتظار کرنے لگے، کسی نے پولیس چوکی ربوہ میں اطلاع کی تو پولیس نے مداخلت کرنے سے معذوری کا اظہار کیا، لالیاں تھانہ میں رابطہ کرنے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ ربوہ کے ٹیلی فون ایکسچینج آپریٹر نے فون کا رابطہ لالیاں سے کاٹ رکھا ہے، دو بجے رات کو پہرے کا زور کچھ کم ہوا تو رفیق باجوہ کسی نہ کسی طریقہ سے گھر سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گیا اور رات کا بقیہ حصہ ربوہ سے دور کسی بستی میں ٹھٹھرتے ہوئے گزارا۔ جب گھیراؤ کرنے والوں کو معلوم ہوا کہ یہ گھر کے اندر نہیں ہے تو انھوں نے گھر کا سارا سامان مکان سے باہر نکال کر سڑک پر رکھ دیا اور مکان کے دروازے مقفل کر دیے، گھر کی خواتین اور ان کے بوڑھے والد کو اسی وقت ربوہ سے نکل جانے کا حکم دے دیا گیا۔ بوڑھا شخص چنیوٹ سے ٹرک لایا اور باہر پڑا سامان لاد کر اپنے آبائی گھر چونڈہ چلا گیا، رفیق باجوہ بڑا قد آور، خوش رو، گورا چٹا اور کڑیل جوان تھا، احمدی خدام نے چونڈہ میں بھی اس پر قاتلانہ حملہ کیا مگر وہ بچ گیا، جس کا حکومتِ پنجاب نے سخت نوٹس لیا تو جماعت کو لینے کے دینے پڑ گئے۔ بعد میں سنا تھا کہ رفیق باجوہ کینیڈا چلا گیا۔ باقی انشاء اللہ پھر۔

اے ربوہ!

تیری یادوں سے رہائی کس طرح پائے کوئی
کس قدر مضبوط ہے حلقہ تری زنجیر کا

مولانا عبدالحیؒ

ہم نے بھی ربوہ دیکھا

غالباً 1958ء کی بات ہے، مرزائی روزنامہ الفضل (ربوہ) میرے زیر مطالعہ رہتا تھا۔ دل میں خیال آیا کہ ربوہ کا سالانہ جلسہ جسے قادیانی حج کا درجہ دیتے ہیں بچشم خود دیکھنا چاہیے اور امت مرزا اور ان کے کارناموں کا قریب سے مشاہدہ ہونا چاہیے۔ تب ربوہ میں کسی مسلمان کے بلا اجازت رہنے کا تصور بھی نہ تھا۔ چنانچہ میں نے پہلے ایک خط دفتر سالانہ جلسہ کو لکھا کہ:

-1 میں ایک سنی العقیدہ مسلمان ہوں، ختم نبوت کا قائل ہوں۔ کیا مجھے تمھارے سالانہ جلسہ میں شرکت اور شمولیت کی اجازت ہوگی؟

-2 چونکہ میں مسلمان ہوں، مجھے وہ ذبیحہ چاہیے جو ایک مسلمان کے ہاتھ کا ذبیحہ ہو۔ مرزائیوں کو میں غیر مسلم سمجھتا ہوں۔ کیا مجھے تمھارے شہر ربوہ میں کسی مسلمان کا ذبیحہ اور طعام میسر ہو سکے گا؟

-3 میں چونکہ ناواقف ہوں کیا ہوٹل یا سرائے یا قریب رہائش کے لیے کوئی مکان میسر آ سکے گا؟

-4 اور مجھے اپنی نماز اور عبادت ادا کرنے کی اجازت بھی ہوگی؟

یہ خط میں نے افسر جلسہ سالانہ کو ارسال کیا جو اس وقت مرزا طاہر تھا۔ مجھے مولوی عبداللہ تونسوی مولوی فاضل جو نائب افسر جلسہ سالانہ تھے، نے جواب بھیجا کہ:

-1 آپ بلا تامل جلسہ میں تشریف لائیں، کوئی رکاوٹ نہ ہوگی۔

-2 ہمارے جلسہ کا جملہ انتظام ٹھیکے داری سنی العقیدہ لوگوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے، آپ کو حلال ذبیحہ بلا تکلف ملے گا (واللہ اعلم یہ صحیح تھا یا نہیں)

-3 آپ ہمارے مہمان ہوں گے، آپ کو ہر قسم کی سہولت دی جائے گی۔ آپ کا نمبر آپ کو ارسال ہے۔

-4 آپ اپنی عبادات ادا کرنے میں آزاد ہوں گے۔

امت قادیانیہ کے اس نظم اور رواداری پر حیران ہوا، ارادۂ سفر کر لیا، اور مولانا قاری محمد عبداللہ صاحب (سابق خطیب مرکزی جامع مسجد اسلام آباد) میرے رفیق سفر تھے۔ ہم ملتان پہنچے جاتے ہوئے حضرت مولانا خیر محمد صاحب رحمتہ اللہ علیہ جالندھری شیخ الحدیث و مہتمم خیر المدارس کو ملنے کے لیے چلے گئے اور شرفِ ملاقات حاصل ہوا۔ حضرت کے پوچھنے پر جملہ پروگرام ان سے ذکر کیا۔ حضرت نے چنیوٹ میں مولانا محمد حسین کے نام خط دے دیا اور وہیں ٹھہرنے کی ہدایت فرمائی۔

براستہ لائل پور (فیصل آباد) ہم روانہ ہوئے۔ مرزائیوں کے زنانہ و مردانہ قافلے عقیدت سے ربوہ جا رہے تھے۔ اور بڑی مسرت و شادمانی ان کے چہروں پر تھی۔ اپنے خلیفہ کی زیارت کا شوق ان کو کشاں کشاں لیے جا رہا تھا۔ ان کی عقیدت اور فرطِ شوق کو دیکھ کر بے اختیار منہ سے نکلا:

لَقَدْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ.

ترجمہ: بیشک شیطان نے ان کے اعمال سنوار سجا کر پیش کیے ہیں۔

جمعہ کا دن تھا، ہم چنیوٹ پہنچے۔ رفقائے سفر کو معلوم نہ تھا کہ ہم مسلمان ہیں۔ ان کا اصرار تھا کہ ان کے ''حضرت صاحب'' کے پیچھے نمازِ جمعہ کا شرف حاصل کریں اور حضرت خلیفہ صاحب کی زیارت جملہ گناہوں کا کفارہ ہے وغیرہ وغیرہ۔ ہم نے کہا ہماری نماز وہاں نہیں ہوتی اور چنیوٹ اتر گئے۔ جمعہ ادا کیا۔ شام کو ربوہ چلے گئے اور واپس آ گئے۔

اگلے دن صبح ہفتہ کو ہم ان خطوط کو لے کر افسر جلسہ سالانہ کا شکریہ ادا کرنے گئے تو وہ ہمارے انتظار میں تھے، ہمیں خوش آمدید کہا اور ہماری بڑی آؤ بھگت کی اور اصرار کیا کہ آپ یہاں ٹھہریں۔ ہم نے بہت معذرت کی لیکن ان کا شدید اصرار تھا کہ کم از کم ان سے چائے پی لیں۔ چنانچہ ان کے ہمراہ کیفے فردوس میں گئے اور بڑی میز کے سامنے بیٹھ گئے۔ تقریباً چھ افراد جو مولوی فاضل یا گریجویٹ معلوم ہوتے تھے، ہمارے ساتھ چلے۔

میزبان کی عیاری و مکاری بھی دیکھی یا میزبان کی پختہ زناری بھی دیکھی۔ ہم آٹھ افراد میز کے گرد بیٹھ گئے۔ چائے پیسٹریاں، اشیائے خوردنی رکھی گئیں۔ اب ارشاد ہوا ذرا ٹیبل ٹاک تو ہونی چاہیے۔ مولوی عبداللہ (مرزائی) کہنے لگے میں بھی ڈیرہ غازی خان کا ہوں۔ ''حب الوطن من الایمان۔''

آپ ہمارے علاقہ اور ضلع کے ہیں۔ ہم نے کہا فرمائیے: ارشاد ہوا کہ ہمیں اسلام کا ایک فرقہ مان لو جس طرح دیوبندی، بریلوی حنفی، شافعی اہل حدیث وغیرہ ایک فرقہ ہیں (اور ہماری بڑی تعریف کرنے لگے کہ تم نے صاف صاف کہہ دیا کہ ہم غیر احمدی ہیں وغیرہ وغیرہ) ہم نے کہا فرمائیے! زبان مناظرانہ ہوگی یا پارلیمانی؟

جواب ملا: نہیں پارلیمانی اور محبت کی زبان ہو۔

ہم نے کہا جب تک درخت کا تنا ایک نہ ہو کبھی بھی متفرق شاخوں میں وحدت نہیں ہوتی۔ اگر کیکر کا درخت شیشم کے ساتھ کھڑا ہے، شاخیں ملی ہوئی ہیں تو وہ دونوں درخت علیحدہ علیحدہ کہلائیں گے کبھی بھی ایک درخت نہیں کہلائے گا۔ تمہارا اور ہمارا تنا (اصل بنیاد) متفرق ہے لہذا وحدت نہیں ہو سکتی تو پھر ہم آپ کو اسلام کا ایک فرقہ کیسے تسلیم کر سکتے ہیں؟

اس پر نائب افسر جلسہ سالانہ نے کہا: بنیاد یا تنا کیا ہے؟ اس کی تشریح کریں جبکہ ہم بھی تمہاری طرح اسلام کے مدعی ہیں۔

ہم نے کہا بنیاد (تنا) نبوت ہے، عیسائیت، یہودیت، اسلام نبوت کی بنیاد کی شاخیں ہیں ورنہ اہل کتاب ہونے میں یہ بھی مشترک ہیں خاص حالات میں اہل کتاب سے نکاح بھی جائز ہے لیکن وحدت نہیں ہے، چونکہ تمہارا نبی مرزا غلام احمد آنجہانی ہے، تم نے اپنا تشخص عام مسلمانوں سے علیحدہ کر رکھا ہے، تمھارے رشتے ناطے مسلمانوں سے نہیں ہوتے، تم مسلمانوں کا جنازہ تک نہیں پڑھتے، تمہاری عیدیں علیحدہ ہیں پھر کیا یہی وحدت ہے جس کی طرف تم بلاتے ہو؟

مولوی عبداللہ مرزائی نے کہا: ہم احمدی ہیں ہماری نسبت حضور کی طرف ہے۔ ہمارے نبی کا نام غلام احمد تھا وہ ظلی بروزی نبی تھے۔ حضور کے صدقہ اور طفیل ان کو نبوت ملی۔ یہ نبوت کے منافی نہیں ہے۔ ہم نے کہا: تمہارا احمدی ہونا ایک فریب ہے۔ تم نسبت مرزا قادیانی کی طرف کرتے ہو اور مرزا کا نام تو غلام احمد تھا۔ احمد مضاف الیہ ہے۔ نسبت مضاف کی طرف ہوتی ہے مضاف الیہ کی طرف نہیں۔ کیا عبداللہ کا باغ خدا کا باغ کہلائے گا؟ خلیفۃ اللہ کی بیوی مضاف الیہ کی بیوی کہلائے گی؟

مضاف اور مضاف الیہ میں تغایر ہوتا ہے اور موصوف صفت میں وحدت ہوتی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ احمد کوئی اور ہے اور غلام کوئی اور۔ اور غلام کبھی بھی اصل مسند پر جانشین نہیں ہو سکتا۔ اگر تمھیں مرزا آنجہانی کی طرف نسبت مطلوب ہے تو تم ''غلمدی'' تو کہلا سکتے ہو احمدی نہیں۔ نسبت ایک دھوکہ ہے جس سے تم یورپ اور ایشیا میں شکار کھیل رہے ہو۔

رہا مرزا کا ظلی بروزی نبی ہونا، یہ اسلامی عقائد کی اصطلاحات میں تحریف ہے، اس کا کوئی اصل ثابت نہیں۔

لَوْ كَانَ بَعْدِیْ نَبِیًّا لَكَانَ عُمَر (الحدیث)

وہاں ظلی بروزی کیوں نہیں فرمایا۔ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد دوسری نبوت کا تصور مطلق حرام ہے، اکمال دین کے خلاف ہے۔ اچھا بتایئے یہی مرزا قادیانی نبی تھے تو کوئی کارنامہ

بھی انجام دیا ہے؟

نائب افسر جلسہ سالانہ نے کہا: حضرت نے مسلمانوں کے اندر ایک فرسودہ مسئلہ حیاتِ مسیح چل رہا تھا اس کی وضاحت کی اور اس کو غلط بتایا تم تو علماء ہو ان کی ریسرچ کی داد دو۔

ہم نے کہا: آپ اس عمر میں کیوں دھوکہ دیتے ہیں۔ میں خطباتِ احمدی سرسیّد احمد خان مرحوم کو تازہ پڑھ کر آیا ہوں۔ سر ولیم میور کے جواب میں یہ تحقیق سرسیّد مرحوم کی ہے، یہ اس کا چبایا ہوا لقمہ ہے کچھ تو لحاظ کرو۔ اس پر ایک مرزائی مندوب نے کہا کہ حضرت نے نظام خلافت قائم کیا ہے اور میاں محمود احمد قادیانی ہمارے خلیفہ ہیں ہم ستر ہزار آدمیوں کو روٹی ایک وقت میں کھلا دیتے ہیں۔

اس پر میں نے کہا: میاں صاحب کے کارنامے تاریخ احمدیت میں پڑھے ہیں۔ مولانا عبدالکریم مباہلہ اور فخر الدین ملتانی کے مکتوبات بھی پڑھ چکا ہوں۔ کیا ان کارناموں پر تم فخر کرتے ہو یہ تمہارا نظام خلافت ہے؟ رہا ستر ہزار کو روٹی کھلا دینا یہ ٹھیکہ مجھے دے دو میں کھلا دوں گا۔

تیمور لنگ جب بایزید یلدرم کے مقابلے کے لیے گیا تھا تو نو لاکھ فوج ساتھ تھی وہ ان کو کتنی جلدی کھانا کھلا دیتا تھا اور سائنسی ترقی نہ ہونے کے باوجود کتنی جلدی سفر کر رہا تھا۔

بایزید یلدرم رحمتہ اللہ علیہ عیسائیت کے محاذ سے پلٹا اور اتنی تیزی سے فتوحات کر چکا تھا کہ اس کا لقب یلدرم (بجلی) پڑ چکا تھا۔

کیا اس دور میں نظام خلافت یہی تمہاری دلیل ہے؟

اس پر وہ لوگ چونک اٹھے، کہنے لگے اچھا جی چلیں ہم آپ کو تعلیم الاسلام کالج اور دیگر مقامات کی سیر کرائیں اور غیر ملکی مہمانوں سے متعارف کرائیں، بحث کو ہم ختم کرتے ہیں کیونکہ دکھتی رگ پر ہاتھ پڑ گیا تھا۔ اب ہمیں یہ بات واضح ہو گئی کہ یہ اخلاص و محبت کی دعوت نہ تھی بلکہ ہمیں شکار کرنا ہی مقصود تھا۔

اے کبک خوش خرام تو خوش می روی بناز
غرہ شو کہ گربہ زاہد نماز کرو

اب چونکہ ہم نے دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ بھلا (تاریخ احمدیت) اور فخر الدین ملتانی اور عبدالکریم مجاہد کے مضامین دیکھنے کے بعد کون ان کے فتنہ میں آ سکتا تھا اور کون ایسی خلافت کی حرکات اور دام تزویر میں پھنس سکتا تھا۔

مرزائیوں کے سالانہ جلسہ کا گراؤنڈ کافی وسیع و عریض تھا۔ تقریباً ستر ہزار سے ایک لاکھ تک سامعین و زائرین موجود تھے۔ رضا کار فورس نے جلسہ کا انتظام تھام رکھا تھا۔ عورتوں کے اجتماع

میں کافی گہما گہمی تھی "لجنہ اماء اللہ" نے (جو کالج کی اور سکولوں کی نوخیز اور جوان لڑکیاں تھیں) انتظامات سنبھال رکھے تھے۔

دفتر تبلیغ میں لوگ جوق در جوق چندہ دے رہے تھے۔ قصر خلافت میں خلیفہ سے ملاقاتیں ہو رہی تھیں۔ کالج اور سکولوں میں مہمان ٹھہرے ہوئے تھے اور ان سب کا خوردنی انتظام وہیں تھا سب لوگ نظم سے کھانا کھا رہے تھے۔

اب ذرا تفصیل ملاحظہ ہو:

ربوہ شہر پہاڑیوں میں گھرا ہوا ہے، مشرقی جانب دریائے چناب بہہ رہا ہے۔ یہ زمین آنجہانی نصر اللہ خان نے مرکزی حکومت سے انجمن احمدیہ کے نام کرا لی۔ یہ کروڑوں روپے کی جائیداد غالباً 3 پائی فٹ یا فی مرلہ کے حساب سے ان کو دے دی گئی۔ یہ شہر تقریباً پچاس ہزار کی آبادی پر مشتمل ہے۔ اس میں ایک مرلہ زمین کسی غیر کی نہیں جس پر خلیفہ قادیان قابض ہے۔

اس شہر میں فلک شگاف کوٹھیاں اور ایوان محمود، قصر خلافت، دفاتر، پریس، کالج، سکول اور تجارتی مراکز ہیں۔ جب کسی مرزائی کو زمین الاٹ کر دی جاتی ہے تو وہ تعمیر کرتا ہے تو وہ ملکیت بدستور انجمن احمدیہ کی رہتی ہے۔ وہ صرف قابض ہوتا ہے اگر وہ مذہب تبدیل کرے تو اس تعمیر شدہ مکان یا کوٹھی سے محروم ہو جائے گا۔ وہ مکین جب ملازمت یا کسی کاروبار میں چلا جائے گا تو کچھ فیصد آمدنی انجمن کو دینی پڑے گی۔ مرنے کے بعد قبرستان ٹیکس (بہشتی مقبرہ) کے لیے 1/10 حصہ جائیداد دینی پڑے گی۔ مرد، عورت، بچے، ملازم، تاجر سب پر ٹیکس (چندہ) لازم ہے۔

اب فرمائیے! یہ مجبور بندے جو ملازمت یا روزگار یا کسی جھانسے میں پھنس گئے ہیں کب اس دلدل سے نکل سکتے ہیں۔ پھر ان کے مستقبل کا کاروبار، شادیاں، مکانات، رشتہ داریاں ان سے ہو جاتی ہیں۔ ہم سوچتے تھے کہ شاید ہی کسی دن کا سورج ربوہ کو آزاد دیکھے گا۔ بھلا ہو مجلس احرار کا اور تحفظ ختم نبوت کا اور ان مظلوم طلباء کا جن کی قربانیوں سے اتنا ہوا کہ اب ربوہ میں مسئلہ ختم نبوت کا اعلان تو سنا جاتا ہے۔

حضرت امیر شریعت سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری رحمتہ اللہ علیہ کی جماعت مجلس احرار اسلام نے میں سب سے پہلے 1976ء میں اس سرزمین کفر پر مسلمانوں کی پہلی جامع مسجد قائم کی اور اب وہاں مسلمانوں کی کئی مساجد آباد ہیں جن سے توحید و ختم نبوت کے ایمان افروز نعرے بلند ہوتے ہیں۔

سارے ملک میں یہ واحد بدنصیب شہر ہے جو صرف اور صرف کفر کی ملکیت ہے۔ پرستارانِ حق نے کبھی سوچا بھی ہے کہ کس طرح مظلوم پھنس چکے ہیں اور کفر کے نظام نے اسلامی

سٹیٹ میں حق کی آواز کو مفلوج کر رکھا ہے، یہ حکومت کے اندر حکومت ہے۔ اسی ربوہ کی عدالت اپنی ہے۔ یہ پوپ (خلیفہ) جو اپنی من مانی کرتا ہے اور یہاں مذہب، اخلاق، عصمت، دولت اور تقدس پامال کیا جاتا ہے، اس کی نظیر شاید دنیا میں کہیں مل سکے۔ اگر اسی کی تفصیل میں جائیں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

انا للّٰہ وانا الیہ راجعون

جلسہ میں مقررین کے خطبات

مختلف عنوانوں پر تقریریں جاری تھیں۔ دوسرے دن شام تقریر کا عنوان تھا ''کمالاتِ مصطفیٰ'' اس تقریر پر تقریباً 14 لوگ حاضر ہوئے گراؤنڈ خالی رہا۔ لوگ چل پھر رہے تھے اور مقرر نے کوئی خاص دلسوزی اور عقیدت نہ دکھائی۔ دوسرے دن تقریر کا عنوان ٹھہرا ''کمالاتِ حضرت صاحب'' (مرزا غلام احمد) پھر کیا تھا گراؤنڈ بھر گیا، قطار در قطار لوگ آ رہے تھے اور سر دھن رہے تھے۔

یہ حالت دیکھ کر خود سمجھیں ایک مسلمان کے دل پر کیا بیتی ہوگی؟ سیّد الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کمالات سننے کے لیے تو کوئی شوق نہیں اور ظلی بروزی طفیلی پیغمبر کے لیے (بقول ان کے) یہ مجمع سر دھن رہا ہے۔ اس فریب کاری کو دیکھ کر ان کی تبلیغ اور خدمتِ اسلام کی حقیقت واضح ہو گئی۔ یہ لوگ تبلیغ اسلام کے نام پر یورپ، ایشیا، امریکہ، مشرقِ وسطیٰ میں پیسہ کماتے ہیں اور یہ ان کی حقیقت ہے۔

چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیر را

لوائے احمدیت کی پرچم کشائی

ظہر کے بعد خلیفہ صاحب تشریف لائے۔ آگے پیچھے محافظ فورس تھی۔ جس طرح ایک ہز ہائی نس (والیٔ ریاست) دربار میں تشریف لاتا ہے اور پھر لوائے احمدیت (مرزائیوں کا مخصوص جھنڈا یا علم) لایا گیا۔ خلیفہ نے اس کی پرچم کشائی کی۔ یہ منظر قابل دید تھا۔ بڑی عقیدت اور جوش سے مرزائی اس پر فریفتہ ہو رہے تھے۔ خلیفہ صاحب نے دیدار کرایا اور آخری تقریر کی۔ اس مصنوعی خلیفہ کے یہ عادات و اطوار قابل دید تھے۔

واقعی سچ ہے: زَیَّنَ لَھُمُ الشَّیْطٰنُ اَعْمَالَھُمْ. یہی وہ خلیفہ تھا جس کی داستانِ روحانیت تاریخ احمدیت وغیرہ میں مرقوم ہے، جس کے عینی شاہد مولانا عبدالکریم مباہلہ (سابق امام مسجد قادیان اور صحابیٔ مرزا) اور فخر الدین ملتانی، عبدالرحمٰن مصری اور ارکانِ جماعتِ لاہوری و کارکنانِ مجاہدین اسلام ہیں۔

سلطنت برطانیہ کی تدبیر اور ہماری غفلت نے آج یہ دن ہمیں دکھلائے۔

(اس لوائے احمدیت پر قادیان کا منارہ چھاپا ہوا ہے)

خبیث اصطلاح

عالم اسلام میں سرکارِ دو جہاں جناب آقائے کل محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بوجہ مدینہ شریف کے مکین اور متوطن ہونے کے مدنی کہا جاتا ہے اور ابتدائی زندگی اور پیدائش مکہ کی وجہ سے مکی کہا جاتا ہے۔ اب ذرا ان ائمہ تلبیس کی شقاوت ملاحظہ کریں کہ یہ لوگ مرزا غلام احمد کو ''حضرت قدنی'' کہتے تھے۔ چونکہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مدنی کہتے ہیں اس کے مقابل یہ مرزا کو قادیان کی نسبت سے اور حضور کے تقابل کے پیش نظر ''مرزائے قدنی'' یا حضرت قدنی کہہ کر پکارتے ہیں۔

حالانکہ قادیانی تو نسبت ہوسکتی ہے قدنی کہاں؟ کیا یہ طفیلی کی شان ہے کہ اصل کے مقابل اعزاز حاصل کرے؟

یہ اسلام کے باغی، نبوت نبوی کے منکر، نئی نبوت کے قائل حضور کے دشمن تو ہو سکتے ہیں تابعدار نہیں۔ ہمارا ایمان تو حضرت مدنی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ہے۔ ہم قدنی کی نبوت کو کفر اور لعنت سمجھتے ہیں اور اس اصطلاح کو بغاوت تصور کرتے ہیں (اعاذنا اللہ منہم) بلکہ یہ طبقہ یہاں تک چلا گیا ہے کہ قاضی ظہور الدین اکمل مرزائی شاعر ہے وہ اپنے جذبات کو اس انداز میں بیان کرتا ہے:

محمد پھر اتر آئے ہیں ہم میں
اور آگے سے ہیں بڑھ کر اپنی شان میں
محمد دیکھنے ہوں جس نے اکمل
غلام احمد کو دیکھے قادیان میں

(اخبار بدر قادیان 25 اکتوبر 1906ء)

بلکہ مرزا آنجہانی کی بیوی کو (نعوذ باللہ) ام المومنین کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔

امہات المومنین کے متعلق ارشادِ خداوندی ہے:

لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ.

''احد'' نکرہ ہے اَلنِّسَآء معرف باللّام ہے، الف لام استغراق کا ہے۔ یعنی دنیا کی کوئی بھی عورت تمھارے برابر نہیں (خواہ سیّدہ مریم خواہ آسیہ خواہ سیّدہ فاطمہؓ کیوں نہ ہوں) یہ مرزائی ام المومنین ایسی ہے جس سے جھنڈا سنگھ (سکھ) روایت کرتا ہے یہ نسبت اور یہ حدیث اور یہ تعلق ہم اس

کی تہہ کونہیں پہنچ سکتے۔ دریں ورطہ شد غرق کشتی ہزار،

خدا جانے اندرونِ خانہ کیا کیا ہے
مسجد اقصیٰ بھی ہے بہشتی مقبرہ بھی

مرزائیوں کی فریب کاری

غیر ملکی یا ملکی مہمان جب بھی ان کے مہمان خانہ پہنچتے ہیں تو پہلے ان کو تبلیغ اسلام کرتے ہیں۔ یہ تصور دلاتے ہیں کہ ہم نے یورپ، ایشیا، افریقہ، مشرقِ وسطیٰ میں عیسائیت کے مقابل محاذ قائم کر رکھا ہے اور اس قسم کا لٹریچر پیش کرتے ہیں۔ ہمہ قسم کی مہمان نوازی کے بعد اگر ملازمت یا تعلیم یا تجارت یا رشتہ کی ضرورت ہو تو امداد کی پیش کش کرتے ہیں۔ پھر ایسا جال میں پھنساتے ہیں کہ اس سے نکلنا مشکل ہو جاتا ہے۔

یَکِیْدُوْنَ کَیْدًا کی عملی تصویریں ہیں۔

اس سلسلہ میں جب ہم گھر پہنچے تو ربوہ سے خط ملا کہ آپ اپنے تاثرات بھیجیں۔ فرمایئے! ہمارا کیا تعلق؟ آئے اور گئے۔ مقصد یہ تھا کہ اگر کوئی عنوان ایسا ملے گا جس میں ہماری مہمان نوازی کی یا تبلیغ کی یا نظام کی یا ہماری اجتماعیت کی تعریف ہوگی تو اسے خوب اچھالیں گے، دوسرا تعلق پیدا ہو جائے گا آئندہ ہوسکتا ہے کہ شکار ہاتھ آجائے۔

لیکن میں نے جواب میں واضح لکھا کہ تم ایک شاطر وکیل کی طرح ہو جو موکل کو باتوں باتوں میں الجھائے رکھتا ہے اسے مقصد سے ذرا بھی تعلق نہیں ہوتا۔ یورپ اور دیگر غیر ممالک میں تم نے اسلام کے نام پر بھاری چندے وصول کیے۔ وہاں انجمن احمدیہ کو ایک اسلامی انجمن قرار دیا۔ ربوہ کو ایک اسلامی جماعتی مرکز قرار دیا ورنہ حقیقت میں تمھیں مرزائے قدنی سے جو ربط ہے وہ سرکار مدنی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے نہیں۔ اس کا منہ بولتا ثبوت وہ جلسہ اور لوائے احمدیت اور تحریک خلافت ہے جسے چشم گنہگار نے بچشم خود ملاحظہ کر لیا۔

لاکھوں غریب، بے کس، طلباء، ملازمین سادہ لوح ان کے فریب میں آچکے ہیں۔ خدا بھلا کرے مجلس احرار اسلام کا اور حضرت سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری کا اور کارکنانِ تحریک تحفظِ ختم نبوت کا، اور دیگر علماء کا جنھوں نے اس فتنہ کو واضح کیا ہے اور ان کو کافر قرار دلوایا۔ اگرچہ قانون تو بن گیا، لیکن زیرِ زمین یہ آگ بدستور جل رہی ہے اور اپنی لپیٹ میں کئی سادہ لوحوں کو لے رہی ہے۔ ہمیں اس سے ہوشیار رہنا چاہیے۔

رفیق ڈوگر

ربوہ کے بازار میں

کسی بستی یا شہر کی اخلاقی اور اقتصادی حالت کے ٹھیک اندازہ کے لیے اس کی عبادت گاہوں اور بازاروں کا چکر لگانا ضروری ہوتا ہے۔ اپنا سامان ربوہ کی جامع احمدیہ کے ہوسٹل کے ایک کمرہ میں رکھنے کے فوراً بعد ہم اپنے گائیڈ کی رہنمائی میں اس چکر میں پڑ گئے۔ ہوسٹل سے ملحقہ جامعہ احمدیہ کی عمارت ہے جس میں قادیانی جماعت کے عقائد اور مذہب کی تبلیغ کے لیے مبلغ تیار کیے جاتے ہیں۔ میٹرک پاس طلباء کو جو اپنی زندگیاں جماعت کے لیے وقف کرنے کا حلف لیتے ہیں، اور جماعت انھیں تکمیلِ تعلیم کے بعد اپنی مرضی اور پسند کے مطابق استعمال کرتی ہے۔ جماعت کے خرچ پر وہاں پر قدیم و جدید علوم کی تربیت دی جاتی ہے۔ عربی اور انگریزی کے علاوہ انھیں دیگر بیرونی زبانوں خاص طور پر افریقی ممالک کی زبانوں کی بھی تعلیم دی جاتی ہے۔ کیونکہ جماعتِ قادیان افریقہ کے پسماندہ اور بے دین عوام تک ''نور'' پہنچانے پر خاص زور دے رہی ہے، بلکہ جب سے پاکستان میں انھیں غیر مسلم قرار دیا گیا ہے، وہ سارا زور اسی پر دے رہی ہے۔ سالانہ جلسہ کے موقع پر شائع کردہ لٹریچر میں جماعت کے موجودہ سربراہ مرزا ناصر احمد کے بیرونی دورہ کی جو تفصیل دی گئی تھی، اس میں انھیں پاکستان سے باہر پریس کانفرنس سے خطاب کرتے، احمدیہ سکولوں کے بچوں سے ملتے اور ''مسجد'' کا افتتاح کرتے تو دکھایا گیا تھا، مگر پاکستان میں ان کے ''نور'' پھیلانے کے پروگرام کی کوئی تفصیل یا تصویر شامل نہیں تھی۔ جامعہ میں بیرونِ ربوہ سے آنے والے افراد کو اجتماعی کھانا تقسیم کیا جا رہا تھا۔ ربوہ شہر کی ترتیب و تعمیر جماعت کے طریقِ کار اور پروگرام کو سامنے رکھتے ہوئے کی گئی ہے۔ ہر عمارت سالانہ جلسہ کی ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے بنائی جاتی ہے کہ اس جلسہ میں ہر قادیانی کی شمولیت ضروری سمجھی جاتی ہے۔ مرزا ناصر احمد کے خطبۂ افتتاحیہ سے اندازہ ہوا کہ ہر سال اس سلسلہ میں ایک سروے رپورٹ تیار کرائی جاتی ہے اور جلسہ سے پہلے تمام قادیانیوں تک جلسہ میں شمولیت کے احکام پہنچائے جاتے ہیں اور ان کی یقین دہانی کی روشنی میں پہلے سے اندازہ کر لیا جاتا ہے کہ اس بار جلسہ میں کتنے قادیانی آئیں گے اور اس کے مطابق انتظامات کیے جاتے ہیں اور حاضری لی جاتی

ہے۔ مسجدیں، سکول، کالج، دفاتر سب عمارتیں دوہرے مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے بنائی گئی ہیں۔ اس بار سکول اور کالج کھلے تھے کیونکہ بقول مرزا ناصر احمد حکومت کے زور دینے پر بوجوہ جلسہ کی تاریخیں بدل دی گئی ہیں اور مقررہ وقت سے پہلے جلسہ کیا جا رہا ہے اس لیے جماعت کے قومی تحویل میں لیے گئے کالجوں اور سکولوں کی عمارتیں اس دفعہ پہلی بار انھیں جلسہ کے لیے استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی، جس کی وجہ سے انھیں خاصی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ کھلے میدانوں میں شامیانے لگائے گئے تھے اور خصوصی عمارتوں کو بھی آنے والوں کو ٹھہرانے کے لیے استعمال کیا جا رہا تھا۔ ہمارے گائیڈ نے بتایا کہ ''یہ مشکل عارضی ہے'' آئندہ سال تک متبادل بارکیں مکمل ہو جائیں گی۔'' جلسہ میں آنے والے افراد کے ضلع وار قیام کی جگہیں پہلے سے مقرر تھیں۔ ہر کسی کو پہلے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے کس جگہ ٹھہرنا ہے، وہاں کون ڈیوٹی پر ہوگا، کھانا کہاں سے لینا ہے وغیرہ۔ یہ سب تفصیلات انھیں پہلے ہی پہنچا دی جاتی ہیں۔ کارکنوں اور رضا کاروں کے ڈیوٹی چارٹ اوقات اور پروگرام جلسہ سے کئی ماہ پہلے شائع کر کے ہر جگہ پہنچا دیے جاتے ہیں، جن کی مدد سے ہر کوئی اپنی مقررہ جگہ پر پہنچ جاتا ہے اور اپنے مرتبہ اور درجہ کے مطابق، کمرہ، چارپائی یا اجتماعی قیام گاہ کے فرش کے لیے پرالی اور کھانے کی چٹ حاصل کر لیتا ہے۔ کھانے کی تقسیم میں بھی قادیانی ''مساوات'' کو سامنے رکھا جاتا ہے۔ کھانے کے کم از کم تین درجے ہوتے ہیں۔ اعلیٰ کھانا، درمیانی کھانا اور عام کھانا جو اعلیٰ، درمیانہ اور عام درجہ کے قادیانیوں کو فراہم کیا جاتا ہے۔ سڑکوں کے دونوں طرف خیموں کی قطاروں سے گزرتے ہوئے ہم جلسہ گاہ پہنچے جہاں سے ابھی تک دمادم کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ربوہ کی سب سے بڑی اور ہمارے گائیڈ کے مطابق خصوصی ''مسجد'' کے سامنے سٹیڈیم کی طرز پر تیار کی گئی جلسہ گاہ کے سٹیج کو آراستہ کیا جا رہا تھا۔ ہم ''مسجد'' میں داخل ہوئے تو اندر ''نمازیوں'' کی بجائے جلسہ میں شمولیت کرنے والوں کا قبضہ تھا۔ عشاء کی نماز کا وقت تھا۔ مگر وہاں جماعت کا اہتمام نہیں تھا۔ ''مسجد'' سے نکل کر ہم یہ دیکھنے کے لیے بازار کی طرف چل دیے کہ ربوہ کے بازار میں کیا کیا بکتا ہے اور یہ جان کر حیران ہوئے کہ ربوہ کے بازار میں سب کچھ بکتا ہے جو عام بازاروں میں بکا کرتا ہے اور اسی نرخ سے بکتا ہے۔ قادیانی دکاندار بھی باہر سے آنے والوں کو حسب توفیق لوٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم نے سن رکھا تھا کہ ربوہ کے بازاروں میں کوئی سگریٹ نہیں پی سکتا۔ مگر سگریٹ پینا تو ایک طرف وہاں سگریٹ بک بھی رہے تھے۔ ثبوت کے لیے ہم نے بلاضرورت سگریٹ خریدے، اور وہ بھی بلیک نرخوں پر۔ بازار میں جو چیز سب سے زیادہ بیچی اور خریدی جا رہی تھی وہ ''**الیس اللہ بکاف عبدہ**'' کی انگشتری تھی۔ جگہ جگہ سٹالوں پر، دکانوں میں اس قرآنی آیت والی قسم قسم کی

انگشتریاں، لاکٹ، بیج وغیرہ فروخت ہو رہے تھے۔ جلسہ کے سلسلہ میں شائع ہونے والے قادیانی جماعت کے رسالوں میں ان کے اشتہار تھے۔ ہمیں بتایا گیا کہ جماعت کے بانی کے والد کی وفات پر جب وہ غمزدہ تھے، خواب میں یہ پہلی ''بشارت'' دی گئی تھی کہ ''کیا اللہ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں ہے؟'' اس لیے اس پہلی ''وحی'' کو قادیانی کندہ کر کے پہنتے ہیں اور یہ ان کی پہچان سی بن گئی ہے کہ کسی قادیانی کا اپنی پہچان کے لیے دوسرے کو انگشتری دکھا دینا ہی کافی ہوتا ہے۔ ہم نے ربوہ کا یہ تحفہ دکھانے کے لیے خریدا مگر بہت مہنگا۔ کاروباری قادیانی اپنے روحانی سربراہ کی ''وحی'' کو بھی نفع کے لیے بیچتے ہیں۔ سنا ہے ایک زمانے میں یہ چیزیں مفت تقسیم کی جاتی تھیں۔ ربوہ کے بازاروں میں کوئی غیر قادیانی دکان نہیں کھول سکتا۔ کیونکہ ربوہ کی ساری زمین جماعت کے نام پر حکومت سے لمبے پٹہ پر حاصل کر کے اور شہر کا نقشہ منظور کرا کر تیار کی گئی ہے۔ پہاڑوں کے دامن میں میلوں تک پھیلے ہوئے اس شہر کو کھلا قرار دینے کے باوجود وہاں پر کسی مسلمان کے نہ جا سکنے کی یہی وجہ ہے کہ وہ نہ دوکان حاصل کر سکتا ہے نہ مکان۔ ربوہ کی حدود ختم ہونے پر ایک نئی آبادی مسلم کالونی آباد کی جا رہی ہے مگر اس کا جھگڑا ابھی عدالتِ عالیہ تک پہنچ چکا ہے۔ وہاں پر ہمیں لاہور کے بعض طلبہ بھی ملے اور مل کر خوشی ہونے کی بجائے پریشانی ہوئی۔

ایک جدید طرز کی عمارت پر لائبریری کا بورڈ دیکھ کر ہم اندر چلے گئے۔ باہر نوٹس لگا تھا کہ جلسہ کے دنوں میں لائبریری بند رہے گی۔ مگر ہمارے ساتھی نے ہمیں بتایا کہ ان کے ایک عالم جنھیں ہم نے ایک زمانہ میں عالم سمجھ کر پڑھا بھی تھا، اندر ہوں گے۔ پچھلے دروازہ سے ہوتے ہوئے ہم تاریخ قادیانیت جسے وہ ''تاریخ احمدیہ'' لکھتے ہیں کے شعبے میں پہنچے تو وہ بڑے جوش وخروش سے باہر سے آنے والے قادیانیوں کو قادیانیت کی سچائیوں کا مزید قائل کرنے میں مصروف تھے۔ ان کی میز پر رکھے ہوئے لیمپ، دیوار سے لگے ہوئے کلاک اور اکثر اشیاء پر لکھا تھا۔ ''عطیۂ فلاں۔'' ہمیں یاد آیا کہ ننکانہ کے گوردوارہ جنم استھان میں بھی اسی طرح عطیہ دینے والوں کے نام کندہ کیے جاتے ہیں۔ فرش کی اینٹوں تک پر لکھا تھا کہ یہ حصہ فلاں سنگھ نے یا فلاں کور نے بنوایا۔ اس طرح دیکھنے والوں میں ''عطیہ'' کی تحریک بیدار ہوتی ہے۔ ہماری بلا اجازت مداخلت سے بھی ان کا جوش کم نہیں پڑا، بلکہ ہمیں دیکھ کر خاص طور پر جان کر ان کے جوش وخروش میں مزید اضافہ ہو گیا، اور وہ ہمیں بھی حقائق سے یک طرفہ آگاہ کرنے میں مصروف ہو گئے۔ اور جب تک ہم ان کے کمرے میں رہے مصروف ترین رہے مگر معلوم نہیں کیوں ہم ان کے علم سے کوئی زیادہ متاثر نہ ہو سکے ورنہ علم کی یہ سب سے بڑی خصوصیت ہے کہ وہ جاہل پر خاص طور پر ہم جیسے یک طرفہ جاہل پر زہر قاتل بن کر اثر انداز ہوا کرتا

ہے۔ ہم نے محسوس کیا ہے کہ علم سے متاثر کرنے کے لیے ساتھ انداز کا ہونا بھی ضروری ہوتا ہے۔ اچھا علم اور اچھا انداز، اور جوش کے ساتھ ہوش بھی بحال رہنا چاہیے۔ وہ ہم سے تو کیا ناراض ہوتے، نوائے وقت سے بھی ناراض تھے۔ اور جو دل میں آیا کہتے گئے۔ ہم کہنے کی بجائے سننے گئے تھے، اس لیے سنتے رہے، مسلمان قادیانیوں کو ہی نہیں آپس میں ایک دوسرے کو بھی کافر قرار دیتے رہے ہیں۔ ہمیں فرقۂ قادیان کے بانی کی ایک ''وحی'' کے حوالہ سے بتایا گیا کہ پندرھویں صدی ہجری ان کی صدی ہے۔ اس صدی میں ہر طرف وہی ہوں گے اور وہ صدی شروع ہونے والی ہے۔ اس لیے وہ ہرگز مایوس یا ناراض نہیں ہیں۔ انھیں پختہ یقین تھا کہ یہ پیش گوئی ضرور پوری ہوگی۔ جس طرح مرزا ناصر احمد کے دورۂ امریکہ کی پیش گوئی پوری ہوئی ہے، یا قیام پاکستان کی۔ ہم اب تک یہی پڑھتے آئے ہیں کہ پاکستان برصغیر کے مسلمانوں کی صدیوں کی جدوجہد اور قربانیوں کی وجہ سے قائم ہوا ہے۔ اس کا سہرا قائداعظم کی قیادت اور مسلمانوں کی جماعت مسلم لیگ کے سر ہے۔ اس کا نظریہ اقبالؒ نے دیا تھا اور اس کا نام چودھری رحمت علی نے تجویز کیا تھا، اور اس مقصد کے حصول کے لیے لاکھوں افراد نے قربانیاں دی تھیں مگر وہاں پر ہم پر یہ راز فاش ہوا کہ پاکستان تو مرزا قادیان کی ایک ''وحی'' کے نتیجہ میں قائم ہوا تھا۔ 1902ء میں انھیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ''خوشخبری'' دی گئی تھی کہ ہم تمھیں ''ایک زمین دیں گے'' اور وہ زمین یہ پاکستان ہی تو ہے۔ مرزا ناصر احمد کے حالیہ دورۂ امریکہ کو ان کے والد مرزا بشیر الدین محمود کی ایک پیشین گوئی کا نتیجہ لکھا گیا ہے۔ دورہ کی رپورٹ میں ہم نے پڑھا کہ ایک دفعہ مرزا غلام احمد مرزا بشیر الدین محمود کو خواب میں ملے اور بتایا کہ میں پانچ سال تک امریکہ میں رہنے کے بعد اب بخارا جا رہا ہوں اور وہ پانچ سال امریکہ میں قیام کا اشارہ مرزا ناصر احمد کے دورۂ امریکہ کی طرف تھا جو پورا ہوا۔

کافی رات گئے ہم لائبریری سے باہر آئے تو بازاروں میں میلہ کا سا سماں تھا۔ چاروں طرف صبح کے جلسہ کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ لوگ آ رہے تھے۔ سڑکوں پر استقبالیہ دروازے کھڑے کیے جا رہے تھے۔ ان پر بینر اور نعرے لکھے جا رہے تھے، جیسے کسی بیرونی سربراہِ مملکت کی آمد کے موقع پر لاہور کی مال پر تیاریاں کی جاتی ہیں۔ دوکانوں پر ابھی تک خریداروں کا ہجوم تھا۔ ہم نے بعض لوگوں سے آئین میں ترمیم کے ذریعہ ان کو اقلیت قرار دینے کا ردعمل معلوم کرنا چاہا مگر وہ اس کو نہایت خوبصورتی سے ٹال جاتے تھے، جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ لیکن ذرا گہرا جائیں تو ان کے اندر کے کرب کا خود بخود اندازہ ہوتا تھا۔ بات آگے بڑھے تو لبوں کی مسکراہٹ تلخی میں بدل جاتی تھی۔ ہم نے کہا کہ جماعتِ قادیان نے سیاست کے میدان میں اپنی قوت کا مظاہرہ کر کے اس پرانے مطالبہ کو

جلد پورا کرنے کا خود بخود جواز پیدا کیا تھا مگر وہ اس سے اتفاق نہیں کرتے۔

پروگرام کے مطابق جلسہ صبح ساڑھے نو بجے شروع ہونا تھا، ہم جلسوں اور خاص طور پر مذہبی جلسوں کے تجربہ کے پیش نظر ذرا جلدی جلسہ گاہ کی طرف روانہ ہوئے کہ عقیدتمندوں کے ہجوم میں ایسا نہ ہو جگہ ہی نہ ملے۔ جلسہ گاہ کی طرف جانے والی سڑکوں کے دونوں طرف پیدل چلنے والوں کو قادیانی جماعت کے رضا کار کنٹرول کر رہے تھے۔ ان کے نظم وضبط کا یہ حال تھا کہ سڑکیں درمیان سے بالکل خالی تھیں اور گاڑیاں بلا کسی رکاوٹ کے چلی جا رہی تھیں، ایک اندازے کے مطابق جلسہ کے موقع پر ملک بھر سے ڈیڑھ سو کے قریب کاریں وغیرہ ربوہ آئی تھیں۔ ہمیں بتایا گیا کہ پیدل چلنے کا یہ انداز بھی ہمیشہ کی تربیت کا نتیجہ ہے۔ ربوہ میں ہر آنے والے کو معلوم ہوتا ہے کہ جلسہ گاہ کی طرف جاتے اور واپس آتے وقت سڑک کے بیچ نہیں چلنا ۔نظم کا اندازہ اس سے کیجئے کہ پیدائش ہی کے وقت ہر قادیانی بچہ اطفال احمدیہ تنظیم کا خود بخود رکن بن جاتا ہے اور پندرہ سال تک اس کا رکن رہتا ہے اور تربیتی اور دینی کورس مکمل کرتا ہے۔ پندرہ سال سے چالیس سال تک کا ہر قادیانی خدام احمدیہ کا رکن ہوتا ہے اور چالیس سال سے بڑی عمر کے تمام قادیانی انصار اللہ تنظیم کے ارکان ہوتے ہیں۔ ان سب تنظیموں کے اپنے اپنے دفاتر ہیں، اور اپنے اپنے تربیتی پروگرام ہوتے ہیں۔ جلسہ کے لیے ٹریفک پولیس کا عملہ بھی آیا تھا مگر وہ سڑکوں کے بیچ اور چوراہوں پر ''گواچی گاں'' کی طرح کھڑے تھے۔ انھیں جیسے نہ کوئی جانتا تھا اور نہ کوئی مانتا تھا۔ ٹریفک رضا کاروں کے اشاروں پر چل رہی تھی۔ جلسہ گاہ ''بڑی مسجد'' کے سامنے بنائی گئی تھی، مسجد کی مشرقی دیوار اور جلسہ گاہ کی مغربی دیوار کے درمیان چند گز کا فاصلہ چھوڑا گیا تھا، سٹیج تک مرزا ناصر احمد کی بلٹ پروف گاڑی کے جانے کے لیے اس درمیانی حصہ میں وہی قادیانی جا سکتا تھا جس کو خاص سکیورٹی کارڈ جاری کیا گیا ہے، دونوں طرف سخت پہرہ تھا۔ جلسہ گاہ کی دیواریں سٹیڈیم کی طرز پر اٹھائی گئی تھیں، جن کی سیڑھیوں پر بچے بیٹھے تھے۔ داخلہ کے دروازوں پر بھی محافظ کھڑے تھے، اندر سٹیج کے دونوں طرف خصوصی داخلہ کے کیبوں کے سامنے کرسیاں بچھائی گئی تھیں، اور اس کے آگے زمین پر مونجی کی پرالی بچھی ہوئی تھی، ایک خاص بات یہ تھی کہ پوری جلسہ گاہ کو چھوٹے چھوٹے جنگلوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا، لکڑی اور رسیوں کے جنگلے جن میں داخلہ کا صرف ایک ہی راستہ تھا اور ہر جنگلہ کے اندر ایک رضا کار بیٹھے ہوئے سامعین کے درمیان کھڑا تھا، ہمیں بتایا گیا کہ یہ اہتمام حاضرین شماری کے لیے کیا گیا ہے۔ جیسے ہی جلسہ ختم ہوگا، تمام رضا کار اپنے اپنے جنگلوں میں بیٹھے ہوئے قادیانیوں کی اصل تعداد سے مرکزی دفتر کو آگاہ کر دیں گے اور اس طرح مرزا ناصر احمد کو پتہ چل سکے گا کہ ان کی تقریر کتنے قادیانیوں نے سنی، مگر بعد

میں یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ جنگلہ بندی حفاظتی اقدام کے پیش نظر بھی کی جاتی ہے۔ سٹیج کے گرد بھی اسی قسم کا جنگلہ تھا اور اس کے ساتھ ساتھ رضا کار کھڑے تھے۔ سٹیج کے اوپر جس جگہ سے مرزا ناصر احمد کو تقریر کرنا تھی وہاں بلٹ پروف قد آدم حفاظتی دیواریں کھڑی کی گئی تھیں۔ سٹیج کے کناروں پر بھی محافظ چوکس کھڑے تھے۔ اس سے پیچھے مسجد پر اور مسجد کے پیچھے پہاڑی پر سب جگہ رضا کار کھڑے نگرانی کر رہے تھے۔ مسجد میں داخلہ پر بھی پابندی تھی۔ لاؤڈ سپیکر پر اعلانات کے علاوہ قادیانی جماعت کے بانی کا ''کلام'' نرم و نازک بھی پیش کیا جا رہا تھا۔ موصوف ''مسیحِ موعود'' ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر بھی تھے۔ اس کے بعد باہر سے آنے والوں کو ملک بھر کے ان قادیانیوں کے ناموں سے آگاہ کیا گیا، جو اس سال کے دوران اپنی حلال کی کمائی کے زور سے جنت پہنچنے میں کامیاب ہوئے ہیں، کمائی خواہ کیسی ہی ہو قادیانی عقیدہ کے مطابق اگر کوئی مرنے والا اپنی جائیداد کا ایک مقررہ حصہ جماعتِ احمدیہ کے نام کر جائے تو وہ اسے ''بہشتی مقبرہ'' میں دفن کرنے کی اجازت دے دیتے ہیں اور بانی جماعت کے حکم کے مطابق جو کوئی بھی اس مقبرہ میں دفن کیا جائے گا وہ جنت میں لازماً پہنچ جائے گا۔ قیام پاکستان سے پہلے یہ ''بہشتی مقبرہ'' قادیان میں تھا، اب ربوہ میں اس کا متبادل تیار کیا گیا ہے۔ نو بج کر دس منٹ پر مرزا ناصر احمد سٹیج پر نمودار ہوئے تو جلسہ گاہ سے اسلام زندہ باد، احمدیت زندہ باد، اور انسانیت زندہ باد کے نعرے لگائے گئے، سڑکوں پر جلسہ گاہ کی طرف رواں دواں ''ہزاروں'' افراد کی وجہ سے انھوں نے مزید انتظار کرنے کا اعلان کیا اور بیٹھ گئے۔

خطبہ کے بعد انھوں نے نماز جمعہ پڑھائی۔ مسلمانوں کو حکم ہے کہ اپنی نمازوں کی حفاظت کرو مگر قادیانی اپنا نمازوں کی نسبت اپنے ''خلیفہ'' کی زیادہ حفاظت کرتے ہیں۔ وہ مغرب کو منہ کر کے نماز پڑھانے لگے تو ان کے دوسری طرف مشرق کو منہ کر کے محافظ کھڑے ہو گئے۔ سٹیج کے اوپر اس سے آگے بنگلوں کے ساتھ مکانوں کی چھتوں اور پہاڑیوں پر ہر جگہ محافظ پہرہ دے رہے تھے۔ جلسہ گاہ سے دس گز کے فاصلہ پر مسلمان زمینداروں کے کھیت شروع ہو جاتے ہیں۔ ادھر کچھ لوگ ریڑھیوں پر کھانے کی چیزیں فروخت کر رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ وہ قریبی دیہات کے مسلمان ہیں اور ربوہ کی حدود سے باہر سودا بیچ سکتے ہیں۔ رہا مسئلہ مسلمان اور غیر مسلم کا تو اس جھگڑے کو قادیانیوں نے خود ہی ختم کر دیا ہے۔ ہم ثبوت کے لیے احمدی جنتری 1977ء کے ساٹھ سالہ ایڈیشن کے صفحہ 31 کا اقتباس یا عکس پیش کر سکتے ہیں جس میں انھوں نے احمدی اور مسلمان کو خود الگ تسلیم کیا ہے۔

عبدالرزاق مہتہ

مرزائیوں کی روحانی شکارگاہ

''عبدالرزاق مہتہ'' جماعت احمدیہ کراچی میں ہی نہیں پاکستان بھر کے قادیانیوں میں ممتاز حیثیت کے حامل ہیں۔ ان کے والد بھائی عبدالرحمٰن صاحب قادیانی نے قادیانیت کی خاطر اپنے آبائی مذہب کو الوداع کہہ کر اپنا سب کچھ برطانوی سرکار کے اس خود کاشتہ پودا کے لیے وقف کر دیا اور یوں بارگاہ نبوت کاذبہ میں ایک اہم مقام حاصل کر لیا۔ پیسہ تو ربوہ کے ''خاندان نبوت'' کی اتنی بڑی کمزوری ہے کہ وہ اس کے حصول کے لیے اخلاق، شرافت وعزت کیا عصمت تک کو داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ مہتہ صاحب کی قربانیاں رنگ لائیں اور وہ ''خاندان'' سے قریب تر ہوتے گئے۔ ان کے اخلاص میں حماقت کی حد تک اضافہ ہو گیا تو وہ مرزا محمود احمد کی خلوتوں کے ساتھی بن گئے۔ ان کی بیگمات وصاحبزادیوں کے ساتھ گلچھرے اڑاتے اور احمدیت کی برکات کے ترانے گاتے رہے۔ ایک مرتبہ خود خلیفہ جی سے سدومیت کا بدیشی شوق بھی فرمایا۔ فوٹوگرافی کے رسیا ہونے کی وجہ سے انھوں نے اجنتا اور ایلورا کی غاروں کے مناظر کو کیمرے کی گرفت میں لے کر ہمیشہ کے لیے محفوظ بھی کر لیا مگر آفریں ہے ان کی ہمت مردانہ پر کہ یہ سب کچھ دیکھنے اور کرنے کے بعد بھی احمدیت کی صداقت پر ان کا ایمان متزلزل نہیں ہوا۔ ان رنگین تصویروں کے حصول کے لیے ان کے گھر میں امور عامہ کے ذریعے چوریاں کروانے کی کوشش کی گئی۔ غنڈہ گردی کے کئی واقعات ظہور میں آئے مگر مہتہ صاحب کا قادیانیت پر ایمان بڑھتا گیا۔ جب معاملات حد سے زیادہ تجاوز کر گئے تو انھوں نے امیر جماعت احمدیہ کو ایک درخواست دی کہ مرزا ناصر احمد خلیفہ ثالث میرے خلاف جو اوچھے ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں، ان کے خلاف تحقیقات کروائی جائے۔ یہ درخواست اس لحاظ سے حماقت کا نقطۂ عروج ہے کہ نام نہاد خلیفہ سالوس کا مقرر کردہ ایک امیر خود اس خلیفہ کے خلاف کیا تحقیقات کر سکتا ہے جس کی اپنی امارت اس Appointing authority کے اشارۂ ابرو کی محتاج ہے۔ لیکن اس ضمن میں انھوں نے ان مظالم کے جو اسباب بیان کیے ہیں، انھیں پڑھ کر ایک شریف النفس انسان لرزہ براندام ہو جاتا ہے۔ عصمت وعفت کو بازیچۂ اطفال بنانا تو قادیانیت

کے ارکان خمسہ میں سے ہے۔ قتل و غارت گری میں بھی وہ بدنام زمانہ کارلوس کے مثیل و بروز ہیں۔ لطفی کا قتل تو ہوا ہے۔ کیا حکومت پاکستان ان کی نعش کا پوسٹمارٹم کروا کر مجرموں کو کیفر کردار تک نہیں پہنچا سکتی۔

مرزا ناصر احمد تو طاہرہ خان کے عشق میں کشتہ کی نسبتاً زیادہ مقدار کھا کر زکباش ہو چکے ہیں۔ اب اسی خاندان کا تیسرا گدی نشین مرزا طاہر احمد ظلم و تشدد کے انہی وحشیانہ ہتھکنڈوں سے کام لے کر اپنے مخالفین پر عرصہ حیات تنگ کر رہا ہے۔ کیا حکومت یہ سارا تماشا اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کے فشار میں گرفتار رہے گی۔ ہماری رائے میں جب تک ربوہ کی زمین کی لیز ختم نہیں کی جاتی، وہاں چند کارخانے نہیں لگائے جاتے اور ربوہ کو تحصیل کا درجہ نہیں دیا جاتا، یہ غنڈہ گردی ہوتی رہے گی۔

ابن الحسین گورگانی

بخدمت جناب سیکرٹری صاحب امور عامہ جماعت احمدیہ

مندرجہ ذیل واقعات مظالم جس کی تفصیل قدرے بیان خدمت کرتے درخواست کرتا ہوں کہ اب جبکہ مظالم اپنی حد سے تجاوز کر گئے ہیں براہ کرم آپ سے گزارش ہے کہ اس تفصیل مظالم کی روشنی میں کارروائی، تحقیق فرما کر مشکور فرمائیں۔ یہ خیال رہے کہ یہ بیالیس سالہ مظالم کی داستان ہے۔

آغازِ مظالم

1936ء میں احرار کا شور شرابا جماعتی انتظام سے ہر کوئی کمانڈنٹ اپنے اپنے فرائض میں مگن کور ٹرپ لیڈر کی حیثیت سے ایک اہم امر کی تحریر مجھے میرے کمانڈنٹ نے صاحبزادہ مرزا ناصر احمد قادیانی کو ان کی کوٹھی پہنچانے بھیجا۔ عریضہ لیتے مجھے حکم ہوتا ہے کہ یہ لاٹھیاں ابھی فلاں جگہ پہنچا دو، جواباً کہا کہ مجھے پہلے اپنے کمانڈنٹ کو ان کے حکم کی تعمیل کی اطلاع دینی ہے۔ لہٰذا مجبور ہوں پس پھر کیا تھا حکم عدولی پرنس آف ویلز ڈکٹیٹرانہ انتقامی جذبہ محاذ میرے خلاف بنایا جاتا ہے کہ خدام الاحمدیہ (جس کے یہ حضرت کمانڈنٹ تھے) کا محصل مجھے بلا مقابلہ حلقہ نے منتخب کیا جسے ان کمانڈنٹ صاحب نے رد کر کے دوسرے چناؤ کا حکم فرمایا پھر مجھ پر ڈکٹیٹرانہ حکم یوں کہ اس کا نام چھوڑ کر کسی دوسرے کا چناؤ کیا جائے'' کیوں جناب ہے نا'' یہ تو رہی جڑ مظالم۔ اب اس جڑ سے تنا اور پھر چوٹی کیونکر؟ اب اس کے بعد وقتاً فوقتاً میرے خلاف من گھڑت مقدمات اپنے اثر و رسوخ سے امور عامہ

اور اس کی ہدایات کے ذریعے جہاں قائم کروائے جاتے وہاں مجھے بدنام کرنے کے جو بھی ہتھکنڈے استعمال کر سکتے کرتے یہاں تک کہ ضلالت کی حدیوں کی گئی کہ مجھے پھانسنے کے لیے عورتوں پر خرچ کرنے سے بھی دریغ نہ کیا جاتا۔ ایک دفعہ مستری دین محمد عرف بلا مستری جس کے پاس ایک گھوڑی تھی خلیفہ ثانی کی روانگی برائے ڈلہوزی نہر تتلے کے قریب سائیکل پر سوار چند دوست الوداع کہنے جا رہے تھے کہ یہ منصوبہ یوں بناتے مستری بلے کو مجھ پر گھوڑی چڑھانے جان سے مروانے کا حکم دیا جس کی کوشش ناکام ہوگئی ''جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے'' امور عامہ کی ہدایات کے مطابق چار پانچ مشٹنڈوں کو میرے گھر چوری کی غرض سے داخل کیا مقصد دراصل تلاش تصاویر عیاشیاں تھی۔ پہلی رات ناکامی پر دوسری صبح مجھے حضور لاہور کام سے بھجوا دیتے ہیں اس طرح دوسری رات ایک کمرہ میں مصروف تلاش ہی تھے جبکہ میری بیوی اور والدہ محترمہ ہی گھر پر تھیں میری بیوی نے اوپر کچھ آہٹ پا کے والدہ محترمہ کو ہوشیار کیا وہ ماشاء اللہ دلیر تھیں للکارا تو وہ مشٹنڈے سر پر پاؤں رکھ کر رفو چکر ہو گئے (کمرہ بھی مکرم بھائی کا) اب ذرا غور فرمائیں خدا کو حاضر ناظر جان کر بتائیں کیا یہ موزوں و مناسب وقت تھا ''کونسا'' میری بیوی ایام زچگی کے چھٹے دن میں تھی (یہ پیدائش 1/9/40 (بچہ عبدالباسط)۔ 2/9/40 کو اپنے زرخرید سب انچارج چوکی قادیان ہزارہ سنگھ کو معہ دیوان بغیر وارنٹ تلاشی وغیرہ اپنی گارد لاتے گھر کا محاصرہ امور عامہ کی معیت میں کرنے گھر میں گھس آیا۔ وقت مقرر تھا عین وقت پر ولی اللہ شاہ بغلیں بجاتا سائیکل سوار ہو کر گزرا کہ آج شکار ضرور ہی قابو آ جائے گا۔ اس کے پیچھے پیچھے ناظر اعلیٰ کی سواری چوہدری فتح محمد سیال تماشا دیکھتے گزرتے ہیں۔ تلاش کرنے جو آئے تھے نہ پا کر مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔ اتنے میں انچارج صاحب چوکی بھی گورداسپور سے تشریف لے آئے مجھے وہاں دیکھ کر محرر سے معلومات لے کر حکم دیا برخوردار جایئے گھر۔ چوکی سے باہر آ کر حضرت والد صاحب جن کے ساتھ قادیان ہی سے ایک انسان جو فرشتہ تھا کھڑا کر دیا۔ مخاطب ہوتے کہا آپ جایئے پھر اگر کوئی بلانے آئے بھی تو مت آیئے میں دیکھ لوں گا۔ اللہ تعالیٰ اس ہمدرد اور اس کے خاندان پر لاکھوں لاکھوں فضل و کرم فرمائے آمین۔ دوسرے دن کی ٹرین پر انچارج تھانہ پھر گورداسپور تشریف لے جاتے۔ اس ہزارہ سنگھ کی تبدیلی کے آرڈر لاتے اس کی میز پر ایسے مارے کہ وہ بھنا گیا۔ اس انتہائی ظلم کی برداشت کب تک۔

''تیرے منہ کی ہی قسم میرے پیارے احمد
تیری خاطر سے یہ سب بار اٹھایا ہم نے''

یہ دل سوز فلک شگاف صدا (حضرت والد صاحب قبلہ) جسے اہل قادیان کبھی بھی نہیں

بھول سکتے نہ ہی اس سلسلہ کا خطبہ جمعہ فرمودہ حضور (جس میں ولی اللہ شاہ کو ناکامی پر) وہ بے نقط جھاڑ پلائی کہ الامان الحفیظ (غیور کے لیے ڈوب مرنے کا مقام تھا مگر غیرت کہاں) حاضرین جملہ گواہ ہیں بعد نماز جمعہ الفضل کے دفتر جا کر ایڈیٹر صاحب خواجہ غلام نبی صاحب کے حضور منتوں خوشامدوں کے ناک رگڑے کہ یہ خطبہ شائع نہ کیا جائے۔ اس صدا کی ہاہ یوں پڑی کہ ولی اللہ شاہ پر فالج پڑ گیا۔ لوگوں نے اسے مشورہ دیا کہ ان سے (یعنی حضرت والد صاحب قبلہ اور خاکسار) سے معافی مانگ لو جس پر یوں کہا بھائی جی سے تو معافی مانگ لی ہے۔

اب اور سنیے ایک سکھ لڑکے نے ریلوے کوارٹر کی ایک لڑکی کو چھیڑا چھاڑا۔ نوبت پولیس تک پہنچی۔ اس سکھ لڑکے کا باپ اور چچا ممنون تو یوں ہی تھے کہ بعض سکھ گھرانوں کو ماہوار وظیفہ ملتا تھا ان میں سے یہ بھی ایک تھا، اس لیے وہ ولی اللہ شاہ کے پاس پہنچے معاملہ بتایا گھر بیٹھے شکار پر نشانہ لگانے کا انتظام ہو گیا۔ کہتے ہیں فکر نہ کرو جس طرح میں کہوں لڑکا بیان دے دے۔

پریس قادیان تو خریدی ہوئی تھی اس کی بجائے میری شناخت پریڈ کروائی گئی اس لڑکی کو ہر چند پولیس اور امور عامہ کے حواریوں نے میرا حلیہ تک بتا دیا مگر اللہ کی قدرت شناخت کسی دوسرے کی ہو گئی کام ختم ذلت نے ان کا منہ چوما۔

اب چلیے ذرا ہندو پاک کی پارٹیشن کی سیاحت کو کہ یہاں کیا گل کھلاتے ہیں۔ اہل قادیان کو بسوں کے ذریعہ بھجوانے کے لیے باقاعدہ تحریری پروگرام بنا جس میں افراد کنبہ، تاریخ روانگی، مقام، بس نمبر درج تھا۔ باقاعدہ دفتر کی مہر دستخط سرخ سیاہی سے کرتے گو کہ حضرت والد صاحب نے روانگی سے قبل ہی یہ تحریر کر دیا تھا کہ میں قادیان ہی ٹھہروں گا مگر پھر بھی لاہور بورڈ پر بھگوڑوں میں نام معہ افراد کنبہ درج فرما دیا جاتا ہے۔ گویا غیرت کا جنازہ اپنے ہی قلم سے نکالا جاتا ہے، جس پر حضرت والد صاحب قبلہ نے بھی احتجاج فرمایا تو میں نے بھی اس پر کافی لکھا مگر ہٹ دھرمی جواب ندارد۔ اب ملاحظہ فرمائیے۔

ایام درویشی حضرت خلیفہ ثانی سے باقاعدہ تحریری اجازت لینے حضرت والد صاحب قبلہ پاکستان تشریف لاتے ہیں۔ موقعہ سے ناجائز فائدہ اٹھاتے بحیثیت نگران درویشاں ڈکٹیٹرانہ انداز میں مکان کا تالا توڑنے تڑوانے تلاشی (حصول تصاویر) لیتے ناکام و نامراد ہوتے گھر کا کل سامان لوٹا لٹوایا گیا۔ کیوں صاحب یہی تو ہے ناں ڈکٹیٹری، کیا حق تھا تالے توڑنے تڑوانے لوٹ کھسوٹ کرنے کا۔ فرمایئے، یہ جذبہ انتقام نہیں تو کیا ہے۔

اب آیئے ذرا جماعت کے کارنامے اور ان کی حقیقت و اصلیت کہ گھمنڈوں اور غروروں

کی بھی سیر ہو جائے۔ چوہدری عبداللہ خاں امیر جماعت کے ذریعے نظر عنایت یوں ہوتی ہے کہ میری وصیت کے خلاف ایڑی چوٹی کا زور جس کی تہہ میں دراصل منہ مانگی رشوت یوں کہ حضور کی آمد کراچی کے موقعہ کی تصاویر از خود ہر قسم کے اخراجات اٹھاتے پیشِ حضور عادتاً عقیدۃً پیش کرتا، ان چوہدری صاحب نے بھی ایک البم مانگی۔ بعد تیاری مع بل پیش کی، آپے سے باہر ہوئے طیش میں نامعلوم کیا کہا آخر مولوی عبدالحمید صاحب نے مجبور کر کے بل دلوایا مگر پارہ چڑھتا ہی گیا۔ دوسری مرتبہ آمد حضور کے موقع پر اوّل تو سٹیشن پر ہی ہر چند رکوانے کی ناکام کوشش کرتا رہا اور بیچ لگژری ہوٹل میں تو ایک ہٹے کٹے کے ذریعے سختی سے نکلوانے کی بھی ناکام کوشش یوں کی کہ میں نے کہا وہ آئی جی پولیس بیٹھے ہیں، جاؤ ان سے شکایت کرو۔ وہ مجھے نکال سکتے ہیں مگر کس کو ہمت ہوتی ایسی چپت پڑتی کہ ہوش آ جاتی۔ اب ذرا انجام دیکھو دوسروں کو ذلیل کرنے والوں کو اللہ کیسے ذلیل کرتا ہے۔ ربوہ جا کر ایک رشتہ کی مانگ پر حضور نے جو پنجابی میں بے نقط سنائیں اور گالیوں کی بھرمار وہ دی کہ ساری کی ساری ہی امارت دھری کی دھری رہ گئی اور برداشت ذلت کر کے دنیا سے رخصت پائی۔

اب باری آتی ہے محترم جناب شیخ رحمت اللہ صاحب کی امارت کی جن کے کان پہلے ہی میرے خلاف بھرے ہوئے تھے۔ رہتی سہتی یوں کی پوری ہوتی ہے کہ بیچ لگژری ہوٹل میں ایک مسئلہ شادی پارٹی پر (جس کا ذکر خطبات الفضل وغیرہ وغیرہ میں بڑے ہی اہتمام احتشام نمائش محض نمائش یا دوسروں کو نصیحت خود را فضیحت کے طور پر ہوتا۔ احکامات وغیرہ بیان فرمائے جانے پر شیخ صاحب محترم کو توجہ دلائی تھی کہ آپے سے باہر ہوئے میرے خلاف خطبہ جمعہ کے سٹیج پر کھڑے ہو کر جو بھی زہر اگل سکتے تھے اُگلا۔ نہ صرف میری ذات تک بلکہ حضرت والد صاحب کی ذات گرامی کے متعلق بھی شدید قسم کے الفاظ استعمال کیے جو ناقابل برداشت تھے۔ خطبہ میں بولنا منع نہ ہوتا تو اس جگہ پر خون خرابہ ہو جاتا۔ باپ کی ذات گرامی ہو تو میرا آخری قطرہ خون حاضر تھا اور انشاء اللہ آخری دم تک رہے گا نتیجتاً پہلے تو تحریری کوشش کی کہ اس طرح ازالہ کر لیں مگر نہ جی ایک طرف تو امارت کا خمار تو دوسری طرف بنلنگ کی شہ مجبوراً قانونی نوٹس دیا جس نے ایسا نشہ ہرن کیا کہ ہوش ٹھکانے آ گئے۔ (کاش اس وقت ہی اگر یہ معاملہ سلجھ جاتا تو مجھے آج اس درخواست کی ضرورت ہی پیش نہ آتی یہی سبھی کچھ اس وقت بھی منظرعام پر آ جانا تھا۔ خیر اب مجھے مجبور کر دیا ہے تو ٹھیک ہے) عقل کے اندھے ایسے ہی تو ہوتے ہیں۔ معافی نامہ لکھ کر دینا بہت بہتر خیال فرمایا۔ اندر خانہ میری یہی ایک چال تھی کہ روز ایسے ہی سٹیج پر کرتے رہیں اور دوسری طرف ان کا خیال نہ آ سکے سو وہی ہوا اور تاریخ میں یہ پہلا معافی نامہ ہے جو لکھ کر دیا گیا ورنہ آج تک تو معافی نامے لکھوائے ہی جاتے تھے۔ معافی

نامہ لکھ کر دینے کا معاملہ جماعت کراچی خصوصاً عاملہ کے علم میں ہے۔ قانونی نوٹس ملتے صبح صبح ہی جناب چوہدری احمد مختار صاحب نائب امیر ہر چند سر پٹکتے مگر جواب وہی فرماتے "یہ ناممکن ہے کہ شیخ صاحب اپنے الفاظ واپس لیں" کیسے ممکن ہوا اس خطبہ جمعہ کے نتیجہ میں میرا خون اس قدر کھولا کہ بیان سے باہر۔ اطباء پریشان گیس ٹربل علاج معالجہ کرتے رہے۔ حضرت والد صاحب کی خدمت میں سالانہ جلسہ کے موقعہ پر قادیان حاضر ہو کر جماعت کراچی کے آئے دنوں کے مظالم وستم کے لیے درخواست دعا کی۔ الوداعی رخصت لیتے پہلی اور آخری مرتبہ ان کے سینہ سے چپکا جس پر یوں فرمایا "بٹیا بے فکر ہو کر جاؤ میں نے جسے درخواست دینی تھی دے دی ہے۔" غور طلب یہ کہ ظلم وستم عروج پر تھا جب میرے مولا نے مجھے اپنے در پر عمرہ کے لیے بلوا لیا کیسے درخواست قبول فرمائی۔ سبحان اللہ ہوائی جہاز عصر کے قریب مجھے جدہ لے گیا جلدی جلدی غسل کیا احرام باندھ کر مکہ روانہ ہوئے اور دوسری رکعت نماز مغرب میں شامل ہوا۔ سنتیں ادا کر کے سعی سے فارغ ہو کر جو دعا کے لیے بیٹھا مشغول دعا تھا کہ نظارہ یوں نظر آیا کہ حرم شریف پر موسلا دھار بارش ہو رہی ہے اور آواز مجھے یوں آئی، مانگ آج جو مانگتا ہے، قبول ہے، واہ رے مولا تیری قدرت اور بھید کس نے پائے قربان تیری قدرت پر جو مانگا اللہ نے دیا اور دکھایا صرف ایک مانگ اپنی کسی غلطی کی وجہ سے صحیح نہ مانگ سکا اس کا بھید اللہ ہی جانتا ہے۔

قصہ مختصر شیخ صاحب محترم کے لیے حقیقت میں بہت سخت بددعا کرتا رہا اور ایک مانگ یہ بھی کہ الٰہی اب جبکہ تو نے اپنے فضل سے اپنے در پر بلا لیا ہے، ہم گناہگار غریب کمزور ناتواں اور پھر ملکی قرعہ اندازیاں تو اپنا فضل فرما اور اس فریضۂ حج سے بھی نواز دے اور لالچ یوں بڑھتا گیا کہ بچوں کی والدہ کو بھی بلوا دے۔ الحمدللہ الحمدللہ کہ اللہ نے قبول فرماتے سال بھر رہنے زیارتوں کے فیوض سے بارآور ہونے کے مواقع عطا فرمائے۔ ہاں تو عرض کر رہا تھا محترم شیخ صاحب کے متعلق، ایام حج بالکل قریب آ گئے مجھے حکم ہوتا ہے حج کا اور ان کے لیے عمرہ کا۔ میں شیطان کو پھونکتا کہ تو پھر ورغلانے آ گیا۔ الغرض دوسرے جمعہ پھر تیسرے بھی وہی حال جس کے بعد چوتھے جمعہ یہ عرض کرتے کہ الٰہی اگر تیری رضا یہی ہے کہ میں ان کے لیے عمرہ کروں سو آج حاضر ہوں۔ احرام باندھا نیت عمرہ محترم شیخ صاحب کر کے عمرہ ادا کرنے کے لیے روانہ ہوا کہا الٰہی اب یہ معاملہ تیرے سپرد ہے میرا دل ان کی طرف سے بالکل صاف ہے کوئی رنج غم نہیں الحمدللہ کہ آج تک محبت پیار سے ملتے ملاتے ہیں۔ مفصل خط محترم شیخ صاحب کے پاس ہوگا ان سے تصدیق کی جا سکتی ہے۔

اب رہا وصیت کا معاملہ مسودہ خلیفہ ثانی کی بیماری کی وجہ سے نگران بورڈ میں حضرت مرزا بشیر احمد

صاحب کی خدمت میں پیش کیا انھوں نے معاملہ سلجھانے اور اصل معاملہ کا ذکر نہ فرمانے کی ناکام کوشش کی جبکہ میں ان کی ایک کتاب سیرۃ المہدی کی ایک تحریر کے مطابق اپنا حق مانگنے میں بضد تھا (وجہ ضد آگے بیان کروں گا) انھوں نے مجبور ہو کر فائل حضرت مرزا عبدالحق صاحب ایڈووکیٹ کو جو غالباً نگران (نائب) تھے ملاحظہ کرنے کو دی۔ بعد ملاحظہ یوں تحریر فرمایا ''ان کی طبیعت میں ضد پائی جاتی ہے، دوسرے جماعتی کاموں میں حصہ نہیں لیتے۔'' یہ اس وجہ سے غلط تھا کہ دوبارہ میرا بلا مقابلہ منتخب ہونا رد کر دیا تھا (یہ دوسرا واقعہ بلا مقابلہ رد کرنے کا ہے پہلا کمانڈنٹ ڈکٹیٹر مرزا ناصر احمد کا۔ پھر جماعتی کاموں میں حصہ نہیں لیتے غلط ہوا۔ ''کیا ہی خوب واقعی صحیح نقطہ پکڑا کہ طبیعت میں ضد (فرمایئے ضد، غصہ قدرتی اور فطرتی ہے کہ نہیں) پھر بھی صدر انجمن جس کے انچارج ڈکٹیٹر صاحب بہادر تھے، وصیت منسوخ کروا دی حالانکہ منسوخی یا بحالی خلیفہ وقت کا اختیار ہوتا ہے۔ ٹھیک ہے میری وصیت تو منسوخ کرتے کراتے خوش ہو گئے۔ آگے دیکھیں کیا ہوتا ہے۔

اب آخری ان کا شیوہ تقدس مآبی بھی ملاحظہ فرمالیجئے۔

خاندان میں پھوٹ، میاں بیوی میں ناچاقیاں۔ ایک دوسرے کی جاسوسیاں کرنے کرانے، ماں باپ کو بچوں سے کٹانے (علیحدہ کرنے) کی شاطرانہ چالیں ہر رنگ ہر چال (جائز تو ان کی ڈکشنری میں کہیں بھی نہیں ملتا) چلتے اپنا اُلو سیدھا کرنا شیوہ مخلصی کے بلند بانگ دعاوی کا ڈھونگ پیٹتے نئی نسل کے رسل رسائل پر گہری نظریں رکھنا کہ ملازمین سے چوری چھپے کوائف وقتاً فوقتاً حاصل کرتے رہنا جہاں کوئی ذرہ سا نچہ پڑا پھر وہاں ایسے جھپٹتے ہیں جیسے گدھ مردار پر۔ جس کے بعد اپنی روحانیت کا میٹھا زہر ہر قسم کے سبز باغ دکھاتے۔ دماغوں میں بھوسہ بھرنے کے وہ وہ حربے خاندانوں کی بڑائی عہدوں کے لالچ چہ جائیکہ کوئی ان کو جانے یا نہ جانے جماعت میں کبھی آئے یا نہ مقصد اپنا اثر و رسوخ جتاتے جونک کی طرح چپکے خون چوسنا ان کی کاروں میں ان کے ہمراہ گھومنا پھرنا یہ ثابت کرنا کہ جن کو ہم بلند کہتے ہیں وہ ہر رنگ میں بڑے ایمان و اخلاص کے حامل ہیں۔

خاندان تمہارا تم خاندان مغلیہ سے ہو تم تو شہزادیاں ہو چنانچہ یہی چال میرے خلاف استعمال کی۔ پہلے تو ہم کو مکان سے نکلوایا یہ کہتے ہوئے کہ طاہر وغیرہ ہم کو تمہاری موجودگی میں بزنس کی بات چیت کرنے میں مشکل پیش آتی ہے۔ شہزادے شہزادیوں کا ورد اپنے بہن بھائیوں کو بھی اب دیا جانا شروع ہو گیا ہے پہلے تو وہم و گمان نہ تھا۔ اِدھر سیکرٹری شپ لجنہ کے کاموں میں دلوا دی مطلب ایک طرف پیسہ کھینچنا اور دوسری طرف اپنی مطلب براری (یہاں ایک سوال گھر سے نکلوانے کا شاید آپ کو یاد ہو گا۔ فون پر ایک فروخت کے سلسلہ میں تھا)

اب اصل مقام غور ہے ذرا توجہ سے سنیئے گا ایام جلسہ میں شمولیت پر یوں فون پر فون کیے کرائے جاتے ہیں کہ جلسہ میں ہمارے گھر ٹھہرنا ایک طرف مرزا انور برادر مرزا ناصر احمد تو دوسری طرف سوتیلا بھائی مرزا طاہر دیکھئے ایک دوسرے سے کیسی چاہت رکھتے ہیں کہ باسط صاحب مع اہلیہ ہمارے ہاں آئیں اور کہیں قیام نہ کریں۔ مقام غور ہے آخر وہ کونسے سرخاب کے پَر یکدم ان کو لگ گئے جو ایک دوسرے سے بازی لینے کی فکر میں فونوں پر فون ہوتے ہیں۔ اب ذرا آپ بھی اپنے گریبان میں منہ ڈالیے اپنا محاسبہ کریں کہ آپ تو ہیں ہی ماشاء اللہ سیکرٹری امور عامہ۔ چلیے محترم امیر جماعت صاحب کی ذات کو ہی لیجئے اگر آپ کو بھی ایسا بلاوا آیا ہو تو فرمایئے۔ آیا خیال شریف میں عقدہ حل ہوا۔ صحیح ثابت ان کے حربے ہوئے یا ابھی نہیں غالباً ابھی نہیں فکر نہ کریں ثابت کر کے دکھاؤں گا جناب یہ تو موٹے موٹے مظالم تھے جو عرض کر دیے اس کے علاوہ معمولی دوچار ہوں گے کوشش تو کرتا ہوں کہ مختصر کروں لیکن 42 سالہ مظالم کر سمجھنے کے لیے آپ کو قدرے وضاحت تو چاہیے۔

حضرت محترم سیکرٹری صاحب یہ تو تھے 42 سالہ مظالم کرنے کرانے کے لیے ایڑی چوٹی کا پورا زور لگا لیا سوال اب یہ ہوتا ہے کہ ان میں ہے ہر کوئی ماں کا لال جو یہ بتائے دکھائے کہ اتنے مقدمات اتنے جھوٹے منصوبے حیلے حوالے ان میں سے کتنوں میں مجھے مجرم وملزم ثابت کیا کروایا یا کم از کم یہی سہی کتنوں میں مجھے کم از کم سرزنش کرتے کراتے وارننگ دیتے دستخط کروائے جبکہ امور عامہ کی فائلوں پر فائلیں بھری بھروائیں یا وہ محض جھخ (جھک۔ ناقل) مارنا مقصد تھا ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ **فاعتبروا یا اولی الابصار** ہاں البتہ میری میرے خاندان کی عزت دوسروں کی نظروں میں گرانی چاہی۔ قادیان کے گلی کوچوں اور جماعت کراچی کی نظروں میں بھی کھینچا تانی فرماتے بغلیں بجاتے تماشا دینی کبریائی دیکھتے دکھاتے پھر تقدس مآبی کا لبادہ پہننے میں ضرور کامیاب ہوئے۔ یہاں ایک واقعہ یاد آ گیا ایک جمعہ کی نماز کے بعد سڑک پر کھڑا تھا کہ حضرت امیر جماعت چوہدری احمد مختار صاحب گزرے سلام کلام ہوا سبحان اللہ کیا ہی جواب انداز میں فرماتے ہیں مہتہ صاحب کوئی جلوہ دکھاؤ گویا ہمارے امیر صاحب جلوہ دیکھنے کو ترستے ہیں۔ کوشش کروں گا ان کی دلی آرزو پوری کرسکوں تا کہ حسرت تو نکل سکے۔

> جلوہ بھی ایسا دکھاؤں گا کہ جو واقعی جلوہ دیکھنے کے لیے ترستے ہیں نہ صرف انھوں نے بھی عمر میں ایسا جلوہ نہ دیکھا ہوگا بلکہ سلسلہ احمدیہ تو درکنار دنیائے اسلام کی تاریخ میں بھی کبھی نہیں ہوا نہ ہوسکتا ہے۔

پھر بھی ان کے 42 سالہ مظالم ہر رنگ میں برداشت کیے، منہ سے لفظ تک نہ نکالا شکوہ تو

در کنار اب جبکہ انھوں نے یہ اپنا آخری ذلیل حربہ کر میں چھرا گھونپا کوئی فکر نہیں تم صبر کرو وقت آنے دو، بے شک دل و دماغ شل ہوا دماغی طور پر تار چر ہوئے احساس کمتری کا شکار ہوئے نتیجتاً طبیعت میں غم غصہ نفرت اور ضد کا بیج بویا جانا میرے بس کا روگ نہیں یہ فطرتی تقاضا انسانیت ہے۔ یقیناً یقیناً آپ بھی اس سے اتفاق کریں گے جس کی وجہ سے کسی مجلس میں موقع محل کے لحاظ سے بات چیت کے قابل نہیں پاتا حتیٰ کہ شکل و شباہت پر ہر وقت غم و غصہ فکر کے آثار رہتے۔ بیوی بچوں کی وجہ سے موقع محل کے لحاظ سے بات چیت کرنے کے لیے کئی دن تلاشِ وقت کے انتظار میں رہتا گویا ''نہ گھر کا رہا نہ گھاٹ کا'' (ایک بات تو آپ کو بھی خوب یاد ہوگی آپ کے مکان پر کسی فروخت کے سلسلہ میں حاضر ہوا تو آپ نے نہایت ہوشیاری سے کچھ معلومات حاصل کرنا چاہیں۔ بعد میں طرز گفتگو سے آپ نے اندازہ فرمالیا کہ مجھے طیش سا آ گیا تھا وجہ یہ کہ جھوٹ اور غلط بات برداشت سے باہر ہے۔ یہ اب بتا ہی دوں کہ درخواست سے ہٹ کر میں نے کچھ نہ لکھا تھا بلکہ فضا خود ہی ہٹ گئی حالانکہ اصولاً اس کا فرض تھا کہ میرا جواب مدعی کو پہنچا دیتے پھر جو وہ لکھتا مجھے بتا دیتے لیکن نہیں خود بخود طرفداری ہوئی چونکہ میرے جواب سے معاملہ ختم اور جھوٹ ثابت ہوتا تھا مثلاً میں نے لکھا تھا کہ مدعی اپنے فارم نکاح پیش کرے تا معلوم ہو کہ اس کی شادی کب ہوئی اور وہ کب کا ذکر کرتا ہے کہ میری بیوی کے نام پر (مکان) تھا۔ اس طرح جماعت کراچی نے دو ایک جھوٹی درخواستیں دلوا کے مجھے جواب کو لکھا ایک ہی جھٹکہ میں معاملہ ختم آج تک کسی کو دوبارہ اس فائل یا درخواست کو کھول کر دیکھنے کی ضرورت ہی پیش نہ آنے دی۔ سوال پیدا ہوتا ہے آخر یونہی تو کسی کا سر پھرا نہیں ہوتا کہ خواہ مخواہ ظلموں پر ظلم ڈھاتا چلا جائے آخر کچھ تو وجہ ضرور ہوگی، سنیے۔

وجہ مظالم

محترمی صبر کرتے، خاموشی سے غور و فکر کرتے۔ دل قابو میں رکھتے۔ ہوش و حواس قائم رکھتے تسلی سے سکون سے جذبات پر قابو پاتے جلوؤں کا نظارہ دیکھئے (امیر صاحب محترم جلوے دیکھنے کا بہت شوق رکھتے ہیں تبھی تو طنزیہ فرمایا جلوہ دکھائیں اگر صرف ''مغلیہ خاندان کی عیاشیاں'' لکھوں تو صرف اتنا لکھ دینے سے آپ کے پلے کچھ نہ پڑے گا لہٰذا فی الحال مجبوراً مختصر اور بوقت کارروائی مفصل عرض و پیش کیا جائے گا، تین امور آپ نے بھی بخوبی پڑھے سنے اور عمل کیے ہوئے ہوں گے۔

1- تاریخ شاہد ہے مغلوں سے تخت و تاج سے دستبرداری کیوں ہوئی، ان کی عیاشیوں کے سبب۔ باپ دادے تو جان ماریاں کرتے سلطنتیں بناتے نام پیدا کرتے رہے، وقت آیا تو اولاد عیش و عشرت کی رنگ رلیوں میں غرق ہوگئی۔

2- ایک خاندان کی بیماری دوسرے خاندان میں (یعنی اولاد وغیرہ) میں آ جاتی سنی ہوگی دودھ کو ایک دفعہ جاگ لگا دی جائے تو پھر وہی جاگ کام آتی رہتی ہے۔ بعینہٖ اسی طرح اب یہ جاگ آخر (یعنی عیاشیوں کی رنگ رلیاں) انہی مغلیہ خاندان کی نسل ہوتے اس خاندان میں بھی لگنی ضروری تھی سو لگی اور خوب لگی اور غالباً ان کی طرزِ عیاشیوں کو بھی مات کر دیا ہوگا۔

جناب سیکرٹری صاحب ہوشیار باش جاگتے رہیے نظارہ جلوہ قریب آ رہا ہے دل مضبوط کر لیجئے۔ ہوش وحواس قائم رکھیے گا۔ قادیان کے عوام ہماری اس خاندان سے وابستگی چولی دامن کا ساتھ سمجھتے تھے۔ ایک دن ہوتا کیا ہے غور فرمایئے گا۔ حضرت خلیفہ ثانی حکم فرماتے ہیں عشاء کے بعد ام طاہر کے صحن والی سیڑھیوں کی طرف سے آنا چنانچہ حاضر ہو کر دستک دی حضور خود دروازہ کھول کر اپنے ساتھ صحن میں لے گئے کیا دیکھتا ہوں کہ دو بڑی چار پائیاں ہیں جن پر بستر لگے ہیں جن کی پوزیشن یوں تھی۔ سرہانہ شمال قبلہ رخ والی چارپائی کے پاس لے جا کر اس پر بیٹھنے کا حکم دیا تو دوسری پر حضور لیٹ گئے مقام خلیفہ کے تقدس کے خیال سے کبھی برابری میں بیٹھنے کا وہم وخیال بھی نہ ہوتا تھا اسی شش و پنج میں حیران پریشان کھڑا بت بنا رہا۔ الٰہی کیا شامت اعمال ہے کیا مصیبت آنے والی ہے کہ اتنے میں حضور تشریف لائے پکڑ کر بٹھاتے ہوئے فرمایا فکر نہ کرو شرماؤ نہیں جس کے چند ہی سیکنڈ بعد چارپائی پر بچھی چادر کے نیچے سے کچھ حرکت معلوم ہوئی۔ سکڑا، سنبھلا کہ ایک چٹکی پیٹھ پر کٹتی ہے۔ گھبرایا ہوش وحواس گم ہی تھے کہ اب چادر کے نیچے سے کوئی ذرا زیادہ ہلتا معلوم ہوا دراصل کروٹ لی گئی تھی کروٹ لیتے پھر دو چار چٹکیاں کٹتی ہیں میں پھر بھی صمٌ بکمٌ بنا بیٹھا تھا کہ پھر حضور آئے شرماؤ نہیں لیٹ جاؤ فرماتے چادر کے اندر منہ کر کے اس صاحبہ سے کچھ کہا جس نے نصف اٹھتے ہوئے اپنے بازو میری کمر کے گرد حمائل کرتے کھینچ کر اپنے اوپر لٹا لیا اس کھینچنے کے نتیجہ میں سر ہاتھ اچانک جو اس جسم نفیس سے لگے تو حیرانی ہوئی کہ محترمہ الف ننگی پڑی ہیں اُدھر میں بے حس وحرکت پتھر بنا پڑا تھا مجھے علم نہ ہو سکا۔ کس وقت میرے بھی کپڑے اتار پھینکے اور کیسے پوری طرح اپنے اوپر لٹانے لگیں بدمستی کی شرارتیں کرنے "آخر جیت ان کی ہوئی

ہار میری'' گویا ان ٹرینڈ کو ٹرینڈ کر کے مستقل ممبر سرِ روحانی (یہ نام میرا دیا ہوا ہے) کا اعزاز بخشا گیا ہاں یہ صاحبہ آخر کون تھیں آپ جستجو تو ضرور کر رہے ہوں گے لیکن فی الحال بغیر نام بتائے اتنا عرض کیے دیتا ہوں کہ وہ صاحبہ حضور خلیفہ ثانی کی بیٹی صاحبہ تھیں بس پھر کیا تھا پانچوں گھی میں سر کڑاہی میں والا معاملہ آئے دن بلاوے دن ہو یا رات دفتر یا چوکیدار کی گو پہلے بھی روک ٹوک نہ تھی مگر اب تو بالکل ہی ختم سیدھے اوپر بیٹیوں سے بڑھتے اب بیگمات کے پیش ہونے یا کیے جانے لگے پہلے پہل تو گھروں میں پھر قصر خلافت کے ایک کمرہ ملحقہ باتھ روم میں جو دراصل مستقل دادِ عیش کی رنگ رلیوں کے لیے مخصوص فرمایا ہوا تھا۔ جہاں بیک وقت ایک ہی بیٹی اور یا بیگم صاحبہ سے خود بھی اکثر شریکِ رنگ رلیاں ہو جاتے گویا تینوں ایک ہی چارپائی پر پڑے محو مستیاں ہوتے (محترم سیکرٹری صاحب امور عامہ اسلام میں پردہ کا حکم سخت بتایا جاتا ہے لیکن یہاں دیکھتے ہیں آپ کا امور عامہ خلیفہ کے اس پردہ زادہ پر کیا نوٹس لیتا ہے کونسی جماعت سے خارج کرتا ہے) خیر یہ آپ کی دردسری ہے۔

ناراض تو نہیں ہو گئے ابھی تو ابتدائے عشق ہے آگے دیکھئے کیا ہوتا ہے بقول کہاوت ''پا نہ ٹریا متھا سڑیا'' ابھی تو سنسنی خیز جلوؤں کی روشنائی ہونی باقی ہے لہٰذا دل قابو میں رکھیے جناب ہوشیار رہیں غور فرمائیں ایک عرصہ جبکہ ایک بیٹی سے دونوں ہی رنگ رلیاں مناتے محو مستیاں تھے کہ مؤذن نے آ کر نماز کی اطلاع دی مجھے یوں فرمایا تم مزے کرتے چلو میں نماز پڑھا کر ابھی آیا۔ چنانچہ اسی حالت میں جبکہ...... میں شرابور تھے وضو تو درکنار اعضا بھی نہ دھوئے نماز پڑھی اور سنتیں نوافل پھر بیٹی کے سینہ پر پڑے غرق عیش و عشرت ہو گئے کیا خوب کہا ہے ع

''تیرا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں''

(جس کسی نے بھی یہ کہا خوب باموقع اور اغلباً انہی کی ذات مبارک کا نقشہ اللہ نے کھنچوایا ہے) مختصر کرنے کے لیے اللہ کو حاضر ناظر کرتے جن سے یہ رنگ رلیاں منائی منوائی گئیں فی الحال تعداد لکھ دیتا ہوں بوقت کارروائی اسمائے گرامی سے مطلع کروں گا۔ بیگمات تین، صاحبزادیاں بھی تین ان دو صاحبزادیوں سے دو دو دفعہ ایک تو قریباً

مستقل، یہاں لگے ہاتھوں ایک بیگم صاحبہ (بڑی) ام ناصر کی حسرت جو قبر میں ساتھ لے گئے یوں فرمایا دیکھو ام ناصر ہیں کہ یہ شریک محفل نہیں ہوتیں تبھی تو موٹی بھینس ہوتی جاتی ہیں اس کے مقابل غور فرمایا جائے ام مظفر کو دیکھو کیسی خوبصورت نازک سی چلتی پھرتی ہیں کیونکہ یہ کرواتی رہتی ہیں گویا بھاوجوں کو بھی نہ بخشا گیا یہ خیال ذہن نشین ہونا ضروری ہے جن سے یا صاحب مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہوا۔ وہ پاک وصاف ہیں اور الفاظ ''رنگ یا مطلب'' جس کی نسبت بیان کیے یا کہے گئے وہی تحریر ہذا کر رہا ہوں کسی کا بلاوجہ مبالغۃً قطعاً قطعاً اشارہ بھی نہ کروں گا انشاءاللہ۔

انسان گنہگار ہے اور ضرور ہے لیکن حد سے تجاوز ارکانِ اسلام سے استہزاء شاید کوئی نام کا مسلمان بھی نہ کرے گا چہ جائیکہ جو خود کو مقام خلیفہ پر کھڑا کرے استغفر اللہ ربی جناب عالی یہ تو رہی نماز اور اس کا احترام اب ذرا اچھی طرح سے سنبھل کر اپنی غیرت کے جوش کو دبا کر قرآن پاک کی عظمت پر اس اولوالعزم خلیفہ کے اس چاند سے مکھڑے کی زبان مبارک سے ادا کیے ہوئے بولے ہوئے خواہ ایک دفعہ دوسرے کی نسبت کہ وہ یوں کہتا ہے اوّل تو اگر کسی نے ان کے سامنے کہے بھی تو غیرت کا تقاضا اس کو ڈانٹ تھا چہ جائیکہ ان الفاظ کو اپنی زبان مبارک سے نہ صرف ایک دفعہ بلکہ ڈھٹائی کی حد یوں کہ پھر دوسری دفعہ وہی دہرائے جاتے ہیں۔ جناب عالی یقین جانیں ان کے لکھنے کی مجھ میں نہ ہمت نہ ہی سکت ہے سمجھانے کی کوشش کروں گا یوں کہا نعوذ باللہ نعوذ باللہ قرآن پاک کا نام لیتے ہیں میں اس کو اپنے...... پر مارتا ہوں استغفر اللہ ربی من کل ذنب واتوب الیہ۔ شرم کے مارے میری آنکھیں زمین میں گڑ گئیں کاٹو تو جسم میں خون کا قطرہ نہیں کیا یہی مقام خلیفہ ہے اور یہی وہ بلند بانگ پرچار ہے کہ ہم ہی ہیں جو خدمت قرآن فلاں فلاں زبانوں میں کر رہے ہیں اور اِدھر اسی قرآن پاک کی فضیلت وعظمت کا عمل بمحاورہ ''صورت مومناں کرتوت کافراں'' سے دیا جاتا ہے توبہ توبہ۔

یہ بھی بتائے جاؤں کہ یہ کس موڈ میں کہے گئے ایک بیگم صاحبہ کو حضور کے ہر طرح کے قرب صلاح مشورے وغیرہ وغیرہ کی بنا پر چہیتی کہا جاتا اور مانا جاتا تھا اور اہل قادیان کی مستورات خصوصاً جانتی تھیں۔ بعد منانے رنگ رلیاں حضور کی خوشنودی کے لیے کھڑے محو گفتگو تھے کہ ان بیگم صاحبہ نے مجھے اپنے سینہ سے لگاتے کہا ''آپ مجھے اپنی چہیتی کہتے ہیں یہ میرا چہیتا ہے'' باموقع خوب مذاق ہوا جس میں نعوذ باللہ وہ الفاظ دو مرتبہ کہے گئے یہ الفاظ پنجابی میں نام لیتے کہے گئے جو ان کی خلافت کی جیتی جاگتی حقیقت واصلیت اسلام اور رسول مقبول سے وابستگی کی نمایاں جھلک دیتی ہے اب ان کی اصلیت ضمیر کی نصیحت ووصیت بھی لگے ہاتھوں ملاحظہ فرماہی لیے جائیں فرمایا:

''میں نے تمام بچوں کو کہہ دیا ہوا ہے کہ جس کے اولاد نہ ہو ایک دوسرے سے کر لی جائے۔ سبحان اللہ کیا یہ نصیحت و وصیت خلیفہ کو زیب دیتی ہے۔

گویا اس سے صاف ثابت ہو گیا کہ یہ رنگ رلیاں صرف حضور کی ذات مبارک تک ہی محدود نہیں بلکہ کل اولاد کیا لڑکے اور کیا لڑکیاں جن کو پہلے ہی استعمال کرنا کرانا شروع کر دیا ہوا ہے۔''

تو بھلا اس صورت میں لڑکے کہاں متقی و پرہیزگار ہو سکتے ہیں تبھی تو یہ رونا حق بجانب ہے کہ ماؤں بہنوں بیٹیوں بھاوجوں کی عزت و ناموس ہر وقت خطرے میں ہے۔ اب ان ملفوظات میں سے ایک اور فرمان ملاحظہ فرما لیا جائے۔

فرمایا لوگ باہر سے تبرک کے لیے اپنی بیویاں، بیٹیاں، بہویں بھیجتے رہتے ہیں لیکن پھر بھی جنونِ عشق بازی سے تسلی نہیں ہوتی مجبوراً پنجابی کہاوت 'جنے لائی لوئی کرے کی کوئی' کے مطابق بے شرموں کے ساتھ بے شرم ہونا ہی پڑے گا۔ مجبوراً حقیقت حال بیان کرنا پڑے گی وہ یہ کہ لونڈے بازی کروانے کا بھی شوق باقی تھا۔ چنانچہ یہ چکر میرے ساتھ بھی ہو چکا ہے۔ لیکن چونکہ مجھے اس قبیح عادت سے نفرت تھی مجبوراً خود ہی کروٹ لیتے اعضاء پکڑ کے اپنے میں ڈالنے کی ناکام عیاشی تو اس پر ایک دفعہ یوں فرمایا کہ خلیفہ صلاح الدین کا (جو رشتہ میں سالا تھا)...... (وہی پنجابی لفظ اعضاء) کتنا موٹا اور لمبا ہے اب اس سے غور کریں کہ ان کی عادات رنگ رلیاں اور عشق مزاجی میرے اس لفظ ممبر محفل سیر روحانی سے بالکل صحیح اور سچ ثابت ہو گیا ابھی اور بھی ممبر اور ممبرات محفل ہیں جن کی تعداد جو میرے علم میں ہے پندرہ بیس ہے اور ان سے آگے جاگ لازمی لگے گی۔ جاگ کا کام ہی یہی ہے۔

اب واقعات کرسچین استانیوں کے، ایک کا ذکر لاہور کے اخبارات میں ہوا خبر یوں لگی کہ ''مرزا قادیانی ہوٹل سے ایک لڑکی لے اڑے'' یہ برگینزا ہوٹل لاہور کا واقعہ ہے ایک دوسرے کو بھیجنے پر ناکامی کے بعد مجھے حکم ملا بعد کامیابی شاباش ملی الغرض اسے لے کر سینما جو ملکہ کے بت کے پاس ریڈ کراس آفس کے بالمقابل ہے (پلازا سینما ناقل) مع عملہ گئے انٹرول کے قریب یکدم بھاگم بھاگ کاروں میں بیٹھ یہ جا وہ جا بعد میں علم ہوا کہ کیبن میں یہ کرسچین لڑکی بغل میں لیے ہوئے پیار وغیرہ کرتے تھے باہر سے کسی کی نظر کا نظارہ ہو گیا گویا نام کو استانی اندر خانہ عیاشی۔ اب یہاں اصل معاملہ یوں بیٹھتا ہے کہ قادیان پہنچ کر سینما بینی میں کل دنیا جہان کی خرابیاں گنوائیں خطبہ جمعہ کے سٹیج سے اخبارات رسائل تقاریر کے ذریعہ سینما بینی سے سختی سے منع فرمایا جاتا ہے مگر اس سے پہلے جب بھی لاہور گئے سینما ضرور دیکھا جاتا آیا خیال شریف میں۔

جناب سیکرٹری صاحب امور عامہ معلوم ہوتا ہے سینما بینی سختی سے منع ہونے پر آپ کا حلق خشک ہو گیا ہے فکر نہ کریں میرے پاس تری کا بھی سامان موجود ہے۔ سو محترم من وہ یوں قادیان سے کار لاہور جاتی وہاں سے محترم شیخ بشیر احمد صاحب ایڈووکیٹ بعد جج کے ذریعہ شراب کار کی پچھلی سیٹ کے نیچے چھپا کر لائی جاتی تا کہ عیاشی میں کوئی کمی نہ رہ سکے (حلق ٹھیک ہو گیا ہوگا) مگر صاحب میں معافی چاہوں گا اوپر لکھا تو ''وجہ مظالم'' تھا لیکن مظالم کی بجائے عیاشیوں کی داستانوں میں پڑ گئے مگر جناب مجبور ہوا تھا سو چلیے میرے ساتھ قصر خلافت کے اس مخصوص کمرہ رنگینیوں میں جسے اس اولوالعزم خلیفہ نے مغلوں کی عیاشیوں کا گہوارہ بنا رکھا تھا ملاحظہ ہو بحیثیت فن فوٹو گرافی ایسے ایسے رنگیں نظاروں سے بھلا نظر کیونکر چوک سکتی تھی لہٰذا ہر ہی پہلو سے اچھی طرح محظوظ ہوئے بس اور بس یہی 42 سالہ وجہ مظالم ہے جن کی تلاش کے لیے چوریاں خانہ تلاشیاں، تالے ڈکیٹری میں توڑے تڑوائے گئے۔ سر توڑ کوششیں فرماتے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ناکام و نامراد ہوتے ذلت کے اتھاہ گڑھے میں ڈبکیاں ہی کھاتے رہے۔ اب جبکہ خاموش بیٹھے بھی صبر نہ آیا مجبور کر دیا ''تم صبر کرو وقت آنے دو'' سو وقت آ گیا ہے ڈبکیوں کی بجائے ڈوبنے کا بھلا ان عقل کے اندھوں سے کوئی پوچھے ایسی ایسی رنگینیوں کی تصاویر بھلا کوئی گھروں میں رکھتا ہے خصوصاً جبکہ تلاش میں ہر قسم ذلالت کے حربے استعمال کیے کروائے جاتے ہوں اب وقت آیا ہے ان کے منظر عام پر لانے کا جو پیش کیے جائیں گے تا ان کی عیاشیوں کو حقیقی رنگ میں ننگا کرنے کے لیے بوقت کارروائی ممد و معاون ہوں۔

جناب والا شاید جو وجہ مظالم درج کی ہے اس سے غلط مفہوم اخذ کریں کہ اس خاکسار کا سارا وقت انہی مشاغل میں مبتلا رکھا جاتا تھا زیادہ نہیں صرف تین واقعات گوش گزار کر دوں جیسا کہ اوپر لکھ چکا ہوں کہ ہمارا اس خاندان سے عقیدۂ گہرا تعلق رہا ہے جس کی وجہ سے حضور کے ذاتی باڈی گارڈ کے طور پر ہر وقت ہی حاضر خدمت رہتے جس کی وجہ سے نہ صرف قادیان بلکہ حضور کی ہمرکابی میں قادیان سے باہر جانے کا شرف نصیب رہا چنانچہ اور مواقع کے علاوہ تین اہم واقعے پیش کرتا ہوں۔

1- دہلی کے ایک جلسہ میں تلاوت کے لیے حضرت مرزا ناصر احمد صاحب کو حکم ہوا تلاوت میں زیر زبر کی غلطی بسا اوقات سہواً ہو ہی جاتی ہے مگر وہاں تو مقصد دراصل جلسہ کو درہم برہم کرنے کا تھا ایک ملنٹے نے کھڑے ہو کے شور مچانا شروع کیا ہی تھا کہ اس کے دوسرے ساتھی بھی اس کے ساتھ مل کر لگے بکواس کرنے نتیجہ میں ہلا گلا ہوا ایسا میدان صاف کہ ان کو ہمیشہ یاد رہے گا۔

2- دوسرے سیالکوٹ میں حضور کی تقریر بھولی نہ ہوگی جہاں پتھروں کی بارش چاروں طرف

سے ہوئی۔ میری ڈیوٹی بالکل حضور کے پیچھے تھی سامنے کی طرف چوہدری محمد عظیم باجوہ اس وقت غالباً نائب یا تحصیل دار تھے جنھوں نے منہ پر پتھر کھائے خون بہتا رہا مگر حکم خاموش کھڑے رہنے کا تھا کھڑے رہے حکم ہمیں تو ملنے کے وقت ملا البتہ حکومت کو خبردار کیا گیا کہ پانچ منٹ میں اگر انتظام کر سکتے ہو تو کر لو ورنہ میں (یعنی حضور) انتظام کر دکھاؤں گا۔

تیسرا ہشیار پور اس مکان میں جہاں حضرت مسیح پاک نے چلا کاٹا تھا حضور بھی بغرضِ دعا وہاں تشریف لے گئے کمرہ کے دروازہ سے باہر گو کہ منتظمین نے انتظام پہرہ کیا تھا مگر حضور نے حضرت والد صاحب قبلہ کو دروازہ کے باہر کھڑے ہونے کا حکم فرمایا مجھے مددگار و معاون (حضرت والد صاحب) تا اگر کوئی کام یا بات وغیرہ ہو تو خود وہاں سے نہ ہٹیں بلکہ مجھے بھیجیں بہرحال مطلب اس لکھنے کا یہ ہے کہ کام کرنا ہمیں بھی آتا ہے۔ ایام جلسہ حضور کی روانگی برائے جلسہ و واپسی سٹیج کے پیچھے باڈی گارڈ وغیرہ انہی خدمات بے لوث نے ان کے دلوں میں حسد جلن دکھ درد کو جنم دیا اِدھر خاندان کی نظروں میں گراتے جھوٹی غلط من گھڑت رپورٹیں دیتے منہ کی کھاتے ہم پھر بھی حاضر خدمت ہی رہے اور ہر قسم کے مظالم سہے برداشت کیے۔ 6/9/40 کی خانہ تلاشی کے بعد مجھ سے حضور نے یوں فرمایا۔ عبدالرزاق یاد رکھنا اس کے بعد جب بھی کوئی موقعہ ایسا آئے اور تمہارا ہاتھ اس پر مضبوطی سے پڑتا ہو پھر خواہ کوئی بھی کہے پیچھے نہ ہٹنا جسے میں نے خوب پلے باندھ لیا تبھی جب بھی جماعت نے غلط قدم اٹھانا چاہا بے فکر ہو کے ڈٹ کر سامنا کیا عزت پائی۔ یہ اس لیے پیش خدمت کیے ہیں کہ امیر صاحب محترم کی طرف سے طنزاً حقارت کی نگاہ بھی ڈالی جاتی ہے۔ البتہ ان کی ایک بات بہت ہی پسند آئی جب میرے قانونی نوٹس ملنے کے بعد میرے مکان پر تشریف لائے اور باتوں کے علاوہ یوں فرمایا اگر مجھے گواہی میں طلب کیا گیا تو اس میں بے شک ضرور خطبہ جمعہ کے الفاظ گواہی میں دیں گے۔ مگر فی الحال سوال جماعت کا ہے۔ جس کے جواب میں میں نے بھی یوں کہہ دیا کہ اگر جماعت کو کسی کی عزت کا پاس نہیں تو مجھے بھی کوئی پرواہ نہیں کیوں؟ خلیفہ وقت کا فرمان سمجھیں یا وصیت سو عمل جاری ہے۔

سوءُ آر رائٹ

جناب عالی! اپنی داستان مظالم تو بیان کر دی اب اس خاندان کے ایک فرد کی بھی داستان ''مغلوں کی شکارگاہ'' سولہ صفحاتی سے بھی کچھ فقرے اقتباسات الفاظ وغیرہ پیش کروں جو بالکل میری

ہی داستان بہ پایۂ ثبوت پہنچانے کا رونا رویا ہے۔ اتفاق کی بات ہے کہ یہ تحریر 62-61ء کی لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے جو مجھے 24/9/79 کو کہیں سے ہاتھ لگ گئی حیرانی کی بات یوں کہ میں نے اس داستان مظالم کو عرصہ سات آٹھ ماہ سے لکھنا شروع کیا کبھی دو لفظ کبھی چار دماغ شل ذرا سا سوچنے سے سر پھٹنا شروع ہو جاتا اور پھر لطف یہ کہ گھر میں لکھ نہیں سکتا تاکہ بیوی بچے نہ دیکھ پائیں۔ اس طرح جب کبھی وہ سوئے اتفاق سے کہیں گئے تو دو چار سطور لکھ پاتا خدا کا شکر ہے کہ آج تک گھر کے کسی بھی فرد کو اس کا علم نہیں اور اسے مکمل لاہور آ کر رہا ہوں جناب عالی یہ مناسب سمجھئے کہ پہلے ان حضرت مرزا ناصر احمد صاحب کے خلیفہ بننے اور پھر اپنے عہد کے کارناموں کی جھلکیاں ملاحظہ ہو جائیں۔

ایک جلسہ سالانہ پر حضور افتتاحی تقریر کے لیے جانے کو تیار تھے، ان دنوں مولانا عبدالمنان صاحب عمر پر عتاب کا زمانہ تھا اس افتتاحی تقریر میں مولانا موصوف کو معافی کا اعلان ہونا تھا کہ یہ حضرت دوڑے پہنچے پستول سینہ پہ تان گویا ہوئے۔ ابا حضور سنا ہے آپ منان کی معافی کا اعلان کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟ فرمایا ہاں۔ ادھر سینہ پر پستول کی نالی مجبور ہوئے یہ کہنے پر کہ اچھا نہیں کیا جاتا۔

پھر ایک جلسہ سالانہ ہی کے موقع پر میرے بڑے بھائی عبدالقادر صاحب پر قاتلانہ حملہ کروایا جاتا ہے جس کی اطلاع مجھے دوسری صبح ہی مل گئی جس پر نگران بورڈ کو تحریری نوٹس یوں دیا کہ اگر میرے خاندان کے کسی بھی فرد کے متعلق کسی بھی قسم کی غلط حرکت ہوئی تو اس صورت میں مجھے مجبور کیا جائے گا کہ بلا امتیاز رتبہ مرد وزن کے خلاف کارروائی کروں۔ اس کے بعد ایک رشتہ کے موقعہ پر جبکہ لڑکے والے عقیدۃً اخلاصاً تجویز پیش کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو (ترقی ایمان کا موجب ہے) فرماتے ہیں میرے ماموں کی صاحبزادی (خلیفہ علیم الدین) ہے چنانچہ وہیں نکاح پڑھواتے چھٹکارا ہوا سبحان اللہ یہی مقام خلیفہ وعمل اسلام ہے اس پر اللہ کی قدرت کا نظارہ ملاحظہ ہو جائے۔ ان کے داماد کو ایک درزن پر لٹو کرواتے ان کی بیٹی صاحبہ کو طلاق دلواتے۔ جو کسی کے لیے گڑھا کھودتا ہے خود اس میں گرتا ہے سبحان اللہ مقام عبرت ہے۔

اسی طرح ان کے بیٹے (مرزا لقمان احمد) کسی خاندان کی نور نظر پر لٹو رہتے، مجبور کرتے شادی اپنی مرضی کی کرتے ہیں اب ان کو ولایت تعلیم کے لیے بھجوایا جاتا ہے آخر جاگ لگتی ہے۔ یوں لگی کہ وہاں شرابی مشہور ہوئے عیاشیوں میں مزے لیتے چنانچہ واپس امام مسجد (بشیر رفیق) لندن کی رپورٹ پر بلوایا جاتا ہے جو پاکستان پہنچ کر اپنی بیوی کو طلاق دے دیتا ہے۔ اصل چیز ملاحظہ ہو امام مسجد کچھ رشتہ دار تھا لڑکی کا، جس پر حکم اسے دیا گیا کہ ہمارا پوتا ہمیں دلوا دو ورنہ تمھیں امامت مسجد

لندن سے چھٹی، کیوں جی یہی مقام خلیفہ ہے نا۔ اسی طرح جب آپ حضور ولایت تعلیم کے لیے تشریف لے جاتے ہیں تو ان کی خوشدامن صاحبہ جو خاندان کی اچیاں پچیاں خوب جانتی تھیں مگر حضور کو کن محتاط الفاظ میں نصیحت فرماتی ہیں۔ محبوب حقیقی کی امانت سے خبردار، خاندانی اچیاں پچیاں یا مرض، جاگ لگی کے اوپر دو نمونے یہ تیسرا اور کتنے پیش کروں بوقت کارروائی سہی۔

خلیفہ بننے کے خوابوں کے طور طریقے بھی ملاحظہ ہوں۔

اپنے سوتیلے بھائی مرزا رفیع احمد صاحب کو کیوں اور کیونکر نظر بند رکھا گیا اور ان کی کوٹھی کے گرد امور عامہ کا پہرہ، جو آتے جاتے کو امور عامہ میں لے جاتے، بازپرس کی جاتی دور کی بات نہیں مسٹر بٹ سے معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ میں اپنی معلومات سے بھی کچھ پیش کر رہا ہوں اور نام بھی تحریر کر رہا ہوں تا یہ خیال پیدا نہ ہو کہ اس کی تحریر سے نقل کر دیے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ (یو آر رائٹ) بٹ صاحب سے پوچھا گیا تم انھیں کیوں ملنے گئے تو انھوں نے جواب دیا میں خلیفہ ثانی کے بیٹے اور حضرت مسیح موعود کے پوتے کی حیثیت سے انھیں ملنے گیا تھا۔ بہت اچھا جواب تھا، چلیے داستان ''مغلوں کی شکارگاہ'' انہی کے خاندان کے فرد کی بھی زبانی سن لیجیے۔

(1) ''مرزا بشیر الدین محمود احمد امام جماعت کی تشویشناک اور لمبی بیماری کی وجہ سے اہالیان ربوہ کی دردناک داستان غم، کہ نہ ہی ہماری جانیں محفوظ ہیں اور نہ ہی ہماری ماؤں، بہنوں، بہو بیٹیوں کی عزت و عصمت محفوظ ہے۔ حمل کیے اور گرائے دوسروں کے نام دھرے جاتے ہیں۔

(2) کاروبار آنکھ کے اشارے سے تہس نہس کروائے جاتے ہیں۔

(3) ماں باپ بہن بھائی میاں بیوی کو ایک دوسرے کی جاسوسی سے بلیک میل کرنا ان کا مشغلہ بن کر رہ گیا ہے۔

(4) جماعت کو ''فسطائی نظام'' پر چلا کر مادر پدر آزاد ہو کر وہ کار ہائے ''تعیش دام مارگی'' فراڈ، قتل و غارت، ظلم و ستم، لوٹ مار، ریا، دغا و فریب اور نہ معلوم کیا کیا ''مغلوں کی شکارگاہ'' سمجھتے نہ ڈرتے نہ ہی شرماتے ہیں کہ مذہبی دیوانے اب ان گناہوں کو گناہ نہیں جزو ایمان سمجھنے لگ گئے ہیں۔

(5) جاسوسی کے جال گھروں سے نکل کر حکومت کے دفاتر ہی نہیں بلکہ افسروں کے کمرہ سے لگ چکے ہیں۔ ہر جائز و ناجائز طریق سے راز نکلوائے جاتے ہیں یہاں تک کہ حکومت کو اعتراف کرنا پڑا کہ موجودہ مرزا قادیانی کے بڑے صاحبزادے مرزا ناصر احمد اس کام

کے سرپرست اعلیٰ ہیں (کیوں صاحب آیا یقین اسی وجہ سے احمدیوں کو اعلیٰ پوسٹوں سے الگ کیا گیا)

(6) روپیہ سمیٹنے کے لیے تحریکوں کے نام عوام سے اسلام و احمدیت کی بقا کے نام پر، قوم کے ننگ و ناموس کے نام پر اپنے کارکنان کے ذریعہ مختلف عہدوں کے لالچ میں لاکر سوشل بائیکاٹ کی دھمکیاں لفظ منافق کا کھلے بندوں اطلاق۔

(7) مرزا قادیانی کے ہمزلف جسٹس شیخ بشیر احمد کی ایک میٹنگ میں بول اٹھے جائیں تو جائیں کہاں ان چھ چھ بیٹیوں کو ان لوگوں کو ناراض کر کے کہاں بیاہا جائے گا۔

(8) مرزا محمود احمد کی بیماری پر من گھڑت خطبات وغیرہ چھاپتے رہیے بالکل سراسر جھوٹ دراصل مرزا محمود کثرتِ جماع کی وجہ سے دماغی توازن کھو بیٹھے ہیں۔

(9) مغلیہ خاندان کے ہتھکنڈے باپ کو قید میں ڈال کر خلافت پر قبضہ کے خواب

(10) اس خاندان کے افراد کا پورا پورا تسلط اور قبضہ ہو چکا ہے ان کی من مانی کے خلاف ذرہ سی جنبش انسان کو مکھن سے بال کی طرح باہر نکال پھینکنے کے لیے کافی ہے۔

(11) کرنل داؤد (ثالث صاحب کا بھتیجا) کو ناظر امور عامہ ربوہ بنانے کو تو بنا دیا لیکن کرنل داؤد نے ان ٹرسٹیوں کی بدعنوانیوں فراڈ پر احتجاج کیا تو اسی وقت چھ گھنٹے کے نوٹس پر کوٹھی خالی کروا کے ربوہ بدر کر دیا گیا۔

(12) اسی طرح محترم بابو عبدالحمید ریٹائرڈ ریلوے آڈیٹر جو صدر انجمن احمدیہ کے بھی آڈیٹر تھے شدید قسم کی مالی بے اعتدالیوں کے سامنے احتجاج کر بیٹھے، اس وقت بیک جنبش قلم بال بچوں سمیت ربوہ بدر کر دیا گیا مگر وہ تمام ریکارڈ جو ان ٹرسٹیوں کی لاکھوں روپیہ کی ہیرا پھیریوں کا آئینہ دار تھا ساتھ لے گئے۔

(13) کہنے کو تو صرف گزارہ الاؤنس لیتے ہیں لیکن کوٹھیوں، رہائش زیبائش کی یہ حالت لونڈے، لونڈیاں، نوکر چاکر، مالی، گیٹ کیپر، ذاتی باڈی گارڈ، فرقان فورس کے نوجوانوں کی تنخواہیں، صدر انجمن کی زمینیں تجارتی فیکٹریاں فلور ملیں کارخانے انجمن کے سرمایہ سے ذاتی ناموں پر منتقل ہو رہے ہیں۔ کہنے کو تو لنڈن مشن کی Inspection کا نام مگر علاج Glands کے کروانے جاتے ہیں۔ واپسی پر ائر کنڈیشن سیٹ مہاراجہ پٹیالہ کے محل کے نمونہ کے بیڈ ٹیپ ریکارڈ کے علاوہ......

(14) قریشی عبدالرشید کی مدد سے جماعتی روپیہ اپنی تحویل میں لے کر وکیل المال تجارت،

تحریک جدید کا روپیہ ایک فرم میں شکمی چکمہ دے کر قبضہ کیا جاتا ہے۔ کہیں چیئرمین کہیں مینجنگ ڈائریکٹر کہیں ڈاکٹر بن کر جماعت کے کاروبار پر اپنے مالکانہ حقوق جمائے جاتے ہیں۔ مرزا حفیظ آنکھ جھپکتے پرموٹر کارپوریشن لمیٹڈ کے ذریعہ اپنے بھائیوں مرزا ناصر، مرزا مبارک وغیرہم کی شہ پر اندازاً چھ لاکھ روپیہ کیسے دبا کر بیٹھ گئے (اسی طرح زمین مسجد کراچی کے چندہ کی رقم مرزا طاہر لے گئے جس سے بیعانہ بھی گیا اور اصل بھی جس سے اکثر چخ چخ ہوتی رہتی ہے۔

(15) مرزا قادیانی کی لمبی بیماری کی وجہ سے آج ربوہ کی بستی و نظام دہشتناک آہنی پردہ کے اوپر ریاست اندر ریاست کا ایک جیتا جاگتا نظارہ پیش کرتا ہے۔ ڈکٹیٹر شپ کی اس دہشتناک اور شرمناک فضا میں اہالیان ربوہ اپنی زندگی کی آخری سانس لے رہے ہیں۔

(16) خلیفہ کا انتخاب انسانی کوششوں کے نتیجہ سے نہیں بلکہ اپنے تصرف سے کرواتا ہے۔ مرزا قادیانی ذہنی خلفشار میں مبتلا ہوئے تو مرزا ناصر احمد اپنے باپ کے مرنے کی امید میں گھڑیاں گن گن کر گزارتے۔ موقعہ پاتے اپنے ابا حضور سے بدیں مضمون تحریر لکھوائی یا دستخط کروائے کہ ''میرے مرنے کے بعد ناصر احمد کو خلافت پر منتخب کر لیا جائے'' اور یہ تحریر الائیڈ بینک میں جمع بھی کروادی گئی، یہ عالم احمدیت سے فراڈ نہیں تو کیا ہے۔

(17) خود تو موچی دروازہ لاہور کی کشمیری ماں سے رائل فیملی کہلانے کے متمنی تو دوسروں کو لونڈیوں کی اولاد سے منسوب کرتے نہ جھجکتے نہ شرماتے، خود ''پدرم سلطان بود''

(18) اپنی سوتیلی بہن و بھائی امت الرشید بیگم خلیل احمد کے خلاف خوف و ہراس، پبلک کی نظروں میں ذلیل، غدار منافق کے لیبل لگا کر سوشل بائیکاٹ ربوہ بدر کے ہتھکنڈے امور عامہ کی CID کے بل بوتے فرقان فورس کی بندوقوں کے سائے تلے قتل کی دھمکیاں دی جاتیں حتیٰ کہ 26/12/61 جلسہ سالانہ کے موقع پر ان کی کوٹھی کا محاصرہ کرتے وہ اودھم مچایا غنڈہ گردی کی کہ الامان والحفیظ جس کے نتیجہ میں کرنل ابراہیم، ڈاکٹر یعقوب، لیفٹیننٹ کمانڈر یحییٰ، قاضی اسلم اور عبدالقادر مہتہ جیسے آدمیوں نے پُرزور پروٹیسٹ کیا۔

(19) مغلیہ خاندان کی ہسٹری گواہ ہے عیاشیوں کے سبب تخت و تاج سے دستبرداری اقتدار کے حصول کے لیے سگے بھائیوں نے سوتیلے بھائیوں کی آنکھیں نکلوا دیں، قتل کروائے، باپ بیٹے کے ہاتھوں جیل کی زندگی میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے پر مجبور ہوا۔ اگر باپ بیٹے سے کہتا ہے اس قید میں بچے ہی پڑھنے کے لیے دے دو تو شہزادے طنزاً جواب میں

کہتے ہیں ''اچھا ابا حضور حکومت کا نشہ ابھی نہیں اترا'' جناب ملاحظہ فرمائیں۔ میری داستان مظالم کی کماحقہ تائید ''گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے'' کو کیونکر جھٹلایا جا سکتا ہے۔

اہالیان ربوہ کی ماؤں، بہنوں، بیٹیوں، بہوؤں کی عزت وعصمت سے کھیلے، حمل کیے اور رکھے نام دوسروں کے اپنی تقدس مآبی کا سکہ بٹھانے کو، پوچھا جائے وہ کون سے دوسرے ہیں جن سے کن کو حمل ہوا اور پھر کیا سزا دی۔

خلیفہ ثانی کے دور میں ہونے والے غنڈہ گردی کے واقعات میں سے چند بطور نمونہ، آپ کی معلومات میں اضافہ کے لیے پیش کرتا ہوں۔

(1) ''فتنہ مستریاں'' بنام مستری فضل کریم پسران عبدالکریم، زاہد کریم، ان کا مکان غنڈوں سے تہس نہس کیوں کروایا۔

(2) شیخ عبدالرحمٰن مصری ہیڈ ماسٹر مدرسہ احمدیہ مصر میں تعلیم دلوائی اور پھر 1924ء میں ولایت ہمرکاب بھی ہوئے اتنے میں بالغ ہو گئے کون ان کے بچے اور پھر ان سے کیا کیا نہ ہوا......

(3) شرف الدین درزی رشتہ دار ماسٹر ماموں خاں صاحب ڈرل ماسٹر کھیتوں میں ایسی پٹائی کروائی کہ اپنی طرف سے ختم کروا دیا مگر جسے اللہ رکھے۔

(4) فخرالدین ملتانی پر قاتلانہ حملہ عزیز نامی قلعی گر سے کرواتے پھانسی کی سزا پاتے اس کی نعش کا جلوس یوں جیسے شہید کا مرتبہ پایا ہو۔

(5) مولا بخش قصائی کا غالباً سالا تھا دفاتر انجمن کی چھت پر سے امور عامہ کے دفتر کے سامنے کھڑا کسی بات پر دھکا دلوا کر نیچے گروا کر مروا دیا گیا۔

(6) تعلیم الاسلام سکول بعد میں کالج کے تالاب میں غلام رسول پٹھان دوکاندار کی ابھرتی جواں سال خوبصورت بیٹی کا مرنا۔

(7) محمد یامین خان پٹھان کو چوہدری فتح محمد سیال ناظر اعلیٰ کے مکان پر قتل کروایا گیا۔

(8) ام وسیم کے گھر کے کوڑے کباڑے کے کنستر سے نوزائیدہ بچے کی نعش ملنا اور خاکروبہ کے شور وغل پر انعام واکرام دے کر خاموش کروایا جانا۔ آپ بھلا کیا کیا جانیں جناب۔ پولیس کے چار آدمی ہوتے تھے جو ہمیشہ خریدے جاتے تھے، اسی طرح ایک کارنامہ جماعت کراچی کے ذریعے لطفی کے قتل کا انجام پذیر ہو چکا ہے وہ بھی یاد تازہ کرنے کو سن لیجئے۔

مولانا عبدالرحیم درد (جو پرائیویٹ سیکرٹری حضرت خلیفہ ثانی تھے) کے ایک بیٹے لطفی نامی نے دفتر سے کچھ نہایت ہی اہم کاغذات اڑا لیے مکرم بھائی صاحب عبدالقادر مہتہ کو علم ہونے پر ایک

حصّہ گراں رقم کے عوض قبضہ کرایا بقیہ لانے کا موقع اس کو یوں نہ ملا کہ بعد تلاش ربوہ سے دوحواری ایک نظام جائیداد (بہلول پوری غالباً) دوسرے امور عامہ کا S.P عزیز بھامڑی جو مجھ پر مظالم میں پیش پیش ہوتا تھا انھوں نے پیر کالونی میں اسے جالیا۔ محبّت پیار سے باتوں میں مٹھائی کھلائی صبح ایک دم مردہ اٹھا ربوہ پہنچ گئے قدرتی موت کا سرٹیفکیٹ غالباً ڈاکٹر جمال الدین جو دراصل ایکسرے ایکسپرٹ تھا سے مجبور کر کے لکھوایا۔ معلومات پر جب معلوم ہوا کہ وہ کاغذات کا ایک حصّہ مہتہ صاحب کو دے دیا گیا ہے۔ سٹ پٹاتے یوں بولے تو نے بیڑا غرق کر دیا ''مغلوں کی شکار گاہ'' والے نے کیا خوب لکھا ہے کہ ''مذہبی دیوانے اب ان گناہوں کو گناہ نہیں بلکہ جزوایمان سمجھنے لگ گئے ہیں۔ جھوٹ بولو بلواؤ جھوٹے سرٹیفکیٹ مجبور کر کے حاصل کرو تا اپنے آپ کو زرخرید غلام ثابت کرسکو سبحان اللہ۔ جناب عالی! آپ نے فضل عمر اولوالعزم خلیفہ کے کرتوتوں عیاشیوں کی داستانیں سنی، پڑھیں۔ ڈوب مرنے کا مقام کہ کلام مجید کے مطابق اپنے آپ کو خلیفہ کہنے والا نماز کی ادائیگی نجس حالت میں کرے۔ حضرت مسیح موعود نے ''دنیا کی سب دوکانیں ہم نے ہیں دیکھی بھالی'' میں نے جن دوکانوں کا ذکر کیا ہے وہ (دوکانیں کاروباری نہیں کیونکہ یہاں تو کاروبار کا سوال نہیں یہاں تو تبلیغ دین اسلام مراد ہے) دوکانوں کا لفظ استعمال کر کے تنبیہ فرمائی کیونکہ ان کے اعمال اور کرتوتوں نے ان کو بھی اسی صف میں کھڑا کیا جیسے ایک بالکل چھوٹی سی دکان والا اپنے گاہک کو نسبتاً اپنے سے بڑی دوکان والے سے پھیرے مثلاً کراچی میں ثناء اللہ کی دوکان بہت مشہور ہے کہ اس کے سیلز مین ٹیکٹ فل (Tactful) ہوتے اپنے گاہکوں کو آخرکار پلہ ڈال ہی لیتے ہیں۔ مگر دوسرے بچارے محروم۔ بعینہٖ اسی طرح انھوں نے بھی ٹیکٹ خطبات ارشادات تقاریر اپنا لیے پیسہ کے پیر بن رہے ہیں ''عزت و آبرو کی پرواہ نہیں'' دور نہ جایئے خلیفہ ثانی کو ایک پلہ میں تو خلیفہ ثالث کو دوسرے پلہ میں ڈالیے پرکھ لیجیے خود ٹیکٹ واضح ہو جائے گا۔ تو اس طرح امیر کراچی بھی بسا اوقات چندوں وغیرہ کے سلسلہ میں جو جلال میں آتے ہیں وہ جھاڑ پلاتے ہیں کہ نہ مرد حضرات اور نہ مستورات کو بخشتے ہیں غرض صرف اور صرف پیسہ گویا اخلاص مخلص، مخلصی ایمان نہیں پیسہ ہے جو بولتا ہے اور خطبات میں واہ واہ کرواتا ہے۔ اس ضمن میں ایک واقعہ عرض کردوں قادیان میں کیا تھا چھوڑ دیجیے، کراچی میں قالینوں کی درآمد برآمد کر کے ایک دفعہ دس ہزار برائے اشاعت قرآن دیے بس پھر کیا خطبات میں متواتر مخلصی کے گن گائے گئے اس کے بعد پھر کبھی کچھ روپیہ دیتے ہیں تو نام کے اعلانات کا منع کر دیتے ہیں۔

جناب عالی! مندرجہ بالا مظالم ٹھہرے میری ذات سے لیکن اب سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے، قرآن پاک کی غیرت آپ کو کیونکر جھنجھوڑے۔ آپ نے جلال امور عامہ اور امارت

کی ایمانی بجلی روشناس کرنی ہے یا رُوگردانی، جیسے امور عامہ پہ باندھتی ہے تو امارت خطبات کے سٹیجوں پہ کھڑے ہوتے دوسروں کی عزت و آبرو سے کھیلتے ان کے خلاف نفرت کا بیج بوتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ اسلام کی تعلیمات قرآنِ پاک کی عظمت پر کلوخ اندازی کرنے کے خلاف کیونکر آپ کا جلال رونما ہوتا ہے۔

1- اس طرح نجس حالت میں نماز کی ادائیگی حکمِ خدا سنتِ رسول اور اسلام سے کھلی بغاوت اور خدا سے فریب کرنا نہیں تو کیا۔

2- بیٹیوں سے عیاشیاں کرنا کرانا نیکی، پرہیزگاری اور تقویٰ کے پردے میں کھلم کھلا خلافت راشدہ کی توہین نہیں تو اور کیا ہے؟

3- کیا یہی وہ مقام عیاشی ہے جس کی ظاہری اور باطنی صفائی کے صدقے بہشتی مقبرہ کے قطعہ خاص الخاص میں دفنائے جانے کا اعزاز خلیفہ کو ہر قسم کی ریا کاریوں کے طفیل ہوتا ہے۔

اپنی اس درخواست کو جو اپنی قسم کی پہلی اور آخری ہوگی، مندرجہ ذیل الفاظ کے ساتھ ختم کرتا ہوں۔

1953ء کے خونی واقعات و حادثات، پڑھیں (منیر انکوائری رپورٹ) ''کہ وہ بچہ ابھی مرا نہیں'' گویا کسی بھی وقت وہی خونی ہولی دوبارہ کھیلی جا سکتی ہے۔

اگر اس درخواست کو جھوٹ، الزام تراشی تصور فرمائیں تو تادمِ تحریر ایک بیگم صاحبہ اور دو صاحبزادیاں پاکستان میں بقید حیات ہیں۔ تصدیق و تسلی آسان ہے یہ تو حقیقت ہے کہ بے شرموں کو بے شرم ثابت کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ قربانی دینی پڑتی ہے۔ لہٰذا

ظالم کو ظلم کی برچھی سے تم سینہ و دل برمانے دو
یہ درد رہے گا بن کے دوا تم صبر کرو وقت آنے دو

محمد حنیف ندیم

ربوہ کی کہانی، مرزا طاہر کی زبانی

ہفت روزہ ختم نبوت کے شمارہ نمبر 36 میں ایک قادیانی نوجوان زاہد عباس سید کا مضمون شائع ہوا ہے جس میں اس نوجوان نے ربوہ میں بغاوت کی اٹھنے والی لہروں کی نشاندہی کی تھی۔ اس مضمون میں قادیانی نوجوان نے یہ بھی بتایا تھا کہ اب وہاں کے نوجوان:

1- مرزا طاہر کے ملک سے فرار پر نکتہ چینی کر رہے ہیں۔

2- مرزا طاہر کے باپ مرزا محمود پر بدکاری کے الزامات زیر بحث ہیں۔

3- یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ مباہلہ کا شوشہ اصل مسائل سے توجہ ہٹانے کے لیے چھوڑا ہے۔

4- یہ بات بھی زیر بحث ہے کہ مرزا قادیانی کی پیش گوئی ''کتا کتے کی موت یعنی کتے کے عدد پر مر گیا'' اس کا مصداق مرزا محمود تھا جو باون ویں سال میں 11 سال تک فالج میں مبتلا رہ کر مر گیا۔

5- وہاں دانشوروں کا ایک طبقہ کھل کر رائل فیملی اور اس کے کارندوں پر تنقید کرتا ہے اور مرزا طاہر نے ان سے سوشل بائیکاٹ کی تلقین کی ہے۔

الغرض اس مضمون میں ربوہ کی اندرونی صورت حال کو واضح طور پر پیش کیا تھا۔ ممکن ہے کہ قادیانی یہ کہیں کہ ربوہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔ وہاں کوئی بغاوت نہیں، سب لوگ رائل فیملی کے وفادار ہیں۔ اس لیے ہم ذیل میں مرزا طاہر کے ایک طویل بیان کے اقتباسات پیش کر رہے ہیں، جس میں اس مضمون کی تصدیق ہوتی ہے لیکن ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ مرزا طاہر کے بیان کا خلاصہ پیش کر دیں، جس سے مرزا طاہر کے بیان کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ خلاصہ یہ ہے:

- ربوہ میں بدیوں کے اڈے بن چکے ہیں۔
- پیشہ ور اور عادی مجرم برائیاں پھیلانے کا کاروبار کرتے ہیں۔
- ''احمدی'' (قادیانی) شراب کا کاروبار کرتے ہیں۔
- ربوہ میں برے لوگوں کے لیے عملِ جراحی کی ضرورت ہے۔

- o وہاں ماحول دیکھ کر لوگ بھاگنا شروع کر دیتے ہیں۔
- o ناظر سودا لانے کے لیے کار استعمال کرے تو تنقید کرتے اور پھبتیاں کستے ہیں۔
- o کسی کے گھر کے اچھے حالات دیکھیں تو اس کا لندن ہاؤس، پیرس ہاؤس نام رکھتے ہیں۔
- o وہ غلطیاں کرتے ہیں تو یہ پکڑنے والے (تنقید کرنے والوں کی طرف اشارہ) کون ہوتے ہیں۔
- o وہ آگ میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ زبان ہے کہ رکنے کا نام نہیں لیتی۔
- o حسد سے دانشوری پیدا ہو رہی ہے۔
- o (قادیانی مبلغ جنھیں مربی کہا جاتا ہے) دبی زبان میں شکوے کرتے ہیں کہ ہم سے یہ ہوا، وہ ہوا۔ ہماری فلاں جگہ تقرری ہونی چاہیے تھی۔
- o فلاں شخص نے ظلم کیا، مجھے نیچا دکھانے کے لیے یہ کیا، وہ کیا۔
- o نئی نسل شتر بے مہار کی طرح جدھر چاہے، سر اٹھائے نکل جاتی ہے۔
- o اگر کسی واقفِ زندگی نے اپنی اولاد کو لاہور شالامار باغ کی سیر کرا دی، لاہور لے گیا تو آگ لگنے کی کیا ضرورت ہے۔ کون سا عظیم گناہ اس سے ہو گیا کہ اس کو طعن و تشنیع کا نشانہ بناؤ۔
- o کاریں استعمال نہ کریں ساتھ دو قدم پر بازار ہے۔ پیدل چلیں خواہ مخواہ کار کا استعمال اچھی عادت نہیں۔
- o جنھوں نے جلنا ہے، انھوں نے جلنا ہی ہے۔

قارئین کرام! یہ مرزا طاہر کے بیان کا نچوڑ اور خلاصہ ہے۔ اب آپ اصل بیان کے اقتباسات ملاحظہ کریں۔

''میں نے تربیتی امور کا جو سلسلہ شروع کیا تھا، اس میں بار بار ربوہ کا نام لیتا رہا ہوں، ایک مثال کے طور پر۔ لیکن جیسا کہ میں نے واضح کیا تھا، دراصل ربوہ کی اس مثال کا تعلق دنیا کی ساری جماعتوں سے ہے۔''

''جہاں تک میرے گزشتہ خطبے میں اس نصیحت کا تعلق ہے کہ تربیت، نرمی اور شفقت، محبت اور پیار اور سمجھانے کے ذریعہ کی جاتی ہے، سختی سے نہیں کی جاتی۔ یہ بات بالکل درست ہے، اس میں کوئی تبدیلی نہیں لیکن اس سے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ پیشہ ور مجرموں سے نرمی کرنی چاہیے اور ان کے جرم کو نظر انداز کر دینا چاہیے اور انھیں معاشرے کے ساتھ ظلم کرنے سے باز رکھنے کے لیے کوئی

کوشش نہیں کرنی چاہیے۔

بعض بدیوں کے اڈے بن جاتے ہیں۔ یعنی لفظ ''پیشہ ور'' اس طرح تو ان پر اطلاق نہیں پاتا لیکن ''پیشہ وری'' کا لفظ ایک محاورہ بن چکا ہے یعنی ''عادی مجرموں'' کے لیے بھی آپ ''پیشہ ور مجرموں'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ پس ان معنوں میں بعض جگہ بدیوں کے ایسے اڈے بن جاتے ہیں جن کو ہم ''پیشہ ور'' اڈے کہہ سکتے ہیں اور وہاں سے برائیاں پھیلانے کے کام ہوتے ہیں۔

بظاہر ایک دکان ہے، ایک جنرل سٹور ہے۔ وہاں کاروبار تو ہونا چاہیے۔ ان سودوں کا جن سودوں کو حاصل کرنے کے لیے لوگ وہاں حاضر ہوتے ہیں، لیکن بسا اوقات وہاں بدیوں کے کاروبار بھی شروع ہو جاتے ہیں اور آپ ہمیشہ وہاں قابلِ اعتراض حرکت کرنے والوں کو قابلِ اعتراض حالت میں لمبے عرصے تک پائیں گے اور کئی قسم کی خرابیاں وہاں سے جنم لیتی ہیں۔

تو جہاں تک نظام کا تعلق ہے، نظامِ جماعت کو وہاں ضرور دخل دینا چاہیے۔

احمدی دکاندار ربوہ سے باہر بھی ہو سکتے ہیں اور وہ بھی اس قسم کی خرابیوں میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ یورپ میں بعض احمدی دکانداروں کے متعلق مجھے معلوم ہوا ہے کہ ان کے ہوٹل کے کاروبار ہیں اور وہاں شراب بھی بکتی ہے۔ چنانچہ جب میں نے اس بات پر اصرار کیا کہ آپ کو یہ کاروبار چھوڑنا ہوگا تو بڑی بھاری تعداد ایسی تھی جنھوں نے اس کاروبار کو ترک کر دیا (جس کا مطلب یہ ہے کہ کچھ قادیانیوں نے اب بھی شراب کا کاروبار نہیں چھوڑا۔ ندیم) تو اس صورت حال کے مطابق مختلف کارروائی کرنی ہوتی ہے۔ مگر نظامِ جماعت کو سب دنیا میں مستعد ہو کر، جہاں تک احمدیوں کا تعلق ہے، ان کو برائیوں سے متعلق نہ رہنے دیں اور ربوہ جیسے شہر میں جہاں انتظامیہ کا دخل عام شہروں کے مقابلے پر زیادہ ہے، کیونکہ وہاں بھاری اکثریت احمدیوں کی ہے اور احمدیوں کی رائے عامہ کو جس قوت سے استعمال کیا جا سکتا ہے، اس قوت سے غیر شہروں میں بسنے والے احمدیوں کی رائے عامہ کو استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ تو Firmness اور سختی سے میری مراد یہ ہے کہ پہلے باقاعدہ ایک منصوبہ بنا کر ایسے لوگوں کو نصیحت کی جائے۔ ان کی برائیاں ان پر کھولی جائیں۔ ان کو بتایا جائے کہ تم ان حالات میں بالکل غلط سمت میں جا رہے ہو۔

ان لوگوں کو تلاش کیا جائے جن کا ان پر اثر ہوتا ہے اور رفتہ رفتہ ایسے لوگوں پر دباؤ بڑھایا جائے۔ پھر اس دباؤ کو نسبتاً عام کیا جائے اور رائے عامہ کو منظم کر کے اس کے ذریعے دباؤ کو بڑھایا جائے۔

پس اس پہلو سے، ربوہ کا شہر ہو یا دوسرے ایسے مقامات ہوں جہاں احمدیوں کی کچھ

آبادیاں، جہاں اس قسم کی بدیاں دکھائی دیتی ہیں، جہاں الگ الگ گھر ہیں لیکن بچوں میں کچھ کمزوریاں نظر آ رہی ہیں، ان سب باتوں کا رائے عامہ سے مقابلہ کریں۔

لیکن پھر بھی بعض بیمار ایسے ہیں جن پر نسخے کارگر نہیں ہوا کرتے۔ ان کی بیماری اس حد تک بڑھ چکی ہوتی ہے۔ ایسے لوگ پھر نتھر کر سامنے آ جاتے ہیں۔ وہاں پھر عمل جراحی بھی ہے۔

پس اس پہلو سے ربوہ کا عمومی معیار بلند کر دیا جائے یا دوسری احمدی بستیوں کا معیار بلند کیا جائے کہ وہاں مریض لوگ بے چینی محسوس کریں۔ بدیوں کے شکار سمجھیں کہ یہاں کوئی مزہ نہیں آ رہا۔ یہ جگہ ہمیں قبول نہیں کرتی۔ ان لوگوں کو معاشرہ رد کر دے۔ معاشرہ ان لوگوں سے تعلق کاٹ لے۔ بغیر اس کے کہ مقاطعہ کا اعلان ہو۔ معاشرے کا عملی وجود مقاطعہ کر رہا ہو اور یہ ظاہر کر رہا ہو کہ ہم الگ ہیں تم الگ ہو۔ تمہاری ہمارے اندر کوئی گنجائش نہیں ہے۔ جب یہ احساس دلوں کے اندر پیدا ہو تو پھر ایسے لوگ ان شہروں کو چھوڑ کر بھاگنا شروع کر دیتے ہیں۔

جہاں تک بدیوں کے اڈوں کا تعلق ہے، بعض بیہودہ حرکتوں والے ایسے اڈے جہاں بدیاں دکھائی دیتی ہیں، ان کے متعلق اور بھی بہت سی ایسی باتیں ہیں جیسا کہ میں نے پہلے بھی بیان کیا تھا کہ ان سے زیادہ دلکش اڈے بھی تو بنانے چاہئیں۔ یہ نہیں کہ بعض اڈے آپ بند کر رہے ہوں۔ ان کی جگہ دوسرے اڈے جاری ہونے چاہئیں، جہاں نوجوان بے کار لوگ، غریب لوگ، جن کے لیے لذت یابی کے کوئی سامان نہیں ہیں، جن کو تسکینِ قلب کے لیے کچھ میسر نہیں، ان کو معاشرہ یہ چیزیں مہیا کرے۔

مثال کے طور پر اگر ربوہ میں کسی ناظر نے سودا لانے کے لیے اپنی کار استعمال کر لی تو ان لوگوں کو یہ خیال نہیں آیا کہ اس کی جو تعلیم ہے، اس کی جو پرانی قربانیاں ہیں، اس کو جس قسم کی صلاحیتیں خدا تعالیٰ نے عطا فرمائی ہوئی تھیں، وہ اگر یہ دنیا میں استعمال کرتا، جس طرح دوسرے دنیا داروں نے کی ہیں، تو جس حال میں اب وہ رہ رہا ہے، اس سے بیسیوں گنا بہتر حال میں ہوتا۔ اگر جماعت نے اس کو کار دے دی اور اگر اس نے اپنا سودا لانے کے لیے بھی استعمال کر لی تو تمھیں جلنے کی کیا ضرورت ہے؟ لیکن وہ اسی پر پھبتیاں کستے رہیں گے۔ اس پر ان کا دل آگ میں جلتا رہے گا کہ ان کو یہ چیزیں کیوں نصیب ہوئیں، انھوں نے یہ چیزیں کیوں استعمال کیں۔

کسی گھر کے اچھے حالات دیکھے تو اس کا نام ''لنڈن ہاؤس'' رکھ دیا، کسی گھر کا نام پیرس ہاؤس رکھ دیا۔ یہ ہے اولی الالباب غیر (دینی۔ ناقل) جو اللہ تعالیٰ کے بیان کردہ۔ ناقل) اولی الالباب کے بالکل مدمقابل طاقتوں کی پیداوار ہے اور ان کی سوچ اور طرز فکر کا نتیجہ سوائے مزید جلن

کے اور کچھ بھی نہیں ہے۔ کسی انتظامیہ سے جھگڑا ہو گیا، کسی امیر سے ناراض ہو گئے، اس کو پھر ساری عمر معاف ہی نہ کیا۔ ان کے خلاف ہر وقت مجلسوں میں تنقید۔ کبھی سوچتے نہیں کہ اس جماعت کے کارکنوں میں، اس کی مجلس عاملہ میں ایسے ایسے کارکن ہیں، جنھوں نے ساری زندگیاں، اپنے سارے وقت کو جماعت کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ جب تم لوگ آرام کرتے تھے، جب تم لوگ سیر و تفریح میں لذتیں حاصل کیا کرتے تھے، یا گھروں کی مجلسوں میں بیٹھے ہوئے تھے، یہ لوگ جماعت کے کام کی خاطر دن رات کبھی دفتروں میں، کبھی لوگوں کے گھروں میں پھر کر چندہ اکٹھا کرتے ہوئے، کبھی نصیحتیں کرتے ہوئے، کبھی مجلسِ عاملہ کے اجلاس میں، گویا کوئی اور شغل ہی نہیں۔ جنھوں نے ساری زندگی...... وقف کر دی، اگر ان سے غلطیاں بھی ہو گئی ہیں تو تم خدا سے بڑھ کر اوپر پکڑنے والے کون ہوتے ہو؟ اللہ تعالیٰ تو ایسے بندوں سے عفو کا سلوک فرماتا ہے۔ درگزر کا سلوک فرماتا ہے اور تمھیں کسی ایسے احساس نے کہ انھوں نے کبھی مجھے اچھی نظر سے نہیں دیکھا تھا یا مجھ سے، جو میں توقع رکھتا تھا، وہ سلوک نہیں کیا تھا۔ ایسے احساس نے ہمیشہ کے لیے آگ میں مبتلا کر دیا ہے۔ ان کے خلاف ہر وقت تخریبی کارروائیاں، تنقید، زبان ہے کہ رکنے کا نام نہیں لیتی اور اردگرد کی جو نسلیں ہیں، جو تمھارے پاس آ کے بیٹھتی ہیں، ان کو بھی جہنم کی آگ میں مبتلا کرتے چلے جاتے ہو۔

ایسے تنقیدی اڈے بعض دفعہ ظاہری بدیوں کے اڈوں سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں......

بعض واقفینِ زندگی ایسے بھی ہیں بدنصیبی کے ساتھ، جنھوں نے اپنے آپ کو ساری عمر...... وقف کیا اور خدمتیں بھی کیں۔ لیکن کبھی تحریکِ جدید کے کسی افسر سے ناراض ہو کر، کسی سلوک کے نتیجے میں، ان کے دل میں ہمیشہ ایک انتقام کی آگ بھڑکتی رہی اور چونکہ حسد سے جو دانشوری پیدا ہوتی ہے، وہ جہنم سے ہٹانے والی نہیں بلکہ جہنم کی طرف لے جانے والی ہوا کرتی ہے۔ آگ کی اولاد ہمیشہ آگ ہوتی۔ آگ سے جنت نہیں پیدا ہوا کرتی۔ اس لیے پھر ان کے گھروں میں جہنم پیدا کرنے کے کارخانے قائم ہو جاتے ہیں۔ اپنے گھر میں بیٹھ کر دبی زبان میں شکوے کرتے ہیں۔ ہم سے یہ ہوا، ہم سے وہ ہوا۔ ہماری فلاں جگہ تقرری ہونی چاہیے تھی، فلاں شخص نے ظلم کی راہ سے اور پارٹی بازی کے نتیجے میں مجھے نیچا دکھانے کے لیے یہ کیا، وہ کیا۔ اب جب اولاد اپنے باپ کی مظلومیت کے قصے سنے گی تو اس کا ردعمل وہاں تک نہیں رہے گا جہاں تک اس کے باپ کا ردعمل تھا۔ اس کے باپ کے اوپر اس کے ذہن کی بالغہ قوتوں نے قبضہ کیا ہوا ہے اور آپ کا جو ردعمل ہے، جس طرح گھوڑے کی باگیں ہاتھ میں ہوتی ہیں، ایک حد تک اس کے ہاتھ میں رہتا ہے۔ لیکن اولاد کے ردعمل پر پھر کوئی باگیں نہیں ہوا کرتیں۔ پھر یہ شتر بے مہار کی طرح جس طرف سر اٹھائیں، نکل جاتے ہیں اور ان کی آنکھوں کے سامنے ان کی اولادیں ضائع ہو جاتی ہیں۔

بعض لوگوں کے متعلق اطلاع ملتی ہے کہ ان کا بیٹا فلاں جگہ کام کر رہا ہے۔ اس نے اپنی ظالمانہ تنقید کے گویا اپنی دانشوری کے اڈے بنائے ہوئے ہیں۔ اور نئی نسلوں کو تباہ کرنے کی کوشش کرتا ہے اور ان کا باپ ہے اس نے عمر بھر خدمت کی، باہر اور اندر بھی۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ اس میں یہ عادت ہے۔ وہ محلے کی انتظامیہ سے شاکی ہوگا۔ فلاں سے شاکی ہوگیا۔ باہر سے حسنِ سلوک سے، محبت سے باتیں کرے گا لیکن گھر میں بیٹھ کر وہ اندرونی جو دبی ہوئی آگ ہے، وہ بھڑک اٹھتی ہے۔

اب نام لینے کا تو کوئی مناسب موقع نہیں ہے۔ نہ مناسب ہے کہ کوئی نام لے کر کسی کو ننگا کرے۔ لیکن ایک دو تین چار ایسے بہت سے ہوا کرتے ہیں۔ ایسے لوگ ہمیشہ رہے ہیں۔ وہ لوگ جنھوں نے انتظامیہ کو ربوہ قادیان میں بہت قریب سے دیکھا ہے، ان کو پتہ ہے کہ کئی کچھ دیر رہے، کچھ کو تو مدینے نے نکال باہر پھینک دیا اور انھوں نے اپنے آپ کو اس ماحول سے اتنا دور سمجھا، ایسی اجنبیت دیکھی کہ بالآخر خود نکل کر چلے گئے۔ کچھ ایسے تھے جن کی اولادیں تباہ ہوگئیں، خود رہے۔ اس طرح مختلف قسم کے بداثرات انھوں نے اپنے ہاتھوں سے خود کمائے۔

اگرچہ میں بذاتِ خود اس میں کوئی عیب نہیں دیکھتا کہ اس سلسلہ میں کسی افسر کو کار ملی ہے، کوئی سہولت ملی ہے تو وہ اپنے بچوں کو بھی اس میں شامل کرلے۔ اگر کسی نے اپنی سہولتوں میں کبھی اپنے بچوں کو شامل کر لیا یعنی اگر لاہور دورے پر گیا ہے، اپنے بچوں کو بھی ساتھ لے گیا۔ واقفینِ زندگی کے بچے آخر قید ہونے کے لیے تو نہیں بنائے گئے اور کبھی ان کو شالامار باغ کی سیر کرا دی تو آگ لگنے کی کیا ضرورت ہے۔ کون سا اس قدر گناہ عظیم اس سے مرتکب ہوگیا کہ اس کو طعن و تشنیع کا نشانہ بناؤ لیکن ایسے لوگوں پر، جو بے چارے طعن و تشنیع کے محل پر کھڑے رہتے ہیں، ان کو طوعی طور پر، قربانی کی خاطر بعض بیاروں کو بچانے کے لیے اپنے معاملات میں احتیاط کرنی چاہیے اور اس سے کوئی بڑی قیامت نہیں آجائے گی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اپنے خاندانوں کو پوری طرح محروم کر دیں۔ مثلاً اگر آپ اپنے بیٹوں کو کاریں دیں کہ وہ بازاروں اور گلیوں میں دندناتے پھریں اور کار کا غلط استعمال کریں اور وہ اپنے ساتھ دوستوں کو لے کر پھریں تو یہ یقیناً حد سے بڑھنے والی بات ہے۔ یہاں آپ کا عمل واقعتاً سرزنش کے لائق بن جاتا ہے۔ پھر آپ اسے عادت بنالیں۔ ساتھ دو قدم پر بازار ہے کہ جب بھی گھر سے باہر نکلنا ہے موٹر پر قدم رکھنا ہے اور موٹر سے قدم نکال کر دکان تک پہنچنا ہے۔ یہ تو اچھی عادت نہیں ہے۔

تو ٹھیک ہے آپ بھی خواہ مخواہ دوسروں میں جلن کیوں پیدا کرتے ہیں۔ جنھوں نے جلنا ہے انھوں نے جلنا ہی ہے۔ (روزنامہ ''الفضل'' ربوہ جلد 74-39، نمبر 15، 17 جنوری 1989ء)

مرزا محمد سلیم اختر

شہرِ نامراد

ابتداءً مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصراً اپنا تعارف بھی کروا دوں۔ میں جماعت ربوہ کی طرف سے دس سال تک پاکستان کے مختلف شہروں میں بطور مبلغ کام کرتا رہا ہوں۔ 1970ء میں ربوہ جماعت سے علیحدگی کے بعد، میں جماعت لاہور کی طرف سے مختلف مقامات پر بطور مبلغ کام کرتا رہا۔ 1974ء میں لاہوری جماعت کی طرف سے جو وفد پاکستان نیشنل اسمبلی میں پیش ہوا، اس کا ایک ممبر میں بھی تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ لاہوری جماعت کا تمام کیس میرا ہی تیار کردہ ہے۔ نیشنل اسمبلی میں Spoksman کو حوالے فراہم کرنے پر بھی، میں ہی متعین تھا۔

میں نے ربوہ اور لاہور میں کیا دیکھا، یہ ایک دلچسپ اور دل گداز داستان ہے، جس کی تفصیل کے لیے کئی دفتر درکار ہیں۔ سردست میں چند واقعات کا نہایت اختصار کے ساتھ تذکرہ کروں گا جو ہمیشہ میرے لیے معمہ بنے رہے اور میں ان دونوں جماعتوں کے متعلق کچھ سوچنے پر مجبور ہوا۔ میں اس بات کی توضیح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ان سطور کی تحریر سے میرا مقصد کسی کی دل آزاری نہیں، میں نے ان دونوں جماعتوں میں شامل رہ کر، جو کچھ دیکھا، اسے من و عن پیش کر رہا ہوں۔ اللہ کرے کوئی سعید روح ان سطور کے مطالعہ کے بعد اس دام ہمرنگ زمین سے نکلنے کی کوشش کرے، جس میں وہ پوری ''نیک نیتی'' اور ''اخلاص'' سے پھنسی ہوئی ہے۔

ربوہ میں قادیانیوں کی ایک دینی درسگاہ ہے جس کا نام ''جامعہ احمدیہ'' ہے۔ دینی تعلیم کے حصول کی خاطر جب میں اس درسگاہ میں داخل ہوا تو جو نقشہ مجھے اس درسگاہ کے مبلغین کا بتایا گیا تھا، وہ اس سے بہت مختلف تھے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ طلبہ کی ایک خاصی تعداد ''تبلیغ اسلام'' کے جذبہ سے سرشار تھی مگر ان سادہ طبعوں کو میری طرح قطعاً معلوم نہ تھا کہ وہ ایک عیار شکاری کے چنگل میں پھنس چکے ہیں، جو اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے انھیں استعمال کرے گا۔ جس طرح بیگار کیمپ میں کسی نوگرفتار کو بے دست و پا کر دیا جاتا ہے، اسی طرح جامعہ احمدیہ میں بھی ہوتا ہے۔ طلباء کو بعض امتحانات کے لیے خلیفہ صاحب سے اجازت لینی پڑتی ہے اور خلیفہ صاحب کی پوری کوشش ہوتی ہے

کہ کوئی طالب علم پڑھ لکھ کر کارآمد وجود نہ بن جائے۔ اس لیے وہ اس راہ میں سدسکندری بن کر حائل ہو جاتے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بعض طلباء نے خفیہ طور پر بعض امتحانات دیے تو ان سے باز پرس کی گئی، گویا علم حاصل کرنا بھی ایک جرم ہے۔ خلیفہ صاحب کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ صرف ہماری دہلیز پر ہی جبہہ سائی کرتے رہیں اور اپنی معیشت استوار کر کے معاشرہ میں باوقار زندگی گزارنے کے قابل نہ ہوسکیں۔

یہی وجہ ہے کہ جب کسی مبلغ کو خلیفہ صاحب کی طرف سے سزا ملتی ہے تو اسے معافی مانگنے کے سوا کوئی چارہ کار نظر نہیں آتا۔ کیونکہ جو علم کلام اس نے پڑھا ہوتا ہے، مارکیٹ میں اس کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ وفات مسیح ثابت کرنے پر ایک قادیانی جماعت ہی ہے جو ڈیڑھ سو روپیہ دیتی ہے۔ دوسرے لوگوں کو اس مسئلے کی ضرورت ہی نہیں ہے اور اسے خود بھی اچھی طرح یہ احساس ہوتا ہے کہ عمر کا قیمتی حصہ تو میں یہاں تباہ کر چکا ہوں، اب جاؤں کہاں؟ اپنے معاشرہ سے مصاہرت و مناکحت کے رشتے وہ پہلے ہی توڑ چکا ہوتا ہے اور ان کی تکلیف واذیت پر استہزا کرنا اس کا معمول بن چکا ہوتا ہے۔ ایک شخص کو نبی مان کر جس معاشرہ کے افراد کو وہ کافر اور دائرہ اسلام سے خارج اور ان کے پیچھے نماز اور جنازہ تک حرام سمجھتا ہے، ان کے ساتھ تعلق رکھنا، وہ کس طرح گوارا کر سکتا ہے؟ ناچار سدھائے ہوئے پرندے یا جانور کی طرح واپس آنے کا سوچتا ہے اور جب یہ "محبوب ہزار شیوہ" بھی اسے منہ نہیں لگاتا تو اسے زمین و آسمان گھومتے نظر آتے ہیں۔ ناچار، وہ خلافت کی چوکھٹ پر سر ڈال دیتا ہے اور اس کا یہ معافی مانگنا خلیفہ صاحب کا معجزہ بن جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی روحانیت کے زور پر اس بے کس کے کس بل نکال دیے ہیں۔ ان مبلغین کو عمر بھر نان جویں کا محتاج رکھا جاتا ہے تاکہ یہ کہیں بھاگ نہ جائیں اور ان کی بے کسی سے فائدہ اٹھا کر ان کو سؤروں سے تشبیہ دی جاتی ہے اور ایسا اس لیے کیا جاتا ہے کہ وہ کسی طرف جانے کے قابل ہی نہیں ہوتے اور اگر خلیفہ صاحب انھیں آزاد بھی کر دیں تو وہ خلافت کی ڈگڈگی بجانے پر سدھائے ہوئے، پھر وہیں آجاتے ہیں۔

اگر یہ لوگ دین دار ہوتے تو دین کی خاطر زندگی وقف کرنے والے ان میں سب سے زیادہ معزز و مکرم ہوتے۔ مگر خلیفہ صاحب ان کو مزید رسوا کرنے کے لیے انھیں ایسے امیروں کی نگرانی میں دے دیتے ہیں جو خلیفہ کی تعلی کو تجلی سمجھ کر اس پر واہ واہ کے ڈونگرے برسانے کے سوا کچھ نہیں جانتے۔ جس سے ان کی زندگی ایک مستقل عذاب بن جاتی ہے اور وہ ہر وقت ایک دوزخ میں پڑے رہتے ہیں۔ خلیفہ ربوہ کے نزدیک واقف زندگی کی وقعت ایک کوڑی کے برابر بھی نہیں۔ ہاں جو انھیں سینکڑوں ہزاروں روپے نذرانہ پیش کرے، خواہ رشوت لے کر ہی دے، وہ مخلصین کے زمرہ میں

شامل ہو جاتا ہے۔

خلیفہ صاحب نے ''امور عامہ'' اور ''کار خاص'' دو شعبے قائم کیے ہوئے ہیں...... جو ہر صبح و مساء لوگوں کی ''بداعمالیوں'' کی رپورٹ انھیں پہنچاتے رہتے ہیں۔ یوں سمجھیے کہ وہ نازی گسٹاپو ہے، جس سے ہر آدمی ہر وقت لرزہ براندام رہتا ہے، کہ ابھی میری رپورٹ ہوئی اور میں ''ثریا سے تحت الثریٰ'' میں گرا...... بیوی، خاوند کے خلاف اور بچے، باپ کے خلاف رپورٹیں کرتے رہتے ہیں تاکہ خلیفہ صاحب کے عتاب سے مامون رہیں۔ خلیفہ کے اس گسٹاپو نے تمام لوگوں کا ذہنی اور قلبی سکون برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ اس گسٹاپو کے پاس ایک فنڈ ہوتا ہے جسے ربوہ کی دفتری زبان میں غ۔م/جی۔ایم یعنی غیر معمولی فنڈ کہتے ہیں۔ اس میں سے لاکھوں روپے سیاسی وغیر سیاسی مخصوص ''مقاصد'' کے حصول کے لیے خرچ کر دیے جاتے ہیں۔ اس فنڈ کو کوئی آڈیٹر چیک نہیں کر سکتا۔ ہزارہا روپیہ گورنمنٹ کے دفاتر میں کام کرنے والوں کو بطور ''نذرانہ'' پیش کیا جاتا ہے، تاکہ اگر ان کے خلاف گورنمنٹ کوئی کارروائی کر رہی ہو، تو وہ انھیں مطلع کر دیں۔

اس تعلق میں ایک واقعہ سماعت فرمائیے۔ گورنمنٹ کی طرف سے ربوہ میں سی۔آئی۔ڈی کا ایک آدمی متعین تھا۔ اس نے ربوہ والوں کے خلاف گورنمنٹ کو کوئی رپورٹ بھجوائی۔ چند دنوں بعد ربوائی تھانیدار عبدالعزیز بھانبڑی نے اپنے دفتر میں اسے چائے پر مدعو کیا اور اس کی اصل رپورٹ میز پر رکھ کر کہا کہ یہ رپورٹ آپ نے گورنمنٹ کو ارسال کی تھی۔ وہ ملازم آدمی تھا۔ ان سے ایسا خوف زدہ ہوا کہ آئندہ اس نے ان کے خلاف رپورٹ بھجوانا ہی ترک کر دیا۔ اس سے آپ اندازہ فرما سکتے ہیں کہ ''تبلیغ اسلام'' کے نام پر حاصل کیا جانے والا چندہ کن ''کارہائے خیر'' میں صرف کیا جاتا ہے۔

صمدانی ٹربیونل میں چودھری امیر الدین نامی ایک قادیانی نے پیش ہو کر کہا کہ خلیفہ صاحب ہمارے فنڈ زخرد برد کرتے ہیں۔ قادیانیوں کے وکیل اعجاز حسین بٹالوی نے اس سے سوال کیا کہ آپ کے پاس اس کا کیا ثبوت ہے کہ خلیفہ صاحب آپ کے فنڈ زخرد برد کرتے ہیں؟ اس نے جواب دیا کہ ہم لوگ تبلیغ اسلام اور اشاعت قرآن کے لیے چندہ دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس غرض کے لیے چندہ دیا جائے، وہ اسی جگہ پر خرچ ہونا چاہیے۔ مگر خلیفہ صاحب نے اس چندہ میں سے ہزاروں روپیہ آپ کو فیس دے دی ہے۔ کیا ہم نے آپ کو فیس دینے کے لیے چندہ دیا تھا۔ یہ خرد برد نہیں تو اور کیا ہے، اعجاز صاحب ایسے چپ ہوئے کہ پھر بول نہ سکے۔

ناگفتنی، گفتنی

مجھے جامعہ احمدیہ میں داخل ہوئے ابھی تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ میاں محمود صاحب کے

ایک صاحبزادے نے، جو آج کل ''شعائر اللہ'' میں سے ہیں، ایک ایسے فعل کا ارتکاب کیا، جس پر شرعی حد واجب ہوتی ہے۔ اس نے خود تحریری طور پر اپنے جرم کا اعتراف بھی کیا اور اس کی رپورٹ ایک ''خالد احمدیت'' نے اپنے ریمارکس کے ساتھ خلیفہ صاحب کی خدمت میں پیش کی۔ رپورٹ کنندہ کو خلیفہ صاحب نے ایسی جھاڑ پلائی کہ اس کی آئندہ نسلیں بھی توبہ کر اٹھیں اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ چونکہ یہ معاملہ میرے بیٹے کا ہے، اس لیے میں اسے محکمہ قضا کے سپرد کرتا ہوں۔ محکمہ قضا والے ''خالد احمدیت'' کی درگت بنتے دیکھ چکے تھے۔ پھر وہ خلیفہ صاحب کے ملازم بھی تھے۔ خلیفہ صاحب کے ایک اشارے سے ان کی قضا آ جاتی تھی۔ انھوں نے ہمارے بعض اساتذہ کو محکمہ قضا میں بلوایا کہ وہ اس معاملہ کی شہادت دیں۔ کس کی جرأت تھی کہ شہادت دیتا اور محکمہ قضا کی کیا طاقت تھی کہ خلیفہ صاحب کے صاحبزادے کے خلاف فیصلہ کرتا۔ لہٰذا یہ معاملہ یونہی رفع دفع کر دیا گیا اور اس کا کچھ بھی فیصلہ نہ ہوا اور صاحبزادے صاحب اس ''کارِ خیر'' کے بعد اپنے ''حضور'' ہی کی کار میں فراٹے بھرنے لگے ۔

ہم یہ سمجھے تھے کہ غالب کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے، پر تماشا نہ ہوا

عقائد یا بازیچہ اطفال

1953ء میں جب قادیانی جارحیت اور منصوبہ سازیوں سے مجبور ہو کر مسلمانوں نے تحریک شروع کی اور میاں محمود احمد صاحب منیر انکوائری کورٹ میں پیش ہوئے تو انھوں نے کمال بزدلی کے ساتھ اپنے پہلے عقائد سے رجوع کر لیا اور جس مرزا صاحب کو ماننا وہ جزو ایمان قرار دیا کرتے تھے، اس سے انکار کر دیا۔ اگر مرزا صاحب فی الواقع نبی ہیں تو ان کا ماننا جزو ایمان کیوں نہیں اور یہ جواب کس قدر لایعنی اور لغو ہے کہ نبی تو وہ ہیں مگر ان کا ماننا جزو ایمان نہیں۔

مسئلہ کفر و اسلام کے متعلق بھی ایسا ہی رویہ اختیار کیا گیا کہ مرزا صاحب نبی تو ہیں مگر ان کے انکار سے کوئی شخص کافر نہیں ہوتا۔ کیا دنیا میں کوئی ایسا نبی بھی ہوا ہے جس کا منکر مومن ہو۔ مسئلہ جنازہ کے متعلق کہا گیا کہ اب ہمیں مرزا صاحب کا ایک خط موصول ہوا ہے، جس پر ہم غور کریں گے۔ خلیفہ صاحب نے پہلے تو یہ غلط بیانی کی کہ یہ خط ہمیں اب ملا ہے۔ یہی خط ایک دفعہ انھیں 1915ء میں بھی ملا تھا۔ پھر یہ خط مسلسل اڑتیس سال غائب رہا۔ پھر اچانک 1953ء میں دوبارہ دستیاب ہو گیا اور اس کے بعد آج تک غائب ہے اور انشاء اللہ غائب ہی رہے گا۔

یہ بات بالکل صاف ہے کہ اگر مرزا صاحب کو آپ نبی مانتے ہیں تو نبی کا حکم اس کے

پیروکار بلا چون و چرا مانتے ہیں۔ وہ اس کے حکم پر نصف صدی سے زائد عرصہ تک غور نہیں کرتے رہتے کہ نبی کے اس حکم کو مانیں یا نہ مانیں۔ کیا دنیا میں کسی نبی کے ماننے والے آپ نے اس طرح کے بھی دیکھے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب حیلے بازی اور کذب آفرینی، اپنے بچاؤ کے لیے کی جا رہی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا جب میرے دل میں خلیفہ کے متعلق خیال پیدا ہوا کہ وہ اپنے عقائد میں مخلص نہیں اور جھوٹ بولنا ان کا روزمرہ کا شعار ہے۔ مگر ساتھ ہی یہ خیال بھی آیا کہ تم اپنے عقائد پر قائم رہو اور اپنے کام سے کام رکھو۔

قادیانی خلیفہ اوّل حکیم نور الدین کے فرزند کا بائیکاٹ

اس کے بعد 1956ء کا زمانہ آیا تو خلیفہ صاحب نے اپنی جماعت کے بعض افراد اور خصوصاً پہلے خلیفہ حکیم نور الدین کے صاحبزادے عبدالمنان عمر کے متعلق جو کچھ کہا اور کیا، اس سے میرے دل پر سخت چرکا لگا۔ میں نے ان کا ذکر خاص طور پر اس لیے کیا ہے کہ یہ میرے استاد رہے ہیں اور میں ان سے اچھی طرح واقف تھا۔ ان کا بائیکاٹ کر دیا گیا۔ بازار والوں کو سودا دینے سے منع کر دیا گیا، دودھ دینے والوں کو روک دیا گیا۔ ان کے مکان کے اردگرد خدام الاحمدیہ کے غنڈے بٹھا دیے گئے۔ وہ عشاء کے بعد ان کے صحن میں اتر کر رقص کرتے، غرض ہر طرح سے ان کا ناطقہ بند کر دیا گیا۔ ان کا قصور کیا تھا۔ خلیفہ صاحب کو خیال پیدا ہوا کہ کہیں میرے بیٹے ناصر احمد کی بجائے یہ خلیفہ نہ بن جائے۔ ان کی اس کسمپرسی کے عالم کو دیکھ کر اللہ یار بلوچ نامی ایک شخص کے دل میں کچھ ہمدردی کے جذبات پیدا ہوئے۔ وہ جب اپنے سودا سلف کے لیے بازار جاتا تو ان کے لیے بھی ضرورت کی کچھ چیزیں لے آتا اور چوری چھپے ان کے گھر پہنچا دیتا۔

خلیفہ صاحب کے جاسوسوں کو جب اس کی اس ''غیر اسلامی'' حرکت کا علم ہوا تو انھوں نے دن دہاڑے بھرے بازار میں مار مار کر اس کی پسلیاں توڑ دیں۔ جب اس واردات کی پولیس میں اطلاع ہوئی تو ''مومنین'' کی اس بستی نے اپنی ''شان ایمانی'' کا اظہار یوں کیا کہ سب لوگ اس وقوعہ سے ہی منکر ہو گئے کہ ہمیں تو علم ہی نہیں کہ اس جگہ کوئی ایسا واقعہ ہوا ہے۔ یہ ہے ''احمدیت یعنی حقیقی اسلام۔''

مجھے چودھری عبداللہ خان مرحوم ساکن چک 81 جنوبی سب انسپکٹر پولیس نے بتایا کہ میں تین سال ربوہ پولیس چوکی میں متعین رہا ہوں۔ ہر روز وہاں کوئی نہ کوئی واردات ہوتی۔ جب ہم گواہ طلب کرتے تو کوئی آدمی گواہی دینے کے لیے تیار نہ ہوتا۔ امور عامہ والے سب کو منع کر دیتے کہ کوئی آدمی گواہی نہ دے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ پولیس بے بس ہو جاتی۔ دوسرے لفظوں میں وہ ہر بات میں امور

عامہ کی محتاجی پر مجبور ہو جاتی۔ کہنے لگے ایک دن تنگ آ کر میں امور عامہ کے دفتر میں گیا اور ربوائی تھانیدار عبدالعزیز بھانبڑی سے کہا کہ آپ لوگ نہایت ''پارسا، متقی اور راستباز'' ہیں۔ ہم محکمہ پولیس سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہمیں کیس مکمل کرنے کے لیے گواہوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ کی ساری بستی ''راست بازوں'' کی ہے۔ لہٰذا آپ اس طرح کریں کہ کچھ جھوٹے لوگ باہر سے لا کر ربوہ میں آباد کریں تاکہ پولیس والوں کا بھی تھوڑا کام چلتا رہے۔ کہنے لگے پہلے تو انھوں نے اپنی راست بازی کا مجھے بڑا رعب دکھایا۔ پھر کچھ دیر بعد کہنے لگے آپ فکر نہ کریں، آپ کا کام بھی ہو جایا کرے گا۔ چودھری صاحب کہتے تھے کہ اس کے بعد خود ربوہ والوں نے ہمارے سامنے ایسے ایسے جھوٹ بولے کہ الامان والحفیظ۔ نیز انھوں نے مجھے یہ بھی سنایا کہ ربوہ میں وہ کچھ ہوتا ہے، جو لاہور میں بھی نہیں ہوتا۔

خلیفہ صاحب نے 1956ء میں اپنی جانشینی کے سلسلہ میں زبردست تقاریر کیں اور اپنے جانشین کے متعلق وصیت کی کہ اس کا انتخاب پوپ کی طرح ہو اور ساتھ ہی یہ اعلان بھی کر دیا کہ میں اسلامی شوریٰ کے طریق کو منسوخ کرتا ہوں اور آپ حیران ہوں گے کہ کمال بے غیرتی کے ساتھ ساری جماعت ایک اسلامی حکم کی منسوخی کا اعلان سنتی رہی اور بالکل ٹس سے مس نہ ہوئی۔ موجودہ خلیفہ کا انتخاب اسلامی شوریٰ کے طریق پر نہیں ہوا بلکہ پوپ کے انتخاب کی طرح ہوا ہے۔ سچ ہے انگریز کی اس پروردہ جماعت کو اپنی خلافت کی سند بھی اپنے آقائے ولی نعمت سے ہی لانی چاہیے تھی۔

مرزا محمود احمد کا برا انجام

میاں محمود احمد پر جب فالج کا حملہ ہوا اور ان کا دماغ کام کرنے سے بالکل جواب دے گیا تو موجودہ خلیفہ صاحب جماعتوں کے دورہ پر نکلے اور جگہ جگہ کہنے لگے کہ ''حضور'' بالکل ٹھیک ہیں۔ آپ انھیں دعا کے لیے خطوط لکھیں، یہ کریں، وہ کریں۔ یہ ایسا سفید جھوٹ تھا، جس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ وہ بالکل شل اور مختل ہو چکے تھے۔ خاکسار نے انھیں دو مرتبہ بیماری کے دوران دیکھا ہے۔ وہ چارپائی پر لیٹے بکری کی طرح سر مارتے رہتے تھے اور بالکل حواس باختہ ہو چکے تھے۔ انھیں نماز وغیرہ کی بھی کوئی سدھ بدھ نہ تھی اور ان کے فرزند ارجمند جو طالمودی نبیل کے مکاشفہ کے مطابق خلیفہ بنے ہیں، لوگوں کو یہ نوید سنا رہے تھے کہ ''حضور'' بالکل ٹھیک ہیں اور خلافت کے سارے کام خود ہی سرانجام دیتے ہیں۔ اصل بات یہ تھی کہ لوگ ان کی بیماری کے باعث ملاقات کے لیے نہیں آتے تھے۔ نذرانہ میں جو کمی واقع ہوئی تو جماعت کو تلقین کی جانے لگی کہ ''حضور'' بالکل ٹھیک ہیں، یعنی آؤ اور ہمیں نذرانہ دو تاکہ گلشن کا کاروبار چلے۔

جلسہ سالانہ پر ہر سال ان کی افتتاحی اور دیگر تقاریر کا اعلان کر دیا جاتا۔ میں دل ہی دل میں سوچتا کہ وہ تو رہین بستر و بالش ہو چکے ہیں۔ یہ لوگ جھوٹے طور پر کیوں ان کی تقاریر کا اعلان کر دیتے ہیں۔ پھر بعد میں سمجھ آیا کہ اس اعلان کو پڑھ کر باہر کی جماعتیں بکثرت شمولیت کریں گی کہ ''حضور'' اس دفعہ تقریر کر رہے ہیں۔ اس طرح انھیں جلسہ پر بکثرت پیسہ مل سکے گا۔

خلیفہ صاحب کی بیماری کے دوران میں نے کئی مرتبہ سوچا کہ یہ عجیب اللہ کے پیارے ہیں جو خود ہی گرفتار عذاب ہیں اور ہر کام سے ناکارہ ہو چکے ہیں۔ ان کی صحت کے لیے میں نے جماعت کو مسلسل کئی سال پانچوں نمازوں کے علاوہ تہجد میں بھی دعا کرتے دیکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ خلیفہ صاحب کو صحت دے۔ کراچی سے لے کر پشاور تک اتنے بکرے بطور صدقہ دیے گئے کہ اگر ان کا خون کسی دریا میں ڈالا جائے تو وہ لالہ رنگ ہو جائے مگر نہ دعائیں سنی گئیں اور نہ صدقات کام آئے۔

مجھے یاد ہے میں نے اپنے ایک دوست سے کہا کہ یا تو خلیفہ صاحب کے مظالم اس قدر ہیں کہ دعائیں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتیں یا جماعت ہی راندہ درگاہ الٰہی ہے، جس کی آہ و بکا کی اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی وقعت نہیں اور وہ ان کی دعائیں بجائے قبول کرنے کے ان کے منہ پر مارتا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ اس جماعت کی دس سالہ دعاؤں اور صدقات سے خلیفہ صاحب کی بیماری میں ایک لحظہ کے لیے بھی افاقہ کی صورت پیدا نہیں ہوئی۔ اس بات نے بھی میرے دل پر خاص طور پر اثر کیا۔

مرزا بشیر احمد کا جنازہ اور ناصر احمد

خلیفہ کے چھوٹے بھائی بشیر احمد نے وفات سے قبل یہ وصیت کی کہ میرا جنازہ مولوی غلام رسول صاحب راجیکی پڑھائیں۔ ان کی اولاد کی بھی یہی خواہش تھی کہ جو کچھ ہمارے والد نے زندگی کے آخری لمحوں میں کہا ہے، اس کا احترام ہونا چاہیے۔ مگر میاں ناصر احمد نے کہا یہ ہمارے خاندان کی عزت کا سوال ہے اور زبردستی امام بن کر خود جنازہ پڑھا دیا۔ آپ ان مذبوحی حرکات کے پس منظر میں ان کی نفسیات کا جائزہ لیں تو میاں ناصر احمد کی ساری روحانیت طشت از بام ہو جاتی ہے۔ مجھے اس بات پر بڑی حیرت ہوئی کہ اس خاندان کی عزت بھی عجیب ہے جو کسی دوسرے آدمی کے جنازے پڑھانے سے برباد ہو جاتی ہے۔ اصل بات یہ تھی کہ میاں ناصر احمد کو یہ خیال آیا کہ میرا باپ تو مرنے ہی والا ہے، چچا نے مرتے وقت جنازہ پڑھانے کے لیے جس آدمی کا نام لیا ہے، اس کے متعلق لوگ خیال کرنے لگیں گے کہ میاں بشیر احمد نے اس کو زیادہ نیک سمجھ کر جنازہ پڑھانے کے لیے کہا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کل خلافت کے لیے بھی اس کا نام پیش ہو جائے اور ہم ہاتھ ملتے رہ جائیں چونکہ اس خاندان کی عزت، خلافت کے ساتھ ہی وابستہ ہے، اس لیے انھوں نے یہ پیش بندی

کی کہ کہیں خلافت کے چلے جانے سے ہم بے عزت نہ ہو جائیں۔

مرزا ناصر احمد کی خلافت

میاں محمود احمد نے اپنی وفات سے بہت عرصہ پیشتر اپنے بیٹے ناصر احمد کو خلیفہ بنانے کے لیے راہ ہموار کرنا شروع کر دی تھی۔ انھیں ووٹوں میں خطرناک شکست کھانے کے باوجود صدر خدام الاحمدیہ بنایا گیا۔ پھر انصار اللہ کا صدر بنایا، پھر پوری انجمن کا صدر بنایا اور مرنے سے چند سال پیشتر ان پر آسمانی نور گرایا۔ اسی ''لائق'' فرزند کو خلیفہ بنانے کے لیے اسلامی شوریٰ کے طریق کو منسوخ کر کے پوپ کے انتخاب کے طریق کو اختیار کیا گیا۔ اس صاحبزادے کو خلیفہ کن لوگوں نے چنا، خاندان کے افراد نے، صدر انجمن اور تحریک جدید کے تنخواہ دار ملازمین جو پہلے ہی میاں ناصر کے ماتحت تھے اور چند پالتو مولویوں نے۔ آپ کے لیے یہ امر باعث تعجب ہوگا کہ پاکستان میں کام کرنے والے کسی مبلغ کو ووٹ کا حق نہیں دیا گیا۔ اس انتخاب میں قاضی نعیم الدین کو تو ووٹ کا حق دار قرار دیا گیا مگر اس کے استاد اور جماعت ربوہ کے مشہور مناظر اور عالم قاضی محمد نذیر کو ووٹ دینے کا اہل نہیں سمجھا گیا ۔

جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

مرزا ناصر احمد کے روحانی کمالات

پاکستانی مبلغین کو ووٹ دینے کا حق اس لیے نہیں دیا گیا کہ وہ جناب میاں ناصر احمد کے ''علمی، عملی، اور روحانی کمالات'' سے خوب آگاہ تھے۔ اس تعلق میں دو باتیں سماعت فرمایئے۔

مرزا ناصر احمد کے ہاں ایک عورت بطور ملازمہ کام کرتی تھی۔ ایک دفعہ ماہ رمضان میں بیگم ناصر احمد نے ملازمہ سے کہا کہ آج میں بھی روزہ رکھوں گی، سحری کے وقت مجھے جگا دینا۔ سحری کے وقت جب اس خادمہ نے بیگم صاحبہ کو جگانے کی کوشش کی تو بیگم صاحبہ نے اس غریب عورت کو وہ مغلظات سنائیں کہ الامان اور کہا کہ تو نے میری نیند کیوں خراب کی ہے۔ نو دس بجے کے قریب بیگم صاحبہ بیدار ہوئیں تو ملازمہ سے کہنے لگیں کہ آج تم نے مجھے جگایا نہیں، میں نے تو آج روزہ رکھنا تھا۔ وہ بیچاری خاموش ہو رہی۔ اس ملازمہ کا بیان ہے کہ بالکل اسی طرح میاں ناصر احمد بھی رمضان شریف کا ''احترام'' کرتے ہیں۔

جب لاہور سے تعلیم الاسلام کالج، ربوہ منتقل ہوا تو خوبصورتی کے لیے بعض پھول دار پودے بھی کالج میں لگوائے گئے۔ میاں ناصر احمد کالج کے پرنسپل تھے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ ربوہ کے دھوبی فیروز نامی کا بکرا وہاں آ نکلا اور اس نے ایک آدھ پودا خراب کر دیا، یا کھا لیا۔ میاں ناصر احمد نے اسے وہیں ذبح کروا کر اس کا گوشت اپنے خاندان میں تقسیم کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد دھوبی بھی

بکرے کی تلاش میں ادھر آ نکلا اور دیکھا کہ بکرے کی روح اللہ تعالیٰ کے حضور اور اس کا گوشت میاں ناصر احمد اور ان کے خاندان کا توشہ بن چکا ہے۔ وہ گم سم کھڑا تھا کہ میاں ناصر احمد نے اسے بلا کر پوچھا کہ یہ بکرا تمہارا ہے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے اثبات میں جواب دیا تو میاں صاحب ''جلال الٰہی کا مظہر'' بن کر اس پر برس پڑے اور اسے ایک قرعہ دے کر کہا کہ اسے دفتر امور عامہ میں لے جاؤ۔ جب وہ غریب دفتر امور عامہ میں پہنچا تو دفتر والوں نے اسے مزید ستر روپے جرمانہ کر دیا۔ زمین کا کونہ کونہ چھان ماریئے، چراغ ہاتھ میں لے کر اکناف عالم میں گھوم جایئے، اس قسم کے اولیاء اللہ آپ کو ربوہ کے سوا کہیں نہیں مل سکیں گے۔

ربوہ کے ''خلفاء اور محبوبان الٰہی'' کی ایک خاص علامت یہ بھی ہے کہ قرض لے کر واپس کرنا، گناہ عظیم خیال کرتے ہیں۔ مجھے ربوہ جماعت کے ایک دوست ملے۔ ان کے پاس ربوہ کے محکمہ قضا کی 29 ڈگریاں تھیں۔ جن میں سے اکثر خاندان خلافت سے متعلق تھیں اور ایک ڈگری ''خالد احمدیت'' کے خلاف بھی تھی۔ یہ صاحب فوت ہو چکے ہیں۔ ان کی اولاد کے پاس آج بھی یہ ڈگریاں محفوظ ہیں۔ وہ آدمی سالہا سال میاں ناصر احمد سے تقاضا کرتا رہا کہ قضاء نے مجھے ڈگری دے دی ہے، اب تو مجھے میری رقم دے دیں۔

یاد رہے ربوہ کا محکمہ قضا خاندان خلافت کے خلاف ڈگری کا اجراء نہیں کروا سکتا کیونکہ وہ خود ان کے ماتحت ہے۔ اس نے تنگ آ کر مجھے کہا کہ آپ ان ڈگریوں کو کسی اخبار میں شائع کروا دیں۔ میں نے انھیں مشورہ دیا کہ آپ ان سے ایک بار مزید دریافت کر لیں، اس کے بعد کچھ کریں گے۔ اس نے خلیفہ صاحب کو خط لکھا، اس کا جو جواب خلیفہ صاحب نے دیا، وہ میں نے خود دیکھا اور پڑھا ہے۔ اس میں لکھا تھا، خدا کے رجسٹر سے آپ کا نام کاٹ دیا گیا ہے۔ اب بتایئے اس سے زیادہ بھی کوئی فریب کاری ہو سکتی ہے کہ ایک آدمی اپنی رقم کا مطالبہ کرتا ہے، ربوہ کا محکمہ قضا اس کے حق میں ڈگری دیتا ہے اور ''حضور پُرنور'' اس کا نام خدا کے رجسٹر سے کاٹتے پھرتے ہیں۔

وہ آدمی بھی بڑا دلچسپ تھا۔ اس نے خلیفہ صاحب کو لکھا کہ ''کیا اس رجسٹر سے میرا نام کاٹا گیا ہے جو آپ کے دفتر میں پڑا ہے یا اس رجسٹر سے میرا نام کاٹ آئے ہیں جو خدا کے پاس محفوظ ہے۔''

یہ صرف میاں ناصر کی بات نہیں، اس حمام میں سب ہی ننگے ہیں۔

قادیان سے میاں محمود جب پاکستان آ گئے تو انھوں نے کہا کہ قادیان کا کوئی آدمی اپنا سَیِّم داخل نہ کرے کیونکہ ہم نے جلد قادیان واپس جانا ہے۔ اس اعلان کو سنتے ہی بے شمار لوگ کلیم

دینے سے دست کش ہو گئے۔ ان میں سے بعض کو خاکسار نے دیکھا ہے جو آج بھی خلیفہ صاحب کے اس اعلان کی برکت سے دربدر کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ قادیان کس نے جانا تھا اور کس نے جانے دینا تھا۔ بات دراصل یہ تھی کہ قادیان کی زمین خلیفہ صاحب نے اپنے مریدوں کے ہاتھ فروخت کی ہوئی تھی، لیکن ان کے نام رجسٹرڈ نہیں کروائی تھی۔ جیسے آج تک ربوہ میں ہوتا رہا ہے۔ اس طرح ان ظالموں نے پاکستان گورنمنٹ کو ٹیکس ادا نہ کر کے لاکھوں روپے کا نقصان پہنچایا ہے۔ جب ملک تقسیم ہو گیا تو جن لوگوں نے قادیان میں زمین خرید کی ہوئی تھی، انھوں نے اس کے کلیم دینے تھے اور خلیفہ صاحب کا فراڈ منظر عام پر آ جانا تھا۔ انھوں نے اس فریب کاری پر پردہ ڈالنے کے لیے مرزا صاحب کے بعض الہامات کا سہارا لیا اور اعلان کر دیا کہ ہم قادیان واپس جائیں گے، اس لیے قادیان کے احمدی کلیم داخل نہ کروائیں۔

ادھر لوگوں کو کلیم داخل کروانے سے منع کر دیا گیا اور دوسری طرف خود اپنی زمین کا کلیم داخل کروا کر سب کچھ الاٹ کروالیا، کیونکہ گورنمنٹ کے کاغذات میں تو قادیان کی زمین انھی کے نام تھی۔ اس طرح جماعت کو دوبارہ احمق بنا کر لوٹا۔ قادیان میں ان سے زمین کی قیمت لے لی اور زمین ان کے نام نہ کروائی اور تقسیم ملک پر ان کو کلیم دینے سے منع کر دیا اور خود ساری جائیداد اپنے نام منتقل کروالی۔

لطف تو تب تھا کہ جب گورنمنٹ نے ان کو زمین الاٹ کر دی تھی تو ان تمام لوگوں سے کہتے کہ جتنی زمین کے تم قادیان میں مالک تھے، اسی قدر اس زمین میں سے لے لو، جو ہمیں الاٹ ہوئی ہے۔ ایک صاحبزادے نے تو ایک سینما بھی الاٹ کروایا تھا۔ کیا آپ نے دنیا کے پردہ پر اس قدر عقل و خرد سے عاری کوئی جماعت دیکھی ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں کیا بلکہ بوگس کلیم بھی داخل کروائے گئے اور بعض ان لوگوں نے بھی یہاں جائیدادیں حاصل کیں جو یہیں کے رہنے والے تھے۔ ان سب باتوں کا دستاویزی ثبوت میں اپنی زیر تصنیف کتاب میں پیش کروں گا۔ ان شاءاللہ۔

عام قادیانی کی بے بسی

ان واقعات کے مطالعہ کے بعد ممکن ہے، آپ کے دل میں سوال پیدا ہو کہ ایسے حالات کے مشاہدہ کے بعد لوگ انھیں چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟ تو اس کے جواب میں واضح ہو کہ وہ خلیفہ اور جماعت کو چھوڑ کر جائیں کہاں؟ مسلم معاشرہ کو وہ کفار کا معاشرہ سمجھتے ہیں۔ اگر خلیفہ کے خلاف کوئی بات کریں تو خلیفہ کے جاسوس ہر آن سائے کی طرح ان کے ساتھ ہوتے ہیں۔ رشتہ داروں اور عزیزوں سے وہ ''مخلص'' ہونے کی وجہ سے قطع تعلق کر چکے ہوتے ہیں۔ اس بھری دنیا میں اظہار

ہمدردی کرنے والا بھی انھیں کوئی نظر نہیں آتا، اس لیے وہ حقائق سے باخبر ہونے کے باوجود منافقانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ وہ کوئی بات کر بیٹھیں تو جان سے بھی ہاتھ دھونے کا خطرہ ہوتا ہے اور خلیفہ کی خوشنودی کی خاطر ہر جائز و ناجائز کام کو کارِ ثواب سمجھ کر کرنے والے وہاں بہت سے افراد موجود ہیں۔ اس جگہ ایک واقعہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

میاں محمود کے چھوٹے بھائی میاں شریف کی فوتیدگی پر میاں عبدالمنان عمر نے لاہور سے تعزیت کے لیے ربوہ آنا تھا۔ ان کے کسی دوست نے انھیں اطلاع دی کہ آپ یہاں نہ آئیں۔ آپ کے قتل کا منصوبہ بن چکا ہے اور تابوت بھی تیار کروا لیا گیا ہے۔ جس میں بند کر کے آپ کو چناب کی لہروں کے سپرد کر دیا جائے گا۔ میاں عبدالمنان عمر باوجود اس اطلاع کے اپنے خاندان کے چند افراد کے ہمراہ ربوہ آ گئے اور تعزیت وغیرہ سے فارغ ہو کر شام کو واپس لاہور چلے گئے۔ ربوائی سی۔ آئی۔ ڈی کے جاسوسوں نے خیال کیا کہ آپ ابھی واپس نہیں گئے بلکہ یہیں اپنی بھانجی کے گھر قیام پذیر ہیں اور رات یہیں گزاریں گے۔ چنانچہ ان کی بھانجی کے مکان کے اردگرد ضلع لائل پور سے بدمعاش منگوا کر ان کی ڈیوٹی لگا دی گئی اور انھیں ہدایت کی گئی کہ رات کو جو آدمی اس مکان سے باہر نکلے، اسے قابو کر لو۔ اتفاق ایسا ہوا کہ کسی ضرورت کے لیے میاں رشید احمد باہر نکلے اور بدمعاشوں نے انھیں اچک لیا۔ وہ شور مچاتے رہے کہ میں میاں رشید ہوں۔ انھوں نے کہا ہمیں نہیں پتہ تم کون ہو۔ جب بدمعاش انھیں امور عامہ کے دفتر میں لے کر آئے تو پتہ چلا کہ یہ تو میاں عبدالمنان نہیں۔ آخر ان کی بھانجی کے گھر میں گھس کر مکان کی تلاشی لی گئی بلکہ ساتھ والے مکان کی بھی تلاشی لی گئی کہ وہ کہیں بھاگ کر ادھر نہ آ گئے ہوں۔ مستورات جو لحاف اوڑھے پڑی تھیں، ان کے اوپر سے لحاف کھینچ لیے گئے۔ جب ہر طرح سے ناکامی ہوئی تو کہنے لگے، شکار ہاتھ سے نکل گیا ہے۔

آپ غور فرمائیں کہ ایک شخص تعزیت کے لیے آتا ہے۔ وہ خلیفہ کا رشتہ دار بھی ہے۔ اس کا باپ خلیفہ کا استاد ہے۔ ایک مرگ کے موقعہ پر اس کے قتل کا پروگرام بنانا کس قدر قساوت قلبی ہے۔ کیا ایسی سنگدلی کی کوئی مثال دنیا میں موجود ہے؟

انہی صاحب کا ایک اور واقعہ بھی سن لیجئے۔ میاں محمود یورپ کے دورہ سے واپس آنے والے تھے۔ ان کی حفاظت اور استقبال کے لیے ایک کمیٹی ترتیب دی گئی۔ جس کے ایک ممبر میاں عبدالمنان صاحب بھی تھے۔ میاں ناصر احمد نے چودھری محمد عبداللہ صاحب سابق صدر عمومی ربوہ کو انھیں بلوانے کے لیے بھیجا۔ انھوں نے شمولیت سے معذرت کر دی۔ وہ پھر دوبارہ آئے اور باوجود ان کے دوبارہ معذرت کرنے کے وہ بیٹھے رہے اور کہنے لگے میاں ناصر احمد نے مجھے کہا ہے کہ اگر تم

اسے ساتھ لے کر نہ آئے تو میں تمھیں جماعت سے خارج کر دوں گا۔ اس لیے آپ میرے ساتھ ضرور چلیں۔ ایسا نہ ہو کہ میں جماعت سے فارغ ہو جاؤں۔

جب یہ میاں ناصر احمد کے مکان پر پہنچے تو میاں ناصر احمد جلدی سے ان کے لیے گھر سے شربت لانے کے لیے گئے۔ انھوں نے بہت کہا کہ مجھے پیاس نہیں مگر وہ اندر سے ایک شربت کا گلاس لے آئے اور اصرار کرنے لگے کہ آپ اسے ضرور پئیں۔ میاں عبدالمنان عمر نے صرف ایک گھونٹ اس گلاس سے لیا۔ گھر واپس آتے ہی انھیں عجیب وغریب قسم کی قے آئی۔ اس موقعہ پر ایک طبیب پہنچ گئے۔ انھوں نے ملاحظہ کے بعد بتایا کہ آپ کو زہر دیا گیا ہے۔ (یہ روایت مجھ سے کئی دوستوں کے درمیان خود میاں عبدالمنان عمر نے بیان کی) اب آپ غور فرمائیں کہ کوئی کس طرح حق گوئی کی جرأت کر سکتا ہے؟

حسن بن صباح کے باپ کو بھی آدمیوں کو قتل کرانے کے وہ نسخے یاد نہ ہوں گے جو ان نام نہاد خلیفوں کو یاد ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر ایک کو ان کے شر سے محفوظ رکھے۔

ایک قصہ "آپ بیتی" سے

واقعات تو بے شمار ہیں انھیں کہاں تک لکھتا جاؤں۔ آخر میں اپنا قصہ بیان کرتا ہوں۔ 1970ء میں ہم تینوں بھائیوں کو ربوہ بلایا گیا۔ پہلے تو ہر کوئی یہی سمجھا کہ شاید مجھ اکیلے ہی کو بلایا گیا ہے۔ اتفاق کی بات ہے سب سے پہلے میں ہی ربوہ پہنچا اور دفتر سے معلوم کرنے کی کوشش کی کہ مجھے کیوں بلایا گیا ہے؟ مگر کسی نے کچھ نہ بتایا۔ آخر میرے ایک دوست نے بتایا کہ امور عامہ کے ناظر تمھارے دفتر میں آئے تھے۔ انھوں نے آپ کے ناظر سے کوئی بات کی ہے جس کے بعد آپ تینوں بھائیوں کو ربوہ آنے کے لیے تار دیے گئے ہیں۔ جب ہم اکٹھے ہوئے تو سب سے زیادہ حیرت ہمیں اس بات پر تھی کہ ہم نے کسی جرم کا ارتکاب تو کیا نہیں، ہمیں بلایا کیوں گیا ہے۔ اسی دوران میں، میرے ایک دوست نے اطلاع دی کہ آپ لوگوں پر ایک زبردست کمیشن بٹھایا گیا ہے۔ اس اطلاع نے ہمیں مزید حیرت میں ڈال دیا، کیونکہ ہمیں کچھ علم نہ تھا کہ ہمارا قصور کیا ہے اور کمیشن نے ہم سے کیا دریافت کرنا ہے؟ بالآخر ہم تینوں بھائی باری باری کمیشن کے روبرو پیش ہوئے۔ ان کے سوالات سے ہم پر یہ امر واضح ہوا کہ خلافت مآب کو اپنی خلافت کے پائے لرزتے نظر آ رہے ہیں۔ وہ کسی طرح یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ہم خلیفہ صاحب کی بہ نسبت میاں رفیع احمد کے ساتھ زیادہ تعلق رکھتے ہیں۔ جب انھیں اس معاملہ میں سخت ناکامی ہوئی تو انتقاماً میرے چھوٹے بھائی کو ملازمت سے فارغ کر دیا گیا اور ہمیں حکم دیا گیا کہ ہم اس سے قطع تعلق کر لیں۔ نیز ہمیں یہ بھی کہا گیا کہ آپ

دونوں بھائی ربوہ آ کر دفتر اصلاح وارشاد میں کام کریں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

یکم اگست 1970ء کو ایک تربیتی کلاس ہونے والی تھی۔ جس میں پاکستان بھر سے مردوں اور عورتوں نے شرکت کرنی تھی۔ میاں ناصر احمد کی منظوری سے مجھے اس کلاس کا انچارج مقرر کیا گیا۔ جس روز کلاس کا افتتاح ہونا تھا، میں متعلقہ کاغذات لے کر ابھی مسجد سے باہر ہی کھڑا تھا کہ ایک آدمی نے مجھے پیغام دیا کہ آپ دفتر چل کر بیٹھیں۔ میں نے جواب دیا کہ میرے پاس تو سارا پروگرام ہے، میں دفتر جا کر کیا کروں گا؟ اتنے میں ایک اور دوست آئے اور کہنے لگے، مولوی ابو العطاء صاحب کہتے ہیں کہ آپ دفتر میں جا کر بیٹھیں۔ مجھے کچھ سمجھ نہ آیا کہ یہ معاملہ کیا ہے؟ خیر میں وہاں سے دفتر چلا آیا۔ ابھی میں نے کاغذات میز پر رکھے بھی نہ تھے کہ ایک مبلغ صاحب برہنہ پا دوڑتے ہوئے آئے اور کہنے لگے مولوی ابو العطاء صاحب نے کہا ہے کہ آپ اس احاطہ سے باہر چلے جائیں۔ مجھے اس پر بڑا طیش آیا اور میں کاغذات وہیں پھینک کر اصلاح وارشاد کے دفتر میں آ گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ بڑے بھائی صاحب، وہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ مجھے کہنے لگے آپ تو اس کلاس کے انچارج ہیں، ادھر کیسے؟ میں نے انھیں سارا واقعہ سنا دیا۔ میرے دریافت کرنے پر وہ کہنے لگے، مجھے انھوں نے کہا ہے کہ آپ یہاں سے اپنے دفتر چلے جائیں اور میں وہاں سے چلا آیا ہوں۔ خیر ہمیں اس بات کا احساس ہوا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔

ہمارے آنے کے بعد میاں ناصر احمد نے اپنی افتتاحی تقریر میں ہمارے چھوٹے بھائی پر خانہ خدا میں کھڑے ہو کر یہ افترا پردازی کی کہ وہ میرے دورۂ افریقہ کے دوران بددعائیں کرتا رہا ہے کہ میرا جہاز Crash ہو جائے، اور اس کے بڑے بھائی کو یہاں انچارج مقرر کیا گیا تھا۔ ایسے لوگوں سے جو خلیفہ کے متعلق بددعائیں کرتے ہیں، یا ان کے بھائی بند ہیں، آپ لوگوں کو کیا روحانی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟

افتتاح کے بعد ربوائی تھانیدار عبدالعزیز بھانبڑی ہمیں بلا کر کہنے لگے، آپ کو ملازمت سے فارغ کر دیا گیا ہے اور آج شام سے پہلے پہلے آپ ربوہ سے چلے جائیں۔ ہم نے پوچھا ہمارا قصور کیا ہے؟ کہنے لگے وہ جہاز والا واقعہ۔ ہم نے کہا ہمیں تو کسی جہاز کا علم نہیں اور نہ ہم کسی جہاز کے پائلٹ تھے۔ کہنے لگے حضور نے ایسا ہی فرمایا ہے۔ گویا ان کے ''حضور'' جو کہہ دیں اس پر کسی گفتگو کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہم نے ان سے کہا آپ ہمارا پراویڈنٹ فنڈ دے دیں، ہم چلے جاتے ہیں۔ کہنے لگے عصر کے وقت پتہ کرنا۔ عصر کے وقت جب ہم اس قادیانی ایس۔ ایچ۔ او کے مکان پر گئے تو بڑی رعونت سے کہنے لگا تم کون ہو؟ جاؤ جا کر اپنے ناظر سے پتہ کرو۔ ہم اپنے ناظر کی طرف جا

رہے تھے کہ راستہ میں ہی ان سے ملاقات ہوگئی۔ وہ تو علیک سلیک سے بھی بیزار نظر آئے، کہنے لگے مسجد میں اعلان ہوگیا ہے، اب ہم آپ سے گفتگو نہیں کر سکتے۔ میں نے کہا آپ بیشک گفتگو نہ کریں، ہمارا پراویڈنٹ فنڈ ہمیں دے دیں۔ کہنے لگے آپ اس وقت چلے جائیں، ہم بعد میں آپ کو گھر کے پتہ پر بھجوا دیں گے۔ ہم نے کہا اگر ہمیں ضرورت ہو اور ہم جلد لینا چاہیں تو ربوہ آنے کی کیا سبیل ہے۔ وہ ہمارے ساتھ بھانبڑی صاحب کے مکان پر آئے۔ انھوں نے کہا، ربوہ آنے کے لیے پہلے یہ درخواست دیں کہ ہم یہاں آنا چاہتے ہیں، اگر ہم اجازت دیں تو آجائیں۔ گویا ربوہ پاکستان کے اندر ایک خود مختار سٹیٹ ہے جس میں انسان ویزا ملنے پر ہی داخل ہوسکتا ہے۔ ہم نے کہا اس وقت تو ہم گھر نہیں پہنچ سکتے۔ کہنے لگے، احمد نگر چلے جائیں، یہ ربوہ سے دو میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں ہے مگر ہمارے وہاں پہنچنے سے پیشتر، یہ وہاں کی جماعت سے کہہ آئے کہ ان کے آنے پر کوئی آدمی ان سے کسی قسم کی گفتگو نہ کرے۔

عبدالعزیز بھانبڑی صاحب کے تعارف میں ایک بات کا لکھنا بہت ضروری ہے۔ وہ یہ کہ ربوہ جماعت کے ایک امیر جماعت کا مقولہ ہے کہ اگر خبیث ترین دس انسپکٹر پولیس ایک طرف ہوں تو بھانبڑی اکیلا ہی ان پر بھاری ہے۔ میں اس پر حلف اٹھا سکتا ہوں کہ انھوں نے یہ بات مجھے کہی تھی۔ یہ اپنی خباثتی خوبیوں کے باعث خلیفہ صاحب کے خاص معتمد ہیں۔ سچ ہے انسان اپنی سوسائٹی سے پہچانا جاتا ہے۔

قصہ کوتاہ یہ کہ اس اعلان کے بعد میں نے میاں ناصر احمد کو چٹھی لکھ کر مباہلہ کا چیلنج دے دیا۔ مگر آپ جانتے ہیں میدان مباہلہ میں قدم رکھنا بزدلوں کا کام نہیں۔ میاں ناصر احمد اس چیلنج کے بعد یوں خاموش ہوا جیسے اسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ اس دوران میرے دوست مجھے ملتے رہے اور بعض ازراہ ہمدردی یہ مشورہ بھی دیتے رہے کہ آپ ''حضور'' سے معافی مانگ لیں۔ میں نے انھیں جواب دیا کہ میں ایک کذاب اور مفتری کے آگے جھکنا اپنی توہین سمجھتا ہوں ۔

راہ خودداری سے مر کر بھی بھٹک سکتے نہیں
ٹوٹ تو سکتے ہیں ہم لیکن لچک سکتے نہیں

اس کے بعد میں نے کلیتہً اس جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی۔

ایک دفعہ ہم تینوں بھائیوں کو لاہور جانے کا اتفاق ہوا تو ہم احمدیہ بلڈنگ میں بھی چلے گئے۔ انجمن کے جنرل سیکرٹری سے ملاقات ہوئی، کچھ مختصر سی گفتگو بھی ہوئی۔ سیکرٹری صاحب نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ ہم ایک دو دن احمدیہ بلڈنگ میں قیام کریں۔ چنانچہ ہم ان کی خواہش کے

احترام میں وہاں ٹھہر گئے۔ بعض دوست ربوہ جماعت کے بالمقابل مولوی محمد علی صاحب کے علمی کمالات کا اظہار بھی کرتے رہے، جنھیں ہم نہایت خاموشی سے سنتے رہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ہم لاہوری جماعت کے علم کلام سے کچھ متاثر نہ ہوئے۔ اس کے بعد ہمیں دوبارہ دعوت دی گئی اور ہم کئی روز تک روزانہ صبح نو بجے سے بارہ بجے تک ایک فاضل لاہوری سے گفتگو کرتے رہے اور وہ ہمیں اپنے عقائد کی صحت کے متعلق سمجھاتے رہے۔ آخر یہ سمجھ کر کہ یہ جماعت، ربوہ جماعت سے اچھی ہے، کیونکہ ختم نبوت کی منکر نہیں، اجرائے نبوت کی قائل نہیں، مرزا صاحب کو نبی ماننے سے انکاری ہے اور تکفیر مسلمین سے مجتنب رہتی ہے۔ ہم میاں عبدالمنان مذکور کے پرزور اصرار پر اس جماعت میں شامل ہوئے مگر چند دن بعد ہی بناوٹی اخلاق کی قلعی کھل گئی۔

ایک سازش کا انکشاف

ربوہ والوں کو جب اس بات کا علم ہوا کہ ہم لاہوری جماعت میں شامل ہو گئے ہیں تو ایک دن ان کے مبلغ محمد شفیع اشرف جبکہ ہم موچی دروازہ باغ میں جلسہ سن رہے تھے، وہاں ہم سے ملنے آ گئے اور میرے بڑے بھائی سے علیحدگی میں گفتگو کرنے لگے۔ میں نے جب ان کی گفتگو میں شمولیت کرنا چاہی تو مبلغ صاحب، طرح دے گئے۔ کہنے لگے ہم چونکہ آپ سے بڑے ہیں اور کچھ علیحدگی میں باتیں بھی کرنا چاہتے ہیں، اس لیے آپ ہم سے الگ رہیں۔ میں الگ ہو کر جلسہ سنتا رہا۔ کوئی ڈیڑھ دو گھنٹہ کی گفتگو کے بعد بھائی صاحب واپس آئے تو میں نے ان سے دریافت کیا کہ مبلغ صاحب کیا کہتے تھے؟ کہنے لگے وہ کہتے ہیں کہ خلیفہ صاحب نے آپ کے ساتھ جو کچھ کیا ہے اس پر سب اہل ربوہ نے اظہار افسوس کیا ہے، دفتر بھی چاہتا ہے کہ آپ لوگ واپس آ جائیں۔

اب آپ لوگ اس طرح کریں کہ چودھری ظفر اللہ خاں کے چھوٹے بھائی اسد اللہ خان کی کوٹھی پر صبح پہنچ جائیں۔ وہاں سارا پروگرام ترتیب دے کر یہ سب معاملہ ٹھیک کر دیا جائے گا۔ مگر ساتھ ہی یہ شرط بھی لگا دی کہ مرزا سلیم آپ کے ساتھ نہیں ہونا چاہیے اور چودھری اسد اللہ سے کہہ دینا کہ ہمیں مبلغ صاحب نے بھجوایا ہے...... جب بھائی صاحب نے یہ بات سنائی تو میں نے کہا یہ ایک سوچی سمجھی سازش ہے، آپ ہرگز وہاں نہ جائیں۔ پہلے تو وہ نہ مانے جب میں نے دلائل سے ثابت کیا کہ یہ سازش ہے تو انھوں نے وہاں جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ میں نے بھائی صاحب سے کہا کہ پہلے تو یہ بات ہی سرے سے غلط ہے کہ اہل ربوہ خلیفہ کے فیصلے پر برا منا رہے ہیں، انھوں نے ایسا اظہار کر کے جوتے کھانے ہیں پھر جبکہ ہمارا بائیکاٹ ہو چکا ہے، ایک مبلغ کی کیا جسارت ہے کہ وہ ہم سے گفتگو کرے۔ تیسرے مبلغ کا یہ کہنا کہ چودھری اسد اللہ خاں کو یہ کہہ دینا کہ ہمیں مبلغ نے آپ

کے پاس بھجوایا ہے، اسے اس بات کی ضرورت کیا ہے کہ وہ اسد اللہ خان کے نوٹس میں یہ بات لائے کہ میں ایسے آدمیوں سے بولتا ہوں، جن کا خلیفہ نے مقاطعہ کیا ہے، کیا آپ امراء اور مبلغین کے تعلقات سے آگاہ نہیں۔ پھر یہ شرط عائد کرنے کی کیا ضرورت ہے کہ مجھے آپ کے ساتھ نہیں ہونا چاہیے۔ بھائی صاحب کو سمجھ آ گئی کہ معاملہ اتنا سیدھا نہیں جتنا میں سمجھتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے شر سے محفوظ رکھنے کے لیے ہماری اس طرح مدد فرمائی کہ ربوہ سے ہمارے ایک عزیز نے ہمارے ایک بہی خواہ (یہ صاحب خلیفہ صاحب کے نہایت قریبی عزیزوں میں سے ہیں) کو خبر دی کہ ان بھائیوں کو زہر دینے کا منصوبہ طے پا چکا ہے۔ لہٰذا جس قدر جلد ممکن ہو سکے آپ انھیں اطلاع کریں، کہیں وہ لقمہ اجل نہ بن جائیں۔ یہ گفتگو مبلغ صاحب نے عشاء کے بعد ہم سے کی اور وہ ہستی بھی اسی رات ربوہ سے لاہور آئی۔ صبح ہم اپنے کمرے میں بیٹھے تھے کہ ہمیں ایک ٹیلی فون آیا کہ فوراً میرے گھر پہنچو۔ چنانچہ ہم اپنے اس بہی خواہ کے گھر گئے، میں نے انھیں گزشتہ شب کا قصہ سنانا شروع کر دیا۔ انھوں نے ساری گفتگو سن کر کہا کہ آپ کے متعلق یہ فیصلہ ہو چکا ہے اور آج اس کی تکمیل بھی ہو جانی تھی، اچھا ہوا آپ نہیں گئے۔ میں آپ کو یہ نصیحت کرتا ہوں کہ کسی ربوائی سے کوئی چیز نہ لیں، یہاں تک کہ سادہ پانی بھی نہ پئیں۔ چنانچہ اس طرح اللہ تعالیٰ نے ہم پر ان کی سازش کا انکشاف کر کے ہمیں بچالیا۔

لاہوری جماعت کی حقیقت

اس بات کا تذکرہ تو جملہ معترضہ کے طور پر آ گیا تھا اب لاہوری جماعت کی سنئے۔ اس جماعت کے بانی مولوی محمد علی صاحب ہیں۔ انھیں خیال تھا کہ حکیم نورالدین کی وفات کے بعد انھیں مرزا صاحب کا جانشین بنایا جائے گا۔ جب ان کی اس خواہش کی تکمیل نہ ہو سکی تو 1914ء میں لاہور آ گئے اور ایک انجمن کی بنیاد رکھی اور اس کے پہلے امیر قرار پائے۔ مسلمانوں میں نفوذ حاصل کرنے کے لیے انھوں نے مرزا صاحب کی نبوت سے انکار کر دیا اور کہا کہ چونکہ میاں محمود، مرزا صاحب کو نبی مان کر مسلمانوں کی تکفیر کرتا ہے، اس لیے ہم اس سے علیحدہ ہو گئے ہیں۔

اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہونا چاہیے کہ مولوی محمد علی صاحب جناب مرزا صاحب کو نبی مانتے رہے ہیں اور اس سے انکار کرنا، ہوا میں گرہ لگانے والی بات ہے۔ بہرکیف لاہور آ کر ان کی جانشینی کی خواہش کسی حد تک پوری ہو گئی۔ اس جماعت کے ہر فرد کا یہ دعویٰ ہے کہ ہمارے عقائد جمیع اہل اسلام سے اچھے ہیں اور واقعی یہ اتنے اچھے ہیں کہ انھیں سوائے چند آدمیوں کے اور کوئی قبول کرنے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتا۔

چند سال بعد مولوی محمد علی صاحب نے ایک تفسیر ''بیان القرآن'' کے نام سے شائع کی جو حقیقت میں حکیم نورالدین صاحب کی ہے۔ مگر مولوی صاحب کا یہ کمال ہے کہ انھوں نے اسے اپنے نام سے شائع کیا ہے۔ اس میں کچھ تصرفات بھی مولوی صاحب نے کیے ہیں اور جہاں جہاں مولوی صاحب نے اپنے اشہب قلم کی جولانی دکھانی چاہی ہے، وہیں منہ کی کھائی ہے۔

عربی زبان سے ناواقف ہونے کی وجہ سے اس کے بعض محاورات کا ترجمہ بھی غلط کیا ہے۔ ان سب امور کا مفصل تذکرہ میں اپنی کتاب میں کروں گا۔ ان شاء اللہ

اس جماعت کو جماعت کے نام سے موسوم کرنا لفظ جماعت کی توہین ہے، یہ تو چوں چوں کا مربہ ہے۔ اس جماعت کی باگ ڈور مولوی محمد علی صاحب کے رشتہ دار سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہے۔ جن کی ''روحانی کارگزاریوں'' کا تذکرہ کبھی کبھی ملکی اخبارات میں بھی شائع ہوتا رہتا ہے۔ پارٹی بازی نے اس نام نہاد جماعت کا بیڑا غرق کر دیا ہے اور یہ بالکل ایک جسد بے روح ہے، جو چندہ آتا ہے وہ میٹنگوں کی نذر ہو جاتا ہے۔ سال کے 365 دنوں میں اس جماعت کی 366 میٹنگیں ہوتی ہیں اور نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات اور مرغ کی ایک ٹانگ۔

جس طرح ربوہ میں میاں محمود کا خاندان جماعت کے ہر شعبہ پر حاوی ہے، اسی طرح یہاں مولوی محمد علی صاحب کے خاندان کا حال ہے اور وہ اس انجمن کو اپنا ورثہ خیال کرتا ہے۔ مولوی صاحب کے رشتہ داروں میں سے ایک ایبٹ آبادی ''خان بہادر'' ہیں، جو آرزوئے امارت کو سینہ سے لگائے، گارڈن ٹاؤن میں ڈیڑھ اینٹ کی ایک الگ مسجد بنا کر یہاں براجمان ہو گئے ہیں اور مع خاندان اس تاک میں ہیں کہ کب مولوی صدر الدین صاحب کو پیغام اجل آئے اور میں عروس امارت سے ہمکنار ہوں۔ جہاں ''خان بہادر'' صاحب میں اور بہت سی ''اچھی صفات'' ہیں، وہاں یہ افترا پردازی میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتے اور ایک دفعہ جھوٹ بولنے کے بعد ان سے اس کا اعتراف کرانا مشکل ہی نہیں، ناممکن ہے۔ بہرحال ہمیں ان کی مستقل مزاجی اور جھوٹ پر ثابت قدمی کی داد دینی پڑتی ہے۔

آزاد کشمیر اسمبلی نے جب قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کی قرارداد پاس کی تو خاکسار نے چند دیگر دوستوں کے دستخطوں کے ساتھ ایک درخواست انجمن کے جنرل سیکرٹری کو بھجوائی کہ آپ جماعت ربوہ سے علیحدگی کا اعلان کریں کیونکہ ہم مرزا صاحب کی نبوت کے قائل نہیں، نہ ختم نبوت کے منکر ہیں، نہ اجرائے نبوت کو مانتے ہیں، نہ تکفیر مسلمین کرتے ہیں۔ مگر اس جماعت کی منتظمہ نے یہ فیصلہ کیا کہ ہم ربوہ والوں سے علیحدگی کا اعلان نہیں کریں گے۔ مجھے اس وقت سمجھ آئی کہ یہ جماعت اپنے

افکار ونظریات میں کلیتہً منافق ہے۔

1974ء میں جب مسلمان قادیانیوں کی دونوں جماعتوں کے خلاف شعلہ جوالا بنے ہوئے تھے، نیو کیمپس کے ایک طالب علم کا خط ہفت روزہ ''چٹان'' میں شائع ہوا۔ جس کا مفہوم یہ تھا کہ جامعہ پنجاب کے قریب مرزائیت کا ایک اڈہ ''دارالسلام'' کے نام سے تعمیر ہو رہا ہے اور یہاں سے ہوسٹلوں میں لٹریچر تقسیم کیا جاتا ہے تاکہ مسلمانوں کی نسل کو گمراہ کیا جائے۔ جب مجھے اس خط کا علم ہوا تو میں نے بعض دوستوں سے گفتگو کی کہ اس خط کا جواب انجمن کی طرف سے دیا جائے اور یہ امر واضح کر دیا جائے کہ ہمارا اہل ربوہ سے کوئی تعلق نہیں۔ جب اس خط کا جواب لکھ کر ہیڈ کلرک نے سیکرٹری صاحب کی خدمت میں دستخطوں کے لیے پیش کیا تو سیکرٹری صاحب نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا اور وہ خط بغیر دستخطوں کے ایڈیٹر ''چٹان'' کو ارسال کر دیا گیا۔ جب یہ خط آغا شورش مرحوم کو ملا تو انھوں نے بتایا کہ آپ کے دفتر سے ایک خط بغیر دستخطوں کے آیا ہے۔ میں ایسے گمنام خطوط شائع نہیں کیا کرتا مگر بوجہ میں اسے شائع کر رہا ہوں اور ساتھ ہی کہنے لگے مجھے معلوم ہو رہا ہے کہ انجمن کے دفتر میں کوئی بڑا بے ایمان اور ربوہ کا ایجنٹ بیٹھا ہوا ہے۔ جواباً کہا گیا کہ آپ کا قیاس بالکل صحیح ہے۔ اگر اس جماعت نے اس آدمی کو سیکرٹری شپ نہ دی ہوتی تو یہ ربوہ کے لنگر خانہ میں مرچیں پیس رہا ہوتا۔

آپ اس بات پر متعجب ہوں گے کہ آخر سیکرٹری کو دستخط کر دینے سے کیا تکلیف ہوتی تھی؟ تو واضح رہے کہ سیکرٹری انجمن کا وہی عقیدہ ہے جو اہل ربوہ کا ہے بلکہ ساری انجمن کا وہی عقیدہ ہے۔ اگر نہیں تو انھوں نے اہل ربوہ سے علیحدگی کا اعلان کیوں نہیں کیا۔ ورنہ مجھے بتایا جائے کہ سیکرٹری نے اپنی انجمن کے عقائد پر دستخط کیوں نہیں کیے۔ کیا جماعت نے اس فعل پر اس سے جواب طلبی کی؟ ہرگز نہیں۔ کیا سیکرٹری کے اندر یہ جرأت ہے کہ وہ ماہانہ ایک ہزار روپیہ مشاہرہ اور رہائش کے لیے ایک پورا ادارہ قابو کر کے اس انجمن کے عقائد کی خلاف ورزی کر سکے۔ صاف ظاہر ہے کہ سب نے ملی بھگت کی ہوئی ہے۔ میں نے خود اس جماعت کے ایک لیڈر سابق پولیس آفیسر سے متعدد مرتبہ سنا ہے کہ اگر میاں محمود کا خاندان خلیفہ نہ بنے تو ہم ان کی بیعت میں شامل ہونے کو تیار ہیں۔ اس بات سے یہ امر بخوبی واضح ہوتا ہے کہ 1914ء میں اصل جنگ اقتدار کی تھی۔ اگر ایسا نہ تھا تو یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ ہم صرف ایک شرط پوری کر دینے پر ان کی جماعت کے ممبر بن جانے کو تیار ہیں۔

پاکستان نیشنل اسمبلی میں پیش ہونے کے بعد جب ہم لاہور واپس آئے تو جماعت کے بعض افراد سے ہم نے طرح طرح کی باتیں سنیں مگر ہم عمداً خاموش رہے۔ چند ماہ بعد ایک مبلغ کی

بیرون ملک روانگی پر مقامی جماعت لاہور کی طرف سے اس کے اعزاز میں ایک جلسہ منعقد کیا گیا۔ میں عموماً مقامی جماعت کے جلسوں میں شمولیت نہیں کرتا تھا مگر اس دن ایک دوست کے اصرار پر جلسہ میں شامل ہو گیا۔ مقامی جماعت لاہور کے صدر جو وکیل ہونے کے باوجود ایک مل اونر کے پرسنل سیکرٹری ہیں، انھوں نے میاں ناصر احمد کی طرح خانہ خدا میں کھڑے ہو کر صریح غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے ہم پر یہ الزام عائد کیا کہ ہم نے جماعت لاہور کے عقائد کو نیشنل اسمبلی میں مسخ شدہ صورت میں ریکارڈ کروایا ہے۔ اس پر میں نے احتجاجاً انجمن کے سیکرٹری کو چٹھی لکھی کہ میں اس وفد کا ایک ممبر تھا جو نیشنل اسمبلی میں پیش ہوا تھا، اس لیے میں ذاتی علم کی بنا پر کہتا ہوں کہ مقامی جماعت کے صدر نے نہایت ڈھٹائی سے افترا پردازی کی ہے۔ اب یا تو وہ اس الزام کا ثبوت پیش کرے یا بصورت دیگر معافی مانگے اور اس چٹھی کی نقول میں نے مختلف جماعتوں کو بھی ارسال کیں۔ سیکرٹری صاحب نے اپنی ممسوخ فطرت کے عین مطابق کمال بددیانتی سے مجھے یہ جواب بھجوایا کہ مقامی جماعت کے صدر نے نیشنل اسمبلی میں داخل کردہ بیان پر تبصرہ کیا ہے۔ مجھے ان کی اس غلط بیانی پر بڑا طیش آیا اور میں نے انھیں لکھا کہ اسمبلی میں داخل کردہ بیان تو ایک کانفیڈنشل دستاویز ہے، اس پر تبصرہ چہ معنی دارد؟

جب سیکرٹری صاحب نے دیکھا کہ میری کذب بیانی پر مضبوط گرفت ہوئی ہے تو دوسرے دن انھوں نے مقامی جماعت کے صدر کا ایک معذرت نامہ بھجوایا، جو عذر گناہ بدتر از گناہ کی مثال تھا۔ میں نے اس معذرت نامہ پر جرح کر کے لکھا، یہ معذرت نہیں محض الفاظ کے طوطے مینا اُڑائے گئے ہیں۔

اس کا الزام دو حال سے خالی نہیں۔ یا الزام سچا ہے یا جھوٹا، اگر سچا ہے تو ثبوت پیش کریں اور اگر جھوٹا ہے تو معافی مانگے۔ اس پر سیکرٹری صاحب نے مجھے دفتر میں بلایا اور کہا کہ آپ نے ساری جماعت میں ایک اضطراب پیدا کر دیا ہے۔ آپ ذرا سیکرٹری صاحب کی دیانت ملاحظہ فرمائیں، جو آدمی ایک مجمع عام میں کسی پر جھوٹا الزام لگاتا ہے، وہ امن کا دیوتا ہے اور جو آدمی اس الزام کا ثبوت طلب کرتا ہے، وہ جماعت میں خلفشار پیدا کرتا ہے۔

تمہاری زلف میں آئی تو حسن کہلائی
وہ تیرگی جو مرے نامہ سیاہ میں ہے

اس قسم کی الٹی منطق اس انجمن کے سیکرٹری کی کھوپڑی میں ہی سما سکتی ہے اور کسی میں یہ بوتا کہاں ہے۔ ہاں اس کے ساتھ سیکرٹری صاحب نے مجھے یہ بھی کہا کہ میں نے اور ڈاکٹر سعید احمد نے اس کو سرزنش کی ہے۔ میں نے کہا مجھے اس بات کی سمجھ نہیں آ سکی کہ الزام تو جلسہ عام میں لگایا جا

رہا ہے اور سرزنش کسی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر کی جا رہی ہے۔ ان دونوں باتوں میں کوئی مناسبت نظر نہیں آتی۔

بہر کیف میں سمجھ گیا کہ اگر اس جماعت کے عقائد وہی ہوتے، جن کا یہ پرچار کرتی ہے تو یہ نیشنل اسمبلی میں پیش ہونے والے ڈیلی گیشن پر الزام نہ لگاتی، کیونکہ ڈیلی گیشن نے تو وہی عقائد پیش کیے تھے جن کا اظہار یہ لوگ کرتے ہیں۔ بہر حال میں نے ان لوگوں کا تعاقب جاری رکھا، تو انھوں نے ایک تحقیقاتی کمیشن قائم کیا مگر وہ صرف کاغذات میں ہی ہوا۔ ان کو اس بات کا پتہ چل گیا تھا کہ اب یہ ہمارا بھانڈہ چوراہے میں پھوڑ دیں گے۔ چھ ماہ تک میری ان کے ساتھ کشمکش رہی کہ آپ مجھے اپنے عقائد بتائیں جو مسخ ہوئے ہیں مگر وہاں ایک خاموشی تھی، سب کے جواب میں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں انجمن کے اس سیکرٹری کا سراپا بھی لکھ دوں جس کی ساری عمر در غیر پہ جبہ سائی کرتے گزری ہے۔

در غیر پر ہمیشہ سر جھکائے دیکھا
کوئی ایسا داغ سجدہ میرے نام پر نہیں ہے

دراصل یہ جماعت لاہور کا عزیز بھانبڑی ہے۔ پستہ قد، گردن کوتاہ، چپٹا ناک، لب بیف برگر، آنکھیں زنبور اصفر، رنگ سیاہ، دل سیاہ، روح سیاہ، گفتار ناصحانہ، کردار منافقانہ، طبیعت شکاری، مزاج بیوپاری، یہ ہے لاہوری انجمن کا سیکرٹری۔

ایک لاہوری ولی کو دعوت مباہلہ

اب اس شکست کا بدلہ لینے کے لیے سب نے مشورے کر کے ایک ایبٹ آبادی ''ولی اللہ'' کو آگے کیا۔ جس نے اپنی ولایت کے زور پر ایسے ایسے جھوٹ تصنیف کیے کہ بس لطف ہی آ گیا۔ یہ صاحب بھی اپنے آپ کو مجدد سے کم نہیں سمجھتے۔ انھیں صرف تین باتوں کا شوق ہے۔ امیر جماعت بننے کا، نماز پڑھانے اور درس دینے کا۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ ان تینوں باتوں کی اہلیت ان کے اندر موجود نہیں۔ میں نے ربوہ والوں اور لاہور والوں میں ایک فرق دیکھا ہے۔ ربوہ میں جو شخص گو بھی کھائے، اسے الہام شروع ہو جاتے ہیں اور لاہور میں جو الف، ب پڑھ جائے وہ اپنے آپ کو مفسر قرآن سمجھنے لگتا ہے۔

اس ایبٹ آبادی ''ولی اللہ'' نے ہمارے خلاف ایک پمفلٹ شائع کیا اور کمال مہربانی سے مجھے بھی بھجوایا۔ میں نے اس پمفلٹ کو پڑھ کر اس کا جواب لکھا اور اس نام نہاد ''ولی اللہ'' کو مباہلہ کا چیلنج بھی دیا اور لکھا کہ اب ہم میں سے جو میدان مباہلہ میں حاضر نہ ہو، اس پر خدا کی لعنت،

مگر آج تک انہیں میرے سامنے آنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ اس کے بعد، میں نے متعدد خطوط لکھے کہ آپ نے جو الزامات لگائے ہیں ان کے ثبوت دیجئے۔ باوجود ''خان بہادر'' اور ''ولی اللہ'' ہونے کے ایسے چپ ہوئے کہ گویا مر ہی گئے ہیں اور آج تک گارڈن ٹاؤن کے قبرستان کے نزدیک ان کا بے جان لاشہ سڑاند پیدا کر رہا ہے۔ میں پوری بصیرت سے اس بات پر قائم ہوں اور جیسا کہ میں نے گزشتہ صفحات میں ثابت کر دیا ہے، ان جماعتوں کے لیڈر خاص طور پر پرلے درجے کے کذاب اور بے دین آدمی ہیں اور میں پورے یقین سے کہتا ہوں کہ یہ جماعتیں سینہ اسلام پر ایک رستا ہوا ناسور ہیں۔ ان کا آپریشن جس قدر جلد ہو، اتنا ہی اچھا ہے۔

اب مجھے اس طرف توجہ مبذول کرنا پڑی کہ اگر مرزا صاحب کی آمد کی غرض اس قسم کے خبیث، بے دین اور کذاب لوگ پیدا کرنا تھی، تو حقیقت معلوم شد۔ کیونکہ درخت اپنے پھلوں سے پہچانا جاتا ہے اور ان جماعتوں میں جو خدا کے مقرر کردہ خلیفے ہیں یا خدا کے مقرر کردہ خلیفہ کے جانشین ہیں، وہی سب سے زیادہ بے ایمان ہیں، تو دوسروں کا اللہ ہی حافظ ہے۔

میں نے جناب مرزا صاحب کی جسمانی اور روحانی دونوں قسم کی اولاد دیکھی ہے اور جو کمالات ان دونوں قسم کی اولاد میں موجود ہیں، ان سے بھی میں اچھی طرح آگاہ ہوں۔ میرے نزدیک لاہور کے گندے نالے کے اندر بھی اتنا تعفن موجود نہیں، جتنا ان کے اندر ہے۔ میں نے عمداً ان کی جنسیاتی بیماریوں کا تذکرہ کرنے سے احتراز کیا ہے کیونکہ میں اپنے قلم کو ایسی باتوں کے ذکر سے آلودہ نہیں کرنا چاہتا۔

لاہوری جماعت کی اس سے بڑھ کر ذلت اور رسوائی اور کیا ہوگی کہ اس کے کارکنان جب استعفا دیتے ہیں تو اس میں صریح الفاظ میں لکھتے ہیں کہ چونکہ تم لوگ بے ایمان ہو، اس لیے ہم آپ کی ملازمت سے علیحدہ ہوتے ہیں۔ جناب غلام نبی صاحب مسلم ایڈیٹر ''پیغام صلح'' اور جناب مرزا محمد حسین صاحب ایڈیٹر ''لائٹ'' اس کی واضح مثال ہیں۔

میں نے ارادۃً ان لوگوں کی بے ایمانیوں اور دھاندلیوں کا تذکرہ نہیں کیا، جن کا اظہار الیکشن کے مواقع پر ان لوگوں سے ہوتا ہے۔ ان باتوں میں بھی، میں نے ان کا بڑا مقابلہ کیا ہے بلکہ ان کے بعض الیکشن کالعدم قرار دلوائے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر انٹرنیشنل طور پر الیکشن میں بے ایمانی کا مقابلہ ہو تو ساری دنیا کو لاہوری انجمن کا اکیلا سیکرٹری ہی شکست فاش دے دے۔

اس جماعت کے گھناؤنے کردار کو دیکھ کر میں نے اس سے علیحدگی اختیار کر لی اور جناب مرزا صاحب اور ان کی جماعت کے عقائد و نظریات کا تنقیدی مطالعہ شروع کر دیا تو مندرجہ ذیل امور میرے سامنے آئے۔

مرزا صاحب کے ذہنی کمالات

مرزا صاحب نے مسلمانوں میں ذہنی خلفشار پیدا کرنے کے لیے اس قسم کے الفاظ استعمال کیے ہیں، جن سے خواہ مخواہ ایک جھگڑے کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً لفظ ''نبی'' کا استعمال ہے۔ اب حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کوئی مسلمان کسی آدمی کو نبی تسلیم نہیں کرسکتا، کیونکہ آپؐ پر نبوت ختم ہوچکی ہے۔

یہ بات خود مرزا صاحب کو بھی مسلم ہے کہ اس لفظ ''نبی'' سے مسلمانوں کے اندر ایک تفرقہ پیدا ہوتا ہے، مگر اس کے باوجود اس لفظ کو استعمال کر رہے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ ہمارا دعویٰ ہے کہ ہم نبی اور رسول ہیں۔ پھر کہتے ہیں اگر میں نبی ہوں تو مسلمان نہیں ہوسکتا اور اگر مسلمان ہوں تو نبی نہیں ہوسکتا۔ کبھی کہتے ہیں میں نے تو لفظ نبی کو صرف لغوی معنوں میں استعمال کیا ہے اور دوسری جگہ کہتے ہیں کہ لغت اور اصطلاح میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ جب بھی ان پر اعتراض کیا گیا تو انھوں نے طرح طرح کی تاویلات کا سہارا لیا کہ میری مراد اس لفظ نبی سے یہ ہے اور وہ ہے۔ پھر جو وضاحت انھوں نے کی، اس پر خود ان کی دونوں جماعتوں کا اتفاق نہیں اور اکثریت آج بھی انھیں حقیقی معنوں میں نبی سمجھتی ہے۔ ختم نبوت کے بعد اجرائے نبوت کا فلسفہ ایک لعنتی فلسفہ ہے اور کوئی مسلمان اسے تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوسکتا، کیونکہ یہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توہین کے مترادف ہے۔

اسی طرح جناب مرزا صاحب نے حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق نہایت سخت کلامی سے کام لیا ہے۔ جب ان سے دریافت کیا گیا کہ آپ ایک نبی کی ہتک کے مرتکب ہوئے ہیں، تو کہنے لگے میں نے یہ الفاظ حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق استعمال نہیں کیے بلکہ میں تو یہ الفاظ اس یسوع کے متعلق استعمال کر رہا ہوں، جو عیسائیوں کا فرضی خدا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب آپ کو خود مسلم ہے کہ یسوع ایک فرضی اور وہمی وجود ہے، تو فرضی اور وہمی وجود کے متعلق سخت کلامی کی کیا تک ہے؟ پھر خود ہی انھوں نے بے شمار مقامات پر حضرت مسیح علیہ السلام کو ہی یسوع قرار دیا ہے، بلکہ اپنے آپ کو یسوع کا مثیل بھی قرار دیا ہے۔ کبھی کہتے ہیں یسوع ایک فرضی وجود ہے اور کبھی اس کے مثیل بن بیٹھتے ہیں۔

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

حضرت علیؓ اور حضرت امام حسینؓ کے متعلق بھی انھوں نے ایسے ہی الفاظ استعمال کیے ہیں۔ جب پوچھا گیا کہ آپ نے ایسے سخت الفاظ ان بزرگوں کے متعلق کیوں استعمال کیے ہیں، تو صاف انکار کر گئے اور کہنے لگے میری مراد حضرت علیؓ اور حضرت امام حسینؓ نہیں بلکہ شیعوں کے خیالی

علی اور حسین مراد ہیں۔ خیالی چیزوں کا تو کوئی وجود ہی نہیں ہوتا۔ آخر اس پر اتنا زور قلم صرف کرنے کا کیا مطلب تھا؟

جہاد کے متعلق تحریم و تنسیخ کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ جب گرفت ہوئی کہ آپ ایک عظیم اسلامی رکن کو منسوخ کرنے کی کیا اتھارٹی رکھتے ہیں، کیونکہ اسلامی شریعت کا کوئی حکم قیامت تک منسوخ نہیں ہوسکتا۔ کہنے لگے میری مراد حرام اور منسوخ کرنے سے ملتوی کرنا ہے۔ لیکن یہ بھی لکھا کہ مجھے مان لینا ہی مسئلہ جہاد کا انکار کرنا ہے۔

مسیح کے **صعود الی السماء** پر مرزا صاحب اور ان کی جماعت نے بہت کچھ لکھا ہے اور اسے باطل قرار دینے کے لیے یہ بھی کہا ہے کہ ایسی کوئی مثال دنیا میں موجود نہیں کہ کوئی انسان مع جسد عنصری آسمان پر گیا ہو اور جناب میاں طاہر احمد نے اپنی تالیف ''وصال ابن مریم'' میں مودودی صاحب کے اس جواب کا بڑا مضحکہ اڑایا ہے کہ یہ ایک ہی واقعہ ایسا ہوا ہے، اس لیے اس کی مثال کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

میاں صاحب موصوف کہتے ہیں یہی تو اس کے باطل ہونے کا ثبوت ہے کہ اس کی کوئی مثال دنیا میں موجود نہیں۔ ہمارا سوال یہ ہے کہ جب سے دنیا میں سلسلہ نبوت کا آغاز ہوا ہے، کیا کوئی مرزا صاحب کی طرح امتی نبی بھی بنا ہے۔ اگر اس کی بھی کوئی مثال دنیا میں موجود نہیں تو مرزا صاحب کیسے نبی بن گئے۔ یہی اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کے نظریات اللہ تعالیٰ کی سنت قدیمہ کے خلاف ہونے کی وجہ سے باطل ہیں۔

مرزا صاحب نے انگریزی حکومت کی وہ تعریف کی ہے کہ بس حد ہی کر دی ہے۔ نبیوں کی یہ شان نہیں ہوتی کہ وہ حکومتوں کے قصائد لکھتے ہیں۔ انگریز ایک غاصب اور ظالم قوم ہے۔ اس نے سوداگری کے بھیس میں آ کر ہمارے ملک پر قبضہ کر لیا اور مسلمانوں کے خون کو پانی کی طرح بہایا۔ اس خون ریزی میں مرزا صاحب کے والد نے پچاس گھڑ سواروں کے ساتھ ان کی مدد کی اور ان کے بڑے بھائی صاحب نے تموں گھاٹ پر مسلمانوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے اور مرزا صاحب نے اپنے پر یہ فرض ٹھہرا لیا کہ میں ہر تصنیف میں انگریزوں کی مدح کروں گا اور پھر اپنی تصانیف کو ایران، روم، عرب اور افغانستان تک پھیلا کر انگریزی حکومت کو لکھا کہ جیسی میں نے آپ کی خدمت کی ہے، ایسی کسی نے نہیں کی۔

اصل بات یہ ہے جیسا کہ قرآن کریم نے اس کی توضیح کی ہے کہ بادشاہ جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں، تو وہاں کے جاگیرداروں اور معزز لوگوں کو ذلیل و رسوا کر دیتے ہیں۔ مرزا صاحب کا خاندان بھی چونکہ جاگیرداروں کا خاندان تھا، اس لیے انھوں نے سمجھا کہ اب اپنی جاگیر اسی

صورت میں محفوظ رہ سکتی ہے کہ انگریزوں کی مدد کی جائے۔ چنانچہ انھوں نے انگریزوں سے مل کر اپنے ہی بھائیوں کا خون بہایا اور کرسی نشین رئیس قرار پائے...... انگریزوں کی تعریف اور امداد کا مقصد صرف اپنی جاگیر کی حفاظت کرنا تھا اور یہی طریق دوسرے جاگیرداروں نے بھی اختیار کیا تھا۔

مرزا صاحب نے اپنے صدق وکذب کا معیار ایک لڑکی سے شادی کرنا قرار دیا ہے۔ کیا نبیوں کی صداقت کا معیار لڑکیوں سے شادی کرنا ہوتا ہے کہ اگر فلاں لڑکی سے شادی ہوگئی تو سچا نبی ہوں گا اور اگر نہ ہوئی تو جھوٹا اور پھر لطف کی بات یہ ہے کہ اس لڑکی سے آپ کی شادی بھی نہ ہوسکی۔ ہاں آسمانوں پر نکاح پڑھا گیا، نہ وہاں پر کوئی گیا اور نہ کسی نے دیکھا۔

''سیرۃ المہدیٰ'' جو ربوہ جماعت کے ''قمر الانبیاء'' اور مرزا صاحب کے منجھلے صاحبزادے کی تالیف ہے، اس میں لکھا ہے کہ مرزا صاحب ایک نامحرم عورت سے اپنا جسم دبوایا کرتے تھے۔ ہر چند یہ ایک بیہودہ بات ہے مگر اس سے بھی کہیں بڑھ کر بیہودہ روایات اس کتاب میں موجود تھیں، جن کو پڑھنے والے آج بھی زندہ موجود ہیں۔

جب ان روایات پر ہر طرف سے اعتراضات کی بوچھاڑ ہوئی تو وہ ایڈیشن تلف کر دیا گیا۔ ربوہ جماعت کے مشہور مناظر ملک عبدالرحمٰن خادم ''سیرۃ المہدیٰ'' کی روایات کو بالکل حجت نہیں مانتے تھے، مگر میرے لیے یہ بات بڑی حیرت اور تعجب کا باعث ہے کہ خادم صاحب میاں بشیر احمد کو ''قمر الانبیاء'' تو مانتے ہیں مگر ان کی بیان کردہ روایات کو بالکل قابل اعتنا نہیں سمجھتے۔ معلوم نہیں اتنے کچے آدمی کو وہ ''قمر الانبیاء'' ماننے پر کیوں مجبور تھے۔

اس جماعت کے افراد کو یہ تربیت دی گئی ہے، بلکہ یہ بات ان کی گھٹی میں داخل ہے کہ جب کوئی شخص مرزا صاحب پر اعتراض کرے تو تم فوراً حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر حملہ کر دیا کرو۔ ربوائی اصطلاح میں اس حملے کا نام ''الزامی جواب'' ہے۔ میانوالی کے مباحثہ میں جب قاضی نذیر محمد صاحب لائل پوری پر یہ اعتراض کیا گیا کہ مرزا صاحب نامحرم عورتوں سے اپنا جسم دبوایا کرتے تھے تو انھوں نے بلا تامل حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فداہ نفسی وروحی وابی وامی پر حملہ کر دیا اور کہا کہ ایک حدیث کی کتاب میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اونٹ پر سوار تھے، تو آپ کا جسم ایک نامحرم عورت کے جسم کے ساتھ مس کر رہا تھا جو آپ کے پیچھے سوار تھی۔

قاضی صاحب نے اس بات کی قطعاً پرواہ نہیں کی کہ یہ بات میں کس ذات اقدس کے متعلق کہہ رہا ہوں۔ جس حدیث سے میں استدلال کر رہا ہوں، وہ کس پائے کی حدیث ہے آیا وہ قابل حجت ہے بھی یا نہیں۔ پھر اگر وہ صحیح بھی ہے تو میں جو تقابل کر رہا ہوں، وہ بھی درست ہے یا نہیں۔

یہ وہ علم کلام ہے جو ربوہ جماعت کو مرزا صاحب کی وراثت سے ملا ہے۔ اس سے آپ

اندازہ فرما سکتے ہیں کہ کسی شخص کی عزت ان کے حملوں سے محفوظ رہ سکتی ہے؟ جو لوگ میاں بشیر احمد کی لچریات کو ثابت کرنے کے لیے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حملہ کرنے سے بھی نہیں چوکتے، ان سے کوئی دوسرا آدمی کیسے بچ سکتا ہے۔

ایسی جماعت سے حذر، ایسے امام سے حذر

مرزائی لیڈروں کی ہفوات

میاں محمود احمد نے اپنے ایک خطبے میں کہا ہے کہ انسان ''محمد رسول اللہ ﷺ'' سے بڑھ سکتا ہے۔ نعوذ باللہ من ذالک۔ اس سے بڑھ کر ناپاک خیال اور کیا ہوسکتا ہے۔ جس کی شان میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا دنٰی دنی فتدلی فکان قاب قوسین او ادنٰی اس سے آگے بڑھ جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں فکر انسانی کا گزر بھی ممکن نہیں۔

حج، جو ارکان اسلام میں سے ہے، جس کی ادائیگی مکہ مکرمہ میں ہوتی ہے۔ اس کے متعلق میاں محمود احمد نے کہا کہ حج کا فائدہ اب مکہ میں حاصل نہیں ہوتا بلکہ قادیان میں ہوتا ہے۔ گویا خدا تعالیٰ نے اب لغو اور عبث طور پر اسے مقرر کر رکھا ہے۔ اس سے بڑھ کر شعائر اسلام کی اور کیا توہین ہو سکتی ہے؟ پھر یہ بھی کہا کہ مکہ کی چھاتیوں سے دودھ خشک ہو گیا ہے۔ وہ مقام جسے اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ کے لیے بابرکت قرار دیا ہے، گویا اس کی برکات ختم ہو گئی ہیں اور اب اس کی بجائے وہ قادیان میں منتقل ہو گئی ہیں۔ نعوذ باللہ من ذالک۔

میاں محمود نے اس صحابیؓ کو جس نے حضرت عمرؓ سے دریافت کیا تھا کہ آپ نے یہ قمیص کہاں سے بنوائی ہے، شیطانی روح قرار دیا ہے۔ اس دریدہ دہن کو اتنا علم نہیں کہ یہ سوال کرنے والے حضرت سلمان فارسی تھے (بحوالہ عمر فاروقؓ مولفہ طنطاویؒ) جن کے متعلق حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیان فرمایا ہے کہ سلمان منا اھل البیت اور لطف کی بات یہ ہے کہ خود مرزا صاحب اپنے آپ کو ان کی اولاد ظاہر کرتے ہیں اور اگر وہ (نعوذ باللہ) شیطانی روح تھے تو آپ کیا ہوئے؟ یہ عظیم اور جلیل القدر صحابی کی شان میں وہ گستاخی کرتا ہے جبکہ اس کی اپنی حیثیت ان کے بیت الخلاء کی اینٹ کے برابر بھی نہیں۔

آیت قرآنی وبالاخرۃ ھم یوقنون کی تفسیر یہ کی جاتی ہے کہ اس سے مراد مرزا صاحب کی وحی ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ دیگر انبیاء کی وحی پر تو لوگوں کو ایمان لانے کی دعوت دی جاتی ہے اور مرزا صاحب کی وحی پر یقین کرنے کی یہ تفسیر دیگر قرآنی آیات کے خلاف ہونے کی وجہ سے باطل ہے اور آج تک کسی مفسر قرآن نے اس طرف اشارہ بھی نہیں کیا۔

محمد صالح نور

فردوس ابلیس

میں ایک قادیانی گھرانے میں، 1927ء میں، پیدا ہوا۔ میرے والد محمد یامین قادیانی تھے۔ میں ربوہ میں، تحریک جدید میں، نائب وکیل التعلیم کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ 1948ء میں قادیان (بھارت) سے پاکستان آیا اور ربوہ کے نزدیک "احمد نگر" میں رہائش اختیار کر لی۔ 1949ء میں ربوہ قائم ہوا تو میں وہاں منتقل ہو گیا۔ بعدازاں، جب قادیانی جماعت نے مرزا بشیر الدین محمود کے ایما پر مجھے ربوہ سے نکال دیا تو میں اپنی بیوی اور دو بچوں کے ہمراہ قصور آ گیا۔ ربوہ سے نکالے جانے کے بعد میں نے اپنا مذہب تبدیل کر لیا۔ اب میں قادیانی نہیں، مسلمان ہوں۔

قادیان کی آبادی ملی جلی تھی۔ ہندو اور سکھ بھی قادیان میں رہتے تھے، لیکن قادیانی اکثریت میں تھے۔ جب میں ربوہ آیا تو یہ ٹاؤن کمیٹی تھی، جس کے سربراہ مرزا ناصر احمد کے بھائی تھے۔ ربوہ کی نواحی بستیوں میں غیر احمدی آبادی زیادہ ہے۔ سالانہ جلسہ کے موقع پر قادیانی کوشش کرتے ہیں کہ مسلمانوں کو ربوہ میں لائیں، تاکہ انھیں قادیانیت قبول کرنے کی ترغیب دیں۔

میں نے تحریک جدید کے علاوہ کسی دوسرے شعبے میں کام نہیں کیا، البتہ جب میں قادیان میں تھا تو میں نے بطور رضاکار، کار خاص کے سربراہ، جسے محتسب کہا جاتا ہے، کے ساتھ کام کیا تھا۔

قادیانی تنظیمیں

انجمن احمدیہ، 1906ء میں، قادیان میں قائم کی گئی۔ قیام پاکستان کے بعد انجمن کا مرکز، قادیان سے ربوہ منتقل ہو گیا۔ احمدیہ جماعت کو چار طبقوں میں تقسیم کیا گیا ہے: ایک حصہ عورتوں پر مشتمل ہے، اسے لجنہ اماء اللہ کہتے ہیں۔ دوسرا حصہ انصار اللہ کہلاتا ہے۔ اس میں صرف مرد ہوتے ہیں، جن کی عمر چالیس سال یا اوپر ہو۔ تیسرا حصہ خدام الاحمدیہ ہے، جو 15 سے 40 سال کے درمیان عمر کے مردوں پر مشتمل ہے۔ چوتھا حصہ اطفال الاحمدیہ کہلاتا ہے۔ اس میں پندرہ سال سے کم عمر کے بچے ہوتے ہیں۔ ہر (Locality) میں ایک افسر ہوتا ہے، جسے زعیم کہتے ہیں، جو اپنی آبادی کے رہائشیوں کی سرگرمیوں پر نظر رکھتا ہے اور ہر قابل ذکر واقعہ کی اطلاع امور عامہ کو دیتا ہے۔ ربوہ میں

بھی ایسی ہی تنظیم ہے۔ ہر محلہ کی ایک انتظامیہ ہوتی ہے، جو زعیم کے تحت ہوتی ہے۔ ربوہ شہر میں تمام زعیم ایک صدر عمومی کے تحت ہوتے ہیں۔ ربوہ میں یہ تنظیمیں اس لیے قائم کی گئی ہیں کہ کمیونٹی کو مختلف سرکاری محکموں سے آزاد رکھا جائے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ربوہ میں سوسائٹی اس قدر Exclusive ہو گئی ہے کہ باہر کا کوئی آدمی یہ معلوم نہیں کر سکتا کہ اس سوسائٹی کے اندر کیا ہو رہا ہے۔ خدام الاحمدیہ کے تمام ارکان پورے ملک سے ربوہ میں سال میں ایک مرتبہ تین چار روز کے لیے جمع ہوتے ہیں۔ وہاں خدام الاحمدیہ کو گھڑ سواری، شوٹنگ اور تنظیمی امور میں تربیت دی جاتی ہے۔ امور عامہ اپنے انتظام کے لیے خدام الاحمدیہ کو بطور پولیس فورس استعمال کرتا ہے۔ 1956ء میں، جب میں ربوہ میں رہتا تھا، خدام الاحمدیہ کی تعداد ہزار، ڈیڑھ ہزار نوجوانوں پر مشتمل تھی، جبکہ ربوہ کی تمام آبادی پانچ سے چھ ہزار تک تھی۔ میں آخری مرتبہ تین سال قبل ربوہ گیا تھا۔ اب ربوہ کی آبادی تقریباً بارہ، تیرہ ہزار کے قریب ہو گی۔ یہ تعداد ربوہ کے واقعہ سے قبل تھی اور اب، اس واقعہ کے بعد بہت سے احمدی ''ہجرت'' کر کے ربوہ پہنچ گئے ہیں اور اب ان کی آبادی پچیس تیس ہزار کے قریب ہو گی۔ ربوہ میں ٹاؤن کمیٹی بھی ہے۔ یہاں جو لوگ زمین پٹہ پر حاصل کریں، اسے دفتر آبادی ربوہ میں ایک رجسٹر میں درج کیا جاتا ہے۔ یہ ''صدر انجمن احمدیہ'' کی ایک برانچ ہے۔ ربوہ میں زمین کے سودوں کا اندراج گورنمنٹ کے مقرر کردہ رجسٹرار یا سب رجسٹرار کے دفتر میں نہیں ہوتا، بلکہ انجمن کے دفتر میں ہوتا ہے۔ انصار اللہ کو کوئی خاص کام سپرد نہیں کیا جاتا کیونکہ یہ بوڑھے لوگوں پر مشتمل ہے۔ مرزا بشیر الدین محمود خدام الاحمدیہ سے Manual Labour حاصل کیا کرتے تھے تاکہ ان میں پست ذہنیت پیدا ہو۔ اپنے لیے سیلاب زدگان کی امداد کر کے نام حاصل کرتے ہیں۔ دراصل، وہ خدمت خلق کا کام اپنے چہروں کی سیاہی دھونے اور اپنی شہرت قائم کرنے کے لیے کرتے ہیں۔

امانت کے شعبہ نے، جو تمام احمدیوں کے لیے بینک کا کام دیتا ہے، خواہ وہ پاکستان میں ہوں یا بیرون پاکستان، احمدیوں کو یہ ہدایات دیں کہ دوسرے بینکوں میں اپنی رقوم جمع نہ کرائیں۔ یہی وجہ ہے کہ ربوہ میں بینک کھولنے کا کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ احمدیوں کو اپنے حسابات شعبہ امانت میں جمع کرانے پڑتے ہیں۔ دیگر بینکوں کی کسی بھی شاخ میں احمدی لین دین نہیں کرتے۔ یہ بینک بیرونی کرنسی کا کام نہیں کرتا۔ بیرونی کرنسی کا کام سٹیٹ بینک کی معرفت کیا جاتا ہے۔

صدر انجمن احمدیہ کے تحت دارالقضاۃ کا ایک الگ محکمہ ہے جو باہمی جھگڑوں کا فیصلہ کرتا ہے۔ دیوانی نوعیت کے مقدمات کا فیصلہ دارالقضاۃ میں ہوتا ہے، جبکہ فوجداری جھگڑوں کا تصفیہ امور عامہ کراتا ہے۔ امور عامہ کے شعبے کے سربراہ کو ناظر امور عامہ اور ان کے نائب کو نائب ناظر کہتے

ہیں۔ جب میں ربوہ میں رہتا تھا، ان دنوں ان دونوں نظارتوں پر فوج کے ریٹائرڈ افسران فائز تھے۔ میجر ریٹائرڈ عارف زمان ناظر تھے اور کیپٹن خادم حسین نائب ناظر تھے۔ ربوہ میں تمام قابل دست اندازی کیسوں کی اطلاع ربوہ پولیس کونہیں دی جاتی۔ بعض ایسے کیسوں میں امور عامہ اپنے ورشن دے کر پولیس کو رپورٹ دیتی ہے۔ امور عامہ یا کسی اور شعبے کی قانون میں کوئی اتھارٹی نہیں ہے کہ وہ قابل دست اندازی جرم کا فیصلہ کرے، لیکن اس کے باوجود امور عامہ اور دارالقضاۃ والے ایسے مقدمات کا فیصلہ کرتے ہیں۔ گویا شعبہ امور عامہ پولیس کے فرائض انجام دیتا ہے۔ دارالقضاۃ کے فیصلوں کے خلاف اپیل ایک بورڈ کے پاس جاتی ہے اور خلیفہ وقت، آخری اتھارٹی ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص ان عدالتوں کے فیصلوں کی نافرمانی کرے تو اس کا سوشل بائیکاٹ کیا جاتا ہے۔ اس کے خلاف تعزیری کارروائی بھی کی جاتی ہے، جس میں جماعت سے خارج کرنا شامل ہے۔ دراصل، پہلا قدم سوشل بائیکاٹ ہے۔ اگر اس سے معاملہ نہ سدھرے تو اسے ربوہ سے نکال دیا جاتا ہے اور آخری چارۂ کار کے طور پر اسے جماعت سے خارج کر دیا جاتا ہے۔ خلیفہ کے خاندان کے لوگ اس کارروائی سے مستثنیٰ ہیں۔

ادارہ اصلاح و ارشاد کو پہلے ادارہ دعوت وتبلیغ کہا جاتا تھا۔ جب 1953ء کے بعد تبلیغ رک گئی تو اس کو ادارہ اصلاح وارشاد کہا جانے لگا۔ تحریک جدید کے بہت سے شعبے ہیں۔ وکیل المال، وکیل الایوان، وکیل التبشیر، وکیل التعلیم اور وکیل الزراعت۔ تبشیر مشنری باہر بھیجتے ہیں۔ ربوہ میں ایک محکمہ کار خاص امور عامہ کے محکمے کے تحت ہے۔ یہ جاسوسی کرنے والی تنظیم ہے۔ اس شعبہ پر خرچ ہونے والی رقم کا آڈٹ نہیں کیا جاسکتا۔

انتقامی کارروائیاں

تشدد کرنا ربوہ والوں کا عام اصول ہے۔ میں متعدد مظالم کا شکار رہا ہوں جو میرے خلاف احمدیہ گروہ نے کیے۔ میں صرف ایک ہی نہیں، جسے ستایا گیا، بلکہ ہر روز کسی نہ کسی شخص کو ایسے مظالم کا شکار ہونا پڑتا ہے۔

ان دنوں مجھے اس وقت کے خلیفہ مرزا بشیر الدین محمود کی ذاتی زندگی کے متعلق ان کے کچھ ناگفتہ بہ حالات معلوم ہوئے تھے، جن کا ذکر میں نے اپنے دوستوں سے کیا تھا۔ جب مرزا صاحب کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے میرے سمیت پچاس کے قریب افراد کے سوشل بائیکاٹ کا حکم دے دیا۔ مجھے جماعت سے خارج کر دیا گیا اور ملازمت سے الگ کر کے ربوہ سے نکال دیا گیا میرے بچوں کو روک لیا گیا۔ خلیفہ صاحب نے میرے سسر کو یہ فتویٰ دیا کہ یہ (میں) مرتد ہو گیا ہے،

اس لیے اس کی بیوی اس کے نکاح میں نہیں رہ سکتی۔ ہم پچاس آدمی ربوہ سے باہر آ گئے۔ میرے تمام رشتے دار ربوہ میں ہیں۔ ان سب کو بہت تکلیفیں دی گئیں۔ ان کی زندگیاں اجیرن کر دی گئیں۔ اس کے بعد جب کبھی میں ربوہ کسی مرگ یا کسی دوسرے موقع پر جاتا تو مسلح آدمی میرا پیچھا کرتے۔

1958ء تا 1959ء میں، میں سالانہ جلسہ کے موقع پر ربوہ گیا تھا کیونکہ ان دنوں شادیاں وغیرہ بھی ہوتی ہیں اور ربوہ کے مکینوں کے تمام رشتہ دار وہاں ان تقریبات کے لیے جمع ہوتے ہیں۔ مجھے میرے بھانجے نے بتایا کہ امور عامہ کے ملازموں کی طرف سے مجھے اغوا کرنے کا پروگرام بنایا گیا ہے، وہ ایک کار میں کچھ عورتوں کے ساتھ میرا تعاقب کریں گے۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ وہ نہ صرف مجھے ماریں گے، بلکہ میرے خلاف یہ الزام بھی لگائیں گے کہ میں نے ان عورتوں کو چھیڑا ہے، لیکن میں نے ایک ہوٹل میں داخل ہو کر اور دوسرے راستے سے نکل کر ایک دوست کے گھر میں پناہ لے لی۔ میرے ساتھ پروفیسر غلام رسول، محمد یوسف ناز اور چوہدری نور نبی بھی تھے۔ پروفیسر غلام رسول میرے ساتھ بھاگ جانے میں کامیاب ہو گئے، مگر دوسرے دونوں کو پکڑ لیا گیا اور امور عامہ کے دفتر لے جایا گیا۔ پروفیسر غلام رسول نے اس اغوا کی تحریری رپورٹ ربوہ چوکی کے ایس آئی کو دی۔ آدھ گھنٹے کے بعد میرے دوسرے ساتھی یوسف ناز اور نور نبی واپس آ گئے اور بتایا کہ عبدالعزیز بھانبڑی نے اپنے امور عامہ کے کارکنوں کو جھڑکا کہ انھوں نے ہم چاروں کو کیوں نہ گرفتار کیا۔ اس کے بعد دونوں کو چھوڑ دیا گیا۔

1965ء میں میرے والد صاحب بیمار ہو گئے اور میں ربوہ میں ان کی خدمت کے لیے گیا۔ اس دوران میں قادیانی گروہ کے سربراہ مرزا ناصر احمد نے پیغام بھیجا کہ چونکہ میرے والد پرانے احمدی ہیں، اس لیے مرزا صاحب ان کی تیمارداری کے لیے آنا چاہتے ہیں، لیکن شرط یہ ہے کہ صالح نور (مریض کا لڑکا) مریض کے پاس موجود نہ ہو۔ اس پر میرے والد صاحب نے جواب دیا کہ میرا بچہ میری خدمت کر رہا ہے، مرزا صاحب خود تکلیف نہ کریں۔

1967ء میں میری والدہ فوت ہو گئیں۔ انھیں میری جدائی کا بہت غم تھا، اسی غم میں وہ فوت ہو گئیں۔ انھیں اس سے قبل فضل عمر ہسپتال میں داخل کرایا گیا۔ انچارج ڈاکٹر منور احمد، جو مرزا ناصر احمد کے بھائی ہیں، نے انھیں دیکھنے سے انکار کر دیا، کیونکہ وہ میری ماں تھیں۔ ان کا ہسپتال ہی میں انتقال ہوا۔ جب میں ہسپتال میں اپنی والدہ کو دیکھنے کے لیے گیا تو ان کی موت میں صرف آدھ گھنٹہ رہ گیا تھا، اس لیے انھیں کسی دوسرے ہسپتال میں منتقل کرنا ممکن نہ تھا، باوجودیکہ ان کو فضل عمر ہسپتال میں اس روز بالکل نظر انداز کر دیا گیا تھا، جس دن ان کی موت واقع ہوئی۔ ایک دوسرے

لیے

موقع پر، میرے والد صاحب نے مرزا ناصر احمد سے درخواست کی کہ میری ہمشیرہ کا نکاح پڑھائیں۔ انھوں نے نہ صرف نکاح پڑھانے سے انکار کر دیا، بلکہ حکم دیا کہ چونکہ صالح نور مرتد ہے، اس لیے جو اس کی ہمشیرہ کا نکاح پڑھائے گا، اسے ربوہ سے نکال دیا جائے گا۔

جماعت احمدیہ کی طرف سے ربوہ کے ہر شہری کی یہ ڈیوٹی لگائی گئی ہے کہ کسی بھی ناخوشگوار واقعہ کی اطلاع امور عامہ کے شعبے کو فوراً مہیا کریں۔ اس شعبے کی کارکردگی کی ایک مثال یہ ہے کہ ربوہ میں ایک گھر میں رقعے موصول ہوتے تھے، جو عورتوں کو لکھے جاتے تھے۔ یہ شک ظاہر کیا گیا کہ میں یہ رقعے اپنے بھانجے عبدالجلیل ظفر کے ذریعے بھجواتا ہوں۔ اس شک پر اسے امور عامہ کے دفتر لے جایا گیا اور خوب مارا پیٹا گیا۔ بعد میں امور عامہ والوں کو یہ علم ہو گیا کہ اس معاملے میں میرا ہاتھ ہے، نہ میرے بھانجے کا۔ اس وقت میرے بھانجے کی عمر تقریباً چودہ پندرہ سال تھی۔

میں نے احمدیہ کمیونٹی کی جانب سے ہراساں کیے جانے کے بارے میں متعدد افسروں کو درخواستیں بھی دی تھیں، لیکن کسی نے میری مدد نہ کی۔ جب میں نے پولیس انسپکٹر انچارج لالہ تھانہ لالیاں حبیب اللہ خان کو یہ اطلاع دی کہ مجھے اور میرے رشتہ داروں کو ہراساں کیا جا رہا ہے، تو اس نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا اور کہا کہ اگر مجھے قتل بھی کر دیا جائے، تو ربوہ میں اسے ایک گواہ بھی شہادت کے لیے نہ ملے گا۔ انھوں نے مجھے مشورہ دیا کہ ربوہ سے دور ہی رہوں یا پھر جب وہاں جانا ہو تو پولیس کی مدد بھی لے کر جاؤں۔ میں نے، اس سلسلہ میں، پولیس اور فوج کے اعلیٰ حکام کو مارشل لاء کے دنوں میں کئی درخواستیں دیں، لیکن ان سب کا بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

1956ء سے اب تک 19 سال ہو گئے ہیں، میرے سسرال والے مجھ سے نہیں مل سکتے، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اگر وہ مجھ سے ملے تو ان کا بھی وہی حشر ہو گا، جو میرا ہوا۔

قادیانی ظلم و ستم

1954-55ء میں لائل پور (فیصل آباد) کے مولوی غلام رسول جنڈیالوی کا لڑکا اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ ربوہ گیا۔ انھیں ریلوے سٹیشن پر خدام الاحمدیہ اور فرقان فورس کے ارکان نے پکڑ لیا۔ انھیں ''خدام'' نے جامع احمدیہ کے قریب اور پھر امور عامہ کے دفتر کے صحن میں سخت مارا پیٹا، یہاں تک کہ ان کی ہڈیاں ٹوٹ گئیں، جس کے نتیجے میں مولوی غلام رسول کا لڑکا موقع ہی پر مر گیا، لیکن پولیس نے اس واقعہ کو دوسرا رنگ دے دیا اور پولیس مقابلہ ظاہر کر کے مقدمہ درج کر لیا۔ ربوہ، تھانہ لالیاں کی حدود میں واقع ہے اور متعلقہ پولیس افسر احمدیہ گروہ سے باقاعدہ وظیفہ پاتے ہیں۔

ربوہ میں رہنے والے میرے رشتہ داروں نے بتایا کہ ایک سال قبل ایک وکیل سیر کے

لیے ربوہ گئے۔ ان کے ساتھ انتہائی بدسلوکی کی گئی، ان کے کپڑے تک پھاڑ دیے گئے، اس شک کی بنا پر کہ وہ جاسوس ہیں۔ مولوی عبدالمنان عمر، جو خلیفہ اوّل مولوی نورالدین کے بیٹے ہیں، کو بھی ربوہ سے نکالا گیا۔ پچھلے بیس سال میں، وہ صرف دو تین مرتبہ ربوہ جا سکے، اس لیے کہ وہ جب بھی ربوہ جاتے ہیں، ان کا پیچھا کیا جاتا ہے۔ مرزا بشیر الدین نے یہ اعلان کیا تھا کہ کوئی احمدی ان کے اور ان کی بیوی کی طرف نہ دیکھے۔ جب وہ اپنی والدہ کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کے لیے آئیں اور کوئی ان کو سرِ راہ مل جائے، تو تھوک کر اپنا چہرہ پھیر لے۔ عبدالمنان نے مجھے خود بتایا تھا کہ خدام الاحمدیہ نے ان کے اغوا کا پروگرام بنایا تھا، مگر بروقت پتہ چل جانے سے انھیں تو نکلنے کا موقع مل گیا، لیکن مرزا رشید احمد کو وہاں سے نکلتے ہوئے غلطی سے اغوا کر لیا گیا۔ انھیں امورِ عامہ کے دفتر لے جایا گیا اور پھر وہاں چھوڑ دیا گیا کیونکہ وہ مرزا غلام احمد قادیانی کا پوتا ہے۔

کچھ اختلافات کی بنا پر، دوسرے خلیفہ مرزا بشیر الدین نے مولوی عبدالکریم مباہلہ کے، قادیان میں واقع، گھر کو نذرِ آتش کرا دیا تھا اور اس کو قادیان سے نکلوا دیا تھا۔ یہ واقعہ میرے بچپن کے دنوں کا ہے۔ مولوی عبدالکریم مباہلہ پر حملے بھی کیے گئے۔ مولوی صاحب اور خلیفہ صاحب کے درمیان اختلافات، بعض ناگفتہ بہ حالات کی بنا پر، پیدا ہوئے تھے۔ مولوی عبدالحمید مباہلہ بھی احمدی تھے۔ چند سال بعد، ایک اور احمدی مسٹر فخر الدین ملتانی نے خلیفہ صاحب کے کردار کی بنا پر، ان پر بعض اعتراضات کیے تھے۔ انھوں نے کہا تھا کہ مرزا بشیر الدین خلافت چھوڑ دیں یا اپنی اصلاح کریں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مرزا بشیر الدین نے فخر الدین ملتانی کو مروا دیا۔ ایسے ہی حالات میں شیخ عبدالرحمٰن مصری کو قادیان سے نکال دیا گیا۔

خلیفہ صاحب کے علم میں لائے بغیر ربوہ میں کوئی واقعہ نہیں ہوسکتا۔ خلیفہ وقت کے حکم کو، احمدی ہر دوسرے حکم پر فوقیت دیتے ہیں، خواہ وہ حکم ملک میں کسی بھی مجاز اتھارٹی کی طرف سے دیا گیا ہو۔ اگر کسی کو ربوہ سے نکالنے کا حکم دیا جائے اور وہ اس کی تعمیل نہ کرے، تو اسے ربوہ شہر کی حدود سے باہر اٹھا کر پھینک دیا جاتا ہے اور اس کا مکمل سماجی بائیکاٹ کیا جاتا ہے۔ خلاف ورزی کرنے والے کا سائے کی طرح پیچھا کیا جاتا ہے۔ خدام الاحمدیہ کیطرف سے خلاف ورزی کرنے والے کو جسمانی سزا بھی دی جاتی ہے۔ ربوہ چھوڑنے تک ہی نہیں، بلکہ موت تک یہ سلوک کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی غیر احمدی ربوہ میں ان کے عقائد کے خلاف کوئی نعرہ وغیرہ لگائے، تو امورِ عامہ کو رپورٹ کیا جاتا ہے۔ امورِ عامہ والے کوئی کارروائی کرنے سے پہلے خلیفہ صاحب کی منظوری لیتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ بطور پالیسی، ربوہ والے، قوت کا استعمال اپنے مخالفین پر کرتے ہیں، اور اس پالیسی کی منظوری ہمیشہ

خلیفہ وقت کی طرف سے حاصل رہتی ہے۔ اس معاملے میں، احمدی یا غیر احمدی میں تمیز نہیں کی جاتی۔ تشدد کے بہت سے واقعات ربوہ میں ہوئے، لیکن وہ مخفی رکھے گئے۔ جن لوگوں کو خلیفہ سے اختلاف ہوتا ہے، انھیں جماعت سے نکال دیا جاتا ہے۔ ایسے اختلافات کچھ وقفہ کے بعد ہوتے رہتے ہیں۔ اب بھی ربوہ میں بہت سے ایسے لوگ موجود ہیں، جو تنظیم احمدیہ جماعت سے اختلاف رکھتے ہیں۔

جن لوگوں کو جماعت سے نکالا گیا، ان میں سے چند ایک کے نام درج ذیل ہیں:

راجہ منور احمد ایم پی اے کے بڑے بھائی راجہ بشیر احمد رازی، پروفیسر غلام رسول ایم۔ اے گورنمنٹ کالج شیخوپورہ، میاں عبدالسنان عمر مالک روزنامہ جمہور، عبدالوہاب عمر اور عبدالسلام عمر کو اپنے خاندانوں سمیت، عبدالرحمٰن خادم، مناظر ربوہ کے بھائی ملک عزیز الرحمٰن ایڈووکیٹ گجرات، پروفیسر فیض الرحمٰن فیضی، عطاء الرحمٰن، راحت ملک، چوہدری صلاح الدین خاں ناصر، جماعت کے تین مبلغین مرزا لطیف اکبر، مرزا سلیم اختر، مرزا شفیق انور (یہ تینوں بھائی ہیں)، محمد صادق شبنم گوجرانوالہ اور عبدالرب خان برہم لائل پور۔

قادیانی......اپنے عقائد کے آئینے میں

میں نے تمام احمدیہ لٹریچر پڑھا ہے۔ احمدیوں نے قرآنی آیات کی معنوی تحریف کی ہے اور تعبیر مختلف کی ہے۔ میں نے ایک احمدیہ مسجد کی تصویر دیکھی ہے، جو نائیجیریا میں بنائی گئی ہے۔ اس پر کلمہ اس طرح لکھا ہے۔

"لا اله الا الله احمد رسول الله" ایسا اس لیے کیا جا رہا ہے کہ احمدی کمیونٹی افریقہ میں مرزا غلام احمد کو ایک نبی کی حیثیت سے پیش کرتی ہے۔ پاکستان میں ان کا کلمہ وہی ہے، جو عام مسلمانوں کا ہے، لیکن نائیجیریا میں انھوں نے کلمہ تبدیل کیا ہے۔

عام مسلمانوں میں اس بات کا پراپیگنڈہ کیا جا رہا ہے کہ احمدی ربوہ اور قادیان کو مکہ اور مدینہ سے زیادہ متبرک سمجھتے ہیں۔ یہ بات بے بنیاد نہیں ہے، کیونکہ مرزا بشیر الدین نے کہا تھا کہ مکہ اور مدینہ کے چشمے خشک ہو گئے ہیں اور قادیان اور ربوہ کے چشمے پھوٹے ہیں۔ مرزا غلام احمد کے صحیح پیروکار مکہ اور مدینہ کو قادیان پر فوقیت دیتے ہیں۔

مرزا بشیر الدین محمود کا یہ بھی فتویٰ ہے کہ جو مرزا غلام احمد قادیانی کو نبی نہ مانے، خواہ ان کے بارے میں سنا بھی نہ ہو، وہ کافر اور خارج از اسلام ہے۔ اس فتویٰ پر تمام احمدی عمل کرتے ہیں۔ اسی لیے سر ظفر اللہ نے قائداعظمؒ کا جنازہ پڑھنے سے انکار کر دیا تھا۔

احمدیوں نے اپنا الگ کیلنڈر بنایا ہوا ہے، جس کے مہینوں کے نام اس طرح ہیں: نبوت،

اخفاء، تبلیغ، امان، ہجرت وغیرہ۔ یہ درست ہے کہ احمدی، غیر احمدی امام کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے، اس لیے وہ عام مسلمانوں کی مسجد میں نہیں جاتے۔ بیت اللہ میں بھی احمدی امام کعبہ کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے۔ میرا ایمان ہے کہ جو شخص نبی ہونے کا دعویٰ کرے، وہ خود بخود اسلام کے دائرہ سے خارج ہو جاتا ہے۔

مسٹر احمد نور ایک کابلی احمدی تھے۔ انھوں نے اپنے نبی ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ ایک اور آدمی خواجہ اسماعیل، جو زندہ ہیں اور لندن میں رہتے ہیں، انھوں نے بھی نبوت کا دعویٰ کیا۔ وہ بھی احمدی تھے۔ ان کے علاوہ بھی کئی احمدیوں نے نبی ہونے کے دعوے کیے، لیکن مجھے ان کے نام یاد نہیں۔

بیرون ممالک میں قادیانی مشن

عرب ممالک میں پہلے کچھ احمدیہ مشن قائم تھے، مگر جب عربوں کو ختم نبوت کے بارے میں احمدیوں کے عقیدے کا پتہ چلا، تو وہ مشن بند کرا دیے گئے۔ میرے علم کے مطابق انڈونیشیا اور ملائیشیا کے علاوہ، مشرق وسطیٰ کے تمام اسلامی ممالک میں احمدی مبلغوں کا داخلہ بند ہے۔ اس کی بڑی وجہ احمدیوں اور ان ممالک کے باشندوں کے درمیان ختم نبوت کے مسئلہ پر اختلاف ہے۔

احمدیوں کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ اسرائیل کے ایجنٹ ہیں۔ یہ تاثر، اس بنا پر، قائم کیا گیا ہے کہ اسرائیل میں احمدی مشن ہے۔ حیفہ (اسرائیل) میں قائم احمدی مشن جاسوسی کے مرکز کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ پاکستان سے جو احمدی، اسرائیل جاتے ہیں، وہ ڈبل پاسپورٹ رکھتے ہیں۔ وہ پہلے کسی افریقی ملک میں پاکستانی پاسپورٹ پر جاتے ہیں، وہاں سے کسی دوسرے ملک کے پاسپورٹ پر اسرائیل جاتے ہیں۔ دوسرے ملکوں کے پاسپورٹ وہ خفیہ رکھتے ہیں۔ بیرون ملک جانے والے مبلغوں کو تمام ضروری معلومات احمدیہ جماعت مہیا کرتی ہے۔ پاسپورٹ رکھنے کا طریقہ ایسے ممالک کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، جن کے ساتھ پاکستان کے سفارتی تعلقات نہ ہوں۔ حیفہ (اسرائیل) میں احمدی مشن ایک ماہوار پرچہ "البشریٰ" کے نام سے شائع کرتا ہے۔ اس کے ایڈیٹر مولوی ابوالعطاء اللہ دتہ، مولوی محمد شریف اور حافظ بشیر الدین عبیداللہ رہے ہیں۔ اسرائیل جانے والے مبلغوں کو صرف عربی زبان سے واقف ہونا چاہیے اور احمدی لٹریچر کا مطالعہ کیا ہونا چاہیے۔ جہاں تک مجھے علم ہے، آج تک کوئی اسرائیلی یہودی مشن کے ذریعے احمدی نہیں ہوا۔

قادیانیوں کی پاکستان دشمنی

تقسیم ملک کے وقت، مرزا بشیر الدین اکھنڈ بھارت کے حق میں تھے۔ انھوں نے اپنے

اس خیال کی تبلیغ کے لیے تمام ذرائع استعمال کیے۔ ان کا اکھنڈ بھارت کا حامی ہونا اس خیال پر مبنی تھا کہ اس طرح ہندوؤں اور سکھوں میں تبلیغ کے زیادہ مواقع ہوں گے اور دوسرے یہ کہ احمدی زیادہ محفوظ ہوں گے۔ مرزا بشیر الدین محمود خلیفہ نے یہ کہا تھا کہ خدام الاحمدیہ اسلام کی قوت ہے، اور یہ کہ احمدیہ جماعت بہت جلد برسراقتدار آنے والی ہے۔ اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد نوجوان احمدیوں کو سول اور ملٹری کی مختلف سروسز میں بھرتی کیا جاتا ہے۔ انجمن احمدیہ کی ہدایات کے تحت، اس پالیسی پر پاکستان کے معرض وجود میں آنے سے پہلے عمل کیا جاتا رہا اور آج بھی اس پر عمل ہو رہا ہے۔

1956ء میں افواج پاکستان میں پچاس سے سو تک احمدی کمشنڈ افسران تھے۔ بعض احمدی افسروں کو ریٹائرمنٹ کے بعد ربوہ کی انتظامیہ میں ملازم رکھ لیا جاتا ہے۔ بیعت میں شامل ہونے سے ہر احمدی اپنے آپ کو ایک Brotherhood کا فرد سمجھتا ہے، اس لیے، احمدی اس رشتے کی وجہ سے ایک دوسرے کی مدد کرنا ضروری سمجھتے ہیں، خواہ یہ مدد جائز یا ناجائز طریقے سے ممکن ہو۔

احمدیہ کمیونٹی پاکستان کا انتظام سنبھالنے کی امید لگائے بیٹھی ہے۔ وہ ایک دن فاتحانہ طور پر قادیان میں داخل ہونے کی امید بھی لگائے بیٹھے ہیں۔ میں نے یہ بات مرزا بشیر الدین، مرزا ناصر احمد اور دیگر قادیانی رہنماؤں کی تقریروں سے اخذ کی ہے۔ ایک دفعہ سول ڈیفنس آفیسر بہاولپور رانا محمد یوسف، جو احمدی ہیں، نے دوران گفتگو مجھے کہا تھا کہ یہ ملک صرف اسی صورت بچ سکتا ہے، جب اس کا سربراہ، نہ صرف سخت گیر ہو، بلکہ اس کا تعلق خدا سے ہو۔ اس پر میں نے تجویز کیا کہ پاکستان میں ایسا آدمی تو صرف مرزا ناصر احمد، موجودہ سربراہ احمدیہ کمیونٹی ہے، تو انھوں نے میری اس بات سے اتفاق کیا۔ اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے قادیانی جماعت ربوہ میں تیاریاں کر رہی ہے۔ کوئی غیر احمدی ربوہ میں رہائش نہیں رکھ سکتا، کیونکہ ربوہ کی کمیونٹی اپنی سرگرمیوں کو مخفی رکھنا چاہتی ہے۔

مرزا بشیر الدین محمود کی خواہش تھی کہ سیاسی غلبہ حاصل کیا جائے۔ آج کل کا ربوہ، انتظامی لحاظ سے، 1947ء سے قبل کے قادیان کا نمونہ ہے اور سیاسی برتری حاصل کرنے کے لیے، ربوہ کے لوگوں کے عزائم اسی طرح ہیں، جیسے قادیان کے لوگوں کے عزائم تھے۔ احمدیوں نے اقتدار میں شامل ہونے کے لیے پاکستان پیپلز پارٹی کا ساتھ دیا تھا۔

احمدی عام مسلمانوں کو دشمن کہتے ہیں۔ ربوہ شہر میں، کاروبار میں بھی، کوئی غیر احمدی نہیں ہے، اس لیے کہ ایک احمدی کو، کاروبار میں بھی، غیر احمدی پر ترجیح دی جاتی ہے۔

قادیانیوں نے، قیام پاکستان کے فوراً بعد، انجمن احمدیہ پاکستان کے نام سے ایک اور انجمن قائم کر لی اور سندھ میں واقع اصل انجمن کی تمام جائیداد قبضہ میں کر لی، کیونکہ ان دنوں کسٹوڈین

مسٹر عبداللہ خان تھے، جو احمدی ہیں اور سر ظفر اللہ خاں کے بھائی ہیں۔ پاکستان میں انجمن کی جائیداد، جو بھارت میں رہ گئی تھی، کے خلاف کوئی کلیم نہ دیا گیا کیونکہ خلیفہ صاحب کا یہی حکم تھا، البتہ، انھوں نے خود اپنی ذاتی جائیداد، جو بھارت میں چھوڑی تھی، اس کا کلیم دیا اور جائیداد حاصل کر لی۔ خلیفہ نے ہر احمدی کو یہ حکم دیا تھا کہ قادیان میں چھوڑی ہوئی ذاتی جائیداد کا کلیم داخل نہ کریں، کیونکہ ہم جلدی قادیان واپس چلے جائیں گے۔

فرقان فورس، جس کا میں ممبر تھا، 1948ء میں کشمیر کے محاذ نوشیرہ پر لڑی تھی، میں وہاں اس محاذ پر تین ماہ تک لڑا تھا۔ ایک دو سال بعد اس کو جنرل گریسی نے ختم کر دیا تھا۔ اس پر، اس فورس کو پاکستانی فوج نے جو اسلحہ دیا تھا، وہ پرسائل آفیسر ریلویز میں غلام محمد اختر کی زیر نگرانی ایک ریلوے ویگن میں ربوہ لایا گیا۔ اس اسلحہ کو محمود مسجد کے قریب زیر زمین دفن کر دیا گیا۔ ایک شخص ملک رفیق، جو میجر رفیق کہلاتا ہے، اس اسلحہ بارود کا انچارج تھا۔

حرفِ آخر

بعض حقائق پر سے عدیم کے باعث پردہ اٹھانے سے قاصر رہا ہوں۔ پھر اگر کوئی ایسا موقعہ پیدا ہوا تو انشاء اللہ العزیز لکھا جائے گا، ابھی بعض موضوع تشنہ رہ گئے ہیں جن کا اجمالاً ذکر کر دینا ضروری ہے، جو یہ ہیں:

-1 جماعت ربوہ کا نظام سراسر ایک سیاسی نظام ہے۔

-2 قادیانی خلیفہ کی جماعتوں کی عصمتوں اور امانتوں کے بارے میں رویہ۔

-3 قادیانی خلیفہ اور خاندان خلافت کی مالی بے راہ رویاں اور دھاندلیاں۔

-4 ربوہ میں ایک آمرانہ نظام اور اس کی چیرہ دستیاں۔

-5 صدر انجمن احمدیہ قادیان جو 1906ء میں بنائی گئی اور وہ اب تک قادیان میں کام کر رہی ہے اور وہ ایک ہندوستانی انجمن ہے۔ اس کی تمام جائیداد جو پاکستان میں ہے، اس پر خلیفہ صاحب کا یا انجمن احمدیہ پاکستان کا ناجائز قبضہ۔ صدر انجمن احمدیہ قادیان نے بھارت میں اپنی جائیداد اس بنیاد پر واگزار کروائی کہ اس انجمن نے ایک لحہ کے لیے بھی بھارت کو نہیں چھوڑا اور ادھر خلیفہ صاحب نے پاکستان میں اس انجمن کی تمام جائیداد پر اس بنیاد پر قبضہ کر لیا کہ وہ انجمن ہجرت کر کے پاکستان میں آ گئی ہے۔ سوچنے والوں کے لیے مقام حیرت اور جائے عبرت ہے کہ کیا یہی مومنانہ شان ہے، جس کا سبق تمام دنیا کو دیا جاتا ہے۔

6- انکم ٹیکس اور سیل ٹیکس میں حکومت وقت کے قانون کی خلاف ورزی۔

7- سٹہ کا کاروبار جو خود خلیفہ صاحب کرتے رہے اور سودی کاروبار۔

8- انجمن کی بعض جائیدادوں پر خلیفہ صاحب کا بلطائف الحیل قبضہ اور جماعت کی خاموشی۔

9- 1953ء میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کو عقائد میں مناسب تبدیلی کی پیشکش اور احمدی نام حذف کر دینے کی خواہش کا اعلان اور تبلیغی ادارہ کے نام میں تبدیلی اور مبلغین کی بجائے مربیان کی تاویل لفظی۔

10- بیماری کے ایک طویل عرصہ میں خلیفہ صاحب کی عبادات سے محرومی اور ان کے تمام ان ساتھیوں کا، جن پر انھیں زندگی بھر ناز رہا، ایک ایک کر کے اس دنیا سے رخصت ہو جانا اور ان کے دو چھوٹے بھائیوں کی وفات۔

11- خلیفہ صاحب نے جس قدر مبلغین یورپ، امریکہ اور افریقہ میں بھجوائے ہوئے تھے، ان میں سے ان لوگوں کا ستون سے علیحدہ ہو جانا، جن سے بہت بھاری توقعات وابستہ رکھی گئی تھیں اور جن کی اچھی خاصی تعداد ہے۔

12- بے شمار قادیانیوں کا خلیفہ صاحب کے ظلم و ستم کا نشانہ بننا اور جماعت اور مرکز سے علیحدگی اور مقاطعہ و بائیکاٹ کی صعوبتیں برداشت کرنا۔

ان موضوعات کے لیے ایک دفتر درکار ہے اور اس کے لیے وقت اور فرصت چاہیے، اس لیے اشارۃً ذکر کر دیا گیا ہے۔

ورق تمام ہوا اور ''مدح'' باقی ہے
سفینہ چاہیے اس ''بحر بیکراں'' کے لیے

شفیق مرزا

شہر سدوم

کسی شخص یا گروہ کی جنسی انارکی کے واقعات کا تذکرہ یا ان کی اشاعت عام طور پر ناپسندیدہ خیال کی جاتی ہے۔ ہمیں بھی اصولاً اس سے اتفاق ہے لیکن اس امر کی وضاحت ضروری سمجھتے ہیں کہ اگر کوئی شخص مذہب کا لبادہ اوڑھ کر خلق خدا کو گمراہ کرے اور ''تقدس'' کی آڑ میں مجبور مریدوں کی عصمتوں کے خون سے ہولی کھیلے، سینکڑوں گھروں کو ویران کر دے، انبیاء علیہم السلام اور دیگر مقدس افراد کے بارے میں ژاژ خائی کرے تو اسے محض اس بنا پر نظر انداز کر دینا کہ وہ ایک مذہبی دکان کا بااثر مالک ہے، قانوناً، شرعاً، اخلاقاً ہر لحاظ سے نادرست اور ناواجب ہے۔ قرآن مجید نے مظلوم کو نہایت واضح الفاظ میں ظالم کے خلاف آواز حق بلند کرنے کی اجازت دی ہے۔ بقولہ تعالیٰ **لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ** مرزا غلام احمد نے جس زبان میں گل افشانی کی ہے، کوئی بھی مہذب انسان اسے پسند نہیں کر سکتا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بطور خاص ان کا نشانہ بنے ہیں۔ گو دیگر انبیاء کرام اور صلحا امت میں سے بھی شاید ہی کوئی فرد ایسا ہوگا جو ان کی ''سلطان القلمی'' کی زد میں نہ آیا ہو۔ مسلمانوں کو ''کنجریوں کی اولاد'' قرار دینا، مولانا سعد اللہ لدھیانوی کو ''نحس'' اور ''نطفۃ السفہا'' کے نام خطاب کرنا، مناظرہ مد میں مسلمانوں کے شہرہ آفاق مناظر کو ''بھونکنے والا کتا'' کے الفاظ سے یاد کرنا اور اس نوع کی دیگر بے شمار دشنام طرازیاں ہر سعید فطرت کو سوچنے پر مجبور کر دیتی ہیں کہ وہ کون سی نفسیاتی الجھن ہے، جو نبوت کا دعویٰ کرنے والے اس شخص کو ایسے الفاظ استعمال کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔ مرزا غلام احمد کے بعد ان کے بیٹے مرزا محمود نے اپنے بلند بانگ دعاوی کی آڑ لے کر جن قبیح حرکات کا ارتکاب کیا...... ان کی طرف سب سے پہلی انگلی پیر سراج الحق نعمانی نے اٹھائی اور اس ''ابن صالح'' کے کرتوتوں کے بارے میں ایک رقعہ لکھ کر مرزا غلام احمد کی پگڑی میں رکھ دیا، گو پیر کا بیٹا ''مریدوں کی عدالت'' سے شبہ کا فائدہ حاصل کر کے بچ گیا، لیکن اس کے دل میں یہ بات پوری طرح جاگزیں ہوگئی کہ مریدوں کی تطہیر ذہنی ہی کافی نہیں، معاشی جبر کے ساتھ ساتھ ان پر ریاستی جبر کے ہتھکنڈے بھی استعمال کیے جائیں تاکہ وہ کبھی سچ بات کہنے کی جرأت نہ کر

سکیں۔ پیر سراج الحق نعمانی نے اظہار حق کا جو ''جرم'' کیا تھا، اس کی پاداش میں مرزا محمود نے ساری عمر اسے چین نہ لینے دیا اور ہر ممکن طریقہ سے اس پر تشدد کیا۔ اطمینان کامل کے بعد مرزا محمود پھر اپنے دھندے میں مصروف ہو گیا اور اس کی اہرمنی احتیاطوں کے باوجود ہر چند سال کے بعد اس پر بدکاری کے الزامات لگتے رہے۔ مباہلے کی دعوتیں دی جاتی رہیں، مگر وہاں ایک خامشی تھی، سب کے جواب میں۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا، بڑے بڑے مخلص مرید، واقف راز ہو کر ایک ہی نوعیت کے الزامات لگا کر علیحدہ ہوتے گئے اور انسانیت سوز بائیکاٹ کا شکار ہوتے رہے۔ حیران کن امر یہ ہے کہ تین تین یا پانچ پانچ سال بعد الزامات لگانے والے ایک دوسرے سے قطعاً نا آشنا ہیں مگر الزامات کی نوعیت ایک ہی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ مرزا محمود یا اس کے خاندان کے افراد نے کبھی بھی حلف موکد بعذاب اٹھا کر اپنے ''مصلح موعود'' کی پاکیزگی کی قسم نہیں کھائی۔ مرزا محمود کی سیرت کے تذکرہ میں ان کی ازواج اور بعض دیگر رشتہ داروں کا نام بھی آیا ہے۔ ہم ان کے نام حذف کر دیتے کیونکہ وہ ہمارے مخاطب نہیں لیکن اس خیال سے کہ ریکارڈ درست رہے، نیز اس بنا پر کہ وہ بھی اس بدکار اعظم کی شریک جرم ہیں، ہم نے ان کے نام بھی اسی طرح رہنے دیے ہیں۔ ہفت روزہ ''نصرت'' کراچی (14 مارچ 1979ء) سے متعلق ایک صحافی خاتون نے خلیفہ جی کی ایک سراپا مہر بیوی سے پوچھا کہ اتنی کمسنی میں آپ کی شادی مرزا محمود ایسے بوڑھے سے کیسے ہو گئی تو انھوں نے جواباً کہا جیسے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی شادی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہو گئی تھی۔ اس جواب سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس ظلمت کدے کا ہر فرد مقدسین امت پر کیچڑ اچھالنے کی مذموم سعی کس دیدہ دلیری سے کرتا ہے اور پھر ہمارے بعض اخبار نویس حضرات کس بے خبری سے اسے اچھالتے اور اجالتے ہیں۔ یاد رہے کہ یہ سراپا مہر بیوی وہ ہیں جن کے بارے میں ان کی خلوتوں کے ایک رازدار کا بیان عرصہ ہوا طبع ہو چکا ہے کہ ان کے موئے زہار موجود نہیں ہیں اور ان کی بے رحمی ایک ایسا امر ہے جس سے ہر باخبر قادیانی واقف ہے۔ ایک قادیانی مبلغ نے اپنی اہلیہ کے حوالے سے مولف کو حلفاً بتایا کہ ان صاحبہ نے خود اس پالتو مولوی کی بیوی کو بتایا کہ ''میں بے رحم ہوں۔'' میں ان کا نام بھی لکھ سکتا ہوں مگر اس خیال سے کہ کہیں اس کی گزارہ الاؤنس والی ملازمت ختم نہ ہو جائے، اس سے احتراز کرتا ہوں۔ یہ ایسی چیزیں ہیں جنھیں کسی بھی کلینک میں چیک کیا جا سکتا ہے۔ یہ ضیاع کس کشتی کی وجہ سے ہوا تھا، اس کا تحریر میں لانا مناسب نہیں، صرف ان سے اتنی گزارش ہے کہ وہ آئندہ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا کسی اور مقدس ہستی پر الزام تراشی سے باز رہیں۔ ورنہ ساری داستان کھول دی جائے گی اور پھوپھاجی کی کارکردگی الم نشرح ہو جائے گی۔

مرزا محمود احمد کے جنسی عدوان پر جن لوگوں نے موکد بعذاب قسمیں کھائی ہیں یا ان کی زندگی کے اس پہلو سے نقاب سرکائی ہے، ان کا تعلق مخالفین سے نہیں، ایسے مریدوں سے ہے جو قادیانیت کی خاطر سب کچھ تج کر گئے تھے۔ ان میں خود مرزا محمود کے نہایت قریبی عزیز، ہم زلف اور برادران نسبتی تک شامل ہیں اور بالواسطہ شہادتوں میں ان کے پسران اور دختران تک کے بیانات موجود ہیں، جن کی آج تک تردید نہیں ہوئی اور نہ ہی ان کے خلاف کوئی قانونی چارہ جوئی کی گئی ہے۔ اس کا سبب اشاعت فحش سے اجتناب وگریز نہیں، بلکہ یہ حقیقت ہے کہ واقعات کی تصدیق کے لیے اس قدر ثبوت، شہادتیں اور قرائن موجود ہیں، جن کا انکار ناممکن ہے۔

ان الزامات کی صحت وصداقت کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ ان مریدین میں سے جو لوگ انتہائی اخلاص کے ساتھ قادیانیت کو سچا سمجھتے تھے اور مرزا محمود کو خلیفہ برحق مانتے تھے، ان کی رنگین راتوں سے واقف ہو کر نہ صرف قادیانیت سے علیحدہ ہوئے بلکہ خدا کے وجود سے بھی منکر ہو گئے۔ ایک شخص کو پاکبازی کا مجسمہ مان کر اس کو کاروگر میں مشغول دیکھ کر جس قسم کا ردعمل ہو سکتا ہے، یہ اس کا لازمی نتیجہ ہے۔ ان میں سماعی یقین رکھنے والے لوگ ہی نہیں، عملی تجربہ سے گزرے ہوئے افراد بھی ہیں۔

دوسرا طبقہ مرزا محمود احمد کو تو جولیس سیزر کا ہم مشرب سمجھتا ہے مگر کسی نہ کسی رنگ میں قادیانی عقائد سے چمٹا ہوا ہے۔ آپ اسے ہر دو طبقہ کی عدم واقفیت یا جہالت کہیں، میرے نزدیک دونوں قسم کا ردعمل الزامات کی صحت پر برہان قاطع ہے۔ ماہرین جرمیات کا کہنا ہے کہ Perfect Crime وہ ہوتا ہے جو کبھی Trace نہ ہو سکے، مگر ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ آدم سے لے کر آج تک ایک بھی ایسا جرم سرزد نہیں ہوا جو اصطلاحاً پرفیکٹ کرائم کہلا سکے کیونکہ جرم ذہن کی Abnormal حالت میں ہوتا ہے، اس لیے کوئی نہ کوئی ایسی حرکت ضرور ہو جاتی ہے، کوئی ایسا Flaw ضرور رہ جاتا ہے، جس سے مجرم کی نشاندہی ہو جاتی ہے مثلاً ایک قاتل نعش کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے انھیں چار پانچ مقامات پر پھینک کر یہ خیال کرتا ہے کہ اس نے قتل کے نشانات تک کو مٹا دیا ہے، مگر عملاً وہ اتنے ہی مقامات پر اپنے جرم کے نشانات چھوڑ رہا ہوتا ہے۔ اس پس منظر میں اگر مرزا محمود کی تقاریر اور بیانات کا جائزہ لیں تو کئی شواہد، ان کے جرائم کی چغلی کھاتے ہیں۔ پیرس میں عریاں رقص دیکھنے کا تذکرہ خود انھوں نے اپنی زبان سے کیا ہے، ملاحظہ فرمائیں:

> ”جب میں ولایت گیا تو مجھے خصوصیت سے خیال تھا کہ یورپین سوسائٹی کا عیب والا حصہ بھی دیکھوں گا۔ قیام انگلستان کے دوران میں، مجھے اس کا

موقع نہ ملا۔ واپسی پر جب ہم فرانس آئے تو میں نے چودھری ظفر اللہ خاں صاحب سے، جو میرے ساتھ تھے، کہا کہ مجھے کوئی ایسی جگہ دکھائیں، جہاں یورپین سوسائٹی عریاں نظر آ سکے۔ وہ بھی فرانس سے واقف تو نہ تھے مگر مجھے ایک اوپیرا میں لے گئے، جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ چودھری صاحب نے بتایا یہ وہی سوسائٹی کی جگہ ہے، اسے دیکھ کر آپ اندازہ لگا سکتے ہیں۔ میری نظر چونکہ کمزور ہے، اس لیے دور کی چیز اچھی طرح سے نہیں دیکھ سکتا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے جو دیکھا تو ایسا معلوم ہوا کہ سینکڑوں عورتیں بیٹھی ہیں۔ میں نے چودھری صاحب سے کہا، کیا یہ ننگی ہیں۔ انھوں نے یہ بتایا کہ یہ ننگی نہیں بلکہ کپڑے پہنے ہوئے ہیں مگر باوجود اس کے ننگی معلوم ہوتی ہیں۔"

("الفضل" 28 جنوری 1924)

مکروفریب ایک ایسی چیز ہے کہ انسان زیادہ دیر تک اس پر پردہ ڈالنے میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ دانستہ یا نادانستہ ایسی باتیں زبان پر آ جاتی ہیں جن سے اصلیت سامنے آ جاتی ہے۔ خلیفہ جی نے اپنی ایک شادی کے موقع پر کہا، میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں خچر پر سوار ہوں اور اس کی تعبیر میں نے یہ کی ہے کہ اس بیوی سے اولاد نہیں ہوگی۔ اب واقعہ یہ ہے کہ اس بیوی سے کوئی اولاد نہیں اور خلیفہ جی کا یہ "خواب" اس پس منظر میں تھا کہ وہ خاتون جوہر نسائیت ہی سے محروم ہو چکی تھیں۔ اب مرید اسے بھی اپنے پیر کا کمال سمجھتے ہیں کہ اس کی پیش گوئی کس طرح پوری ہوئی، حالانکہ یہ معاملہ پیش خبری کا نہیں، پیش بینی بلکہ دروں بینی کا ہے۔

خلیفہ جی کے ایک صاحبزادے کی رنگت اور شکل و شباہت سے کچھ ایسا اظہر ہوتا ہے کہ ان کی صورت ایک ڈرائیور سے ملتی ہے، لوگوں میں چہ میگوئیاں شروع ہوئیں تو "کار خاص" کے نمائندوں نے خلیفہ جی کو اطلاع دی، اور انھوں نے انگریز عورتوں کے گھروں میں سیاہ فام بچے پیدا ہونے پر ایک خطبہ دے مارا، حالانکہ یہ کوئی ایسی بات نہ تھی کہ اس پر ایک طویل مثالوں سے مزین لیکچر دیا جاتا، مگر کہتے ہیں، چور کی داڑھی میں تنکا۔

ایسے ہی وہ اپنی ایک بیوی کی وفات پر پرانی یادوں کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"شادی سے پیشتر جب کہ مجھے گمان بھی نہ تھا کہ یہ لڑکی میری زوجیت میں آئے گی، ایک دن میں گھر میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ ایک لڑکی سفید لباس پہنے سمٹی سمٹائی، شرمائی لجائی دیوار کے ساتھ لگی کھڑی ہے......"

("سیرۃ ام طاہر" شائع کردہ مجلس خدام الاحمدیہ، ربوہ)

اب سفید لباس پر نظر پڑ سکتی ہے لیکن سمٹنے سمٹانے، شرمانے لجانے اور دیوار کے ساتھ کھڑے ہونے اور چہرے کی کیفیات کا تفصیلی معائنہ کسی نیک چلن انسان کا کام نہیں، ہمیں ''رائل فیملی'' کے کسی فرد کے بارے میں نیک چلنی کا حسن ظن نہیں کیونکہ اس ماحول میں معجزۃً بچ جانا بھی ممکن نظر نہیں آتا، مگر ہم ان کے بارے میں کف لسان ہی کو پسند کرتے ہیں چونکہ سربراہان قادیانیت عموماً اور مرزا محمود خصوصاً اس ڈرامے کے خصوصی کردار ہیں، اس لیے ان کے بہروپ کو نوچ پھینکنا اور لوگوں کو گمراہی کی دلدل سے نکالنا انتہائی ضروری ہے، ضمناً قادیان اور ربوہ کی اخلاقی حالت کا ذکر بھی آ گیا ہے، اگر درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے تو قادیانیت یقیناً شجرۂ خبیثہ ہے۔ لاہور کی سڑکوں پر گھومنے والی سلمیٰ جبشن اور لنک میکلوڈ روڈ پر مقیم حنیفاں اس کی شاہد ہیں۔ قادیانی امت اپنے ''نبی'' کی اتباع میں اپنے ہر مخالف کی بے روزگاری، مصیبت اور موت پر جشن مناتی ہے اور اسے مطلقاً اس امر کا احساس نہیں ہوتا کہ یہ انتہا درجہ کی قساوت قلبی، شقاوت ذہنی اور انسانیت سے گری ہوئی بات ہے...... اللہ تعالیٰ نے قادیانی امت پر ایسا عذاب نازل کیا ہے کہ اب ان کا ہر قابل ذکر فرد ایسی رسوا کن بیماری سے مرتا ہے کہ اس میں ہر صاحب بصیرت کے لیے سامان عبرت موجود ہے۔ فالج کی بیماری کو خود مرزا غلام احمد نے ''دکھ کی مار'' اور ''سخت بلا'' ایسے الفاظ سے یاد کیا ہے اور اب قادیانی امت کی گندی ذہنیت کی وجہ سے یہ بیماری اللہ تبارک وتعالیٰ نے سزا کے طور پر قادیانیوں کے لیے کچھ اس طرح مخصوص کر دی ہے کہ ایک واقف حال قادیانی کا کہنا ہے: ''اب تو حال یہ ہے کہ جو شخص فالج سے نہ مرے، وہ قادیانی ہی نہیں۔'' مرزا محمود احمد نے اپنے باوا کی سنت پر عمل کرتے ہوئے امت مسلمہ کے اکابر اور جید علماء دین کے وصال پر جشن مسرت منایا اور ان کا یہ دھندا اب تک چل رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قادیانیت کے گوسالہ سامری مرزا محمود کو ''فالج کا شکار'' بنا کر دس سال تک رہین بستر و بالش کر دیا اور اس عبرت ناک رنگ میں اس کو اعضا و جوارح اور حافظہ سے محروم کر دیا کہ وہ مجنونوں کی طرح سر ہلاتا رہتا تھا اور اس کی ٹانگیں بید لرزاں کا نظارہ پیش کرتی تھیں، گویا یہ ''لا یموت فیھا و لا یحیی'' کی تصویر تھا، مگر قادیانی مذہبی انڈسٹری کے مالکان اس حالت میں بھی الٹا ''اخبار'' اس کے ہاتھ میں پکڑا کر ''زیارت'' کے نام پر مریدوں سے پیسہ بٹورتے رہے اور پھر سات بجے شام مر جانے والے اس ''مصلح موعود'' کی دو بجے شب تک صفائی ہوتی رہی اور ''سرکاری اعلان'' میں اس کی موت کا وقت دو بج کر دس منٹ بتایا گیا اور اس عرصہ میں اس کی الجھی ہوئی داڑھی کو ہائیڈروجن یا کسی اور چیز سے رنگ کر اسے طلائی کلر دیا گیا اور خط بنایا گیا اور غازہ لگا کر اس کے چہرے پر ''نور'' وارد کیا گیا، تا کہ مریدوں پر اس کی ''اولیائی'' ثابت کی جا سکے۔ حیرت ہے کہ جب کوئی مسلمان

دنیاوی زندگی کے دن پورے کر کے اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہوتا ہے تو قادیانی اس کی بیماری کو ''عذاب الٰہی'' قرار دیتے ہیں لیکن ان کے اپنے اکابر ذلیل موت کا شکار بنتے ہیں تو یہ ''ابتلاء'' بن جاتا ہے اور اس کے لیے دلائل دیتے ہوئے قادیانی تمام وہ روایات پیش کرتے ہیں جن کو وہ خود بھی تسلیم نہیں کرتے۔ شاہ فیصلؒ کی شہادت پر قادیانی امت کا خوشی منانا ایک ایسا المناک واقعہ ہے جس پر جس قدر بھی نفرین کی جائے، کم ہے اور سابق وزیراعظم پاکستان کے پھانسی پانے پر ہفت روزہ ''لاہور'' کا یہ لکھنا کہ اس سے مرزا غلام احمد کی ایک پیشین گوئی پوری ہوئی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے عہد میں قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیا گیا تھا، مسخ شدہ قادیانی ذہنیت کی شہادت ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد جو جماعت یا فرقہ کسی شخص کو نبی تسلیم کرتا ہے، وہ قرآن وحدیث کی رو سے کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہے، اسے کوئی شخص بھی مسلمان قرار نہیں دے سکتا اور خدا کے فضل سے تمام امت مسلمہ اب بھی بالاتفاق قادیانیوں کو کافر ہی سمجھتی ہے اور آئندہ بھی ایسا ہی ہوگا۔

تقدیس کے بادہ خانے میں

1857ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد مسلمانوں پر انگریزوں کے مظالم کی داستان اس قدر مہیب اور خونچکاں ہے کہ اس کا تصور کرتے ہوئے بھی روح کپکپاتی اور سینہ بریاں ہوتا ہے۔ معاشی طور پر ملت اسلامیہ پہلے ہی پسی ہوئی تھی، سیاسی آزادی کی اس عظیم تحریک نے دم توڑا تو انگریز کی اہرمنی فراست اس نتیجہ پر پہنچی کہ جب تک مسلمانوں سے دینی روح، انقلابی شعور اور جذبہ جہاد کو محو کر کے انھیں چلتے پھرتے لاشے نہ بنا دیا جائے، اس وقت تک ہمارے سامراجی عزائم تشنہ تکمیل رہیں گے۔ جاگیردار طبقہ اپنے مفادات کی خاطر پہلے ہی فرنگی حکومت کی مدح وثنا میں مصروف تھا۔ ''علماء'' کا ایک گروہ بھی قرآن حکیم کی آیات کو من مانے معانی پہنا کر تاج برطانیہ کی حمایت کر کے اپنی چاندی کر رہا تھا مگر انگریز سرکار ان سارے انتظامات سے مطمئن نہ تھی، اس کے نزدیک مسلمانوں کا انقلابی شعور کسی وقت بھی سلطنت برطانیہ کے لیے خطرہ بن سکتا تھا، اس لیے اس نے مسلمانوں کی دینی غیرت، سیاسی بصیرت اور قومی روح پر ڈاکہ ڈالنے کے لیے ایک ایسے خاندان کا انتخاب کیا جو اپنی سفلگی وغداری میں کوئی ثانی نہ رکھتا تھا اور اس کا بڑے سے بڑا فرد بھی سرکار دربار میں کرسی مل جانے کو باعث افتخار سمجھتا تھا۔ اس مکروہ منصوبہ کو انجام تک پہنچانے اور مسلمانوں کی وحدت ملی کو پاش پاش کرنے کے لیے مرزا غلام احمد قادیانی کا انتخاب عمل میں لایا گیا، جس نے حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ختم نبوت کو داغ دار کرنے کے لیے (العیاذ باللہ) اپنی بے سروپا تاویلات سے امت مسلمہ میں اس قدر فکری انتشار برپا کیا کہ انگریز کو اپنے گھناؤنے مقاصد کے حصول کے لیے

برصغیر میں ایک ایسی جماعت میسر آ گئی جو ''الہامی بنیادوں'' پر غلامی کو آزادی پر ترجیح دیتی رہی اور آج انگریز کے چلے جانے کے بعد گو اس کی حیثیت متروکہ داشتہ کی سی رہ گئی ہے، مگر پھر بھی وہ اسرائیل سے تعلقات استوار کر کے، عربوں میں تنسیخ جہاد کا پرچار کر کے، انھیں یہود کی غلامی پر آمادہ کرنے کی مذموم جدوجہد میں مصروف ہو کر وہی فریضہ سرانجام دے رہی ہے جو اس کے آقایان ولی نعمت نے اس کے سپرد کیا تھا۔ حضرت سیدالانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے وحدت انسانیت کا جو انٹرنیشنل فکر، ختم نبوت کی شکل میں دیا تھا، قادیانی امت نے اس کی صریح خلاف ورزی کرتے ہوئے نئی نبوت کا ناٹک رچا کر وحدت ملت اسلامیہ ہی کو سبوتاژ کرنے کی سعی نامسعود شروع کر دی۔ دین سے تلعب کے نتیجے میں اس مسیحیت جدیدہ پر اللہ تعالیٰ کی ایسی پھٹکار نازل ہوئی کہ خود ''نبوت باطلہ کا گھرانہ'' عصمت وعفت کی تمیز سے عاری ہو کر اس طرح معصیت کا ملتہب دوزخ بنا، کہ قریب ترین مریدوں نے اسے ''فحش کا مرکز'' قرار دیا۔ گو یہ درست ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی پر واضح رنگ میں جنسی عصیان کا تو کوئی الزام نہ لگا مگر اس کو تسلیم کیے بغیر بھی کوئی چارہ نہیں کہ ان کی جنسی زندگی ناآسودگی کا شکار رہی۔ اگر محمدی بیگم کے پاجامے منگوا کر سونگھنے والی روایت کے ساتھ ساتھ، اس مظلوم خاتون کے بارہ میں آسمانی نکاح کے تمام ''الہامات'' بھی طاق نسیاں پر رکھ دیے جائیں اور بڑھاپے میں مولوی حکیم نورالدین کے نسخہ ''زوجام عشق'' کے سہارے پچاس مردوں کی قوت حاصل کر لینے کے دعاوی کے ساتھ ایک نوجوان لڑکی کو حبالہ عقد میں لانے اور پھر بوجوہ اس کی غیر معمولی فرمانبرداری کا تذکرہ نہ بھی کیا جائے تو بھی ان کی تحریرات میں ایسے شواہد بکثرت ملتے ہیں جو اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ ان کی عائلی زندگی خوشگوار نہ تھی اور معاشرتی سطح پر پہلی بیوی کا اپنے شوہر کے گھر میں محض ''پھجے دی ماں'' بن کر رہ جانا، بڑا دلدوز واقعہ ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اتنے بلند بانگ دعاوی کے باوجود مرزا صاحب جب بھی اپنے ناقدین کو جواب دینے پر آمادہ ہوئے، انھوں نے الزامی جوابات کی کمین گاہ پر بیٹھ کر درشت کلامی ہی پر اکتفا نہ کیا بلکہ اشارے کنائے میں ہی نہیں، اکثر اوقات واضح الفاظ میں ایسی باتیں کہہ گئے جو ان کے دعاوی کی مناسبت سے ہرگز ان کے شایان شان نہ تھیں، مثلاً ہندوؤں کے خدا کو ناف سے چھ انچ نیچے قرار دینا اور ماسٹر مرلی دھر کے محض یہ کہہ دینے پر کہ آپ تو لاچار اور قرض دار ہیں، انھیں یہ جواب دینا کہ ہمارے ہاں ہندو جاٹوں کا یہ طریق ہے کہ جب انھوں نے کسی کو اپنی دختر نیک اختر، نکاح میں دینی ہوتی ہے، تو وہ خفیہ طور پر جا کر اس کے کھاتہ، کھیون اور خسرہ نمبر کا پتہ کرتے ہیں مگر ہمارے تمھارے درمیان تو ایسا کوئی معاملہ نہیں۔ پنجابی میں یہ کہنے کے مترادف ہے کہ ''توں مینوں کڑی تے نہیں دینی'' ہم اس جواب کا

تجزیہ خود قادیانی حضرات پر چھوڑ دیتے ہیں۔

قادیانی خلافت کی نیلی فلموں میں مرزا محمود احمد ہمیشہ ہی ایک ایسا ہیرو رہا ہے، جس کے ساتھ کسی ولن نے ٹکر لینے کی جسارت نہیں کی۔ ان پر جنسی بے اعتدالی کا سب سے پہلا الزام 1905ء میں لگا اور ان کے والد مرزا غلام احمد نے اس کی تحقیقات کے لیے ایک چار رکنی کمیٹی مقرر کر دی، جس نے الزام ثابت ہو جانے کے باوجود چار گواہوں کا سہارا لے کر شبہ کا فائدہ دے کر ملزم کو بچایا۔ عبدالرب برہم خاں 335 اے پیپلز کالونی فیصل آباد کا حلفیہ بیان ہے کہ اس کمیٹی کے ایک رکن مولوی محمد علی لاہوری سے انھوں نے اس بارہ میں استفسار کیا تو مولوی صاحب نے بتایا کہ الزام تو ثابت ہو چکا تھا مگر ہم نے ملزم کو Benefit of Doubt دے کر چھوڑ دیا۔ 1914ء میں جب گدی نشینی کے لیے جنگ اقتدار چھڑی تو دہلی کی محلاتی سازشوں کے ماہرین نے ایک مذہبی جماعت کی سربراہی کے لیے بائیس سال کے ایک ایسے چھوکرے کو ''منتخب'' کر لیا، جس میں پیر کا بیٹا ہونے کے علاوہ کوئی خصوصیت موجود نہ تھی۔ ایسا برخود غلط اور کندہ ناتراش قسم کا آدمی عمر کے ہیجانی دور میں ایک ایسے منصب پر فائز ہوا جسے بظاہر ایک تقدس حاصل تھا۔ مرزا محمود نے تقدس کے اس کٹہرے کو اپنے لیے پناہ گاہ سمجھتے ہوئے جنسی عصیان کا وہ ہولناک ڈرامہ کھیلا کہ الامان والحفیظ۔

بلوغت سے لے کر مکمل طور پر مفلوج ہو جانے تک ہر چند سال کے وقفہ کے بعد القابات کی رداؤں میں ملفوف اس پیرزادے پر مسلسل بدکاری کے الزامات مخلص مریدوں کی طرف سے لگتے رہے، مباہلہ کی دعوتیں دی جاتی رہیں مگر ذہنی طور پر پورا ملحد و بے دین ہونے کے باوجود اس کو کبھی بھی جرأت نہ ہوئی کہ کسی مظلوم مرید کے دعوت مباہلہ پر میدان میں نکلے۔ جب بھی کسی ارادت مند نے واقف راز دروں ہو کر للکارا تو قادیانی گماشتوں اور معیشت کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ملاؤں نے ایک طرف اخبارات و جرائد میں ہاہاکار شروع کر دی اور دوسری طرف اس محرم راز کو بدترین سوشل بائیکاٹ کا نشانہ بنایا گیا اور اسے اقتصادی و معاشرتی الجھنوں میں مبتلا کرنے پر ہزاروں روپے خرچ کر کے جب کسی قدر کامیابی ہوئی تو اسے اپنے بدمعاش پیر کا ''معجزہ'' قرار دیا گیا۔

کوئی شخص اپنی والدہ پر الزام تراشی کی جرأت نہیں کرتا اور اگر خدانخواستہ وہ اس پر مجبور ہو جاتا ہے تو صرف یہ کہہ کر اس کو خاموش کرانے کی کوشش کرتا کہ دیکھو یہ بہت بری بات ہے، مناسب نہیں۔ اس امر کا جائزہ لینا بھی تو ضروری ہے کہ وہ کن المناک حالات سے دوچار ہوا کہ اسے اپنی، اتنی عزیز ہستی کی اصل حقیقت کو دنیا کے سامنے پیش کرنا پڑا۔ پیر کی جلوتیں اگر اس کی خلوتوں سے نالاں ہوں تو مریدوں کا اسی سانچے میں ڈھل جانا، ایک لازمی امر ہے۔ مرزا محمود احمد جب گدی

نشین ہوا تو اس نے اپنے باوا کی نبوت کو نعوذ باللہ.........ع

احمد ثانی نے رکھ لی احمد اوّل کی لاج

کے مقام پر پہنچایا۔ کبھی مسلمانوں کو اہل کتاب کے برابر قرار دیا اور کبھی انھیں ہندوؤں اور سکھوں سے مشابہت دے کر ان کے بچوں تک کے جنازوں کو حرام قرار دے دیا۔ قادیانیت کا غالب عنصر اس دور میں اس نچلے اور متوسط طبقے پر مشتمل تھا جو معاشی طور پر پسماندہ ہونے کی وجہ سے پیش گوئیوں کی فضا میں رہتے ہوئے چین محسوس کرتا تھا اور انگریز سے وفاداری کی قادیانی سند اس کی ملازمت کو محفوظ رکھتی تھی۔ جب نئ نبوت، تکفیر مسلمین اور ان کے جنازوں کا بائیکاٹ، انتہا کو پہنچا تو مذکورہ بالا دونوں طبقوں نے قادیان کی طرف بھاگنا شروع کر دیا کہ وہاں رہائش اختیار کریں کیونکہ جس معاشرہ کو ایک ''نبی'' کے انکار کی بنا پر کافر قرار دے کر وہ علیحدہ ہوئے تھے، وہاں رہنا اب ان کے لیے ناممکن تھا۔ قادیان میں مرزا محمود احمد نے اپنے خاندان کی مالی حالت کو بہتر بنانے کے لیے مریدوں کے چندے سے خریدی ہوئی زمین کچھ اپنے عزیزوں کے ذریعے نہایت مہنگے داموں فروخت کی اور کچھ صدر انجمن احمدیہ کی معرفت اپنے ماننے والوں کو گراں قیمت پر فروخت کی مگر رجسٹریشن ایکٹ کے ماتحت اس کا انتقال ان کے نام نہ کروایا گیا۔ اس طرح وہ اپنے معاشرہ سے کٹ کر قادیانیت کے دام میں اس طرح پھنسے کہ

نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن!

اپنی سوسائٹی سے علیحدہ ہو کر، اب ایک نئ جگہ پر نئے حالات کا لازمی تقاضا یہ تھا کہ وہ ہر جائز و ناجائز خوشامد کر کے پیر اور اس کے لواحقین کا قرب حاصل کرتے اور انھوں نے وقت اور حالات کے دباؤ کے ماتحت ایسا ہی کیا۔ مگر پیر نے مجبور مریدوں کی عزتوں پر ڈاکہ ڈال کر سینکڑوں عصمتوں کے آبگینے تار تار کر دیے اور اگر کوئی بے بس مرید بلبلا اٹھا تو اسے شہر سے نکال دینے اور مقاطعہ کر دینے کی دھمکیاں دے کر خاموش رہنے کی تلقین کی۔ فخر الدین ملتانی ایسے کئ لوگوں کو قتل کروا کر دہشت کی فضا پیدا کی گئی مگر اس تمام یزیدی اہتمام کے باوجود مرزا محمود، اپنی پاکبازی کا ڈھونگ رچانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ گاہے بگاہے اس دریا سے ایسی موج اٹھتی کہ ''ذریت مبشرہ'' کے بارے میں جملہ ''الہامات'' ''کشوف'' اور ''رؤیا'' دھرے کے دھرے رہ جاتے۔ یوں تو مرزا محمود کی زندگی کا شاید ہی کوئی دن ایسا ہو جو بدکاری کی غلاظت سے آلودہ نہ ہوا اور جس میں اس پر زناکاری کا الزام نہ لگا ہو، لیکن ذیل میں ہم ان الزامات و بیانات کا تذکرہ کرتے ہیں جن کی گونج اخبارات و رسائل ہی میں نہیں، ملک کی عدالتوں تک میں سنی گئی اور اس کے ساتھ بعض بالکل نئ روایات بھی

درج کرتے ہیں جو آج تک اشاعت پذیر نہیں ہو سکیں۔ قادیانی امت کی جنسی تاریخ پر اس سے پیشتر متعدد کتب آ چکی ہیں، لیکن وہ تقاضائے حالات کے ماتحت، جس رنگ میں پیش کی گئیں، اس کی بہت سی وجوہ تھیں۔ آئندہ سطور میں ہم کوشش کریں گے کہ ان روایات کو ذرا وضاحت سے پیش کریں اور اس سے پیشتر جو چیزیں اجمال سے بیان ہوئی ہیں، ان کی تفصیل کر دیں کیونکہ اگر اس وقت اس کام کو سرانجام نہ دیا گیا تو آنے والا مورخ، بہت سی معلومات سے محروم ہو جائے گا کیونکہ پرانے لوگوں میں سے جو لوگ صبح گئے یا شام گئے، کی منزل میں ہیں، وہ نہ ان سے مل سکے گا اور نہ ان دل دوز واقعات کو سن سکے گا جو خود ان پر یا ان کی اولاد پر گزرے ہیں۔ یہ سب شہادتیں موکد بعذاب قسموں کے ساتھ دی گئی ہیں اور یہ تمام افراد قادیانی امت کے خواص میں سے تھے۔ ان میں سے اکثر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے مشرف بہ اسلام ہو چکے ہیں مگر چند ایسے بھی ہیں جو اپنی برین واشنگ کی وجہ سے کسی نہ کسی رنگ میں قادیانیت سے وابستہ ہیں۔ مگر وہ قادیانی ''مصلح موعود'' کو پورے یقین، پورے وثوق اور پورے ایمان کے ساتھ جولیس سیزر کا مثیل، راسپوٹین کا بروز اور ہرموڈیس کا ظل کامل سمجھتے ہیں اور ہر عدالت میں اپنی گواہی ریکارڈ کرانے کے لیے تیار ہیں۔ ممکن ہے بعض لوگ یہ بھی خیال کریں کہ برائی کی اشاعت کا طریق مناسب نہیں، ان کی خدمت میں گزارش ہے کہ وہ اس امر کو مدنظر رکھیں کہ یہ اظہار ان مظلوموں کی طرف سے ہے، جن میں سے بعض کی اپنی عصمت کی ردا چاک ہوئی اور اظہار حق کی پاداش میں ان پر وہ مصائب ٹوٹے کہ اگر وہ دنوں پر وارد ہوتے تو راتیں بن جاتیں۔ یہ اظہار ان مظلوموں کی طرف سے ہے جنھیں خدا نے بھی یہ حق دے رکھا ہے۔

لایحب اللہ الجہر بالسوء من القول الا من ظلم

مباہلہ والوں کی للکار

مولوی عبدالکریم صاحب مرحوم اور میاں زاہد، حال امرتسر مارکیٹ برانڈرتھ روڈ لاہور کے نام کے ساتھ ''مباہلہ والے'' کا لفظ نتھی ہو کر رہ گیا ہے۔ ان مظلوموں نے 1927ء میں اپنی ایک ہمشیرہ سکینہ بیگم پر مرزا محمود کی دست درازی کے خلاف اس زور سے صدائے احتجاج بلند کی کہ بیت الخلافت میں مقیم مذہبی مہنتوں کی روحیں کپکپا اٹھیں۔ قادیانی غنڈوں نے ان کے مکان کو نذر آتش کر دیا اور جناب میاں زاہد کے اپنے بیان کے مطابق اگر مولانا حکیم نور الدین کی اہلیہ محترمہ ان کو بروقت خبردار نہ کر دیتیں تو وہ سب اسی رات قادیانیوں کے ہاتھوں جام شہادت نوش کر چکے ہوتے۔ انھوں نے مرزا محمود احمد کے ناقوس خصوصی ''الفضل'' کے کذب و افترا کا جواب دینے کے لیے ''مباہلہ'' نامی اخبار جاری کیا، جس کی پیشانی پر یہ شعر درج ہوتا تھا ۔

خونِ اسرائیل آ جاتا ہے آخر جوش میں
توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسمِ سامری

یہ مظلوم خاتون قادیانی فرقہ کے صوبائی امیر مرزا عبدالحق ایڈووکیٹ سرگودھا کی اہلیہ ہیں۔ وہ اپنے مشاہدہ اور تجربہ کی بنا پر اب بھی ربوہ کے پاپائے ثانی کو بدکردار سمجھتی ہیں۔ یہ سانحہ اس طرح ظہور میں آیا کہ وہ کسی کام کی خاطر ''قصرِ خلافت'' میں گئیں۔ مرزا محمود نے اپنی گھناؤنی فطرت کے مطابق ان کے ساتھ زیادتی کا ارتکاب کیا۔ انھوں نے واپس آ کر سارا معاملہ اپنے شوہر کے گوش گزار کر دیا۔ مرید خاوند نے اپنی زوجہ پر اعتماد کر کے پیر پر تین حرف بھیجنے کی بجائے اس معاملہ کی تحقیق کا ارادہ کیا اور پاپائے ثانی کے پاس پہنچا۔ پیر تو، رنگ ماسٹر تھا، اسے مریدوں کو نچانے کا فن خوب آتا تھا، اس نے بڑی ''معصومیت'' سے کہا: مجھے خود اس معاملہ کی سمجھ نہیں آ رہی، سکینہ بیگم بڑی نیک اور پاک باز لڑکی ہے۔ اس نے ایسی حرکت کیوں کی ہے۔ میں دعا کروں گا، آپ کل فلاں وقت تشریف لائیں۔ جب مرزا عبدالحق دوسرے دن پہنچے تو شاطر پیر اپنا عیارانہ منصوبہ مکمل کر چکا تھا۔ اس نے مرید کے لیے دام بچھاتے ہوئے کہا: میں نے اس معاملہ پر بہت غور کیا ہے، دعا بھی کی ہے۔ ایک بات سمجھ میں آئی ہے کہ چونکہ میں خلیفہ ہوں، ''مصلح موعود'' ہوں، اس لیے سکینہ بیگم ایک روحانی تعلق کی بنا پر مجھ سے محبت رکھتی ہے اور اس قسم کا جذبہ الفت جب پوری طرح قلب و ذہن پر مستولی ہو جاتا ہے تو اس وقت بعض عورتیں خواب کے عالم میں دیکھتی ہیں کہ انھوں نے فلاں مرد سے ایسا تعلق قائم کیا ہے اور اس خیال کا استیلاء و غلبہ ان پر اس قدر ہوتا ہے کہ وہ اس کو بیداری کا واقعہ سمجھ لیتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی مرزا محمود نے طب کی ایک کتاب نکال کر دکھا دی کہ دیکھ لو اطباء نے بھی اس مرض کا ذکر کیا ہے۔ اس پر مرید مطمئن ہو کر گھر واپس آیا تو اہلیہ کے استفسار کرنے پر مرید خاوند نے کہا: ''تم بھی سچ کہتی ہو اور حضرت صاحب بھی سچ کہتے ہیں۔''

''ایک احمدی خاتون کا بیان''

مذکورہ بالا عنوان کے تحت ایک مظلوم خاتون کا بیان اخبار ''مباہلہ'' قادیان میں اشاعت پذیر ہوا تھا، گو اس وقت یہ چیلنج بھی دے دیا گیا تھا کہ اگر ''خلیفہ صاحب'' مباہلہ کے لیے آمادہ ہوں تو نام کے اظہار میں کوئی ادنیٰ تامل بھی نہیں ہوگا۔ مگر چونکہ اس گوسالہ سامری کو مقابل پر نکلنے کی جرأت نہ ہوئی، اس لیے نام کا اظہار نہیں کیا گیا تھا۔ اب ہم ریکارڈ درست رکھنے کی خاطر یہ درج کر رہے ہیں کہ وہ خاتون قادیان کے دکاندار شیخ نورالدین صاحب کی صاحبزادی عائشہ تھیں۔ ان کے بھائی شیخ عبداللہ المعروف عبداللہ سوداگر آج کل ساہیوال میں مقیم ہیں۔ عائشہ بیگم تھوڑا عرصہ ہوا،

انتقال کر گئی ہیں، اب ہم وہ بیان درج کرتے ہیں۔

''میں میاں صاحب کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتی ہوں اور لوگوں میں ظاہر کر دینا چاہتی ہوں کہ وہ کیسی روحانیت رکھتے ہیں؟ میں اکثر اپنی سہیلیوں سے سنا کرتی تھی کہ وہ بڑے زانی شخص ہیں مگر اعتبار نہیں آتا تھا کیونکہ ان کی مومنانہ صورت اور نیچی شرمیلی آنکھیں ہرگز یہ اجازت نہ دیتی تھیں کہ ان پر ایسا الزام لگایا جا سکے۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ میرے والد صاحب نے، جو ہر کام کے لیے حضور سے اجازت حاصل کیا کرتے تھے اور بہت مخلص احمدی تھے، ایک رقعہ حضرت صاحب کو پہچانے کے لیے دیا، جس میں اپنے کام کے لیے اجازت مانگی تھی۔ خیر میں یہ رقعہ لے کر گئی۔ اس وقت میاں صاحب نئے مکان (قصر خلافت) میں مقیم تھے۔ میں نے اپنے ہمراہ ایک لڑکی لی جو وہاں تک میرے ساتھ گئی اور ساتھ ہی واپس آ گئی۔ چند دن بعد مجھے پھر ایک رقعہ لے کر جانا پڑا۔ اس وقت بھی وہی لڑکی میرے ہمراہ تھی۔ جونہی ہم دونوں میاں صاحب کی نشست گاہ میں پہنچیں تو اس لڑکی کو کسی نے پیچھے سے آواز دی۔ میں اکیلی رہ گئی۔ میں نے رقعہ پیش کیا اور جواب کے لیے عرض کیا، مگر انھوں نے فرمایا کہ میں تم کو جواب دے دوں گا، گھبراؤ مت۔ باہر ایک دو آدمی میرا انتظام کر رہے ہیں، ان سے مل آؤں۔ مجھے یہ کہہ کر، اس کمرے کے باہر کی طرف چلے گئے اور چند منٹ بعد پیچھے کے تمام کمروں کو قفل لگا کر اندر داخل ہوئے اور اس کا بھی باہر والا دروازہ بند کر دیا اور چٹخنیاں لگا دیں۔ جس کمرے میں بیٹھی تھی، وہ اندر کا چوتھا کمرہ تھا۔ میں یہ حالت دیکھ کر سخت گھبرائی اور طرح طرح کے خیال دل میں آنے لگے۔ آخر میاں صاحب نے مجھ سے چھیڑ چھاڑ شروع کی اور مجھ سے برا فعل کروانے کو کہا۔ میں نے انکار کیا۔ آخر زبردستی انھوں نے مجھے پلنگ پر گرا کر میری عزت برباد کر دی اور ان کے منہ سے اس قدر بو آ رہی تھی کہ مجھ کو چکر آ گیا اور وہ گفتگو بھی ایسی کرتے تھے کہ بازاری آدمی بھی ایسی نہیں کرتے۔ ممکن ہے جسے لوگ شراب کہتے ہیں، انھوں نے پی ہو کیونکہ ان کے ہوش وحواس بھی درست نہیں تھے۔ مجھ کو دھمکایا کہ اگر کسی سے ذکر کیا تو

تمہاری بدنامی ہوگی، مجھ پر کوئی شک بھی نہ کرے گا۔"

مستورات کی چھاتیوں پر خفیہ دستاویزات

"جب اس شاطر سیاست کے خفیہ اڈوں پر حکومت چھاپہ مارتی تھی تو یہ اسلحہ اور کاغذات کمال ہوشیاری سے زیرزمین دفن کر دیتا تھا۔ قادیان کی سرزمین میں فسادات کے موقع پر احمدی نوجوانوں اور سابق فوجیوں کے ہاتھوں جو ماڈرن اسلحہ مہیا کیا اوران کی فوجی گاڑیاں حرکت میں آئیں تو اس پر حکومت کی جانب سے یکدم چھاپہ پڑا، جس کی اطلاع قبل از وقت خلیفہ کو نہ ہو سکی کیونکہ وہاں احمدی سی۔ آئی۔ ڈی ناکام رہی لیکن خلیفہ کی اپنی اہرمنی فراست ان کے کام آئی کیونکہ جب پولیس سر پر آ گئی تو اس "مقدس پاکباز مسلم مصلح دوراں" نے اپنی مستورات کی چھاتیوں پر خفیہ دستاوزیات باندھ کر کوٹھی دارالسلام (قادیان) بھجوا دیں اور قادیانی فوجیوں نے فوراً اسلحہ زیر زمین کر دیا۔"

مخدرات میدان معصیت میں

"طویل مشاہدے کے بعد یقین ہوا اور پیر پرستی کے برگ حشیش کا اثر زائل ہوا لیکن سارا ماجرا بیان کرنے کی استعداد مفقود ہو گئی۔ چونکہ سیاہ کاریاں محیرالعقول تھیں، اس لیے ان کی نوعیت اس سیاہ کار کے لیے مدافعت بن گئی۔ کون مان سکتا کہ اس نے محرم اور غیرمحرم کی تمیز کو روند کر رکھ دیا تھا اور اس کے لیے وہ اپنی جہنمی محفل میں کہا کرتا تھا کہ

"آدم کی اولاد کی افزائش ہی اس طرح ہوئی ہے کہ کوئی مقدس سے مقدس رشتہ مجامعت میں حائل نہیں ہو سکتا۔" العیاذ باللہ۔

جیسا کہ اس تالیف میں ایک جگہ محمد یوسف ناز کا بیان نقل ہوا ہے، وہ اپنی مخدرات کو میدان معصیت میں پیش کرتا اور اس کے تربیت یافتگان ان سے حظ اندوز ہوتے اور خود اس روح فرسا منظر کا تماشا کر کے ابلیسی لذت محسوس کرتے۔"

خلوت سیہہ کے وقت کلام الٰہی کی توہین

"مبینہ طور پر خلوت سیہہ (خلوت صحیحہ ناقل) کے وقت قرآن کریم کو پاس

رکھنے والا بھی خدا کی گرفت سے بچ جائے تو اللہ تعالیٰ کے عظیم صبر بخشنے کے بعد ہی اس کی سیاہ کاریوں کے وسیع و عریض رقبے کو جاننے والا اپنے ایمان کی دولت کو محفوظ رکھ سکتا ہے...... جب یہ شخص اپنے باپ کو بھی نہیں بخشتا تو یہ کیا نہ کرتا ہوگا۔"

مولف "فتنہ انکار ختم نبوت" سے ان الفاظ کی وضاحت چاہی گئی تو انھوں نے کہا کہ

"مصلح الدین سعدی نے موکد بعذاب قسم کھا کر مجھے بتایا کہ ایک دن، میں مرزا محمود کی ہدایت پر ایک لڑکی کے ساتھ داد عیش دے رہا تھا کہ وہ آیا۔ اس نے لڑکی کے سرینوں کے نیچے سے قرآن پاک نکالا۔" (استغفر اللہ)

آخری فقرہ کے بارہ میں ان کا کہنا ہے کہ مولوی فضل دین صاحب نے انھیں بتایا کہ انھیں ان کے بڑے بھائی مولوی علی محمد صاحب اجمیری نے بتایا تھا کہ مرزا محمود اپنی محفل خاص میں کہا کرتا تھا کہ "حضرت مسیح موعود" بھی یہی کام کرتے تھے۔

تین سہیلیاں، تین کہانیاں

قادیان اور ربوہ میں بے شمار ایسی کہانیاں جنم لیتی ہیں جو مجبور مریدوں کی ارادت اور قادیانی گسٹاپو کے تشدد کے باعث ہمیشہ کے لیے دفن ہو جاتی ہیں اور اس ریاست اندر ریاست کو مذہب کے لبادے میں ہر شرمناک کارروائی کرنے کی کھلی چھٹی مل جاتی ہے اور حکومت کا قانون، عاجز اور بے بس ہی نہیں، لاوارث اور یتیم ہو جاتا ہے۔ انہی کہانیوں میں سے ایک کہانی غلام رسول پٹھان کی بیٹی کلثوم کی ہے، جس کی نعش تالاب میں پائی گئی۔ اسی لڑکی کلثوم کی سہیلی عابدہ بنت ابوالہاشم خاں بنگالی کو شکار کے بہانے باہر لے جایا گیا اور ترکی ضلع جہلم میں "اتفاقیہ" گولی کا نشانہ بنایا گیا۔ تیسری سہیلی امت الحفیظ صاحبہ بنت چوہدری غلام حسین صاحب ابھی بقید حیات ہیں۔ اگر وہ اپنی دو سہیلیوں کے "اتفاقیہ" قتل پر روشنی ڈال سکیں تو تاریخ میں ان کا نام سنہرے حروف سے لکھا جائے گا اور اس طرح مرزا محمود احمد کی "کرامات" میں بھی اضافہ ہو جائے گا۔

"مصلح موعود" کی کہانی حکیم عبدالوہاب کی زبانی

حکیم عبدالوہاب عمر قادیانی امت کے "خلیفہ اوّل" مولانا نورالدین کے صاحبزادے ہیں۔ ان کا بچپن اور جوانی "قصر خلافت" کے در و دیوار کے سائے میں گزرے ہیں اور اس آسیب کا سایہ جس پر بھی پڑا ہے، اس نے مشاہدہ پر اکتفا کم ہی کیا ہے، وہ حق الیقین کے تجربے سے گزرا ہے، یہی حال حکیم صاحب کا ہے اگرچہ اس مرتبہ میں متعدد دوسرے افراد بھی ان کے شریک ہیں، لیکن

انھیں یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ اپنی داستان بھی بغیر کسی لاگ لپیٹ کے کہہ سناتے ہیں اور اپنے اوپر قادیانیوں کے معروف طریق کے مطابق تقدس کی جعلی ردا نہیں اوڑھتے اور اگر اس اظہار حقیقت میں ان کا کوئی عزیز زد میں آ جائے تو وہ اسے بچانے کی بھی زیادہ جدوجہد نہیں کرتے، عموماً وہ اپنی آپ بیتی حکایت عن الغیر کے طور پر سناتے ہیں اور گو ان روایات کے مندرجات بتا دیتے ہیں کہ ان کا مرکزی کردار وہ خود ہی ہیں لیکن اگر کوئی پیچھے پڑ کر کریدنا ہی چاہے کہ یہ نوجوان کون تھا، تو وہ بتا دیتے ہیں کہ ''یہ میں ہی تھا۔'' انھوں نے بتایا:

1- ''1924ء میں مرزا محمود بغرض سیر و تفریح کشمیر تشریف لے گئے۔ دریائے جہلم میں پیراکی میں مصروف تھے کہ مرزا محمود نے غوطہ لگا کر ایک سولہ سالہ نوجوان کے منارۂ وجود کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے تو ان کے دواخانہ کے انچارج جناب اکرم بٹ نے پوچھا: آپ کو کیسے پتہ چلا؟ تو وہ بولے: یہ میں ہی تھا۔''

2- ''قصر خلافت'' قادیان کے گول کمرہ سے ملحق ایک اور کمرہ ہے۔ مرزا محمود احمد نے ایک نوجوان سے کہا: اندر ایک لڑکی ہے، جاؤ اس سے دل بہلاؤ۔ وہ اندر گیا اور اس کے سینے کے اہراموں سے کھیلنا چاہا۔ اس لڑکی نے مزاحمت کی اور وہ نوجوان بے نیل مرام واپس لوٹ آیا۔ مرزا محمود نے اس نوجوان کو کہا: تم بڑے وحشی ہو۔ جواباً کہا گیا کہ اگر جسم کے ان ابھاروں کو نہ چھیڑا جائے تو مزہ کیا خاک ہوگا۔ مرزا محمود نے کہا: لڑکی کی اس مدافعت کا سبب یہ ہے کہ وہ ڈرتی ہے کہ

''اس طرح کہیں اس نشیب و فراز کا تناسب نہ بدل جائے۔''

3- ''ایک دفعہ آپ کی بیگم مریم نے اس نوجوان کو خط لکھا کہ فلاں وقت مسجد مبارک (قادیان) کی چھت سے ملحقہ کمرہ کے پاس آ کر دروازہ کھٹکھٹانا تو میں تمھیں اندر بلا لوں گی۔ دروازہ کھلا تو اس نوجوان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب اس نے دیکھا کہ بیگم صاحبہ ریشم میں ملبوس سولہ سنگھار کیے موجود تھیں۔ اس نوجوان نے کبھی کوئی عورت نہ دیکھی تھی، چہ جائیکہ ایسی خوبصورت عورت۔ وہ مبہوت ہو گیا۔ اس نوجوان نے کہا کہ حضور اجازت ہے۔ انھوں نے جواب دیا: ایسی باتیں پوچھ کر کی جاتی ہیں۔ اس وقت

نوجوان نے کچھ نہ کہا کیونکہ اس کے جذبات مشتعل ہو چکے تھے۔ اس نے سوچا کہ ''گرو جی کچھرے ہی میں نہال ہو جائیں گے'' اس لیے اس وقت کنارہ کرنا ہی بہتر ہے۔ بیگم صاحبہ موصوفہ نے اس خط کی واپسی کا مطالبہ کیا جو اس نوجوان کو لکھا تھا۔ اس نوجوان نے جواب دیا کہ میں نے اس کو تلف کر دیا ہے۔ تقسیم ملک کے بعد مرزا محمود احمد کے پرائیویٹ سیکرٹری میاں محمد یوسف صاحب اس نوجوان کے پاس آئے، کہا: میں نے سنا ہے کہ آپ کے پاس حضور کی بیویوں کے خطوط ہیں اور آپ اس کو چھاپنا چاہتے ہیں اس نوجوان نے جواب دیا: بہت افسوس ہے کہ آپ کو اپنی بیوی پر اعتماد ہوگا اور مجھے بھی اپنی بیوی پر اعتماد ہے، اگر کسی پر اعتماد نہیں تو وہ حضور کی بیویاں ہیں۔''

4- ''مرزا محمود احمد نے اپنی ایک صاحبزادی کو رشد و بلوغت تک پہنچنے سے پیشتر ہی اپنی ہوس رانی کا نشانہ بنا ڈالا۔ وہ بے چاری بے ہوش ہوگئی، جس پر اس کی ماں نے کہا: اتنی جلدی کیا تھی، ایک دو سال ٹھہر جاتے۔ یہ کہیں بھاگی جا رہی تھی یا تمھارے پاس کوئی اور عورت نہ تھی۔''

دواخانہ نور الدین کے انچارج جناب اکرم بٹ کا کہنا ہے کہ میں نے حکیم صاحب سے پوچھا: یہ صاحبزادی کون تھی؟ تو انھوں نے بتایا: ''امتہ الرشید۔''

نوٹ: اس روایت کی مزید وضاحت کے لیے صالح نور کا بیان غور سے پڑھیں، جو اسی کتاب میں درج کیا جا رہا ہے۔ ملک عزیز الرحمٰن صاحب بحوالہ ڈاکٹر نذیر ریاض اور یوسف ناز بیان کرتے ہیں کہ جنسی بے راہروی کے ان مظاہر پر جب مرزا محمود سے پوچھا جاتا کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں تو وہ کہتا: لوگ بڑے احمق ہیں، ایک باغ اگاتے ہیں، اس کی آبیاری کرتے ہیں۔ جب وہ پروان چڑھتا ہے اور اسے پھل لگتے ہیں تو کہتے ہیں:

''اسے دوسرا ہی توڑے اور دوسرا ہی کھائے۔''

ربوہ کی معاشی نبوت کا عظیم فراڈ

حکومت کے خلوت خانہ خیال کی نذر

1- صدر انجمن احمدیہ قادیان ایک رجسٹرڈ باڈی ہے۔ تقسیم ملک سے قبل اس انجمن کی جائیداد

ملک کے مختلف حصوں میں بھی تقسیم کے بعد ناصر آباد، محمود آباد، شریف آباد، کریم نگر فارم، تھر پارکر سندھ کی زمینیں پاکستان میں آ گئیں تو مرزا محمود نے ربوہ میں ایک ڈمی انجمن ''ظلی صدر انجمن احمدیہ'' قائم کی اور چوہدری عبداللہ خاں برادر چوہدری ظفر اللہ خاں ایسے قادیانیوں کے ذریعے یہ زمین اپنے صاحبزادوں اور انجمن کے نام منتقل کرا لی اور مقصد پورا ہو جانے کے بعد یہ ظلی صدر انجمن، مرزا غلام احمد کی ظلی نبوت کی طرح ''اصلی'' بن گئی اور صدر انجمن احمدیہ قادیان نے وہاں کی تمام جائیداد بھارتی حکومت سے واگزار کروا لی اور اسی مقصد کے حصول کے لیے موجودہ خلیفہ مرزا ناصر احمد کے ایک بھائی مرزا وسیم احمد کو وہاں ٹھہرایا گیا، جو آج بھی وہیں مقیم ہے۔

-2 جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے، قادیان میں سکنی زمین، صدر انجمن احمدیہ لوگوں کو فروخت کرتی تھی مگر وہ خریداروں کے نام رجسٹریشن ایکٹ کے ماتحت رجسٹر نہیں کروائی جاتی تھی، جیسا کہ ربوہ میں ہوتا ہے۔ اس طرح سرکاری کاغذات میں زمین اصل مالکان کے نام ہی رہتی ہے، حالانکہ وہ اسے فروخت کر کے لاکھوں روپیہ ہضم کر چکے ہوتے ہیں۔ اس عیاری پر پردہ ڈالنے کے لیے خلیفہ ربوہ نے مہاجرین قادیان کو چکمہ دے کر کہ قادیان ''خدا کے رسول کا تخت گاہ'' ہے (نعوذ باللہ) اور انھیں اس بستی میں واپس جانا ہے، انھیں قادیان کے مکانوں کا کلیم داخل کرنے سے منع کر دیا اور خود چار کروڑ روپے کا بوگس کلیم داخل کر دیا۔ اب اگر مرید بھی کلیم داخل کر دیتے تو حکومت اور مریدوں سے دہرے فراڈ کی قلعی کھل سکتی تھی، اس لیے مریدوں کو کلیم داخل کرنے سے منع کر دیا گیا مگر بہت سے شاطر مرید اس عیاری کو سمجھ گئے اور انھوں نے خود بھی بے پناہ بوگس کلیم داخل کیے اور پھر قادیانی اثر و رسوخ سے منظور کروائے۔

اگر حکومت صرف قادیانیوں کی پاکستان میں جعلی اور بوگس الاٹمنٹوں کی تحقیقات کروائے تو کروڑوں روپے کے فراڈ کا پتہ لگ سکتا ہے اور مولف کتاب ہذا بعض جعلی کلیموں کے نمبر تک حکومت کو مہیا کرنے کا پابند ہے۔

-3 ربوہ کی زمین صدر انجمن احمدیہ کو کراؤن لینڈ ایکٹ کے تحت علامتی قیمت پر دی گئی تھی۔ مرزا محمود نے یہاں بھی قادیان والا کھیل دوبارہ کھیلا اور ٹوکن پرائس پر حاصل کردہ اس زمین کو ہزاروں روپیہ مرلہ کے حساب سے مریدوں کے نام فروخت کیا مگر رجسٹریشن ایکٹ کے ماتحت سب لیز ہولڈرز کے نام زمین منتقل نہ ہونے دی، اس طرح مریدوں کا

لاکھوں روپیہ بھی جیب میں ڈالا اور گورنمنٹ کے لاکھوں روپیہ کے ٹیکس بھی ہضم کیے گئے، مریدوں پر الٹا رعب بھی قائم رہا کہ وہ زمین خریدنے کے باوجود مالکانہ حقوق سے محروم رہے اور یہی وجہ ہے کہ جب بھی کسی نے ''خاندان نبوت'' کی عیاشیوں اور بدمعاشیوں کے متعلق آواز بلند کی، اسے اپنی ''ریاست'' سے باہر نکال دیا اور قبائلی نظام کے مطابق اس کا سوشل بائیکاٹ کر دیا۔ اب جو مرید ایک ''نبی'' کے انکار کی وجہ سے ساری ملت اسلامیہ کو کافر قرار دے کر علیحدہ ہوئے ہیں، وہ اپنی مخصوص Conditioning اور لایعنی علم الکلام کی وجہ سے واپس امت مسلمہ کے سمندر میں تو نہیں آ سکتے، وہ اسی گندے اور متعفن جوہڑ میں رہنے پر مجبور ہیں، اس لیے ایسے مریدوں سے سچائی کی توقع عبث ہے۔

-4 (i) ربوہ کو کھلا شہر قرار دینے کے سلسلہ میں سب سے پہلا اور اہم قدم یہ ہے کہ ربوہ کی لیز فوراً ختم کی جائے۔

(ii) ربوہ کو چنیوٹ کے ساتھ شامل کر کے سرکاری دفاتر ربوہ کے اندر منتقل کیے جائیں اور اندرون شہر خالی پڑی ہوئی زمین پر فوراً سرکاری عمارات تعمیر کی جائیں۔ ربوہ میں چند کارخانے قائم کیے جائیں اور اردگرد کے لوگوں کو وہاں معاش کی سہولتیں مہیا کی جائیں تاکہ قادیانی یلغار اور لالچ کا ہدف نہ بن سکیں۔

-5 ربوہ کے تمام تعلیمی اداروں سے قادیانی اساتذہ کو فوراً تبدیل کر دیا جائے تاکہ وہ مسلمان طلبہ کو کفر کی تعلیم دینے کی ناپاک جسارت نہ کر سکیں۔

-6 ربوہ میں بڑا تھانہ قائم کیا جائے اور اس کی عمارت گول بازار کے سامنے ٹیلی فون ایکسچینج کے ساتھ تعمیر کی جائے۔

-7 خدام الاحمدیہ اور دوسری نیم عسکری تنظیموں کو توڑ دیا جائے اور نظارت امور عامہ (شعبہ احتساب) کو ختم کر کے ربوہ کا نام تبدیل کر کے چک ڈھگیاں اس کا پہلا نام رکھ دیا جائے تاکہ قادیانی اپنی دجالیت نہ پھیلا سکیں۔ اگر مندرجہ بالا امور پر عمل نہ کیا گیا تو ربوہ کبھی کھلا شہر نہ بن سکے گا۔ وہاں قادیان سے بدتر غنڈہ گردی ہو رہی ہے اور ہوتی رہے گی کیونکہ قادیان میں تو پھر کچھ آبادی ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کی تھی مگر یہاں تو انگریز کی معنوی ذریت کے علاوہ اور کوئی ہے ہی نہیں۔

-8 قادیانی ڈاکٹروں، مسلح افواج میں قادیانی افسروں اور سرکاری محکموں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز قادیانیوں کے سالانہ اجلاس، ربوہ کے سالانہ میلے پر منعقد ہوتے ہیں، جہاں خلیفہ کو

حکومت کے راز منتقل ہوتے ہیں اور ملک کی معیشت پر قادیانی گرفت کو مضبوط کرنے کے پروگرام بنتے ہیں، اس لیے تمام اعلیٰ عہدوں پر فائز قادیانیوں کی چھٹی ضروری ہے تاکہ وہ اپنی اسلام دشمن اور ملک دشمن ذہنی ساخت کے باعث ملک وقوم کو مزید نقصان نہ پہنچائیں۔

جناب صلاح الدین ناصر کا ازالہ اوہام

جناب صلاح الدین ناصر ایک نہایت معزز فیملی سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کے والد خان بہادر ابوالہاشم بنگال میں ڈپٹی ڈائریکٹر مدارس تھے۔ ناصر صاحب پارٹیشن کے بعد پاکستان آ گئے۔ کچھ دیر ربوہ میں بھی مقیم رہے، لیکن جب ان کو خلیفہ جی کی عدیم المثال، جنسی بے راہ روی کا یقینی علم حاصل ہو گیا تو وہ رات کی تاریکی میں والدہ اور ہمشیرگان کو ساتھ لے کر لاہور آ گئے، وہ مرزا محمود کی ننگ انسانیت حرکتوں کو بیان کرتے ہوئے کبھی مداہنت سے کام نہیں لیتے، جب ان کی قادیانیت سے علیحدگی کے بارہ میں دریافت کیا گیا تو کہنے لگے:

> ''بھئی ہماری قادیانیت سے علیحدگی، لائبریری کے کسی اختلاف کا نتیجہ نہیں، ہم نے تو لیبارٹری میں ٹیسٹ کر کے دیکھا ہے کہ اس مذہبی انڈسٹری میں دین نام کی کوئی چیز نہیں۔ ہوس اور بوالہوس دو لفظوں کو اکٹھا کر دیں تو قادیانیت وجود میں آ جاتی ہے۔''

اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے تو میں نے کہا، جناب اس اجمال سے تو کام نہ چلے گا، کچھ بتائیں شاید کسی قادیانی کو ہدایت نصیب ہو جائے تو فرمانے لگے:

> ''یوں تو مرزا محمود یعنی ''مودے'' کی بے راہروی کے واقعات طفولیت ہی سے میرے کانوں میں پڑنا شروع ہو گئے تھے اور ہماری ہمشیرہ عابدہ بیگم کا ڈرامائی قتل بھی ان مذہبی سمگلروں کی بدفطرتی اور بدمعاشی کو Expose کرنے کے لیے کافی تھا، مگر ہم حالات کی آہنی گرفت میں اس طرح پھنس چکے تھے کہ ان زنجیروں کو توڑنے کے لیے کسی بہت بڑے دھکے کی ضرورت تھی اور جب دھکا بھی لگ گیا تو پھر عقیدت کے طوق وسلاسل اس طرح ٹوٹتے چلے گئے کہ خود مجھے ان کی کمزوری پر حیرت ہوتی تھی۔''

میں نے ہمت کر کے پوچھ لیا، جناب وہ دھکا تھا کیا؟ یہ سن کر ان کی آنکھوں میں نمی سی آ گئی۔ ماضی کے کسی دل دوز واقعہ نے انھیں چرکے لگانے شروع کر دیے تھے۔ چند سیکنڈ کے بعد کہنے لگے:

"تقسیم برصغیر کے بعد ہم رتن باغ لاہور میں مقیم تھے۔ جمعہ پڑھنے کے لیے گئے تو مرزا محمود نے اعلان کیا کہ جمعہ کے بعد صلاح الدین ناصر مجھے ضرور ملیں۔ جمعہ ختم ہوا تو لوگ مجھے مبارکباد دینے لگے کہ "حضرت صاحب نے تمھیں یاد فرمایا ہے۔" میں نے خیال کیا شاید کوئی کام ہوگا، اس لیے میں جلد ہی اس کمرہ کی طرف گیا، جہاں اس دور کا شیطان مجسم مقیم تھا۔ میں کمرہ میں داخل ہوا تو میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ مرزا محمود پر شیطنت سوار تھی، اس نے مجھے اپنی "ہومیوپیتھی" کا معمول بنانا چاہا۔ میں نے بڑھ کر اس کی داڑھی پکڑ لی اور گالی دے کر کہا: "اگر مجھے یہی کام کرنا ہے تو اپنے کسی ہم عمر سے کرلوں گا، تمھیں شرم نہیں آتی، اگر جماعت کو پتہ لگ گیا تو تم کیا کرو گے۔" میری یہ بات سن کر مرزا محمود نے بازاری آدمیوں کی طرح قہقہہ لگایا اور کہا: "داڑھی منڈوا کر پیرس چلا جاؤں گا۔"

یہ دن میرے لیے قادیانیت سے ذہنی وابستگی رکھنے کا آخری دن تھا۔"

جناب صلاح الدین ناصر "حقیقت پسند پارٹی" کے پہلے جنرل سیکرٹری رہے ہیں۔ اس دور میں ملک کے گوشے گوشے میں تقاریر کر کے انھوں نے قادیانیت کی حقیقت کو خوب واشگاف کیا۔ اسی زمانہ کا ایک واقعہ سناتے ہوئے کہنے لگے:

"گجرات کے ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے میں نے مرزا محمود کے متعلق کہا کہ اس کی اخلاقی حالت سخت ناگفتہ بہ ہے۔ اس پر ایک قادیانی اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا: اس کی وضاحت کریں۔ میں نے کہا: یہ الفاظ بہت واضح ہیں۔ وہ پھر بولا: کیا اس نے تمہاری شلوار اتاری تھی۔ میں نے جواب دیا: اسی بات کو بیان کرنے سے میں جھجک رہا تھا۔ آپ اپنے خلیفہ کے مزاج شناس ہیں، آپ نے خوب پہچانا ہے، یہی بات تھی۔

جلسہ کے تمام سامعین کھلکھلا کر ہنس پڑے اور وہ صاحب آہستہ سے کھسک گئے۔"

میں کہاں آ نکلا

جناب محمد صدیق ثاقب زیروی قادیانی امت کے خوش گلو شاعر ہیں۔ اگر وہ اپنی شاعری کو مرزا غلام احمد کے خاندان کی قصیدہ خوانی کے لیے وقف کر کے تباہ نہ کرتے تو ملک کے اچھے شعراء میں شمار ہوتے۔ سچ کہنے کی پاداش میں وہ ربوائی ریاست کے زیرِ عتاب رہ چکے ہیں مگر اب چونکہ

انھوں نے خوف فساد کی وجہ سے قادیانی امت کے سیاسی و معاشی مفادات کے لیے اپنے آپ کو رہن کر رکھا ہے اور ہفت روزہ ''لاہور'' قادیانی امت کا سیاسی آرگن بن گیا ہے، اس لیے اب ربوہ میں ان کی بڑی آؤ بھگت اور خاطر مدارات ہوتی ہے اور ہر طرف سے انھیں ''بشریٰ لکم'' کی نوید ملتی ہے۔ عرصہ ہوا انھوں نے ایک نظم اپنے ''خلیفہ صاحب'' کے بارہ میں لکھی تھی، مگر اشاعت کے مرحلہ پر اس پر یہ نوٹ لکھ دیا گیا۔

''ایک پیر خانقاہ کی لادینی سرگرمیوں سے متاثر ہو کر''

قارئین غور فرمائیں کہ ''پیر خانقاہ'' اور ربوہ کے مذہبی قبرستان کے احوال میں کیسی مماثلت و مشابہت ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ اسی کی تصویر ہے۔

شورش زہد بپا ہے میں کہاں آ نکلا
ہر طرف مکر و ریا ہے میں کہاں آ نکلا

نہ محبت میں حلاوت نہ عداوت میں خلوص
نہ تو ظلمت نہ ضیا ہے میں کہاں آ نکلا

چشم خود بیں میں نہاں حرص زرد گوہر کی
کذب کے لب پہ دعا ہے میں کہاں آ نکلا

راستی لحظہ بہ لحظہ ہے رواں سوئے دروغ
صدق پابند جفا ہے میں کہاں آ نکلا

دن دہاڑے ہی دکانوں پہ خدا بکتا ہے
نہ حجاب اور حیا ہے میں کہاں آ نکلا

یاں لیا جاتا ہے بالجبر عقیدت کا خراج
کیسی بے درد فضا ہے میں کہاں آ نکلا

خندہ زن ہے سفلگی اس کی ہر اک سلوٹ میں
یہ جو سرسبز قبا ہے میں کہاں آ نکلا

دلنوازی کے پھریروں کی ہواؤں کے تلے
جانے کیا رینگ رہا ہے میں کہاں آ نکلا

عجز سے کھلتی سمٹتی ہوئی باچھوں پہ نہ جا
ان کے سینوں میں دغا ہے میں کہاں آ نکلا

یہ ہے مجبور مریدوں کی ارادت کا خمار
یہ جو آنکھوں میں جلا میں کہاں آ نکلا
قلب مومن پہ سیاہی کی تہیں اتنی دبیز
ناطقہ سہم گیا ہے میں کہاں آ نکلا
الغرض یہ وہ تماشا ہے جہاں خوف خدا
چوکڑی بھول گیا ہے میں کہاں آ نکلا

مولوی عبدالستار نیازی اور دیوان سنگھ مفتون

مولانا عبدالستار صاحب نیازی کی شخصیت محتاج تعارف نہیں، بلکہ خود تعارف ان کا محتاج ہے۔ مذہبی و دینی علوم کے علاوہ سیاسی نشیب وفراز پر جس طرح وہ نظر رکھتے ہیں اور جس جرأت اور بے باکی سے باطل کو للکارتے ہیں، یہ انہی کا حصّہ ہے۔ مولانا موصوف نے مولف اور امیر الدین صاحب سیمنٹ بلڈنگ تھارنٹن روڈ لاہور کے سامنے بیان کیا کہ

> ''ایوب حکومت میں جب دیوان سنگھ مفتون پاکستان آئے تو مجھے ملنے کے لیے بھی تشریف لائے۔ دوران گفتگو انھوں نے بڑی حیرانگی سے کہا: میں عرصہ دراز کے بعد ربوہ میں مرزا محمود سے ملا ہوں، خیال تھا کہ وہ کام کی بات کریں گے مگر میں جتنا عرصہ وہاں بیٹھا رہا، وہ یہی کہتے رہے کہ فلاں لڑکی سے تعلقات استوار کیے تو اتنا مزہ آیا، فلاں سے کیے تو اتنا!''

مرزا محمود احمد کی ایک بیوی کا خط
دیوان سنگھ مفتون کے نام

حکیم عبدالوہاب عمر بیان کرتے ہیں کہ مرزا محمود خلیفہ ربوہ کی ایک بیوی نے ایک مرتبہ ایڈیٹر ''ریاست'' سردار دیوان سنگھ مفتون کو خط لکھا کہ تم راجوں مہاراجوں کے خلاف لکھتے ہو، ہمیں بھی اس ظالم کے تشدد سے نجات دلاؤ جو ہمیں بدکاری پر مجبور کرتا ہے۔ ایڈیٹر مذکور نے ظفر اللہ خاں وغیرہ قادیانیوں سے تعلق کی وجہ سے کوئی جرأت مندانہ اقدام تو نہ کیا، البتہ ''ریاست'' میں خلیفہ جی کی معزولی کے بارہ میں ایک نوٹ تحریر کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ جس شخص پر اہل خانہ تک جنسی بے راہروی کے الزامات لگا رہے ہوں، اسے اس قسم کے عہدہ سے چمٹا رہنا سخت ناعاقبت اندیشانہ فعل ہے۔ قادیانی ''رائل پارک فیملی'' کے قریبی حلقوں کا کہنا ہے کہ یہ بیوی مولوی نورالدین جانشین اوّل

جماعت قادیان کی صاحبزادی امتہ الحی بیگم تھیں۔

راجہ بشیر احمد رازی کی تجرباتی داستان

راجہ بشیر احمد رازی حال مشن روڈ بالمقابل ناز سینما لاہور، راجہ علی محمد صاحب کے صاحبزادے ہیں، جو ایک عرصہ جماعت ہائے احمدیہ گجرات کے امیر رہے۔ 1945ء میں زندگی وقف کرنے کے بعد ربوہ چلے گئے اور صدر انجمن احمدیہ ربوہ میں نائب آڈیٹر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ اسی دوران ان کے تعلقات شیخ نورالحق ''احمدیہ سنڈیکیٹ'' اور ڈاکٹر نذیر احمد ریاض سے ہو گئے جو مرزا محمود احمد کی خلوتوں سے پوری طرح آشنا تھے۔ راجہ صاحب ایک قادیانی گھرانے میں پلے تھے، اس لیے متعدد مرتبہ سننے کے باوجود انھیں اس بات کا یقین نہیں آتا تھا کہ یہ سب کچھ ''قصر خلافت'' میں ہوتا ہے۔ انھوں نے ڈاکٹر نذیر ریاض صاحب سے کہا کہ ''میں تو اس وقت تک تمہاری باتوں کو ماننے کے لیے تیار نہیں، جب تک خود اس ساری صورت حال کو دیکھ نہ لوں۔'' ڈاکٹر صاحب مذکور نے ان سے پختہ عہد لینے کے بعد ان کو بتایا کہ محاسب کا گھڑیال ہمارے لیے سٹینڈرڈ ٹائم کی حیثیت رکھتا ہے، جب اس پر 9 بجیں تو آ جانا۔ مقررہ وقت پر راجہ صاحب ڈاکٹر نذیر کی معیت میں ''قصر خلافت'' پہنچے تو خلاف توقع دروازہ کھلا تھا۔ راجہ صاحب کچھ ٹھٹکے کہ یہ کیا معاملہ ہے، کہیں ڈاکٹر سچ ہی نہ کہہ رہا ہو، پھر انھیں یہ بھی خیال آیا کہ کہیں انھیں قتل کروانے یا پٹوانے کا تو کوئی پروگرام نہیں، مگر انھوں نے حوصلہ نہ چھوڑا اور ڈاکٹر نذیر کے پیچھے زینے طے کرتے گئے۔ جب اوپر پہنچے تو ڈاکٹر نے انھیں ایک کمرہ میں جانے کا اشارہ کیا اور خود کسی اور کمرہ میں چلے گئے۔ راجہ صاحب نے پردہ ہٹا کر دروازے کے اندر قدم رکھا تو عطر کی لپٹوں نے انھیں مسحور کر دیا اور انھوں نے دیکھا کہ چھوٹی مریم آراستہ و پیراستہ بیٹھی ہے اور انگریزی کے ایک مشہور جنسی ناول ''فینی ہل'' کا مطالعہ کر رہی ہے۔ راجہ صاحب کہتے ہیں کہ

> ''یہ منظر دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور میری سوچ کے دھاروں میں تلاطم برپا ہو گیا۔ میں نے چشم تصور سے اپنے والد محترم کو دیکھا اور کہا تم اس کام کے لیے چندہ دیتے رہے ہو، پھر مجھے اپنی والدہ محترمہ کا خیال آیا جو انڈے بیچ کر بھی چندہ کے طور پر ربوہ بھجوا دیا کرتی تھیں، اسی حالت میں آگے بڑھا اور پلنگ پر بیٹھ گیا۔ وہاں تو دعوت عام تھی، مگر میں سعی لاحاصل میں مصروف تھا اور مجھے ڈاکٹر اقبال کا یہ مصرعہ یاد آ رہا تھا ع
>
> یہ ناداں گر گئے سجدے میں جب وقت قیام آیا

اصل میں مجھے اس قدر Shock ہوا تھا کہ میں کسی قابل ہی نہ رہا تھا، اس لیے میں نے بہانہ کیا کہ میں کھانا کھا کر آیا ہوں۔ مجھے پتہ نہیں تھا کہ مجھے یہ فریضہ سرانجام دینا ہے اور اگر شکم سیری کی حالت میں، میں یہ کام کروں تو مجھے اپنڈیکس کی تکلیف ہو جاتی ہے، اس طرح معرکہ اولیٰ میں ناکام واپس لوٹا اور آتے ہوئے مریم نے مجھے کہا: ''کل اکیلے ہی آ جانا، یہ ڈاکٹر نذیر بڑا بدنام آدمی ہے، اس کے ساتھ نہ آنا۔'' دوسرے دن ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ہوئی تو وہ کہنے لگے کہ تمہاری شکایت ہوئی ہے کہ ''یہ کون ہیجڑہ سالے آئے تھے۔'' دوسرے دن میں ذہنی طور پر تیار ہو کر گیا اور گزشتہ شکایت کا ہی ازالہ نہ ہوا، میرے اعتقادات، نظریات اور خلیفہ جی اور ان کے خاندان کے بارہ میں میرا مریدانہ حسن ظن بھی حقائق کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا اور میں نے واپس آ کر سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ملازمت سے مستعفی ہو گیا۔ ازاں بعد مجھے رشوت کے طور پر لنڈن بھیجنے کی پیشکش ہوئی، مگر میں نے سب چیزوں پر لات ماردی۔''

اب آپ ''کمالات محمودیہ'' ص 55 سے ان کی تحریر کا متعلقہ حصہ ملاحظہ فرمائیں:۔

''یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہم ربوہ کے کچے کوارٹروں میں، خلیفہ صاحب ربوہ کے کچے ''قصر خلافت'' کے سامنے رہائش پذیر تھے۔ قرب مکانی کے سبب شیخ نورالدین ''احمدیہ سنڈیکیٹ'' سے راہ و رسم بڑھی تو انھوں نے خلیفہ صاحب کی زندگی کے ایسے مشاغل کا تذکرہ کیا، جن کی روشنی میں ہمارا وقف کار احمقاں نظر آنے لگا۔ اتنے بڑے دعوے کے لیے شیخ صاحب کی روایت کافی نہ تھی۔ خدا بھلا کرے ڈاکٹر نذیر احمد ریاض صاحب کا، جن کی ہمرکابی میں مجھے خلیفہ صاحب کے ایک ذیلی عشرت کدہ میں چند ایسی ساعتیں گزارنے کا موقع ہاتھ آیا، جس کے بعد میرے لیے خلیفہ صاحب ربوہ کی پاک دامنی کی کوئی سی بھی تاویل و تعریف کافی نہ تھی اور اب میں بفضل ایزدی علیٰ وجہ البصیرت خلیفہ صاحب ربوہ کی بداعمالیوں پر شاہد ناطق ہو گیا ہوں۔ میں صاحب تجربہ ہوں کہ یہ سب بداعمالیاں ایک سوچی سمجھی ہوئی سکیم کے تحت وقوع پذیر ہوتی ہیں اور ان میں اتفاق اور بھول کا دخل نہیں۔ محاسب کا گھڑیال (نوٹ: محاسب کے گھڑیال سے مراد یہ ہے کہ اگر ایک شخص کو رات نو بجے کا وقت، عشرت کدے کے لیے دیا گیا ہے تو اس کی گھڑی میں بے شک 9 بج چکے ہوں، جب تک محاسب کا گھڑیال 9 نہ

بجائے، اس وقت تک وہ شخص اندر نہیں آ سکتا) ان رنگین مجالس کے لیے سٹینڈرڈ ٹائم (Standard Time) کی حیثیت رکھتا تھا، اب نہ جانے کونسا طریقہ رائج ہے۔ میرے اس بیان کو اگر کوئی صاحب چیلنج کریں تو میں حلف موکد بعذاب اٹھانے کو تیار ہوں۔" والسلام (بشیر رازی سابق نائب آڈیٹر، صدر انجمن احمد، ربوہ)

یوسف ناز "بارگاہ نیاز" میں

"ایک مرتبہ، جبکہ میاں صاحب چاقو لگنے کی وجہ سے شدید زخمی ہو گئے تھے، اس کے چند دن بعد مجھے ربوہ جانے کا اتفاق ہوا۔ میں نے دیکھا دفتر پرائیویٹ سیکرٹری کے سامنے مرزا صاحب کے مریدان باصفا کا ایک جم غفیر ہے۔ ہر شخص کے چہرے پر اضطراب کی جھلکیاں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اپنے پیر کے دیدار کی ایک معمولی سی جھلک ان کے دل ناصبور کو اطمینان بخش دے گی۔

پرائیویٹ سیکرٹری کے حکم کے مطابق کچھ احتیاطی تدابیر اختیار کی گئی تھیں، یعنی ہر شخص کی الگ الگ چار جگہوں پر جامہ تلاشی لی جاتی تھی اور اس امر کی تاکید کی جاتی تھی کہ "حضرت اقدس کے قریب پہنچ کر نہایت آہستگی سے السلام علیکم کہا جائے اور پھر یہ کہ اس کے جواب کا منتظر نہ رہا جائے، بلکہ فوراً دوسرے دروازے سے نکل کر باہر آ جایا جائے۔ میں خود ملاقات کی غرض سے حاضر ہوا تھا۔ گراں بندشوں نے کچھ آزردہ سا کر دیا اور میں واپس چلا گیا۔ چنانچہ پھر دو بجے بعد از دوپہر دوبارہ حاضر ہوا۔ شیخ نور الحق صاحب، جو ان کے ذاتی دفتر کا ایک رکن ہے، اس سے اطلاع کے لیے کہا۔ "حضرت اقدس" نے خاکسار کو شرف باریابی بخشا۔ اس وقت کی گفتگو جو ایک مرید (میرے) اور ایک پیر (مرزا صاحب) کے درمیان تھی، ہدیہ ناظرین کرتا ہوں۔

میں نے نہایت بے تکلفی سے کام لیتے ہوئے حضور سے دریافت کیا کہ "آج کل تو آپ سے ملنا بھی کارے دارد ہے۔"

فرمایا: "وہ کیسے؟"

عرض کیا کہ "چار چار جگہ جامہ تلاشی لی جاتی ہے تب جا کر آپ تک رسائی ہوتی ہے۔"

جواباً انھوں نے میرے "عمود لحمی" کو پکڑ کر ارشاد فرمایا کہ

"جامہ تلاشی کہاں ہوئی ہے کہ جس مخصوص ہتھیار سے تمھیں کام لینا ہے وہ تو تمام احتیاطی تدابیر کے باوجود اپنے ساتھ اندر لے آئے ہو۔" اس حاضر جوابی کا بھلا میرے پاس کیا جواب ہو سکتا

تھا۔ میں خاموش ہو گیا مگر ایک بات جو میرے لیے معمہ بن گئی، وہ یہ تھی کہ سنا تو یہ تھا کہ چارپائی سے ہل نہیں سکتے، حتیٰ کہ سلام کا جواب بھی نہیں دے سکتے تھے مگر وہ میرے سامنے اس طرح کھڑے تھے جیسے انھیں قطعی کوئی تکلیف نہیں تھی۔

میں میاں صاحب کی خدمت میں التماس کروں گا کہ اگر وہ اس بات کو جھٹلانے کی ہمت رکھتے ہیں تو حلف موکد بعذاب اٹھائیں اور میں بھی اٹھاتا ہوں۔"

ایم یوسف ناز، کراچی
حال مقیم لاہور

(یہاں عبارت کی عریانی دور کرنے کی سعی کی گئی ہے)

قادیانی امت کے نام نہاد "خالد بن ولید"

قادیانی امت نے اپنے متنبی کی اتباع میں وحدت امت کو ملیامیٹ کرنے اور مسلمانوں میں فکری انتشار پیدا کرنے کے لیے اسلامی اصطلاحات کا جس بے دردی سے استعمال کیا اور ان مقدس ناموں کی جس قدر توہین کی ہے، ایک عامی تو درکنار، اچھے بھلے تعلیم یافتہ افراد کو بھی اس سے پوری شناسائی نہیں۔ مرزا غلام احمد کے لیے نبی اور رسول کا استعمال تو عام ہے۔ ان کی اہلیہ کے لیے "ام المومنین۔" جانشینوں کے لیے "خلیفہ" ان کے اولین پیروؤں کو "صحابہ" اور "رضی اللہ عنہم" کا خطاب ہی نہیں دیا، بلکہ انھیں بمراحل اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بہتر سمجھا جاتا ہے۔ ع...... "صحابہ سے ملا جو مجھ کو پایا" کہنے پر اکتفا نہیں کیا جاتا بلکہ ایک قرآنی آیت یاتی من؟ بعدی اسمہ احمد کی لایعنی تاویلات کر کے اسے بانی جماعت پر چسپاں کیا جاتا ہے اور ایک دوسری آیت کی غلط توجیہ کرتے ہوئے موسس قادیانیت کی "بعثت" کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت ثانیہ قرار دے کر اس کے ماننے والوں کو صحابہ سے افضل قرار دیا جاتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام اور صلحا امت کی توہین ہر قادیانی اس طرح کر جاتا ہے کہ سلب ایمان کی وجہ سے اسے احساس ہی نہیں ہوتا کہ وہ کیا ناپاک حرکت کر رہا ہے۔ حیرت ہے کہ آئین مملکت کے بارہ میں ژاژخائی کرنے پر تو قانون حرکت میں آ جاتا ہے، مگر قرآن مجید، حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین اور مقدس اسلامی اصطلاحات کے متعلق قادیانی امت کی دیدہ دلیری پر سرکاری مشینری کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔

اگر پوری تفصیل درج کی جائے تو بجائے خود اسی کی ایک کتاب بنتی ہے، اسی بے راہروی میں قادیانی امت کے پوپ دوم نے ملک عبدالرحمٰن خادم گجراتی، مولوی اللہ دتہ جالندھری اور مولوی

جلال الدین شمس کو ''خالد بن ولید'' کا خطاب دیا تھا کیونکہ ان ہر سہ افراد نے سب کچھ جان بوجھ کر جھوٹ بولنے، افترا پردازی کرنے اور قادیانیت کی حمایت اور خلیفہ کی ''پاکبازی'' ثابت کرنے میں سب قوتیں ضائع کیں۔ گو یہ الگ امر ہے کہ ان میں سے ہر ایک کو ذاتی طور پر اسی گوسالہ سامری کی جانب سے ذلیل ترین الفاظ کا تحفہ ملا۔ کوئی ''طاعونی چوہا'' کہلایا اور کوئی ''لندن میں رہنے کے باوجود مولوی کا مولوی ہی رہا۔''

ان خطاب یافتہ پالتو مولویوں میں سے ایک کے متعلق اس کے سگے بھائی نے اپنی کتاب ''ربوہ کا مذہبی آمر'' میں لکھا ہے کہ ''وہ فن اغلامیات میں یدطولیٰ رکھتے تھے'' دوسرے صاحب اپنی گوناگوں ''صفات'' کی وجہ سے ''رحمت منزل'' گجرات کے اطفال و بنات سے ایسے گہرے مراسم رکھتے تھے کہ امیر ضلع تلاش کرتے رہتے تھے مگر وہ اچانک بلڈ پریشر کے دورہ کے باعث غائب ہو کر اسی مقام پر جا پہنچا کرتے تھے۔ تیسرے صاحب کی ''مساعی جمیلہ'' بھی کسی سے کم نہیں۔

مرزا غلام احمد کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مدمقابل کھڑا کر کے قادیانیوں کے دل میں بڑے ارمان مچل رہے تھے مگر ''افسوس'' کہ وہ پورے نہ ہو سکے۔ انھوں نے مرزا غلام احمد قادیانی کو صاحب کتاب نبی بنانے کے لیے اس کے اضغاث احلام کو مجموعہ الہامات قرار دے کر اس کا نام ''تذکرہ'' رکھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث کے طرز پر مرزا غلام احمد کے ''ملفوظات'' اکٹھے کر کے ''سیرت المہدی'' کے نام سے شائع کیے، جس میں ہر بات ''بیان کی مجھ سے فلاں نے'' یعنی حدیث فلاں بن فلاں سے شروع ہوتی ہے اور مرزا غلام احمد کے سالے مرزا محمد اسماعیل نے رسالہ ''درود شریف'' میں یہ درود درج کیا:

اللھم صلی علی محمد و احمد و علی ال محمد و ال احمد...... الخ

اللھم بارک علی محمد و احمد کما بارکت علی ال محمد وال احمد...... الخ

قادیانی جھوٹ بولنے میں بڑے ماہر ہیں۔ قومی اسمبلی کی کارروائی کے دوران جب اس کتاب کی فوٹو سٹیٹ ضیاء الاسلام پریس قادیان کی پرنٹ لائن کے ساتھ مرزا ناصر کے سامنے پیش کی گئی تو وہ چکرا گیا اور علمائے کرام کی ان کے گھر سے معمولی واقفیت کی بناء پر انھیں یہ کہہ کر ٹرخا دیا کہ کسی غیر احمدی نے چھاپ دیا ہوگا، حالانکہ یہ تحریر ان کے آنجہانی دادا کے ''سالا صاحب'' کی ہے اور جن لوگوں کو قادیان اور ربوہ کے مکروہ ترین آمرانہ نظام سے واقفیت ہے، وہ جانتے ہیں کہ ان کے پریس میں کسی مسلمان کی کوئی تحریر چھپ جانا ناممکنات میں سے ہے۔ اگر مرزا طاہر احمد اور ان کی

امت توبہ کر کے امت مسلمہ کے سیل رواں میں شامل ہونے کا برملا اعلان کرے تو میں یہ اصل کتاب کسی بھی عدالت میں پیش کرنے کے لیے تیار ہوں۔ قرآن کریم نے مسجد ضرار کے گرائے جانے کی وجہ تفریقاً بین المومنین کے الفاظ میں بیان فرمائی ہے، قادیانی نہ صرف تفرقہ کا موجب بن رہے ہیں ، بلکہ دین اسلام کے بنیادی ارکان میں التباس پیدا کر رہے ہیں، اس لیے ان کی عبادت گاہوں کی شکل تبدیل کرنا، ان سے کلمہ کو مٹانا، درحقیقت مسجد ضرار کے گرائے جانے کی مانند تفرقہ اور التباس کی سازش کو ختم کرنا ہے۔

رحمت اللہ اروپی کا کشتہ

o رحمت اللہ اروپی گوجرانوالہ کے ایک مضافاتی قصبہ اروپ کے رہنے والے ہیں۔ کافی عرصہ ہوا، ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔ اس لیے یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ زندہ ہیں یا قید حیات سے آزاد ہو چکے ہیں۔ بہرحال اگر وہ زندہ ہیں تو خدا انھیں صحت و عافیت دے کہ انھوں نے قادیانی امت مجہولہ کی طرح مرزا غلام احمد کو امتی اور نبی، ایک پہلو سے امتی اور ایک پہلو سے نبی، غیر تشریعی نبی، لغوی معنوں میں نبی اور ظلی اور بروزی نبی کے گورکھ دھندے میں نہیں الجھایا بلکہ مرد میدان بن کر صاف کہا ہے کہ وہ مرزا غلام احمد کو صاحب شریعت نبی تسلیم کرتے ہیں۔

1974ء میں جب قادیانی امت کو چوہڑوں، چماروں، پارسیوں اور ہندوؤں کی صف میں شامل کر کے دائرہ اسلام سے خارج قرار دے دیا گیا تو انھوں نے اپنا یہ موقف حکومت کو پیش کیا کہ وہ اس فیصلے کو تسلیم کرتے ہیں کہ وہ غیر مسلم ہیں لیکن وہ مرزا غلام احمد کو تشریعی نبی ماننے سے انکار کرنے کے لیے تیار نہیں۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ اوائل جوانی میں جب وہ اپنے والد کے ساتھ قادیان میں تھے تو انھیں قائد خدام الاحمدیہ ہونے کا اعزاز بھی حاصل رہا اور ان ایام میں وہ لوائے احمدیت کو پکڑ کر قصر خلافت کے ہر حصے میں آزادانہ آتے جاتے تھے۔ انھی ایام میں اپنے اخلاص کے اظہار کے لیے ہر سہ پہر کو وہ ایک ایسے چوزے کو جو ابھی اذان نہیں دیتا تھا، ذبح کر کے اور اس کے پیٹ میں ایک کشمیری سیب کو چھید کر رکھ کر پاؤ بھر گھی اور ایک چھٹانک گری، بادام اور کشمش میں ہلکی آنچ پر پکا کر اس کا سوپ حضرت صاحب (مرزا محمود احمد) کی خدمت میں پیش کیا کرتے تھے اور کبھی کبھار اس کے ساتھ بیسن کی گھی میں تر بتر تندوری روٹی بھی انھیں بھجوایا کرتے تھے۔ اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئے تو میں نے پوچھا کہ ایسی مرغن اور مقوی غذائیں کھانے والا سرکاری سانڈ پھر کوئی اپنی یا بیگانی کھیتی ویران کیے بغیر رہ سکے گا؟ تو وہ دھیمے سے مسکرا کر کہنے لگے کہ جب مجھے اپنی اس خدمت کے نتائج کا علم ہوا تو اس وقت تک کئی گھر اجڑ چکے تھے اور میرے ہاتھ میں صرف خدام الاحمدیہ کا ڈنڈا

ہی باقی رہ گیا تھا اور میں یہ سوچنے لگ پڑا تھا کہ جب انسان کے پاس دنیاوی وسائل کی فراوانی ہو، نو عمر لڑکیوں اور لڑکوں سے میل جول کے مواقع بھی پوری طرح میسر ہوں، اندھی عقیدت سے مخمور مرید اپنے پیر کے متعلق کوئی سچی سے سچی بات سننے سے بھی انکاری ہوں تو ایسا پیر اگر بدمعاشی نہ کرے تو پھر شاید اس سے بڑا بدمعاش اور کوئی نہ ہوگا اور اسی سے روکنے کے لیے اسلام نے تہمت کے مواقع سے بھی بچنے کی تلقین کی ہے۔

میں نے ایک بہت پرانے قادیانی سے، جو مرزا غلام احمد سے لے کر مرزا طاہر احمد تک کے جملہ حالات سے واقف ہیں اور سال خوردگی کی انتہائی سٹیج پر ہونے کی وجہ سے اپنا نام ظاہر نہیں کرنا چاہتے، اس بارے میں پوچھا تو کہنے لگے مرزا صاحب (مراد مرزا غلام احمد) نے بھی بڑھاپے میں

"ہرچہ باید نو عروسے را ہمہ ساماں کنم
واں چہ مطلوب شما باشد عطائے آں کنم

کے تحت ایک نوجوان لڑکی سے شادی رچا کر اسے اللہ رکھی سے نصرت جہاں بیگم بنا دیا تھا لیکن فطرت کی تعزیروں نے وہاں بھی اپنا کام دکھایا اور پھر ان کی اولاد نے جو کچھ کیا اور جنسی عصیان میں جس مقام تک پہنچی، یہ کام کشتوں کی اولاد ہی کرتی ہے۔ نارمل اولاد یہ کام نہیں کر سکتی کیونکہ کشتوں کے پشتے لگا دینا اس کا کام ہی نہیں۔

میچ کی تیاری...... بیٹنگ اور باؤلنگ

یہ ان دنوں کی بات ہے جب مرزا ناصر احمد آنجہانی نے فاطمہ جناح میڈیکل کالج کی ایک ایسی طالبہ کو اپنے حبالہ عقد میں لے لیا تھا، جس پر ان کے صاحبزادے مرزا لقمان احمد نے ڈورے ڈالے ہوئے تھے۔ انہی ایام میں قادیانی حلقوں میں یہ بھی سننے میں آیا کہ مرزا ناصر احمد اور مرزا لقمان میں شدید شکر رنجی ہی نہیں بلکہ باقاعدہ مخاصمت کا آغاز ہو گیا ہے۔ میں نے ایک پرانے قادیانی خاندان کے کسی قدر مضطرب ایک فرد وائی ایم سی اے کارنر (دی مال لاہور) پر چائے کی دکان کے مالک انیس احمد سے پوچھا کہ ان خبروں میں کس حد تک صداقت موجود ہے تو انھوں نے بے ساختہ کہا کہ ایسا ہونا تو لازمی تھا کیونکہ کرکٹ میچ کی تیاری تو بیٹے نے کی تھی مگر والد صاحب نے اس پر بیٹنگ اور باؤلنگ شروع کر دی اور پھر وہی ہوا جو ایسے معاملات میں ہوا کرتا ہے کہ چڑھتی دھوپ اور ڈھلتی چھاؤں میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی دوڑ شروع ہو گئی۔ مرزا ناصر احمد نے اپنے از کار رفتہ اعضاء میں جوانی کی امنگیں بھرنے کے لیے تمام جدید وسائل علاج میسر ہونے کے باوجود کشتے کا استعمال شروع کیا، جو راس نہ آیا اور اس کا جسم پھول کر کپا بن گیا اور وہ آناً فاناً اللہ تعالیٰ کی

عبرتناک گرفت میں آ کر کشتے کی آگ میں جھلنے کے بعد نار جہنّم کا ایندھن بننے کے لیے عدم آباد سدھار گیا۔

ہمارے ایک قادیانی دوست نے مرزا ناصر احمد کی اس شہادت پر انھیں شہید فرج کا خطاب دیا ہے اور ان کا اصل خط بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ بعد میں ایک مشترکہ دوست کے ذریعے میں نے انھیں یہ پیغام بھیجا کہ اس خطاب کو تراشنے کے لیے آپ نے بلاوجہ زحمت کی۔ فیروز اللغات میں اس کے لیے چوتیا شہید کا محاورہ پہلے سے موجود ہے تو انھوں نے ہنستے ہوئے جواباً کہا کہ لغوی اعتبار سے یہ بات تو ٹھیک ہے لیکن یہ خاندان جنس کے طوفان میں جس طرح غرقاب ہے، اس کے لیے لغت بھی نئی ہی کائن Coin کرنی پڑے گی۔

آلہ واردات

ملک عزیز الرحمٰن 8۔ اے عزیز والا کرشن نگر لاہور میرے قریبی عزیز ہیں اور اپنی مخصوص ذہنی تطہیر کے باعث وہ ابھی تک مرزا غلام احمد کو مسیح موعود، مہدی موعود اور مجدد وقت تسلیم کرتے ہیں اور ہر وقت اس کا پرچار کرتے رہنے کو ہی ذریعہ نجات سمجھتے ہیں۔ ان کا کسی قدر مزید تعارف کرا دوں۔ یہ احمدیہ پاکٹ بک کے مصنف ملک عبدالرحمٰن خادم ایڈووکیٹ گجرات، جنھوں نے کسی زمانے میں ''احمدیہ پاکٹ بک'' لکھی، کے سگے بھائی ہیں۔ ان کے ایک دوسرے برادر معروف لیبر لیڈر راحت ملک بھی ان کے سگے بھائی ہیں، جنھوں نے کسی دور میں خلیفہ ربوہ کے بارے میں ''ربوہ کا مذہبی آمر'' کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی اور انھوں نے خود خالد احمدیت کا خطاب پانے والے اپنے بھائی کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ وہ فن اغلامیات میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔

ملک عزیز الرحمٰن قصر خلافت میں سپرنٹنڈنٹ کے عہدہ پر فائز رہے اور جب انھیں مرزا محمود احمد کے بارے میں پورے یقین کے ساتھ یہ معلوم ہوگیا کہ وہ ایک بدمعاش اور بدکردار آدمی ہے تو انھوں نے [illegible] مکمل علیحدگی اختیار کر لی کہ اپنے خالد احمدیت بھائی کا جنازہ اس بنا پر نہ [illegible] بھی یقینی علم تھا کہ مرزا محمود احمد بدمعاش ہے مگر اس کے باوجود وہ اسے مصلح موعود ثابت کرنے پر تلا رہا۔ وہ مرزا غلام احمد کو تو مجدد وقت اور مسیح موعود ثابت کرنے کے لیے تو غالیانہ انداز میں تبلیغ کرتے رہتے ہیں لیکن اسی تواتر سے مرزا محمود احمد کو بدمعاش اور بدکردار ثابت کرنے کے لیے بیسیوں پمفلٹ شائع کر چکے ہیں۔

اس سے ان کی اپنے افکار و نظریات میں پختگی کا اندازہ ہوسکتا ہے اور وہ اس معاملے میں اتنے متشدد ہیں کہ کہتے ہیں چونکہ مرزا محمود احمد اور ان کی والدہ ''نصرت جہاں بیگم'' دونوں ہی ایک

قبیل سے تعلق رکھتے تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے دونوں کو مرزا غلام احمد کی پیش گوئی کے مطابق قادیان کی ''پاک'' سرزمین سے نکال کر ربوہ کی لعنتی سرزمین میں لا دفن کیا ہے۔

وہ اسی پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ ''پسر موعود'' اور ''زوجہ موعود'' کے ربط وضبط کے بارے میں بھی ایسی ناگفتنی باتیں کہہ جاتے ہیں کہ میرے جیسے بندے کو بھی، جو قادیانی خلفاء سے لے کر جہلا تک کی ساری کرتوتوں کے سلسلے میں کسی اشتباہ کا شکار نہیں، تذبذب کی کیفیت سے دوچار ہو کر یہ سوچنا پڑتا ہے کہ یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے اور صرف یہی خیال آتا ہے کہ آدمی جب گناہ کی دلدل میں دھنستا ہے تو پھر اس حد تک کیوں دھنستا چلا جاتا ہے کہ جب تک اسفل السافلین کے مقام پر نہ پہنچ جائے، اس وقت تک اسے چین نہیں آتا۔

ملک عزیز الرحمٰن صاحب گھر کے بھیدی تھے۔ اس لیے تیقن کے مقام پر پہنچنا ان کے لیے کوئی زیادہ مشکل نہ تھا۔ لیکن جب وہ اپنی تحقیق عارفانہ سے مرزا محمود احمد اور اس شوق فروزاں کے متعلق ٹھوس معلومات ملنے اور مشاہدات سے اسے مزید پختہ کرنے تک پہنچ گئے تو پیریت کی زنجیروں کو ایک جھٹکے سے توڑنے کے لیے انھوں نے اپنی اہلیہ محترمہ عظمت بیگم کو استرا دے کر قصر خلافت بھجوا دیا اور کہا اگر حضرت صاحب دست درازی کی کوشش کریں تو پھر انھیں آلہ واردات سے ہی محروم کر دینا لیکن خلیفہ صاحب بھی گرگ باراں دیدہ تھے اور انھوں نے اپنی معصیتوں کو چھپانے کا بڑا فرعونی نظام وضع کر رکھا تھا۔ تلاشی لی گئی اور عظمت بیگم سے استرا برآمد ہو گیا اور ملک صاحب کو ان کے پورے خاندان سمیت ربوہ بدر کر دیا گیا۔

صالح نور نے مجھے بتایا کہ میں نے ازراہ مذاق ملک صاحب سے پوچھا کہ آپ اس کے موالید ثلاثہ یعنی تھوبلا ناتھ کو کیوں کٹوانا چاہتے تھے تو انھوں نے کہا کہ یہ ایک عملی ثبوت بھی ہوتا اور ویسے بھی ایک نادر چیز ہونے کے اعتبار سے اس کی قیمت کروڑوں سے کم نہ ہوتی اور میں تو اسے سرکے کی بوتل میں ڈال کے رکھتا۔

تکبیر اور ذبیحہ

میں نے مباہلہ والے زاہد سے پوچھا کہ حکیم عبدالوہاب جو نورالدین کے بیٹے ہیں، وہ تو مرزا محمود احمد کی تمام رنگینیوں کو بڑے مزے لے لے کر بیان کرتے رہتے ہیں لیکن ان کے بھائی عبدالمنان عمر بڑی پُراسرار خاموشی اختیار کیے رکھتے ہیں۔ کیا انھیں علم نہیں کہ مرزا محمود احمد ایک بدکردار آدمی تھے تو وہ کہنے لگے کہ میں اب بڑھاپے کی اس منزل میں ہوں، جہاں اس قسم کی باتوں کے کرنے سے انسان طبعاً حجاب کرتا ہے لیکن چونکہ یہ ایک صداقت کا اظہار ہے، اس لیے میں برملا

اس امر کا اقرار کرتا ہوں کہ میاں عبدالمنان عمر کو مرزا محمود احمد کی تمام وارداتوں کا پوری طرح علم ہے اوران کا ڈپلومیسی کے تحت اس بارے میں زبان نہ کھولنا محض منافقت ہے ورنہ میں اپنی نوعمری میں جب خود شعلہ جوالہ ہوتا تھا تو مجھے علم ہے کہ قصر خلافت کے ایک دروازے پر میاں عبدالمنان عمر کھڑے ہوتے تھے اور دوسرے پر میں اور ہمیں اس بات کا یقینی علم ہوتا تھا کہ اندر کیا ہو رہا ہے اور انہی ایام میں وہ عیاش پیر کبھی مجھ پر تکبیر پھیر دیتا تھا اور کبھی میاں منان کا ذبیحہ کر دیتا تھا۔

اک تے تہاڈیاں نمازاں نے......

''فتنہ انکار ختم نبوت'' کے مولف مرزا احمد حسین اگرچہ خاندان نبوت کاذبہ کے درون حرم ہونے والے واقعات سے صرف آگاہ ہی نہیں تھے بلکہ مشاہدے کی سرحدوں سے نکل کر تجربے کی کٹھالی سے نکلنے کی دہلیز پر آ پہنچے تھے لیکن اس مرحلے پر اپنی بزدلی یا نام نہاد پارسائی کی بنا پر ناکامی سے دوچار ہونے کے بعد انھیں مرزا محمود احمد اور ان کے چھٹے ہوئے بدمعاشوں کے ہاتھوں جس ذہنی تشدد اور اذیت کا شکار ہونا پڑا اور جس طرح ان کے جسم کے ناسور والے حصے پر پٹی لگانے سے ڈاکٹر کو حکماً منع کر دیا گیا، اس کا ان پر اتنا گہرا اثر رہا کہ وہ اپنے دم واپسیں تک مرزا محمود احمد کی خلوتوں کے بارے میں اشارتاً اور کنایۃً ہی گفتگو کرتے رہے اور مذکورہ بالا کتاب میں بھی جو باتیں اس ضمن میں انھوں نے درج کی ہیں، ان میں سریت اور اخفا کا پہلو غالب ہے۔

ایک روایت انھوں نے مصلح الدین کے حوالے سے متعدد مرتبہ چینیز لنچ ہوم دی مال لاہور میں بیان کی، جسے سننے والے بیسیوں افراد خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے زندہ سلامت موجود ہیں لیکن چونکہ وہ حسب معمول اسرار کے پردوں میں لپٹی ہوئی تھی، اس لیے یہ یونہی ملفوف اور راز سربستہ رہی۔ اس کا اصلی نقاب صلاح الدین ناصر بنگالی مرحوم نے سرکایا اور پھر چودھری فتح محمد عرف پھتہ سابق منیجر ملتان آئل ملز حال شالیمار ٹاؤن لاہور نے رہی سہی کسر بھی نکال دی۔ میں نے کہا کہ چودھری صاحب آپ تو علم و تحقیق کی دنیا کے آدمی نہیں آپ کو قادیان میں مرزا محمود احمد کی بدکرداری کا کیسے علم ہو گیا تو کہنے لگے افسوس کہ بھرپور جوانی کی لہر میں میں بھی اس سیلاب میں بہہ گیا تھا۔ تو میں نے کہا کہ پھر آپ اس سے نکلے کیوں کر؟ آپ کو تو ہر طرح کا خام مال میسر تھا۔ کہنے لگے کہ ''حضرت صاحب'' جس مقام تک چلے جاتے تھے، وہاں تو عزازیل کے پر بھی جلنے لگتے تھے۔ میں نے کہا آپ کو علم ہے کہ اس سے قادیانیوں کی تسلی ہوتی ہے نہ عام لوگوں کی، اس لیے ذرا کھل کر بات کیجئے۔ کہنے لگے تم میرے بیٹوں کے برابر ہو۔ تم سے کیا بات کروں لیکن تمھارے اصرار پر حلفاً کہتا ہوں کہ ایک مرتبہ مرزا محمود احمد نے محفل رنگ و شباب سجائی ہوئی تھی کہ موذن نے آ کر روایتی انداز

میں آواز لگائی ''حضور نماز کے لیے'' یعنی نماز کا وقت ہو گیا ہے تو حضور نے جو بڑے موڈ میں تھے، کہا:

اک تے تہاڈیاں نمازاں نے یہہ ماریا اے

یہ جملہ کمرہ خاص میں بیٹھے ہوئے تمام رندان بادہ خوار نے سنا اور کھلکھلا کر ہنس پڑے اور پھر موذن کو کہہ دیا گیا کہ نماز ''پڑھا دی جائے'' حضور مصروف ہیں۔ چودھری صاحب کہتے ہیں کہ یہی وہ لمحہ تھا کہ میں نے اس کنم کدہ کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا اور ایسی توبہ کی کہ پھر قادیان و ربوہ کا رخ تک نہ کیا اور اگرچہ میری معاشی اور معاشرتی زندگی پر اس کے بڑے تباہ کن اثرات مرتب ہوئے ہیں مگر زہر ہلاہل کو قند کہنے پر تیار نہیں ہوں۔

اس سے اس خانوادہ کو نعوذ باللہ نبوت، رسالت، امامت اور اہل بیت کے مقام تک پہنچانے والے خود سوچ لیں کہ کیا انگور کو کبھی حنظل کا پھل لگ سکتا ہے اور اگر نہیں تو پھر مرزا غلام احمد کیسے ''نبی'' ہیں کہ جس اولاد کو وہ ذریت مبشرہ قرار دیتے رہے اور ان کے قصیدے لکھتے ہوئے یہاں تک کہتے رہے کہ

یہ پانچوں جو کہ نسل سیدہ ہیں
یہی ہیں پنجتن جن پر بنا ہے

وہ اپنی بدکرداری اور اپنی اندرونی محفلوں میں اسلامی شعائر کا مذاق اڑانے میں اس مقام تک چلی گئی کہ اس کا تصور بھی کسی مسلمان کے حاشیہ خیال میں نہیں آ سکتا۔

لارڈ ملہی اور ظفر اللہ خاں

لاہور کے سیاسی و سماجی حلقوں کے لیے چودھری نصیر احمد ملہی المعروف لارڈ ملہی کا نام اجنبی نہیں۔ وہ ون یونٹ کے دوران مغربی پاکستان کے وزیر تعلیم رہے اور پھر انھوں نے پنجاب کلب میں اپنا ایسا مستقل ڈیرہ بنایا کہ یہ ان کی دوسری رہائش گاہ بن کر رہ گئی۔ ان کا تھوڑا ہی عرصہ ہوا، انتقال ہوا ہے۔ ان کے بیٹے چودھری افضال احمد ملہی ایڈووکیٹ لاہور بار کے رکن ہیں۔ لارڈ ملہی مرحوم نے ترقی پسندی سے لے کر بقول ممتاز کالم نگار رفیق ڈوگر آخری عمر میں مذہب کی طرف مراجعت کا بڑا طویل سفر کیا لیکن انھیں قریب سے جاننے والے جانتے ہیں کہ وہ جھوٹ نہیں بولتے تھے اور کسی واقعہ کے بیان میں ان کی ذات بھی ہدف بن جاتی تھی تو وہ اسے بچانے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔

ایک مرتبہ کلاسک پر کھڑے کھڑے بات چل نکلی تو میں نے ان سے چودھری ظفر اللہ خاں کے کردار کے بارے میں پوچھا تو کہنے لگے طالب علمی کے دور میں میں نے شاہنواز (شاہنواز

موٹرز اور شیزان والے) سے اس بارے میں پوچھا تو چونکہ وہ میرے بہت قریبی دوست اور عزیز تھے، اس لیے بے ساختہ کہنے لگے یار وہ تو جب آتا ہے، جان ہی نہیں چھوڑتا اور اس نے مجھے اپنی بیوی کے طور پر رکھا ہوا ہے۔ لارڈ ملھی نے مزید بتایا کہ ''انہی ایام میں ظفر اللہ خان نے مجھے بھی پھانسنے کی کوشش کی تھی لیکن میں اس کے قابو میں نہیں آیا۔''

یہ ہے جنرل اسمبلی میں قرآن کریم کی تلاوت کرنے والے۔ قائداعظم کا اپنے نام نہاد عقائد ونظریات کی خاطر جنازہ نہ پڑھنے والے اور اپنے آپ کو ایک کافر حکومت کا مسلمان وزیر یا ایک مسلمان حکومت کا کافر وزیر قرار دینے والے کا اصل کردار اور یہ صرف ظفر اللہ خاں ہی سے مخصوص نہیں ہر بڑا قادیانی دہرے کردار کا مالک ہوتا ہے۔

امرود کھانے کا مصلح موعودی طریقہ

انگریزی اور اردو زبان کو یکساں قدرت کے ساتھ لکھنے کے ساتھ ساتھ فلسفہ سیاست کے علاوہ فلم، موسیقی اور آرٹ پر گہری نگاہ رکھنے والے معدودے چند نامی صحافیوں میں احمد بشیر کی شخصیت اپنی ایک چمک رکھتی ہے۔ وہ اپنے صاف ستھرے کردار، اکھڑپن اور ہر حالت میں سچ کہہ کر اپنے دشمنوں میں اضافہ کرتے رہنے کی عادت کے باوصف حق گوئی و بے باکی میں ایک ایسا مقام رکھتے ہیں کہ اس عہد میں اس کی مثالیں اگر نادرالوجود نہیں تو خال خال ہو کر ضرور رہ گئی ہیں۔ ان سے ایک مرتبہ قادیانی امت کے مصلح موعود کے عجائب وغرائب کی ذیل میں آنے والے احوال وظروف کا تذکرہ ہو رہا تھا تو انھوں نے مرزا محمود احمد کے عشرت کدہ خلافت سے آگاہی رکھنے والے اپنے ایک قادیانی دوست کے حوالے سے بتایا کہ مرزا محمود احمد کو معکوس عجمی ذوق کی عادت بھی تھی اور ایک مرتبہ وہ بقول اس قادیانی دوست کے اس عمل سے بھی گزر رہے تھے اور ساتھ ساتھ امرود بھی کھاتے جا رہے تھے۔

احمد بشیر صاحب خدا کے فضل وکرم سے زندہ موجود ہیں اور اس روایت کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ میں اس پر صرف یہ اضافہ کرنا چاہوں گا کہ مذہب کا لبادہ اُوڑھ کر اس نوع کے افعال سے دل بہلانے والے اور روحانیت کے پردے میں رومانیت کا کھیل کھیلنے والوں کی تو اس خطے میں کوئی کمی نہیں لیکن امرود کھانے کا یہ مصلح موعودی طریقہ ایسا ہے کہ شاید ہی نہیں، یقیناً پوری دنیا میں اس کی نظیر نہیں مل سکے گی۔ ایسے شخص کو آپ مفعول کہیں گے یا مفعول مطلق اس کا فیصلہ آپ خود کر لیں۔

مظہر ملتانی مرحوم کی ایک حیران کن روایت

مظہر ملتانی مرحوم نے جن کے والد فخر الدین ملتانی کو قادیان میں مرزا محمود احمد کی ناگفتہ بہ

حرکات کو منظر عام پر لانے کے لیے پوسٹر لگانے کی پاداش میں قتل کر دیا گیا تھا، مجھے بتایا کہ ایک مرتبہ ان کے والد محترم اپنے ایک دوست سے گفتگو کرتے ہوئے انھیں مرزا غلام احمد کے داماد نواب محمد علی آف مالیر کوٹلہ کے بارے میں یہ بتا رہے تھے کہ انھیں اواخر عمر میں کوئی ایسا عارضہ لاحق ہو گیا تھا کہ وہ اپنی کوٹھی کی سیڑھیاں نا کتخدا لڑکیوں کو اہرام سینہ سے پکڑ کر چڑھتے تھے لیکن اپنے خاندان کی خواتین کو سخت ترین پردے میں رکھتے تھے اور انھیں پالکیوں میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتے تھے۔ یاد رہے کہ جب مرزا غلام احمد نے ان سے اپنی نوجوان بیٹی مبارکہ بیگم بیاہی تو ان کی عمر ستاون سال تھی اور حق مہر بھی ستاون ہزار ہی رکھا گیا تھا اور نواب مالیر کوٹلہ کو اپنے تفضیلی عقائد کو بھی برقرار رکھنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔

قاضی اکمل اور مرزا بشیر احمد

قاضی اکمل بڑی معروف شخصیت تھے۔ اب تو عرصہ ہوا ھاویہ میں پہنچ چکے ہیں۔ جس زمانے میں راقم الحروف ربوہ میں بسلسلہ تعلیم مقیم تھا۔ چند مرتبہ ان کے پاس بھی جانا ہوا۔ وہ صدر انجمن احمدیہ کے کوارٹرز میں رہتے تھے۔ بواسیر کے مریض تھے۔ اس لیے لیٹے ہی رہتے تھے اور ان کے پہلو میں ریڈیو مسلسل اپنی دھنیں بکھیرتا رہتا تھا۔ یہ خبیث الطرفین شخصیت ہی وہ ہے، جس نے مرزا غلام احمد کے عہد میں خود ان کے سامنے اپنی یہ نظم پیش کی تھی، جس کے یہ اشعار زبان زد عام ہیں ؎

محمد پھر اتر آئے ہیں ہم میں
اور آگے سے ہیں بڑھ کر اپنی شان میں
محمد دیکھنے ہوں جس نے اکمل
غلام احمد کو دیکھے قادیان میں

ان کو ملنے کے لیے گئے تو نصر اللہ ناصر میرے ساتھ تھے۔ اگر ان کا حافظہ جواب نہ دے گیا ہو یا ملازمت کی مجبوریاں زیادہ نہ بڑھ گئی ہوں تو وہ تصدیق کر سکتے ہیں کہ قاضی اکمل نے تفنن طبع کے طور پر یہ واقعہ سنایا کہ ایک مرتبہ ہم چند دوست مرزا بشیر احمد کے پیچھے قادیان سے باہر سیر سپاٹے کے دوران نماز پڑھ رہے تھے۔ مرزا بشیر احمد نے امامت کروائی اور ابھی وہ نماز میں ہی تھے تو میں نے کہا ''اوئے وضو کیتا سائی'' یہ ہے قادیانی نماز......

جب میں لاہور آیا تو مظہر ملتانی نے قاضی اکمل کے اپنے ہاتھوں کا لکھا ہوا ایک شعر مجھے دکھایا جو ایک طویل نظم کا حصہ تھا۔ وہ شعر مجھے اب بھی یاد ہے جو یہ ہے ؎

بدن اپنا پھر آگے اس کے ڈالا
توکلت علی اللہ تعالیٰ

اس قادیانی کی خباثت کا اندازہ لگائیں کہ وہ اسلامی شعائر کی توہین کرنے میں کس قدر بے باک تھا۔ ایک دوسرا شعر بھی قاضی اکمل کے اپنے ہینڈ رائٹنگ میں مظہر ملتانی مرحوم نے مجھے دکھایا تھا لیکن وہ اس قدر خستہ تھا کہ اس کا صرف ایک ہی مصرع پڑھا جاسکتا تھا۔ جو یہ ہے ۔

نہ چیخ مارو حبیب میرے کہ ہو چکا ہے دخول سارا

اب اگر قادیانی امت کے نام نہاد ''صحابیوں'' کی یہ حالت ہے تو پھر ان کے ''نبی صاحب'' ''خلفا'' اور دوسرے ''اہل بیت'' کی کیا حالت ہوگی، اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔

مرزا ناصر احمد نے اپنے ہی پوتے کے اغوا کا منصوبہ بنا لیا

ربوہ میں چارسدہ کی ایک ممتاز دیرینہ احمدی فیملی رہائش پذیر تھی۔ مرزا ناصر احمد کو پتہ نہیں کیا سوجھی کہ اس نے اپنے بیٹے مرزا لقمان احمد کا نکاح اس خاندان کے سربراہ کو باصرار راضی کر کے ان کی صاحبزادی سے کر دیا۔ یہ لڑکی ایک انتہائی شریف اور وضع دار خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ ''قصر خلافت'' میں آ گئی تو اس نے اپنے خاوند، اس کے والد مرزا ناصر احمد اور دیگر افراد خانہ کی اصل ''روحانیت'' اور ''احمدیت'' کا حقیقی عکس دیکھا تو اس کے لیے ایک پل بھی یہاں رہنا ناممکن ہو گیا۔ ناچار اس شریف زادی نے ساری داستان اپنے گھر والوں کو بتائی اور مرزا لقمان احمد سے طلاق لے لی۔

اس عرصہ میں ان کے ہاں ایک بیٹا تولد ہو چکا تھا۔ مرزا لقمان احمد نے مرزا ناصر احمد کی شہ پر اس بیٹے کو اغوا کر کے اسے فوری طور پر لندن سمگل کرنے کا منصوبہ بنایا اور اس کے لیے یہ نہ صرف پاسپورٹ تیار کروایا گیا بلکہ ویزہ بھی حاصل کر لیا گیا۔ لیکن ''خاندان نبوت'' سے ہی قریبی تعلق رکھنے والے ایک معروف و متمول شخص نے نہایت خاموشی سے یہ اطلاع درانی صاحب کو پہنچا دی اور وہ اپنے بچوں کو بڑی مشکل سے ربوہ سے نکالنے میں کامیاب ہوئے۔ اب یہ لڑکا رضوان پشاور کے ایک کالج میں زیر تعلیم ہے مگر ''خاندان نبوت'' کے غنڈے وہاں سے بھی اسے اغوا کرنے کے چکر میں رہتے ہیں مگر مقامی مسلمان طالب علموں، اساتذہ اور پرنسپل کی خصوصی نگہداشت کے سبب وہ ابھی تک اس میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ اس کی ایک وجہ رضوان کے عزیز و اقارب کا پوری طرح چوکس رہنا ہے۔ اگر وہ کہیں ربوہ میں ہی رہائش پذیر ہوتے تو پتہ نہیں قادیانی غنڈے ان کا کیا حشر کرتے اور اس بستی میں کوئی ایک شخص بھی سچی گواہی دینے کے لیے تیار نہ ہوتا۔

جب تک حکومت ربوہ کی رہائشی زمین کی (جو کراؤن لینڈ ایکٹ کے تحت کوڑیوں کے مول

لی گئی تھی) لیز ختم کر کے لوگوں کو مالکانہ حقوق نہیں دیتی اور وہاں کارخانے لگا کر روزگار کے مواقع پیدا نہیں کرتی، ایک ہی اقلیت کے تسلط کے باعث یہاں غنڈہ گردی ہوتی رہے گی اور قانون بے بس اور لاچار رہے گا۔

عروسہ گیسٹ ہاؤس

جنرل ضیاء الحق مرحوم کے زمانے میں ''خاندان نبوت'' کے معتوب امیدوار ''خلافت'' مرزا رفیع احمد کے ایک انتہائی قریبی عزیز پیر صلاح الدین جو بیوروکریسی میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز رہے ہیں، راولپنڈی میں عروسہ گیسٹ ہاؤس کے نام سے فحاشی کا ایک اڈہ چلاتے ہوئے پکڑے گئے، جس پر ان کا منہ کالا کیا گیا اور اس کی روسیاہی کی تصویریں تمام قومی اخبارات میں شائع ہوئیں۔ جس کو اس بارے میں کوئی شک ہو، وہ ''نوائے وقت'' اور ''جنگ'' کے فائلوں میں یہ تصویر دیکھ سکتا ہے۔

فیر چندہ کتھے دیاں گے

قادیانی امت نے ماڈرن گداگروں کا روپ دھار کر اپنے مریدوں کی جیبیں صاف کرنے کے لیے چندہ عام، چندہ جلسہ سالانہ، چندہ نشر و اشاعت، چندہ وصیت، چندہ تحریک جدید، چندہ وقف جدید، چندہ خدام الاحمدیہ، چندہ انصار اللہ، چندہ اطفال الاحمدیہ، چندہ بہشتی مقبرہ اور اس طرح کے بیسیوں دیگر چندے وصول کرنے کے لیے گداگری کے اتنے کشکول بنائے ہوئے ہیں کہ عام قادیانیوں سے جینے اور مرنے کا بھی ٹیکس وصول کر لیا جاتا ہے اور خود تو ''خاندان نبوت'' کے افراد اندرون ملک اور بیرون ملک عیاشانہ زندگی بسر کرتے ہیں لیکن اپنے مریدوں کو سادگی اور ''احمدیت'' اور ''اسلام'' کے فروغ کے لیے سادگی اختیار کرنے کی تلقین کرتے رہتے ہیں۔ اس مسلسل کنڈیشننگ کا یہ عالم ہے کہ عام قادیانی اسے بھی زندگی کا حصہ خیال کرنے لگ پڑتے ہیں۔ ماسٹر محمد عبداللہ ٹی آئی سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ انھیں اس بات کا یقینی اور قطعی علم ہو گیا کہ یہ مدرسہ خلیفہ جی اور ان کے حواریوں کو خام مال سپلائی کرنے کی نرسری ہے تو انھیں یہ باتیں زبان پر لانے کی پاداش میں جماعت سے ہی نہ نکالا گیا بلکہ مذہبی جاگیرداریت کا مظاہرہ کرتے ہوئے انھیں شہر بدر بھی کر دیا گیا۔

جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ پھر ''احمدیت'' پر ہی تین حرف بھیج دیں کیونکہ اس کے رہنماؤں کے احوال وظروف سے تو آپ کو بخوبی آگاہی ہو چکی ہے تو وہ کہنے لگے ''اے گل تے ٹھیک اے پر فیر چندہ کتھے دیاں گے؟''

لاہوری پارٹی کے سابق امیر مولوی صدرالدین نے جب وہ قادیان میں ٹی آئی ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے تو انھوں نے بھی اسی صورت حال کو ملاحظہ کیا تھا۔ ماسٹر عبداللہ اور مولوی صدرالدین نے

ایک دوسرے کو ملنا تو درکنار شاید دیکھنا بھی نہ ہو لیکن ان کے بیانات میں مطابقت قادیانیوں کے لیے قابل غور ہے۔

یادوں کا کارواں...... چند مزید جھلکیاں

آغا سیف اللہ مربی ''سلسلہ عالیہ احمدیہ'' جو کئی سال تک 87 سی ماڈل ٹاؤن لاہور میں ''تبلیغی فرائض'' انجام دیتے رہے ہیں۔ جامعہ احمدیہ میں تعلیم کے دوران ہی اپنے مخصوص ایرانی ذوق کی وجہ سے خاصے معروف تھے اور سیالکوٹ کے نواحی قصبے کے ایک دوسرے طالب علم نصیر احمد سے ربط وضبط کی وجہ سے رسوائی کی سرحدوں تک پہنچے ہوئے تھے۔ موخر الذکر کو قدرے بھاری سرینوں کی وجہ سے نصیر احمد ''ڈھولکی'' کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ آغا سیف اللہ نے میرے سامنے بوجوہ واضح طور پر یہ تو تسلیم نہیں کیا کہ ان کے نصیر احمد کے ساتھ تعلقات کی نوعیت کیا تھی لیکن اتنا ضرور بتایا کہ ایک دوسرے مربی صاحب داؤد احمد حنیف نے نصیر احمد سے ''کرم فرمائی'' کی استدعا کی تھی لیکن انھوں نے آغا صاحب کو بتا دیا، جس پر انھوں نے داؤد احمد حنیف کو خوب ڈانٹ ڈپٹ کی جو بالواسطہ اشارہ تھا کہ قادیانی امت کے قواعد وضوابط کے مطابق کسی دوسرے کی جولانگاہ میں اس طرح کا کھلا تجاوز درست نہیں۔ آخر اجازت لے لینے میں ایسی کون سی قباحت ہے۔

موصوف نے یہ بھی بتایا کہ وہ اپنے ایک ایم۔ ایس سی دوست سے بھی مسلسل فیض یاب ہوتے رہتے ہیں اور انھیں اس بات پر خصوصی حیرت ہے کہ مرد وزن اور دو مردوں کے درمیان جنسی مراسم میں کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ سارا پراسس بالکل ایک جیسا ہے۔ پھر پتہ نہیں لوگ ایک کو جائز اور دوسرے کو ناجائز کیوں سمجھتے ہیں؟ انھوں نے فن طفل تراشی کی کراہت کو کم کرنے کے لیے یہ بھی بتایا کہ مجید احمد سیالکوٹی مربی سلسلہ نے انھیں دوران تعلیم ہی ''سلوک'' کی ان منازل سے کچھ آگاہی بخشتے ہوئے کہا تھا کہ میر داؤد احمد آنجہانی سابق پرنسپل جامعہ احمدیہ جو ''حضرت مصلح موعود مرزا محمود احمد خلیفہ ثانی'' کے نہایت قریبی عزیز اور میر محمد اسحاق کے بیٹے تھے، انھیں بھی اس خاندانی علت المشائخ سے حصہ وافر ملا تھا اور موصوف (مجید احمد سیالکوٹی) کو افسر جلسہ سالانہ میر داؤد احمد کے ساتھ کئی سال تک پرنسپل اسسٹنٹ کے طور پر ڈیوٹی دیتے ہوئے بعض بڑے نادر تجربات ہوئے اور اسی تعلق میں انھوں نے یہ بھی بتایا ''ایسے ہی ایک موقع پر رات کے پچھلے پہر جب سب اپنی اپنی ڈیوٹی سے تھک ہار کر ستانے کے لیے لیٹے تو میر داؤد احمد نے میرے شجر حیات کو پکڑ کر اپنی رانوں کے درمیان رکھ لیا اور اسی عالم میں میں نے ان سے یہ وعدہ لیا کہ وہ مجھے اندرون ملک مربی بنا کر نہیں رکھیں گے بلکہ کسی بیرونی ملک میں بھجوا دیں گے اور پھر انھوں نے اپنا یہ وعدہ پورا کر دیا۔

راقم یہ گزارش کرنا ضروری سمجھتا ہے کہ مجھے فنون کثیفہ کی اس صنف کے ایک اور ماہر جامعہ احمدیہ کے پرانے طالب علم صادق سدھو نے بتایا کہ میر داؤد احمد انھیں تخلیہ میں بلا کر اکثر پوچھا کرتے تھے کہ تم سلسلہ اغلامیات کے یہ مرحلے کس طریقے سے طے کرتے ہو۔ اس پس منظر میں یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ ان کمزور لمحات میں اگر مجید احمد سیالکوٹی میر داؤد احمد سے کچھ اور بھی منوا لیتے تو شاید وہ اس سے بھی انکار نہ کرتے اور یوں قادیانی کام شاستر کے کچھ نئے آسن بھی سامنے آ جاتے۔

خیر یہ چند جملے تو یونہی طوالت اختیار کر گئے۔ تذکرہ ہو رہا تھا آغا سیف اللہ صاحب کا جو آج کل قادیانی امت کے ناقوس خصوصی ''الفضل'' کے پبلشر ہیں۔ انھوں نے راقم الحروف کو خود بتایا کہ ان کی اہلیہ جو ''خاندان نبوت'' سے بڑی عقیدت رکھتی ہیں، ایک مرتبہ خلیفہ ثانی کے اس ''حرم پاک'' سے ملنے گئیں جو بشریٰ مہر آپا کے نام سے معروف ہیں تو جب تکلفات سے بے نیاز ہو کر کھلی ڈلی گفتگو شروع ہوئی تو موصوفہ نے کسی لگی لپٹی کے بغیر کہا کہ ان کا تو رحم ہی موجود نہیں ہے۔ یہ رحم کس طرح ''معجزانہ'' طور پر غائب ہوا تھا اور عصمت کے اس ویرانے میں کس انداز میں ''رویا و کشوف'' کی چادر چڑھا کر اس معاملے کو ٹھپ کر دیا گیا اور اندھے مریدوں اور مجبور عقیدت مندوں سے اس پر کیونکر ''زندہ باد'' کے نعرے لگوائے گئے۔ اس اجمال کی کسی قدر تفصیل پہلے آ چکی ہے۔ اس لیے مزید طوالت سے اجتناب کرتے ہوئے اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے ورنہ یہ حقائق پر مبنی واقعات اتنے زیادہ ہیں کہ اگر انھیں پوری تفصیل سے لکھا جائے تو گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈز کے کئی ایڈیشن اسی کے لیے مخصوص ہو کر رہ جائیں۔

خدا گواہ ہے کہ جب میں نے حصول تعلیم کے لیے ربوہ کی سرزمین پر قدم رکھا تو میرے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات موجود نہ تھی کہ ''نبوت و خلافت'' کی جھوٹی رداؤں میں لپٹے ہوئے رویائے صادقہ اور کشوف کی دنیا میں ''سیر روحانی'' کا دعویٰ کرنے والے لاکھوں افراد سے ''دین اسلام'' کو اکناف عالم تک پہنچانے کے جھوٹے دعوے کر کے ان کی معمولی معمولی آمدنیوں سے چندے کے نام پر کروڑوں نہیں، اربوں روپیہ وصول کرنے والے اور انھیں نان جویں پر گزارہ کی تلقین کر کے خود ان کے مال پر گلچھرے اڑانے والے، اندر سے اس قدر غلیظ اس قدر گندے اور اس قدر ناپاک ہوں گے اور ایسی کسی تصوراتی لہر کا ذہن میں آ جانا فی الواقع ممکن بھی نہ تھا۔ کیونکہ میرے والد محترم فوج سے قبل از وقت ریٹائرمنٹ کے بعد نہ صرف یہ کہ خود قادیانیت کے چنگل میں پھنس چکے تھے، بلکہ انھوں نے میرے دو بڑے بھائیوں کو بھی قادیانیت کی جانی، مالی، لسانی، حالی اور قلمی خدمت کے لیے وقف کر رکھا تھا۔

ان حالات میں، میں نے ربوہ کی شور زدہ زمین پر قدم رکھا تو چند ہی دنوں میں میرے تعلقات ہر کہ و مہ سے ہو گئے اور ہمارے خاندان کی یہ اتنی بڑی احمقانہ ''قربانی'' تھی، جسے وہاں ''اخلاص'' سمجھا جاتا تھا اور اس کا برملا اعتراف کیا جاتا تھا۔ لیکن جوں جوں میرے روابط کا دائرہ پھیلتا گیا، اسی نسبت سے اس جبریت زدہ ماحول میں ربوہ کے باسیوں کی خصوصی اور دوسرے قادیانیوں کی عمومی بے چارگی اور بے بسی کا احساس میرے دل میں فزوں تر ہوتا گیا اور اس پر مستزاد یہ کہ ''خاندان نبوت'' کے تمام ارکان بالخصوص مرزا محمود احمد کے بارے میں ایسے ایسے ناگفتہ بہ انکشافات ہونے لگے کہ ذہن ان کو قبول کرنے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتا تھا کہ کہیں ایسا بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن جب میں نے پرانے قادیانیوں سے اس بارے میں مزید استفسار کیا تو پھر تو مشاہدات اور آپ بیتیوں کی ایک ایسی پٹاری کھل گئی کہ میری کوئی تاویل بھی ان کے سامنے نہ ٹھہر سکی اور میں اپنے مشاہدات کی جو یہ تعبیر کر لیتا تھا کہ خلیفہ صاحب کے خاندان کے لوگ اور ان کے اردگرد رہنے والے تو بدکردار ہیں، لیکن خود وہ ایسے نہیں ہو سکتے، وہ خود بخود ڈھا ہو کر رہ گئی۔

اس دوران قلب و ذہن، کرب و اذیت کی جس کیفیت سے گزر سکتا ہے، اس سے میں بھی پورے طور پر گزرا۔ اس لیے اگر کسی قادیانی کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ محض الزام تراشی اور بہتان طرازی صرف ان کا دل دکھانے کے لیے ہے تو وہ یقین جانے کہ بخدا ایسا ہرگز نہیں۔ یہ سارے دلائل تو میں بھی اپنے آپ کو مطمئن کرنے کے لیے دیتا رہا مگر دلائل کب مشاہدے اور تجربے کے سامنے ٹھہر سکے ہیں کہ یہاں ٹھہر جاتے۔ پھر سوچنے کی بات یہ بھی ہے کہ یہ الزامات لگانے والے کوئی غیر نہیں بلکہ خود قادیانی امت کے لیے جان اور مال کی قربانیاں دینے والے اور اپنے خاندانوں اور برادریوں سے اس کے لیے کٹ کر رہ جانے والے لوگ ہیں۔ کیا وہ محض قیاس اور سنی سنائی باتوں پر اتنا بڑا اقدام کرنے پر عقلاً تیار ہو سکتے ہیں ہرگز نہیں، ہرگز نہیں۔

انسان جس شخصیت سے ارادت وعقیدت کا تعلق رکھتا ہے، اس کے بارے میں اس نوع کے کسی الزام کے بارے میں وہ سوچ بھی نہیں سکتا اور اگر وہ ایسا کرنے پر تل جاتا ہے تو پھر سوچنا پڑے گا، کہ اس شخصیت سے ضرور کوئی ایسی اب نارمل بات سرزد ہوئی ہے کہ اس سے فدائیت کا تعلق رکھنے والے فرد بھی اس پر انگلی اٹھانے پر مجبور ہو گئے ہیں اور پھر یہ انگلی اٹھانے والے معمولی لوگ نہیں ہر دور میں خاندان نبوت کے یمین و یسار میں رہنے والے ممتاز افراد ہیں۔ مرزا غلام احمد کے اپنے زمانے میں مرزا محمود احمد پر بدکاری کا الزام لگا، جس کے بارے میں قادیانیوں کی لاہوری پارٹی کے پہلے امیر مولوی محمد علی کا بیان ہے کہ یہ الزام تو ثابت تھا مگر ہم نے شبہ کا فائدہ دے کر مرزا محمود احمد کو

بری کر دیا۔ پھر محمد زاہد اور مولوی عبدالکریم مباہلہ والے اور ان کے اعزہ اور اقرباء نے اپنی بہن سکینہ کے ساتھ ہونے والی زیادتی کے خلاف احتجاج کے لیے باقاعدہ ایک اخبار ''مباہلہ'' کے نام سے نکالا اور خلیفہ صاحب کے اشارے پر میر قاسم علی جیسے چھٹ بھئیوں نے ان کے خلاف مستریاں مشین سویاں ایسی طعنہ زنی کر کے اصل حقائق کو چھپانے کی کوشش کی اس کے بعد مولوی عبدالرحمٰن مصری، عبدالرزاق مہتہ، مولوی علی محمد اجمیری، حکیم عبدالعزیز، فخرالدین ملتانی، حقیقت پسند پارٹی کے بانی ملک عزیز الرحمٰن صلاح الدین ناصر بنگالی مرحوم اور دور سے بے شمار لوگ وقتاً فوقتاً مرزا محمود احمد اور ان کے خاندان پر اسی نوعیت کے الزام لگا کر علیحدہ ہوتے رہے اور بدترین قادیانی سوشل بائیکاٹ کا شکار ہوتے رہے۔

ملازمتوں سے محروم اور جائیدادوں سے عاق کیے جاتے رہے۔ مگر وہ اپنے موقف پر قائم رہے۔ کیا محض یہ کہہ کر کہ یہ قریب ترین لوگ محض الزام تراشی کرتے رہے، اصل حقائق پر پردہ ڈالا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی ماں پر بدکاری کا الزام لگاتا ہے، درست نہ ہوگا۔ یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ اس کی ماں نے گول بازار کے کس چوراہے میں بدکاری کی ہے کہ خود اس کے بیٹے کو بھی اس کے خلاف زبان کھولنا پڑی ہے۔ جس رفتار سے ان واقعات سے پردہ اُٹھ رہا تھا، اسی سرعت سے میرے اعتقادات کی عمارت بھی متزلزل ہو رہی تھی اور میری زبان ایک طبعی ردعمل کے طور پر ربوہ کے اس دجالی نظام کی قلعی کھولنے لگ پڑی تھی اور اس خباثت کو نجابت کہنے کے لیے تیار نہ تھی۔ مرزا محمود احمد بارہ سال کے بدترین فالج کے بعد جہنم واصل ہوا تو ربوہ کے قصر خلافت میں جس دو جانب کھلنے والے کمرے میں اس کی لاش رکھی ہوئی تھی، میں بھی وہاں موجود تھا اور میرے دو ساتھی فضل الٰہی اور خلیل احمد، جواب مربی ہیں، بھی میرے ساتھ ہاکیاں لیے وہاں پہرہ دے رہے تھے۔ میں نے مرزا محمود احمد کو انتہائی مکروہ حالت میں پاگلوں کی طرح سر مارتے اور کرسی پر ایک جگہ سے دوسری جگہ اسے لے جاتے ہوئے کئی مرتبہ دیکھا تھا۔ ربوہ کی معاشی نبوت پر پلنے والے اس حالت میں بھی اس کی ''زیارت'' کے نام پر لوگوں سے پیسے بٹورتے رہتے تھے اور کہتے تھے کہ بس گزرتے جائیں، بات نہ کریں۔ حسب توفیق نذرانہ دیتے جائیں۔ اس دور میں اس کے جسم کی ایسی غیر حالت تھی کہ بیوی بچے بھی انھیں چھوڑ چکے تھے اور سوئٹزر لینڈ سے منگوائی گئی نرسیں بھی دو ہی ہفتے کے بعد بھاگ کھڑی ہوئی تھیں۔ لیکن اب تو وہاں تراشی ہوئی داڑھی والا اور ابٹن و زیبائش کے تمام لوازمات سے بری طرح تھوپا گیا ایک لاشہ پڑا تھا۔

میں نے مذکورہ بالا دونوں نوجوانوں کو کہا کہ یار کل تک تو اس چہرے پر بارہ بجے ہوئے

تھے مگر آج اس پر بڑی محنت کی گئی ہے تو ان میں سے موخر الذکر کہنے لگا ''توں ساڈا ایمان خراب کر کے چھڈیں گا۔'' یہ دونوں اپنی ''پختہ ایمانی'' کی بنا پر ابھی تک قادیانیت کا دفاع کر رہے ہیں لیکن میں نے اس ایمان کو ذہنی طور پر اسی وقت چناب کی لہروں کے سپرد کر دیا تھا۔

مرزا ناصر احمد کو ایک مخصوص پلاننگ کے تحت خلافت کے منصب پر بٹھایا گیا تو اس نے دوسرے امیدوار مرزا رفیع احمد پر عرصہ حیات تنگ کر دیا۔ اس سے ملنے جلنے والوں اور تعلق رکھنے والوں کو ملازمتوں سے محروم کرنے اور ربوہ بدر کرنے کے احکامات جاری ہونے لگے اور یہ سلسلہ اس حد تک بڑھا کہ گدی نشینی کی اس جنگ میں ہزاروں افراد اور ان کے خاندان خواہ مخواہ نشانہ بن گئے۔ سوشل بائیکاٹ کا شکار ہوئے، یہ لوگ اپنی برادریوں سے مرزا غلام احمد کو نبی مان کر اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کے جنازوں اور شادیوں تک میں شرکت کو حرام قرار دے کر ان سے پہلے ہی علیحدہ ہو چکے تھے۔ اس لیے ان کے لیے نہ جائے ماندن، نہ پائے رفتن والی کیفیت پیدا ہوگئی۔ ربوہ میں رہائشی زمین کسی کی ملکیت نہیں ہوتی اور صدر انجمن احمدیہ جو مرزا غلام احمد کے خاندان کی گھریلو کنیز اور ذاتی تنظیم ہے، وہ کسی بھی وقت ''باغیوں'' کو رہائش سے محروم کر دیتی ہے اور ان کی بڑی تعداد پھر اس خوف سے کہ وہ اس مہنگائی کے دور میں سر کہاں چھپائیں گے، دوبارہ ''خلیفہ خدا بناتا ہے'' کی ڈگڈگی پر رقص کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس دور میں بھی یہی کچھ ہوا۔

ان دنوں میں اقتدار کی اس کشمکش کو بہت قریب سے اور بہت غور سے دیکھ رہا تھا لیکن اس دور میں میرا عقائد و نظریات کے حوالے سے قادیانی امت سے کوئی بنیادی اختلاف نہ تھا اور ایک روایتی قادیانی کی طرح میں اتنا ہی غالی تھا جتنا کہ ایک قادیانی ہوسکتا ہے۔ فرق صرف یہ تھا کہ میں غالباً اپنی والدہ محترمہ کی تربیت کے زیر اثر قادیانیوں کے اس عمومی طریق استدلال کا سخت مخالف تھا، جس کے تحت وہ مرزا غلام احمد اور اس کی اولاد کا معمولی معمولی باتوں میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے موازنہ شروع کر دیتے تھے اور میری اس پر بے شمار لڑائیاں ہوئیں۔

قادیانیوں کی اس بارے میں دریدہ ذہنی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کا ایک بااثر مولوی جو آج کل اپنی اسی خناسیت کی وجہ سے گھٹنوں کے درد سے لاچار ہے، کہا کرتا تھا کہ خاتم النبیین کی طرز پر ایسی ترکیبیں اس کثرت سے زوردار طریقے سے رائج کرو کہ اس ترکیب کی (نعوذ باللہ) کوئی اہمیت ہی نہ رہے۔

یاد رہے کہ میری والدہ محترمہ میرے والد کے بے حد اصرار کے باوجود قادیانیت کے جال میں نہیں پھنسیں اور میں نے کبھی ایک مرتبہ بھی ان کی زبان سے مرزا غلام احمد یا اس کے کسی نام نہاد

خلیفہ کا نام تک نہیں سنا۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ میں پانچ وقت نماز پڑھتی ہوں، حکم خداوندی ادا کرتی ہوں، تہجد بھی پڑھتی ہوں، اللہ تعالیٰ کی راہ میں صدقہ و خیرات بھی میرا معمول ہے۔ اگر اس کے باوجود خدا تعالیٰ مجھے نہیں بخشتا تو نہ بخشے۔ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کسی کو نبی نہیں مان سکتی۔

مرزا ناصر احمد کی گدی نشینی کے سلسلے میں جب ہارس ٹریڈنگ شروع ہوئی تو میں نے اس پر سخت تنقید کرتے ہوئے احتجاج کیا اور اپنی محفلوں میں اس پر خوب کھل کر تبصرے کیے۔ ایک موقع پر ہمارے ایک جھنگوی دوست نے مجھ سے پوچھا کہ اگر کسی دوسرے پیر کے بیٹے اور پوتے اس کے بعد گدی پر بیٹھ جائیں تو ہم اسے گدی کہتے ہیں لیکن مرزا غلام احمد کے بیٹے اور پوتے یہی کام کر لیں تو یہ خلافت کیوں کہلاتی ہے تو میں نے اسے کہا کہ جس طرح عام آدمی کو آنے والا خواب، خواب ہوتا ہے اور خلیفہ جی کو آنے والا خواب ''رویا'' ہوتا ہے، اسی طرح یہ گدی خلافت ہوتی ہے۔ مرزا ناصر احمد کے جاسوسوں نے فوراً اسے اس بات کی خبر کر دی اور وہ بہت چراغ پا ہوئے اور ایک اجتماعی ملاقات میں میرے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے اس نے مجھے دھمکی دی کہ آپ کوئی بات نہیں مانتے۔ آپ کو خیال رکھنا چاہیے۔ میں اسی لحظہ سمجھ گیا کہ اب مرزا ناصر احمد کے تلوے جلنے لگے ہیں اور وہ کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے میرے خلاف اقدامات کریں گے۔ اسی دوران ایک اور واقعہ ہوا کہ میں لیہ میں مقیم تھا کہ بیت المال کا ایک کلرک جسے ربوہ کی زبان میں انسپکٹر بیت المال کہتے ہیں، میرے پاس ٹھہرا اور آزادانہ بات چیت کے دوران اس نے مجھے اندرونی حال بتاتے ہوئے کہا کہ خاندان والے خود تو کوئی چندہ نہیں دیتے لیکن ہمارے حقیر معاوضوں میں سے بھی چندہ کے نام پر جگا ٹیکس کاٹ لیتے ہیں۔ ان دنوں مرزا ناصر احمد کسی دورے پر افریقہ یا کسی دوسرے ملک گیا ہوا تھا۔ میں نے کہا اگر تم ایسے ہی دل گرفتہ ہو تو دعا کرو کہ اس کا جہاز کریش ہو جائے۔ اس آدمی نے یہ بات توڑ مروڑ کر لیہ کے مقطوع النسل امیر جماعت فضل احمد کو بتائی تو اس نے نمبر بنانے کے لیے مرزا ناصر احمد کو فوری رپورٹ دی کہ شفیق تو تمہارا جہاز کریش ہونے کی دعا کرتا ہے۔ مرزا ناصر کو یہ بات سن کر آگ لگ گئی۔ مجھے فوراً واپس بلایا گیا۔ سو پہلے تو ربوہ کے ڈی آئی جی عزیز بھانبڑی اور اس کے گماشتوں کے ذریعے قادیانی غنڈے میرے پیچھے لگائے گئے مگر میں پھر بھی باز نہ آیا تو ربوہ کی تمام عبادت گاہوں میں میرے سوشل بائیکاٹ کا اعلان کر دیا گیا اور پاکستان کی تمام جماعتوں کے افراد کو خطوط کے ذریعے بھی اس کی اطلاع کر دی گئی اور مرزا ناصر احمد نے اس پر ایک پورا خطبہ بھی دے ڈالا جو آج تک شائع نہیں ہوا۔

میرا مزید ناطقہ بند کرنے کے لیے میرے دو بڑے بھائیوں سے تحریری عہد لیا گیا کہ وہ

مجھ سے کوئی تعلق نہ رکھیں گے سو انھوں نے بھی مجھے نقصان پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور میرے آبائی گھر پر تسلط جما کر مجھے وہاں سے بھی نکال دیا۔ یہ واقعات صرف مجھ پر ہی نہیں بیتے اور سینکڑوں نہیں، ہزاروں افراد اس صورت حال سے دوچار ہوئے ہیں مگر کسی حکومت نے، انسانی حقوق کی کسی تنظیم نے اس پر آواز احتجاج بلند نہیں کی۔ کسی عاصمہ جہانگیر، آئی اے رحمان نے ان لوگوں کے بنیادی شہری اور انسانی حقوق کی بحالی اور ان کو پہنچائے جانے والے نقصان کی تلافی کے لیے آواز نہیں اٹھائی مگر کسی قادیانی کے پاؤں میں کانٹا بھی چبھ جائے تو شور مچا دیا جاتا ہے۔

ایک طرف تو یہ صورت حال تھی تو دوسری طرف بڑے بڑے قادیانی عہدیدار مجھے ''حضور'' سے معافی مانگ لینے کی تلقین کر رہے تھے لیکن میں قضیب احمر کو کسی بھی صورت میں گاجر کہنے کے لیے تیار نہ ہوا تو قادیانیوں نے لاہور میں میری رہائش گاہ پر آ کر مجھے قتل کرنے اور سبق سکھا دینے کی دھمکیاں دیں۔ لاہور میں بہترین مکان خرید کر دینے کی پیشکش بھی ہوئی مگر میں اس ترغیب و ترہیب کے بھرے میں نہ آیا۔ قادیانی امت کا رنج اس بات سے مزید بڑھ گیا تھا کہ میرا اختلاف اب انگریز کے خود کاشتہ پودے کے صرف اعمال ہی سے نہیں تھا، نظریات سے بھی تھا اور میں مرزا غلام احمد کی ظلی، بروزی، لغوی اور غیر تشریعی نبوت پر لعنت بھیج کر مکمل طور پر آنحضرتؐ کے سبز پرچم کے نیچے آ چکا تھا۔ مرزا ناصر احمد کی گدی نشینی کے عہد میں ان کے مختلف مغلیٔ مشاغل کی کہانیاں ٹی آئی کالج سے لے کر ربوہ کے ہر اس گھر تک پھیلی ہوئی تھیں، جہاں کسی خوش رو کا بسیرا تھا اور اس طرح ''خاندان نبوت'' کی دوسری کلیاں بھی اپنے اپنے ذوق کا سامان کرنے کی وجہ سے گوناگوں کہانیوں کی زد میں تھیں۔ لیکن مرزا ناصر احمد کے سینکڑوں کبوتروں کو ٹی آئی کالج کی رہائش گاہ سے ''قصر خلافت'' منتقل کرنا ان کے آزاد کر دینے کا معاملہ خاصے دنوں تک ایک مسئلہ بنا رہا اور مولوی تقی نے اس پر بڑا دلچسپ تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ مغل کوئی ''بازی'' ترک کرنے پر تیار نہیں ہوتے۔

ایک دن مرزا ناصر احمد کے ''فیض جسمانی'' کے کرشموں کا بیان جاری تھا اور جو دھامل بلڈنگ میں واقعہ دواخانہ نور الدین میں حکیم عبدالوہاب بڑے مزے لے کر سنا رہے تھے کہ صاحبزادہ صاحب نے کس طرح ریلوے کے ایک کانٹے والے کی لڑکی ثریا کو اس کے باپ کی غیر موجودگی میں خود اس کے ریلوے کوارٹر میں جا لتاڑا۔ ابھی یہ حکایت ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ الشرکہ الاسلامیہ والی پرانی بلڈنگ کے مالک حکیم صاحب کو ملنے کے لیے آ گئے اور باتوں باتوں میں احمدیت کی مخالفت کرنے والوں کو ذلیل و خوار ہونے کے واقعات کا تذکرہ شروع ہو گیا اور تمام اکابر مسلمانان پاک و ہند کو پیش آنے والے مبینہ مصائب کو احمدیت کی مخالفت کی سزا قرار دے کر ''احمدیت'' کی سچائی ثابت کی

جانے لگی۔

جب حکیم صاحب کے پرانے شناسا اس نووارد نے یہ داستان ختم کی تو حکیم صاحب نے بڑی آہستگی سے کہا کہ وہ آپ کی بیٹی کے ساتھ جو کچھ کیا گیا تھا، اس کے بعد بھی آپ ربوہ میں ہی رہ رہے ہیں تو میں حیران رہ گیا کہ ایک طرف تو وہ ''احمدیت'' کے مخاصمت پر مخالفین کو پہنچنے والے نقصانات اور آلام ومصائب کو اپنے مسیح موعود اور مصلح موعود کی ''کرامات'' کے طور پر پیش کررہا تھا، مگر جونہی اس نے حکیم صاحب کی زبان سے یہ الفاظ سنے تو اس کی آنکھیں بھرا گئیں اور وہ گلوگیر آواز میں کہنے لگا حکیم صاحب انسان زندگی میں مکان ایک بار ہی بنا سکتا ہے اور پھر اب تو بچے بھی جوان ہوگئے ہیں۔ ان کی شادیوں کا مسئلہ بھی ہے۔ برادری سے پہلے ہی قطع تعلق کر چکے ہیں۔ اب جائیں تو جائیں کہاں! دواخانہ نور الدین کے انچارج اکرم بھی اس محفل میں موجود تھے۔ وہ اس روایت کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ محمد علی سبزی فروش کا المناک قتل بھی ربوہ میں مرزا ناصر احمد کے عہد میں ہی ہوا اور اس کی بھی سب سے بڑی وجہ یہی تھی کہ چونکہ اس کا ''خاندان نبوت'' کے گھروں کے اندر آنا جانا تھا اور وہ راز ہائے درون خانہ کو بیان کرنے میں بھی کسی حجاب سے کام نہیں لیتا تھا۔ اس لیے بری طرح ذبح کر دیا گیا مگر ''نیک اور پاکباز'' لوگوں کی اس بستی کے کسی ایک فرد نے بھی اس قتل کے راز سے پردہ اٹھانے کی جرات نہ کی۔

یوں تو قادیانیت امت کے بزرجمہر مرزا محمود احمد کے زمانے ہی سے سیاست کا کھیل بھی کھیلتے رہے ہیں لیکن 1953ء کی مجاہدانہ تحریک نے ان کو بڑی حد تک محدود کر کے رکھ دیا اور مرزا محمود احمد نے ان تمام اسلامی اصطلاحات کا استعمال ترک کرنے کا عہد کر لیا، جو امت مسلمہ کے لیے اذیت کا موجب بنتی رہی ہیں لیکن وہ قادیانی ہی کیا ہوا جو اپنی بات پر قائم رہ جائے۔ جونہی حالات بدلے، مرزا محمود احمد نے بھی گرگٹ کی طرح پینترا بدل لیا اور دوبارہ وہی پرانی ڈگر اختیار کر لی۔ مرزا محمود احمد اس کے جلد ہی بعد ڈاکٹر ڈوئی کی طرح عبرتناک فالج کی گرفت میں آیا تو مرزا ناصر احمد نے، جس کے لیے اس کا ساحر والد جماعت کو اپنے خطوط کی ابتداء میں ھوالناصر لکھنے کی تلقین کر کے راہ ہموار کر چکا تھا، اور پھر عیسائی طریقے کے مطابق اپنے حواریوں کی ایک منڈلی کے ذریعے اپنے آپ کو ''منتخب'' کروا لیا، کھل کر پر پرزے نکالنے شروع کر دیے۔ اس کے بعد مرزا طاہر احمد نے اپنی گیم آف نمبرز میں مرزا رفیع احمد کو مات دے کر اور مرزا لقمان احمد کے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی کر کے گدی نشینی کے لیے اپنا راستہ بنایا۔ ذوالفقار علی بھٹو کو آگے لانے میں قادیانی امت نے قریباً 16 کروڑ روپیہ صرف کیا اور اپنے تمام تنظیمی اور دوسرے وسائل اس کے لیے استعمال کیے۔ اس عہد میں مرزا

طاہر احمد صاف طور پر سیکنڈ ان کمان بن کر سامنے آیا اور جماعت میں یوں تاثر دیا جانے لگا کہ اب احمدیت کا غلبہ ہوا ہی چاہتا ہے اور کوئی اس کو روک نہیں سکتا لیکن جب آٹھویں عشرے کے اوائل میں تحریک ختم نبوت پوری قوت سے دوبارہ ابھری اور ذوالفقار علی بھٹو نے ہی ان کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا عظیم الشان کارنامہ انجام دیا تو قادیانی اپنے ہی زخموں کو چاٹ کر رہ گئے۔

پروفیسر سرور مرحوم نے ایک دفعہ بتایا کہ تحریک ختم نبوت کے ایام میں قادیانیوں نے ایک وفد خان عبدالولی خان سے ملنے کے لیے بھیجا اور جس وقت اس نے خان صاحب سے ملاقات کی، میں بھی وہیں پر موجود تھا۔ جب قادیانیوں نے بھٹو کو لانے میں اپنی خدمات کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ وہ ہمارا ساتھ چھوڑ گیا ہے، اس لیے آپ ہمارا ساتھ دیں اور اپنے سیکولر نظریات کے حوالے سے اس تحریک کے پس منظر میں ہمارے حق میں آواز اٹھائیں تو خان عبدالولی خاں نے بے ساختہ کہا بھئی باچا خان کا بیٹا اتنا بے وقوف نہیں ہے کہ جس بھٹو کو لانے کے لیے تم نے 16 کروڑ روپیہ خرچ کیا ہے، اس مسئلہ میں اس کی مخالفت کر کے خواہ مخواہ امت مسلمہ کی مخالفت مول لے لے۔

تحریک ختم نبوت کے دنوں میں آغا شورش مرحوم کے ہفت روزہ ''چٹان'' میں بڑی باقاعدگی سے کبھی اپنے نام سے اور کبھی کسی قلمی نام سے قادیانی امت کے بارے میں لکھا کرتا تھا۔ آغا صاحب کے پاس یوں تو آنے جانے والوں کا عام دنوں میں بھی تانتا بندھا رہتا تھا لیکن اس دوران تو وہاں سیاست دانوں، علماء اور دانش وروں کی آمد ایک سیلاب کی صورت اختیار کیے ہوئے تھی۔ آغا صاحب ہر قابل ذکر آدمی کو کہتے تھے کہ بھئی یہ کام صرف اور صرف ذوالفقار علی بھٹو ہی کر سکتا ہے۔ اس لیے تمام سیاسی اختلافات بالائے طاق رکھ کر اس کام کے لیے اس کی حمایت کریں۔ پھر جوں جوں وقت گزرتا جائے گا، اس فیصلے کے اثرات اپنا رنگ دکھانا شروع کر دیں گے اور قادیانی اپنے ہی زہر میں گھل گھل کر مر جائیں گے۔ یہ چند باتیں تو یونہی جملہ معترضہ کے طور پر آ گئیں۔ بیان ''خاندان نبوت'' میں ہونے والی جنگ اقتدار کا ہو رہا تھا۔ مرزا طاہر احمد کی جانب سے مرزا ناصر احمد سے رشتہ کو مضبوط کر لینے کے بعد اس کی لابی بہت مضبوط ہو چکی تھی اور مرزا رفیع احمد کے خلاف چھوٹی چھوٹی اور معمولی شکائتیں کر کے اس نے اپنا مقام مرزا ناصر احمد کی نظروں میں خوب بنا لیا تھا۔ اس لیے جب مرزا ناصر احمد ایک نوخیز دوشیزہ کو ''ام المومنین'' بنا کر راہی ملک عدم ہوئے تو مرزا طاہر احمد کی گدی نشینی میں کوئی روک باقی نہ رہی اور اس نے اقتدار کی باگ ڈور سنبھال کر تمام وہ حربے اختیار کیے، جو اورنگ زیب نے اپنے والد اور بھائیوں کے خلاف استعمال کیے تھے۔ اس ماحول میں پلنے والا مرزا طاہر احمد کس قدر نیک اور پاکباز ہو سکتا ہے، اس کا اندازہ صرف اس ایک مثال سے ہو سکتا ہے، کہ

ربوہ میں تعلیم کے دوران ہی مجھے محمد ریاض سکنہ عالم گڑھ ضلع گجرات نے جو اب فوج میں ہیں، نے ایک چوکیدار کے حوالے سے بتایا کہ میاں طاہر روزانہ نماز فجر پڑھنے کے بعد ولی اللہ شاہ سابق ناظر امور عامہ کے گھر جاتا ہے اور اس کی لڑکیوں کو سینے کے گنبدوں سے پکڑ کر اٹھاتا ہے اور آخری فقرہ پنجابی میں خود چوکیدار ہی کی زبان میں صحیح مفہوم ادا کرتا ہے کہ ''اوہ حرامزادیاں وی لیریاں ہو کے پیاں رہندیاں نیں۔''

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ قصہ یہیں تمام ہوا۔ یہ تو ایک ایسا شہر طلسمات ہے کہ اس کا ہر حصہ طلسم ہوشربا کو بھی شرما کر رکھ دینے والا ہے اور بیدی کا یہ جملہ بلاشبہ اپنے اندر بے پناہ صداقت لیے ہوئے ہے کہ ''بڑے گھرانوں کی غلاظتیں بھی بہت ہی بڑی ہوتی ہیں۔''

قادیانی امت کے رہنماؤں کی بداعمالیوں کے بارے میں جب میں حق الیقین کے مرتبے پر پہنچ گیا تو میں نے دنیا بھر کے مسلمان دانشوروں کی چیدہ چیدہ کتب کا بغور مطالعہ شروع کیا کہ قادیانیوں کے اعمال کے بعد ان کے افکار و نظریات کی صحت کا بھی جائزہ لوں تو چند ہی دنوں میں قادیانی افکار و نظریات کا علمی و عقلی بودا پن بھی مجھ پر روز روشن کی طرح واضح ہو گیا اور خاص طور پر فلسفی شاعر علّامہ ڈاکٹر اقبال کے نہرو کے نام خطوط اور تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کے مطالعہ سے میرا ایمان اس بات پر چٹان کی طرح پختہ ہو گیا کہ ختم نبوت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی انٹرنیشنل فکر ہے اور اس کی علت غائی یہ ہے کہ تمام مذاہب کے ماننے والوں کو وحدت خداوندی اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے کے ایک نکتے پر اکٹھا کیا جائے اور اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات اور صفات میں واحد ہے۔ اس لیے اس نے ہر شعبہ حیات میں اپنے انداز میں وحدت کا ایک سفر شروع کر رکھا ہے۔

مذاہب کی دنیا میں اس نے حضرت آدم علیہ السلام سے اس سفر کا آغاز کیا اور جب تک دنیا سفری و مواصلاتی اعتبار سے اس رنگ میں رہی کہ ہر گاؤں، ہر قریہ اور ہر بستی اپنی جگہ ایک الگ دنیا کی حیثیت رکھتی تھی تو ان لوگوں کی طرف قومی اور زمانی نبی تشریف لاتے رہے لیکن جب علم الٰہی کے مطابق حضرت خاتم الانبیاءؑ کے زمانے میں دنیا کا سفر گلوبل ولیج کی جانب شروع ہوا تو اللہ تعالیٰ نے تمام سابق انبیاء کرام کی اصولی تعلیم کو قرآن کریم میں جمع کر کے اسے خاتم الکتب بنا دیا اور ان کے اوصاف اور خوبیوں کو نہایت ارفع و اعلیٰ شکل میں حضورؐ کی ذات مبارک میں جمع کر کے انھیں خاتم النبیین کے منصب پر سرفراز کر دیا۔ اس لیے جس طرح خاتم الکتب قرآن مجید کے بعد کسی دوسری کتاب کا تصور نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح خاتم النبیین کے بعد کسی دوسرے نبی کا تصور نہیں کیا جا سکتا اور اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو وہ خدا تعالیٰ کے وحدت ادیان، وحدت انبیاء، وحدت کتب، وحدت

انسانیت، وحدت کائنات اور وحدت النفس و آفاق کے اس پروگرام کو ڈائنامیٹ کرنا چاہتا ہے، جو اس نے حضرت آدم سے شروع کیا اور ایسا ہونا ناممکن ہے۔

ان چند سطور کی روشنی میں قادیانیوں کو خود سمجھ لینا چاہیے کہ وہ کتنی گمراہ کن، کتنی خوفناک اور کتنی تباہ کن منزل کی طرف جا رہے ہیں اور اس میں مرزا غلام احمد اور اس کے نام نہاد نظریات کی حیثیت کیا ہے؟ ان نظریات کو سمٹتے اور مٹتے ہوئے ہم خود دیکھ رہے ہیں۔ ان کا مٹنا اور پرچم ختم نبوت کی سربلندی تقدیر خداوندی ہے اور اسے دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی طاقت نہیں روک سکتی۔ قادیانیت تو ویسے ہی اب فرنگ کی متروکہ رکھیل بن کر رہ گئی ہے جس کے منہ میں دانت ہے نہ پیٹ میں آنت۔ اس لیے اب محض نعرے بازی اور ترقی کا پروپیگنڈا اسے زندہ نہیں رکھ سکتا۔ عملی طور پر بھی اس نے امت مسلمہ کے انتشار میں اضافہ کرنے اور مختلف مذاہب کے بانیوں کے خلاف انتہائی غلیظ زبان استعمال کر کے ان کی باہمی مناقشت کو تیز کرنے کا ''فریضہ'' ہی انجام دیا ہے۔ اس لیے ہر صحیح الفکر آدمی یہ سمجھ رہا ہے کہ جس نام نہاد نبی نے اپنی 86 سے زائد کتب میں برطانوی حکومت کے خلاف ایک لفظ تک نہیں لکھا اور محض اس کی مدح کے قصیدے ہی لکھے ہیں وہ کیا کسر صلیب کر سکتا ہے اور جلد ہی یہ بات قادیانیوں کی سمجھ میں بھی آ جائے گی اور اب مرزا طاہر احمد کو بھی اپنے دادا کی سنت پر عمل کرتے ہوئے ''ستارہ قیصرہ'' کی طرز پر کوئی تحفہ شہزادہ چارلس کے نام سے کوئی قصیدہ مدحیہ لکھ دینا چاہیے تاکہ ''کسر صلیب'' کا جو کام مرزا غلام احمد کے ہاتھوں نامکمل رہ گیا ہے، وہ مکمل ہو جائے اور قادیانیت کے مذہبی بیگار کیمپ میں غلامی کی زندگی بسر کرنے والے جو ''ہاری'' ایک عرصہ سے یہ راگ الاپ رہے ہیں ؎

جب کبھی بھوک کی شدت کا گلہ کرتا ہوں
وہ عقیدوں کے غبارے مجھے لا دیتے ہیں

ان کی اشک شوئی کا بھی شاید کوئی اہتمام ہو جائے اگرچہ یہ امکانات بہت ہی دور دراز کے ہیں کیونکہ جس امت کے نام نہاد نبی کے لیے حقیقت الوحی کے ڈیڑھ سو کے قریب ''الہامات'' میں سے سو سے اوپر صرف دس روپے کی آمد کے بارے میں ہیں، ان کی دنائت سے اچھی امید کیونکر کی جا سکتی ہے۔ ہاں البتہ یہ کام پاکستان کے انسانیت نواز حلقوں کا ہے کہ وہ اس معاملہ کو ایمنسٹی انٹرنیشنل، ایشیا واچ اور انسانی حقوق کی دوسری تنظیموں کے سامنے اٹھائیں اور قادیانیوں کے اس پروپیگنڈے کا توڑ کریں جو وہ بیرونی دنیا کے سامنے، پاکستان میں اپنے اوپر ہونے والے مصنوعی مظالم کے حوالے سے کر رہے ہیں۔

زیڈ۔اے۔سلہری

دام ہمرنگ زمین سے رہائی

میں سیالکوٹ میں ایک نچلے متوسط گھرانے میں 6 جون 1913ء کو پیدا ہوا۔ سیالکوٹ میں جو سال میں نے گزارے، وہ کسی طور پر غیر معمولی نہ تھے۔ پھر میری ایک بہن کی شادی قرار ہونی پائی، تو میں نے لفظ قادیان سنا۔ معلوم ہوا کہ میرے والد سالانہ جلسے پر قادیان گئے تھے اور وہاں کسی صاحب سے میری بہن کی نسبت کر آئے ہیں۔ مجھے شادی کا اچھی طرح یاد نہیں، لیکن کچھ عرصے بعد میری بہن سیالکوٹ سے چلی گئیں۔ اس سے اگلا واقعہ یہ ہوا کہ ہم سب خود قادیان چلے آئے، ہوا یوں کہ والد صاحب غالباً حیدر آباد دکن جا رہے تھے اور انھوں نے فیصلہ کیا کہ ہم سیالکوٹ میں رہنے کی بجائے قادیان چلے جائیں، وہاں ہماری بہن بھی ہوگی، چنانچہ ہم قادیان چلے آئے اور میں وہاں تعلیم الاسلام ہائی سکول کی تیسری جماعت میں داخل ہو گیا۔

اب مجھے معلوم ہوا کہ والد صاحب ''احمدی'' ہیں۔ یہی نہیں، بلکہ انھوں نے میری والدہ کے خاندان کو بھی ''احمدیت'' سے منسلک کروا دیا ہے۔ میں نے قادیان ہی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا، اس کا مطلب ہے کہ میں قریباً آٹھ سال تک قادیان میں رہا۔ میرا یہ وقت کم وبیش نیم مدہوشی میں گزرا۔ مجھے سوائے تعلیم اور کھیل کے کسی اور چیز سے دلچسپی نہ تھی۔

اب جو قادیان کی زندگی پر غور کرتا ہوں تو وہ عجب عالم بے خبری میں گزری معلوم ہوتی ہے۔ بیشک جیسے جیسے میری عمر بڑھتی گئی، مجھے محسوس ہوتا گیا کہ قادیان کوئی معمولی قصبہ یا گاؤں نہیں۔ وہاں بعض اوقات، سالانہ جلسے کے دنوں میں، جو دسمبر کی آخری تاریخوں میں منعقد ہوتا، خاص گہما گہمی ہوتی، باہر سے ہزاروں لوگ آتے، ہم لڑکے مہمانوں کی خدمت پر بھی مامور ہوتے، ان دو مشاغل تعلیم اور کھیل نے میرے ذہن میں کسی اور شوق و استغراق کے لیے جگہ نہیں چھوڑی، میں دوسرے لڑکوں کے ساتھ مذہبی ارکان بجالاتا، لیکن میں قادیانیت کے انوکھے مفہوم سے ناواقف رہا۔ میں نے اکثر خلیفہ محمود احمد کا خطبہ جمعہ سنا، ان کی باتوں سے مترشح ہوتا تھا کہ قادیانی کوئی خاص مخلوق ہیں۔ ''ہم زندہ مسلمان ہیں، غیر احمدی مسلمان مردہ ہیں'' ان کا خاص موضوع ہوتا اور کبھی قادیان

سے باہر جانے کا اتفاق ہوتا تو اس نعرے کی صدائے بازگشت سنائی دیتی اور میں دوسرے مسلمانوں کو دیکھتا کہ وہ کس اعتبار سے ہم سے پیچھے ہیں، لیکن جہاں مذہبی طور پر مجھ میں قادیانیت کے متعلق خاص تیقن نہ پیدا ہوا تھا، وہاں ادبی طور پر میرا ذوق پختہ ہو رہا تھا، مجھے انگریزی کے علاوہ اردو سے بہت شغف تھا...... اسی دوران مجھے علامہ اقبالؒ کے کلام سے شناسائی ہوئی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ کلام اقبالؒ نے میری زندگی کی کایا کو پلٹ کر رکھ دیا۔ ان کے فلسفہ حیات کے جس نکتے نے مجھ پر خاص اور گہرا اثر کیا، وہ یہ تھا:

ے زیادہ راحت منزل سے ہے نشاط رحیل

اس کے بعد میری نظروں میں منزل کی خاص وقعت نہیں رہی، لیکن یہ بعد کی پیش رفت ہے۔ قادیان میں طالب علمی کے زمانے میں اردو ادب اور کلام اقبالؒ کا مجھ پر ضرور اثر تھا کہ مجھے کچھ زبان کا چسکا پڑ گیا تھا۔ کسی بات کی تو ضرور اہمیت ہوتی ہے، لیکن طرز ادائیگی اور اسلوب بیان بھی کوئی چیز ہے، اب اس معیار پر، جو آہستہ آہستہ، باخاموشی اور غیر محسوس طور پر ادب کا مطالعہ مجھ میں استوار کر رہا تھا، قادیانی خطبات، تحریریں، شاعری، استدلال اور بحث و مباحثہ پورا اترتا نہ لگتا تھا۔ اس لیے قادیانی ماحول میرے اندر ایک ذہنی تحفظ اور قلبی رخنہ پیدا کر رہا تھا اور میں زندگی میں قادیانی موقف سے غیر جانبدار ہوتا چلا جا رہا تھا، لیکن یہ ایک ذوقی اور وجدانی راہ انحراف تھی، اس میں وہ فکری جذبہ بغاوت نہ تھا جو بعد ازاں عمر کی زیادہ ارتقائی منزل میں متولد ہوا۔

لیکن، کیا یہ ذوقی وجدانی راہ انحراف میرے تبدیلی عقیدہ کے لیے کافی تھی۔ آبائی مذہب چھوڑنا آسان نہیں۔ خصوصاً جب مجھے اپنے والد سے گہرا قلبی لگاؤ تھا تو پھر میرے خیالات اتنے بنیادی طور پر کیسے بدلے؟ یہاں یہ سوال اس لیے ضروری ہے کہ میں نے جوانی کے شروع میں ہی، بلکہ لڑکپن کے ایام میں ہی، قادیانیت کو ماننے سے انکار کر دیا تھا، یہ گتھی یوں سلجھ سکتی ہے کہ انسان قرآن کریم کے اس نکتے پر غور کرے کہ رشد و ہدایت کا منبع صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ وہ جسے چاہے ہدایت کرتا ہے، جسے چاہے گمراہی میں پڑا رہنے دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو قلب سلیم لے کر آئے، اسے ہم سچائی کا رستہ دکھاتے ہیں، لیکن یہ قلب سلیم کون عطا کرتا ہے؟ یہ بھی اس کی دین ہے۔ بعد کے تجربات زندگی نے مجھے اس عقیدے پر پختہ کر دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کرم کے بغیر زندگی کی کسی جہت اور معاملے میں بھی ہدایت نہیں حاصل ہوتی۔ سب امور کتاب میں درج ہیں، اس لیے میں تجربے کی حد تک تو یہ کہتا ہوں کہ میں ذوقی و وجدانی طور پر ایک ایسے مقام فہم پر پہنچا، جو قادیانیت سے ابا کرتا تھا، لیکن حقیقت یہی ہے کہ

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

قادیان میں آٹھ سال مستقل رہائش کے بعد میں لوح قلب کو اس سادہ صورت میں لے کر نکل آیا، جس حالت میں اسے لے کر، میں وہاں داخل ہوا تھا۔ تعلیم قادیان میں ضرور حاصل کی، لیکن قادیان کی روح سے غیر متاثر رہا۔

من وتو سے پیدا، من وتو سے پاک

لیکن، نقطہ انحراف تک پہنچنا ایک جز تھا اور جذباتی ورثے سے نجات حاصل کرنا بالکل جدا، اس کے لیے محسوس جدوجہد کی ضرورت پڑی۔ اس جدوجہد میں کئی اور عوامل شامل ہوئے، جن کا میں بعد میں ذکر کروں گا۔ یہ میری زندگی کا بہت صبر آزما دور تھا، ابھی میری عمر سترہ سال ہی کی تھی اور میرے دل ودماغ میں پختگی نہ آئی تھی کہ میں اپنے مذہبی عقیدت کو شک وشبے کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا، میرے لیے اس کی بنیاد متزلزل ہو چکی تھی۔

یہ پانچ سال کی داستان ہے۔ ان سالوں میں میرے مذہبی خیالات کی نشوونما کے ساتھ ان کی تطہیر وتذکیر بھی ہوئی۔ جب تک میں سکول کے زمانے میں قادیان میں رہا، میں کسی اور دنیا کو نہ جانتا تھا۔ میرے لیے ذاتی طور پر قادیان کا ماحول پرسکون تھا۔ جیسا میں نے عرض کیا، مجھے تعلیم اور کھیل کے سوا کسی اور چیز سے غرض نہ تھی، لیکن کبھی کبھی میرے کان میں عجیب وغریب افواہیں پڑتیں۔ عبدالرحمٰن مصری کا قصہ سننے میں آیا، وہ غالباً مدرسہ احمدیہ کے پرنسپل تھے، انھیں نکال دیا گیا۔ اسی طرح فخر الدین کتب فروش اور مستری عبدالکریم کے نام سننے میں آئے۔ پس منظر میں کچھ جنسی سکینڈل منڈلاتے تھے۔ بعض وقت دیواروں پر فحش زبان میں پوسٹر چسپاں نظر آتے تھے۔ زیادہ تر خلیفہ بشیر الدین محمود کی ذات الزامات کا مرکز تھی، لیکن میں نے کبھی ان معاملات میں دلچسپی نہیں لی۔ سزائیں یقیناً سنگین ہوں گی، کیونکہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ کئی لوگوں نے قادیانی فرقے کو چھوڑ کر لاہوری جماعت سے وابستگی اختیار کر لی ہے۔ ان لوگوں میں ان کے خلیفہ اوّل حکیم نور الدین کے لڑکے مولوی عبدالمنان بھی شامل ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ بھی انہی حالات میں ربوہ سے علیحدہ ہوئے، جن حالات نے مولوی محمد علی کو 1914ء میں قادیان چھوڑ کر لاہور کی انجمن احمدیہ کا سنگ بنیاد رکھنے پر مجبور کیا تھا، یعنی وہ بھی قادیانی فرقے کے تیسرے خلیفہ مرزا ناصر احمد کے مقابل خلیفہ محمود احمد کے جانشین بننے کے دعویدار تھے اور کہتے ہیں کہ اس جماعت کے کافی لوگ ان کے حق میں تھے، بہر حال جو لوگ قادیان یا ربوہ چھوڑ کر لاہوری جماعت سے وابستہ ہوئے، ان کے محرکات ذاتی تھے،

عقیدتاً وہ بھی مرزا غلام احمد کے دعاوی کو صحیح مانتے تھے، اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ قومی اسمبلی نے احمدیت کو خارج از اسلام قرار دینے کے ضمن میں قادیانی اور لاہوری فرقوں کے درمیان تخصیص کو ناقابل اعتنا قرار دینے میں بالکل ٹھیک فیصلہ کیا۔

لیکن، ان واقعات کا میرے تشکیل جذبات کے عمل میں کوئی دخل نہیں، جس چیز نے میری آنکھیں کھولیں، وہ بالکل مختلف ہے۔ پہلے تو جیسا میں نے کہا، میں وجدانی اور ذوقی لحاظ سے اپنے آپ کو قادیانی انداز استدلال سے غیر متاثر پاتا تھا۔ مجھے ان کی تحریر و تقریر میں کوئی جاذبیت اور کشش محسوس نہ ہوتی تھی، لیکن، چونکہ، میں ابھی بہت نوعمر تھا اور میں نے قادیانیت کے بنیادی دعاوی کو تجزیے کی روشنی میں نہ دیکھا تھا، میں ایک قسم کی غیر مرئی غیر جانبداریت کے سوا اور کوئی طرز عمل اختیار نہ کر سکتا تھا۔ چونکہ، ہر طرف قادیانی ہی قادیانی تھے، میں ان کے طور طریق میں کوئی نمایاں پہلو نہ دیکھتا تھا، لیکن جب میں شملہ اور دہلی آیا، تو وہاں کی قادیانی جماعت مجھے ایک نئی اور ممتاز صورت میں نظر آئی۔ اس کا امتیاز یہ تھا کہ مسلمانوں کے درمیان رہ کر بھی اس نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد بنائی ہوئی تھی۔

اب میں نے دیکھا کہ قادیانی نہ صرف مسلمانوں سے مذہبی و جماعتی طور پر الگ تھلگ تھے، بلکہ وہ سیاسی طور پر بھی مسلمانوں کے معاملات سے کوئی دلچسپی نہ رکھتے تھے، ان کا انداز عمل کچھ ایسا تھا کہ گویا مسلمانوں اور دوسروں کے درمیان ان کی کوئی غیر جانبدارسی پوزیشن ہے۔ بالفاظ دیگر، ان کی حیثیت مسلمانوں کے جسد قومی کے ایک جزو لاینفک کی نہ تھی کہ ان کا مرنا اور جینا ان کے ساتھ مقدر ہو۔

قادیانی جماعت مسلمانوں کے بحران سے کوئی سروکار رکھتی معلوم نہ ہوتی تھی، بلکہ میں قادیانی زعما سے یہ سن کر ہکا بکا رہ جاتا تھا اور یہ الفاظ میں نے خود خلیفہ بشیرالدین محمود کی زبان سے بھی سنے کہ ''انگریز احمدیوں کو قابل اعتماد سمجھتے ہیں اور ملازمتوں میں دوسرے مسلمانوں پر ترجیح دیتے ہیں'' شاید اسی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے حکومت برطانیہ نے چوہدری ظفر اللہ خاں قادیانی کو وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کا رکن بنایا تھا۔ ان کی تقرری پر خلیفہ صاحب نے کہا تھا۔ ''لوگ متعجب ہیں کہ ایک احمدی کو اس اعلیٰ عہدے کے لیے کیوں منتخب کیا گیا، آخر احمدیوں کو بھی تو ان کا حصہ ملنا ہے، خواہ وہ کتنا ہی قلیل کیوں نہ ہو۔ حصہ بخشی اکثریت کے بجائے اقلیت سے کیوں شروع نہیں ہو سکتی؟'' میں نے دیکھا قادیانی، حکومت کی ملازمتوں کو حاصل کرنے کی خاص کوشش کرتے تھے اور ظفر اللہ خاں کے زمانہ میں انھیں نوکریاں ملنے میں سہولتیں بھی حاصل ہو گئیں تھیں، وہ سرکاری افسر ہونے

کو اس سیاسی طاقت کے حصول سے تعبیر کرتے، جن کا ان کے ساتھ ''الٰہی'' وعدہ کیا گیا ہے۔ ظفر اللہ خاں قادیانی نے اپنی پوزیشن کا ناجائز فائدہ اٹھا کر کئی نوجوانوں کو قادیانی بھی بنایا، جب کوئی پڑھا لکھا ان کے پاس سفارش کے لیے جاتا تو اس پر تبلیغ شروع کر دیتے، جب لوگوں نے یہ دیکھا کہ حصول ملازمت کا طریقہ ہی یہ رہ گیا ہے، تو بعض تو جاتے ہی احمدیت میں اپنی دلچسپی کا اظہار شروع کر دیتے۔ شملہ میں ظفر اللہ قادیانی کی مشہور سرکاری کوٹھی ریٹریٹ میں ہوتی تھی اور امیدواران ملازمت کے لیے سنہری موقع مہیا کرتی، وہاں ظفر اللہ خاں جس نئے چہرے کو دیکھتے، اس پر مہربان ہو جاتے، ان باتوں سے مجھے یقین ہو گیا تھا کہ قادیانیوں کو برصغیر کی آزادی سے کوئی رغبت نہیں۔ اگر وہ مسلمانوں سے ہمدردی جتاتے ہیں، تو محض ان میں اپنا اثر و رسوخ پھیلانے کو، جدوجہد کشمیر میں حصّہ لیا تو اس تحریک کی لیڈرشپ پر اجارہ داری جمانے کے لیے، لیکن اصلاً وہ ٹھیٹھ مسلم مفاد سے بے اعتنائی برتتے، اور اس بنیادی رجحان کا بھرم تحریک پاکستان کے دوران کھل گیا، وہ برصغیر کی آزادی کے تو قائل نہ تھے، لیکن مسلمانوں کے حق خود ارادیت کے مخالف نکلے، چنانچہ انھوں نے، جہاں مسلمانوں کی جنگ آزادی سے پہلو تہی اختیار کی تھی، وہاں مسلم لیگ کی قیادت سے بھی قطعی تجارتی طرز عمل اختیار کیا۔ مرزا محمود احمد قادیانی خلیفہ نے قائد اعظمؒ کو لکھا کہ ''ان کی جماعت بہت اثر و رسوخ کی مالک ہے اور اس کی طاقت روز افزوں ترقی پر ہے۔ اگر مسلم لیگ اس کے تعاون کی خواہش مند ہے تو اس سے شرکت عمل کی شرطیں طے کرے، ورنہ وہ کانگرس کا ساتھ دے گی۔'' اس سے ظاہر ہے کہ وہ مسلمانوں کے مفاد کو اپنا مفاد نہ سمجھتے تھے، تاوقتیکہ ان سے کوئی عہد معاہدہ نہ ہو جائے۔ میں نے مسلمانوں کے معاملات سے قادیانی غیر جانبداری کی ذہنیت کا مظاہرہ پاکستان بننے کے بعد بھی دیکھا۔

قادیانیوں کو میں نے شروع ہی سے مسلمانوں سے الگ پایا تھا۔ مثلاً قادیان کی زندگی میں ہمارا ان معدودے چند مسلمانوں سے کوئی واسطہ نہ تھا، جو وہاں رہتے تھے۔ قادیان کا ایک بازار، بڑا بازار، کہلاتا تھا اور اس میں زیادہ تر ہندوؤں اور مسلمانوں کی دکانیں تھیں، جب میں اس بازار سے گزرتا تو کبھی کبھی ایک سبزی کی دکان پر کھڑا ہو جاتا، جس کے مالک کا لڑکا ہمارا ہم جماعت تھا، مجھے میری اس حرکت پر سرزنش کی گئی کہ میں کسی ''غیر احمدی'' سے سکول کے باہر کیوں تعلق رکھتا ہوں، پھر قادیانیوں کی مسلمانوں سے رشتہ داریاں بھی نہ ہوتیں، قادیانی مردوں کے لیے مسلمان لڑکیاں تو جائز تھیں، لیکن قادیانی لڑکی کا کسی مسلمان لڑکے سے رشتہ قطعی ناجائز تھا۔ جب کبھی خاندانی تعلقات کی بناء پر ایسا ہو جاتا، تو ''مجرم'' کا بائیکاٹ ہوتا، قادیانیوں کے لیے مسلمانوں کے پیچھے نماز پڑھنے کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا، وہ مسلمانوں کی نماز جنازہ تک پڑھنے کے روادار نہ تھے، چنانچہ ظفر اللہ خاں

نے قائداعظمؒ کا جنازہ نہیں پڑھا اور لاکھوں کے مجمع میں الگ بیٹھے رہے، جب چوہدری صاحب سے پوچھا گیا کہ وہ مسلمانوں کا نماز جنازہ کیوں نہیں پڑھتے، تو انھوں نے جواب دیا کہ جو ہمیں کافر کہیں، ان کا ہم جنازہ نہیں پڑھتے، اسی سانس میں انھوں نے بڑے فخر سے بتایا کہ قائداعظمؒ ہندوستان کی مرکزی اسمبلی کے دنوں میں (جب ظفر اللہ خاں وہاں ریلوے ممبر تھے) ان کے مداح تھے اور انھیں مسلمان سمجھتے تھے۔ (اگر اسے سچ مان لیا جائے) تو سوال اٹھتا ہے کہ پھر آپ نے قائداعظمؒ کا جنازہ کیوں نہ پڑھا؟ وہ آپ کو کافر بھی نہ کہتے تھے اور آپ کے محسن بھی تھے کہ ان کے علاوہ پاکستان میں کس کو جرأت ہو سکتی تھی کہ ظفر اللہ خاں کو وزیر خارجہ بنا دے..... مسلمانوں سے الگ تشخص قائم کرنے کی دھن میں وہ اتنی دور گئے کہ اپنا ایک کیلنڈر بھی اختراع کر لیا، لیکن اس زمانے میں، میں قادیانی زندگی کی ان خصوصیات کی وجہ کو سمجھ نہ سکا تھا۔ اب قادیان سے باہر، وسیع تر میدان میں جب میں نے قادیانیوں کے مسلمانوں سے غیر جانبدارانہ بلکہ معاندانہ طرز عمل کو دیکھا، تو اس کی وجوہات پر غور کرنے پر مجبور ہوا۔ مسلمانوں میں فرقہ بازی نئی چیز نہیں، کئی فرقے ہیں، لیکن قادیانیوں کا باوا آدم نرالا ہے، ان کا الگ مذہبی وجود ہی نہ ہے بلکہ وہ اپنے منفرد سیاسی وجود پر بھی مصر ہیں۔

جب میں نے ان کے عقائد کا مطالعہ کیا تو بنیادی خرابی ان کے عقائد میں یہ نظر آئی کہ مرزا غلام احمد قادیانی نبی ہیں، جبکہ نبوت تو لامحالہ ایک الگ امت کی متقاضی ہوتی ہے، اگر مرزا غلام احمد قادیانی دعویٰ نبوت کر کے مسلمانوں سے الگ امت کے بانی بن جاتے، تو لوگوں کو اختیار تھا کہ اس دعویٰ کو اپنے اپنے معتقدات کی روشنی میں پرکھ لیتے، مسلمانوں کے لیے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد، جو خاتم النبیین ہیں اور جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان پر اپنی نعمت دین مکمل کر دی ہے، کسی اور رسول کی گنجائش نہ تھی، لیکن غیر مسلم جو چاہے، وطیرہ اختیار کرتے۔ ایران میں بہاء اللہ نے یہی طرز عمل اختیار کیا، لیکن قادیانیت کی جس خصوصیت نے مسلمانوں میں خلفشار پیدا کیا، وہ یہ تھی کہ اسے حقیقی اسلام کے طور پر پیش کیا جاتا تھا، گو میں نے اس وقت مذہبی استدلال نہیں کیا، لیکن یہ امر مجھ پر بالکل صاف ہو گیا تھا کہ اگر مجھے مسلمانوں کے امور سے تعلق منظور ہے، تو میں قادیانی جماعت کا فرد نہیں رہ سکتا۔ مجھے ان سے آزاد پوزیشن اختیار کرنی پڑے گی، مجھے مداہنت سے طبعی نفرت ہے اور میں جب اس دوٹوک نتیجے پر پہنچا، تو میں نے اپنے گھر والوں اور دوستوں سے اس کا برملا ذکر کیا۔

اب قادیانیوں نے ایک صنعت کو بہت پروان چڑھایا ہوا ہے اور وہ ہے تاویل کی صنعت، ان کی تاویل تراشی پر علامہ اقبال کا یہ شعر صادق آتا ہے ۔

احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسر
تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پازند

یہ اسی تاویل کا کرشمہ ہے کہ قادیانیوں نے حکومت انگلشیہ کو، نعوذ باللہ، حاکم برحق کا درجہ دیا، گویا کرشمہ انھوں نے تاویل کے ساتھ اصطلاح قرآنی کو مسخ کرنے سے حاصل کیا، یعنی بجائے اولوا الامر منکم کے صرف اولوا الامر کہا، کسے باشد، ان کی بلا سے، مسلمانوں پر جو چاہے حکومت کرے، صرف شرط یہ ہے کہ قادیانی مقربین کی صف میں شامل ہوں، انگریزوں کو حاکم تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ جہاد کا منسوخ قرار دیا جانا، قادیانی مذہب کے لیے ناگزیر تھا، کیونکہ ایک طرف مسلمانوں کو انگریزوں کے اتباع کی تلقین کی جائے اور دوسری طرف وہ ان کے خلاف جہاد پر آمادہ ہو جائیں تو خدمت سرکار کا اہتمام نہیں ہوتا۔

اللہ تعالیٰ بھی فرماتا ہے کہ بات سیدھی کہو۔ ادھر ان کی تاویل آمیز تفاسیر میں الجھاؤ ہی الجھاؤ تھا، موقع ملے تو بال کی کھال اتارنے سے دریغ نہیں کرتے اور منطق کام نہ آئے تو ''الہامی'' حوالے دیے جاتے ہیں، جس کا اس کے سوا اور کیا جواب دیا جا سکتا کہ ؎

محکوم کے الہام سے اللہ بچائے
غارت گر اقوام ہے وہ صورت چنگیز

لیکن، یہ بہت بعد کی باتیں ہیں۔ مرزا محمود احمد نے دعویٰ کیا کہ انھیں قرآن کریم کی تفسیر خوابوں میں سمجھائی گئی، اب انسان کسی عام نکتے پر تو بحث کر سکتا ہے، لیکن اس نکتے پر کیا اظہار رائے کرے، جو خوابوں کے ذریعے کسی کی طبیعت رسا پر وا اور منکشف ہوا ہو، ان کے خوابوں میں کسی اور کا کیسے گزر ہو سکتا تھا۔ مجھے عمر کے ساتھ ساتھ قادیانیت کے محرکات اور مضمرات پر سوچ بچار کا موقع ملا اور میں اپنی تحقیق کے نتائج کسی مناسب جگہ پیش کروں گا، لیکن اس وقت بھی مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس جماعت کا مقصد اولیٰ، امت مسلمہ کی وحدت و تنظیم کی جڑیں کاٹنا ہے، وہ مسلمانوں سے ایسی صورت میں وابستہ رہنے پر اصرار کر رہے تھے، جب ان کے جماعتی مفادات ان کے قطعی خلاف تھے، اوّل تو وہ برصغیر میں انگریزوں کے زوال کے تصور کو ہی ناممکن سمجھتے تھے، ان کی تمام تر سیاست کا تکیہ انگریزی تسلط کا مستقل قیام تھا، وہ اگر مسلمانوں کے ساتھ نظر آتے تھے تو اس لیے کہ مسلمانوں کے سیاسی حقوق پر اپنا حق جما سکیں۔ آخر ظفر اللہ خاں وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں مسلمان کہلانے کی بناء پر پہنچے، یہ امر انگریزوں اور قادیانیوں دونوں کو راس تھا، اس طرح انگریزوں کو وفادار نائب ملتے تھے اور قادیانیوں کو تقسیم انعامات میں خصوصی حصہ، دوسری طرف وہ کانگریس سے بھی رابطہ رکھتے تھے کہ داخلی طور پر انتقال اقتدار ہوا تو وہ بہت بڑی جماعت کی حیثیت سے اکثر صوبوں کے حاکم ہوں

گے اور وہ یقیناً انگریزوں کی طرح ایسی جماعت کو استعمال کرنا چاہیں گے، جس کا ایمان ہی اولوا الامر کی اطاعت ہے، لیکن جب یہ سیاسی گومگو کی حالت زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکی اور افق پر جنگ کے آثار سے یہ ظاہر ہونا شروع ہو گیا کہ انگریز کو ہندوستان کے متعلق فیصلہ کرنا پڑے گا، تو قادیانی اصلیت اظہر من الشمس ہو گئی اور انھوں نے صاف طور پر برصغیر کی تقسیم کے خلاف اکھنڈ بھارت کے تصور کو ترجیح دی۔ بات یہ تھی کہ جب تک انگریز کا سایہ عاطف قائم تھا، ان کے لیے دوغلے پن کی گنجائش تھی، وہ اپنے آپ کو مسلمانوں کا ہمدرد بھی ظاہر کر سکتے تھے اور ہندوؤں سے سیاسی لین دین بھی کر سکتے تھے، لیکن انگریز کے بعد کی صورت حالات میں انھیں دو میں سے ایک متبادل کا انتخاب کرنا لازمی ہو گیا، اکھنڈ بھارت میں ان کے پنپنے کے زیادہ امکانات ہیں یا پاکستان میں؟ اب انھیں صاف نظر آیا کہ ایک خالص اسلامی مملکت میں ان کا گزارا نہیں ہو سکتا اور اس کے مقابل، اکھنڈ بھارت میں ، جہاں کانگریس، سیکولر طرز حکومت قائم کرنا چاہتی ہے، انھیں اپنی جمعیت کو مضبوط کرنے کا خاصا موقع ملے گا، پھر وہ تو ازلی وفادار ہیں، کانگریس انھیں مسلمانوں پر بہرحال ترجیح دے گی، جن کی سرشت میں غیر مسلمانوں کے خلاف بغاوت لکھی ہوئی ہے اور جن کی اکثریت تحریک پاکستان کی موید ہونے کی وجہ سے راندہ درگاہ ہو گی۔ سو قادیانیوں نے اپنا پورا وزن برصغیر کی سیاست کے ترازو...... مسلم لیگ کے مخالف پلڑے میں ڈال دیا۔

بے شک یہ پیش رفت اس زمانے سے تعلق نہیں رکھتی، جب میں قادیانیوں کے متعلق سوچ رہا تھا، لیکن ان کی باتیں سن کر ان کا طرز عمل دیکھ کر میرے دل میں کوئی شک وشبہ نہ رہا تھا کہ بالآخر وہ کس طرف جائیں گے۔ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے، ہم عموماً اپنے فہم کی تسکین دلیلوں اور لفظوں کے استعمال میں ڈھونڈتے ہیں، لیکن قرآن کریم مشاہدے پر زور دیتا ہے۔ پوچھا کہ ہم مرنے کے بعد دوبارہ کیسے اٹھیں گے؟ جواب ملا تو آپ پیدا کیسے ہوئے تھے؟ جو خالق ایک بار پیدا کر سکتا ہے وہ دوسری بار بھی اٹھا سکتا ہے۔ علم کا اصل منبع ہی مشاہدہ ہے اور میرے مشاہدے نے میرے اندر بدرجہ اتم یہ ایقان پیدا کر دیا کہ قادیانیوں کا مسلمانوں سے کوئی علاقہ نہیں اور میں اپنے لیے مسلمانوں کا راستہ انتخاب کر چکا تھا۔ قادیانیت کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کے پیروکار مرزا صاحب کی پیشگوئیوں پر بہت انحصار کرتے ہیں، بات بات پر ان کی پیشگوئیوں کا حوالہ دیتے ہیں اور اس کے پورا ہونے کی تشہیر کرتے ہیں، ضمناً ان کی ایک پیشگوئی قطعی مسلمانوں کے حق میں نہ تھی۔ جب بنگال کے ہندو تقسیم بنگال، جو عین مسلمانوں کے فائدے میں تھی، کے خلاف تحریک چلا رہے تھے، تو مرزا صاحب کو الہام ہوا کہ ''دلجوئی کی جائے گی'' اب جب 1911ء میں تقسیم کے فیصلے کو

منسوخ کر دیا گیا تو حقیقتاً دلجوئی ہندوؤں کی ہوئی، قادیانی حضرات کہہ سکتے ہیں کہ اس سے غرض نہیں، پیشگوئی کس کے حق میں پوری ہوئی، انھیں تو اس کے اہتمام سے غرض ہے۔ قادیانی پیشگوئیوں کی صداقت کے اس قدر قائل ہیں کہ وہ انھیں بروئے کار لانے کی بھی کوشش کرتے ہیں، چنانچہ ایک پیشگوئی کے مطابق حضرت مسیح علیہ السلام کی بعثت ثانی دمشق کے ایک کنارے پر ہوگی۔ چنانچہ ایک طرف تو قادیان میں مینارۃ المسیح بنوایا گیا۔ رہتی کسر مرزا محمود احمد صاحب نے پوری کر دی کہ جب وہ سفر یورپ پر جا رہے تھے یا آ رہے تھے، دمشق ٹھہرے اور وہاں کی مسجد کے مینارے پر چڑھے، وہ خود تو "مسیح موعود" نہ تھے، ان کا دعویٰ صرف "مصلح موعود" ہونے کا تھا، لیکن جس حد تک وہ مرزا صاحب کے فرزند اور خلیفہ ہونے تک ان کی نمائندگی کر سکتے تھے، انھوں نے اس پیشگوئی کو اپنے باپ کی طرف سے پورا کر دیا۔ میرا پیشگوئیوں کے متعلق تفصیل بتانے کا مقصد یہ اتمام حجت ہے کہ قادیانی انھیں اپنے مستقبل کا دار و مدار سمجھتے ہیں، اب ایک اہم معاملے میں مرزا صاحب کی پیشگوئی سے بالکل الٹ نتیجہ پیدا ہوا۔ قادیان، جس کے متعلق ان کا ایک شعر ہے ؎

زمین قادیان اب محترم ہے
ہجوم خلق سے ارض حرم ہے

جس قدر قادیانیوں کو محبوب ہو سکتا ہے، اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں، قادیان کے متعلق مرزا صاحب نے پیشگوئی کی تھی کہ وہ اتنی ترقی کرے گا کہ اس کا ایک سرا دریائے بیاس تک جا ملے گا اور اس کی شان و شوکت دیکھ کر لوگ کہیں گے کہ کبھی لاہور ہوتا تھا، مطلب یہ ہے، اس وقت اس کی عظمت کے سامنے لاہور مات ہوگا۔ اب خدا کا کرنا کیا ہوا کہ تقسیم برصغیر سے قادیان غالباً متروکہ شہروں میں سب سے زیادہ متاثر و ماؤف ہوا کہ مشرقی پنجاب کے دوسرے شہر تو مسلمانوں کے نکل آنے پر ہندوؤں اور سکھوں نے آباد کر دیے، لیکن قادیان کی کوئی تجارتی یا دوسری اہمیت نہ تھی۔ اس کی اہمیت یہی تھی کہ وہ مرزائیوں کا مرکز ہے، جس تک ریلوے لائن بھی اس لیے بچھائی گئی کہ چوہدری ظفر اللہ خاں وائسرائے کی کونسل کے ریلوے ممبر تھے، ورنہ مسافروں کی آمد و رفت اس کے لیے کوئی جواز مہیا نہ کرتی تھی۔ اس لیے تقسیم پر قادیانی تو اسے چھوڑنے پر مجبور ہو گئے کہ جان کا خطرہ تھا، لیکن ہندوؤں سکھوں نے اسے آباد کرنے کے لائق نہ جانا اور میں نے سنا کہ اب وہاں ہمارے مکانوں میں گدھے بندھے ہیں، گویا قادیان کی صرف رونق ہی ضائع نہ ہوئی، وہ بالکل ویران ہو گیا۔ اس سے زیادہ پیشگوئی کے غلط ہونے کا اہتمام نہ ہو سکتا تھا، چونکہ میں 49ء سے لندن میں تھا اور مجھے تقسیم کے بعد، قادیان کی مکمل تباہی کے بارے میں قادیانیوں کے ردعمل کا علم نہ تھا، اس لیے

جب 1950ء میں واپس آیا تو یہ معلوم کرنے کے لیے بہت متجس تھا کہ اس المیے کا ان کے دلوں میں کیا اثر ہوا، لوگوں کے قدم تو اس پیشگوئی کی تعبیر معکوس سے ڈگمگا گئے ہوں گے، لیکن میری حیرانی کی انتہا نہ رہی، جب میں نے دیکھا کہ اس حادثے سے ان کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ یہ احساس کا فقدان تھا یا تاویلوں کی تاثیر، ان کے ایمانوں میں کوئی فرق نہ پڑا تھا۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ ایک کوشش کبھی نہیں ہوئی، اسلام میں کسی اور نبوت کے اجراء کے لیے دروازہ نہ کھولا گیا، یہ جسارت صرف ہندوستان میں انگریزوں کی علمداری میں ہوئی، قادیانیت، انگریزوں کی سنگینوں کے تلے پروان چڑھی۔ قادیانی نبوت سراسر دورازکار تاویلات کی تصنیف ہے، کہیں مسیح علیہ السلام کی بعثت ثانیہ کا سہارا لیا گیا ہے، کہیں ضعیف حدیثوں پر انحصار کیا گیا ہے، کہیں پوچ استدلال پر، مثلاً یہ دلیل کہ انعامات خداوندی کبھی بند نہیں ہوتے، تو نبوت کا دروازہ کیسے بند ہوسکتا ہے، جسے ایک قادیانی شاعر نے گھڑی سے تشبیہ دی ہے۔

کیا فائدہ رکھنے کا گھڑی جیب میں یارو
جب وقت کی پڑتال پہ پاتے ہو گھڑی بند

لیکن، جب اللہ تعالیٰ نے نوع انسانی پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے اپنی نصیحت پوری کر دی تو آپ کو خاتم النبیین قرار دیا۔ اسلام نیا مذہب نہیں، یہ وہی پیغام ہے جو حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام پر وحی کیا گیا، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اس پیغام کی تکمیل ہوئی اور اس تکمیل اور اتمام نعمت کا خاصا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی حفاظت کا ذمہ لیا، جب کہ توریت اور انجیل کے متعلق اس قسم کی ذمہ داری نہیں اٹھائی اور اسی وجہ سے ان میں تحریف ہوئی، ان صریح احکامات میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں، چونکہ، اسلام میں یہ نکات بنیادی تھے، ان پر پوری امت کا اجماع ہوا اور اسلام میں چودہ سو سال تک کسی نے دعویٰ نبوت نہیں کیا، تا آنکہ قادیان سے مرزا غلام احمد نے اپنی صدا لگائی، اگر یہ کہا جائے کہ ہندوستانی ''نبوت'' کی اس لیے ضرورت پڑی کہ فی زمانہ مسلمانوں کی حالت بہت گر چکی تھی تو امت پر اس سے پہلے بھی بڑے بڑے بحران آئے، جب کسی ''نبوت'' کا بندوبست کیوں نہ ہوا؟ پھر قادیانیوں نے اوّل کام ہی یہ کیا کہ وہ مسلمانوں سے کٹ گئے اور انھوں نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ تعمیر کی، پھر انھوں نے صرف مسلمانوں سے سروکار ہی نہ رکھا، بلکہ ان کے خلاف کام کیا۔

قادیانیوں نے اپنی ''نبوت'' کے جواز میں عجیب دلیلیں دی ہیں۔ ایک یہ کہ مرزا قادیانی کی ''نبوت'' سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقام اور بلند ہوتا ہے کہ ان کے امتی بھی ''نبی'' بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں، یہ ایک دفاعی دلیل ہے کہ کہیں یہ نہ کہا جائے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں گستاخی کی ہے، ورنہ اس سے صاف معلوم ہوتا کہ

ع چہ بے خبر ز مقام محمد عربی است

اگر انھوں نے ایک طرف یہ کہا تو دوسری طرف ان سے اپنی حقانیت میں یہ بیان بھی سنا گیا کہ اگر چوہدری ظفر اللہ خاں جیسا لائق آدمی (یہ بات ان دنوں خاص طور پر کہی جاتی تھی، جب چوہدری صاحب وائسرائے کونسل کے رکن تھے) مرزا صاحب کو ''نبی'' مانتا ہے تو اس سے زیادہ ان کی ''صداقت'' کا اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے! انہی پوچ باتوں نے مجھے قادیانی موقف سے بیزار کیا، مجھے یقین ہو گیا کہ قادیانیوں نے سنجیدگی سے نبوت کے متعلق سوچا نہیں یا ان میں سنجیدہ فکر کی اہلیت ہی نہیں۔ پھر مجھے خیال آیا کہ اگر وہ اپنے عقیدے سے وابستہ ہیں تو دنیا میں لوگ طرح طرح کی بو الجمیوں کی مانتے ہیں، انسانی ذہن ہر عقیدے کا جواز ڈھونڈ لیتا ہے، لیکن، بہرحال قادیانیت کو اسلام کے اس عالمگیر مقصد سے کوئی تعلق نہیں اور اس کا کوئی درک نہیں جو ان **الدین عند اللہ الاسلام** میں مضمر رکھا گیا ہے کہ اسلام کل انسانیت کے لیے ہے اور اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پوری نوع انسانی کے لیے مبعوث فرمائے گئے تھے۔ وہ کسی خاص قوم کے لیے نہیں آئے، جیسا کہ حضرت عیسیٰ کا مقصد بنی اسرائیل کے دین کی تجدید تھی، وہ خاتم النبیینؐ تھے، جس کا مطلب ہے اسلام دنیا کے قیام سے آخیر تک انسانیت کو راہ ہدایت دکھاتا رہے گا اور وہ اس کے سوا اور کوئی نجات اخروی کا ذریعہ نہ پائے گی۔ اس عظیم الشان مشن کا تقاضا تھا کہ قرآن کریم محفوظ رہا اور اس کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے لے رکھی ہے اور تاریخ کی شہادت ہے، وہ چودہ سو سال بعد بھی حرف بحرف وہی ہے جو رسول اللہؐ زندگی میں تھا اور تاقیامت اسی طرح یہ تحریف سے محفوظ رہے گا اور دوسرے امت مسلمہ کا وجود ثابت و سالم رہے گا، کیونکہ اگر وہ منقسم، منفرق اور منتشر ہو گئے، تو اسلام کی قوت نفوذ ختم ہو جائے گی۔ اسلام کی سرمدی تعلیم مسلمانوں کے ٹھوس جسد سیاست کی مقتضی تھی، وہ ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم تھے، اب تاریخ اس امر پر بھی شاہد ہے کہ باوجود اس حقیقت کے کہ مسلمانوں پر ہر قسم کی فکری و جماعتی اور سیاسی آفتیں آئیں، ان کا قلب صحیح اور زندہ رہا۔ بے شک درجنوں فرقے پیدا ہوئے، مسلمانوں پر عروج کے ساتھ زوال آیا اور وہ اغیار کے دست نگر اور تابع بھی بنے، لیکن ان میں اپنی وحدت کا جذبہ کبھی سرد نہ پڑا اور صداقت یہی ہے کہ وہ ہر امتحان اور آزمائش کے بعد ابھرے

ع اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

وحدت کا ناقابل شکست اور زندہ احساس جو ہر زمانے میں مسلمانان عالم میں جاری ساری رہا، کار کن اعلیٰ اور عامل اعظم وہ گہرا تعلق ہے جو مسلمانوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات بابرکات سے رہا، اور جو اسی طرح قائم رہ سکا کہ وہ خاتم النبیین تھے اور کوئی اور نبی یا پیغامبر

مسلمانوں اور رسول اللہؐ کے درمیان حائل نہیں ہوا، یہ ناقابل تردید نفسیاتی حقیقت ہے کہ اگر خدانخواستہ کوئی تیسرا عامل کسی شخص یا ادارے کی صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمانوں کی درمیان حائل ہو جاتا تو یہ قلبی تعلق، جو مسلمانوں کو رسول اللہؐ سے محسوس ہوتا ہے اور جس پر ہر دوسرا تعلق قربان کیا جا سکتا ہے، قائم نہ رہ سکتا، جس کا مطلب ہے، امت کی وحدت معرض انتشار میں پڑ جاتی۔ اس حقیقت کے ثبوت میں خود قادیانیوں کے طرز عمل کی مثال دی جا سکتی ہے۔ کہنے کو تو وہ رسول اللہؐ سے بہت عشق و محبت کا اظہار کرتے ہیں، لیکن عملی صورت کیا ہے؟ ان کے گھروں میں ہر وقت مرزا صاحب کا ذکر ہوتا ہے۔ مرزا صاحب سے ان کے پیروؤں کے تعلق کے متعلق وہ خود ایک لطیفہ بیان کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک آدمی کے متعلق مرزا صاحب کو معلوم ہوا کہ وہ ان کے متعلق بحث کے سلسلے میں کسی مسلمان سے لڑ پڑا، مرزا صاحب نے اسے کہا کہ تمھیں نہیں لڑنا چاہیے تھا، تو اس شخص نے جواب دیا کہ آپ تو اپنے آقا (یعنی رسول اللہؐ) کے بارے میں ہر ایک سے لڑتے ہیں، میں اپنے آقا (مرزا صاحب) کے بارے میں کیوں نہ لڑوں؟ اس قادیانی کے لیے ''آقا'' کا مفہوم بدل گیا، رسول اللہؐ اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئے، رسول اللہؐ کے لیے خاتم النبیین کے مقام کا تعین محض ان کی عظمت کے اظہار کے لیے نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی اس تدبیر کے ماتحت ہے کہ اسلام ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دین انسانیت بنا دیا گیا ہے اور اس تدبیر کو عملی جامہ پہنانے کے لیے نہ صرف قرآن کریم ابد تک محفوظ رہے گا، بلکہ امت مسلمہ کا وجود سالم و ثابت رہے گا اور جس کا سراسر انحصار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مسلمانوں کے تعلق پر ہے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ تدابیر اتنی ہی غیر مبدل ہیں جیسے کائنات کا نظام۔ سورج مشرق سے چڑھے گا اور مغرب میں غروب ہو گا، زمین سورج کے گرد گردش کرتی رہے گی اور چاند زمین کے گرد چکر لگاتا رہے گا، دن رات کے تعاقب میں لگا رہے گا اور رات دن کے۔ جب مردہ شہر پر پانی برسے گا تو اس سے ہر قسم کی سبزیاں اُگیں گی، تا آنکہ یوم موعود آ جائے اور زمین اپنے رب کے نور سے منور ہو جائے۔

بشیر احمد مصری

شریک جرم نہ ہوتے تو مخبری کرتے

الحافظ بشیر احمد مصری 1914ء میں ہندوستان کے قصبہ قادیان میں پیدا ہوئے۔ آپ نے گورنمنٹ کالج لاہور سے عربی میں بی۔اے آنرز میں ڈگری لی۔ آپ جامعہ الازھر (مصر) کے شعبہ عربی کے بھی فارغ التحصیل ہیں اور لندن سے صحافت (Journalism) میں بھی سند یافتہ ہیں۔ آپ کی زندگی کے بیس برس مشرقی افریقہ میں بسر ہوئے جہاں وہ ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر کے علاوہ بہت سی انجمنوں اور سماجی اداروں کے ذمہ دارانہ عہدوں پر کام کرتے رہے۔ 1961ء میں آپ نے انگلینڈ ہجرت کر لی۔ 1964ء سے 1968ء تک پانچ برس آپ ماہنامہ ''اسلامک ریویو'' کے ایڈیٹر رہے۔

بشیر احمد مصری صاحب کے والد عبدالرحمٰن مصری قادیانی خلیفہ مرزا محمود کے دست راست تھے۔ مرزا محمود ایسا ہوس پرست، خواہشات نفسانیہ کا پجاری اور زنا کار کا بیوپاری تھا کہ اپنے دوستوں کی اولاد پر ہاتھ صاف کرنا، یا ان کی عزتوں سے کھیلنا اس کی لغت میں کوئی معیوب نہ تھا۔ اس نے اپنی ہوس کا نشانہ عبدالرحمٰن مصری کے خاندان کو بنایا۔ مصری نے مرزا محمود کو ایسے دردمندانہ خطوط لکھے جس نے مرزا محمود کی تقدس مآبی کو خاک میں ملا دیا۔ خطوط میں مصری نے اپنی مظلومیت کو ایسے انداز میں ثابت کیا ہے، جسے پڑھ کر دل کانپ کانپ جاتا ہے۔ عبدالرحمٰن مصری نے مرزا محمود کے کرتوت دیکھ کر لاہوری گروپ میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ آسمان سے گرا، کھجور میں اٹکا۔ حضرت مولانا محمد علی جالندھریؒ فرماتے تھے کہ عبدالرحمٰن نے غلط کار پایا محمود کو اور سزا دی اس کے ابا مرزا قادیانی کو، کہ وہ پہلے اسے نبی مانتے تھے پھر ولی ماننے لگے۔ حافظ بشیر احمد مصری، لاہوری گروپ کے مرکز ووکنگ مسجد لندن کے امام بن گئے۔ 11 فروری 1968ء کو مناظر اسلام مولانا لال حسین اخترؒ نے ووکنگ مسجد لندن میں تقریر کی۔ تقریر کے اختتام پر حافظ بشیر احمد مصری نے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا اور مسجد مسلمانوں کے سپرد کر دی۔ آج بھی وہ مسجد اہل اسلام کے پاس ہے۔ مرزا طاہر نے جب مباہلہ کا چیلنج دیا تو اس کی کاپی حافظ بشیر احمد مصری کو بھی بھجوائی۔ خدا کا کرم دیکھئے مصری صاحب نے اس کا جواب لکھا۔ مرزا محمود سے مرزا طاہر تک اس کے تمام خاندان کو زانی، شرابی، بدکار، اغلام باز، نہ معلوم کیا کچھ تحریر کیا۔ مرزا طاہر کو سانپ سونگھ گیا۔ مصری نے اس کا اردو اور انگلش ایڈیشن

شائع کرایا۔ مصری صاحب ہر سال ختم نبوت کانفرنس برطانیہ میں شرکت کرتے تھے۔ عالمی مجلس کے رہنماؤں سے ان کے والہانہ تعلقات تھے۔ چند سال ہوئے فوت ہو گئے ہیں۔ قدرت ان سے اپنے رحم و کرم کا معاملہ فرمائے۔

الحافظ مصری صاحب برطانیہ میں ایک امتیازی حیثیت رکھتے تھے۔ ریڈیو پر آپ کے خطاب، ٹیلیویژن پر تقاریر و مکالمات اور مختلف جرائد میں مضامین نے برطانیہ میں انھیں ایک قابل رشک ادیبانہ اور فاضلانہ مقام دیا۔ ان کی ایک کتاب انگریزی اور عربی میں ''الرفق بالحیوانات فی الاسلام'' (اسلام میں جانوروں کے حقوق) (The Islamic Concern for Animals) کے عنوان سے چھپی، جس میں سو کے قریب آیات قرآنی اور پچاس کے قریب احادیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوالہ جات سے اس موضوع پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ کتاب ساری دنیا میں خصوصاً مغربی ممالک میں بہت مقبول ہو رہی ہے۔ اسی موضوع پر آپ کی دوسری کتاب جو بہت جامع ہے ''اسلام اور حیوانات'' کے عنوان سے انگریزی میں زیر طبع ہے۔ موصوف ان کے علاوہ کئی دوسری کتابوں کے بھی مصنف تھے جو انگلش میں ہیں۔

زیر نظر مضمون میں الحافظ مصری صاحب نے اپنے ذاتی مشاہدات پر مبنی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، جو سب مسلمانوں کی آنکھیں کھول دے گا۔ خصوصاً ان سیدھے سادے نوجوانوں کے لیے جو قادیانیوں جیسے مذہبی دھوکہ بازوں کے دام فریب میں پھنس سکتے ہیں یا ان کی مظلومیت سے متاثر ہیں۔

میرے بہت سے دوستوں نے متعدد مرتبہ مطالبہ کیا ہے کہ میں قادیانیت پر مبنی اپنے مشاہدات اور خیالات قلم بند کروں، تاکہ میری زندگی میں ہی وہ ضبط تحریر میں آ جائیں۔ اس مختصر مضمون میں یہ ممکن نہیں کہ تفصیلات میں جایا جائے، اس لیے میں اختصار کے ساتھ صرف ان حالات کا خلاصہ درج کر رہا ہوں جن کی بناء پر میں نے قادیانیت کی بے راہ رو اور منافقانہ سرگرمیوں سے توبہ کی۔

1914ء میں سوئے اتفاق سے میں قادیان میں پیدا ہوا۔ میری پیدائش کی جائے وقوع کا حادثہ میری 74 سالہ زندگی میں کلنک کا ٹیکہ بنا رہا۔ بچپن میں مجھے یہ ذہن نشین کرایا گیا کہ ''احمدیوں'' کے علاوہ دنیا بھر کے سب مسلمان کافر ہیں۔ یہ درس و تدریس اس انتہا تک تھی کہ خدا کی ذات پر ایمان بھی نہیں ہو سکتا، جب تک کہ ''احمدیت'' کے بانی مرزا غلام احمد کی نبوت پر ایمان نہ ہو...... نیز یہ کہ اس کے جانشین ہی اب بندے اور خدا کے درمیان وسیلہ ہیں۔

لیکن اس کے برعکس جب میں نے سن بلوغت میں قدم رکھا تو اپنے اردگرد قادیانیوں کی

اکثریت کو بدکردار، عیار اور مکار پایا۔ اس میں شک نہیں کہ ان لوگوں میں چند ایسے بھی تھے، جو اس سلسلہ کے ابتدائی ایام میں اخلاص کے ساتھ اس جماعت میں شامل ہوئے تھے اور اس دھوکے کا شکار ہو گئے تھے کہ یہ تحریک اسلام میں ایک تجدیدی تحریک ہے، لیکن اس قسم کے مخلصین کی تعداد بہت کم دیکھنے میں آئی اور پھر جن کو نیک و مخلص پایا، ان میں بھی اکثر یا تو اتنے سادہ لوح تھے کہ ان میں اپنے گرد و نواح کے مذموم ماحول پر ناقدانہ نظر ڈالنے کی صلاحیت ہی نہ تھی اور یا پھر اپنے حالات کی مجبوریوں میں اتنے لاچار تھے کہ کچھ کر نہ پاتے تھے۔

میں نوعمری کے زمانہ میں اس قابل تو نہ تھا کہ ذہنی اعتبار سے اس بات کی اہمیت کو سمجھ سکتا کہ تحریک قادیانیت نے کس طرح اسلام کے مذہبی عقائد میں فتور ڈالنا شروع کر دیا ہے، البتہ ان لوگوں کے خلاف میرا ابتدائی ردعمل بداخلاقی اور جنسی بدکاریوں کی وجہ سے تھا۔ میری ذہنی اور روحانی نابالغی کی اس غیر پختگی کی حالت میں ہی قادر تقدیر نے مجھے طاغوتی آگ کی بھٹی میں پھینک کر میری آزمائش کی۔

میں ایک 18 برس کا صحیح الجسم اور کسرتی نوجوان تھا، جب مجھے خلیفہ قادیان بشیر الدین محمود کا پیغام ملا کہ وہ کسی نجی کام کے سلسلہ میں بلاتے ہیں۔ یہ وہ دور تھا کہ جب میں اس شخص کو نیم دیوتا سمجھا کرتا تھا اور اس جذبہ کے تحت میں نے اس پیغام کو باعث عزت و فخر کے طور پر لیا۔ مجھے گمان ہوا کہ ''حضور'' میرے ذمہ کوئی ایسا مذہبی کام لگانا چاہتے ہیں جو رازدارانہ قسم کا ہوگا۔

ہماری پہلی ملاقات باضابطہ اور مقررہ اسلوب کے مطابق رہی۔ خلیفہ مجھ سے ادھر ادھر کے ذاتی سوالات پوچھتا رہا اور میں باادب و احترام جواب دیتا رہا۔ رخصت ہوتے وقت مجھے یہ ''حکم'' دیا گیا کہ میں اس ملاقات کا کسی سے ذکر نہ کروں اور دوسری ملاقات کا تعین کر دیا۔ اس کے بعد مزید ملاقاتیں بتدریج غیر رسمی ہوتی گئیں اور مجھے رغبت دلائی گئی کہ میں ایک مخصوص ''حلقہ داخلی'' میں شامل ہو جاؤں۔

پتہ چلا کہ اس نیم دیوتا نے زناکاری کا ایک خفیہ اڈہ بنا رکھا ہے، جس میں منکوحہ، غیر منکوحہ حتیٰ کہ محرمات کے ساتھ کھلے بندوں زناکاریاں ہوتی ہیں۔ اس عیاشی کے لیے اس نے دلالوں اور کٹنیوں کی ایک منڈلی منظم کر رکھی ہے، جو پاکباز عورتوں اور معصوم دوشیزاؤں کو بہلا پھسلا کر مہیا کرتی ہیں۔ جو عورتیں اس طرح ورغلائی جاتیں، وہ اکثر ان خاندانوں کی ہوتی تھیں، جو اقتصادی لحاظ سے جماعتی نظام کے دست نگر ہوتے تھے یا جن کے دماغ اندھی تقلید سے معطل ہو چکے تھے۔ اس کے علاوہ اور بہت سی وجوہات اور مجبوریاں بھی تھیں، جن کے باعث بہت سے لوگ اس ظالمانہ فریب

کے خلاف مزاحمت کی طاقت نہ رکھتے تھے۔ گاہے بگاہے جب بھی کوئی ایسا شخص نکلا، جس نے سرکشی کی تو اس کا منہ بند کرنے کے لیے اسے جماعت سے خارج کر دیا جاتا، اس کا مقاطعہ کر دیا جاتا یا شہر بدری کا حکم صادر ہو جاتا اور اس کے خلاف منظم طریق طنز و استہزاء کی مہم شروع کر دی جاتی تا کہ اس کی بات پر کوئی بھروسہ نہ کرے۔

مرزا خاندان مذہبی اثر و رسوخ کے علاوہ قادیان اور گرد و نواح کی اکثر زمینوں پر حقوق جاگیرداری بھی رکھتا تھا اور روحانی عقیدت کے ساتھ ساتھ ساکنان قادیان، قوانین جاگیرداری میں بھی جکڑے ہوئے تھے۔ اپنے مکانوں کی زمینیں خریدنے کے باوجود بھی انھیں مالکانہ حقوق نہیں ملتے تھے اور ان کی زمین و مکانات جاگیردار کی اجازت کے بغیر غیر منقولہ ہی رہتے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو اپنا سب کچھ بیچ کر قادیان کی نام نہاد مقدس بستی میں اپنے بیوی بچوں کو بسانے کے لیے لائے تھے۔ اس قسم کے حالات میں اور خصوصاً اس زمانہ میں کون جرأت کر سکتا تھا کہ اس خاندان کا مقابلہ کرے۔ جن لوگوں نے ذرہ بھی صدائے احتجاج بلند کی، وہ یا تو اس طرح مار دیے گئے کہ ظاہراً کسی حادثہ سے مرے ہوں اور یا پھر ایسے لاپتہ ہو گئے کہ ان کا نام و نشان بھی نہ رہا۔ جب یہ سب ستم ہائے پارسائی ہو رہے تھے، مسلمان علماء سادگی میں یہ گمان کیے بیٹھے تھے کہ مرزائیت کو عقائد کی رو سے مناظروں اور مباحثوں کے مچانوں میں شکست دے دیں گے۔

جب میں اس انتہائی ذلیل اور وحشیانہ ماحول سے دوچار ہوا تو اپنی لاچارگی کے احساس سے دماغ مختل ہو گیا۔ مجھے ابھی تک وہ بیدار راتیں یاد آتی ہیں جن میں، میں بے یار و مددگار خاموش آنسوؤں سے اپنے تکیے تر کیا کرتا تھا۔ اس خیال سے کہ میری باتوں پر یقین نہیں کیا جائے گا، میں اپنے والدین کو بھی نہیں بتا سکتا تھا کہ کیا اودھم مچا ہوا ہے؟ اسی طرح اپنے دوستوں سے بھی ان حالات پر تبادلہ خیالات نہ کر سکتا تھا کہ کہیں وہ خلیفہ کے مخبروں سے ذکر نہ کر دیں۔ میرے لیے ایک راستہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ کہیں روپوش ہو جاؤں، لیکن اس کا ایک نتیجہ یہ ہوتا کہ یونیورسٹی میں میری تعلیم چھوٹ جاتی۔ اس کے علاوہ یہ اخلاقی ذمہ داری بھی مانع تھی کہ اپنے والدین کو ان بدچلنیوں اور بدکاریوں سے لاعلمی کی حالت میں چھوڑ کر فرار ہو جانا، ان سے دغا کرنے کے مترادف ہوگا۔

اس ذہنی کشمکش کی حالت میں یہ خیال بھی آتا کہ اس مذہبی دھوکہ باز کو قتل کر دوں، لیکن باوجود کم عمری کے منطقی استدلال غالب آ جاتا کہ قتل کی صورت میں عوام الناس یہ غلط نتیجہ نکال لیں گے کہ قاتل کوئی مذہبی متعصب تھا اور مقتول کو تاریخی اسناد ایک شہید کا درجہ دے دیں گی۔ پھر یہ بھی سوچتا تھا کہ فوری اور ناگہانی موت اس شخص کے لیے عقوبت کی بجائے ایک نعمت بن جائے گی۔ اس

قسم کا شخص تو ایسی موت مرنے کا مستحق ہوتا ہے جو معذ بانہ ہو، محض اس لیے نہیں کہ وہ اس قسم کے پاجیانہ اور ظالمانہ افعال کرتا ہے، بلکہ خصوصاً اس لیے کہ وہ یہ افعال مذمومہ خدا اور مذہب کے نام پر کرتا ہے۔

چنانچہ بعد کے حالات نے میری توجیہات کی تصدیق کی۔ انجام کار یہ شخص (مرزا بشیر الدین محمود) فالج میں مبتلا ہو کر کئی سال تک گھسٹتا رہا اور ایڑیاں رگڑتے جہنم رسید ہوا۔ ایک ڈاکٹر نے جو آخری ایام میں اس کا معالج تھا، بتایا کہ وہ انتہائی ضعیف العقل ہو چکا تھا اور کلمہ یا اور کسی دعا کی بجائے، فحش اناپ شناپ بکتے اس نے دم توڑا۔

ان سب توجیہات کے علاوہ ایک وجہ اور بھی تھی، جس کے ماتحت میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس ایک فرد کا قتل بے نتیجہ اور بے اثر ہوگا۔ مجھ پر یہ حقیقت واضح ہو چکی تھی کہ قادیان کے معاشرہ میں اس قسم کی بدچلنیاں اور بدمعاشیاں اس ایک شخص کے مر جانے سے ختم نہ ہوں گی۔ صرف یہ بدذات شخص اکیلا جنسی خبط میں مبتلا نہ تھا، بلکہ اس کے دونوں بھائی اور نام نہاد ''خاندان نبوت'' کے اکثر افراد بھی اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ اس جماعت کے سرکردگان جو ذمہ دارانہ عہدوں پر فائز تھے، ان میں سے بھی اکثر نمائشی داڑھیوں کو لہراتے اپنے اپنے سیاہ کاریوں کے اڈے جمائے بیٹھے تھے اور یہ سب کچھ ان لوگوں کی آپس میں اس خاموش تفہیم کے ماتحت ہو رہا تھا کہ ''تم میری داڑھی نہ نوچو تو میں تمہاری داڑھی نہ نوچوں گا۔''

درحقیقت قادیان کے نظام میں اعلیٰ عہدوں پر تقرر اکثر اسی قماش کے لوگوں کا ہوتا تھا جو مرزا خاندان کے اسلوب زندگی اور ان کی جنسی قدروں کو اپنا لیتے تھے، یعنی اس خاندان کی مطلق العنان جنسی قدروں کے مطابق جس خاندان کو یہ لوگ ''خاندانِ نبوت'' کے نام سے موسوم کرنے کی جرأت اور گستاخی کرتے ہیں۔

یہ کوئی غیر متوقع بات نہ تھی کہ اس قسم کی اخلاقی قیود سے آزاد عیاشیوں کی افوائیں باہر بھی پھیلنا شروع ہو گئیں اور باہر سے اوباش نوجوان اس جماعت میں شامل ہونے لگے، تاکہ ان جنسی پابندیوں سے آزاد ہو جائیں جو ایشیائی تمدن وثقافت ان پر عائد کرتا ہے اور اس طرح یہ شیطنت ماب دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا۔

خلیفہ کے اس خفیہ اڈے سے قطع تعلق کر لینے کے بعد میری زندگی دائمی طور پر خطرہ میں رہنے لگی۔ اس کے غنڈوں نے سایہ کی طرح میرا تعاقب کرنا شروع کر دیا۔ ایسی مایوس کن اور پرُخطر حالت میں میرے لیے کوئی چارہ نہ تھا، سوائے اس کے کہ کھلم کھلا مقابلہ پر اتر آؤں اور انجام خدا پر

چھوڑ دوں۔ چنانچہ میں خلیفہ سے ملنے گیا اور اسے ایک تحریر کی نقل دکھائی جس میں، میں نے اس کی کرتوتوں کی تفاصیل لکھی تھیں اور اس کے شرکائے جرم کے نام، تاریخیں وغیرہ درج کی تھیں۔ میں نے اسے بتایا کہ اس تحریر کی نقول میں نے بعض ذمہ دار احباب کے پاس محفوظ کرا لی ہیں اور انھیں ہدایت کی ہے کہ ان لفافوں کو میری موت یا میرے لاپتہ ہو جانے پر کھول لیا جائے۔ اس حکمت عملی نے مطلوبہ مقصد پورا کر دیا اور میں بلاخوف وخطر، آزادی سے قادیان کے گلی کوچوں میں پھرنے لگا۔

جیسے جیسے مجھ پر قادیان کے اس گندے ماحول کا انکشاف ہوتا گیا، اسی نسبت سے میں مذہب سے بیزار ہوتا گیا۔ صرف قادیانی مذہب سے ہی نہیں، بلکہ مجموعی طور پر مذہب کے ادارے سے اور بتدریج یہ حالت دہریت تک پہنچ گئی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس سقیم حالت نے ایک روحانی خلاء بھی پیدا کر دیا، جس کو پر کرنے کے لیے میری تنہا ذات میں طاقت نہ تھی۔ مجھے اپنے والد صاحب کو یہ سب حالات بتانا پڑے جو طبعًا ان کے لیے انتہائی صدمہ کا باعث ہوئے۔ قدرتاً وہ ایک بچے کی باتوں کو بلا تصدیق مان نہیں سکتے تھے، لیکن انھوں نے محتاط طور پر تحقیقات کرنا شروع کر دیں اور کچھ عرصہ میں ہی ان پر ثابت ہو گیا کہ میں سچ کہہ رہا ہوں۔

میرے والد صاحب نے اس نام نہاد خلیفہ کو ایک خط لکھا جس میں مطالبہ کیا کہ وہ ان الزامات کی تکذیب کرے یا اپنی بدکاریوں کا کوئی شرعی جواز پیش کرے یا پھر خلافت سے معزول ہو جائے۔ اس خط کا خلیفہ نے کوئی جواب نہ دیا، لیکن دو مزید خطوط کے بعد اس نے اعلان کر دیا کہ شیخ عبدالرحمان مصری (یعنی میرے والد صاحب) اور ان کے خاندان کے سب افراد کو جماعت سے خارج کر کے ان کا مقاطعہ کیا جاتا ہے۔ میرے والد صاحب کے یہ تینوں خطوط اس زمانہ میں چھپ گئے تھے۔

اس قسم کے مقاطعہ کے اصل ہتھکنڈے یہ ہوتے تھے کہ کسی شخص یا خاندان کا کلیتًا بائیکاٹ کر کے اس کا ''حقہ پانی'' بند کر دیا جاتا تھا۔ ان حالات میں ہمارے خاندان کی جانیں اتنے خطرہ میں تھیں کہ حکومت کو ہماری حفاظت کے لیے فوجی پولیس کے دستے متعین کرنا پڑے جو 24 گھنٹے ہمارے مکان کے گرد پہرہ دیتے تھے۔ ہم میں سے کسی کو بھی بغیر پولیس کی نگرانی کے گھر سے جانے کی اجازت نہ تھی، لیکن باوجود اس قسم کی حفاظتی پیش بندیوں کے، مجھ پر اور میرے دو ساتھیوں پر قادیان کے بڑے بازار میں دن دھاڑے حملہ ہو گیا۔ میرے ایک سن رسیدہ ساتھی کو چاقو کا گھاؤ لگا، جس سے وہ جاں بحق ہو گئے۔ دوسرے ساتھی کو گردن اور کندھے پر چاقو سے زخم آئے اور انھیں کافی عرصہ ہسپتال میں رہنا پڑا۔ مجھے پروردگار نے اس طرح بچا لیا کہ میرے ہاتھ میں ایک پہاڑی ڈنڈا

تھا، جو میں حملہ آور کی کھوپڑی میں اتنے زور سے مارنے میں کامیاب ہو گیا کہ اس کے سر سے خون بہنے لگا۔ اس زخمی حملہ آور کو اس کے شرکائے جرم سہارا دے، کر آناً فاناً غائب ہو گئے اور اسے ایک ایسی پوشیدہ جگہ میں چھپا دیا جو پہلے سے معین کر رکھی تھی، لیکن پولیس اس کے سر سے ٹپکے ہوئے خون کے قطرات دیکھ کر وہاں پہنچ گئی اور اسے گرفتار کر لیا۔ عدالت عالیہ میں اس کا جرم ثابت ہوا اور اسے پھانسی دی گئی۔ اس زمانہ کی قادیانی ''ریاست'' میں امن و قانون کی اتنی برملا تحقیر کی گئی کہ قاتل کی میت کا جلوس دھوم دھام سے نکالا گیا اور خلیفہ نے خود نماز جنازہ پڑھائی، جو قادیانی مریدوں کی نظر میں بہت بڑی عزت افزائی سمجھی جاتی تھی۔

اس حادثہ کے بعد مسلمانوں کی ایک جماعت ''مجلس احرار الاسلام'' نے ہماری حفاظت کے لیے رضا کاروں کے جتھے بھیجنا شروع کر دیے، جو فوجی پولیس کے علاوہ تھے۔ ان رضا کاروں نے ہمارے بنگلے کے گرد میدان میں خیمے نصب کر دیے اور ہمارا گھر ایک محصور قلعہ کی طرح بن گیا۔ اس اثناء میں مرزائی ٹولے نے میرے والد صاحب کو جعلی مقدمات میں الجھانا شروع کر دیا، تاکہ جماعت میں ان کی ساکھ اُٹھ جائے، نیز یہ کہ ان پر مالی بوجھ پڑے۔ الغرض وہ تمام کمینی چالیں چلی گئیں، جن سے ان کی زندگی اجیرن ہو جائے۔ اپنے گیارہ بچوں پر مشتمل کنبے کی پرورش کے لیے نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ انھیں خاندانی زیورات اور گھر کے ساز و سامان بیچ بیچ کر گزارا کرنا پڑا۔ ان آفات انگیز حالات کا سب سے بڑا سانحہ یہ تھا کہ اس دوران خاندان کے بچوں کی تعلیم کے سلسلہ میں خلل پڑ گیا۔ ہم اس حملہ اور دیگر زیادتیوں کے حالات ہندوستان کے اخبارات میں باقاعدہ بھیجتے رہتے تھے۔

ہمارے خاندان کو سرکاری افسران اور بہت سے مخلص دوست احباب کی طرف سے بھی یہ ترغیب دی جا رہی تھی کہ ہم قادیان سے نقل مکانی کر لیں اور ہم طوعاً و کرھاً لاہور منتقل ہو گئے۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے، میرا ایمان بحیثیت مجموعی ہر مذہب سے اٹھ چکا تھا، اس لیے میں نے اپنے آپ کو ان بندھنوں سے آزاد رکھا۔ زندگی کے اس دور میں میرا تعلق مجلس احرار الاسلام کے سرکردہ احباب سے بڑھنا شروع ہو گیا، جو میرے لیے بہت روح افزا ثابت ہوا۔ ان بزرگوں میں سے بعض کے نام درج کرنا ضروری محسوس کرتا ہوں۔ مثلاً سید عطاء اللہ شاہ بخاری صاحب، مولانا حبیب الرحمان صاحب لدھیانوی، چوہدری افضل حق صاحب، مولانا مظہر علی صاحب اظہر وغیرہ۔ ان سب کو قریب سے دیکھنے پر احساس ہوا کہ یہ لوگ نیک سیرت مسلمان اور پُرخلوص دوست ہیں۔

گو میرے والد صاحب نے میری دہریت کو ظاہراً تسلیم و رضا کے ساتھ قبول کر لیا تھا، لیکن میں جانتا تھا کہ دل میں یہ صدمہ ان کے لیے سوہان روح بنا ہوا ہے، وہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ

میرے لیے بہت دعائیں کرتے ہیں اور مجھے بھی نصیحت کرتے رہتے تھے کہ میں دعاؤں کے ذریعہ اللہ سے ہدایت کا طالب ہوں۔ اس کا جواب میں یہ دیا کرتا تھا کہ آپ مجھ سے ایک ایسی ہستی سے دعا کرنے کو کہہ رہے ہیں جس کا وجود ہی نہیں۔ ایک عرصہ کے بحث و مباحثہ کے بعد انھوں نے یہ مشورہ دینا شروع کیا کہ میں اپنی دعاؤں کو مشروطی رنگ میں کیا کروں۔ اور میں نے اس قسم کے اناپ شناپ الفاظ میں دعائیں کرنا شروع کر دیں، ''یا اللہ! مجھے یقین ہے کہ تیری کوئی ہستی نہیں، لیکن اگر تیری ہستی ہے تو اس کی کوئی علامت مجھ پر ظاہر کر، ورنہ مجھے قابل الزام و ملامت نہ ٹھہرانا کہ میں تجھ پر ایمان نہ لایا'' وغیرہ وغیرہ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ راسخ العقیدہ مومنوں کی نظر میں اس قسم کی دعا کلمہ کفر کے مترادف ہیں اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی شان پاک میں بے ادبی ہے، لیکن اس کے باوجود میری اس طرح کی دعائیں میرے لیے ایسی کارگر ثابت ہوئیں کہ ایک سال کے عرصہ میں ہی ان کے روحانی نتائج نکل آئے۔ مجھے تواتر کے ساتھ دو خواب دکھائے گئے۔ چونکہ، وہ خواب شخصی اور نفسیاتی کیفیت کے ہیں، اس لیے ان کے بیان کرنے کی جرأت نہیں کرتا۔ صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہوگا کہ یہ خواب، خصوصاً دوسرا خواب بہت لمبا، آسانی سے سمجھ میں آنے والا اور مربوط تھا۔ ایسا کہ مجھ ایسے گنہگار کے لیے بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات پر کسی شک وشبہ کی گنجائش باقی نہ رہی۔ یہاں پر اتنا بتا دینا مناسب ہوگا کہ دوسرے خواب کے آخری لمحات میں مجھے مرزائی خلیفہ کا چہرہ دکھایا گیا جو بھیانک طور پر سیاہ فام اور فسق و فجور سے مسخ شدہ تھا۔

ان خوابوں کے بعد میرے دل و دماغ سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا اور میں نے فیصلہ کیا کہ اپنی کتاب زندگی کا نیا ورق الٹا کر باضابطہ اسلام قبول کرلوں، چنانچہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری مجھے اپنے ساتھ مولانا محمد الیاس صاحب کے ہاں مہرولی لے گئے۔ مہرولی، دہلی سے چند میل پر وہ قصبہ ہے جہاں مولانا محمد الیاس صاحب نے تبلیغی جماعت کی بنا ڈالی تھی۔ اس طرح 1940ء میں، میں مولانا محمد الیاس صاحب جیسے بزرگ کے ہاتھ پر بیعت کر کے مسلمان ہوا۔ اس مبارک موقع پر یہ حسن اتفاق تھا کہ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب بھی موجود تھے۔ مغرب کی نماز پڑھانے کے بعد مولانا محمد الیاس صاحب اور چالیس 40 کے قریب معتقدین نے میرے حق میں دعا کی۔

1941ء میں، میں مشرقی افریقہ ہجرت کر گیا۔ ہندوستان کو خیرباد کہتے ہوئے میرے احساسات مسرت و الم کا مرکب تھے۔ بمبئی کی بندرگاہ میں جہاز کے عرشہ پر کھڑے زیرلب میں قرآن مجید کی یہ آیت تلاوت کر رہا تھا ''اور تمھارے پاس کیا عذر برات ہے کہ تم ان ضعیف و بے بس

مردوں، عورتوں اور بچوں کی مدد کے لیے اللہ کی راہ میں جنگ نہیں کرتے، جو آہ وزاری سے دعائیں مانگ رہے ہیں کہ اے ہمارے رب ہمیں اس بستی سے نجات دلوا، جس کے باشندے ظالم ہیں۔'' (سورۃ النساء: 75)

افریقہ میں بیس سال کی سکونت کے بعد میں نے 1961ء میں انگلینڈ ہجرت کر لی، جہاں پہلے 4 برس کے قریب، بطور طالب علم، اپنی تعلیمی کمزوریوں کو دور کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس کے بعد ''اسلامک ریویو'' رسالہ کا بالاشتراک ایڈیٹر بن گیا اور 1964ء میں شاہ جہاں مسجد ووکنگ کا سب سے پہلا مسلمان امام مقرر کیا گیا۔ یہ مسجد برطانیہ میں سب سے پہلی مسجد تھی اور اس زمانہ میں سارے یورپ کے اسلامی مرکز کی حیثیت رکھتی تھی۔ پانچ سال کی امامت کے بعد 1968ء میں مستعفی ہو کر بذریعہ کار قریباً 43 ممالک کا تین برس تک دورہ کرتا رہا، جن میں زیادہ تر اسلامی ممالک تھے۔ اس دورہ کا اصل مقصد اپنی ایک دیرینہ خواہش کو پورا کرنا تھا کہ بلاتوسط، بچشم خود مطالعہ کروں کہ اسلامی دنیا میں، عوام الناس کس طرح اسلامی قدروں کو عملی طور پر نبھا رہے ہیں۔ میری ہنگامی اور نزاعی زندگی میں خدا نے جو سب سے زیادہ مسرت بخش اسلام کی خدمت کرنے کی مجھے توفیق دی، وہ یہ تھی کہ ووکنگ مسجد کی امامت سے مستعفی ہونے سے قبل ایسے حالات پیدا کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ اس مسجد اور مرکز میں اب کبھی بھی کسی مرزائی امام کا تقرر نہیں ہوسکتا۔ وما توفیقی الا باللہ۔

چونکہ میرے الزامات اخلاقی خباثت اور جنسی گناہ ہائے کبیرہ کو فاش کرنے سے متعلق ہیں، جن میں اس قسم کی کریہہ باتیں بھی کہنا پڑیں گی جن کا ذکر عام طور پر شریف معاشرے میں نہیں کیا جاتا۔ اس لیے اس کی توضیح کر دینا ضروری ہے کہ کن وجوہات کی بناء پر میں اس قسم کی شرمناک باتوں کو قلمبند کرنا محض بجا ہی نہیں بلکہ اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہوں۔

عام طور پر کسی ایک فرد کو یہ حق نہیں ہوتا کہ وہ دوسرے فرد پر ناقد بن کر بیٹھ جائے لیکن جب کوئی شخص کسی اہم اور اخلاقی ذمہ داری کے عہدہ پر فائز ہوتا ہے تو اس کی انفرادیت ادارہ کا جزو بن جاتی ہے۔ ایسی صورت میں اس کے انفرادی اختیارات وحقوق، ادارہ کے حقوق واختیارات میں مدغم ہو جاتے ہیں۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ ہر مہذب معاشرہ میں ڈاکٹر، مدارس کے معلمین محتاجین کے اداروں اور یتیم خانوں کے کارکنان، غرضیکہ ہر اس قسم کے کارندوں پر سرکاری قوانین کے علاوہ اخلاقیات اور نیک چلنی کے قواعد کی پابندی بھی عائد ہو جاتی ہے۔ باوجود اس کے ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کے معاشرے میں مذہبی ڈھونگئے اور جعلساز اخلاقی قواعد کی پابندی سے آزاد رہتے ہوئے سادہ لوح اور کم عقل لوگوں کو دھوکہ دیتے رہتے ہیں۔ اس قسم کے مذہبی ڈھونگیوں پر اخلاقی پابندیاں اس لیے

عائد کرنا مشکل ہوتی ہیں کہ دنیوی حکومتیں مذہبی معاملات میں دخل دینا پسند نہیں کرتیں۔ وہ اسی میں عافیت سمجھتی ہیں کہ اخلاقی نظم ونسق کی پابندی مذہبی اداروں پر ہی چھوڑ دو۔ اس طرح مذہبی اداروں پر تنقیدی نظر رکھنا معاشرے کی ذمہ داری بن جاتی ہے۔

ان کریہہ باتوں کے بیان کرنے کی دوسری وجہ معقول یہ ہے کہ قادیانی جماعت کے سرکردہ گروہ نے جو جنسی اور اخلاقی قواعد کی خلاف ورزی شروع کی ہوئی ہے، وہ انفرادی یا شخصی حیثیت سے نہیں کی جارہی بلکہ ان بداعمالیوں کو ایک جتھہ بندی اور تنظیم کا روپ دے دیا گیا ہے اور طرہ یہ کہ یہ سب کچھ اسلام کے نام پر کیا جارہا ہے۔ اگر یہ لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہلانا چھوڑ کر ایک نئے مذہب کا اعلان کر دیں اور اپنی جماعت کا نام ''احمدی'' کی بجائے کوئی بھی اور غیر مسلم نام رکھ لیں تو مسلمان ان سے مذہبی معاملات میں الجھنا بند کر دیں گے۔

میرے الزامات قادیانی جماعت کے ہر شخص کے خلاف نہیں، اس جماعت میں بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں، جو دیانت داری اور اخلاص سے قادیانی عقائد پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ وہ عقائد غلط اور غیر اسلامی ہیں۔ ہم مذہبی عقائد میں اختلافات کی بناء پر کسی سے مار پیٹ نہیں شروع کر دیتے لیکن جب کوئی منظم گروہ مذہب وعقائد کے روپ میں معاشرہ کے طریقہ ماند و بود میں تخریب پیدا کرنا شروع کر دے، تب ہی عوام الناس اس تخریب کی روک تھام کے لیے ایستادہ ہوتے ہیں۔ اگر بنی نوع انسان میں اس قسم کے ناخلف اور بے غیرت لوگ موجود ہیں، جو اپنی محرم بہو بیٹیوں اور نوعمر بیٹوں کی آبرو اور عصمت کو اپنے بدچلن پیروں کی پرجوش عقیدت پر قربان کر دینے کے لیے تیار ہیں تو ایسے بھیڑیوں کو کون بچا سکتا ہے۔ بحث طلب مسئلہ تو آبرودار معاشرے کے لیے ہے جس میں سادہ لوح انسان نادانستہ اس قسم کے دھوکوں کا شکار ہونے لگیں۔ ایسی حالت میں معاشرہ کو اختیار ہو جاتا ہے کہ وہ شرفاء کو مار آستین سے خبردار کریں۔

''میں اللہ تعالیٰ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر میں جھوٹا بیان دوں، تو مجھ پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو اور میں ایک سال کے عرصہ میں مر جاؤں کہ

(الف) مرزا طاہر احمد (چوتھا قادیانی خلیفہ) کا والد مرزا بشیر الدین محمود احمد (جو بانی سلسلہ احمدیہ، مرزا غلام احمد کے تین بیٹوں میں سب سے بڑا بیٹا اور قادیانی جماعت کا خلیفہ ثانی تھا) بدکار تھا، اور منکوحہ وغیر منکوحہ عورتوں کے ساتھ زنا کرنے کا عادی تھا، حتیٰ کہ خاندان کی ان عورتوں کے ساتھ بھی زنا کیا کرتا تھا جن کو نہ صرف اسلامی شریعت نے، بلکہ سب الہامی مذاہب نے محرمات قرار دیا ہے۔

(ب) مرزا طاہر احمد کا پدری چچا مرزا بشیر احمد (جو مرزا غلام احمد کے تین بیٹوں میں دوسرے نمبر کا بیٹا تھا اور جسے قادیانی "قمر الانبیاء" کہتے ہیں) لواطت کا عادی تھا اور بالخصوص، اسے نوعمر لڑکوں سے بدفعلی کی بہت عادت تھی۔

(ج) مرزا طاہر احمد کا پدری چچا مرزا شریف احمد (جو مرزا غلام احمد کے تین بیٹوں میں تیسرے نمبر کا بیٹا تھا) لواطت کا عادی تھا اور مرزا بشیر احمد کی طرح اسے بھی نوعمر لڑکوں سے بدفعلی کی بہت عادت تھی۔

(د) مرزا طاہر احمد کا بڑا بھائی مرزا ناصر احمد (پسر مرزا بشیر الدین محمود احمد قادیانی، مرزا غلام احمد کا پوتا اور قادیانی جماعت کا خلیفہ ثالث) زانی ہونے کے علاوہ لواطت بھی کیا کرتا تھا۔

(ر) مرزا طاہر احمد کی دادی کا بھائی (یعنی مرزا غلام احمد کی بیوی کا بھائی) میر اسحاق قادیانی جماعت کے نظام میں ایک بلند اور باعزت حیثیت رکھتا تھا اور محدث کے خطاب سے سرفراز ہوا تھا۔ وہ بھی لواطت کا عادی تھا۔ قادیان کے یتیم خانہ کے محاسب ہونے کی حیثیت میں بیچارے کم سن یتیم بچے اس کی برگشتہ خواہشات شہوانی کے شکار ہوا کرتے تھے۔

اگر میں چاہوں تو بہت سے ایسے ناموں کی فہرست لکھ سکتا ہوں جو قادیانی نظام میں بڑے بڑے عہدوں پر مامور تھے اور جو اپنے اثر و رسوخ کے بل بوتے پر اپنی شہوانی برگشتیوں میں اخلاقی پابندیوں سے آزاد تھے، لیکن ان فحش باتوں کی زیادہ تفاصیل لکھنے کی ضرورت نہیں۔

برایں حال، میں نے مذکور بالا الزامات کو صرف مرزا خاندان تک ہی محدود رکھا ہے، تاکہ اس تنقیح طلب امر میں کسی غلط فہمی کا امکان نہ رہ جائے اور آپ کو اس مباہلہ کے ضابطہ سے کوئی راہ فرار نہ ملے۔ یہی وجہ ہے کہ مرزا خاندان سے بھی دوسری اور تیسری نسلوں کے کسی فرد کو اس فہرست میں شامل نہیں کیا۔ اس خاندان کی خواتین کے نام شامل نہ کرنے کی زیادہ تر وجہ یہ ہے کہ ان پر ترس آتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ان خواتین میں بعض ایسی بھی تھیں، جنھوں نے اس قسم کی مذموم حرکات میں اپنی رضا مندی سے حصہ لیا، لیکن ان میں بہت سی ایسی بھی تھیں جو قصور وار نہ تھیں اور اس دام فریب میں مجبوراً پھنسی ہوئی تھیں، ان کے لیے اپنے مردوں سے تعاون کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا، ان کی حالت تنقید کی بجائے رحم کی مستحق تھی۔

میں اپنے مسلمان بھائیوں اور بہنوں کو ایک مشورہ دینے کی جرأت کرتا ہوں، اس توقع پر کہ مسلم اکابرین اور اسلامی حکومتوں کے سربراہ ان خیالات اور جذبات کو کماحقہ، اہمیت دیں گے۔

میرے یہ تاثرات قادیانیوں کے ساتھ عمر بھر کی آویزش اور تجربات پر مبنی ہیں۔ مرزائیت کے عقائد اور فرقہ بندیوں میں اب اسلام کے لیے کوئی خطرہ باقی نہیں رہا۔ اس مذہبی فریب کا بھونڈا چہرہ مدت سے بے نقاب ہو چکا ہے۔ اسلام میں بطور دین حق کے، پوری صلاحیت ہے کہ اس قسم کی غیر شرعی تحریکوں کا مقابلہ کر سکے لیکن مرزائیت کی طرف سے اب ایک نئے قسم کا خطرہ پیدا ہو رہا ہے۔ قادیانی ٹولے نے اب بین الاقوامی سیاست میں بھی ناٹک کھیلنا شروع کر دیا ہے اور دشمنان اسلام کے پاس چوری چھپے اپنی خدمات بیچنا شروع کر دی ہیں۔ جاسوسی کا پیشہ، ہمیشہ پر منفعت ہوتا ہے، لیکن جب غیر ممالک میں جاسوسی کے اڈے مذہب کے نام پر تبلیغی مراکز کے بھیس میں کھولے جائیں تو یہ گماشتگی سودمند ہونے کے ساتھ خطرہ سے آزاد اور آسان بھی ہو جاتی ہے۔ غیر مسلموں کا عام طور پر یہ خیال ہے کہ ہماری طرف سے مرزائیت کی مخالفت محض مذہبی تعصب کی بنا پر ہو رہی ہے، وہ یہ حقیقت نہیں سمجھ پاتے کہ عقائد کے اختلافات کے علاوہ قادیانی منڈلی کو اسلام دشمن قوموں نے خرید رکھا ہے اور انھیں اسلامی ممالک میں اپنے سیاسی اور اقتصادی فوائد کو فروغ دینے کے لیے شریک کار بنا رکھا ہے۔ ان سب ملاحظات کے علاوہ مرزائیت کی مخالفت کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ مسلم شرفاء کے دلوں میں یہ تشویش رہتی ہے کہ قادیانی معاشرہ کا زندانہ رنگ، کہیں ان کے اپنے نوجوانوں پر نہ چڑھ جائے اور ان کی اخلاقی قدروں کو گھن نہ لگا دے۔

جی آر اعوان

احمقوں کی جنت

ربوہ میں بس کے ذریعے آئیں تو سڑک کی ایک جانب پہاڑ ہی پہاڑ اوران کے دامن میں مرزائیوں کا جنت دوزخ ہے جبکہ دوسری جانب دریائے چناب تک شہر آباد ہے۔ تاہم دریا کے قریب سڑک کے دونوں جانب آبادیاں ہیں۔ پرانے اڈے سے شہر کی طرف داخل ہوں تو ایک طرف قصر خلافت اور اس سے ملحقہ ''پوش علاقہ'' ہے۔ لاری اڈے سے شہر آنے والی یہ سڑک دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے، جس کے ایک حصے پر قصر خلافت، جامعہ نصرت کالج ونصرت گرلز ہائی سکول ہے اور دوسری جانب یہی سڑک امور عامہ اور تحریک جدید کے دفاتر کے سامنے سے گزرتی ہوئی گول بازار میں داخل ہو جاتی ہے۔ گول بازار بھی دراصل گول نہیں بلکہ درانتی کی مانند آدھا گول ہے۔ اب تو شہر کی شکل بدل چکی ہے، تاہم 1965ء میں اس کی صورت ایسی ہی تھی، جیسی بتلائی جا رہی ہے۔ دکانوں کا سلسلہ منان ٹیلر کی دکان سے شروع ہو کر زیرہ ہاؤس پر ختم ہوتا تھا۔ زیرہ ہاؤس کے سامنے سے ایک سڑک گزرتی ہے جو ریلوے پھاٹک کو کراس کرتی ہوئی شہر کے دوسرے حصے کی طرف جاتی ہے، جس پر فضل عمر ہسپتال، ٹیلی فون ایکسچینج اور تنویر سٹوڈیو وغیرہ آتے ہیں۔ ریلوے لائن شہر کے وسط میں سے گزرتی ہے جس کے ساتھ ساتھ جانے والی ریلوے روڈ دریا کی طرف اور غلہ منڈی اور فیکٹری ایریا کی طرف جاتی ہے۔ دریا کی طرف جانے والی اسی سڑک پر جامعہ احمدیہ، تعلیم الاسلام ہائی سکول اور تعلیم الاسلام کالج ہیں۔

ربوہ کے تمام داخلی راستوں پر بڑے بڑے سائز کے بورڈ آویزاں تھے جن پر جلی حروف میں ''سگریٹ نوشی ممنوع ہے'' لکھا ہوا تھا۔ یہاں آنے والے اجنبی ان بورڈوں کو پڑھ کر اکثر سگریٹ پھینک دیتے یا جیبوں میں اچھی طرح چھپا دیا کرتے تھے۔ میں نے شہر میں پھرتے ہوئے دیکھا کہ ہر کریانے کی دکان پر نہ صرف سگریٹ فروخت ہوتے بلکہ چلتے پھرتے لوگ سگریٹ پیتے بھی نظر آتے تھے، جبکہ پان سگریٹ کے کئی کھوکھے بھی تھے۔ گول بازار میں پان سگریٹ کی سب سے بڑی دکان ''فہیم موٹے'' کی تھی۔ اس سلسلے میں لوگوں سے پوچھا گیا کہ جب شہر میں سگریٹ نوشی

ممنوع ہے تو یہاں سگریٹ کی دکانیں کیوں ہیں؟ بتایا گیا کہ سرعام سگریٹ پینا منع ہے۔ گھروں کے اندر سگریٹ، حقہ اور بیڑی پی جا سکتی ہے۔ بعد میں پتہ چلا، یار لوگ پینے والی بہت سی چیزیں چھپ کر پی لیں تو ان پر کوئی گرفت نہیں ہوتی تھی۔ جب سرعام سگریٹ پینے والوں کا ذکر کیا گیا تو ایک شرمندہ سے تبسم کے علاوہ کوئی جواب نہ مل سکا۔

ربوہ میں اردو کے ایک پروفیسر ڈاکٹر ناصر احمد پرویز پروازی تھے جن کے والد مولوی احمد خان نسیم مرزائی مبلغ تھے جو پاکستان بھر کے دیہات کے دورے کر کے سادہ لوح دیہاتیوں کو گھیر گھار کر مرزائی بناتے تھے۔ ڈاکٹر ناصر احمد پرویز پروازی ''قینچی'' کے سگریٹ پیتے تھے۔ ان کے لیے شہر کا ایک مخصوص دکان دار خصوصی طور پر اس برانڈ کے سگریٹ منگوایا کرتا تھا۔ ڈاکٹر پروازی جامعہ احمدیہ کے کواٹروں میں رہتے تھے۔ ریلوے لائن کے کنارے کنارے چلتے ہوئے جب وہ تعلیم الاسلام کالج پڑھانے جاتے تو کھلے عام سگریٹ پیتے ہوئے جاتے تھے جب کہ ایم ایم احمد کے بھائی ہسٹری کے پروفیسر مرزا مجید عرف میاں موجی تو کار میں آتے جاتے، کلاس پڑھاتے وقت اور سرعام بھی ''پائپ'' منہ میں ٹھونسے رکھتے تھے۔ شہر میں سگریٹ نوشی کی جتنی ممانعت تھی، اتنی زیادہ سگریٹ کی فروخت ہوتی تھی۔ مرزائیت کو میرا نارسا ذہن تو پہلے ہی سمجھتا تھا، مگر سگریٹ نوشی کے متعلق ان کی دورنگی نے ''مرزا غلام احمد'' کی نبوت کا فلسفہ مزید واضح کر دیا کہ مرزائیت منافقت آگیں اور دو نمبر مذہب ہے۔

''رحمت بازار غلہ منڈی'' میں لاہور ہاؤس، شاہد کلاتھ ہاؤس، بھٹی چیپ سٹور، سلیم ورائٹی ہاؤس، نعیم پمپی ہاؤس اور دارالخیر جنرل سٹور بہت مشہور دکانیں تھیں۔ دکاندار تو سارے ہی مرزائی اور اپنے ''نبی'' کی طرح بڑے طرار تھے لیکن شاہد کلاتھ ہاؤس اور دارالخیر جنرل سٹور والے سب پر بازی لے گئے تھے۔ یہ دونوں ہاتھوں سے لوٹتے بھی تھے اور ان کی دکانوں میں حوروں کی بھیڑ بھی لگی رہتی تھی۔ بتانے والے بتاتے ہیں کہ دارالخیر جنرل سٹور کے مالک امین کی بیوی معمولی شکل وصورت کی خاتون تھی۔ اس کے ایک دوست نے اس کی توجہ اس جانب مبذول کرائی تو امین نے بے نیازی سے کہا اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ شہر کی ہر ماہ جبین تو میری جیب اور دکان پر ہوتی ہے۔ گول بازار میں بھی بہت سی دکانیں تھیں لیکن مون لائٹ جنرل سٹور، بیت اللباس اور احمدیہ ماڈرن سٹور قابل ذکر ہیں۔ مون لائٹ جنرل سٹور کے مالک کو ''پیر جی'' کہتے تھے۔ یہ شخص نہایت اچھا آدمی تھا۔ شنید ہے کہ وہ اندر خانے مسلمان ہو گیا تھا تاہم بعد میں ربوہ کے قریب ہی ایک حادثے میں انتقال کر گیا تھا۔ لیکن احمدیہ ماڈرن سٹور جو ایک ڈیپارٹمنٹل سٹور تھا، اس کا مالک تو اوّل درجے کا بے ایمان تھا۔ مرزائی امت اس دکان کو احمدیہ مادر.......... سٹور کہا کرتی تھی۔

ربوہ شہر کئی عجیب وغریب لوگ تھے جس میں مرزا منور کا بیٹا مرزا مظہر عرف میاں مجو قابل ذکر ہے۔اس کا دماغی توازن درست نہیں تھا۔انتہائی فربہ مرزا مظہر ہاتھوں میں اخبار' بغل میں کتابیں اور منہ میں پان رکھے شہر میں گھومتا رہتا تھا۔اس کے شلوار کے پائنچے ٹخنوں سے اوپر ہوتے جب کہ ایک ہاتھ میں چھڑی ہوتی تھی۔لوگ اسے مذاقاً چلتی پھرتی لائبریری کہا کرتے تھے۔جونہی کوئی اسے لائبریری کہتا' مرزا مظہر کے منہ سے گالیاں اور کف برسنا شروع ہو جایا کرتا تھا۔ربوہ شہر میں ریلوے اسٹیشن' گول بازار کے پھاٹک اور دار ضیافت کے پہلو میں ایک کچا کمرہ ہے جس کی بنیادیں انتہائی پکی ہیں۔یہ وہ کمرہ ہے جہاں قیام پاکستان کے بعد ربوہ آنے پر مرزا محمود احمد نے قیام کیا تھا۔اس یادگار کمرے کو پرستش کا مقام دے دیا گیا ہے۔لوگ زیارت کے طور پر یہ کمرہ دیکھنے جاتے ہیں لیکن ''مرزائی امت'' کے پیشواؤں' پیروکاروں اور علمبرداروں کی تضاد فکر ملاحظہ ہو۔اس کمرے کے اردگرد کوئی امیر وکبیر خاندان مقیم نہیں بلکہ یہاں تیسرے درجے کے'' کمی کمین'' لوگ رہتے ہیں جن میں ہمارا ایک کلاس فیلو محمود احمد شمس عرف پوپو بھی رہتا تھا' جس کی والدہ کے ساتھ ایک افریقی مبلغ نے شادی کی اور کئی بچوں کی شکل میں اسے مرزائیت کا داغ دے کر بھاگ گیا۔وہ بیچاری بچوں کا ایک ''ترنڈ'' لے کر ''اپنے نبی کے یادگار کمرہ'' کے قرب میں مرزائیت کا ماتم کرتی تھی۔

ربوہ میں ایک شخص عزیز راجیکی تھا جس کی وضع قطع دیکھ کر میں بہت حیران ہوتا تھا۔انتہائی لمبے قد کا بھاری بھرکم شخص سفید تہبند اور کرتہ پہنا کرتا تھا جبکہ اس کے سر پر بہت بڑی سی سفید پگڑی ہوتی جس میں اس کا بڑا سا چہرہ چھپ کر رہ جاتا۔سکھوں کی طرح ڈاڑھی اور مونچھوں نے اس کے ہونٹ بھی چھپا رکھے تھے۔کہا جاتا کہ یہ ''مرزا غلام احمد'' کے صحابی مولوی غلام رسول راجیکی کا بیٹا ہے۔اس شخص کا مسلک ''سدومیت'' سے بڑا گہرا تعلق تھا اس کے جلو میں ہر وقت شہر کے ''نوخیز امرد'' گھوما کرتے تھے جن میں ملک خدا بخش ہرل تھانیدار کا بیٹا قابل ذکر ہے۔

ربوہ سے سرگودھا جائیں تو لالیاں اور 46 اڈے کے درمیان ایک 58 چک ہے جس کو ''چک قصائیاں'' کہا جاتا ہے۔یہ چک درحقیقت جسم فروشی کا اڈہ ہے جس کو اگر دیہی بازار حسن کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ہم جب سکول و کالج میں پڑھا کرتے تھے تو اکثر مرزائی لڑکے ایک دوسرے کو کہتے ''چلو شکار کے لیے چک قصائیاں چلیں'' تب میں سمجھتا تھا کہ یہ لوگ شاید پرندوں کے شکار کے لیے کسی گاؤں جانے کی بات کرتے ہیں لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ اصل حقیقت کیا ہے۔یہ چک مرزائیوں نے اپنی تسکین کے لیے آباد کر رکھا تھا۔دروغ برگردن راوی ہمارے ایک مرزائی کلاس فیلو جس کا نام قصداً یہاں لکھنا مناسب نہیں' مجھے بتایا تھا کہ ماضی کی ایک اداکارہ ناصرہ کے بارے میں کہا

جاتا ہے کہ وہ ربوہ کے محلہ فیکٹری ایریا کے کسی تحصیلدار کی بیٹی تھی۔

جس زمانے کی یہ باتیں ہیں، تب ربوہ کی درس گاہوں کو مثالی سمجھا جاتا تھا۔لیکن یہ بات ریکارڈ پر موجود ہے اور اس زمانے کے ربوہ سے فارغ التحصیل طلباء یہ بات بڑے وثوق سے بتا سکتے ہیں کہ ربوہ میں تعلیم کا معیار ملک بھر کے باقی تعلیمی اداروں جیسا ہی تھا۔کوئی تخصیص نہیں تھی ماسوائے اس کے کہ جنسی تعلیم عام تھی۔وقت سے پہلے ہر لڑکا وہ باتیں سیکھ جاتا تھا جو زندگی سنوارنے کی بجائے تباہ کر دیا کرتی ہیں۔سکول و کالج کے ہوسٹل تو ''جنسی انسٹی ٹیوشن'' تھے جہاں لڑکے لڑکیوں کو ''گے اور لزبین'' کلچر کی تعلیم کے علاوہ تربیت بھی دی جاتی تھی۔لیکن ہوش وخرد سے عاری والدین نہ جانے کیوں اپنے بچوں کو گھروں سے دور جنسی درندوں کے حوالے کر دیا کرتے تھے۔جامعہ نصرت کالج اور سکول کی لڑکیاں ہوسٹل کے بند دروازوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے دیواریں پھاند کر جہاں مرضی ہو چلی جاتیں اور خوش وقت ہولیا کرتی تھیں۔بلکہ بتانے والے بتاتے ہیں کہ لڑکیوں کے ہوسٹل کے دروازے قصر خلافت کے دروازوں کے آمنے سامنے رکھنے کے بھی کئی مقاصد ہیں۔

ربوہ میں بھونڈی نہایت تیاری سے کی جاتی تھی۔لڑکے ٹیڈی پتلونیں پہن کر سائیکلوں پر شہر کی سڑکوں پر گھومتے اور سیاہ برقعوں میں ملبوس حوروں کو آنکھوں سے اشارہ کرتے۔اگر بات بن جاتی تو ریل گاڑی میں بیٹھ کر چنیوٹ کے ریلوے سٹیشن پر چلے جاتے۔یہاں انہیں دوسری طرف سے آنے والی ٹرین کی آمد تک کافی موقع مل جاتا۔اس کے علاوہ چنیوٹ سرگودھا اور لائل پور کے سینما گھر ''ڈیٹ'' کے لیے بہترین مقامات تھے۔

''مرزائی امت'' کے پیروکاروں کو ''شیعہ مسلک'' سے خدا واسطے کا بیر تھا۔یہ اپنے خاص خاص فنکشن خاص طور پر محرم کے ایام میں رکھا کرتے تھے۔شادی بیاہ کی بیشتر تقاریب دسویں محرم کو ہوا کرتی تھیں۔ان بدبختوں کا اس بارے میں موقف یہ تھا کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی یزید کے ساتھ جنگ سیاسی تھی اور ایک نافرمان کے حاکم وقت کے ہاتھوں قتل ہو جانے پر افسوس کرنا پرلے درجے کی بے وقوفی ہے۔ہمارے سکول میں دسویں جماعت کی الوداعی پارٹی بھی دسویں محرم کو ہوئی جس میں ہم لوگوں نے احتجاجاً شرکت نہیں کی تھی۔اس کے علاوہ ماتم اور مجالس عزا اور بالخصوص مجلس شام غریباں کا ربوہ میں زبردست مذاق اڑایا جاتا تھا۔چمن عباس، چنیوٹ اور احمد نگر میں تعزیہ اور ذوالجناح کے جلوس نکلتے تو خدام الاحمدیہ کے شیر جوان خاص طور پر وہاں بھونڈی کرنے کے لیے جاتے اور اگلے روز اپنی خباثت کے قصے مزے لے لے کر سنایا کرتے تھے۔حالانکہ ان کو یہ معلوم نہیں تھا کہ ان کے جلسہ سالانہ پر ان کی حوریں ''اڑانے'' کے لیے باہر سے ربوہ میں کون کون آتا تھا،

لیکن وہ یہ نہیں سوچتے تھے کیونکہ ورثے میں ملی ہوئی بے غیرتی کے باعث شرم اس امت سے کوسوں دور تھی۔

طلاق ربوہ میں جس قدر عام تھی، اس کی مثال کسی اور معاشرے میں بہت ہی کم ملتی ہے۔ یہاں مرد اور عورتیں دونوں طلاق کو مرضی کے مطابق استعمال کر لیتے تھے۔ ہمارے سکول کے ایک ٹیچر اسماعیل صاحب کے فلاسفی کے پروفیسر بیٹے مبارک احمد کی شادی ہوئی تو سہاگ رات کو ہی لڑکی نے لڑکے کے ساتھ رہنے سے انکار کر دیا اور اگلے ہی روز دونوں میں طلاق ہو گئی اور اسی ہفتے دونوں کی نئی شادیاں کر دی گئیں۔ طلاق کے بعد خواتین میں عدت گزارنے کا بھی کوئی تصور نہیں تھا۔

ایک مرتبہ ایک شخص نے اپنی منکوحہ افتخار بیگم کو محض اس بناء پر طلاق دے دی کہ اس کو کسی اور لڑکی سے محبت تھی جبکہ اس کا باپ اس لڑکی کو صرف اپنے اغراض و مقاصد کے لیے ''بہو'' بنا کر لانا چاہتا تھا۔ اس شخص نے اپنی منکوحہ کو طلاق کے ساتھ تحریر کیے جانے والے خط میں لکھا ''ہمارے معاشرے میں سسر کا بہو کے ساتھ تعلقات استوار کر لینا معمول کی کارروائی ہے۔ لہٰذا میں آپ کو اپنے باپ کے چنگل سے بچانے کے لیے طلاق دے رہا ہوں۔'' یہ واقعہ بھی محلّہ دارالرحمت شرقی کی ایک مکین لڑکی سے پیش آیا۔

اکثر مرزائی عورتیں شوقیہ طلاق بھی لے لیتی تھیں۔ ایسی کئی مثالیں دیکھی گئی ہیں۔ ایک شخص عبدالواسع کی بہن نے جب کسی ٹھوس وجوہ کے بغیر طلاق لے لی تو ہمارے ایک کلاس فیلو محمود نے اس بارے میں بتایا کہ مذکورہ خاتون ازدواجی بندھن کی قائل نہیں تھی۔ اس نے گھر والوں کے مجبور کرنے پر شادی کی اور ایک ''بچہ'' حاصل کرنے کے بعد شوہر اور سسرال سے چھٹکارا حاصل کر لیا۔ محمود کے مطابق ربوہ سے وابستہ اکثر تعلیم یافتہ خواتین میں یہی رجحان پایا جاتا ہے۔ وہ صرف بچہ حاصل کرنا چاہتی ہیں تاکہ معاشرے میں ان سے ''تنہا عورت'' کا لیبل اتر جائے۔ اس مقصد کے لیے وہ کسی بھی عام شخص سے شادی کر لیتی ہیں اور مقصد حاصل ہوتے ہی کسی بھی بات کو جواز بنا کر نجات حاصل کر لیتی ہیں۔

ربوہ میں طلاقوں کی ایک اور وجہ بھی ہے جس پر مرزائی بے زار افراد کی اکثریت پوری طرح متفق ہے۔ ان لوگوں کے مطابق مرزائی امت کے مرد حضرات اپنے پیشوا اور اس کی آل کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ''سدومیت'' کے اس قدر رسیا ہیں کہ وہ بیویوں کو بھی تختہ مشق بننے پر مجبور کرتے ہیں۔ بعض خواتین اپنی مجبوریوں کے باعث سر تسلیم خم کر لیتی ہیں جب کہ اکثریت اس پر طلاق کو ترجیح دیتی ہیں۔ ہمارے محلّہ میں ایک خاتون بشریٰ نے محض اسی وجہ سے طلاق لے لی کہ وہ

شوہر کی یہ خواہشات پوری کرنے سے قاصر تھی۔

ربوہ سے کوٹ امیر شاہ جانے والے راستے پر پہاڑ کے دامن میں ایک وسیع و عریض چار دیواری ہے جس میں قبروں کا لامتناہی سلسلہ ہونے کے باوجود بہت سی زمین ابھی مزید قبروں کے لیے باقی ہے۔ یہ قبرستان مرزائیوں کی جنت ہے۔ اس چار دیواری کے پیٹ میں آنے والے مرزائی اپنی امت کے ''نام نہاد جنتی'' کہلاتے ہیں۔ اس قبرستان سے ملحقہ چار دیواری کے باہر سبزہ اور سایہ دار درختوں سے محروم گورستان ان لوگوں کا ہے، جنھیں ''مرزائی بادشاہ'' کی جنت حاصل نہیں ہوئی یا دوسرے لفظوں میں یہ کہا جائے کہ وہ ''جنت'' حاصل نہیں کر سکے۔ دراصل ان لوگوں کو غالب کے بقول ''اس جنت'' کی حقیقت کا پتہ تھا چنانچہ انھوں نے محض دل کو خوش رکھنے کے لیے ''ایسی جنت'' کے حصول کے لیے پیر اور پر نہیں مارے۔

مرزائی امت کے ''جنتیوں'' کے اس مقبرے کو بہشتی مقبرہ کہتے ہیں جو مدینہ کے ''جنت البقیع'' کا مماثل تیار کرنے کے لیے بنایا گیا تھا اور یہ بھی اس امر کی عکاسی کرتا ہے کہ قادیانی امت اسلامی اصطلاحات اور شعائر اسلامی کی ایک نہایت بھونڈی نقل کر رہی ہے۔

''بہشتی مقبرہ'' یعنی مرزائیوں کی جنت میں داخلے کی ٹکٹ کے بارے میں جب مقامی لوگوں سے دریافت کیا تو کئی ایک نے بچ بچا کر وضاحت کرنے کی کوشش کی اور بتایا کہ ''خاندان نبوت'' کے کل پرزوں نے اپنی امت کو چاروں طرف سے لوٹنے کے لیے مختلف بہانے بنا رکھے ہیں۔ جنت کی ٹکٹ کی قیمت دراصل بہشتی مقبرے میں قبر کی زمین کی قیمت ہے جس کو جنت کی کنجی قرار دے کر اس کی بھاری قیمت لگا دی گئی۔ عقل مارے مرزائی بے شمار گناہ کرنے کے باوجود دولت کے زور پر جنت میں جانے کی سعی لاحاصل کرتے ہیں۔ چنانچہ اسے مرزائیوں کی جنت کے بجائے احمقوں کی جنت کہا جائے تو بے جا نہیں ہوگا۔ وہ اس لیے کہ کوئی بھی شخص زندگی میں اپنی قبر کھود کر نہیں بیٹھتا۔ یہ درست ہے کہ کسی کو اپنی موت کی خبر نہیں، کوئی دم بھی دم آخر ہو سکتا ہے۔ اس کے باوجود ایک امید کے ساتھ زندگی گزارتے ہوئے لوگ موت کے بارے میں لحہ بھر کے لیے بھی نہیں سوچتے اور برسوں جیئے چلے جاتے ہیں۔ لیکن ربوہ کی نبوت باطلہ کے پرچارکوں نے امت کی جیبیں خالی کرانے کے لیے انھیں زندگی میں اپنی قبریں بنانے پر مجبور کر دیا ہے۔ بہشتی مقبرے میں قبر حاصل کرنے کا خواہشمند جب چندہ وصیت ادا کر دیتا ہے یا اس کی اقساط کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے تو اسے موصی نمبر اور وصیت کا سرٹیفکیٹ جاری کر دیا جاتا ہے تاکہ اس کے مرنے کے بعد نام نہاد بہشتی مقبرہ میں اس کی قبر کی جگہ مخصوص ہو سکے۔ ایسے شخص کو مرزائی امت بہت خوش نصیب کہتی ہے۔

کہتے ہیں ''قبرستان جا کر انسان کو موت یاد آتی ہے اور وہ زندگی کے سبق سیکھتا ہے۔ ربوہ کے ایک مکین خورشید احمد چیمہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ موصوف واقف زندگی تھے۔ اپنا اور اپنی اولاد کا پیٹ کاٹ کر مرزائی خاندان نبوت کا دوزخ بھرتے تھے۔ مرزائیوں کے بہشت میں ان کی قبر کا رجسٹرڈ نمبر بھی لگا دیا گیا تھا۔ ایک روز وہ اپنی قبر دیکھنے بہشتی مقبرے گئے تو قدرت کو ان کی سادگی پر پیار آ گیا اور جس نے انھیں ہدایت دینے کا وسیلہ بنا دیا۔ بتانے والے بتاتے ہیں کہ انھوں نے دیکھا کہ ان کی قبر میں کتا پیشاب کر رہا ہے۔ یہ دیکھ کر انھیں اس قدر نفرت ہوئی کہ انھوں نے ایسی جنت کا خیال دل سے نکال دیا اور چندوں کی رقوم، عزیز و اقارب اور مرزائی نبوت اور اس کے خانوادوں پر تین حرف بھیج کر مسلمان ہو گئے۔

نام نہاد صحابیوں کی افراط

قدرت اللہ شہاب نے اپنی تصنیف ''شہاب نامہ'' میں ایوب چوک جھنگ کے ایک موچی کی عظمت کا ذکر کیا ہے، جس کی خودداری کو سابق صدر ایوب خان نے بھی خراج تحسین پیش کیا تھا۔ ربوہ کے رحمت بازار میں ولی محمد کی آٹا پیسنے والی چکی کے پاس ایک سلیم موچی کا ''تھڑا'' تھا۔ یہ شخص نہایت سچا، کھرا، دیانتدار اور بااخلاق تھا۔ میں نے گزشتہ اوراق میں کئی ایک مرزائیوں کا ذکر کیا ہے، جو مرزائیت کے بدنما وجود میں نہ صرف اجلے اور علیحدہ نظر آتے تھے بلکہ انھیں مرزائی کہتے ہوئے بھی دل دکھتا ہے۔ میرا بہت دل چاہتا تھا کہ کاش یہ لوگ مرزائی نہ ہوتے۔ سلیم موچی کا شمار بھی انھیں لوگوں میں ہوتا تھا۔ سلیم اباجی کی بہت عزت کرتا تھا۔ ہم لوگ اسے اکثر کہا کرتے تھے:

''سلیم! تم شکل و عادت سے مرزائی نہیں لگتے۔ پھر تم ان بدبختوں میں کہاں آ پھنسے ہو۔''

ہمیشہ کی طرح سلیم مسکرا دیتا اور کہتا ''دیکھیں جی ماں باپ احمدی تھے۔ میں بھی احمدی بن گیا۔ وہ کچھ اور ہوتے تو کچھ اور بن جاتا۔''

سلیم کو کئی بار اباجی نے مسلمان ہونے کی پیشکش کی لیکن وہ انکار کیے بغیر خاموش ہو جایا کرتا تھا۔ ایک روز میں سلیم کی دکان پر کھڑا تھا کہ وہاں ایک بہت ہی بوڑھا سا شخص آ کر بیٹھ گیا۔ اس شخص کی زبان کپکپا رہی تھی اور ہاتھوں میں رعشہ طاری تھا۔ اتنے میں اور لوگ بھی اس بوڑھے کے پاس آ گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے سلیم کی دکان کو لوگوں کے ایک گول دائرے نے گھیر لیا۔ ہر شخص بوڑھے کو محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے اصرار کر رہا تھا:

''باباجی کچھ باتیں سنائیں اپنے زمانے کی۔''

کانپتی آواز میں بابے نے کہا ''ٹھہر جاؤ اوئے منڈیو! مینوں ساہ تے لین دے او۔''
قدرے تامل کے بعد بابے نے ''مرزا غلام احمد'' کے بارے میں مختلف قصے اور قادیان کی کہانیاں سنانی شروع کر دیں۔ اسی دوران اس نے سیلاب کے دنوں کا ایک لطیفہ بھی سنا ڈالا۔ لطیفہ انتہائی غلیظ تھا۔ مجھے اتنے بزرگ بندے کے منہ سے ایسا لطیفہ سن کر بڑی مایوسی ہوئی۔ مگر تمام سامعین اس لطیفے پر قہقہے لگا رہے تھے اور کہہ رہے تھے ''بابا جی اک ہور سنؤ۔''

بابا اپنے ''نبی'' کے تذکرے کو غلیظ لطیفوں کے ساتھ مکس کر کے کوئی گھنٹہ بھر اپنے ماننے والوں کو محظوظ کرتا رہا۔ اس دوران اس کے لیے دودھ کا ایک بھرا ہوا پیالہ لایا گیا جو اس نے پیا اور کہا ''ہٹو اوئے منڈیو! ہن مینوں جان دیو۔''

بابا چلا گیا۔ میں نے سلیم سے پوچھا یہ بابا کون تھا؟ سلیم حسب معمول مسکرایا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، ایک اور شخص مجھے سرزنش کے انداز میں کہنے لگا ''اسے بابا مت کہو، بلکہ بابا جی کہو، یہ تو ہمارے حضرت مسیح موعود کے صحابی ہیں۔ انھیں بہت بلند مقام حاصل ہے۔ یہ تو کبھی موج میں آ جائیں تو بات کرتے ہیں ورنہ تو لوگ ان کی باتیں سننے کو ترستے ہیں۔''

''صاہابی'' میں نے ذرا لمبا کر کے کہا، اور سٹپٹا کر رہ گیا۔ لیکن مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے سلیم سے کہا ''صحابی کا درجہ تو وہ ہوتا ہے جو حضرت ابوبکر صدیق ؓ اور حضرت عمر فاروق ؓ کو حاصل تھا، جن کی زندگی کا لحہ لحہ، ان کی گفتگو کا حرف حرف ایک درس اور مشعل راہ تھا۔ یہ کیسا صحابی ہے جس نے اتنے بیہودہ لطائف سنا ڈالے اور لوگ واہ واہ کر رہے ہیں۔'' اس سے پہلے کہ مذکورہ شخص کے ساتھ میری تو تکار ہو جاتی، سلیم نے نہایت معاملہ فہمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بات کو سنبھال لیا اور جب وہ شخص چلا گیا تو سلیم کہنے لگا ''بھیا! تم خواہ مخواہ ان پھڈوں میں نہ پڑا کرو، ہر شخص کی عقیدت کا اپنا معیار ہوتا ہے، انھیں یہی پسند ہے پھر لڑنا کیسا۔''

میں بھی یہ سوچ کر خاموش ہو گیا کہ جس نبی کا یہ صحابی ہے، وہ ''نبی آخر کیسا ہوگا'' کیونکہ مرزا غلام احمد کے مختصر سے مختصر کلام میں بھی زیادہ سے زیادہ دشنام شامل رہی ہیں۔ چنانچہ اس کے مصاحب جیسے پڑھے ہیں، ویسے ہی پڑھائیں گے۔

مجھے ذاتی طور پر بھی مرزائیوں کے ایک نیم صحابی سے ملاقات کا پالا پڑا۔ یہ شخص بھی کوئی 80 کے پیٹے میں تھا۔ اس کی زبان کترنی کی طرح چلتی تھی۔ اس کے ہر موضوع کی تان آ کر ''سیکس'' پر ٹوٹا کرتی تھی۔ اس کے پاس کوئی بھی شخص آ کر بیٹھتا، یہ اس سے جنسی موضوعات پر بات چیت کر کے خوش وقت ہوتا۔ ایک دن کہنے لگا میں اگرچہ عمر کے اس حصے میں ہوں جب انسان ''خصی بیل''

جیسے حال میں ہوتا ہے لیکن میرے اندر زندگی کے تمام تر ''کرنٹ'' موجود ہیں۔ اب بھی میں بس، ریل یا تانگے میں بیٹھوں تو عورتیں بالخصوص نوعمر لڑکیاں مجھے بوڑھا آدمی سمجھ کر ساتھ بٹھا لیتی ہیں۔ ان کے خیال میں، میں بے ضرر سا بوڑھا ہوں حالانکہ صورت حال اس کے برعکس ہوتی ہے۔ میرا تو رواں رواں اس وقت عمر رفتہ کو صدائیں دے رہا ہوتا ہے اور مجھے انتہائی ضبط کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے جو میری عمر کا اقتضا نہیں ہے۔

ربوہ میں مجھے ''مرزا غلام احمد'' کے ایک اور صحابی کو بھی دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ سال خوردہ شخص اپنی عمر کی سنچری بنانے والا تھا۔ سرخ سر اور داڑھی والا سیاہ رو بابا ''آرے آرے تیرے گھرتے منارے'' کہلاتا تھا۔ اسے سوہنی، موہنی اور کومل سی لڑکی سے شادی کا بے حد شوق تھا۔ ایک روز میں سکول سے واپس آ رہا تھا تو اپنی گلی کی نکڑ پر بڑے چھوٹے لوگوں کا ایک مجمع دیکھا جس میں سفید شلوار قمیص اور شملے دار پگڑی والا ایک پستہ قد بوڑھا کھڑا دعا مانگ رہا تھا جب کہ سب لوگ اونچی آواز میں آمین کہتے جا رہے تھے۔

دعا کا خلاصہ یہ تھا:

> ''اے اللہ مجھے اتنی دولت دے کہ میں اس کے ڈھیر کے نیچے دب جاؤں۔ مجھ سے نکلا نہ جائے۔ لوگ آ کر مجھے نکالیں۔ پھر مجھے ایک بڑا سا گھر دے جس میں باغ ہوں، باغیچے ہوں اور پھول کھلیں۔ بہت سے نوکر چاکر اور کنیزیں اس گھر میں چلتی پھرتی نظر آئیں۔ میں ایک کو بلاؤں تو ساری بھاگی چلی آئیں.......... اس گھر میں ہر وقت مختلف انواع کے لذیذ کھانے پکیں۔ اے اللہ میاں جب یہ ساری چیزیں آ جائیں تو پھر اس گھر میں ایک بہت ہی چھوٹی سی عمر کی نازک سی، شرمیلی سی، خوبصورت سی لڑکی بھیج دے جو مجھ پر فریفتہ ہو جائے۔ وہ مجھے کہے کہ میرے ساتھ شادی کر لو۔ میں کہوں نہیں۔ وہ مناتی جائے میں انکار کرتا جاؤں اور پھر میں مان جاؤں۔ جب ہماری شادی ہو جائے تو ہم ہنسی خوشی سکھی اس گھر میں رہیں اور دن رات یہ گانا گائیں ''آرے آرے تیرے گھرتے منارے.......... آرے آرے تیرے گھرتے منارے۔''

دعا ختم ہونے کے بعد بابے نے یہ گانا شروع کیا تو لوگ بھی ساتھ گانا گانے لگے۔ پھر ''بابے'' نے دھمال ڈالنی شروع کر دی۔ وہ اتنا ناچا کہ کیا کوئی جوان ناچے گا۔ رقص و سرود ختم ہوا تو

میں نے اپنے ایک پڑوسی انیس احمد سے پوچھا یہ کون تھا تو کہنے لگا یہ ہمارے حضرت صاحب کے صحابی تھے۔ اس کے بعد میں نے شہر میں اکثر اس بڈھے کو پھرتے دیکھا جو لوگوں کو دیکھتے ہی اپنا راگ ''آرے آرے تیرے گھرتے منارے'' الاپنا شروع کر دیتا تھا۔ جس کے جواب میں لوگ اسے پیسے دیا کرتے تھے۔ اسے دیکھ کر منہ سے بے ساختہ نکلتا ''صحابی نہ ہوا بھکاری ہوا''

ہماری گلی میں بلکہ گھر کے بالکل سامنے دو کچے سے مکان تھے۔ ایک میں معذور شخص چاچا محمد حسین رہتا تھا جبکہ دوسرے میں اسلم چھین اور اس کا بھائی اچھو اپنی والدہ کے ہمراہ رہا کرتے تھے۔ اس مکان کا مالک ایک بوڑھا ضعیف آدمی تھا جس کو لوگ ''بابا ہل جل'' کہا کرتے تھے۔ مجھے یہ بات معلوم نہیں کہ یہ بابا خود کہاں رہتا تھا لیکن کبھی کبھی جب آتا تو لوگ اسے بھی ''نیم صحابی'' کہا کرتے تھے۔ مرزا غلام احمد کا یہ صحابی جب بھی آتا اپنے کرایہ داروں کو انتہائی غلیظ گالیاں دیتا اور مکان خالی کرنے کے لیے کہا کرتا تھا۔ ایک بار تو اس نے اندھیر ہی مچا دیا۔ اپنے ساتھ کچھ لوگوں کو لایا اور چاچا محمد حسین کے گھر والوں کو مکان خالی کرنے کو کہا۔ انھوں نے منت سماجت کر کے مہلت جو مانگی بس پھر کیا تھا۔ بابا بپھر گیا اور گالیوں کی بھرمار کر دی۔ اپنا لٹھ نما ڈنڈا در و دیوار پر برسانے لگا۔ اس کی طرف سے فائر کرنے کا حکم ملنے کی دیر تھی، اس کے ساتھ آئے ہوئے حواریوں نے بیچارے محمد حسین کے گھر کا سامان باہر پھینک دیا۔ یہ لوگ رات بھر گلی میں رہے اور اگلے دن نہ جانے کیسے سر چھپانے کے لیے کوئی کوٹھڑی تلاش کی۔ ''بوڑھے ہل جل صحابی'' نے مکان گروا کر اس کی جگہ نیا مکان تعمیر کروایا۔ اس میں زیادہ کرایہ دینے والے کرایہ دار رکھ لیے۔ یہ تھا ''مرزا غلام احمد'' کے صحابیوں کا کردار۔ حالانکہ صحابی تو اچھی صحبت کے باعث لوگوں پر مہربان ہوتے ہیں اور خود دکھ اٹھا کر خلق خدا کو سکھ پہنچاتے ہیں۔

ربوہ میں ہر دوسرا تیسرا ضعیف و نحیف بوڑھا خود کو صحابی یا نیم صحابی کہلا کر اتراتا پھرتا تھا۔ ہمارے سکول کے ایک لڑکے کا دادا بہت بوڑھا تھا۔ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت تاہم یہ بابا ہر کسی کو گالیاں خوب دیا کرتا تھا۔ اس کی دشنام طرازی سے بچنے کے لیے بابے کی آل اولاد نے اسے ایک کمرے میں بند کر رکھا تھا۔ ایک دن دروازہ کھلا رہ گیا اور بابا کسی طرح گھر سے باہر نکل آیا اور گھر کے باہر تھڑے پر بیٹھ کر ہر آنے جانے والے کے شجرہ نسب پر طبع آزمائی شروع کر دی۔ بابے کے گھر والوں نے اسے گھر کے اندر لے جانے کی کوشش کی تو اس نے انہیں اینٹیں مارنی شروع کر دیں۔ آخر کار شام کو بابا تھک ہار کر گھر کے اندر چلا گیا تو اس کے گھر والوں نے اسے کمرے میں بند کر کے ''لاک'' لگا دیا۔ لوگوں نے صاحب خانہ سے پوچھا کہ یہ بابا جی کون تھے تو جواب دیا گیا یہ

ہمارے ابا جی اور حضرت مسیح موعود کے صحابی ہیں۔

میرے کئی کلاس فیلو بہت کٹر مرزائی ہونے کے باوجود ''مرزا غلام احمد'' اوراس کی ذریت کے بارے میں میرے خیالات کو درست تسلیم کرتے تھے۔ میں نے اپنے ایک ہم جماعت سے پوچھا ''یار! یہ صحابی کا کیا چکر ہے۔ تمھارے شہر میں ہر گھر سے کوئی نہ کوئی صحابی نکل آتا ہے۔'' موصوف نے کہا ''یار تم ان چکروں میں نہ پڑا کرو۔ کون کیا ہے؟ یہ صرف اللہ جانتا ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص خود کو صحابی کہہ کر دل پشوری کر لیتا ہے تو تمھیں کیا اعتراض ہے۔ ابھی تو نے دیکھا ہی کیا ہے یہاں تو ایک اینٹ اٹھاؤ، اندر سے صحابیوں کے ''اجڑ'' نکل آئیں گے۔ کیونکہ ربوہ میں یہ فیشن ہے کہ ہر شخص ''خاندان نبوت'' سے قرابت داری ظاہر کرنے کے لیے اپنے باپ دادا کو صحابی یا نیم صحابی کا درجہ دے ڈالتا ہے۔''

مرزائیوں کی تنظیم مجلس خدام احمدیہ درحقیقت جماعت کی ایک ایسی فوج ہے جس سے ہر جائز و ناجائز کام لیا جا سکتا ہے۔ ان میں بہت سے جرائم کے بادشاہ ہیں اور اس فوج کے کمانڈر مرزا طاہر تھے۔ یہ صبح اپنا کلینک بھگتا کر خدام الاحمدیہ کے دفتر میں آ جاتے اور پھر وہاں مرزائیت کی گھناؤنی سرگرمیوں کے لیے سکیمیں تیار کی جاتی تھیں۔

مرزا طاہر کے کلینک پر مرد و زن دونوں ہوا کرتے تھے۔ لیکن صنف نازک کی تعداد زیادہ ہوتی۔ خواتین کہتی تھیں ''میاں تاری تو باتوں سے مرض دور کر دیتے ہیں۔'' ایک بار موصوف نے ایک خاتون نور احمد عابد کی بیوی رشیدہ بیگم کو کہہ دیا ''آپ کی جوانی تو برسوں قائم رہنے والی ہے'' جس پر موصوفہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ وہ دنوں تک مرزا طاہر کے تاثرات اپنی سہیلیوں کو بتاتی پھری۔ مزے کی بات یہ تھی کہ وہ جب یہ بات کسی کو بتاتی تو ساتھ ہی شرم سے گلنار ہو جاتی تھی۔ مرزا طاہر کی نیلی شیشیوں میں سفید دانے دار گولیوں میں کوئی شفا تھی یا نہیں تھی، مگر اس کی ''زبان اور ہاتھ'' خواتین کے لیے بڑے شافی تھے۔

مرزا محمود کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ تخریب کارانہ ذہن کے مالک تھے۔ جماعت میں سے کہیں سے کوئی تنقید یا فتنہ سر اٹھاتا تو وہ بڑی چابکدستی کے ساتھ اسے دبا دیا کرتے تھے۔ اس کے لیے اعلیٰ درجے کے مخبر رکھے جاتے جو اوّل تو فتنہ اٹھنے ہی نہ دیتے اور کہیں کوئی ''ابنارمیلٹی'' نظر آتی، ان کے کارندے وہاں پہنچتے اور صورت حال پر قابو پا لیا کرتے تھے۔ مرزا محمود احمد کے انتقال کے بعد یہ ذمہ داری بھی مرزا طاہر نے اپنے سر لے لی۔ آل نبوت کے کالے کرتوتوں پر اگر کسی شخص نے انگشت نمائی کرنے کی کوشش کی تو مرزا طاہر نے اس کی گردن وہیں مار دی۔ ربوہ میں ''گردن

مارنا اور جان مار دینا'' کے الفاظ محاورہ کے طور پر استعمال ہوتے تھے اور یہ جملے خاندان نبوت کے سپوت زیادہ تر استعمال کرتے تھے۔ مرزا طاہر کو دہشت گردی اور تخریب کاری کی علامت اور روح رواں سمجھا جاتا تھا۔ اپنی انہی خوبیوں اور سازشوں کی بنا پر انھیں ''مسند خلافت'' حاصل ہوئی۔

مرزا غلام احمد کسی زمانے میں سیالکوٹ میں رجسٹری محرر تھے، انھیں زمین ہتھیانے اور اپنے نام لگانے کے جملہ گر آتے تھے، پھر انگریز سے انھوں نے خلعت نبوت بھی تو محض مال وزر کے لیے حاصل کی تھی۔ ''مرزا غلام احمد'' نے قادیان کی ساری زمین لمبی مدت کے لیے پٹے پر حاصل کر لی اور پھر وہ زمین رہائشی پلاٹوں کی شکل میں اپنے ہی پیروکاروں میں فروخت کر کے قیمت حاصل کر لی۔ مگر زمین کے انتقال مرزائی خریداروں کے نام نہ کرائے گئے۔ یوں وہ رند کے رند رہے اور ہاتھ سے جنت بھی نہ جانے دی۔ دولت تو مرزا قادیانی کے گھر کی لونڈی اسی وقت بن گئی تھی جب انھوں نے انگریز کے کہنے پر کاشانہ رسالت میں نقب لگائی اور جھوٹے نبی بن بیٹھے۔ ''مرزا غلام احمد'' کے مرنے کے بعد یہ ساری دولت اور زمینیں نصرت جہاں کی اولاد کو مل گئیں جبکہ ''محمدی بیگم کا بھانجا اور اس کی ماں نامراد ہی رہے۔'' مرزا محمود احمد اپنے باپ کے بھی باپ نکلے۔ جھوٹ، عیاری، عیاشی اور مکاری میں باپ کو بھی مات کر دیا۔ باپ مسیح موعود تھا تو بیٹا مصلح موعود۔ باپ نبی تھا تو بیٹا خلیفہ۔ باپ لٹیرا تھا تو بیٹا راہزن تھا۔ بہرکیف قیام پاکستان کے بعد مرزائی نبی کی آل اور مرزائی امت جب با دل نخواستہ قادیان سے ربوہ آئے تو یہاں مرزا محمود نے باپ والی چال چلی۔ پہلے تو اس نے قادیان کی جملہ زمینوں کے بدلے سندھ میں سونا اگلتی زمینیں کلیم کرا لیں اور ان کو مختلف دیہات بنا کر اپنے بیٹوں کے نام لگا دیا۔ عمی کے بقول سندھ میں ناصر آباد، منصور آباد، مبارک آباد سمیت کئی ریلوے سٹیشن مرزائیوں کے نبی زادوں کے نام ہیں۔ ان زمینوں سے اگلنے والا سونا بھی مرزائی آل نبوت کی تجوریوں کو ہی بھرتا ہے۔

اس کے علاوہ مرزا محمود احمد نے ربوہ جس کا اصل نام ''چک ڈھگیاں'' ہے یہاں 99 سال کے لیے غالباً 1034 ایکڑ زمین ایک آنہ فی مرلہ کے حساب سے حاصل کر لی۔ یہ زمین بھی مرزائی امت کو فروخت کر کے اپنے ''مالی گھڑے'' بھر لیے گئے۔ مکان خریدنے کے باوجود زمین کا انتقال کبھی بھی خریدار کے نام نہیں کرایا گیا۔ یوں مرزا محمود احمد نے اپنی امت سے دھوکہ دہی کی بنا پر کروڑوں روپیہ کما لیا۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی مرزائی خواہ کتنا ہی اس مذہب سے بے زار کیوں نہ ہو، وہ صرف مکان کی خاطر ربوہ چھوڑنے کی جسارت نہیں کرتا۔

ربوہ میں مختلف ادارے بھی ہیں جو خود ساختہ قوانین کے سہارے چل کر اپنی امت سے پیسے بٹورنے کے لیے حیلہ جوئی کرتے ہیں۔ ان اداروں اور دفاتر میں امور عامہ، تحریک جدید، فضل عمر

فاؤنڈیشن، فضل عمر ہسپتال اور مجلس خدام احمدیہ شامل ہیں۔ یہ سب سونے کی مرغیاں ہیں جو مسلسل سونے کا انڈہ دے کر جماعت کے ''بڑوں'' کے خزانے بھرتی رہتی ہیں۔

عبدالسلام عمی نے صرف فضل عمر ہسپتال کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا کہ یہ ہسپتال درحقیقت ایک خیراتی ہسپتال ہے جس کی تعمیر لوگوں کے عطیات سے ہوئی ہے۔ ہسپتال کے ہر کمرے کے باہر نصب تختی یہ بتاتی ہے کہ اس کمرے کا خرچ کس نے دیا ہے۔ یہاں ادویہ لوگوں کے صدقات و خیرات سے آتی ہیں۔ انتہائی قیمتی آلات جماعت کے خون پسینے کی کمائی سے لائے گئے ہیں لیکن علاج کی سہولیات و مراعات صرف ''بالا بلندوں اور منہ لگے'' لوگوں کو حاصل ہیں۔ جہاں تک غرباء کا تعلق ہے انھیں دوا ملے نہ ملے لیکن دھکے ضرور ملتے ہیں۔ ہسپتال کی باگ ڈور ''مرزا منور'' کے ہاتھ میں ہے۔ جن کی رسائی ہے ان کے وارے نیارے، نہیں تو جہنم میں گئے سارے۔''

چندے جن کی کئی اقسام تھیں، وہ بھی مرزائی خاندان نبوت پر ''ہن'' برساتے اور اس ''شجر'' ممنوعہ کو شاداب رکھتے تھے۔ اطفال کا چندہ بچوں سے، ناصرات کا چندہ لڑکیوں سے، خدام کا چندہ نوجوانوں سے، لجنہ اماء اللہ کا چندہ خواتین سے اور انصار اللہ کا چندہ بوڑھوں سے وصول کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ چندہ وصیت سمیت کئی چندے کالے قوانین کی طرح اس امت پر مسلط تھے اور انھیں گھن کی طرح چاٹ رہے تھے۔

جامعہ احمدیہ مرزائیوں کی ''مبلغ ساز'' فیکٹری تھی جس میں مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے لیے تبلیغ کرنے والا خام مال تیار ہوتا تھا۔ جماعت کی خدمت کا جذبہ لے کر یہاں آنے والے مبلغ اپنی زندگی اور زر ادارے کی نذر کرتے اور اسے بخشش کا ذریعہ خیال کرتے تھے۔ حالانکہ یہ ان کی خام خیالی ہے، جلد ہی انھیں اصل حالات سے آگاہی ہو جاتی ہے، مگر وہ اس کمبل کو چھوڑ سکتے ہیں نہ ریچھ انھیں چھوڑتا ہے۔

جماعت کے تمام افراد جن کا کسی نہ کسی حوالے سے کوئی ذاتی کاروبار ہے انھیں بھی آمدنی کا ایک حصہ بلا کسی حیل و حجت کے مرکز کی نذر کرنا پڑتا ہے۔ بے شمار دکاندار، زمیندار، صنعت کار، فیکٹری مالک، ٹرانسپورٹر اور حکماء ڈاکٹر اپنی دولت پر لگے ہوئے مرزائیت کے جگے ٹیکس بڑی باقاعدگی سے جماعت کو دیا کرتے تھے۔ مرزا غلام احمد اور ان کی آل اولاد نے جماعت کو چندہ کی اہمیت اور افادیت سے اس قدر ہپناٹائز کر رکھا ہے کہ وہ چلتے پھرتے آتے جاتے سوتے جاگتے چندے کی ادائیگی کو ایک مسنون فعل قرار دیا کرتے ہیں۔ ''چندا اڈکشن'' کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ ایک مرزائی کو مسلمانوں نے قائل کر لیا کہ ''مرزا جھوٹا'' نبی ہے لہٰذا اسے ماننا خدا اور اس کے رسول کے احکام سے

انکار کے مترادف ہے۔ قریب تھا کہ یہ شخص مسلمان ہو جاتا مگر اس نے محض اس وجہ سے اسلام قبول نہیں کیا کہ وہ مرزائیت چھوڑ کر چندہ کسے دے گا۔

میں نے سن رکھا تھا کہ مرزا ناصر قصر خلافت میں جس جگہ عام لوگوں سے ملاقات کرتے ہیں وہاں ایک بڑا صندوق رکھا ہے۔ اسے یار لوگ ''طلسمی صندوق'' کہا کرتے تھے۔ ہفتے میں دو روز مرزا ناصر سے عام ملاقات ہوتی تھی۔ جس کے لیے پہلے سے وقت لیا جاتا تھا۔ اور بعض اوقات تو باری بھی بڑی مشکل سے آتی تھی۔ چنانچہ جب یہ لوگ ملاقات کے لیے آتے تو اس صندوق کا پیٹ بھرنے کے لیے دولت، قیمتی کپڑے اور تحائف، اجناس، خوشبویات اور دیگر عطیات جھولیاں بھر کر لاتے تھے۔ جب مجھے اپنے ابا جی کے ہمراہ قصر خلافت جانے کا موقع ملا تو میں نے وہ صندوق دیکھا جسے صدے سہہ کر صدقات دینے والے بھرتے تھے۔ لوگ آتے صرف ''السلام علیکم'' کہتے، دعا کی درخواست کرتے اور روپے، زیور، بانڈز اور اپنی متاع گراں اس صندوق میں ڈال کر چلے جاتے۔ اس صندوق کی ساری آمدن صرف اور صرف ''مرزا ناصر احمد'' کی ہوا کرتی تھی۔ یہ سب تو آمدن کے جائز اور ظاہری ذرائع تھے جن سے مرزائیت پھل پھول رہی تھی۔ اس کے علاوہ بے شمار ناجائز ذرائع بھی مرزائیت کو پال پوس رہے تھے۔

محمد علی پھل فروش گول بازار میں پھلوں کی ریڑھی لگایا کرتا تھا۔ یہ شخص قصر خلافت کے ان پرانے ملازموں میں سے تھا جو اندر کے بھید اور خاصے کی بات جانتے تھے۔ نہ جانے اس شخص سے کیا خطا ہوئی جس کی بنا پر اسے قصر خلافت کی خدمت سے الگ کر دیا گیا۔ محمد علی نے بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے گول بازار میں ریڑھی لگا لی لیکن جھوٹے خاندان نبوت پر یہ خوف سوار رہنے لگا کہ محمد علی کہیں ان کے اندر کے راز افشا نہ کر دے۔ یہ خوف بالآخر محمد علی کے قتل پر منتج ہوا۔ اسے کسی نامعلوم شخص نے قتل کر کے تعلیم الاسلام ہائی سکول کے قریب پہاڑی کے ساتھ عیسائیوں کی بستی میں پھینک دیا۔ مقتول کے لواحقین کے اصرار کے باوجود مرزائی ارباب حل وعقد نے یہ کیس پولیس کے حوالے کرنے کے بجائے اپنے نام نہاد تھانیدار عزیز بھانبڑی کے حوالے کر دیا لیکن جب دباؤ بڑھا تو مجبوراً یہ مقدمہ پولیس کو دینا پڑا تاہم مرزائیوں نے یہ قتل عیسائیوں پر ڈال دیا۔ جب پولیس نے عیسائیوں کو پکڑا اور تھانے میں مارا پیٹا تو ربوہ بھر کے تمام خاکروبوں نے احتجاجاً ہڑتال کر دی۔ دو تین دن کوڑا کرکٹ اٹھانے جب کوئی نہ آیا تو تعفن نے مرزائی امت اور اس کے آقاؤں کی عقل ٹھکانے لگا دی۔ انھوں نے پولیس کے حکام بالا کی مٹھی اور جیب گرم کر کے عیسائی چھڑا لیے اور یوں محمد علی کا پراسرار قتل داخل دفتر کرا دیا گیا۔ اس قتل کے محرکات کیا تھے، اندر کے لوگ جب دبے دبے الفاظ میں سرگوشیاں کرتے

تو کئی باتیں سننے کو ملتی تھیں۔ کہنے والوں کا کہنا تھا کہ محمد علی قصر خلافت کے خواتین و حضرات کے بہت سے رازوں سے واقف تھا۔ ایک بار اس نے اپنے کسی ساتھی ملازم سے یہ بات کہہ دی کہ اسے جب بھی موقع ملا وہ قصر خلافت اور مرزائیت چھوڑ دے گا اور جھوٹے خاندان نبوت کی کہانیاں عام کر دے گا۔ یہ بات ''مذہبی وڈیروں'' کو پتہ چلی تو انھوں نے محمد علی سے اس کا روزگار، مکان اور بیوی بچے چھین لینے کی دھمکی دی جس پر اس نے جواباً للکارا کہ وہ بھی اندر کے راز ساری امت میں پھیلا دے گا۔ بعد میں اسے قصر خلافت سے نکالتے وقت یہ سمجھوتہ ہوا کہ ''خاندان'' اسے کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا جبکہ محمد علی بھی اپنی زبان بند رکھے گا۔ محمد علی نے کچھ عرصہ تو زبان بند رکھی مگر مرزائیوں کی سی آئی ڈی کو معلوم ہوا کہ محمد علی وقتاً فوقتاً ''خاندان'' والوں کے خلاف زہر اگلتا رہتا ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ربوہ میں ''خاندان'' کا لفظ صرف مرزا غلام احمد کے خانوادہ کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ قصہ مختصر یہ کہ مرزائی ظالموں نے محمد علی کو قتل کرا دیا۔ شہر میں اکثر واقف حال لوگ کہا کرتے تھے کہ اگر کوئی ماہر کھوجی محمد علی کے قتل کا کھوج لگائے تو ''کھرا'' مرزا لقمان کے گھر جا نکلے۔

یہ مرزا لقمان کے قول و عمل کا اثر تھا یا مرزا غلام احمد کی تعلیم کی کرامت تھی کہ ربوہ میں عام لڑکے بھی معمولی معمولی باتوں پر اتنی لمبی لڑائیاں کرتے جو کئی کئی ہفتوں اور مہینوں پر محیط ہو جاتیں اور فریقین موقع ملتے ہی مخالف پر حملہ کر دیا کرتے تھے۔ سکول سے چھٹی کے بعد عموماً لڑکے گھات لگا کر بیٹھ جاتے اور مخالف فریق کو آتے ہی اپنی زد میں لے لیتے۔ لوہے کے ''مکے اور چاقو'' عام سے عام لڑکے کی جیب میں ہوا کرتے تھے۔

مرزا لقمان کے بعد ربوہ میں اگر کسی کا راج تھا تو وہ عزیز بھانبڑی تھا۔ یہ ہمارے سکول ٹیچر مولوی ابراہیم بھانبڑی کا بھائی اور اٹامک انرجی کمیشن کے ایک سرکردہ آفیسر منیر احمد بھانبڑی کا سسر تھا۔ عزیز بھانبڑی نہ صرف مرزا لقمان کے عقوبت خانوں اور ٹارچر سیلز کی نگرانی کرتا بلکہ اس کے اپنے بھی تشدد گھر تھے۔ جرم و خطا اور تعزیر و سزا کو جانچنے کا اس شخص کا اپنا ہی میعار تھا۔ ''ستم پہ خوش کبھی لطف و کرم پر رنجیدہ'' کے فلسفے کے مطابق کسی کو معمولی سی بات پر دھن کر کے رکھ دیتا اور کسی کو بڑے سے بڑے جرم پر بھی معافی دے دیتا تھا۔ لڑکوں کے سر پر ٹوپی نہ ہوتی تو انھیں چھڑیوں سے مارتا، کسی کے بال بڑھے ہوتے یا قلمیں لمبی ہوتیں تو سرعام بال کاٹ دیتا تھا...... اسے دیکھ کر مرزائی لڑکوں کی سٹی گم ہو جاتی تھی۔ اسے مرکز کی طرف سے اچھی رہائش اور بہت سی مراعات حاصل تھیں۔ کہنے والے کہتے تھے کہ یہ سب کچھ محض اس وجہ سے ہے کہ عزیز بھانبڑی ''خاندان'' والوں کا بھیدی ہے اور اس ڈر سے کہ کسی وقت کوئی لنکا نہ ڈھا دے، وہ لوگ اس کو ہمیشہ خوش رکھا کرتے تھے۔

واقفان حال کا کہنا ہے کہ محمد علی پھل فروش کی زبان بندی کے لیے بھی عزیز بھانبڑی کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ لیکن مقتول اپنی ضد پر اڑا رہا تو اسے ٹھکانے لگانے میں بھی عزیز بھانبڑی نے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ یہ کوتوال شہر دوپہر ڈھلتے سائیکل پر سوار ہو کر پورے شہر کا گشت کیا کرتا تھا۔

مرزائی اکابرین کی ''ذاتی'' بہادری کا یہ عالم تھا کہ ایک بار ربوہ کے باغی نوجوانوں نے رابعہ انقلابی کے نام سے ایک گروہ بنایا اور رابعہ انقلابی کے نام سے مرزا ناصر کو خط لکھا کہ وہ اپنے لاؤ لشکر سمیت ربوہ فتح کرنے آ رہی ہے۔ بس پھر کیا تھا، خوف کی ایک لہر نے ''خاندان'' کے ہر مرد کو چوڑیاں پہن کر قصر خلافت میں چھپ جانے پر مجبور کر دیا جبکہ ''امت'' کے نوجوانوں کو قصر خلافت اور شہر کی حفاظت پر مامور کر دیا گیا۔ شہر کے داخلی راستوں پر موجود پہرے دار شہر میں داخل ہونے والے ہر شخص کی تلاشی لیتے اور کسی اجنبی کو ربوہ میں نہ آنے دیتے۔

یہ صورت حال ایک دو ماہ قائم رہی مگر مرزائی قوم اور اس کے سالار ایک بار تو خوف سے لرز گئے۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ تنویر فوٹو سٹوڈیو کے مالک احمد زمان کے ساتھ پیش آیا۔ یہ لوگ لاری اڈا کے پاس پہرہ دے رہے تھے کہ خواتین کا ایک گروپ شہر میں داخل ہوا۔ ان لوگوں نے حسب معمول انھیں پرسش کیے بغیر ہی شہر میں جانے دیا۔ مرکز کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو فوٹو گرافر اور اس کے ساتھیوں کو قصر خلافت طلب کر کے پوچھا گیا کہ مذکورہ خواتین کو تلاشی کے بغیر کیوں جانے دیا گیا ہے؟ تنویر نے مرزا ناصر کو بتایا کہ خواتین کو نہ روکنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ ''خاندان'' کی عورتیں تھیں۔ اس پر سوال کیا گیا کہ ''تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ خاندان کی خواتین تھیں'' تنویر نے جواب دیا ''آنکھوں سے کیونکہ ایسی آنکھیں صرف خاندان والوں کی ہی ہو سکتی تھیں'' اس معنی خیز جواب نے مرزا ناصر کو چپ کرا دیا۔

منافقت کے چکنے چکنے پات

یہ حقیقت ہر شخص جانتا ہے کہ ملک کی تمام کلیدی آسامیوں پر آج بھی مرزائی براجمان ہیں اور جن دنوں کے حقائق یہاں رقم ہیں تب تو ملک بھر میں مرزائی راج تھا۔ ہر محکمے کی بڑی بڑی کرسی مرزائیوں کے قبضے میں تھی۔ یہ اتفاق کی بات نہیں بلکہ مرزائی نبی اور اس کے خلفاء کی منظم منصوبہ بندی تھی کہ ملک کے اعلیٰ اداروں کی اعلیٰ آسامیوں پر ان کا قبضہ رہے۔ انہی حقائق کے پیش نظر مسلمان کیا، مرزائی بھی نوکریوں کے لیے مرزائی خاندانِ نبوت کے پیچھے مارے مارے پھرتے تھے۔

غرباء پر چندہ کی جو آفت ''مرزائی امت'' کی طرف سے مسلط ہے، اس کا تذکرہ اس

سے پہلے کئی بار کیا جا چکا ہے۔ ہمارے پڑوس میں چاچا محمد حسین ایک بیمار اور لاچار شخص رہتا تھا۔ اس کی بیوی گھر والوں کا پیٹ بھرنے کے لیے مختلف گھروں کا کام کرتی تھی۔ مگر ان غریبوں کے لیے بھی چندہ دینا لازمی تھا۔ اس کی زبوں حالی دیکھ کر اباجی سے رہا نہ گیا، وہ اسے لے کر مرزا منصور کے پاس گئے اور کہا ''ظالمو! دیکھو یہ شخص کچھ کما نہیں سکتا لیکن تم لوگوں کو پالنے کے لیے چندہ باقاعدگی سے دیتا ہے۔ کچھ تو خوفِ خدا کرو۔''

ربوہ کا سالانہ میلہ

ربوہ میں رمضان شریف کو کوئی اہمیت دی جاتی تھی نہ عیدین پر کسی مسرت کا کوئی اہتمام کیا جاتا تھا۔ یہاں تو بس جلسہ سالانہ ہی عید اور بقر عید تھیں۔ فروری 1966ء کی بات ہے جب ربوہ میں ہمیں پہلا رمضان شریف گزارنے کا موقع ملا۔ ہمارے گھر میں روزہ اور تراویح کی باقاعدہ پابندی ہوتی تھی۔ میں سکول میں روزہ رکھ کر جاتا تو طلبہ میرا خوب مذاق اڑایا کرتے تھے۔ اکثر ساتھی کہا کرتے:

''او توں روزہ رکھیا ہویا اے'':

''ہاں تو'' جواب دیا جاتا۔

''روزہ تو طلبہ پر فرض ہی نہیں۔ اس سے پڑھنے والوں کا دماغ کمزور ہو جاتا ہے''۔ یہ مرزائی طلبہ کی دلیل ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ مرزائی مکتبۂ فکر کا فلسفہ یہ تھا کہ طلبہ محنت کش اور بوڑھے روزہ سے مستثنیٰ ہوتے ہیں۔ ایک مولوی صاحب نے اس بارے میں اپنے ''باطل نبی'' کا ارشاد سنایا:

''روزہ رکھنے سے انسان خصی ہو جاتا ہے''۔

ہمارے ایک استاد محمد ابراہیم بھانبڑی اپنے باوا کی اس فکر کی بنا پر کہا کرتے تھے: روزہ جماعت پر اس لیے فرض نہیں کہ ''مسیح موعود'' نے اپنی امت کو اس جسمانی مشقت سے نجات دلا دی ہے۔ ان کا اس سلسلے میں یہ استدلال تھا کیونکہ کام بھی ایک عبادت ہے۔ روزے سے انسان کم غذا لیتا ہے، اس وجہ سے کمزور ہو جاتا ہے۔ یوں اس کی استعداد کار کم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ وہ کام جیسی عبادت سے محروم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ایک عبادت کے لیے دوسری عبادت ترک نہیں کی جاسکتی۔

ایک مرتبہ میں اپنے اباجی کے ہمراہ مرزا ناصر کے فلاسفی کے پروفیسر بیٹے مرزا انس کے تعلیم الاسلام کالج کے دفتر میں بیٹھا تھا کہ مرزا انس نے اباجی سے کہا:

''صوفی صاحب! آپ مجھے کوئی ایسا طریقہ بتائیں کہ میرا وزن کم ہو جائے''۔

اباجی نے کہا ''آپ روزے رکھا کریں''۔

''نہیں صوفی صاحب نہیں۔ کوئی اور بات بتائیں' روزہ رکھنے کے بعد انسان افطاری میں

عام حالات سے بھی زیادہ کھا جاتا ہے۔ چنانچہ وزن کم ہونے کے بجائے بڑھ جاتا ہے، ویسے بھی روزہ قابل عمل عبادت نہیں''۔ مرزا انس نے جواب دیا۔

ربوہ میں روزہ اور تراویح کے نعم البدل کے طور پر روزانہ نماز ظہر سے عصر تک مسجد مبارک میں قرآن پاک کا درس ہوا کرتا تھا، جس میں ایک سپارہ کا ترجمہ وتفسیر بیان کی جاتی تھی۔ یہ درس سننا ہر شخص پر لازم تھا۔ رمضان میں سکول و کالج دوپہر میں ایک بجے بند ہو جاتے تھے اور تمام طلبہ وطالبات اور اساتذہ مسجد مبارک پہنچ جاتے تھے۔ کوئی طالب علم درس سنے یا نہ سنے مگر وہاں حاضری لازمی لگوانی پڑتی تھی۔ یہ پابندی رمضان کے ابتدائی ایام میں تو سختی سے کی جاتی تھی مگر رفتہ رفتہ لڑکے مسجد کے بجائے ادھر ادھر پہاڑوں میں گھومتے پھرتے رہتے، جبکہ اساتذہ بھی درس سننے کے بجائے گھر بھاگ جاتے تھے۔ اکثر یہ بھی دیکھنے میں آتا کہ مسجد میں لوگ جاتے ہی نہیں تھے اور مولوی صاحب کو درس دیواروں کو سنانا پڑتا تھا۔ رمضان گزرتا تو عید الفطر اس طرح منائی جاتی جس طرح مسلمان کرسمس مناتے ہیں۔ نہ نئے کپڑے سلوانے کا اہتمام کیا جاتا، نہ دکانیں لگتیں نہ کوئی تفریحی پروگرام ہوتا۔ اس کے برعکس جلسہ سالانہ کی مہینوں پہلے تیاری شروع کر دی جاتی تھی۔

بقر عید پر بھی لوگ ایک دوسرے کے گھروں میں گوشت دیتے نہ غیروں میں بانٹا جاتا تھا، جبکہ ہر شخص قربانی کا گوشت آدھا اپنے گھر رکھ لیتا اور آدھا صدر محلہ کو بھجوا دیتا محلہ کا صدر گوشت کے ایک ایک کلو کے پیکٹ بنا کر ان لوگوں کے گھروں میں بھیج دیا کرتا جو قربانی نہیں کرتے تھے۔ ہم ربوہ میں کیونکہ اکیلے تھے، کوئی عزیز یا رشتہ دار تو تھا نہیں۔ چنانچہ جب ہم نے پڑوسیوں کو گوشت بھجوایا تو انہوں نے لینے سے انکار کر دیا۔ ہم نے خیال کیا کہ ہم مرزائی نہیں، اس لیے یہ گوشت قبول کرنے سے گریز کر رہے ہیں۔ ہم نے ایک پڑوسی ثناء اللہ زرگر سے پوچھا تو اس نے کہا بات احمدی غیر احمدی کی نہیں' قصہ یہ ہے کہ ''حضور'' کا حکم ہے کہ گوشت خود تقسیم کرنے کے بجائے صدر محلہ کے حوالے کرو، وہ خود جس کو مناسب سمجھے گا' بھیجے گا۔

جلسہ سالانہ جسے عیدین پر فوقیت حاصل تھی' جلسہ کم میلہ زیادہ ہوتا تھا۔ مرزائی جلسہ پر حاضری کو حج اور عمرے کے برابر سمجھتے تھے۔ مہینوں سے اس کی تیاریاں شروع ہو جاتیں۔ زنانہ اور مردانہ سکول و کالج کے وسیع کھیل کے میدانوں میں ''پرالی'' کے پہاڑ لگ جایا کرتے تھے۔ امیر مرزائی تجوریوں کے منہ کھول دیتے۔ بڑے بڑے شہروں میں شاپنگ کی جاتی جبکہ غریب مرزائی سال بھر کی جمع شدہ' پونجی جلسہ پر خرچ کر ڈالتے تھے۔ ربوہ میں تین لنگر خانے اور ایک دار الضیافت تھا۔ اول الذکر تینوں سال بھر بند رہتے تھے لیکن جلسہ سالانہ کے دوران 9 دن کے لیے کھول دیئے جاتے۔ یہاں

گائے' بیل' اور بھینسوں کے ریوڑ کے ریوڑ لائے جاتے۔ جلسہ سالانہ پر آئے ہوئے مہمانوں کو صبح کے وقت ''ماش کی چھلکوں'' والی دال اور رات کو ''سنڈھے'' کا گوشت اور آلو پکا کر کھلایا جاتا۔ لنگر خانے سے روٹی کے حصول کے لیے باقاعدہ راشن کارڈ جاری کیا جاتا۔

جلسہ سالانہ پر اندرون ملک اور بیرون ملک سے مہمان آتے جس میں اکثریت اپنے ربوہ میں مقیم رشتہ داروں کے ہاں ٹھہرا کرتی۔ تمام تعلیمی اداروں میں جلسہ کے دنوں میں چھٹیاں کر دی جاتیں اور ان کے کمروں میں بھی مرد وزن قیام کرتے اور پرالی پر سو جاتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی کسی کو جائے قیام نہ ملتی تو وہ خیموں میں سوتے اور 26، 27، 28 دسمبر کی ٹھٹھرتی راتوں میں اس چندہ خور خاندان کو بددعائیں دیتے جو سارا سال پیسے لینے کے باوجود ان کے لیے رہائش کا مناسب انتظام بھی نہیں کرتا تھا۔ جلسہ پر سکولوں کے طلباء، اساتذہ، شہریوں اور دیگر دفاتر کے اہلکاروں کی ڈیوٹیاں لگائی جاتیں جو مہمانوں کی خدمت کرتے۔ یہاں ایک بات قابل ذکر ہے۔ ظلی حج یعنی جلسہ سالانہ کے موقع پر ڈیوٹیاں لگاتے وقت اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا کہ ہر شعبے میں ڈیوٹی دینے والے ''خوش شکل امرد'' لازمی شامل کیے جائیں تاکہ وہ اپنے ساتھیوں کے آتش شوق کو سرد کریں۔ کئی خوب رو لڑکوں کو تختہ مشق منانے کے لیے جلسہ سالانہ کا انتظار کیا جاتا اور ڈیوٹیوں کی آڑ میں انہیں شکار کیا جاتا تھا۔

مرزائی جلسہ پر اپنے خلیفہ کی تقاریر سنتے' شدید سردی میں ''دال اور شورا'' پیتے۔ پرالی پر سوتے' ڈیوٹیاں دیتے اور ''درثمین'' کے اشعار پڑھتے تھے۔ ربوہ میں جلسہ پر مختلف سٹال لگتے، انواع واقسام کی نمائش لگتی' سرمہ' انگوٹھیاں' مٹھائیاں بیچنے کے علاوہ ''وہ'' دھندا بھی عروج پر ہوتا۔ اکثر لڑکے لڑکیاں اپنی غربت کا دوزخ سرد کرنے کے لیے جلسہ سالانہ کا انتظار کرتے اور ضمیر کو سلا کر مال کمالیا کرتے تھے۔

جلسہ سالانہ پر بہت سے لوگ تماشائی بن کر دوسرے شہروں سے حور وغلمان اور میلہ دیکھنے ربوہ آیا کرتے تھے۔ ایک بار ہماری بھیرہ کی ایک پڑوسن ''زینی مچھانی'' ''ماچھن'' مرزائیوں کا جلسہ دیکھنے ہمارے پاس ربوہ آ گئی۔ امی جان اسے جامع نصرت کالج کے زنانہ جلسہ گاہ میں لے گئیں۔ مرزا ناصر کا قاعدہ تھا کہ وہ ہر سال جلسہ سالانہ کے آخر پر تجدید بیعت کراتے تھے۔ میں اور میرا بھائی امی جان کے ساتھ تھے اور وہ ہمارے ساتھ مصروف تھیں کہ اسی دوران مرزا ناصر کی اختتامی تقریر شروع ہوگئی۔ تقریر کے آغاز میں انہوں نے تمام حاضرین جلسہ کو تجدید بیعت کے لیے کہا۔ پہلے قرآنی آیات پھر درود پاک پڑھا گیا۔ بیچاری ''زینی مچھانی'' مرزا ناصر کے پیچھے آیات و درود پڑھنے

لگی۔ جونہی مرزا ناصر نے کہا کہ ''میں مرزا ناصر کے ہاتھ پر سلسلہ احمدیہ کی بیعت کرتی ہوں'' ہماری امی جان نے بھاگ کر زیبی کو بازو سے پکڑ لیا اور کہا:

''نی جھلیے، ایہہ مردود تے اپنی بیعت کران لگا ای، تو کافر ہونا اے'':

زیبی جو روا روی میں مرزا ناصر کے ساتھ ساتھ پڑھے جا رہی تھی فوراً خاموش ہو گئی اور اس نے لاحول پڑھی۔ امی جان نے جب اسے روکا تو ان کی آواز سن کر بہت سی عورتیں ان کی طرف متوجہ ہوئیں۔ کئی ایک نے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے کہا:

''لگتا ہے یہ کوئی غیر احمدی عورت ہے۔''

جلسہ سالانہ پر ''مرزائی حوروں'' کی بھی چاندی ہوا کرتی تھی۔ ان کی ڈیوٹیاں بھی حسین لڑکوں کی طرح مخصوص خدمات کے لیے لگائی جاتیں جن کا فیصلہ خاندانِ نبوت کے اکابرین کیا کرتے تھے۔ ڈیوٹیوں کی آڑ میں اکثر لڑکیاں گھروں سے باہر بہ آسانی رہ لیتی اور ''من کی مراد'' پالیتی تھیں۔

ربوہ میں سگریٹ نوشی ممنوع تھی مگر لوگ سر عام تمباکو نوشی کرتے تھے۔ ریڈیو لگانا منع تھا۔ مگر ٹیپ ریکارڈر پر دیسی اور بدیسی گانے سننے میں کوئی ممانعت نہ تھی۔ ہماری ایک جاننے والی بی اے کی طالبہ بصیرت ایک گانا ''او ملی ٹھنڈک نگاہوں کو تیرے دیدار سے ہو سکے تو آواز دے' آواز مجھ کو پیار سے' اس لے ولحن سے گاتی، یوں لگتا جیسے مالا خود گا رہی ہے۔ اس کے علاوہ ہمارا کلاس فیلو مومن ''چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں'' سنا کر محفل جما لیا کرتا تھا، جبکہ اعجاز اکبر ''سجناں نے بوہے اگے چک تان لئی'' مزے لے لے کر گاتا تھا۔ شکیل کی آواز بھی بے مثل تھی۔

ربوہ میں مرزائی نبوت نے سینما نہیں بننے دیا لیکن اس کی ضرورت چنیوٹ سے پوری کرنے کو معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ ہم لوگ جمعہ کی چھٹی گزار کر ہفتہ کو چنیوٹ سے سکول آتے تو ہمارے مرزائی ساتھی سب سے پہلا سوال یہ کرتے کہ شمع اور نیلم سینما میں کون سی نئی فلم آئی ہے۔ قدرت کے قہر سے مالا مال ربوہ شہر میں گرمیوں میں زندگی گزارنا انتہائی مشکل تھا۔ دوپہر کے وقت تو گھر سے باہر نکلنا تندور میں قدم رکھنے کے مترادف تھا۔ اس شہر کی کلر زدہ زمین جنگلی کیکروں کے علاوہ کوئی چیز اگلتی نہ تھی۔ ایسی صورت میں چنیوٹ کا پڑوس ربوہ کے لیے کسی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں تھا۔ صبح سویرے چنیوٹ سے سبزی' ترکاری کے ریڑھے بھر کر ربوہ آتے۔ گوشت گیہوں بھی وہیں سے لایا جاتا۔ اس کے باوجود مرزائی چنیوٹ کو دشمن شہر کہا کرتے تھے۔

چنیوٹ کے شہید چوک میں ایک کلینک دارالصحت تھا اس کو ایک مرزائی ڈاکٹر عبداللہ چلاتا تھا۔ اس کا بیٹا طاہر بن عبداللہ ہمارا کلاس فیلو تھا۔ موصوف اپنی سدومی صفات کے باعث سکول

بھر میں چلتا پھرتا اشتہار تھا۔ طاہر بن عبداللہ نے ایک بار بتایا کہ اس کے باپ کا کلینک پہلے ربوہ میں ہوا کرتا تھا' لیکن کلینک پر مریض کوئی نہیں آتا تھا۔ مرزا منور کی اجارہ داری کے باعث دوسرے ڈاکٹر محض ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہتے تھے۔ چنانچہ طاہر کے والد نے اپنا کلینک چنیوٹ منتقل کیا تو چاندی برسنا شروع ہوگئی۔

ہمارے پڑوسی مستری فضل دین کی بیٹی امتہ المتین ایک مرزائی سلیم کی بیوی اور دو بچوں کی ماں تھی۔ سلیم لائل پور (فیصل آباد) میں ملازم تھا۔ وہاں اس کے ایک خاتون سے تعلقات ہو گئے۔ اس نے امتہ المتین کو دھوکے سے لائل پور بلایا اور اس سے دوسری شادی کے اجازت نامے پر دستخط کرا لیے۔ موصوفہ گھر لوٹی تو اس صدمے نے اس پر اس قدر اثر کیا کہ وہ پاگل ہوگئی۔ ابتدائی علاج کے لیے اسے فضل عمر ہسپتال ربوہ میں داخل کیا گیا مگر جب صورتحال قابو سے باہر ہوگئی تو اسے لاہور کے مینٹل ہسپتال میں منتقل کرا دیا گیا۔ کافی علاج کے باوجود اسے کوئی افاقہ نہ ہوا تو اس کے گھر والے اسے واپس ربوہ لے آئے۔ امتہ المتین دن رات چھت پر چڑھ کر اپنے ماں باپ' مرزائی نبی' اس کے خاندن کو انتہائی فحش گالیاں دیا کرتی تھی۔ اس کے گھر والے اور محلے دار اس کیفیت سے سخت پریشان اور نالاں تھے۔ لیکن عجیب اتفاق تھا کہ وہ ہم سب کے ساتھ نہایت پیار اور ادب و احترام سے پیش آتی۔ ابا جی صحن میں نماز پڑھ رہے ہوتے تو وہ بڑی عقیدت سے انہیں دیکھا کرتی۔ ایک روز اس کی والدہ رشیدہ بیگم ابا جی کے پاس آئی اور عرض کی ''صوفی صاحب! ہم ہیں تو احمدی' آپ سے بات کرنا بھلا معلوم نہیں ہوتا لیکن مجبور ہیں۔ ہماری مدد کریں اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر دے گا''۔

ابا جی نے کہا ''بہن! بتاؤ میں کیا خدمت کر سکتا ہوں''۔

کہنے لگی ''آپ میری بیٹی امتہ المتین کو کوئی ایسا تعویذ دے دیں جس سے وہ ٹھیک ہو جائے''۔ ابا جی نے جواب دیا ''آپ لوگ ان چیزوں پر یقین رکھتے ہیں؟ یہ تو ان لوگوں کے لیے ہیں جن کا ان پر کامل اعتقاد ہوتا ہے''۔

اس پر رشیدہ بیگم رونے لگ گئی اور کہا ''احمدیت'' بیشک ہمارا مذہب ہے لیکن اسے ہم نے بادل نخواستہ قبول کر رکھا ہے۔ اسے چھوڑیں تو جائیداد' رشتہ دار اور سماجی تعلقات جاتے ہیں۔ اس کے اختیار کرنے سے جو کچھ ہم نے کھویا ہے، وہ ہم ہی جانتے ہیں۔ آپ مہربانی فرما کر ہم پر ترس کھائیں مجھ سے اپنی بیٹی کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔''

ابا جی نے امتہ المتین کو کچھ تعویذ اور پانی دم کر کے دینا شروع کیا۔ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ چند یوم میں وہ بالکل ٹھیک ہوگئی۔ وہ ابا جی کی اس قدر معتقد ہوئی کہ باقاعدگی سے آ کر دین کی باتیں

پوچھنے لگی۔ تاہم ٹھیک ہونے کے بعد بھی اس نے مرزا قادیانی اور اس کے دین کو برا بھلا اور جھوٹا کہنا نہ چھوڑا، وہ سرعام کہتی ''مرزا غلام احمد قادیانی ایک جھوٹا اور مکار انسان تھا۔ یہ صورت حال دیکھ کر مرزائی اسے پاگل سمجھتے مگر درحقیقت وہ بالکل نارمل تھی جس کو اس کے گھر والے بھی تسلیم کرتے تھے۔ ایک بار کسی نے امتہ المتین سے پوچھا کہ تم کسی ڈاکٹر کے علاج سے تندرست ہوئی تو اس نے کہا ''میں تو صوفی صاحب کے دم کیے ہوئے پانی سے ٹھیک ہوئی ہوں۔'' سوال کرنے والے مرزائی نے اس بات پر یقین نہ کیا اور دم کیے ہوئے پانی کو لیبارٹری میں ٹیسٹ کروایا۔ جب وہاں پانی محض خالص پانی ثابت ہوا تو وہ شش و پنج میں مبتلا ہو گیا کہ مسلمان سچے یا وہ اور اس کا مذہب ''مرزائیت۔''

ربوہ کے ہی ایک مرزائی کی چھ بیٹیاں تھیں۔ ان کی شادیاں نہیں ہو رہی تھیں وہ بہت ہی متفکر تھا۔ اپنے ''مرزوں'' سے بار بار دعائیں کرا کے مایوس ہو چکا تو اسے کسی نے ہمارے ہاں بھیج دیا۔ اباجی نے اسے کہا کہ تم ''مرزائیت'' سے تائب ہو جاؤ، اللہ تعالیٰ تمہاری مشکل آسان کر دے گا۔ اس نے واقعی ایسا کیا اور قدرت نے چھ ماہ کے اندر اس کی تمام بیٹیوں کے ہاتھ پیلے کر کے اسے سرخرو کر دیا۔

اقبال دشمنی

علامہ اقبالؒ نے قادیانیت کو کھلم کھلا الگ مذہب قرار دیا۔ یہی وجہ ہے کہ مرزائیوں کو ان کے ساتھ خدا واسطے کا بیر ہے۔ وہ ہر گھڑی، ہر ساعت علامہ کی مخالفت میں سرگرم رہتے ہیں۔ جن دنوں میں تعلیم الاسلام ہائی سکول میں پڑھتا تھا، ان دنوں ملک بھر کے دیگر مدارس میں صبح اسمبلی کے وقت علامہ اقبال کی یہ دعا پڑھائی جاتی تھی۔

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری
دور دنیا کا میرے دم سے اندھیرا ہو جائے
ہر جگہ میرے چمکنے سے اجالا ہو جائے
ہو میرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت
جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت
زندگی ہو میری پروانے کی صورت یارب!
علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یارب!
ہو میرا کام غریبوں کی حمایت کرنا

درد مندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا
میرے اللہ! برائی سے بچانا مجھ کو
نیک جو راہ ہو اسی راہ پر چلانا مجھ کو

اس کے برعکس ہمارے ہیڈ ماسٹر ملک حبیب الرحمٰن کے حکم پر سکول میں اسمبلی کے دوران کلام محمود کی یہ نظم کلام اقبال کا ہم پلہ قرار دے کر پڑھائی جاتی تھی۔

نونہالان جماعت مجھے کچھ کہنا ہے
پر ہے یہ شرط کہ ضائع میرا پیغام نہ ہو
خدمت دین کو اک فضل الٰہی جانو
اس کے بدلے میں کبھی طالب انعام نہ ہو
جب گزر جائیں گے ہم تم پہ پڑے گا سب بار
سستیاں ترک کرو طالب آرام نہ ہو
میری تو حق میں تمھارے یہ دعا ہے پیارو
سر پہ اللہ کا سایہ رہے ناکام نہ ہو

جس کو شاعری سے ذرا سا بھی شغف ہے وہ کلام محمود کا اقبال کی شاعری سے موازنہ کرنے کی جسارت ہی نہیں کر سکتا۔ لیکن مرزائی علامہ سے محض اس وجہ سے بغض و عناد رکھتے ہیں کیونکہ جس طرح انھوں نے پاکستان کا عظیم تصور پیش کیا، اسی طرح اس پیکر حکمت نے مرزائیت کو خطرے کی گھنٹی قرار دیتے ہوئے مسلمانوں کو خبردار کیا کہ قادیانیت، یہودیت کا چربہ ہے۔

علامہ صاحب فرماتے ہیں: مرزائیت اسلام کے ضوابط کو برقرار رکھتی ہے لیکن اس قوت ارادی کو فنا کر دیتی ہے جس کو اسلام مضبوط کرنا چاہتا ہے۔ میں نے تحریک مرزائیت کے ایک رکن کو خود اپنے کانوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے متعلق نازیبا کلمات کہتے ہوئے سنا۔ سیاسی نقطہ نظر سے وحدت اسلامی اس وقت متزلزل ہو جاتی ہے جب اسلامی ریاستیں ایک دوسرے سے جنگ کرتی ہیں اور مذہبی نقطہ نظر سے اس وقت، جب مسلمان بنیادی عقائد یا ارکان شریعت کے خلاف بغاوت کرتے ہیں اور ابدی وحدت کی خاطر اسلام اپنے دائرے میں کسی باغی جماعت کو روا نہیں رکھتا، صرف اسلام کے دائرے سے باہر ایسی جماعت کے ساتھ دوسرے مذاہب کے پیروؤں کی طرح رواداری برتی جا سکتی ہے اور بس یہ وہ حقائق ہیں جن سے مرزائیت کو سب سے پہلے کافر مذہب علامہ اقبال نے قرار دیا اور انھوں نے اپنے مطالعہ سے مرزا قادیانی کو خدا کا باغی، دین کا

قاتل اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دشمن قرار دیا ہے یہی وجہ ہے کہ مرزائیوں کو علامہ سے خاص بغض تھا۔

میں نے کئی مرزائیوں سے سنا کہ اگر علامہ اقبالؒ اور شورش کاشمیری مرزائی ہوتے تو مرزائیت کو کوئی خطرہ نہیں تھا، وہ دنوں میں پھلتی پھولتی اور دنیا پر اپنا تسلط قائم کر لیتی۔ یہاں اس امر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مرزائی امت کو اپنے جھوٹے نبی کی تصدیق کے لیے علامہ اقبال اور شورش کاشمیری جیسے عاشقان رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کتنی ضرورت تھی۔ دروغ بر گردن راوی اکثر مرزائی علامہ اقبال پر الزام لگایا کرتے تھے کہ وہ پہلے مرزائی تھے اور بعد میں انھوں نے اس مذہب کو چھوڑ دیا حالانکہ علامہ اقبال کی بالغ نظری کو جدید وقدیم کی اس چپقلش کا تازیست احساس رہا۔ انھوں نے مرزائیوں کے مسئلہ پر جو مضامین لکھے، ان میں کئی جگہ عقیدے کو اپنے ناخن فکر سے کھولا۔ یہی وہ عوامل ہیں جو مرزائی نبی اور اس کے برگ و بار خلفاء اور امت کو علامہ اقبال کی ذات کے خلاف زہر اگلنے پر مجبور کرتے رہے۔

بھارتی روزنامے "سٹیٹس مین دہلی" کی تحریریں اس بات کی گواہ ہیں کہ علامہ انگریزوں کو کھلے خطوط تحریر کرتے رہے جن میں قادیانیوں اور مسلمانوں کی نزاع کے معاشرتی اور سیاسی پہلوؤں سے آگاہ کیا گیا۔

ہم لوگ جب ایف۔ اے میں پڑھتے تھے تو ہمارے نصاب میں علامہ اقبالؒ کا یہ کلام شامل تھا۔

کبھی اے حقیقت منتظر، نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں میری جبین نیاز میں
طرب آشنائے خروش ہو، تو نوا ہے محرم گوش ہو
وہ سرود کیا کہ چھپا ہوا ہو سکوت پردہ ساز میں
تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں
دم طوف کرمک شمع نے یہ کہا کہ وہ اثر کہن
نہ تری حکایت سوز میں نہ میری حدیث گداز میں
نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرم خانہ خراب کو تیرے عفو بندہ نواز میں

نہ عشق میں رہیں گرمیاں، نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی، نہ وہ خم ہے زلف ایاز میں
جو میں سربسجدہ ہوا کبھی تو زمین سے آنے لگی صدا
تیرا دل تو ہے صنم آشنا! تجھے کیا ملے گا نماز میں

ڈاکٹر ناصر احمد پرویز پروازی نے یہ کلام پڑھاتے ہوئے زہر اگلا کہ علامہ کی اس نظم کا توڑ مرزا غلام احمد کی بیٹی نواب مبارکہ بیگم نے اپنی کتاب ''درعدن'' میں کر دیا ہے جس کا مطالعہ کر کے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ موصوفہ کی فکر علامہ اقبال سے کتنی بلند ہے۔ اس وقت میرے دل میں خیال آیا کہ کہاں ''راجہ بھون کہاں گنگو تیلی'' یہ شخص ایک عظیم انسان کو کس ''جنس کا سد'' کے ساتھ ملا رہا ہے۔ نواب مبارکہ بیگم کا کلام ملاحظہ ہو۔

مجھے دیکھ طالب منتظر، مجھے دیکھ شکل مجاز میں
جو خلوص دل کی رمق بھی ہے ترے ادعائے نیاز میں
تیرے دل میں میرا ظہور ہے، تیرا سر ہی خود سر طور ہے
تیری آنکھ میں میرا نور ہے، مجھے کون کہتا ہے دور ہے
مجھے دیکھتا جو تو نہیں تو یہ تیری نظر کا قصور ہے
مجھے دیکھ طالب منتظر مجھے دیکھ شکل مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں تیری جبین نیاز میں
مجھے دیکھ رفعت کوہ میں مجھے دیکھ پستی کاہ میں
مجھے دیکھ عجز فقیر میں، مجھے دیکھ شوکت شاہ میں
نہ دکھائی دوں تو یہ فکر کر کہیں فرق ہو نہ نگاہ میں
مجھے دیکھ طالب منتظر، مجھے دیکھ شکل مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں تیری جبین نیاز میں
کبھی بلبلوں کی صدا میں سن کبھی دیکھ گل کے نکھار میں
میری ایک شان خزاں میں ہے میری ایک شان بہار میں
مجھے دیکھ طالب منتظر، مجھے دیکھ شکل مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں تیری جبین نیاز میں
میرا نور شکل ہلال میں میرا حسن بدر کمال میں

کبھی دیکھ طرز جمال میں کبھی دیکھ شان جلال میں
رگ جاں سے ہوں میں قریب تر، تیرا دل ہے کس کے خیال میں
مجھے دیکھ طالب منتظر، مجھے دیکھ شکل مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں تیری جبین نیاز میں

مرزائی امت اس بات کی شدت سے خواہش مند تھی کہ وہ حضرت علامہ اقبال کے مدمقابل کے طور پر اپنے ہاں کوئی ایسی شخصیت سامنے لائے لیکن ان احمقوں کو یہ معلوم نہیں کہ دانائے راز صدیوں میں آتا ہے جس کا مقابلہ مرزا غلام احمد جیسے مسیلمہ کذاب نہیں کر سکتے۔ اکثر مرزائی کلاس فیلو یہ دعویٰ بھی کرتے تھے کہ ان کے نبی کے فیض کے اثر سے سب سے زیادہ مرزائی شہر اقبال سیالکوٹ میں ہوئے ہیں۔ قصہ مختصر مرزائیوں نے مرزا غلام احمد کی شان بلند کرنے کے لیے جس طرح کئی پاپڑ بیلے' اس طرح علامہ کے مرتبہ کو کم کرنے کے لیے بے شمار حربے استعمال کیے' لیکن نہ وہ اپنے ''نبی'' کا مقام بلند کر سکے نہ علامہ کی شان گھٹا سکے۔

کالج کا ماحول بھی بالکل تعلیم الاسلام ہائی سکول جیسا تھا۔ یہاں بھی مذہبی حوالے سے مرزائی اجارہ داری تھی۔ نصابی مضامین کے علاوہ ایک اضافی مضمون ''تھیالوجی'' ہر طالب علم پر پڑھنا لازم تھا اور مرزائی کتب پر مشتمل تھا۔ کالج کے یونیفارم میں ''موئی'' کالی ٹوپی اور سیاہ انڈر گریجویٹ گاؤن شامل تھا۔ کالج کے تمام اساتذہ بظاہر خوش مزاج مگر تعصب کے ''پرکالے'' تھے۔ ہمیں اردو ڈاکٹر ناصر احمد پرویز پروازی پڑھایا کرتے تھے۔ وہ اپنے پیریڈ میں کسی نہ کسی بہانے مرزائیت کا پرچار جاری رکھا کرتے تھے۔ انہیں کالج کی طرف سے آفس کے لیے جو کمرہ دیا گیا تھا وہ درحقیقت ایک ''کشادہ غسل خانہ'' تھا چنانچہ جب بھی کسی لڑکے کو کمرے میں بلانا مقصود ہوتا تو وہ کہتے ''ارے میاں ذرا میرے غسل خانے میں آ جانا''۔

جو لڑکے کمرے کی حقیقت سے واقف تھے انہیں تو کوئی حیرت نہ ہوتی لیکن نئے لڑکے ایک مرتبہ تو گھبرا جاتے۔ ان کی گھبراہٹ اپنی جگہ بجا ہوتی کیونکہ ربوہ کے اساتذہ کی اکثریت ''گے کلچر'' کی خوگر تھی۔ کلاس میں پروازی صاحب اکثر لڑکوں سے پوچھا کرتے بھئی! آپ نے کبھی عشق فرمایا ہے؟ لڑکے بھی جواباً پوچھتے ''سر! آپ نے کبھی فرمایا ہے؟ اس پر پروازی صاحب کہتے میں نے عشق فرمایا نہیں کیا ہے اور جن سے کیا وہ میری اہلیہ ہیں۔'' ہمارے ایک کلاس فیلو نعیم شاہ سے انہوں نے پوچھا کیا تم نے کبھی عشق فرمایا ہے؟ ''کہا جی'' پوچھا ''کس کے ساتھ؟'' نعیم شاہ نے کہا جناب محلے کی ایک لڑکی کے ساتھ۔ اس پر پروازی صاحب فرمانے لگے بھئی دیکھ لینا کہیں وہ لڑکا نہ ہو اور

تمہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں''۔

صوفی بشارت ایم اے عربی کی کلاسیں لیا کرتے تھے، جن میں لڑکیاں بھی ہوتی تھیں۔ کلاس روم کے وسط میں ایک بڑا سا پردہ لگا دیا گیا تھا جس کے دوسری طرف لڑکے ہوتے تھے۔ درمیان میں یعنی دونوں اصناف کے سامنے صوفی صاحب براجمان ہوتے تھے۔ ان پر لڑکیوں کے روئے جمال دیکھنے پر کوئی پابندی نہیں تھی تاہم لڑکوں کے لیے ان کی ہم جماعت لڑکیاں شجر ممنوعہ تھیں جن کی طرف دیکھنا زنداں میں جانے کے مترادف تھا۔ ایک مرتبہ ایک لڑکا اپنے لمبے قد کی وجہ سے دھر لیا گیا۔ موصوف ایم اے عربی کا طالب علم تھا اس کا ''لمبا قد'' کمرے میں معلق پردے سے اونچا تھا۔ وہ کلاس میں کھڑا تھا کہ اس دوران صوفی بشارت کلاس میں وارد ہوئے، انہوں نے سمجھا، لڑکا پردے کے اس پار کسی ''پری'' کو دیکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ بس پھر کیا تھا، قہر بشارت عود کر آیا اور اس طالب علم کو کالج سے بے جرم نکال دیا گیا۔ ربوہ میں یہ بات عام تھی کہ صوفی بشارت اولاد جیسی نعمت سے محروم ہونے کے باعث اپنی محرومیوں کا حساب طلباء سے لیتے تھے۔ عربی کی طالبات میں سے ایک حسن و جمال کی پرتو اپنے ایک ہم جماحت پر فریفتہ ہوگئی لیکن اس طالب علم نے اپنے کالج بدر ہم جماعت کا حوالہ دے کر ہاتھ جوڑتے ہوئے موصوفہ سے کہا ''اے دشمن عقل و آگہی! مجھے معاف ہی کرو مجھ میں قہر بشارت برداشت کرنے کی ہمت نہیں''۔

اسلامیات کے پروفیسر عثمان صدیقی، جنھیں پھلبہری کے داغوں کے باعث ''بابا عالم سرخ پوش'' کہا جاتا تھا، گو مرزائی تھے مگر ان میں دیگر مرزائیوں جیسا حوصلہ نہیں تھا۔ ایک بار وہ سورہ یوسف پڑھا رہے تھے تو انہوں نے حضرت یوسف اور زلیخا کے بارے میں کچھ خرافات بیان کرنے کی کوشش کی جس پر میرے سمیت چند مسلمان طلبہ نے ان سے برملا کہا ''جناب آپ نصابی کتب پڑھا رہے ہیں لہٰذا ان میں ''اپنی جماعت'' داخل نہ کریں ورنہ ہم کلاس کا بائیکاٹ کر دیں گے۔'' بس اتنی بات کہنے کی دیر تھی' صدیقی صاحب سیدھے ہو گئے۔

فضل عمر ہوسٹل میں ہر قسم کی شراب ملتی تھی۔ کوئی مرزائی لڑکا مے نوشی کرتا ہوا پکڑا جاتا تو معاملہ دبا دیا جاتا مگر جب کوئی مسلمان لڑکا گرفت میں آ جاتا تو اس کی باقاعدہ تشہیر کی جاتی اور اسے کالج سے نکال دیا جاتا۔ ایک بار ہمارے ایک دوست شاہد نسیم پر بھی شراب نوشی کا الزام لگایا گیا۔ اس سے قطع نظر وہ قصور وار تھا یا نہیں' اس کو باقاعدہ سزا دی گئی اور کالج چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا۔

مولانا اللہ وسایا

جنس پرستوں کی نگری

قادیانی جماعت کے چوتھے چیف گرو مرزا طاہر قادیانی کے آنجہانی ہونے کے بعد قادیانی جماعت کا لاٹ پاٹ مرزا مسرور احمد قادیانی کو بنایا گیا۔ مرزا مسرور احمد قادیانی زرعی یونیورسٹی میں پڑھتا رہا۔ اس مناسبت سے چناب نگر کے قادیانی اسے ''مالی'' کہتے ہیں۔ چونکہ مرزا مسرور احمد قادیانی کی کوئی خاص دینی تعلیم نہیں، نہ ہی اسے بولنے کا طریقہ وسلیقہ آتا ہے، اس لیے اس کو ''گونگا'' بھی کہتے ہیں۔ مرزا مسرور احمد قادیانی کے چناب نگر میں قادیانی مخالف اسے ''گونگا مالی'' کہتے ہیں۔ گونگا شیطان کی پرانی اصطلاح تو جانی پہچانی تھی۔ اب اس گونگے شیطان کو گونگا مالی بنانا یہ قادیانی خانہ ساز اصطلاحات کی فیکٹری کی تازہ ورائٹی ہے۔ مرزا مسرور قادیانی کے متعلق چناب نگر کے واقف قادیانیوں کا کہنا ہے کہ یہ پرلے درجہ کا مغرور' بدتمیز اور بدکردار انسان ہے۔ کوئی ایسا انسانی عیب نہیں جو اس میں نہ پایا جاتا ہو۔ بدکرداری میں مرزا محمود قادیانی کا ظل اور بروز ہے۔ ظلی بروزی نبوت کے فیض کا اس نے قادیانی امت کے اطفال اور لجنہ میں انتقال تام کیا تو مزید شہر سدوم' ربوہ کا پوپ' ربوہ کا مذہبی آمر' ربوہ کا راسپوٹین' تاریخ محمودیت' کمالات محمودیہ ایسی کئی تصانیف پر مشتمل قادیانی لٹریچر تیار ہو جائے گا۔

مرزا غلام احمد قادیانی کا فیض نجو' منشانی' بھانو کو کیا منتقل ہوا، چشمہ فیض جاری ہو گیا۔ پوری قادیانیت اس کی فیض رسانی سے شاداب وتروتازہ ہے۔ ''تازہ پھل'' پکنے سے قبل ہی بیوپاری حضرات کی نذر ہو جاتا ہے۔ مرزا محمود مرزا قادیانی کی ان روایات کا علمبردار تھا اور مرزا مسرور احمد قادیانی 'مرزا محمود قادیانی کا بروز ثانی ہے۔ اس گونگے مالی مرزا مسرور قادیانی کے برسر اقتدار آتے ہی اس کے بدکرتوتوں سے واقفیت کے باعث ہر قادیانی پریشان ہے۔ اس کے تن بدن پر لرزہ طاری ہے۔ قادیانیت کے محل میں شگاف پڑ رہے ہیں۔ مغربی جرمنی اور امریکہ کے سرکردہ قادیانیوں کا قادیانیت کو خیر باد کہنا اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔ مرزا مسرور احمد قادیانی کیا آیا، قادیانیت کے لیے بھونچال لایا ہے جو قادیانیت کے زوال کا باعث ہوگا۔ اس بھونچال وزلزال کا باعث کیا ہے؟ ذیل کے واقعہ

سے اس پر کچھ روشنی پڑ سکے گی۔ اس سے شاید قادیانی فائدہ حاصل کر پائیں تو ان کا بھلا ہوگا۔

مبینہ طور پر معلوم ہوا کہ چناب نگر قادیانی جماعت کا ناظم وقف جدید اللہ بخش صادق تھا۔ اس نے وقف جدید کے معلم نذیر احمد کو سندھ تھر پارکر' نگر پارکر میر پور قادیانی اسٹیٹوں سے جعلی بیعت فارم پُر کر کے بھجوانے کے دھندہ پر لگا دیا۔ ان فارموں کی بنیاد پر اللہ بخش صادق وقف جدید چناب نگر کے فنڈ سے ان فرضی افراد کی امداد شو کر کے رقم اپنی جیب میں رکھ لیتا۔ معلم نذیر احمد قادیانی کے علاوہ وقف جدید میں دو تین اہل کار اس نے اپنے ہم نوا بنائے ہوئے تھے۔ ان کو تنخواہ کے علاوہ مزید جیب خرچی مل جاتی تھی۔ معلم نذیر احمد قادیانی خوبرو نوجوان تھا۔ اللہ بخش صادق قادیانی اور دوسرے اس کے ہجولی' معلم نذیر احمد قادیانی کے چناب آنے پر اس سے خلاف وضع فعل کرتے تھے۔

معلم نذیر احمد قادیانی کا ان سے کسی امر پر بگاڑ ہو گیا۔ اس نے اللہ بخش صادق قادیانی کو دھمکی دی کہ فرضی امداد کے نام پر پچھتر لاکھ روپے تم نے قادیانی جماعت کے فنڈ سے خورد برد کیے ہیں۔ میں اس کا انکشاف کر کے تمہیں ذلیل کروں گا۔ اللہ بخش قادیانی کو جان کے لالے پڑ گئے۔ اس نے معلم نذیر احمد قادیانی کی منت خوشامد کر کے گھر بھیج دیا۔ سال بھر تنخواہ اس کے گھر بھجواتا رہا۔ جب دیکھا کہ سال گزر گیا ہے۔ معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا ہے تو اس کی تنخواہ بند کر دی۔

معلم نذیر احمد قادیانی سندھ سے سفر کر کے چناب نگر آیا۔ اللہ بخش صادق قادیانی کو ملا اور تنخواہ کا مطالبہ کیا۔ اللہ بخش صادق قادیانی ناظم وقف جدید نے ڈرایا دھمکایا کہ کونسی تنخواہ؟ سال بھر مفت کی کھاتے رہے۔ جاؤ تمہارا جماعت سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر تم نے کہیں بھی زبان کھولی تو تمہارا نشان مٹا دیا جائے گا۔

(قادیانی جماعت کا کوئی فرد پاکستان سے اپنے نام نہاد خلیفہ' چیف گرو' لاٹ پادری کو خط لکھے تو مقامی جماعت کے امیر کی تصدیق لازمی ہوتی ہے۔ پھر وہ خط چناب نگر جاتا ہے۔ سنسر کے بعد خلیفہ کو بھیجا جاتا ہے۔)

لیکن معلم وقف جدید نذیر احمد قادیانی سندھی کا ایک تعلق دار برطانیہ میں مرزا طاہر قادیانی آنجہانی کا جاننے والا تھا۔ اس کی معرفت معلم نذیر احمد قادیانی نے پورے فراڈ کی کہانی لکھ کر مرزا طاہر قادیانی آنجہانی کو لندن بھجوا دی۔ مرزا طاہر قادیانی نے وہ خط چناب نگر پاکستان میں قادیانی جماعت کے امیر کو تحقیقات کے لیے بھجوایا۔ جب اللہ بخش صادق قادیانی کو پتہ چلا کہ معاملہ خراب ہو رہا ہے تو اس نے فوری طور پر بہانے سے معلم نذیر احمد قادیانی کو سندھ سے چناب نگر بلوایا۔ ترغیب و ترہیب دے کر قائل کرنا چاہا کہ کسی طرح اپنے خط کے جھوٹے ہونے کا اقرار نامہ لکھ دے۔

معلم نذیر احمد قادیانی تیار نہ ہوا تو اللہ بخش صادق نے معلم نذیر احمد قادیانی کو جان سے

مار دینے اور لاش غائب کر دینے کی دھمکیاں دے کر مرزا طاہر کے نام خط لکھوالیا کہ میں نے پہلے خط میں اللہ بخش صادق ناظم وقف جدید کی جو شکایات کی تھیں، وہ غلط تھیں۔ یہ تحریر لکھوا کر اللہ بخش صادق اور اس کے ہم جولی مطمئن ہو گئے۔ لیکن معلم نذیر احمد نے گھر جا کر پھر اپنے ذریعہ سے مرزا طاہر قادیانی کو ساری صورتحال لکھ دی کہ مجھ سے گن پوائنٹ پر دستخط لیے گئے ہیں۔ لیکن میں اپنے پہلے بیان پر قائم ہوں کہ اللہ بخش صادق نے واقعی پچھتر لاکھ کا فراڈ کیا ہے۔

مرزا طاہر نے انکوائری کرائی۔ جرم ثابت ہونے اور فراڈ کے ذریعہ قادیانی جماعت کو پچھتر لاکھ روپے کا ٹیکہ لگانے کے جرم کی پاداش میں اللہ بخش صادق کو جماعتی عہدہ سے برطرف کر دیا گیا۔ مرزا طاہر کے زمانہ میں وہ معافی تلافی کے لیے کوشاں رہا۔ لیکن مرزا طاہر قادیانی نہ مانا۔ اب مرزا مسرور احمد قادیانی کے گرو بنتے ہی اللہ بخش صادق دوبارہ کوشش کر کے چناب نگر میں قادیانی جماعت کا صدر عمومی بن گیا ہے۔

کیا مرزا مسرور احمد قادیانی چیف گرو اس کی تردید کر سکتا ہے؟ نہیں کر سکتا۔ ہرگز نہیں کر سکتا تو پھر اے کاش قادیانی جماعت سے وابستہ افراد سوچیں کہ ان کے چندوں کے ساتھ کیا دھندہ کیا جا رہا ہے۔ یہ اللہ بخش صادق ہے اگر صادق کا یہ حال ہے تو کاذب کا کیا کمال ہوگا؟

قادیانی عوام سوچیں کہ قادیانی قیادت کس طرح آپ کے ایمان، مال و آبرو کے درپے آزار ہے۔ پچھتر لاکھ فراڈ کا مرتکب صدر عمومی بن بیٹھا ہے۔ وقف جدید کے نوجوان اور خوبرو معلم نذیر احمد قادیانی سے اس وحشیانہ سلوک کا عادی مجرم چناب نگر کے قادیانی عوام کی عزتوں سے کیا کرتا ہوگا؟

ڈی سی جھنگ توجہ فرمائیں

چناب نگر میں قادیانی جماعت نے ایک شکارگاہ قائم کر رکھی ہے۔ نئے نئے لوگوں کو شکار کر کے وہاں لایا جاتا ہے۔ مفلوک الحال، غریب، ناواقف مسلمانوں کو قادیانی، شکار کر کے مختلف علاقوں سے وہاں لاتے ہیں۔ ان کے آنے جانے کا خرچہ اور مزید انعام ''شکاری قادیانی'' کو علیحدہ ملتا ہے۔ یہاں پہنچ کر قادیانی جماعت کے دجل وفریب کے سراپا تصویر مبلغین و مربی ان نئے گرفتار ہونے والے مسلمانوں کو قادیانی بناتے ہیں۔ اس ارتدادی مہم میں جہاں ان مسلمانوں کو رکھ کر قادیانی بنایا جاتا ہے، اس جگہ کا نام دارالضیافت یا لنگر خانہ مسیح موعود (مرزا قادیانی دجال) ہے۔ یہ لنگر خانہ و دارالضیافت ہمیشہ قادیانی فراڈ کا بہت بڑا حصہ رہا ہے۔ ایمان واخلاق کی بربادی کے علاوہ یہاں پر ہمیشہ مالی فراڈ بھی ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ مرزا غلام احمد قادیانی ملعون نے جب قادیان میں یہ لنگر خانہ

قائم کر کے چندہ کے حصول کے لیے اسے ''کاسۂ گدائی'' کے طور پر استعمال کیا تھا۔ اس وقت بھی قادیانی جماعت کے سرکردہ بعض افراد نے جو مرزا غلام احمد قادیانی کے مریدان باصفا نے مرزا غلام احمد ملعون سے اس کا حساب طلب کیا تھا۔ مرزا قادیانی نے جواب میں کہہ دیا میں منشی تھوڑا ہوں کہ تمہیں حساب دوں۔ ان لوگوں نے درخواست کی کہ آئندہ کے لیے اس کی آمد وصرف کا حساب ہمارے سپرد کر دیا جائے۔ اس پر مرزا قادیانی نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے الہام کے ذریعہ بتایا ہے کہ اگر لنگر خانہ کا کسی اور کو حساب دیا گیا تو لنگر خانہ بند ہو جائے گا۔ اس پر بدھو احمق مرید خاموش ہو گئے۔ الہام کے مقابلہ میں تو قادیانیت سے خارج کر دیے جاتے پھر اس صورت میں لنگر خانہ کا حساب ملنے کی بجائے لنگر خانہ کے ٹکڑوں سے بھی محروم ہو جاتے۔ کیا کوئی قادیانی، مرزا قادیانی کے اس فراڈ و مالی اعتراضات پر مشتمل متذکرہ تفصیلات کے لیے حوالہ کا طلب گار ہے؟ اگر ہے تو وہ فقیر سے رابطہ کرے۔

اصل قادیانی کتاب کا حوالہ پیش کرنے کی ذمہ داری کے ساتھ جو مجھے آج کی فرصت میں ضلع جھنگ کے اپنے محترم عالی جناب ڈی سی صاحب سے عرض کرنا ہے، وہ یہ ہے کہ آج کل دارالضیافت چناب نگر کا انچارج اور ناظم معروف قادیانی ملک منور احمد جاوید ہے۔ ہر سال یہ دارالضیافت اور سالانہ جلسہ کے نام پر ہزاروں ٹن گندم کا پرمٹ حاصل کر کے گندم خرید کرتے ہیں حالانکہ جماعت کا فراڈ ملاحظہ ہو کہ دارالضیافت میں مسلمانوں کو لا کر مرتد بنایا جاتا ہے اور سالانہ جلسہ 1984ء سے بند ہے۔ کبھی اس کی حکومت نے اجازت نہیں دی۔ جس جلسہ پر حکومت نے پندرہ سال سے پابندی عائد کر رکھی ہے اور جس مہمان خانہ میں ارتداد پھیلایا جاتا ہے، اس کے نام پر حکومت سے منظوری لے کر جناب ڈی سی جھنگ سے پرمٹ حاصل کر کے گندم خرید کی جاتی ہے اور اسے سٹاک کر کے گندم کی بجوائی کے موقع پر جب گندم کے بازار میں نسبتاً ریٹ بڑھ جاتے ہیں، ہزاروں ٹن گندم غلہ منڈی سرگودھا کے یعقوب آڑھتی کے ذریعہ مہنگی فروخت کر دی جاتی ہے۔ اس ذخیرہ اندوزی اور ناجائز کمائی میں کون کون شریک ہیں۔ اس کی انکوائری کرنی، انھیں قرار واقعی سزا دینا اور فراڈ کو روکنا اور قادیانی اس دھوکہ وجعل سازی کے لیے پرمٹ خریداری گندم کا پرمٹ منسوخ کرنا، یہ جناب ڈی سی جھنگ کی ذمہ داری ہے۔ کیا وہ اس پر توجہ فرمائیں گے؟

بلیو پرنٹ، زنا کاری، کینیڈا

روزنامہ جنگ کا چناب نگر میں نمائندہ اکبر فانی قادیانی ہے۔ اس کا لڑکا فضل قادیانی روزنامہ دن کا نمائندہ بنا ہوا ہے۔ عرصہ سے اس نے چناب نگر میں قادیانی لڑکیوں کا ایک گروہ بدکاری وزنا کاری کے لیے تیار کر رکھا تھا۔ چناب نگر، چنیوٹ، جھنگ، فیصل آباد، سرگودھا تک آرڈر بک کر

کے ان لڑکیوں کو سپلائی کرتا تھا۔ اس قادیانی اخلاق کے عظیم شاہکار فضل فانی نے ان قادیانی لڑکیوں کی بدکاری کے بلیو پرنٹ تیار کر رکھے تھے۔ ان کے ذریعہ بلیک میل کرنا اور بلیو پرنٹ فروخت کر کے اس کی کمائی کھانا اس کا پیشہ تھا۔ قادیانی جماعت کے موجودہ امور عامہ کرنل اعجاز نے جب اس کہانی کے ہر جگہ تذکرے عام ہوتے اور چرچے بلند ہوتے دیکھے تو اس قادیانی کو کینیڈا بھجوا دیا۔ یہ سزا دی یا انعام سے نوازا، اس کا فیصلہ میں قادیانی عوام پر چھوڑتا ہوں۔ کیا اس پر وہ فقیر سے عدالتی سطح پر گواہ طلب کریں گے؟

منیر، عظمیٰ، خان میڈیکل ہال، لاہور

منیر احمد خان ولد رفیع۔ خان میڈیکل ہال اقصیٰ چوک چناب نگر جو محلہ دارالرحمت شرقی "ب" کا صدر ہے۔ اس نے عظمیٰ نامی لڑکی سے (منیر احمد خان نے) ناجائز تعلقات قائم کیے۔ فضل عمر ہسپتال کی بیک سائیڈ پر منیر خان اور عظمیٰ کے "عشق و مستی" اور "باہم دیگر کرم فرمائیوں" کے معرکے سر ہوتے رہے۔ جب بات پھیلی تو منیر کو کرنل اعجاز نے لاہور چلتا کیا۔ مرزا محمود کی روح خوش ہو گی "کیونکہ زنا کی اجازت ہے مگر اس کا عام تذکرہ ٹھیک نہیں" یہ مرزا محمود کا معروف فلسفۂ حیات تھا، جسے کرنل اعجاز ان قادیانی شہبازوں کے ذریعہ چناب نگر (ربوہ) کے گلی کوچوں میں خوب سے خوب تر پروان چڑھا رہا ہے۔

ڈاکٹر سعید، منصورہ بیگم، نشہ آور ٹیکے، الف ننگا

حافظ آباد کا ایک نام نہاد ڈاکٹر سعید جس نے رحمت بازار چناب نگر میں اپنا کلینک قائم کر رکھا ہے، بریگیڈیر شمیم اقبال قادیانی کی بیوہ منصورہ بیگم سے اس نے شادی رچا رکھی ہے۔ دارالرحمت وسطی میں اس کی رہائش ہے۔ قادیانی اوباش لڑکے اور لڑکیوں کو نشہ آور ٹیکے لگانا۔ جنسیاتی عمل کو تیز کرنے اور مہمیز لگانے والی ادویات مہیا کرنے کے لیے قادیانی لڑکے اور لڑکیوں کا اس کے ہاں ٹھٹھ لگا رہتا ہے۔ ایک لڑکا منصور ولد خان محمد متوفی فیکٹری ایریا کے گھر سے الف ننگا برآمد ہوا۔ کیا اس سے انکار ممکن ہے۔ ڈاکٹر سعید نے جعلی سیمنٹ کی فیکٹری بنا رکھی ہے۔ سعید خان بلوچ ایس ایچ او کی سرپرستی میں یہ جعل سازی ہو رہی ہے۔ کیا اس پر توجہ دی جائے گی۔ حکومتی اداروں سے سوال؟

جعلی سندیں، جعلی پاسپورٹ، جعلی ویزے

قاسم سنیارہ کا ایک لڑکا جس کا نام منور احمد شاہد ہے۔ آج کل روزنامہ صحافت چناب نگر کی اس نے نمائندگی لے رکھی ہے۔ جعلی سندیں، جعلی شناختی کارڈ، جعلی ویزے بنانا اس کا مشغلہ ہے۔

ط

طاہر عارف ڈی آئی جی ایف آئی اے سرگودھا نے طارق نامی ایک قادیانی کو ایف آئی اے میں بھرتی کیا تھا۔ یہ طارق چک نمبر 98 شمالی سرگودھا کا رہائشی ہے۔ منور احمد شاہد قادیانی کی تمام تر جعل سازی میں یہ برابر کا شریک ہے۔ کیا حکومتی ادارے اس پر توجہ فرمائیں گے؟

روزنامہ صحافت کے چیف ایڈیٹر جناب خوشنود علی خان سے بھی استدعا ہے کہ بجائے منور احمد شاہد کے کسی اور کو نمائندگی دیں۔ چناب نگر میں اور بھی نمائندے مل جائیں گے۔ منور احمد شاہد صحافت کی آڑ میں جعل سازی کر رہا ہے۔ اس سے اپنے اخبار کے وقار کو بچانا ضروری ہے۔

پی سی او

مبشر احمد نے ربوہ میں پی سی او بنا رکھا ہے۔ پی سی او کیبن کے بیک سائیڈ میں اس نے کیا کیا کارروائیاں شروع کر رکھی ہیں۔ یہ بات چناب نگر کے باسیوں اور خود پولیس کے لیے اگر وہ شریک کار نہیں تو ایک سوال یہ ہے کہ کس کس کے کس کس کے ساتھ کیا کیا معاملات طے پاتے ہیں۔ بہت کچھ یہاں کی نگرانی سے مل سکتا ہے۔

محمد نوید شاہین (ایڈووکیٹ)

''قادیانی اخلاقیات'' اخبارات کی نظر میں

- ''1990ء میں لاہور میں بلیو پرنٹ فلموں کا ایک بہت بڑا کیس پکڑا گیا ہے اور دو ملزم ظفر احمد خاں اور ہالہ کو پولیس نے گرفتار کر لیا ہے۔ شبہ کیا جا رہا ہے کہ ظفر احمد خاں قادیانی ہے۔ ملزموں کی طرف سے کیس کی پیروی ایک قادیانی وکیل نفیر اے خاں کر رہا ہے جو خود بھی بلیو پرنٹ کے دھندے میں ملوث ہے اور لاہور کی ایک بدنام شخصیت شمار کیا جاتا ہے۔ مذکورہ وکیل اور ملزمان مل کر لڑکیوں کو اپنے جال میں پھنساتے ہیں اور انھیں بلیک میل کرتے ہیں۔ اس طرح یہ لوگ باقاعدہ طور پر بلیو پرنٹ فلموں کی (تیاری) کا کاروبار کر رہے ہیں۔ موجودہ کیس میں ملوث ایک لڑکی مسماۃ عائشہ بھی گرفتار کر لی گئی ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ اس قادیانی وکیل نفیر اے ملک نے لندن میں اپنے قیام کے دوران مرزا طاہر احمد سے بھی ملاقات کی تھی اور 62 کے لگ بھگ بلیو پرنٹ فلمیں لندن پہنچا چکا ہے۔ مزید برآں مذکورہ وکیل مشہور TV آرٹسٹ دلدار پرویز بھٹی اور TV فوٹو گرافر حمید الدین سے بھی ایک بڑی رقم دھوکہ دہی سے ہتھیا چکا ہے۔ بلیو پرنٹ سے قادیانی مغربی دنیا میں پاکستان کی سیدھی سادھی نوجوان لڑکیوں کو بدنام کر رہے ہیں۔'' (روزنامہ نیشنل ٹائمز لاہور دسمبر 1990ء)
- ''قادیانی سربراہ کے رشتہ داروں نے قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ربوہ میں جوئے کے اڈے کھولنے شروع کر دیے۔ تفصیلات کے مطابق ربوہ پولیس نے محلہ دارالرحمت شرق میں چھاپہ مار کر مرزا محمد ابراہیم ولد مرزا بشیر احمد منعمؔ ناصر ولد رشید اور ان کے ساتھیوں کو جواء کھیلتے ہوئے گرفتار کر لیا ہے۔ پولیس کو دیکھ کر مرزا ابراہیم جو قادیانیوں کے سربراہ مرزا غلام احمد کا پوتا بتایا جاتا ہے بھاگ کھڑا ہوا اور چھت سے چھلانگ لگا دی جس سے اس کی ٹانگ بھی ٹوٹ گئی۔ مرزا ابراہیم کو پولیس نے فضل عمر ہسپتال میں داخل کروا دیا ہے۔''

(روزنامہ جنگ لاہور 7 جولائی 1993ء)

چنیوٹ 21 جنوری (نامہ نگار) پولیس نے گذشتہ شب اچانک چھاپہ مار کر ریذیڈنٹ مجسٹریٹ ربوہ کے ریڈر نعیم چوہان کے گھر سے سترہ افراد کو وی سی آر پر بھارتی فلم ''لو سٹوری'' دیکھتے ہوئے موقع پر گرفتار کر لیا۔ ملزمان کے خلاف 18 موشن پکچرز آرڈیننس اور کسٹم ایکٹ کے تحت مقدمہ درج کر کے وی سی آر رنگین ٹیلی ویژن سیٹ اور کیسٹ قبضہ میں لے لیے ہیں۔ ملزموں میں نعیم چوہان، غلام شبیر، غلام مصطفیٰ، نصیر احمد، مبشر احمد، اسحاق طاہر، محمود نصر اللہ، عبدالحمید بشارت خالد اور صدیق شامل ہیں۔

(بشکریہ روزنامہ جنگ لاہور 23 جنوری 1983ء)

- ''ربوہ میں معززین شہر نے ایک قادیانی شعیب اور اس کے دوست آپریٹر ٹیلی فون ایکسچینج انوار الحق کو شریف شہریوں کے گھروں میں اخلاق سوز فحش کالیں کرتے ہوئے پکڑ لیا۔ تفصیلات کے مطابق اگست کی رات مقامی ٹیلی فون ایکسچینج ربوہ کے ڈیوٹی آپریٹر انوار الحق کو صحافیوں اور معززین شہر کی شکایات پر ملازمت سے فارغ کر دیا گیا۔ واقعات کے مطابق وہ اپنے دوست محمد شعیب قادیانی کو ٹرنک کال روم میں بٹھا کر لوگوں کے گھروں میں اخلاق سوز فحش کالیں کروا رہا تھا۔ اسسٹنٹ انجینئر ٹیلی فون ربوہ نے محکمہ کے ضوابط کی خلاف ورزی کرنے پر اسے ملازمت سے فوری طور پر فارغ کر دیا۔ گزشتہ روز صوفی محمد اقبال اسسٹنٹ انجینئر ٹیلی فون ربوہ نے اپنے دفتر میں مقامی صحافیوں سے ملاقات کے دوران بتایا کہ انھوں نے صارفین کی شکایات پر مکمل تحقیقات کی تو یہ معلوم ہوا کہ آپریٹر انوار الحق اپنے ایک غیر متعلقہ دوست شعیب قادیانی کو ٹرنک روم لا کر صارفین کے گھروں میں واہیات کالیں کروایا کرتا تھا۔ معززین شہر نے دونوں کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا۔ شکایات درست ثابت ہونے پر حسب ضابطہ پاکستان ٹیلی کمیونیکشن کارپوریشن نے آپریٹر کو فوری طور پر ملازمت سے نکال دیا ہے۔ اسسٹنٹ انجینئر ٹیلی فون نے بتایا کہ شعیب قادیانی نے انھیں سنگین نتائج کی دھمکیاں دیتے ہوئے وارننگ دی کہ وہ میاں شہباز شریف کا خاص آدمی ہے۔ اس کی رسائی اسلام آباد تک ہے لہٰذا تم اپنے مستقبل کا ابھی سے بندوبست کر لو۔ اس نے اپنا مسلم لیگ کا گرین کارڈ دکھاتے ہوئے کہا کہ یہ کارڈ میاں شہباز شریف کے قابل اعتماد دوستوں کو ہی جاری کیے جاتے ہیں۔ شہر بھر کے صارفین ٹیلی فون، عوامی نمائندگان اور صحافیوں نے اسسٹنٹ انجینئر ٹیلی فون ربوہ کے بروقت اقدام کو سراہا اور خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فرض شناس اہلکار کا شکریہ ادا کیا۔''

(روزنامہ نوائے وقت لاہور 9 اگست 1991ء)

- ''اقلیتی ایم پی اے ملک نعیم الدین خالد قادیانی کی غنڈہ گردی نے کیو بلاک ماڈل ٹاؤن یرغمال بنالیا۔ قادیانی ایم پی اے نے علاقہ میں فحاشی' شراب نوشی اور مجرا کو پروان چڑھانا شروع کر دیا ہے۔ باخبر ذرائع کے مطابق ڈھلے فلیٹس کیو بلاک ماڈل ٹاؤن کے علاقہ میں اقلیتی قادیانی ایم پی اے نے اقتدار کے نشے میں چور ہو کر ہزاروں کی آبادی پر مشتمل علاقے کے واحد پارک جو لوگوں کی خوشی اور غمی میں استعمال ہوتا ہے' پر قبضہ کر لیا ہے اور ایل ڈی اے کی بنائی ہوئی سڑک پر لوہے کے بیریئر لگا کر لوگوں کی آمد و رفت روک دی۔ ایم پی اے نے اپنے گھریلو فنکشن پر اسی پارک میں مجرا کروایا اور شراب اور فحاشی کی محفل رات گئے تک سجی رہی۔ علاوہ ازیں یہاں پر فائرنگ روز کا معمول بن چکی ہے۔ علاقے کے لوگوں کے مطابق ایم پی اے کا بیٹا رات گئے تک اپنی گاڑی کا ڈیک چلا کر اہل محلّہ کو تنگ کرتا ہے' جبکہ ایم پی اے نے ایل ڈی اے کی تعمیر شدہ سڑک پر لوہے کے بیریئر لگا کر روڈ بند کر دیا ہے اور پارک کے دروازے اپنے گھر کے سامنے سے کھول دیے ہیں اور اسے اپنی ذاتی جاگیر بنا رکھا ہے۔ اگر کوئی اس غنڈہ گردی کو روکنے کی بات کرے تو قادیانی ایم پی اے غنڈہ گردی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے سنگین نتائج کی دھمکیاں دیتا ہے۔ اہل علاقہ نے شدید پریشانی میں غنڈہ گردی کی روک تھام کے لیے مذکورہ محکموں اور ارباب اختیار کو درخواستیں دیں اور ابھی تک کسی نے ایک نہ سنی اور قادیانی غنڈہ گرد ایم پی اے کی من مانیاں ابھی تک جاری ہیں۔''

(روزنامہ خبریں لاہور 16 اگست 1996ء)

- ''دو قادیانی لڑکوں نے سانگلہ ہل میں غریب مزدور کی بیٹی کو زبردستی اغواء کر کے اس کے ساتھ زنا کیا اور اس کی برہنہ تصویریں بنائیں۔ یہ تمام تفصیلات مذکورہ لڑکی کے والد نے ایف آئی آر میں بتائیں۔ محمد اسماعیل ولد اللہ بخش چک نمبر 45/RB صدر سانگلہ ہل کا رہائشی ہے اور محنت مزدوری کرتا ہے۔ عرصہ قریب 6/7 ماہ قبل اس کی بیٹی آسیہ کو گھر سے باہر جاتے ہوئے مسمیان جاوید ولد محمد اسماعیل قادیانی اور وسیم احمد ولد علی بخش قادیانی قوم راجپوت نے زبردستی اغواء کر کے اسے اپنی بیٹھک میں لے گئے اور تقریباً ایک گھنٹہ اسے محبوس رکھا اور اس کی بیٹی کو اسلحہ دکھا کر جان سے مارنے کی دھمکی دے کر اسے برہنہ کر دیا اور دونوں ملزمان نے باری باری اور اکٹھے بھی اس کی بیٹی کے ساتھ فحش تصویریں اتاریں اور زنا کیا اور لڑکی کو دھمکی دی کہ اگر کسی کو بتایا تو تمھیں اور تمھارے اہل خانہ کو جان سے مار دیں گے۔ اسماعیل اور اہل خانہ اپنی عزت اور جان کے خوف سے خاموش ہو گئے اور

بیٹی کی شادی کر دی۔ دونوں ملزمان نے اس لڑکی کو بے ہودہ خطوط لکھے جس کے نتیجہ میں اس لڑکی کا گھر اجڑ گیا۔ اب پھر ملزموں نے 97-10-11 کو رات 11/12 بجے کے قریب گھر کے دروازے پر دستک دی اور دروازہ کھولنے پر انھوں نے فائر کر دیا لیکن یہ گولی کسی بھی گھر والے کو نہیں لگی۔ مذکورہ مظلوم اسماعیل اب ہر جگہ انصاف مانگ رہا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اسے انصاف مہیا نہیں ہو رہا۔‘‘

(روزنامہ خبریں لاہور 15 جنوری 1991ء)

- ’’قادیانیوں نے انتظامیہ اور افسر شاہی کی سرپرستی میں سندھ میں فحاشی کے اڈے کھولنے شروع کر دیے ہیں۔ تفصیلات کے مطابق قادیانی جھوٹے مذہب کی تبلیغ انتہائی جارحانہ انداز میں کرتے ہیں۔ تبلیغ کے ساتھ اپنے مرزواڑے میں ڈش انٹینا کے ذریعے انھوں نے فحاشی کے اڈے بنائے ہوئے ہیں۔ واقعات کے مطابق کھوسکی شادی لاج کے عبادت خانے میں قادیانیوں نے ڈش انٹینا لگایا ہوا ہے جس میں بعض اضافی آلات لگائے ہوئے ہیں جو PTV کے پروگرام جام کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ مرزا طاہر احمد کے پروگرام کے بعد فحش فلمیں شروع کر دی جاتی ہیں جس سے نوجوانوں کے اخلاق پر برے اثرات پڑ رہے ہیں۔ قادیانی نہ صرف نوجوانوں کو فحش فلموں کے نظارے کرواتے ہیں بلکہ وہ اپنے ساتھ اپنی لڑکیوں کو لے جاتے ہیں اور پھر نوجوانوں کو شادی کا لالچ دے کر انھیں راہ ہدایت سے بھٹکانے کی کوشش کرتے ہیں۔ گویا قادیانی مذہب کا خلاصہ ہے، لڑکی لو مرزائی بنو۔ قادیانی فحاشی کے اڈے کے خلاف خبریں شائع کرنے والے اخبارات کی انتظامیہ اور نامہ نگاروں کو بھی سنگین نتائج کی دھمکیاں دے رہے ہیں۔ اس لیے یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ قادیانیوں کے ’’بیوت الذکر‘‘ عبادت خانے نہیں بلکہ بیوت المنذ کر و مونث ہیں۔ انھیں منی سینما گھروں اور فحاشی و عریانی کے اڈوں کا نام دینا زیادہ مناسب ہے۔ حکومت کو چاہیے کہ ان منی سینماؤں اور فحاشی و عیاشی کے اڈوں کو فوراً ختم کرے۔‘‘ (ہفت روزہ ختم نبوت کراچی 20 تا 26 اگست 1996ء)

- ’’ربوہ میں انجمن احمدیہ کے زیر نگرانی فحاشی اور ’’موبائل ایڈز‘‘ نے گھروں کا رخ کر لیا ہے۔ تفصیلات کے مطابق ربوہ میں چلتی پھرتی ایڈز سڑکوں اور بازاروں سے گھروں تک پہنچ گئی ہے جس نے بے شمار گھروں کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے۔ رحمان کالونی میں بھی ایک فحاشی کا اڈہ کھل گیا ہے جہاں اِدھر کا مال اُدھر اور اُدھر کا مال اِدھر کر دیا جاتا

ہے۔ لاری اڈہ فحاشی کا اڈہ بن چکا ہے۔ پولیس سمیت سرکاری دفاتر میں ''حسن کے پجاری'' دیوی کے درشن اور گنگا اشنان میں مگن سرکاری کرسی کو اپنی موروثی جاگیر سمجھ کر ربوہ سے تبدیل ہو کر جانا بہت بڑا پاپ سمجھتے ہیں۔ ایسی صورتحال پیدا ہو چکی ہے کہ ٹرانسفر ہونے والے اہلکار چند دنوں میں واپس آ جاتے ہیں۔ انجمن احمدیہ اب کھلی آنکھوں سے بے حیائی و کرپشن کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ شہریوں کی طرف سے کرپشن اور بے حیائی کے خلاف اٹھائی جانے والی آواز کو نہ صرف دبایا جاتا ہے' بلکہ ایسے مجاہدوں کو مختلف الزامات اور تہمتیں لگا کر بدنام کیا جاتا ہے اور ربوہ کو قادیانیوں نے ایک بار پھر اندھیر نگری اور چوپٹ راج بنا دیا ہے۔'' (روزنامہ جرأت لاہور 18 اکتوبر 1996ء)

- ''قادیانی مذہب بداخلاقی اور جنسی بدکاریوں کا مذہب ہے۔ اس بات کا اندازہ بشیر احمد مصری صاحب کی ان تحریروں سے کیا جاتا ہے اور یہ تمام تحریریں بشیر احمد مصری صاحب کے ذاتی مشاہدات پر مبنی ہیں۔ بشیر احمد صاحب کے مطابق جب میں سن بلوغت میں پہنچا تو میں نے اپنے اردگرد قادیانیوں کی اکثریت کو بدکردار' عیار اور مکار پایا اور میرا ان لوگوں کے خلاف ابتدائی ردعمل بداخلاقی اور جنسی بدکاریوں کی وجہ سے تھا۔ جوں جوں میں بڑا ہوتا گیا تو مجھے قادیانیوں کی بدکاریوں کا علم ہوتا چلا گیا۔ ایک دفعہ مجھے پتہ چلا کہ نیم دیوتا مرزا بشیر الدین نے زنا کاری کا ایک خفیہ اڈا کھول رکھا ہے (ان دنوں ہم خلیفہ قادیان کو نیم دیوتا کہا کرتے تھے) جس میں منکوحہ' غیر منکوحہ حتیٰ کہ محرمات کے ساتھ کھلے بندوں زنا کاریاں ہوتی ہیں اور اس عیاشی کے لیے اس نے دلالوں اور کٹنیوں کی ایک منڈلی منظم کر رکھی ہے جو پاکباز عورتوں اور معصوم دوشیزاؤں کو بہلا پھسلا کر مہیا کرتی ہے اور یہ دلال مجبوراً اور غریب دوشیزاؤں کو بہلا پھسلا کر یہاں لاتے ہیں۔''

(ماہنامہ نقیب ختم نبوتؐ اکتوبر 1989ء)

- ''لاہور ہائیکورٹ کے مسٹر جسٹس فلک شیر نے پنجاب میڈیکل کالج فیصل آباد کے دو قادیانی پروفیسروں کی طرف سے میڈیکل کے طلباء و طالبات سے امتحانات میں پاس کروانے کے لیے بھاری رشوت لینے' کلاس روم میں طالبات کے ساتھ غیر اخلاقی گفتگو کرنے' انھیں بلیک میل کرنے اور میڈیکل کے بعض طلباء کے ساتھ غیر فطری فعل کرنے کے واقعات کا سختی سے نوٹس لیتے ہوئے پنجاب یونیورسٹی کے چانسلر' وائس چانسلر کنٹرولر امتحانات چیئرمین بورڈ آف سٹڈیز' کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے پرنسپل اور پنجاب

میڈیکل کالج فیصل آباد کے پرنسپل کو نوٹس جاری کر دیے ہیں۔ فاضل عدالت نے حکومت پنجاب کو ہدایت کی ہے کہ مذکورہ دونوں اساتذہ کو آئندہ حکم تک پنجاب کے کسی کالج میں ممتحن نہ لگایا جائے۔ فاضل عدالت نے دونوں پروفیسروں سے الزامات کے تحریری جوابات بھی طلب کیے ہیں۔ فاضل عدالت نے عدالت کے احکام نہ ماننے پر سیکرٹری صحت پنجاب اور پنجاب یونیورسٹی کے کنٹرولر امتحانات کو بھی نوٹس جاری کیے ہیں۔"

□ "درخواست میں کہا گیا تھا کہ کالج کے دو قادیانی پروفیسر ڈاکٹروں نے ان دونوں پرچوں میں صرف ان طلباء و طالبات کو کامیاب کرایا' جنھوں نے پروفیسروں کو اس کے عوض بھاری رقوم دیں جبکہ رشوت نہ دینے والے تمام کو فیل کر دیا گیا۔ اب 14 اپریل سے شروع ہونے والے امتحانات کے لیے بھی انہی پروفیسروں کو دوبارہ ممتحن لگایا جا رہا ہے اور وہ درخواست گزاروں سے بھاری رقوم مانگ رہے ہیں۔ ایک پروفیسر مارفیا کے عادی ہیں اور روزانہ مارفیا کے ٹیکے لگواتے ہیں اور کئی بار رات کو نشہ کی حالت میں لڑکیوں کے ہاسٹل کے ممنوعہ علاقے میں آ جاتے ہیں۔ ایک پروفیسر نے ایک سال میں طالب علموں کو صرف ایک لیکچر دیا ہے۔ دوسرے پروفیسر طلباء کو ٹیوشن پڑھنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ایک پروفیسر کلاس روم میں طالبات سے بے ہودہ گفتگو کرتے ہیں اور انھیں بلیک میل بھی کرتے ہیں۔ درخواست میں استدعا کی گئی ہے کہ ان دونوں کو 14 اپریل سے ہونے والے امتحانات کے لیے ممتحن مقرر نہ کیا جائے اور انھیں معطل کر کے محکمانہ کارروائی کا حکم دیا جائے۔ اسسٹنٹ ایڈووکیٹ جنرل پنجاب نے عدالت کو بتایا کہ طلباء کی شکایت کے بعد ڈی آئی جی کرائمز دو پرنسپلوں اور ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج نے تحقیقات کی تو معلوم ہوا کہ طلباء کے بیشتر الزامات درست ہیں۔ ایک قادیانی پروفیسر کو لواطت کی بھی عادت ہے۔ ایک پروفیسر یہ خبر بھی رکھتا ہے طالبات کون سے کپڑے پہن کر کہاں گئیں۔ پھر انھیں بلیک میل کرتا ہے۔ غلیظ اور بے ہودہ گفتگو بھی کرتا ہے۔ ان کا طالبات کے ساتھ رویہ بہت غلط ہے۔ رپورٹ میں سفارش کی گئی ہے کہ سیکرٹری صحت ان دونوں پروفیسروں کے خلاف رشوت ستانی کے الزام میں مقدمہ درج کریں۔ پرنسپل ڈاکٹر محمد ظفر چوہدری نے اپنی رپورٹ میں بتایا کہ رٹ موصول ہونے کے بعد انھوں نے تحقیقات کے لیے ایک کمیٹی قائم کی جس کے روبرو 27 طالبات پیش ہوئیں' ایک پروفیسر پیش ہوئے۔ لیکن دوسرے نہ آئے اس کے بعد ایک اور کمیٹی قائم کی لیکن وہ پھر پیش نہ

ہوئے۔ چیئرمین بورڈ آف سٹڈیز پرنسپل کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج پروفیسر ڈاکٹر بشیر احمد نے اپنی رپورٹ میں کہا کہ رٹ درخواست میں لگائے گئے الزامات اور پنجاب میڈیکل کالج کے پرنسپل سے ہونے والی خط و کتابت کی روشنی میں میں نے فوری طور پر بورڈ آف سٹڈیز کا اجلاس طلب کیا اور فیصلہ کیا کہ فوری طور پر پروفیسر کو ممتحن کی حیثیت سے ہٹا دیا جائے اور معاملہ کی تحقیقات کے لیے پروفیسر نعیم الحمید پروفیسر جلیل الاولیٰ اور پروفیسر اے حمید پر مشتمل کمیٹی قائم کر دی۔ اسسٹنٹ ایڈووکیٹ جنرل زعیم الفاروق ملک نے فاضل عدالت کو بتایا کہ اس سلسلہ میں سیکرٹری صحت پنجاب اور کنٹرولر امتحانات پنجاب یونیورسٹی کی رپورٹیں موصول نہیں ہوئیں۔ اس پر فاضل عدالت نے نوٹس جاری کیا کہ وہ جواب دیں کہ عدالت کے احکام کیوں نہیں مانے اور رپورٹیں کیوں نہیں بھجوائیں۔ فاضل عدالت نے کہا کہ مذکورہ بالا رپورٹوں اور رٹ میں لگائے گئے الزامات میں مماثلت ہے لہٰذا عدالت نے رٹ درخواست باقاعدہ سماعت کے لیے منظور کر لی ہے۔ فاضل عدالت نے تمام مدعا علیہان کو نوٹس جاری کرتے ہوئے درخواست کی مزید سماعت 18 مئی تک ملتوی کر دی اور حکومت پنجاب کو ہدایت کی کہ مذکورہ پروفیسر ڈاکٹر کو آئندہ حکم تک کہیں اور کسی کالج میں ممتحن مقرر نہ کیا جائے۔ فاضل عدالت نے مذکورہ دونوں ڈاکٹروں کو رٹ درخواست میں مدعا علیہ بنا دیا جس کے بعد ایس ایم مسعود ایڈووکیٹ پروفیسر ڈاکٹر نصیر اے بشیر کی طرف سے پیش ہو گئے۔“

(روزنامہ جنگ لاہور 12 اپریل 1993ء)

❑ ”قادیانی جماعت 36 ٹو ایل اوکاڑہ کے امیر کی نعش ایک برس بعد مل گئی۔ بیٹیوں سے بداخلاقی کرنے پر مقتول عبدالجبار کی بیوی نے اسے قتل کر کے نعش دفن کر دی تھی۔ تفصیلات کے مطابق اوکاڑہ کے نواحی گاؤں 36 ٹو ایل کے رہائشی قادیانی جماعت کے امیر عبدالجبار ولد مصطفیٰ کی بیوی شریفاں بی بی نے عرصہ تقریباً ایک سال قبل تھانہ میں درخواست دی کہ وہ سات بیٹیوں اور دو بیٹوں کی ماں ہے۔ اس کا خاوند تین بیٹیوں سے زبردست شیطانی کھیل کھیلنے کے دوران بداخلاقی کا نشانہ بنا چکا ہے اور وہ حاملہ ہیں۔ اس وقت کے ایس ایچ او نے پولیس بھیج کر ملزم کو گرفتار کر لیا۔ بعد میں پولیس نے پوچھ گچھ کے دوران عبدالجبار سے رشوت لے کر اسے چھوڑ دیا۔ عبدالجبار نے گھر آتے ہی بیوی اور بچوں پر تشدد کیا اور دھمکیاں دیں۔ بتایا جاتا ہے کہ ملزم نے اس دوران اپنی چوتھی بیٹی

کو بھی اپنی ہوس کا نشانہ بنایا۔ وقوعہ کے چند روز بعد شریفاں بی بی اپنے خاوند عبدالجبار کو بہانہ سے ڈھاری کے ٹیوب ویل پر لے گئی جہاں پر اسے نشہ آور چائے تیار کر کے پلا دی۔ چائے پیتے ہی عبدالجبار بے ہوش ہو کر چارپائی پر گر گیا۔ اس دوران شریفاں بی بی نے اس کا گلا دبا دیا جس کے نتیجہ میں وہ ہلاک ہو گیا۔ بیوی نے رات کی تاریکی میں ٹیوب ویل کے قریب ایک گڑھا کھودا اور نعش وہاں پھینک کر اوپر مٹی ڈال دی۔ وقوعہ کے دو روز بعد شریفاں بی بی نے تھانہ میں درخواست دے دی کہ اس کا خاوند گھر سے لاپتہ ہے' اس کا سراغ لگایا جائے۔ پولیس نے قادیانی جماعت 36 ٹو ایل کے امیر عبدالجبار کو متعدد مقامات پر تلاش کیا مگر ناکامی ہوئی۔ وقوعہ کو ایک سال بیت گیا' سراغ نہ مل سکا۔ گزشتہ روز ٹیوب ویل دوسرے مقام پر لگانے کے لیے کھدائی کی جا رہی تھی کہ دوران کھدائی زمین سے ایک انسانی ڈھانچہ برآمد ہو گیا جس کی شناخت کر لی گئی۔ پولیس نے ڈھانچہ قبضہ میں لینے کے بعد تفتیش شروع کر دی۔" (روزنامہ انصاف لاہور 4 ستمبر 2001ء)

سمگلنگ اور ہیروئن فروشی

- "سمگلنگ' ہیروئن اور دوسرے ناجائز کاروبار میں ملوث 13 قادیانی کراچی ایئرپورٹ سے گرفتار کر لیے گئے ہیں۔ پولیس ملزمان سے پوچھ گچھ کر رہی ہے۔

قادیانیوں نے ملک میں سمگلنگ' ہیروئن فروشی اور دوسرے ناجائز اور غیر قانونی کاروبار شروع کر دیے۔ اس بات کا واضح ثبوت یہ ہے، فروری مارچ 1990ء کے تقریباً تمام قومی اخبارات میں یہ خبر چھپی ہے کہ 13 قادیانیوں کو پولیس نے کراچی ایئرپورٹ پر ملک سے فرار ہوتے ہوئے سمگلنگ' ہیروئن فروشی اور دوسرے ناجائز و غیر قانونی کاروبار میں ملوث ہونے پر گرفتار کر لیا ہے۔"

(روزنامہ جنگ کراچی 13 مارچ 1990ء)

- "قادیانیوں نے ربوہ میں وسیع پیمانے پر ہیروئن فروخت کرنی شروع کر دی۔ اس بات کا انکشاف اینٹی نارکوٹکس بورڈ کی رپورٹ میں ہوا ہے کہ ربوہ ضلع جھنگ میں قادیانی کھلے عام ہیروئن فروخت کر رہے ہیں اور نوجوان طبقہ اس لعنت کا شکار ہو رہا ہے۔ اس گھناؤنے کاروبار کی سرپرستی کرنے والوں میں قادیانیوں کے علاوہ ضلع فیصل آباد کی پولیس کے بعض اعلیٰ حکام کے رشتہ دار اور ربوہ کی پولیس بھی شامل ہے۔"

(روزنامہ خبریں لاہور 5 دسمبر 1992ء)

- قادیانیوں نے جعل سازی کے بعد اب ملکی سرحدوں پر ملک دشمن بھارت کے ساتھ

سمگلنگ شروع کر دی ہے۔ تفصیلات کے لیے یہ خبر ملاحظہ فرمائیں:

سندھ اور راجستھان سے لے کر رحیم یار خان' بہاولپور تک چولستان کا علاقہ ملک دشمن سرگرمیوں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ اسی راستے سے سمگلنگ عام ہو رہی ہے اور اسی راستے سے تخریب کار داخل ہو کر ملک میں تخریب کاری کر رہے ہیں۔ گویا یہ علاقہ سمگلروں کی جنت ہے۔ گزشتہ دنوں یہ خبر آئی تھی:

''سندھ راجستھان سیکٹر میں سندھ سے سونا' چاندی' ہیرے اور غیر ملکی کرنسی بڑے پیمانے پر بھارت سمگلنگ سے علاقے کی سلامتی کو زبردست خطرات کا سامنا ہے۔ اطلاعات کے مطابق بھارتی خفیہ ایجنسی ''را'' نے دہشت گردوں کو صوبہ سندھ میں داخل کرنے اور انھیں پناہ دینے کے لیے مقامی قادیانیوں کی خدمات حاصل کر رکھی ہیں جس کے بدلے انھیں کسی رکاوٹ کے بغیر بھارت میں سمگلنگ کی اجازت دے دی گئی ہے۔ یہ قادیانی سمگلر سندھ میں پہلے سے موجود ''را'' کے ایجنٹوں کے لیے پیغامبر کے طور پر بھی کام کرتے ہیں۔ انڈس رینجرز کی خصوصی ہدایات پر رینجرز کی ایک ٹیم نے کھوکھراپار سرحد کے قریب سمگلروں کی آمد و رفت کے راستے کو بلاک کر دیا۔ رات کے وقت سرحد پار جانے والے اونٹوں کے ایک قافلے کو رینجرز نے للکارا' سمگلر تاریکی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے فرار ہو گئے۔ اونٹوں پر تین من خالص چاندی لدی ہوئی تھی جس پر قبضہ کر لیا گیا جس کی مالیت دس لاکھ روپے بتائی جاتی ہے۔ گزشتہ آٹھ ماہ کے دوران انڈس رینجرز نے 48 من چاندی برآمد کی جو بھارت سمگل کی جا رہی تھی۔'' (روزنامہ جنگ کراچی 19 اگست 1991ء)

- ''قادیانیوں نے ایک منصوبہ کے تحت پاکستان کی معیشت کو تباہ کرنے اور نوجوانوں کو منشیات جیسی لعنت میں مبتلا کرنے کا پروگرام مرتب کیا ہے۔ گذشتہ دنوں فیکٹری ایریا پولیس نے تین مرزائیوں کو سوسو روپے کے جعلی نوٹوں اور بھاری ہیروئن کے ساتھ گرفتار کر لیا ہے۔'' (روزنامہ جنگ لاہور 31 جولائی 1990ء)
- ''قادیانیوں نے ملک میں ہیروئن کا کاروبار شروع کر دیا ہے۔ اس بات کا انکشاف گزشتہ دن ایک ویلفیئر سوسائٹی کے اجلاس لاہور میں ہوا۔ اس اجلاس میں اور اس بات کا انکشاف کیا گیا کہ قادیانی ملک میں سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہیروئن کا کاروبار کر کے نئی نسل کو تباہ کر رہے ہیں۔'' (روزنامہ جسارت کراچی یکم جون 1986ء)

منیرالدین احمد

ڈھلتے سائے

میرے آباء واجداد کا تعلق چنگا بنگیال تحصیل گوجر خان، ضلع راولپنڈی سے ہے، جو گوجر خان سے کلر سیداں جانے والی سڑک پر سات میل کے فاصلے پر واقع ہے اور سترہ ڈھوکوں پر مشتمل ہے۔ اس نواح میں بنگیال قوم کے پانچ گاؤں پائے جاتے ہیں۔ جہلم، گجرات اور گوجرانوالہ کے اضلاع میں بھی اس قوم کے لوگ آباد ہیں۔ راولپنڈی میں ان کا شمار راجپوتوں میں ہوتا ہے جبکہ دوسرے اضلاع میں ان کو جاٹ گنا جاتا ہے۔ میرے قبیلے کا کہنا ہے کہ ہم پنوار راجپوتوں میں سے ہیں۔

میں 22 نومبر 1934ء کو راولپنڈی میں راجہ عبدالرؤف خان اور ان کی اہلیہ امتہ العزیز بیگم کے ہاں پیدا ہوا۔ میں اپنے والدین کا چھٹا بچہ تھا۔ پہلے تین بچے: ایک لڑکا عبدالقدیر اور دو توام پیدا ہونے والی بچیاں کم عمری میں مر گئے تھے اور صرف دو بچے: نصیر الدین احمد اور نصیرہ بیگم میری پیدائش کے وقت زندہ تھے۔

دادا جان اپنے خاندان میں سے پہلے شخص تھے جنھوں نے احمدیت کو قبول کیا تھا۔ آپ کے علم وفضل کا اس زمانے میں شہرہ ہو چکا تھا اور پٹھوہار کے علاقے میں آپ کو سب لوگ مولوی محمد عمر بخش نقشبندی مجددی کا جانشین مانتے تھے جس کے سبب بہت سے لوگوں نے آپ کی پیروی میں مرزا غلام احمد قادیانی کی بیعت کر لی۔ بالخصوص آپ کے خاندان کے بیشتر افراد دادا جان کی ترغیب پر احمدی ہو گئے البتہ نانا جان تین چار برسوں تک سخت مخالفت کرتے رہے۔ دادا جان ان کو تبلیغ کرنے کے لیے ان کی حویلی میں آتے تھے تو نانا جان لٹھ اٹھا کر ان کو گھر سے باہر نکال دیتے تھے۔ دادا جان تھوڑی دیر میں دوسرے دروازے سے آ جاتے تھے اور کہتے تھے: ''لالہ میں آپ کو منوا کے رہوں گا۔'' آخر ان کی ہٹ دھرمی رنگ لائی اور نانا جان نے نہ صرف بیعت کر لی بلکہ 1908ء میں چنگا سے ہجرت کر کے قادیان میں جا کر آباد ہو گئے۔ مرزا غلام احمد قادیانی اپنے پیروکاروں کو قادیان میں آ کر رہنے کی ترغیب دیتے تھے تاکہ ان کے گمنام قصبے کی آبادی بڑھے اور ان کی موروثی زمینیں زیادہ قیمت پر بک سکیں۔

دادا جان نے جہاں پر بعض دوسری اہم کتابیں تصنیف کیں، جن میں سے چند ایک کا پہلے ذکر ہو چکا ہے، وہاں پر آپ نے جماعتِ احمدیہ کی فقہ کی بنیاد بھی ڈالی۔ چنانچہ آپ نے "فتاویٰ احمدیہ" کے نام سے دو جلدوں میں مرزا غلام احمد قادیانی اور ان کے خلفاء کے فتاویٰ کو جمع کر کے چھاپا۔ بعدازاں آپ نے علیحدہ علیحدہ جلدوں میں نماز، روزے، زکوٰۃ وغیرہ کے احکام کو یکجا پیش کیا ہے۔ مگر دادا جان نے اپنی زندگی کے اختتامی برسوں میں جماعتِ احمدیہ سے علیحدگی کا اعلان کر دیا۔ آپ نے یہ قدم نہ تو بلاوجہ اٹھایا تھا اور نہ ہی اس کے پیچھے ذاتی انا کا کوئی ہاتھ تھا۔ آپ خوب جانتے تھے کہ یہ چیز آپ کی زندگی کی کہانی کو ایک المیہ ڈرامے میں بدل کر رکھ دے گی کیونکہ اس موقع پر کوئی آپ کا ساتھ نہ دے گا۔ آپ خود اپنے عزیزوں سے بھی یہ توقع نہ رکھ سکتے تھے کہ وہ آپ کی خاطر جماعتِ احمدیہ سے قطع تعلق کرنے کو تیار ہوں گے کیونکہ وہ لوگ اس جماعت کے نظام کا حصہ بن چکے تھے۔ ان کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ سنجیدگی کے ساتھ ان وجوہات پر غور وفکر کرتے جن کی بنا پر دادا جان خود اپنے سائے پر سے پھلانگنے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔

میرے سکول میں داخل ہونے کے چند ماہ بعد ابا جی کی تبدیلی پاراچنار ہو گئی اور اماں نے قادیان منتقل ہونے کا ارادہ باندھ لیا جہاں پر اماں کا سارا کنبہ رہتا تھا۔ ماموں احمد خان نسیم برما سے واپس لوٹ آئے تھے جہاں پر ان کو جماعت احمدیہ کی طرف سے مبلغ بنا کر بھیجا گیا تھا۔ یوں بھی اماں کا خیال تھا کہ بچوں کو قادیان کے سکولوں میں داخل کرانا چاہیے جن کا معیارِ تعلیم ان کی نظر میں دوسرے سکولوں سے بہتر تھا۔ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں ہے کہ میں نے پہلی جماعت پشاور میں پاس کر لی تھی یا نہیں۔ بہر صورت ابا جی پاراچنار جانے سے پہلے ہمیں قادیان چھوڑنے آئے تھے۔

یہ میرا ریل گاڑی کا پہلا سفر تو نہیں تھا تاہم یہ پہلا سفر تھا جس کی تفصیلات میری یادداشت میں محفوظ ہیں۔ لاہور کے سٹیشن پر بے شمار بندر تھے جو گاڑی کے رکتے ہی اس کی چھت پر ٹوٹ پڑے تھے بلکہ کمپارٹمنٹوں کے اندر بھی گھس آئے تھے اور مسافروں کے ہاتھوں سے چیزیں چھیننے سے بھی نہ چوکتے تھے۔ ہندو مسافر تو خیر ہنومان جی کی سیوا کرنے کے عادی تھے مگر مسلمان مسافروں کو بندروں کی چھینا جھپٹی بالکل نہ بھاتی تھی۔ اماں نے میرے چھوٹے بھائی اسد کو، جو ابھی بہت چھوٹا تھا، اپنے پہلو میں سیٹ پر لٹا رکھا تھا۔ اچانک ایک بندر کھڑکی میں آ کر بیٹھ گیا۔ اماں نے دیکھا کہ اس کی نظر بچے پر ہے اس لیے اماں نے جلدی سے اسد کو اٹھا کر گود میں لے لیا۔ عین اس لمحے بندر نے، جس کی سکیم ناکام بنا دی گئی تھی، اماں کے گال پر زناٹے سے ایک تھپڑ رسید کیا اور کھڑکی سے باہر کود گیا۔ عین اس لمحے ابا جی ہمیں گاڑی سے اتارنے کے لیے زنانہ کمپارٹمنٹ میں پہنچے جس

میں اماں ہم بچوں سمیت بیٹھی ہوئی تھیں۔ انھوں نے ابا جی کو ماجرا سنایا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ اسد کو کوئی گزند نہ پہنچی تھی۔ ابا جی سوٹی لے کر بندر کے پیچھے بھاگے جو جست لگا کر گاڑی کی چھت پر چڑھ گیا۔

میرے لیے اس سفر کے دوران سب سے زیادہ اچنبھے کی بات یہ تھی کہ ہماری گاڑی امرتسر سٹیشن پر رکنے اور گھنٹہ بھر وہاں پر ٹھہرنے کے بعد جب چلی تو بجائے آگے جانے کے پیچھے کی طرف چل دی، جس طرف نیا انجن لگا دیا گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اگر گاڑی اسی سمت میں چلتی رہی تو ہم پشاور واپس پہنچ جائیں گے۔ اماں نے بتایا کہ گاڑی گھوم کر سیدھے راستے پر جائے گی مگر بٹالے تک میرا شک دور نہ ہوا۔ میں دل ہی دل میں ڈرتا رہا کہ کیا کرایا سفر رائیگاں چلا جائے گا۔ ہمیں پشاور سے لاہور پہنچنے میں پوری رات لگی تھی۔ اب مجھے یہ خطرہ تھا کہ ہم سارا دن سفر کر کے شام تک پھر پشاور میں ہوں گے۔

بٹالے پہنچ کر اطمینان ہوا کہ ہم ٹھیک لائن پر سفر کر رہے تھے۔ وہاں سے گاڑی چلی تو اس میں صرف احمدی مسافر باقی رہ گئے تھے جو کھڑکیوں میں کھڑے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر قادیان کے منارۃ المسیح کو تلاش کر رہے تھے مگر وڈالے سے پہلے کسی کو منارہ نظر نہ آیا۔ قادیان میں جماعت احمدیہ نے حضرت مسیح علیہ السلام کے دمشق کے منارے پر اترنے کی پیشگوئی کو عملی رنگ میں پورا کرنے کے لیے ایک منارہ تعمیر کر دیا تھا جو مسجد اقصیٰ کے اندر کھڑا ہے۔ جب منارہ نظر آیا تو پوری گاڑی نعرہ تکبیر سے گونج اٹھی۔ مجھے بالکل سمجھ نہ آئی کہ اس نعرے بازی کی منطق کیا تھی؟

وڈالے سے قادیان صرف چند میل کے فاصلے پر ہے۔ نہر کو پار کرنے کے بعد تو سب لوگ گاڑی کی کھڑکیوں سے باہر لٹکے ہوئے تھے۔ پہلے تلونڈی جھنگلاں کا گاؤں آیا، پھر قادیان کے قصبے کا ایک بیرونی محلہ دکھائی دیا اور نواب محمد علی خان آف مالیر کوٹلہ کی کوٹھی جس کے پیچھے تعلیم الاسلام ہائی سکول کی عمارت درختوں میں چھپی چھپی نظر آ رہی تھی۔ قادیان کا ریلوے سٹیشن وہاں سے زیادہ دور نہ تھا۔

وہاں پر میرا خالہ زاد بھائی محمد احمد نعیم ہمیں لینے کے لیے آیا ہوا تھا۔ وہ اماں کی بڑی بہن گلاب بی کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ اس کی ماں تھوڑا عرصہ قبل فوت ہوئی تھی اور اپنے پیچھے دو بیٹیاں اور تین بیٹے چھوڑ گئی تھی۔ خالہ گلاب بی کا خاوند اس سے پہلے مر گیا تھا۔ صرف ایک بیٹی صغریٰ بیاہی ہوئی تھی۔ بچوں کا چچا دونوں چھوٹے بیٹوں اشرف اور اسلم کو اپنے ساتھ گاؤں لے گیا تھا۔ خالہ بیگم جی نے بھائی جان محمد احمد نعیم اور اس کی چھوٹی بہن صفیہ بیگم کو، جو نصیرہ کی ہم عمر تھی، اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ بھائی جان محمد احمد ہمارے خاندان کے بچوں میں سب سے بڑا تھا۔ وہ مدرسہ احمدیہ کا طالب علم تھا اور

اس نے انہی دنوں میں پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا تھا۔ میں اسے پہلی بار دیکھ رہا تھا اور اس بات پر بہت حیران ہوا تھا کہ اس نے پٹھان فوجیوں کی طرح، جن کو ہم پشاور میں دیکھا کرتے تھے، پٹے رکھے ہوئے تھے جو اس کے شانوں پر پڑتے تھے۔ اس نے پوری داڑھی رکھی ہوئی تھی۔ اس زمانے میں ابھی مرزائی کٹ داڑھی کا رواج نہیں ہوا تھا۔

ہمیں بہت جلد ایک مکان کرائے پر مل گیا جو خالو جان کے مکان سے کم و بیش ایک سو گز کے فاصلے پر تھا۔ یہ مکان چوہدری حمید اللہ، جو آج کل جماعت احمدیہ ربوہ کے ستونوں میں سے ہیں اور انجمن تحریک جدید کے چیئرمین ہیں، کے والد کا تھا جو ان کے مکان کو دو حصوں میں بانٹ کر بنایا گیا تھا۔ ایک حصے میں وہ رہتے تھے اور دوسرے حصے میں ہم مقیم تھے۔ دونوں حصوں کے درمیان ایک دیوار کھینچ دی گئی تھی۔ حمید اللہ بھائی نصیر کے کلاس فیلو تھے جب کہ ان کا چھوٹا بھائی سعد اللہ میرے چھوٹے بھائی عبدالقیوم کا ہم جماعت تھا۔ حمید اللہ کی بڑی بہن رضیہ سلطانہ نے مجھے اپنا بھائی بنا رکھا تھا مگر ہم اس مکان میں صرف سال بھر رہے تھے کیونکہ آپا صغریٰ نے اپنے خاوند کے پاس دولمیال میں جا کر رہنے کا پروگرام بنایا اور اپنے بچوں سمیت وہاں چلی گئیں۔ ان کا مکان اماں نے کرائے پر لے لیا تاکہ بھائی جان محمد احمد نعیم اور ان کی بہن صفیہ بیگم ہمارے ساتھ وہاں پر ہی مقیم رہ سکیں۔

نقل مکانی سے پہلے اماں نے اپنی مرحومہ سہیلی امتہ اللہ کی بیٹی عزیزہ بیگم کا بیاہ رچایا جو ایک نو مسلم سردار مہر سنگھ کی پوتی تھی۔ اس کے نانا چھوٹے سے قد کے تھے مگر بے حد فعال انسان تھے۔ وہ بالخصوص سکھوں میں اسلام کی تبلیغ کرنے کا جذبہ رکھتے تھے اور آئے دن رسالے اور پمفلٹ چھاپتے رہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ احمدی ان سے گورمکھی سیکھیں تاکہ خود سکھوں کا مذہبی لٹریچر پڑھ سکیں۔ ان کا کہنا تھا کہ گورو بابا نانک دراصل مسلمان تھے اور انھوں نے مکے کا سفر کیا تھا جہاں پر وہ کئی ماہ تک مقیم رہے تھے، یہی وجہ ہے کہ سکھوں کی ساری مذہبی اصطلاحات اسلامی فقہ سے لی گئی ہیں۔ وہ اپنے گھر پر کلاسیں لگاتے اور مفت سبق دیتے تھے۔ ان کا بیٹا ڈاکٹر نذیر احمد حبشہ میں ہوتا تھا اور اپنے باپ کی طرح آنریری مبلغ تھا۔ میری ملاقات ڈاکٹر نذیر احمد کے ساتھ تین دہائیاں بعد جرمنی میں ہوئی۔ انھوں نے ایک جرمن نو مسلمہ سے شادی کر لی تھی اور اسی سلسلے میں جرمنی آئے تھے۔

اماں نے عزیزہ کا رشتہ ماموں احمد خان نسیم کی وساطت سے ایک برمی احمدی فیملی میں کرایا تھا۔ عزیزہ کے والد تاج صاحب نے بیٹی کی شادی کی ساری ذمے داری اماں کے سر پر ڈال دی تھی۔ چونکہ عزیزہ کے خاوند محمود احمد برمی کا قادیان میں کوئی ٹھکانا نہ تھا، اس لیے عزیزہ اپنے نانا کے گھر سے، جو ہمارے ہمسائے میں تھا، رخصت ہو کر ہمارے مکان پر لائی گئی تھی۔ یہ پہلی شادی تھی جو میں نے

بچپن کے زمانے میں دیکھی۔ اس موقع پر کوئی ڈھول نہیں بجا تھا اور کسی نے گیت نہیں گائے تھے۔ یہ چیز قادیان کے ماحول میں مستحسن نہ سمجھی جاتی تھی۔ دوسری طرف ہمارے مکان کے قریب ایک دو منزلہ مکان ڈاکٹر ظفر الحسن کا تھا جہاں سے ہر شام کو فلمی گانوں کے ریکارڈ اونچی آواز میں سنے جا سکتے تھے۔ اس بارے میں کہا جاتا تھا کہ ڈاکٹر ظفر الحسن کی بیوی کو خلیفہ ثانی مرزا بشیر الدین محمود احمد کی طرف سے اس امر کی خاص اجازت ملی ہوئی ہے کیونکہ وہ اس تفریح کے بغیر قادیان میں رہنے کے لیے تیار نہ تھی۔

اس زمانے میں قادیان کی آبادی دس ہزار کے لگ بھگ تھی۔ اکثریت احمدیوں کی تھی مگر ہندو اور سکھ بھی پرانی آبادی میں رہتے تھے۔ مرزا غلام احمد قادیانی کے خاص دوستوں میں ایک ہندو لالہ ملاوامل بھی شامل تھا، جس کو وہ اپنے بعض الہامات کے پورے ہونے کا گواہ قرار دیتے تھے۔ چونکہ قادیان اور نواح کے پانچ دیہات مرزا قادیانی کی فیملی کی ملکیت تھے اس لیے وہاں پر صرف ان لوگوں کے پاس مکان بنانے کے لیے زمین فروخت کی جاتی تھی جو مرزا قادیانی کی جماعت میں شامل ہو چکے ہوتے تھے۔ اس وجہ سے غیر احمدی مسلمان وہاں پر شاذ و نادر ہی پائے جاتے تھے البتہ بعض لوگ ایسے بھی موجود تھے جو شاید احمدیت سے منحرف ہو چکے تھے مگر اس بات کا مجھے اس زمانے میں پوری طرح علم نہ تھا۔ اباجی کے ایک واقف کار حکیم عبدالعزیز تھے جن کے بارے میں خدا جانے کیسے میرے دل میں یہ شبہ پیدا ہوا کہ ان کا شمار منافقوں میں ہوتا تھا۔ اب تحقیق کرنے سے پتا چلا ہے کہ یہ بات درست نہ تھی۔ میں اباجی کے ساتھ ان کے گھر پر گیا تھا جہاں پر انھوں نے طبیہ عجائب گھر بنا رکھا تھا۔ آپ نے اباجی کو معجون تحفے میں دی تھی جو ایسی مزیدار تھی کہ میں بھی اس کو کھانے کی خواہش رکھتا تھا مگر ایسی نادر چیزوں سے خدا جانے کیوں بچوں کو دور رکھا جاتا ہے۔

مجھے اس وقت علم نہ تھا کہ جس زمانے میں ہم قادیان جا کر آباد ہوئے، جماعت احمدیہ زبردست بحران کا شکار تھی کیونکہ خلیفہ ثانی مرزا بشیر الدین محمود احمد پر تھوڑا عرصہ قبل سنگین جنسی الزامات لگائے جا چکے تھے جن کی بنا پر ان کے ماموں میر محمد اسحاق نے، جو جماعت کے مقتدر علماء میں شمار ہوتے تھے، ان کے پیچھے نماز پڑھنی چھوڑ دی تھی۔ ایسے الزامات ان پر اس سے قبل بھی لگ چکے تھے۔ اس زمانے کے احمدی اخبارات کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ جماعت کے اندر بے چینی اور تذبذب پھیلا ہوا تھا۔ قادیان سے باہر رہنے والے احمدیوں کو درست صورت حال کا علم نہیں تھا، نہ ہی جماعتی اخبارات میں کھل کر بتایا جاتا تھا کہ ''فتنہ خلافت'' کے پیچھے کون سے الزامات ہیں جن کی بنا پر مرزا محمود احمد کی معطلی کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ جب ہم قادیان پہنچے تو مجھے ان باتوں کا کوئی علم نہیں تھا۔

قادیان کی ایک شخصیت، جس نے مجھے متاثر کیا، وہ ہمارے محلے کے صدر ڈاکٹر محمد طفیل تھے۔ مجھے بعد میں پتا چلا کہ وہ ڈگری یافتہ میڈیکل ڈاکٹر نہیں تھے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ ہومیو پیتھ ڈاکٹر ہوں جن کے پاس اس زمانے میں ڈگریاں نہیں ہوتی تھیں۔

ڈاکٹر محمد طفیل کے بیٹے نے ان دنوں انجمن احمدیہ کے ایک کارکن کی خوبصورت بیوی پر ڈورے ڈالے اور اس کو لے کر غائب ہوگیا۔ کسی کو پتا نہ تھا کہ وہ کہاں چلے گئے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے زمین نے ان کو نگل لیا تھا۔ تقسیم ملک کے بعد اماں کو، جو مہاجروں کی آبادکاری کے کام سے متعلق تھیں، کشمیر سے آئی ہوئی ایک فیملی کے بارے میں خبر ملی کہ ان کو فوری طور پر رہائش کے لیے مکان درکار تھا۔ وہ لوگ عارضی طور پر ایک گیراج میں ٹھہرے ہوئے تھے جہاں پر اس فیملی کے پانچ بچوں کے لیے جگہ ناکافی تھی۔ اماں خود ان کے ٹھکانے پر پہنچیں تاکہ ان کی ضروریات کا اندازہ لگا کر ان کے لیے مناسب رہائش گاہ کا انتظام کیا جائے۔ اماں نے میاں بیوی کو پہچان لیا کیونکہ وہ ان کو قادیان کے زمانے سے جانتی تھیں۔ اماں نے ان کو ہر ممکن مدد دینے کا وعدہ کیا اور ان کے ماضی کے بارے میں کچھ نہ کہا۔ چند دنوں کے اندر ان کے لیے تمام ضروریاتِ زندگی کا انتظام ہوگیا اور ان کو رہائش کے لیے بہتر جگہ بھی مہیا کر دی گئی۔

قادیان کی زندگی کی جو تصویر میری یادداشت پر مرتسم ہے، وہ ایک ایسے معاشرے کی ہے جس میں جماعت احمدیہ کی ذیلی تنظیمیں اہم کردار ادا کرتی تھیں۔ مردوں کو عمروں کے اعتبار سے تین تنظیموں میں تقسیم کیا گیا تھا، سولہ سال کی عمر تک کے بچے ''مجلس اطفال الاحمدیہ'' میں شامل تھے۔ سترہ سے چالیس سال کی عمر تک کے جوان ''مجلس خدام الاحمدیہ'' میں منظم تھے۔ اکتالیس سال سے بڑی عمر کے احمدی ''مجلس انصار اللہ'' کے ممبر تھے۔ عورتوں کی تنظیمات الگ تھیں۔ سولہ سال تک کی بچیاں ''مجلس ناصرات الاحمدیہ'' میں اور اس سے بڑی عمر کی مستورات ''مجلس اماء اللہ'' میں شامل تھیں۔ مرکزی طور پر ان تنظیموں کے دفاتر قادیان میں تھے البتہ ہر جگہ، جہاں پر جماعت احمدیہ قائم تھی، اوپر بیان کردہ ذیلی تنظیمیں پائی جاتی تھیں۔ مقامی طور پر قادیان کے ہر محلے میں ان تنظیموں کی شاخیں قائم تھیں جن کی اپنی مجلس عاملہ ہوتی تھی جو ایک قائد کے تحت کام کرتی تھی۔ مرکزی طور پر ہر ذیلی تنظیم کا صدر ہوتا تھا۔ مقامی طور پر ہر مجلس دس دس افراد کے احزاب میں تقسیم تھی جو ایک ناظم حزب کے تحت ہوتی تھی۔ ہر حزب کی طرف سے مقامی مساجد میں نمازوں میں شامل ہونے پر حاضری لگتی تھی۔ ہر ماہ مقامی طور پر ایک دن فلاحی کام کے لیے منایا جاتا تھا جس کو ''وقارِ عمل'' کا نام دیا جاتا تھا۔ اس روز تمام ممبران مل کر کوئی اجتماعی خدمت، مثلاً گلیوں کی صفائی یا سڑکوں کی مرمت کی خدمت سرانجام دیتے

تھے۔ اسی طرح ہر ماہ ایک دن تبلیغ احمدیت کے لیے وقف ہوتا تھا، جس کے لیے ممبران کے گروپ گرد ونواح کے دیہات میں پھیل جاتے تھے اور وہاں کی مقامی آبادی کو تبلیغ کرتے تھے۔ ہمارے قادیان میں قیام کے دوران ایک تبلیغی پارٹی پر قادیان کے ایک نواحی گاؤں بھامڑی میں مقامی لوگوں نے لاٹھیوں سے حملہ کیا اور بہت سے احمدی خدام کو زخمی کیا تھا۔ احمدی بھی نہتے نہیں تھے، کیونکہ ہر خادم کے لیے لازمی تھا کہ وہ ایک چھ فٹ کی لاٹھی اپنے پاس رکھا کرے۔ ابتدا میں خدام کی اپنی خاص وردی بھی ہوتی تھی جو فوجی وردی کے مشابہ تھی جس میں ایک طرف نیکر شامل تھی تو دوسری طرف پگڑی۔

میں جب جرمنی آیا اور یہاں پر میں نے نازی پارٹی کے طور طریقوں کے مطالعہ کیا تو میں نے دیکھا کہ جماعت احمدیہ کی ذیلی تنظیموں کا بلیو پرنٹ عین مین وہی تھا جو جرمنی میں ہٹلر کی پارٹی کا تھا۔ میں نے اس بات کا ذکر ڈاکٹر خلیل احمد ناصر سے کیا، جب وہ ایک بار امریکہ سے میرے پاس ہمبرگ تشریف لائے تھے۔ وہ لمبے عرصے تک جماعت احمدیہ کے امریکہ میں مبلغ رہ چکے تھے۔ وہ ''خدام الاحمدیہ'' کے بنیادی ممبروں میں سے تھے اور اس کی پہلی مجلس عاملہ کے رکن رہ چکے تھے۔ انھوں نے اس بات کی تصدیق کی اور بتایا کہ یورپ کی فاشسٹ پارٹیوں، بالخصوص جرمنی کی نازی پارٹی کا مطالعہ مرزا ناصر احمد نے، جو مرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفۂ ثانی کے بڑے بیٹے تھے اور جن کو ان کا جانشین بننا تھا، اپنے قیام یورپ کے دوران کیا تھا۔ وہ اس زمانے میں آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے اور اس مقصد کے لیے خاص طور پر جرمنی گئے تھے جہاں کی ایک انڈسٹریل فیملی گروپ کا لڑکا ان کے ساتھ پڑھتا تھا۔ یہ فیملی نازی حکومت کی دست راست تھی۔ وہاں سے مرزا ناصر احمد جو لٹریچر ساتھ لائے تھے، اس کا مطالعہ ''خدام الاحمدیہ'' کی مجلس عاملہ کے ہر ممبر کے لیے لازمی قرار دیا گیا تھا۔ یہ بات کچھ ایسی عجوبہ نہیں ہے کیونکہ علامہ مشرقی کی ''خاکسار تحریک'' بھی انھیں خطوط پر قائم کی گئی تھی۔ علامہ مشرقی نے البتہ یہ دعویٰ کیا تھا کہ اصل بلیو پرنٹ انھوں نے تیار کیا تھا اور ہٹلر کو جرمنی میں ایک ملاقات کے دوران اپنی سکیم سے آگاہ کیا تھا جس پر اس نے اپنی تنظیم بنائی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خاکساروں اور نازی پارٹی کے ورکروں کی قمیصیں ایک جیسی تھیں اور دونوں بیلچہ اٹھا کر مارچ کرتے تھے جس سے یہ دکھانا منظور تھا کہ وہ خدمت خلق کے لیے ہر وقت مستعد ہیں مگر ساتھ ہی اپنے دشمنوں کو یہ دکھانا بھی مقصود تھا کہ وہ بیلچے کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے سے دریغ نہیں کریں گے۔

قادیان کے باسی مرزا محمود احمد کے ہاتھوں میں کٹھ پتلیوں کی طرح تھے جن کو وہ جس طرح چاہتے، نچا سکتے تھے۔ جماعت احمدیہ کے آرگن روزنامہ ''الفضل'' میں پہلے صفحے پر ''حضور ایدہ

اللہ بنصرہ العزیز" کی صحت کے بارے میں خبر چھپتی تھی جس میں اکثر ناسازی طبع کا ذکر ہوتا تھا۔ پورے سال کی اخباریں نکال کر دیکھیں تو نوے فیصد یہی تذکرہ ملتا ہے۔ یہ بھی ایک طرح کا کیمو فلاج تھا۔ جو شخص دائمی بیمار ہو اس سے کوئی شخص توقع نہیں رکھ سکتا کہ وہ ویسی جنسی فتوحات کی طاقت رکھتا ہے جس کے الزامات اس پر لگائے جاتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ موصوف نے سات عورتوں کے ساتھ قانونی طور پر نکاح کیا اور عام طور سے ہمیشہ بیک وقت چار بیویاں رکھتے تھے۔ ہمارے قادیان میں قیام کے دوران ام طاہر فوت ہوئیں، جو خلیفہ چہارم مرزا طاہر احمد کی والدہ تھیں، تو فوراً مرحومہ کی بھتیجی سے نکاح پڑھوالیا جو آگے چل کر مہر آپا کے نام سے جانی جاتی تھیں۔ اس نکاح کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ وہ اپنی پھوپھی کے بچوں کی دیکھ بھال کرسکیں گے، جبکہ وہ پھوپھی کے بیٹے سے دو چار سال ہی بڑی تھیں۔ عام طور سے مرزا محمود احمد کہا کرتے تھے کہ ان عورتوں سے نکاح کرنے کی وجہ دراصل یہ ہے کہ وہ ان کو اپنی نگرانی میں تربیت دینا چاہتے ہیں تاکہ وہ جماعت کی عورتوں کی تربیت کر سکیں۔ پتا نہیں کہ وہ یہ خدمت بجالائیں یا نہیں، انھوں نے مرزا محمود احمد کے اکیس بچوں کو ضرور جنم دیا جن میں سے چند ایک کے ساتھ آگے چل کر میری دوستی ہوئی۔

مرزا محمود احمد اپنے گھر کے پہلو میں واقع مسجد مبارک میں مغرب کی نماز کے بعد "مجلس عرفان" لگاتے تھے جس میں قادیان کے مومن شامل ہوتے تھے۔ میں بھی چند ایک بار گھر کے کسی بزرگ کی معیت میں وہاں پر گیا تھا۔ گرمیوں کے دن تھے اور نماز مسجد کی چھت پر پڑھی جاتی تھی جس کے بعد مرزا محمود احمد نمازیوں کی طرف رخ کر کے محراب میں اور سارے حاضرین ان کے سامنے بیٹھ جاتے تھے۔ مجھے اب یاد نہیں ہے کہ ان محفلوں میں، جن میں میں شریک ہوا تھا، گفتگو کا موضوع کیا تھا، بس اتنا یاد ہے کہ "مجلس عرفان" عشاء کی نماز تک جاری رہتی تھی۔ نمازِ عشاء کی ادائیگی کے بعد گھر کے راستے میں گھپ اندھیرا ہوتا تھا۔ اس مجلس کی رپورٹ باقاعدگی کے ساتھ "الفضل" میں چھپتی تھی۔

ایک دفعہ میرا دوست فاروق میرے ساتھ گیا۔ ہم مغرب کی نماز سے بہت پہلے مسجد مبارک میں پہنچ گئے اور یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ مسجد کی چھت پر مرزا اظہر احمد پتنگ اڑا رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر انھوں نے پتنگ کو اتارنے کی کوشش کی اور جلد بازی کی وجہ سے پتنگ ایک مکان کے چھجے سے اٹک گئی۔ لگتا تھا کہ وہ مکان بھی ان کے خاندان کا تھا جس کی طرف گھر کے اندر سے راستہ کھلتا تھا۔ وہ ہمیں کھڑا چھوڑ کر ادھر گئے۔ ان کی ڈور مسجد کے فرش پر بکھری پڑی تھی۔ وہاں پر میرے اور فاروق کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ مرزا اظہر احمد اس دروازے سے اندر گئے جس میں سے مرزا محمود احمد

نماز پڑھانے کے لیے مسجد میں آیا کرتے تھے۔ ان کے آنکھوں سے اوجھل ہونے کی دیر تھی کہ فاروق نے جھپٹ کر ساری ڈور سنبھالی اور دم دبا کر بھاگ نکلا۔ میرے لیے یہ چیز بالکل غیر متوقع تھی اور میرا لوٹی ہوئی ڈور میں سے حصہ لینے کا ارادہ بھی نہ تھا مگر اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ فاروق کے پیچھے پیچھے بھاگتا جاؤں۔ ہم ریتی چھلے تک پیچھے مڑ کر دیکھنے کے بغیر دوڑتے چلے گئے۔ وہاں پر اندرونی شہر کی آبادی ختم ہوتی تھی اور باہر کے محلے شروع ہوتے تھے۔ وہاں پر پہنچ کر ہم نے سانس لیا اور میں نے فاروق سے کہا کہ یہ کام سراسر چوری کے مترادف تھا مگر اسے اس بات کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ قادیان میں بچوں کو پتنگ اڑانے کی اجازت نہ تھی اس لیے میں یہ دیکھ کر حیران ہوا تھا کہ مرزا محمود احمد کا بیٹا مسجد میں کھڑا ہوا پتنگ اڑا رہا تھا۔

تعلیم الاسلام ہائی سکول اور جامعہ احمدیہ کے طالب علم عصر کی نماز کے بعد ہاکی، فٹ بال اور والی بال کھیلتے تھے۔ گاہے بگاہے کبڈی کے بھی مقابلے ہوتے تھے۔ ہمارا مکان چونکہ کھیلوں کے میدانوں کے سامنے تھا اس لیے ہم بھی اپنی عمر کے بچوں کے ساتھ کھیلوں میں شریک ہوتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مغرب کی نماز تک دارالعلوم محلے کے سارے میدانوں میں نوع نوع کے کھیل کھیلے جاتے تھے۔ مسجد نور کے پچھواڑے میں تالاب تھا جہاں پر باقاعدگی کے ساتھ پیراکی کے مقابلے ہوتے تھے۔ اس تالاب میں لڑکیاں بھی پیراکی سیکھتی تھیں۔ ان کے لیے خاص دن مقرر تھے۔ پھر ایک روز ایک لڑکی تالاب میں ڈوب گئی جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ اس نے خودکشی کی تھی کیونکہ وہ لڑکی اچھی خاصی پیراک تھی۔ پتا چلا کہ وہ مرزا غلام احمد قادیانی کے چھوٹے بیٹے مرزا شریف احمد کی کنواری بیٹی امتہ الودود تھی۔ افواہ یہ تھی کہ وہ حمل سے تھی۔ دوسروں کا کہنا تھا کہ اس نے خودکشی نہیں کی تھی بلکہ اس کو قتل کیا گیا تھا۔ یہی بات غلام رسول افغان کی بیٹی کے بارے میں مشہور تھی جو اس سے قبل قادیان کے ڈھاب میں ڈوب کر مری تھی۔ اس کے بارے میں سنا تھا کہ وہ خوبصورتی میں اپنی نظیر نہ رکھتی تھی۔

قادیان کے جن افراد کی یاد میرے ذہن میں آج تک محفوظ ہے ان میں سے ایک مفتی محمد صادق تھے جو مرزا غلام احمد قادیانی کے خاص اصحاب میں سے تھے اور لمبے عرصے تک امریکہ میں مبلغ رہ چکے تھے۔ انھوں نے لمبی عمر پائی اور نوے برس کی عمر میں نئی شادی کی جس کی یادگار ایک بیٹا ہے۔ وہ بورڈنگ سکول کے احاطے میں میجک لینٹرن کے ذریعے تصویریں دکھا کر لیکچر دیا کرتے تھے۔

مغربی افریقہ کے ایک سابق مبلغ مولوی عبدالرحیم نیر بھی، جو ہمارے محلے میں رہتے تھے اور جن کو میں صبح کے وقت چھڑی گھماتے ہوئے سیر کے لیے جاتے ہوئے دیکھا کرتا تھا، میجک

لینٹرن کے ذریعے لیکچر دیا کرتے تھے۔ ان کا طریق بیان مفتی صاحب سے یکسر مختلف تھا۔ وہ بہت زور شور کے ساتھ بولتے تھے اور اپنے سامعین کو باور کرانے کی کوشش کرتے تھے کہ ان کی مساعی سے گولڈ کوسٹ، جو آج کل گھانا کے نام سے جانا جاتا ہے، سیرالیون اور نائیجیریا کے ممالک کے ہزاروں باشندے احمدی ہو چکے ہیں۔ جب وہ مغربی افریقہ میں تھے تو ان کی بھیجی ہوئی رپورٹیں ''الفضل'' میں چھپتی تھیں جن میں یہ بیان ہوتا تھا کہ ہر مقام پر ان کا استقبال کرنے کے لیے خلقت ٹوٹ پڑتی تھی اور ان کے چہرے پر ایک نظر ڈالنے کے بعد سب لوگ اجتماعی بیعت کر لیتے تھے۔ مرزا محمود احمد ان کی بھیجی ہوئی رپورٹوں کو اپنے خطبوں میں اس دعوے کے ساتھ پیش کرتے تھے کہ مغربی افریقہ احمدیت کی گود میں آنے کے لیے بے قرار ہے۔ احمدیت کے پیروکاروں کے اعداد وشمار کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کی روایت خود بانی سلسلہ احمدیہ مرزا غلام احمد قادیانی کی پیدا کردہ ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں اپنی جماعت کے بارے میں لکھا تھا کہ وہ لاکھوں کو پہنچ چکی ہے، جبکہ 1901ء کی مردم شماری نے ثابت کیا تھا کہ جماعت احمدیہ کے ممبران کی تعداد چند ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ خلیفہ رابع مرزا طاہر احمد نے بیسویں صدی کی آخری دہائی میں دعویٰ کر دیا تھا کہ وہ پچھتر ملین کو پہنچ چکی ہے اور اس میں ہر سال سو فیصد اضافہ ہو رہا ہے۔ گویا دو سال میں یہ تعداد ایک سو پچاس ملین ہو جائے گی، جو پاکستان کی مجموعی آبادی سے زیادہ ہے۔ جماعت احمدیہ کے سرکردہ لوگوں کو اب تک یہ احساس نہیں ہوا کہ ان کی اپنی جماعت کے ممبروں کے اعداد وشمار کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کی پالیسی احمدیوں کے حق میں اچھی ثابت نہیں ہو رہی۔

مرزا محمود احمد نے 1944ء میں اعلان کیا کہ بانی سلسلہ احمدیہ مرزا غلام احمد قادیانی کی پیشگوئی، جو موصوف نے 20 فروری 1886ء کو ایک اشتہار میں شائع کی تھی اور جس میں ایک مصلح موعود کے آنے کی خبر دی گئی تھی، ان کی ذات میں پوری ہو گئی ہے۔ اس بارے میں وہ ایک عرصے سے قسطوں میں دعوے کرتے آئے تھے، جس کی مخالفت کئی ایک لوگوں کی طرف سے ہوتی رہی تھی۔ دادا جان نے بھی احمدیت سے اپنی علیحدگی کا اعلان کرتے ہوئے اس چیز کا حوالہ دیا تھا۔ مرزا محمود احمد نے اپنے مصلح موعود ہونے کے بارے میں اعلان ایک جلسے میں کیا جو خاص طور پر اس مقصد کے لیے منعقد کیا گیا تھا۔ قادیان کے چھوٹے بڑے سب لوگ اس میں شامل ہوئے۔ میں بھی وہاں پر موجود تھا۔ اس روز سکول میں پڑھائی سے چھٹی تھی۔ پھر یہ معمول بن گیا کہ ہر سال 20 فروری کو عام چھٹی ہوتی تھی اور سب لوگوں کو ''جلسہ مصلح موعود'' میں شامل ہونا پڑتا تھا۔ قادیان کی زندگی میں جلسوں کا بہت اہم کردار تھا جو آئے دن برپا کیے جاتے تھے۔

قادیان کے زمانے کی ایک دکھی عورت کی یاد آج تک میرے حافظے میں محفوظ ہے۔ اس کا نام میں بھول چکا ہوں مگر اس کے دکھ کو میں آج بھی محسوس کرتا ہوں۔ ہمارا اس کے ہاں آنا جانا تھا۔ میری خالہ زاد بہن صغریٰ کی شادی اس کے ایک عزیز کے ساتھ ہوئی تھی۔ وہ پنڈی سازش کیس کے سلسلے میں معطل کیے جانے والے میجر جنرل نذیر احمد کی خالہ تھی اور ایک وسیع وعریض صحن والے مکان میں اکیلی رہتی تھی۔ اس کا ایک ہی بیٹا محمد اسلم تھا جو بی اے کر چکا تھا۔ ہم اس کے گھر جایا کرتے تھے اور خرگوشوں سے کھیلتے تھے جنھوں نے اس کے صحن میں لمبی چوڑی سرنگیں بنا رکھی تھیں۔ میں نے اس کے بیٹے کو نہیں دیکھا مگر سن رکھا تھا کہ وہ بہت تنومند اور خوبرو جوان تھا۔ باپ کے اچانک وفات پا جانے کے صدمے نے اس کے دماغ پر ایسا اثر کیا کہ وہ پاگل ہو گیا۔ طبی مشورے کے تحت اس کو کشمیر بھیج دیا گیا تا کہ معتدل آب و ہوا میں کچھ ماہ بسر کرے مگر وہاں پر قیام کے دوران ایک روز وہ اپنے جسم کے کپڑے پھاڑ کر بازار میں نکل گیا۔ اس کو تلاش کرنے کی ساری کوششیں بے سود رہیں۔ اس کی ماں کا کہنا تھا کہ اگر بیٹا اس کے پاس رہتا تو وہ یقیناً ٹھیک ہو جاتا۔ اس کو یہ دکھ تھا کہ کون جانے اس کا لال کس وِیرانے میں ننگا دھڑنگا پھر رہا ہوگا۔ اس کے بعد سالہا سال تک، جب بھی مجھے سڑک پر کوئی ننگا پاگل گھومتا پھرتا نظر آتا تھا، تو میں سوچا کرتا تھا کہ وہ کہیں اس دکھی عورت کا بیٹا محمد اسلم نہ ہو۔

بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں کساد بازاری زوروں پر تھی۔ نوجوانوں کو ملازمتیں نہیں ملتی تھیں۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں سے احمدی خاندان ہجرت کر کے قادیان آتے جا رہے تھے جس کے سبب اس قصبے میں بے روزگاروں کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی تھی۔ ملک میں جماعت احمدیہ کی مخالفت کا بازار گرم تھا جس کی رہنمائی مجلس احرارِ اسلام کے ہاتھوں میں تھی۔ ان کا مطالبہ تھا کہ جماعتِ احمدیہ کو غیر اسلامی جماعت قرار دیا جائے۔ اس سلسلے میں علامہ اقبال کا نام بھی لیا جاتا تھا کیونکہ انھوں نے اس مطالبے کے حق میں بیانات دیے تھے۔ دوسری طرف خود احمدیوں کے اندر بے چینی پائی جاتی تھی۔ مرزا محمود احمد پر جنسی بے راہروی کے الزامات لگائے جا رہے تھے۔ اس صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک دس سالہ سکیم بنائی گئی جس کو "تحریک جدید" کا نام دیا گیا۔ مقصد یہ تھا کہ احمدیوں کی توجہ کو دوسری طرف مبذول کیا جائے۔ ان سے مطالبہ کیا گیا کہ احمدی نوجوان اپنی زندگی تبلیغِ اسلام کے لیے وقف کریں۔ اس کام پر اٹھنے والے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے جماعت کو چندہ دینا ہوگا جس کے لیے ضروری ہوگا کہ احمدی سادہ زندگی کو اپنائیں اور ہر قسم کی لگژری کو ترک کر دیں۔ چندہ احمدیوں کو اس سے قبل بھی دینا پڑتا تھا جس کی شرح ماہوار آمدن کا سولہ فیصد

تھا۔ اس کے علاوہ ان کو وصیت کرنے کی تحریک کی جاتی تھی جس کے تحت ان کو اپنی منقولی وغیر منقولی جائداد کا کم سے کم دسواں حصہ صدر انجمن احمدیہ کے نام ہبہ کرنا اور دس فیصد ماہوار آمدن کا بطور چندہ ادا کرنا ہوتا تھا۔ صرف ان لوگوں کو جماعت احمدیہ کے قبرستان ''بہشتی مقبرے'' میں دفن کیا جاتا تھا البتہ مرزا غلام احمد قادیانی کے خاندان کے لیے استثنیٰ ہے کہ اس کا ہر فرد وصیت کے بغیر بھی وہاں پر دفن کیا جا سکتا ہے۔

''بہشتی مقبرے'' مرزا غلام احمد کے ایک خاندانی قطعہ زمین میں بنایا گیا تھا جہاں پر آس پاس آموں کے باغ تھے۔ اس سکیم کا مقصد صدر انجمن احمدیہ کے لیے مستقل جائداد پیدا کرنا تھا جس میں کچھ ایسی زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ اس سکیم کا اجراء 1905ء میں ہوا تھا جب مرزا غلام احمد قادیانی نے ایک رسالہ بنامی ''الوصیت'' شائع کیا۔ آج تک اس سکیم کے تحت تیس ہزار احمدیوں نے اس میں حصہ لیا ہے جن کا وصیت نامہ باقاعدگی کے ساتھ جماعت احمدیہ کے اخباروں میں چھپتا ہے، تا کہ اگر کسی کو اس میں بیان کردہ کوائف پر اعتراض ہو تو وہ اس چیز سے نظارتِ وصیت کو مطلع کرے۔ میرے اندازے کے مطابق ان تیس ہزار میں سے کم و بیش نصف نے اپنی وفات سے قبل اپنی وصیت منسوخ کر دی تھی یا کسی اور وجہ سے ان کی وصیت منسوخ کر دی گئی تھی۔ دادا جان نے اس بارے میں ایک اعلان ہندوستان کے اخباروں میں چھپوایا تھا اور مطالبہ کیا تھا کہ اس سلسلے میں ان کی طرف سے ادا کی جانے والی رقوم واپس کی جائیں۔ اس پر صدر انجمن احمدیہ نے کوئی کارروائی نہیں کی البتہ جب ابا جی کو اپنے مکان کی تعمیر کے سلسلے میں بنک سے قرض لینا پڑا، جس پر سود ادا کرنا پڑتا تھا تو صدر انجمن احمدیہ نے ابا جی کی وصیت منسوخ کر دی۔ وجہ یہ بیان کی گئی کہ احمدیوں کو سودی کاروبار کی ممانعت ہے۔ اس کے باوجود مجھے علم ہے کہ احمدی تاجر اور دوسرے لوگ بنکوں میں اپنی رقوم جمع کراتے اور بنکوں سے قرض لے کر کاروبار کرتے ہیں۔ گویا احمدی سود لیتے اور دیتے ہیں۔ اس چیز سے مرزا غلام احمد قادیانی کی نسل مستثنیٰ نہیں ہے۔ اس کے باوجود ان کو بہشتی مقبرے میں دفن کیا جاتا ہے۔

جب مرزا محمود احمد نے احمدیوں سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنی اور اپنے بچوں کی زندگیاں تبلیغ اسلام کے لیے وقف کریں تو میں انہی دنوں میں پیدا ہوا تھا۔ اماں نے اپنے جوشِ خلوص میں میری زندگی اس کام کے لیے وقف کر دی، جیسے ان کو یہ حق حاصل تھا کہ بیٹے کی زندگی کے ساتھ جو چاہیں کریں۔ مجھے آگے چل کر اس خلوص کی بہت بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔ اگر اماں کو اسلام کی خدمت کرنے کا جوش تھا تو انھیں اپنی زندگی وقف کرنی چاہیے تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ اماں نے ساری عمر جماعتِ احمدیہ کی خدمت کی جس کا ذکر آگے چل کر آئے گا۔

وقفِ زندگی کی تحریک پر بہت سے نوجوانوں نے لبیک کہا۔ ان میں سے جن لوگوں کو قادیان میں آ کر تبلیغِ اسلام کی تربیت لینے کو کہا گیا ان میں سے اکثر کالجوں کے پڑھے ہوئے تھے۔ ان کو جامعہ احمدیہ میں داخل کیا گیا جس کی عمارت ہمارے گھر کے قریب پرائمری سکول اور بورڈنگ ہاؤس کے درمیان تھی۔ ہم ان کو عصر کی نماز کے بعد مختلف کھیلوں میں حصہ لیتے ہوئے دیکھا کرتے تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے خاتمے پر ان کو ایک وفد کی صورت میں انگلستان بھیجا گیا۔ قادیان کے اکثر باسی ان کو الوداع کہنے کے لیے ریلوے سٹیشن پر آئے ہوئے تھے، میں بھی ان میں شامل تھا۔ وفد کے ممبران اچکن، سفید شلوار قمیص اور پگڑی پہنے ہوئے تھے۔ ان کو لندن میں کچھ عرصے تک قیام کرنے کے بعد یورپ کے مختلف ملکوں میں جانا تھا۔ اس وفد کے اراکین میں سے کچھ کے نام مجھے یاد ہیں۔ مشتاق احمد باجوہ (مبلغ لندن) شیخ ناصر احمد (مبلغ سوئٹزر لینڈ)، چوہدری عبداللطیف (مبلغ جرمنی)، قدرت اللہ سنوری (مبلغ ہالینڈ)، محمد عثمان (مبلغ اٹلی)، خلیل احمد ناصر (مبلغ امریکہ)۔ ان سب کے ساتھ مجھے برسوں کے بعد ملنے کا موقع ملا۔

قادیان کے مذہبی ماحول میں شعر و شاعری کچھ دبی دبی رہتی تھی اگرچہ یہ ضرور تھا کہ ہر جلسے میں تلاوتِ قرآن کے بعد تقریروں سے پہلے نظم خوش الحانی کے ساتھ سنائی جاتی تھی، بس ذرا نظموں کا انتخاب محدود تھا۔ عام طور سے مرزا غلام احمد قادیانی کی نظمیں پڑھی جاتی تھیں۔ موصوف نے اردو، عربی اور فارسی تینوں زبانوں میں نظمیں کہی ہیں جو ادبی معیار کے اعتبار سے اوسط درجے کی ہیں۔ ان کی بیٹی مبارکہ بیگم البتہ اچھی شاعرہ تھیں مگر جماعت احمدیہ میں ان کے بھائی مرزا محمود احمد کے کلام کو ترجیح دی جاتی تھی جن کے بارے میں مشہور تھا کہ انھوں نے مرزا داغ دہلوی سے اصلاح لی تھی البتہ ان کے اصل استاد قاضی اکمل تھے جن کا بیٹا شبلی بی کام ملک کے صحافتی حلقوں میں شہرت رکھتا تھا۔ میرے بچپن کے زمانے میں قادیان میں مصلح الدین راجیکی کی عشقیہ نظمیں انڈر گراؤنڈ میں سننے کو مل جاتی تھیں جو اختر شیرانی کی رومانی نظموں کا چربہ تھیں۔ ان کی نظموں میں بھی ایک سلمیٰ پائی جاتی تھی جس کے بارے میں ہم قیاس آرائیاں کیا کرتے تھے کہ وہ کون لڑکی ہوگی۔ اس زمانے میں ظہور نظر بھی قادیان میں مقیم تھا اور مشق سخن کر رہا تھا۔ ثاقب زیروی کو میں نے پہلی بار جماعتِ احمدیہ کے سالانہ جلسے کے سٹیج پر نظم پڑھتے ہوئے دیکھا۔ اسی سال اس کی کتاب ''شاہنامۂ احمدیت'' چھپی تھی جو حفیظ جالندھری کے ''شاہنامۂ اسلام'' کی طرز پر لکھی گئی تھی۔ ثاقب زیروی اپنے مخصوص لحن سے جلسے پر چھا گیا۔ اس کے بعد ہر سال اس کو مرزا محمود احمد کی تازہ نظم پڑھ کر سنانے کا اعزاز ملنے لگا۔ سالہا سال کے بعد جب ہماری آپس میں دوستی ہوئی تو اس نے ایک بار کہا: ''یار مجھے حضرت

صاحب کی پھیکی نظم پڑھنی پڑتی ہے۔ اگر نہ پڑھوں تو وہ مجھے اپنی نظم سنانے سے روک دیں گے۔"

میں نے میٹرک کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ نتیجہ نکلنے والے روز اماں ہسپتال میں داخل تھیں۔ میں ان کو یہ خبر دینے کے بعد گھر واپس لوٹا تو جماعت احمدیہ کا آرگن روزنامہ "الفضل" آیا پڑا تھا۔ اس میں پہلے صفحے پر اشتہار چھپا ہوا تھا جس میں میٹرک کا امتحان پاس کرنے والوں کو زندگی وقف کرنے کی ترغیب دی گئی تھی اور لکھا تھا کہ فرسٹ ڈویژن حاصل کرنے والوں کو جماعت کے خرچ پر کالج میں داخل کیا جائے گا اور انجینئرنگ کی تعلیم دلائی جائے گی۔ سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہونے والوں کو جامعہ احمدیہ میں داخل کیا جائے گا۔ میں نے اسی روز کسی کو بتائے بغیر ایک کارڈ ربوے لکھ بھیجا کہ اماں نے میری زندگی وقف کر رکھی ہے۔ اس طرح مجھے امید تھی کہ میں کالج میں اپنی تعلیم کو جاری رکھ سکوں گا۔

چند روز کے بعد مجھے ربوے سے ایک خط موصول ہوا کہ اپنے مقامی امیرِ جماعت سے تصدیقی چٹھی لے کر فلاں روز انٹرویو کے لیے پہنچ جائیں۔ ربوے کی بستی جماعتِ احمدیہ نے چنیوٹ کے قریب دریائے چناب کے کنارے ایک بنجر زمین خرید کر بنائی تھی جس کی تمام عمارتیں اس زمانے میں کچی تھیں۔ مجھے انجمن تحریک جدید کے دفتر میں حاضر ہونے کے لیے کہا گیا تھا۔ یہ چوکور عمارت اس طرح بنی ہوئی تھی کہ چاروں طرف دفاتر کے کمرے تھے اور درمیان میں کشادہ صحن تھا۔ جب میں وہاں پر پہنچا تو پہلا شخص، جس کے ساتھ میرا آمنا سامنا ہوا، وہ پیام شاہجہان پوری تھے جو اس زمانے میں تحریک جدید کے کارکن تھے۔ بعد میں انھوں نے ربوے کو خیرباد کہہ کر صحافت کو اپنایا اور آج تک لاہور سے اپنا رسالہ نکالتے ہیں۔ میرے علاوہ چھ یا سات دوسرے نوجوان انٹرویو کے لیے آئے ہوئے تھے۔ اتفاق ایسا تھا کہ ہمارا انٹرویو عین اس کمرے میں ہوا جس میں مجھے آگے چل کر دو برسوں تک قیام کرنا تھا۔ انٹرویو لینے والے بورڈ کے ممبروں میں سے مجھے تین یاد ہیں: مولوی جلال الدین شمس اور مشتاق احمد باجوہ لندن میں احمدی مشنری رہ چکے تھے جبکہ چوہدری فقیر محمد سابق ڈی ایس پی تھے جو لمبے عرصے تک راولپنڈی میں رہ چکے تھے اور ہمارے خاندان سے بخوبی واقف تھے۔ انھوں نے اباجی کا نام سنتے ہی اماں کی خدمات گنوانا شروع کر دیں اور میرا انٹرویو درمیان میں ہی رہ گیا۔ مجھ سے کچھ نہ پوچھا گیا۔ چند منٹوں کے بعد مجھے باہر انتظار کرنے کو کہا گیا۔ باری باری سب امیدوار پیش ہوئے اور آخر میں سب کو جامعہ احمدیہ میں داخل ہونے کی ہدایت کی گئی جہاں پر ان کو عربی کی تعلیم حاصل کرنی تھی۔ میرے علاوہ مزید ایک لڑکا اس گروپ میں شامل تھا جس نے فرسٹ ڈویژن میں میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا۔ ہمیں اگلے روز احمد نگر میں جا کر جامعہ احمدیہ میں داخلے کی کارروائی

پوری کرنے کا حکم ہوا جو ان دنوں گرمیوں کی چھٹیوں کی وجہ سے بند تھا۔ مجھے اس بات پر بہت رنج ہوا کہ اشتہار میں کچھ بیان کیا گیا تھا اور اب سب امیدواروں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکا جا رہا تھا۔ ماموں احمد خان نسیم نے، جن کے پاس میں ٹھہرا ہوا تھا، مجھے جماعت کے فیصلے پر عمل کرنے کا مشورہ دیا کیونکہ اسی میں بہتری ہے۔ مجھے پتا تھا کہ اماں اور ابا جی بھی مجھے یہی مشورہ دیں گے کیونکہ دونوں اپنی روحیں جماعتِ احمدیہ کے پاس گروی رکھ چکے تھے۔ میں دل آزردہ ہو کر راولپنڈی واپس لوٹ گیا مگر میرے سامنے اپنی تعلیم کو جاری رکھنے کے لیے کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔

اماں ہسپتال سے گھر آ گئی تھیں۔ ان کے دھڑ کا نچلا حصّہ مفلوج ہو چکا تھا مگر بالکل بے حس نہیں تھا۔ اس حصّے میں ایک پھوڑا نکل آیا تھا جو نہایت تکلیف دہ تھا۔ ڈاکٹروں کو پتا نہیں چل رہا تھا کہ اس پھوڑے کو کس طریق سے قابو میں کیا جائے۔ ابا جی کے ایک احمدی دوست فضل محمد خان شملوی کا دعویٰ تھا کہ وہ مسمریزم کے ذریعے علاج کر سکتے ہیں۔ وہ گورنمنٹ کے کسی محکمے میں افسر تھے اور دفتر سے واپسی پر گھر جانے کی بجائے اپنے مریضوں کے پاس جاتے تھے۔ ہمارے گھر پر وہ شام کو آتے تھے اور اماں کے بستر پر اپنے ہاتھوں کو ہوا میں لہرا کر کوئی عمل کرتے تھے۔ وہ اکثر اماں سے پوچھا کرتے تھے کہ کیا دن کے فلاں وقت آپ کو تکلیف تھی؟ میں نے اس کو محسوس کیا تھا اور آپ پر توجہ کی تھی اور فلاں وقت آپ کو آرام آ گیا تھا۔ مجھے ان کی باتیں ہوکس پوکس لگتی تھیں مگر اس چیز کا میں نے کبھی اظہار نہ کیا۔ جہاں تک مجھے پتا ہے اماں کو ان کے علاج سے کوئی افاقہ نہیں ہوا۔

میں اس زمانے میں ربوے جانے کی تیاریاں کر رہا تھا جہاں پر جامعہ احمدیہ کا نیا سال ستمبر میں شروع ہونے والا تھا۔ میرے سامنے کوئی دوسرا راستہ نہ تھا جس کو اختیار کر کے میں اپنی تعلیم کو جاری رکھ سکتا۔ میں اپنے والدین پر بوجھ نہیں بننا چاہتا تھا اس لیے ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال میرے دل میں نہ آیا کہ ابا جی سے کہوں کہ اپنے پیٹ پر پتھر باندھ کر مجھے کالج میں داخل کرائیں۔ مجھے یقین تھا کہ میں اپنی محنت سے خود اپنا تعلیمی مستقبل بنا سکتا ہوں۔

اواخر اگست 1951ء کی کسی تاریخ کو میں ربوے جانے کے لیے راولپنڈی سے چلا۔ اُس وقت مجھے پتا نہ تھا کہ یہ سفر میرے لیے اپنے خاندان سے ہمیشہ کے لیے جدائی کا پیش خیمہ بن جائے گا۔ میرا اثاثہ ایک چھوٹا سا سوٹ کیس تھا، جس کو اٹھائے ہوئے میں گھر سے نکلا تھا۔ ابا جی مجھے ریلوے سٹیشن پر گاڑی میں سوار کرانے کے لیے تانگے میں میرے ساتھ آئے تھے۔ چناب ایکسپریس ابھی اس زمانے میں نہیں چلی تھی۔ مجھے لالہ موسیٰ سے لائل پور جانے والی گاڑی لینی تھی، جو سانگلہ ہل سے گزرتی ہوئی جاتی تھی۔ مجھے چک جھمرہ جنکشن پر اتر کر سرگودھا جانے والی گاڑی پکڑنی تھی۔ میں

چونکہ اس سے قبل یہ سفر کر چکا تھا اس لیے جانتا تھا کہ راستے میں چنیوٹ آئے گا۔ پھر دریائے چناب کے پل کے بعد ربوے کی ننگی چٹانوں والی پہاڑیاں آ جائیں گی، جن پر گھاس کا ایک تنکا تک نہیں اگتا۔

ربوہ اس زمانے میں ابھی تعمیر کے ابتدائی مراحل میں تھا۔ جماعت احمدیہ کے دفاتر اور کارکنوں کے رہائشی کوارٹر، مساجد حتیٰ کہ مرزا بشیر الدین محمود احمد کا ''قصر خلافت'' سب کچی اینٹوں سے بنے ہوئے تھے۔ ربوہ کی آبادی چند سو افراد پر مشتمل تھی، جو ایک ڈیڑھ مربع میل کے رقبے میں آباد تھے۔ قادیان سے ہجرت کرنے کے بعد جماعت احمدیہ نے پاکستان میں نیا مرکز بنانے کے خیال سے حکومت سے چنیوٹ کے قریب ایک بنجر رقبہ قیمتاً خریدا تھا، جو ناقابل کاشت ہونے کے سبب عرصہ دراز سے ویران پڑا تھا۔ شمال کی طرف اور درمیانی علاقے میں ٹیلے تھے، جن کا سلسلہ مشرق کی طرف بہنے والے دریائے چناب تک جاتا تھا۔ دس بارہ مربع میل کا یہ علاقہ بے آب و گیاہ تھا۔ زمین شور زدہ تھی، جس میں پانی نہ ہونے کے سبب کچھ نہیں اگتا تھا۔ تاہم امید کی جاتی تھی کہ زیر زمین گہرائی میں پانی موجود ہوگا۔ البتہ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ٹیوب ویل لگانے سے پانی نکلا تو وہ پینے کے قابل ہوگا یا نہیں۔ میری آمد سے قبل نلکے لگ چکے تھے، جن میں سے نکلنے والا پانی کھارا ہونے کی وجہ سے ناقابلِ شُرب تھا۔ مگر عوام کے لیے یہ پانی پینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ البتہ مرزا بشیر الدین محمود احمد کے خاندان کے لیے پانی ایک قریبی گاؤں احمد نگر سے منگوایا جاتا تھا، جو دو اڑھائی میل کے فاصلے پر آباد تھا۔

اسی گاؤں میں جامعہ احمدیہ پایا جاتا تھا، جس کے لیے ہندوؤں کی ایک متروکہ عمارت حاصل کر لی گئی تھی۔ اسی گاؤں میں ایک دوسری زیادہ وسیع عمارت میں، جس میں رہائشی کمروں کے علاوہ اصطبل بھی پایا جاتا تھا، جامعہ احمدیہ کا ہوسٹل بنا ہوا تھا۔ مگر مجھے ابتدائی دنوں میں وہاں پر کمرہ نہ مل سکا اس لیے میرا قیام ماموں احمد خان نسیم کے گھر پر ربوے میں تھا، جہاں پر اس زمانے میں ماموں کا خاندان دو کمروں میں رہائش پذیر تھا۔ اسی گلی میں خالو جان مولوی غلام نبی مصری کا مکان تھا جن کے ساتھ بھائی جان محمد احمد نعیم اپنی بیوی اور ننھے بچے منصور کے ساتھ مقیم تھے۔ دونوں مکان آمنے سامنے تھے اور ان کی مکانیت ایک جتنی تھی۔ دراصل سارے کوارٹر اسی ٹائپ کے تھے، جن میں صدر انجمن احمدیہ اور انجمن تحریکِ جدید کے کارکن رہتے تھے۔ کوارٹروں کے پہلو میں ایک چھوٹا سا بازار تھا، جہاں سے ضروریاتِ زندگی خریدی جا سکتی تھیں۔ تعلیم الاسلام ہائی سکول اس زمانے میں ابھی چنیوٹ میں اور تعلیم الاسلام کالج لاہور میں تھے۔ البتہ بچیوں کے لیے ایک سکول کھول دیا گیا تھا اور ربوے کا ایک اپنا چھوٹا سا ہسپتال بھی تھا، جس کے سربراہ ڈاکٹر مرزا منور احمد تھے جو مرزا بشیر الدین

محمود احمد کے صاحبزادے تھے۔ ڈاک خانہ بھی کھل چکا تھا اور ربوے کے عین درمیان سے گزرنے والی ریل کی پٹڑی پر ایک سٹیشن بھی بن چکا تھا، جہاں پر سرگودھا اور لائل پور کے درمیان چلنے والی ریل گاڑی رکتی تھی۔

جامعہ احمدیہ میں اس زمانے میں پچاس کے لگ بھگ طالب علم پڑھتے تھے۔ ہماری کلاس دوسری تھی، جس میں داخلے کے لیے میٹرک پاس ہونا لازمی قرار پایا تھا وگرنہ اس سے قبل قادیان کے زمانے میں پرائمری یا مڈل پاس طالب علموں کو داخلہ مل جاتا تھا۔ سارا کورس عربی زبان اور دینی تعلیم کا تھا۔ البتہ ماسٹر غلام حیدر انگریزی پڑھانے پر مامور تھے۔ مگر مجھے یاد نہیں پڑتا کہ ہم نے ان سے کچھ سیکھا تھا۔

جامعہ کے پرنسپل مولوی ابوالعطاء جالندھری تھے جو جماعت احمدیہ کے کامیاب مقرر اور مناظر تھے۔ وہ اپنی جوانی کے زمانے میں فلسطین اور شام میں مبلغ رہ چکے تھے اور عربی زبان پر عبور رکھتے تھے۔ مولوی ابوالعطاء کو، جن کا ماں باپ کا دیا ہوا نام اللہ دتا تھا، لکھنے کا بھی شوق تھا۔ انھوں نے اپنا رسالہ ''الفرقان'' نکالا، جو ان کی وفات (جون 1974ء) تک شائع ہوتا رہا۔

میں درجہ ثالثہ میں تھا جب مولوی ابوالعطاء کو جامعۃ المبشرین کا پرنسپل بنا کر ربوے منتقل کر دیا گیا۔ ان کی جگہ پر مولوی ظہور حسین کو جامعہ احمدیہ کا پرنسپل بنایا گیا۔ وہ چند ماہ سے زیادہ اس عہدے سے نبرد آزمانہ ہو سکے۔ موصوف علم الصرف (عربی گرائمر) کے استاد تھے، مگر پڑھانے کا گر نہ جانتے تھے۔ ایک زمانے میں ان کو روس کا مبلغ بنا کر بھیجا گیا تھا۔ ویزا نہ ہونے کی بنا پر سرحد پر ہی گرفتار کر لیے گئے اور دو اڑھائی سال تک بخارا کی جیل میں قید رہے۔ پھر ملک سے نکال دیے گئے۔ ہندوستان واپس پہنچ کر انھوں نے اپنی تبلیغ مساعی کی عجیب وغریب داستان گھڑی بلکہ ایک کتاب بعنوان ''مجاہد بخارا'' لکھ ڈالی۔ اس میں ایک طرف تو یہ بیان ہے کہ سارا وقت دوسرے قیدیوں سے الگ تھلگ ایک کمرے میں رکھے گئے، جہاں پر وہ دن رات سو نہ سکتے تھے کیونکہ ان کو خطرہ تھا کہ روسی محافظ ان کے کمرے میں ایسے کاغذات ڈال دیں گے جو ان پر لگائے گئے الزاماتِ جاسوسی کے ثبوت کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہوں اور دوسری طرف یہ دعویٰ کہ اپنی قید کے دوران انھوں نے چالیس پچاس قیدیوں کو احمدیت میں داخل کیا تھا۔ جب میں نے ان سے پوچھا کہ ان حالات میں آپ کیسے تبلیغ کرتے تھے تو کہا کہ میں دوسرے قیدیوں کو پکار کر احمدی ہونے کی دعوت دیتا تھا۔ جہاں تک مجھے علم ہے ان کو روسی زبان نہیں آتی تھی۔ خدا جانے وہ کس زبان میں تبلیغ کرتے تھے۔ موصوف نماز بہت رقت سے پڑھتے تھے جس کی نقل لگا کر ان کا چھوٹا بیٹا ہمیں ہنسایا کرتا تھا۔ ان کی

تقریر میں کوئی اثر نہیں تھا۔

ان کی جگہ پر قاضی محمد نذیر لائل پوری کو پرنسپل لگایا گیا۔ ان کو تحقیق کا شوق تھا اور تقریر کرنے میں خاصی مہارت رکھتے تھے۔ اگرچہ مجھے ان کا طریق استدلال کچھ ایسا پسند نہ تھا کیونکہ اس میں بے حد تکرار ہوتی تھی۔ کلاس روم میں البتہ وہ اس طریق سے کند ذہن طالب علموں کو بھی اپنی بات ذہن نشین کرا دیتے تھے۔ ان کے سپرد منطق و فلسفہ کے مضامین تھے۔ جماعت احمدیہ کے جلسہ سالانہ میں ان کی تقریر رکھی جاتی تھی۔ آگے چل کر وہ صدر انجمن احمدیہ کے ناظر اشاعت رہے۔ ان کے کارناموں میں یہ چیز شامل ہے کہ انھوں نے اپنی ایک کتاب میں لکھ دیا تھا کہ مرزا غلام احمد قادیانی سے محمدی بیگم کے سلسلے میں ہونے والے الہامات کو سمجھنے میں اجتہادی غلطی سرزد ہوئی تھی کیونکہ مرزا قادیانی موصوف آخر دم تک اس دعوے پر قائم رہے تھے کہ محمدی بیگم ان کے نکاح میں آئے گی۔

جامعہ کے اکثر طالب علم وقفِ زندگی تھے اور ان کو صدر انجمن احمدیہ کی طرف سے وظیفہ ملتا تھا۔ البتہ جب میں جامعہ میں داخل ہوا تو کسی کو نقد رقم نہیں ملتی تھی۔ ہوسٹل کے اخراجات وظیفے سے کٹ جاتے تھے۔ باقی ماندہ رقم پرچی کی صورت میں ملتی تھی، جس سے مقامی دکانوں سے ضروریاتِ زندگی حاصل کی جا سکتی تھیں۔ البتہ پرچی حاصل کرنا بہت مشکل کام تھا۔ جمعہ کے روز سپرنٹنڈنٹ ہوسٹل ماسٹر غلام حیدر پرچیاں جاری کرتے تھے اور صرف استثنائی صورتوں میں کسی کو نقد رقم دی جاتی تھی۔ یہ کام ان کے کلرک عبدالخالق صاحب کے ذمے تھا جو بہت زندہ دل انسان تھے۔ جب ان کا کسی نئے آدمی سے تعارف ہوتا تھا تو کہا کرتے تھے۔ میرا نام سیّد عبدالخالق ہے۔ البتہ سیّد میں 1947ء سے ہوں، اس سے پہلے شیخ ہوا کرتا تھا۔ اس پر ہر کوئی ہنس دیتا تھا اور بات ہنسی مذاق میں ٹل جاتی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ انھیں پتا نہیں کہ کون ان کی اصل ذات سے واقف ہے اور کون نہیں۔ اس لیے وہ احتیاطاً تقسیم ملک کے بعد اپنا سیّد ہونا بتاتے تھے۔ مجھے انھوں نے کہا۔ تم دیکھ لو گے کہ میرے بچے پکے سیّد بن جائیں گے۔

انہی دنوں میں واقفینِ زندگی سے صدر انجمن احمدیہ نے اس مضمون کے اسٹامپ لکھوائے کہ تعلیم کو ادھورا چھوڑنے یا تعلیم مکمل کرنے کے بعد جماعت احمدیہ کی خدمت نہ کرنے کی صورت میں وظیفے کی تمام رقم واپس کرنی ہوگی۔ ماسوائے چند ایک طالب علموں کے، جو اپنے خرچ پر تعلیم حاصل کر رہے تھے، سارے باقی ماندہ طالب علم گویا جماعتِ احمدیہ کے زرخرید غلام تھے۔ حافظ بدرالدین نامی نوجوان کا، جو تھوڑا عرصہ قبل احمدی ہوا تھا اور جامعہ میں پڑھ رہا تھا، وظیفہ انہی دنوں میں بند کر دیا گیا

تھا۔ میں نے اسے پیش کش کی کہ میرے خرچ پر اپنی تعلیم کو جاری رکھے۔ اس طرح وہ مزید دو برسوں تک جامعہ سے منسلک رہ سکا۔ مجھے اباجی کی طرف سے ماہوار رقم مل جاتی تھی اس لیے مجھے وظیفہ ملنے یا نہ ملنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اسٹامپ لکھوانے کی کارروائی کا ایک ذیلی پہلو یہ بھی تھا کہ صدر انجمن احمدیہ اور تحریکِ جدید انجمن احمدیہ نے طالب علموں کی تقسیم کا فیصلہ کیا، جس کی کارروائی اس طرح عمل میں آئی کہ طالب علموں کو ایک قطار میں کھڑا کیا گیا اور دونوں انجمنوں کے نمائندوں نے بھیڑوں کی طرح طالب علموں کا چناؤ کیا۔ صدر انجمن احمدیہ کے حصّے میں آنے والے طالب علموں کا تقرر تعلیم کے خاتمے پر پاکستان میں بطور مربی ہونا تھا، جبکہ تحریکِ جدید انجمن احمدیہ کے حصّے میں آنے والے طالب علموں کو مبلغ بنا کر غیر ممالک میں بھیجا جانا تھا۔ میں تحریک جدید کے حصّے میں آیا تھا، جو ایک طرح سے انعام سمجھا جاتا تھا۔

میں اس دوران جامعہ کی یونین کا جنرل سیکرٹری بن گیا تھا۔ نائب صدر کے عہدے پر میرے کلاس فیلو مرزا رفیق احمد کا انتخاب ہوا تھا جو مرزا بشیر الدین محمود احمد کے اکیس بچوں میں بیسویں نمبر پر سب سے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ ان کو کالج کے سیکنڈ ایئر سے اٹھا کر جامعہ میں داخل کیا گیا تھا مگر بجائے اس کے کہ ان کو پہلے درجے میں داخل کیا جاتا ان کو براہِ راست تیسرے درجے میں بٹھا دیا گیا۔ یوں بھی صاحبزادہ صاحب کو زعم تھا کہ وہ جامعہ کی تعلیم کو دو برسوں کے اندر مکمل کرلیں گے۔ البتہ اس کام کے لیے جتنی مستعدی اور لیاقت درکار ہے ان سے موصوف عاری تھے۔ وہ احمد نگر کم ہی آتے تھے اور اکثر و بیشتر ہفتوں تک کلاس سے غیر حاضر رہتے تھے۔ کورس کی کتابوں سے ان کی شناسائی بس سرسری سی تھی البتہ میرے ساتھ ان کی دوستی تھی، جس کا سبب شاید میری ادیبانہ شہرت تھی۔ میرے دل میں بہت دنوں سے یہ خواہش پیدا ہو رہی تھی کہ کسی طریق سے جامعہ کو احمد نگر سے ربوے منتقل کرایا جائے، جہاں پر نیم شہری ماحول تھا اور جہاں پر جرمن محاورے کے مطابق شہنائی بجتی تھی۔

احمد نگر ایک چھوٹا سا گاؤں تھا، جس کی آبادی جھنگ کے جانگلیوں اور مشرقی پنجاب سے آئے ہوئے احمدی مہاجروں پر مشتمل تھی جن کو ہندوؤں کے چھوڑے ہوئے مکانات عارضی طور پر الاٹ ہوئے تھے۔ البتہ اس گاؤں کی متروکہ زرعی اراضی پر مرزا بشیر الدین محمود احمد اور ان کے خاندان نے قبضہ جما لیا تھا جبکہ موصوف نے اپنی جماعت کے افراد کو یہ ہدایت دے رکھی تھی کہ اپنی قادیان میں چھوڑی ہوئی املاک کے بدلے میں متروکہ جائداد حاصل کرنے کے لیے کوئی کلیم داخل نہ کریں۔ چنانچہ میرے خالو مولوی غلام نبی مصری، جن کو تقسیم ملک کے بعد ہمارے گاؤں چنگا بنگیال

کے ایک نواحی گاؤں میں اباجی کی کوششوں سے متروکہ زمین الاٹ ہوئی تھی، اس کا قبضہ لینے کے لیے تیار نہ ہوئے کیونکہ خلیفۂ ثانی نے فرمایا تھا کہ ہم بہت جلد قادیان واپس لوٹ جائیں گے۔ یوں بھی قادیان کی جائداد کا بدل انسان کو نہیں مل سکتا۔ چنانچہ خالو جان اس زمین کو اس کے حال پر چھوڑ کر ربوے جا کر آباد ہو گئے تھے۔ ان کی طرح ہزاروں دوسرے احمدیوں نے اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارتے ہوئے متروکہ جائداد حاصل کرنے سے اجتناب کیا۔ اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مرزا بشیر الدین محمود احمد کے خاندان نے پورے قادیان اور پانچ نواحی گاؤں کو اپنی ملکیت بتاتے ہوئے متروکہ جائداد پنجاب اور سندھ میں حاصل کر لی جس کے سبب آج اس خاندان کا شمار پاکستان کے بڑے زمینداروں میں ہوتا ہے۔

جامعہ کے طالب علموں میں ایسی آزادی نہیں پائی جاتی تھی کہ وہ گاؤں کی لڑکیوں کے ساتھ تعلقِ خاطر قائم کر سکیں۔ وہ ان کو دور دور سے دیکھ کر آہیں بھر سکتے تھے یا جیسا کہ یار دوست کہا کرتے تھے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر سکتے تھے۔ البتہ ہوسٹل کے اندر لڑکوں کے ساتھ دوستی کرنے کا رواج تھا۔ عام طور سے بڑی جماعتوں کے طالب علم ایک آدھ جونیر چیلا رکھتے تھے جس پر وہ اپنی ساری محبت نچھاور کرتے تھے۔ ہمارے سامنے مولوی ظفر محمد ظفر کی زندہ مثال موجود تھی جو کھلے بندوں ہمارے ایک گورے چٹے کلاس فیلو امین اللہ خان سالک کے ساتھ اپنا ''ٹھرک'' پورا کرتے تھے۔ عام طور سے کہا جاتا تھا کہ موصوف اس کو شاعری سکھاتے ہیں مگر سب لوگ جانتے تھے کہ ان کا شغف کہیں زیادہ گہرا تھا۔ ان کے بارے میں یہ شعر اس زمانے میں بہت مشہور ہوا تھا:

کہا داور نے محشر میں کہ جو مانگو، وہ ملتا ہے
پکارا ظفر یہی ہر بار: امین اللہ خاں سالک

چوہدری رشید بھی ان لوگوں میں شامل تھا مگر وہ چاہتا تھا کہ جانے سے پہلے کم از کم میٹرک کی ڈگری حاصل کر لے۔ ہوسکتا ہے کہ انگلینڈ میں اس کی ضرورت پڑ جائے۔ دوسری طرف موصوف کو پتا تھا کہ میٹرک کا امتحان پاس کرنا اس کے بس کی بات نہیں اس لیے اس نے اپنے ایک کلاس فیلو کو، جو لکھنے پڑھنے میں ذرا ہوشیار تھا، تیار کیا کہ وہ بھی اس کے ساتھ میٹرک کا امتحان دے۔ واضح ہے کہ امتحان میں شامل ہونے کے لیے دونوں کا داخلہ چوہدری رشید نے ادا کیا۔ ان کا باہمی معاہدہ یہ تھا کہ وہ آپس میں رول نمبر بدل لیں گے۔ چوہدری رشید اپنے پرچوں پر اس کا رول نمبر درج کرے گا اور وہ چوہدری رشید کا نمبر لکھے گا۔ اسی طرح کسی کو شبہ نہیں ہوگا کہ دھاندلی کی جا رہی ہے۔ پاس ہونے کی صورت میں چوہدری رشید نے اس کو دس ہزار روپے ادا کرنے کا وعدہ کیا، جس

میں سے پانچ ہزار پیشگی ادا کر دیے گئے۔ نتیجہ نکلا تو توقع کے مطابق چوہدری رشید پاس ہو گیا اور دوسرا فیل ہو گیا۔ چوہدری رشید کا پاسپورٹ بن چکا تھا، وہ جہاز کا ٹکٹ کٹوا کر لندن چلا گیا۔

احمد نگر کی زرخیزی کے مقابلے میں ربوہ ایک بے آب و گیاہ جگہ تھی مگر ہم طالب علموں کو بے شمار چیزیں ربوے کی طرف کھینچتی تھیں۔ یوں بھی ہم کو آئے دن ربوے جانا پڑتا تھا۔ ربوے میں ان دنوں سیلونی کا چائے خانہ آزاد منشوں کے لیے بہت کشش رکھتا تھا مگر اس کو یہ چیز پسند نہ تھی کہ ہم لوگ گھنٹوں تک چائے کی ایک پیالی پر بیٹھے ہوئے بحث مباحثہ میں لگے رہتے تھے۔ جب ہماری ٹولی اس کے چائے خانہ میں داخل ہوتی تھی تو ہمیں دور سے ہی اس کی بڑبڑاہٹ سنائی دیتی تھی۔ "لو پھر آ گئے یہ ادیب لوگ۔ اب یہ شام سے پہلے نہیں اٹھیں گے۔" ایک روز ایک بہت بڑی توند والا شخص ہمارے قریب بیٹھا ہوا چائے پی رہا تھا۔ یہ بات اگست کے مہینے کی ہے۔ مرزا حنیف احمد کو مذاق سوجھا اور اس نے پوچھا کہ کون سا مہینہ ہے۔ جواب ملا: آٹھواں۔ مرزا حنیف احمد نے کہا: نہیں نواں مہینہ ہونا چاہیے۔ جب کوئی فیصلہ نہ ہو سکا تو اس نے توند والے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ بھائی صاحب سے اس بات کا فیصلہ کرا لیا جائے۔ اس شریف آدمی نے نہایت سادگی سے جواب دیا کہ آٹھواں مہینہ ہے۔ اس پر ایک فلک شگاف قہقہہ اٹھا جس کی موصوف کو توقع نہ تھی۔ اسے بالکل احساس نہ ہوا تھا کہ سارا وقت دراصل اس کی توند زیر بحث رہی تھی۔ میں ان دوستوں سے روز روز ملنا چاہتا تھا جو صرف اس صورت میں ممکن تھا کہ جامعہ احمدیہ احمد نگر سے ربوے منتقل ہو جائے۔

میں نے اس کام کے لیے یونین کے نائب صدر مرزا رفیق احمد کو تیار کیا کیونکہ اس کی پہنچ صدر انجمن احمدیہ کے سرکردہ لوگوں تک تھی۔ علاوہ ازیں وہ آسانی کے ساتھ یہ بات اپنے والد محترم حضرت صاحب تک پہنچا سکتا تھا کہ ربوے میں مبلغین کے ادارے "جامعۃ المبشرین" کی نئی عمارت بن جانے کے بعد اس کی سابقہ عمارت خالی ہو رہی تھی، جو اتنی بڑی تھی کہ اس میں جامعہ احمدیہ اور ہوسٹل دونوں سما سکتے ہیں۔ خلاف توقع یہ مرحلہ آسانی کے ساتھ طے ہو گیا اور جامعہ کو ربوے منتقل ہونے کا پروانہ مل گیا۔

جامعہ کو ربوے میں جو عمارت ملی تھی وہ کچی اینٹوں سے بنی ہوئی تھی، جس کے صحن میں گھاس کا ایک تنکا تک نہ اگتا تھا۔ ایک ہینڈ پمپ موجود تھا مگر اس میں سے نکلنے والا پانی بے حد کھارا تھا، جو اس قابل نہ تھا کہ پیا جا سکے کیونکہ اس میں سے ہمس آتی تھی۔ مجھے تو اس پانی سے نہاتے ہوئے بھی گھن آتی تھی۔ ہوسٹل کے کمپونڈ میں ہر طرف دھول اڑ رہی تھی حتیٰ کہ کمروں کا فرش تک شور زدہ مٹی سے اٹا پڑا تھا۔ ہمیں اس وقت احمد نگر بہت یاد آیا جس کے ہرے بھرے کھیتوں میں ہم لوگ

گھومتے پھرتے تھے اور رہٹ والے کنویں پر جا کر ٹھنڈے اور میٹھے پانی سے نہایا کرتے تھے۔ مگر اب واپسی کے راستے بند تھے۔

میں اس وقت جامعہ کے درجہ رابعہ کا طالب علم تھا اور مولوی فاضل کے امتحان میں بیٹھنے کی تیاری کر رہا تھا۔ پنجاب یونیورسٹی کو امتحان کا داخلہ بھیجا جا چکا تھا۔ کلاسیں بند تھیں کیونکہ کورس کی پڑھائی اختتام کو پہنچ چکی تھی۔ طالب علموں کو اپنے طور پر امتحان کی تیاری کرنے کی کھلی آزادی تھی۔ مجھے اپنے ایک ہم جماعت مرزا سلیم اختر کے ساتھ ایک کمرہ ملا ہوا تھا۔ ہم نے سوچا کہ مل کر امتحان کی تیاری کی جائے۔ میری خواہش تھی کہ ہم ربوے کے ہوسٹل سے باہر قصبے میں کوئی چھوٹا موٹا مکان یا کمرہ تلاش کر لیں جہاں پر ہمیں طالب علموں کی گہما گہمی سے ہٹ کر سکون کے ساتھ پڑھنے کا موقع مل سکے۔

چند دنوں کے اندر اندر ہمیں کریم (افغان) پٹھان کی معرفت ایک زیر تعمیر مکان مل گیا جس کے دو کمرے مکمل ہو چکے تھے اور دروازے وغیرہ لگ چکے تھے، چار دیواری بھی بن گئی تھی مگر کسی وجہ سے تعمیر کا کام روک دیا گیا تھا۔ مالک مکان خود ربوے میں نہیں رہتے تھے البتہ ان کا ایک ایجنٹ موجود تھا جو ہمیں وہ مکان چند ماہ کے لیے بلا معاوضہ دینے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس نے سوچا ہو گا کہ ہم وہاں پر رہیں گے تو تعمیر کے سلسلے میں جمع شدہ سامان چوری ہونے سے بچا رہے گا۔ ہوسٹل کے ساتھ یہ طے کر لیا گیا کہ ہم کھانا وہاں پر آ کر کھایا کریں گے۔ کریم چاہتا تھا کہ ہم امتحان کی تیاری میں اسے بھی اپنے ساتھ شامل کر لیں۔ وہ ہم سے عمر میں کافی بڑا تھا اور مولوی فاضل کا امتحان سات بار دے چکا تھا۔ چونکہ اس کا باپ آخر دم تک اس بات پر قائم رہا تھا کہ اس کا بیٹا مولوی فاضل کا امتحان پاس کرے گا اس لیے کریم اس کی روح کو خوش کرنے کے لیے آٹھویں بار امتحان میں بیٹھنا چاہتا تھا۔

نقلِ مکانی کے دوسرے یا تیسرے روز پتا چلا کہ ساتھ کے مکان میں، جہاں پر ایک نوجوان لڑکا رہتا تھا، دوپہر کے وقت ایک قریبی گاؤں کی جانگلی عورت آتی ہے اور دو تین گھنٹے وہاں پر گزارتی ہے۔ کریم پٹھان نے کہا کہ اگر اس چیز کو نہ روکا گیا تو ہم پر بھی حرف آ سکتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ لڑکا لفنگا ہے اور منع کرنے پر باز نہیں آئے گا اس لیے کسی طریقے سے جانگلی عورت کو ڈرا دیا جائے۔ چنانچہ اس نے اس نوجوان کو بلا کر اس کے سامنے ایک تجویز رکھی کہ اگر وہ چاہے تو ہم اس عورت کے ساتھ ایک ناٹک کھیلیں، جس کے نتیجے میں اس پر خوب رعب پڑے گا۔ کریم پٹھان اونچے قد کاٹھ کا لحیم شحیم آدمی تھا اور عام طور سے ملیشیا کے کپڑے پہنتا تھا۔ جب وہ ہاتھ میں بید پکڑے

ہوئے اور سر پر پولیس والوں کی ٹوپی پہن کر نکلتا تھا تو دیکھنے والے اس کو تھانیدار یا کم از کم ہیڈ کانسٹیبل سمجھتے تھے۔ نوجوان تھوڑا سادہ لوح تھا، وہ کریم کے جھانسے میں آ گیا۔ اگلے روز کریم نے عین اس وقت جا کر کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا جب نوجوان جانگلی عورت کے ساتھ مصروف عمل تھا، اس نے جلدی سے اپنے کپڑے سیدھے کیے اور دروازہ کھول دیا۔ کریم کسی تھانیدار کی شان اور رعب کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے دونوں کو خوب جھاڑ پلائی اور کہا کہ وہ دونوں کا چالان کر دے گا۔ اس پر نوجوان نے پہلے سے طے شدہ پلان کے مطابق خوب واویلا کیا اور کہا کہ میرے بھائیوں کو ساتھ کے مکان سے بلاؤ۔ وہ آ کر تھانے دار کی ایسی تیسی کر دیں گے۔ ہم شور شرابا سن کر دوڑے ہوئے گئے۔ تھانیدار نے یہ پوز کیا کہ وہ ہمیں جانتا ہے اور ہماری بات کو رد نہیں کر سکتا۔ وہ فوراً اس شرط پر معاملہ رفع دفع کرنے کے لیے تیار ہو گیا کہ عورت یہ وعدہ کرے کہ وہ آئندہ کبھی اس طرف کا رخ نہیں کرے گی۔ اگر اس نے خلاف ورزی کی تو وہ اس کو پکڑ کر حوالات میں بند کر دے گا۔ پھر اس کو کوئی نہیں چھڑا سکے گا۔ بے چاری جانگلی عورت سچ مچ ڈر گئی۔ وہ دودھ بیچنے کے لیے ربوے آتی تھی۔ اس نے اپنا دودھ کا برتن اٹھایا اور پلک جھپکتے میں وہاں سے رفو چکر ہو گئی۔

ہم نے دیکھا کہ شور شرابا سن کر آس پاس کے گھروں سے لوگ باہر نکل آئے تھے اور معاملے کی نوعیت کو جان گئے تھے۔ اب خطرہ تھا کہ کہیں یہ خبر نظارت امور عامہ کے متعلقہ افسر بھامڑی صاحب تک نہ پہنچ جائے، کیونکہ اس کے سپرد ایسے معاملات سے نبٹنا تھا۔ جماعت احمدیہ کے نظام میں اس کو تھانیداروں سے بھی بڑھ کر اختیارات حاصل تھے۔ کریم پٹھان نے کہا پیشتر اس کے کہ بات بگڑ جائے ہمیں فوراً وہ مکان خالی کر دینا چاہیے۔ کریم اس زمانے میں ایک دوست کے گھر پر رہتا تھا جس کا ایک کمرہ ہمارے لیے خالی کیا جا سکتا تھا۔ اس طرح ایک ہفتے کے اندر اندر ہمیں دوسری بار بوریا بستر باندھ کر نقل مکانی کرنی پڑی۔

میں نے ''خالد'' میں محمد نذیر فاروقی کا ایک مضمون 1857ء کے غدر کے بارے میں چھاپا جس میں غدر کو جنگِ آزادی قرار دیا گیا تھا۔ یہ مضمون میر داؤد احمد کی نظر سے گزرا جو اس زمانے میں خدام الاحمدیہ کے صدر تھے۔ وہ فوراً رسالہ اٹھا کر مرزا بشیر احمد، برادر خورد مرزا بشیر الدین محمود احمد کی خدمت میں حاضر ہوئے کیونکہ ان کی رائے کو جماعت احمدیہ میں بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ دراصل مرزا غلام احمد قادیانی نے 1857ء کے غدر کو بغاوت کا نام دیا تھا جس میں ان کے والد ماجد نے پاس گھڑ سوار انگریزی سرکار کی کمک کے لیے دہلی بھیجے تھے۔ میرا خیال تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ہمیں تاریخی معاملات کے بارے میں اپنی رائے بدلنے کا حق حاصل ہے مگر اس میں یہ قباحت تھی کہ

مرزا غلام احمد قادیانی کے مؤقف کو غلط ماننا پڑتا تھا جس کے لیے جماعت تیار نہ تھی۔ باہمی مشورے سے ''خالد'' کے مدیر اعلیٰ مولوی دوست محمد شاہد کی جواب طلبی ہوئی۔ پتا چلا کہ مضمون کی اشاعت ان سے مشورہ کیے جانے کے بغیر نائب مدیر کی ذمے داری پر ہوئی تھی چنانچہ ایک دوپہر کو چلچلاتی دھوپ میں مولوی دوست محمد شاہد مجھے یہ بتانے کے لیے میری قیام گاہ پر تشریف لائے کہ مجھے ''خالد'' کی ادارت سے معزول کر دیا گیا ہے۔ مولوی صاحب کو خطرہ تھا کہ ان پر بھی نزلہ گرے گا مگر وہ معزولی سے بال بال بچ گئے۔ دوسری طرف میرے دل میں جماعت احمدیہ کے عقائد کے بارے میں گرہ پڑ گئی جو آگے چل کر میری اس سے جدائی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

اس بات کا تعلق جماعت احمدیہ کی اس پالیسی سے ہے کہ جو کوئی سلسلے سے جدا ہو جائے یا اس کو نکال دیا جائے...... عام طور سے اس کے سوشل بائیکاٹ کا اعلان کر دیا جاتا ہے...... تو اس شخص کے ساتھ کسی کو تعلق رکھنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ مجھے آج بھی اس بات پر بے حد شرمندگی محسوس ہوتی ہے کہ میں نے ایک دفعہ ڈاکٹر نذیر احمد ریاض کو راولپنڈی میں اردو بازار کے پوسٹ آفس کے پاس دیکھا اور بجائے اس کے سلام کا جواب دینے کے منہ موڑ کر الٹی سمت میں چل دیا تھا۔ اس کو کچھ عرصہ قبل ربوے سے نکال دیا گیا تھا، جس کی وجوہات سے میں ناواقف ہوں۔ جب نظارت امورِ عامہ کی طرف سے اعلان کر دیا جاتا ہے کہ فلاں شخص کو جماعت سے خارج کرنے کے علاوہ اس کا بائیکاٹ کیا جاتا ہے تو فوراً اسی نظارت کا محتسب (عرف عام میں تھانیدار) متعلقہ شخص کو چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر ربوے سے نکل جانے کا نوٹس دیتا ہے۔ اگر وہ خود اپنی مرضی سے نقل مکانی نہیں کرتا تو جماعت کے کارکن (غنڈے؟) اس کے گھر کا سامان مکان سے باہر نکال کر سڑک پر پھینک دیتے ہیں۔ اس بات کا تجربہ سیّد داؤد احمد انور کو ہوا تھا جس کا قصور صرف اتنا تھا کہ اس نے خلیفہ ثالث مرزا ناصر احمد کے مرنے پر جانشینی کی دوڑ میں مرزا رفیع احمد کا ساتھ دیا تھا جو مرزا ناصر احمد کی طرح مرزا بشیر الدین محمود احمد کا بیٹا ہے مگر ''خاندانِ نبوت'' (اس نام سے مرزا غلام احمد قادیانی کے خاندان کو جماعتِ احمدیہ میں یاد کیا جاتا ہے) نے مرزا طاہر احمد کو جانشین بنانے کا فیصلہ کیا تھا اس لیے سیّد داؤد احمد جیسے سرفروشوں کو جماعت سے نکال دیا گیا تھا۔ اس کو راتوں رات ربوے سے نکل جانے کا حکم دیا گیا تھا جس پر سختی سے عمل درآمد ہوا تھا۔

مگر بعض صورتوں میں جماعت کو دوسری وجوہات کی بنا پر اپنے طریق عمل میں تبدیلی بھی کرنی پڑتی تھی۔ اس کی مثال ذیل کا واقعہ ہے۔ چوہدری ظفر اللہ خان کے بھائی چوہدری عبداللہ خان کے بیٹے حمید نصر اللہ کا رشتہ ''خاندانِ نبوت'' کی ایک لڑکی سے طے پایا تھا۔ نکاح خود مرزا بشیر الدین

محمود احمد نے پڑھایا تھا اور اس بات پر خوشی کا اظہار کیا تھا کہ جماعت کے دو سرکردہ خاندان اس رشتے کے سبب زیادہ قریب آ جائیں گے۔ مگر رخصتی والے روز، جب مرزا فیملی کے سب لوگ ربوے میں جمع تھے، برات کراچی سے نہیں آئی تھی۔ حمید نصر اللہ خفیہ طور پر اپنی کزن امتہ الحئی سے محبت کرتا تھا جو چوہدری ظفر اللہ خان کی بیٹی تھی۔ امتہ الحئی اس زمانے میں ایک دوسرے شخص کے ساتھ بیاہی ہوئی تھی۔ بعد میں اس نے اپنے والد کی مرضی کے خلاف خاوند سے طلاق لے کر حمید نصر اللہ کے ساتھ شادی کر لی تھی۔ اس کا پہلے خاوند سے، جو ہجرت کر کے آسٹریلیا چلا گیا تھا، ایک بیٹا تھا جو لاہور میں ماں کے پاس رہتا تھا۔ چند برس ادھر اس کو کسی نے ان کے گھر میں گھس کر قتل کر دیا تھا۔ حمید نصر اللہ نے "خاندانِ نبوت" کی لڑکی کو جس طرح ٹھکرایا تھا اس کی سزا سے وہ صاف بچ گیا تھا۔ اگر اس کی جگہ پر کوئی دوسرا ہوتا تو اس کو اور اس کے خاندان کو جماعت احمدیہ سے خارج کرنے کے علاوہ اس کا سوشل بائیکاٹ کر دیا جاتا۔ حمید نصر اللہ برسوں سے جماعت احمدیہ لاہور کا امیر ہے۔

مولوی غلام باری سیف (جن کو یار لوگوں نے "غلام کھڑکی تلوار" کا نام دے رکھا تھا) ہمیں اشتراکیت پر لیکچر دیتے تھے۔ ان کا شمار بھی جماعت احمدیہ کے جید عالموں اور مقرروں میں ہوتا تھا۔ وہ برسوں تک رسالہ "خالد" کے مدیر رہ چکے تھے جس کے لیے میں تواتر سے لکھتا آیا تھا مگر ایک واقعے کے بعد میں نے ان کو مضامین دینے بند کر دیے تھے۔ انھوں نے میرا ایک مضمون، جس پر مجھے بہت فخر تھا، کیونکہ اس میں تمثیل (الیگوری) کی تکنیک کو استعمال کیا گیا تھا، میرے نام کے بغیر چھاپا تھا۔ جب میں نے احتجاج کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ اگلے شمارے میں اس غلطی کا ازالہ کر دیا جائے تو موصوف اس کے لیے تیار نہ ہوئے۔ ان کے نزدیک ایسی چھوٹی باتوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ کاپی رائٹ یا ریکارڈ کو درست کرنے کے بارے میں شاید انھوں نے کچھ نہیں سن رکھا تھا۔

مولوی ابوالمنیر نورالحق (جن کو ربوے میں ان کے چھوٹے قد اور موٹی توند کے سبب "مولوی پاوا" کے نام سے یاد کیا جاتا تھا) تفسیر القرآن کے استاد تھے۔ وہ مرزا بشیر الدین محمود احمد کے ساتھ سالہا سال تک منسلک رہے جو "تفسیر کبیر" کے عنوان کے تحت تیس جلدوں میں چھپنے والی قرآنِ کریم کی سب سے بڑی تفسیر لکھ رہے تھے مگر اسے تکمیل تک نہ پہنچا سکے تھے۔ چونکہ مرزا محمود احمد کو عربی بس واجبی سی آتی تھی اس لیے ان کو مولوی ابوالمنیر جیسے عالم کی ضرورت تھی جو ان کے لیے عربی اور فارسی میں لکھی جانے والی تفاسیر کے متعلقہ صفحات کا ترجمہ مہیا کرے۔ چنانچہ مولوی صاحب موصوف تیس چالیس سال تک اس کام میں لگے رہے۔ انھوں نے کہیں کہہ دیا تھا کہ "تفسیر کبیر" کی تصنیف میں ان کا بھی حصہ ہے اس لیے جب مرزا طاہر احمد اور سید محمود احمد دو سال تک انگلستان میں

قیام کے بعد پاکستان لوٹے تو ربوے کے سٹیشن پر ان کا استقبال کرنے والوں کے سامنے مرزا طاہر احمد نے کہا تھا کہ "تفسیر کبیر" کے اصل مصنف مولوی نور الحق صاحب کہاں ہیں؟ یہ بات کہنے کا مقصد مولوی صاحب موصوف کو شرمندہ کرنا تھا۔ چونکہ "تفسیر کبیر" کے کام کو زیادہ اہمیت حاصل تھی اس لیے مولوی صاحب کم ہی جامعۃ المبشرین میں پڑھانے کے لیے حاضر ہوتے تھے۔

میرا ان کے ساتھ ایک بار شدید ٹکراؤ ہوا، جس کا اثر ان پر تو شاید نہ ہوا مگر جس نے میرے اندر بغاوت کے جذبات پیدا کر دیے۔ خدام الاحمدیہ کے سالانہ اجتماع کے سلسلے میں جب تقریروں کا مقابلہ ہوا، جس میں پوزیشن حاصل کرنے والوں کو ربوے کی نمائندگی کرنی تھی، تو میں نے بھی اس میں حصّہ لیا۔ مولوی صاحب اس زمانے میں ربوے کے قائد تھے۔ مقابلہ تین سیکشنوں میں ہوا۔ میں سب سے اوپر والے سیکشن میں تھا جبکہ مرزا بشیر الدین محمود احمد کا پوتا مرزا انس احمد، جو مرزا ناصر احمد صدر خدام الاحمدیہ کا بیٹا تھا، تیسرے سیکشن میں تھا۔ ہر سیکشن میں شامل ہونے والوں کا علیحدہ علیحدہ مقابلہ ہوتا تھا مگر جب مولوی صاحب نے نتیجے کا اعلان کیا تو مرزا انس احمد کو پہلے سیکشن میں اوّل قرار دے دیا۔ میری پوزیشن دوسری تھی۔ گویا اس سیکشن میں ربوے کی نمائندگی کے لیے مرزا انس احمد کو نامزد کر دیا گیا۔ میں نے اس طریقِ کار پر اعتراض کیا اور کہا کہ جس شخص نے پہلے سیکشن میں حصّہ نہیں لیا اس کو کیسے اس سیکشن کے لیے نامزد کیا جا سکتا ہے؟ مولوی صاحب نے میرے احتجاج پر بالکل کان نہ دھرا۔ وہ "خاندانِ نبوت" کو خوش کرنا اور اپنے نمبر بڑھانا چاہتے تھے۔ اس پر میں اس معاملے کو نائب صدر خدام الاحمدیہ چوہدری شبیر احمد کے پاس لے گیا، جو نہیں چاہتے تھے کہ میں بات کو آگے بڑھاؤں۔ ان کا کہنا تھا کہ جو فیصلہ ہو گیا اس کو قبول کر لینا چاہیے۔ میں نے کہا کہ ہم کمیونسٹ روس میں نہیں بلکہ ایک جمہوری ریاست پاکستان میں ہیں جہاں پر فیصلے قانون اور قاعدے کے مطابق ہوتے ہیں۔ یہ بات ان کو قطعاً پسند نہ آئی اور انھوں نے مجھے ایسی باتیں کرنے سے روکنا چاہا۔ چونکہ ایک طرف میرا مؤقف درست تھا اور دوسری طرف وہ امام جماعت احمدیہ کے پوتے کو نامزدگی سے نہ ہٹا سکتے تھے اس لیے مجھے بھی مرزا انس احمد کے ساتھ نامزد کر دیا گیا۔ چنانچہ ہم دونوں کو سالانہ اجتماع کے موقعے پر ربوے کی طرف سے تقریری مقابلے میں حصّہ لینے کی اجازت دے دی گئی۔ مولوی نور الحق سخت کینہ پرور انسان تھے، مجھ سے اس کے بعد وہ ہمیشہ کنی کاٹتے تھے، جیسے وہ مجھے جانتے ہی نہ ہوں۔ سلام کا جواب تک نہ دیتے تھے۔

مولوی خورشید احمد شاد استاد الحدیث تھے۔ ان کے اندر ایک طرف مُلاؤں والی خشکی پائی جاتی تھی تو دوسری طرف وہ طالب علموں کے ساتھ دوستانہ ملاپ رکھتے تھے۔ مزاج میں تھوڑا تلون تھا

جس کے سبب انسان نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اگلے لمحے کیا کر بیٹھیں گے۔ سنا تھا کہ ایک بار ان کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا۔ وہ مولوی ابوالعطاء جالندھری کے داماد تھے اور عام طور سے بہت ذہین و فطین انسان گنے جاتے تھے۔ مجھے ان کے ساتھ ایک واقعہ پیش آیا، جس نے ان کے بارے میں میری خوش فہمی کا خاتمہ کر دیا۔ ہم نے ایک مجلس بنائی تھی جس کے تحت علمی تقاریر کا سلسلہ قائم کرنے کا پروگرام بنایا گیا تھا۔ میں اس کا سیکرٹری تھا اور شاد صاحب صدر تھے۔ پہلا لیکچر شاد صاحب کا رکھا گیا جو علم حدیث کے بارے میں تھا۔ ''الفضل'' میں اس کا اعلان چھپ چکا تھا۔ ہمیں امید تھی کہ ربوے کے علم دوست بڑی تعداد میں لیکچر سننے کے لیے آئیں گے۔ مقررہ تاریخ سے ایک روز پہلے دوپہر کے وقت شاد صاحب میری قیام گاہ پر تشریف لائے اور فرمایا کہ ان سے مقالہ نہیں لکھا گیا اس لیے مجھے لیکچر کی منسوخی کا اعلان کرنا ہوگا۔ میں نے کہا: آج کا اخبار چھپنے کے بعد تقسیم ہو رہا ہے اور لیکچر والے روز اخبار کی چھٹی ہے اس لیے سامعین تک لیکچر کی منسوخی کی خبر نہیں پہنچائی جا سکتی۔ اب ان کو لیکچر دینا ہوگا۔ یوں بھی وہ اس موضوع کے پروفیسر ہیں اس لیے ان کو اس بارے میں بولنے کے لیے کسی لمبی چوڑی تیاری کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے مگر شاد صاحب اپنی بات پر اڑے رہے۔ آخر کار میں نے تجویز پیش کی کہ اگر میں کل تک ایک مقالہ لکھ دوں تو کیا وہ اس کو پڑھ کر سنانے کے لیے تیار ہوں گے۔ اس پر ان کی جان میں جان آئی اور انھوں نے فرمایا کہ اگر آپ مقالہ لکھ دیں تو پھر میری مشکل حل ہو جائے گی۔ چنانچہ میں نے رات بھر جاگ کر بیس صفحے کا مقالہ لکھا اور اگلی صبح ان کے گھر پر پہنچا دیا۔ نمازِ عصر کے بعد ہماری مجلس کا پہلا اجلاس منعقد ہوا جس میں شاد صاحب نے میرا لکھا ہوا مقالہ حرف بحرف پڑھ کر سنایا۔ صدرِ محفل مولوی ابوالعطاء جالندھری تھے۔ انھوں نے مجلس کے اختتام پر مقالہ اپنی تحویل میں لے لیا اور اپنے رسالے ''الفرقان'' کے اگلے شمارے میں شاد صاحب کے نام سے چھاپ دیا۔ میں نے ان کی علمیت کا بھانڈا پھوڑنا مناسب نہ سمجھا اور شاد صاحب کے اندر اتنی جرأت نہ تھی کہ اپنے خسر کو بتاتے کہ مقالہ ان کا لکھا ہوا نہیں ہے۔

جامعۃ المبشرین کے بیشتر اساتذہ کو تقسیم ملک سے پہلے جماعتِ احمدیہ کی طرف سے ہندوستان کے اہم مذہبی مدرسوں میں پڑھنے کے لیے بھیجا گیا تھا تاکہ وہ اپنے اپنے مضامین میں خصوصی تعلیم حاصل کریں۔ وہ سب مولوی فاضل کا امتحان پاس کر چکے تھے بلکہ ان میں سے شاد صاحب کی طرح چند ایک یونیورسٹی میں پہلی پوزیشن حاصل کر چکے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ ان کے ذریعے جماعت کے اندر دینی تعلیم کا معیار بلند کیا جائے۔ چنانچہ ان کو پوسٹ گریجویٹ درجے کے ادارے میں پڑھانے کے لیے متعین کیا جاتا تھا مگر یہ لوگ توقعات کو پورا نہ کر سکے۔ بالخصوص شاد

صاحب کو، جو ایک تاجر فیملی سے تعلق رکھتے تھے، ہمیشہ یہ گلہ رہا کہ ان کی تنخواہ بہت تھوڑی ہے۔ دراصل جماعتِ احمدیہ کے واقفین زندگی کو بہت معمولی الاؤنس دیا جاتا تھا جو جرمن محاورے کے مطابق مرنے کے لیے بہت زیادہ مگر ایک پورے ٹبر کے گزارے کے لیے کہیں کم تھا۔ شاد صاحب نے دو تین بار وقف زندگی سے جان خلاصی کی کوشش کی مگر ہر بار ان کو واپس آنا پڑا۔ ایک بار انھوں نے ربوے کے گول بازار میں ایک دکان کھول لی۔ اتفاق سے دو چار روز کے بعد مرزا بشیر الدین محمود احمد کی کار وہاں سے گزری اور انھوں نے پوچھ لیا کہ یہ نئی دکان کس کی ہے۔ بتایا گیا مولوی خورشید احمد شاد کی۔ اس پر حضرت صاحب نے شاد صاحب کو پیغام بھیجا کہ آپ کو اس لیے خصوصی تعلیم نہیں دلوائی گئی تھی کہ آپ بزازوں کی طرح دکان کھول کر بیٹھ جائیں۔ چنانچہ ان کو اگلے روز سے دکان بند کر کے جامعہ میں اپنی ڈیوٹی پر حاضر ہونا پڑا۔ جب مرزا بشیر الدین محمود احمد پر فالج کا حملہ ہوا اور سلسلے کے کاروبار میں دخل اندازی کے قابل نہ رہے تو شاد صاحب نے موقع غنیمت جانتے ہوئے ایک مطب کھول لیا۔ انھوں نے اپنے طور پر طب کا مطالعہ کر رکھا تھا، اس مطب کو وہ بہت کامیابی کے ساتھ اپنی وفات تک چلاتے رہے۔ سنا ہے کہ اب ان کا بیٹا باپ کے نسخوں کے مطابق بنائی ہوئی معجونیں اور دوسری دوائیاں بیچتا ہے۔ شاد صاحب کے ساتھ یہ المیہ تھا کہ ان کی پہلی بیوی امتہ اللہ خورشید سے اولاد نہ ہوئی تھی۔ اس کی وفات کے بعد شاد صاحب نے دوسری شادی کی اور اولاد سے نوازے گئے۔

پروفیسروں میں حیران کن تقرری پیر معین الدین کی تھی جو مرزا بشیر الدین محمود احمد کے داماد اور تعلیمی اعتبار سے ایم ایس سی (کیمسٹری) اور جماعت کے قائم کردہ ادارے ''فضل عمر ریسرچ لیبارٹری'' کے ریسرچ فیلو تھے۔ چونکہ یہ ادارہ ناکام ہونے کے بعد بند ہو چکا تھا اس لیے ان کو مصروف رکھنے کے لیے جامعتہ المبشرین میں انگریزی پڑھانے پر لگا دیا گیا۔ آدمی البتہ محنتی تھے اور اپنے لیے ایک نیا میدانِ عمل تلاش کرنے میں کامیاب ہوئے۔ انھوں نے مرزا بشیر الدین محمود احمد کی ''تفسیر کبیر'' کا، جس میں بے شمار رطب و یابس جمع کر دیا گیا ہے اور جو اپنی طویل کلامی کے سبب پڑھنے والوں پر ایک بار بن جاتی ہے، خلاصہ نکال کر کتابی صورت میں چھاپنا شروع کر دیا۔ اتفاق ایسا تھا کہ ان کے بڑے بھائی پیر صلاح الدین بھی، جو سول سروس کے آدمی تھے، ساری عمر فارغ اوقات میں قرآن کا اردو اور انگریزی زبان میں ترجمہ کرنے میں لگے رہتے تھے۔ انگریزی ترجمہ دو جلدوں میں ہے اور اردو ترجمہ چار جلدوں میں۔ یہ وہی صاحب ہیں جن کو جنرل ضیاء الحق کے زمانۂ اقتدار میں راولپنڈی میں سرِ عام کوڑے مارے گئے تھے۔ ان کا راولپنڈی کے چاندنی چوک میں ایک ہوٹل

تھا جس کا انتظام ان کے بیٹوں کے ہاتھ میں تھا۔ سننے میں آیا تھا کہ وہاں پر رنڈیوں نے ڈیرہ جما رکھا تھا اور شہر بھر کے لفنگے وہاں پر جمع ہو کر رنگ رلیاں مناتے تھے۔ ہوٹل کے مالک چونکہ پیر صلاح الدین تھے اس لیے بیٹوں کے جرم کی سزا باپ کو بڑھاپے کی عمر میں بھگتنی پڑی۔ اس چیز کو وہ تو کسی نہ کسی طرح برداشت کر گئے مگر ان کا ایک چھوٹا بھائی اس صدمے کے سبب ہارٹ اٹیک کا شکار ہو کر مر گیا۔ اس بھائی کی شادی سابق امیر جماعت احمدیہ راولپنڈی امیر عالم صاحب کی اس بیٹی سے ہوئی تھی جس سے میں نے مولوی فاضل کے کورس کی کتابیں عاریۃً مانگی تھیں۔ بعد میں سننے میں آیا کہ محترمہ نے مولوی فاضل کا امتحان دو تین بار فیل ہونے کے بعد پاس کر لیا تھا۔ پیر صلاح الدین کی بیوی مرزا بشیر الدین محمود احمد کی بیوی مریم صدیقہ کی بہن تھی۔

جامعۃ المبشرین میں ہماری پڑھائی شروع ہوئے ابھی چار ہفتے بھی نہ ہوئے تھے کہ سلسلہ عالیہ احمدیہ کی عمارت میں ایک بھونچال آ گیا۔ مرزا بشیر الدین محمود احمد نے انکشاف کیا کہ خلیفہ اوّل حکیم مولوی نور الدین کے بیٹے عبدالمنان عمر نے نوجوانوں کا ایک گروپ بنا رکھا ہے جو اس کو خلیفہ بنانے کے لیے ساز باز کر رہا ہے۔ عبدالمنان عمر اس وقت امریکہ گئے ہوئے تھے۔ وہ وہاں سے فی الفور واپس لوٹے اور آتے ہی سیدھے ''قصرِ خلافت'' پہنچے۔ ان کا خیال تھا کہ کسی غلط فہمی کے باعث ان پر یہ الزام لگایا گیا ہے جس کو دور کیا جا سکتا ہے۔ مگر ''قصرِ خلافت'' کے دروازے ان پر بند رہے اور صدر انجمن احمدیہ کا کوئی ذمے دار کارکن ان کی بات سننے کے لیے تیار نہ تھا۔ جماعتِ احمدیہ کے اخباروں میں خلافت کے حق میں مضامین کا سلسلہ شروع ہو گیا جو یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ خلیفہ خدا تعالیٰ خود بناتا ہے۔ جو کوئی اس منزلت کو دھاندلی سے حاصل کرنے کی خواہش رکھتا ہے اس کو ہمیشہ منہ کی کھانی پڑتی ہے۔

عبدالمنان عمر ایم اے (عربی) تھے اور جامعہ احمدیہ کے ٹیچنگ سٹاف پر تھے۔ ان کا خاص مضمون حدیث تھا۔ احمد نگر کے زمانے میں مجھے یاد ہے کہ وہ شاید مہینہ بھر ہمیں پڑھانے کے لیے آئے تھے۔ پھر چوہدری ظفر اللہ خان کی وساطت سے ان کو امریکہ کی ہارورڈ یونیورسٹی میں منعقد ہونے والی ایک کانفرنس میں شمولیت کی دعوت ملی تھی جس کا کرتا دھرتا پروفیسر رچرڈ فرائی تھا جسے برسوں کے بعد ہمبرگ یونیورسٹی میں میرا کولیگ بننا تھا۔ عبدالمنان عمر کے اس کانفرنس کے دوران امریکی یونیورسٹیوں سے روابط بن گئے اور وہ بار بار وہاں پر بلائے جانے لگے۔ وہ بلند پایہ عالم تھے اور جماعتِ احمدیہ کے ستونوں میں شمار ہوتے تھے۔ ان کی طرف لوگوں کی نظریں اٹھنے لگی تھیں۔

مرزا بشیر الدین محمود احمد پر اس سے دو سال قبل ایک ناکام قاتلانہ حملہ ہو چکا تھا جس کا ان

کی صحت پر بہت گہرا اثر پڑا تھا۔ خنجر کی نوک ان کی گردن میں اٹکی رہ گئی تھی جس کا پتا اس وقت چلا تھا جب وہ علاج کے لیے یورپ گئے۔ مگر اس کو نکالا نہ جاسکا کیونکہ اپریشن کرنے پر ان کی جان جانے کا خطرہ تھا۔ ان کی صحت مسلسل گر رہی تھی اور ''خاندانِ نبوت'' میں ان کی جانشینی کا سوال اٹھایا جا رہا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ خلافت کی گدی ان کے بیٹے مرزا ناصر احمد کو ملنی چاہیے جس کو انھوں نے بچپن میں قرآن حفظ کرایا تھا، پھر جامعہ احمدیہ میں تعلیم دلا کر مولوی فاضل کی ڈگری دلوائی تھی۔ اس کے بعد اس کو پڑھنے کے لیے آکسفورڈ بھیجا تھا جہاں سے وہ بی اے کی ڈگری لے کر آئے تھے۔ اپنے نام کے ساتھ وہ ایم اے (آکسن) اس لیے لکھا کرتے تھے کیونکہ جو کوئی وہاں سے بی اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد دو سال تک کسی کالج میں پڑھائے اس کو ایم اے کی ڈگری دے دی جاتی تھی۔ انگلستان سے واپسی پر ان کو پہلے جامعہ احمدیہ کا، پھر تعلیم الاسلام کالج کا پرنسپل مقرر کیا گیا۔ اس کے باوجود عام طور سے ان کے بارے میں یہ تاثر تھا کہ وہ موٹے دماغ کے آدمی ہیں۔ ان سے ایک بار دہلی کے ایک جلسے میں تلاوتِ قرآن کرائی گئی تھی، جس میں ان سے غلطی سرزد ہوئی تھی، جس کے سبب مخالفوں نے پتھراؤ کیا تھا۔ مرزا بشیر الدین محمود احمد نے کئی بار اس واقعے کا خود ذکر کیا تھا اور اپنے بیٹے کی قابلیت کے بارے میں شک وشبہے کا اظہار کیا تھا۔ اس وجہ سے جماعت کے اندر اس خیال کا پیدا ہونا قرین قیاس ہے کہ ان کے مقابلے میں عبدالمنان عمر خلافت کے لیے زیادہ موزوں شخص ہیں۔ وہ بھی تو ایک بڑے عالم دین کے بیٹے ہیں جو جماعت کے پہلے خلیفہ تھے۔ پھر وہ خود بھی نامور عالم تھے۔

عبدالمنان عمر کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ برسوں سے مسند احمد بن حنبلؒ کی جملہ حدیثوں کو صحیح بخاری کی طرح ابواب میں ترتیب دینے میں لگے ہوئے ہیں۔ اس چیز کو علمی اصطلاح میں ''تبویب'' کا نام دیتے ہیں۔ اس بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کے والد حکیم مولوی نور الدین نے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ کیا ہی اچھا ہو اگر کوئی شخص یہ علمی خدمت بجا لائے۔ خلافت کے قریبی حلقوں میں اس خدشے کا اظہار کیا گیا کہ اگر عبدالمنان عمر کی کتاب چھپ گئی تو ساری جماعت پر ان کی علمیت کا رعب پڑ جائے گا، اس کا فی الفور تدارک ہونا چاہیے۔ چنانچہ جماعت کے مولوی حضرات نے مرزا بشیر الدین محمود احمد کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ احمدی علماء کی ایک کمیٹی بنائی جائے جو دونوں چار مہینوں کے اندر اندر مسند احمد بن حنبلؒ کی تبویب کا کام مکمل کرے۔ جب ان کی طرف سے کتاب پہلے چھپ جائے گی تو عبدالمنان عمر کا سارا کیا کرایا رائیگاں جائے گا۔

یہ چیز جماعت احمدیہ میں نئی نہیں تھی، کیونکہ اس کی ایک مثال پہلے سے پائی جاتی تھی۔

جب خلیفہ اوّل حکیم مولوی نور الدین کی 1914ء میں وفات ہوئی تو صدر انجمن احمدیہ کے بنیادی اراکین کی اکثریت اس حق میں تھی کہ جماعت میں خلافت کا نظام آگے نہ چلایا جائے بلکہ اس کی جگہ پر رہنمائی کا کام ایک بورڈ کے سپرد کیا جائے جو جمہوری طرز پر جماعت کا انتظام چلائے۔ مگر مرزا بشیر الدین محمود احمد چونکہ پیری مریدی کی گدی بنانی چاہتے تھے اس لیے وہ خلافت کے جاری رکھنے کے حق میں تھے۔ صدر انجمن احمدیہ کے بیشتر سینئر اراکین قادیان کو چھوڑ کر لاہور چلے گئے اور انھوں نے وہاں پر اپنی جماعت بنالی جس کو عام طور سے ''لاہوری جماعت'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس جماعت کے سرکردہ مولوی محمد علی تھے جن کے سپرد صدر انجمن احمدیہ کی طرف سے قرآن کو انگریزی میں ڈھالنے کا کام لگایا گیا تھا۔ لاہور جاتے ہوئے وہ اپنا مسودہ ساتھ لیتے گئے۔ قادیان کی جماعت کو خطرہ پیدا ہوا کہ اگر مولوی محمد علی کا انگریزی ترجمۃ القرآن چھپ گیا تو ان کی ساکھ بندھ جائے گی اس لیے یہ سکیم بنائی گئی کہ ان کا ترجمہ چھپنے سے پہلے قادیان کی طرف سے قرآن کا انگریزی زبان میں ترجمہ چھاپ دیا جائے۔ چنانچہ ایک بورڈ بنایا گیا اور ایک سال کے اندر اندر 1915ء میں پہلے پارے کا انگریزی ترجمہ چھاپ دیا گیا۔ مکمل قرآن کا ترجمہ بیس برسوں کے بعد 1935ء میں جا کر چھپا جس پر مولوی شیر علی نے دن رات کام کیا تھا۔ اتفاق ایسا تھا کہ ان کی بیٹی امۃ الرحمٰن کی شادی عبدالمنان عمر کے ساتھ ہوئی تھی۔ ان دونوں میاں بیوی نے بھی آگے چل کر قرآن کا ترجمہ حکیم مولوی نور الدین کے درس القرآن کی روشنی میں انگریزی میں کیا جو 1991ء میں امریکہ سے شائع ہوا۔ مگر اب وہ جماعت احمدیہ ربوہ کے رکن نہیں تھے۔ اس ترجمے کے بارے میں ان سے کسی دوست نے استفسار کیا تھا کہ آپ نے حکیم مولوی نور الدین کے نام کے ساتھ ''خلیفۃ المسیح الاوّل'' کے الفاظ کیوں نہیں لکھے؟ تو اس کا جواب عبدالمنان عمر صاحب نے یوں دیا تھا: ''میں نے ان سے عرض کیا کہ وہ ''خلیفۃ المسیح'' اپنی نیکی، تقویٰ، علم وفضل اور ذاتی خوبیوں کی وجہ سے بنے تھے۔ ان کی عظمت نے انھیں خلیفہ بنایا نہ کہ خلافت نے انھیں عظمت دی۔'' (خط مطابق 15 جون 1993ء)

مسند احمد بن حنبلؒ کی تبویب کا فیصلہ آناً فاناً ہوا۔ جامعۃ المبشرین کے جملہ اساتذہ اور طلبہ کو حکم ہوا کہ اگلے روز سے اس کام میں لگ جائیں۔ ربوے کی خلافت لائبریری میں مسند احمد بن حنبلؒ کی صرف ایک جلد موجود تھی۔ اس زمانے میں ابھی فوٹو کاپی کی مشینیں نہیں پائی جاتی تھیں اس لیے فیصلہ یہ تھا کہ جلد کے اجزاء الگ الگ کر لیے جائیں، اس کے بعد ساری حدیثیں الگ الگ اوراق پر نقل کی جائیں تاکہ ماہرین حدیث ان کو ابواب میں ترتیب دے سکیں۔ اس فیصلے کے نتیجے میں پیدا ہونے والی مشکلات کی طرف کسی کی نظر نہ گئی۔ اوّل تو یہ بات قابل غور تھی کہ اندھا دھند نقل

کرنے کے نتیجے میں غلطیاں در آئیں گی۔ پروف ریڈنگ کی طرف کسی نے توجہ نہ دی تھی۔ پھر سب طالب علم عربی زبان سے کماحقہ واقف نہ تھے۔ میرا ہم نام کلاس فیلو عربی سے بالکل نابلد تھا اس لیے جتنی دیر میں وہ ایک حدیث درج کرتا تھا میں اتنی دیر میں دس حدیثیں نقل کر لیتا تھا۔ پھر یہ بھی تھا کہ ہم لوگ صبح سے شام تک یہ کام نہ کر سکتے تھے۔ اس لیے دو چار دنوں کے اندر حدیثوں کی تعداد مقرر کر لی گئی، جو ہر کسی کو نقل کرنی ہوتی تھیں۔ اس فیصلے کے نتیجے میں میرے لیے آسانی پیدا ہو گئی، کیونکہ میں اپنا کام دو تین گھنٹوں میں ختم کر لیتا تھا۔ اس کے بعد ہم پر کوئی پابندی نہ تھی۔ میں نے ایف اے کا امتحان دینے کی ٹھان رکھی تھی اس لیے اس کے لیے مقرر کردہ کورس کی کتابیں پڑھنے بیٹھ جاتا تھا۔ یوں بھی ہمارا تعلیمی پروگرام روک دیا گیا تھا۔

پھر ایک رات جامعۃ المبشرین کے آفس میں ڈاکا پڑا۔ دلچسپ امر یہ تھا کہ چوروں نے تمام الماریاں چھان ماری تھیں مگر اپنے ساتھ کچھ بھی نہیں لے کر گئے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ کسی ایسی چیز کی تلاش میں تھے جو ان کو نہیں مل سکی تھی۔ اگلے روز ذمہ دار حضرات اس نتیجے پر پہنچے کہ چوری کے پیچھے عبدالمنان عمر کا ہاتھ تھا جو یہ چاہتے تھے کہ مسند احمد بن حنبلؒ کا واحد نسخہ اُٹھا لیا جائے۔ گویا نہ ہوگا بانس اور نہ بجے گی بانسری۔ اس لیے ہمیں بہت محتاط ہونے کی ہدایت کر دی گئی بلکہ فیصلہ ہوا کہ اس پروجیکٹ پر کام کرنے والے سارے عملے کو ربوے سے باہر کسی پوشیدہ جگہ پر بھیج دیا جائے تاکہ چوری چکاری کا امکان نہ رہے۔ مولوی خورشید احمد شاد نے کہا کہ وہ چاہتے ہیں کہ اپنے گروپ سمیت مری چلے جائیں، جبکہ دوسرے گروپ کے انچارج مولوی محمد احمد ثاقب نے لاہور کا انتخاب کیا۔ میں دوسرے گروپ میں تھا، اس لیے لاہور کے لیے روانہ ہو گیا۔ میں نے اس وقت تک لاہور نہیں دیکھا تھا۔ گویا لاہوریوں کے الفاظ میں ابھی جمنا ہی نہیں تھا۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ میرا گائیڈ لاہور میں جامعہ احمدیہ کا ایک سابق طالب علم حافظ محمد اعظم تھا جو نابینا تھا۔ اس نے مجھے لاہور کے مال روڈ کی سیر کرائی۔ وہ مجھے بتاتا جاتا تھا کہ ہمارے دائیں ہاتھ پر فلاں بلڈنگ ہے اور بائیں ہاتھ پر فلاں۔ اور اگلے چوک پر ہمیں فاطمہ جناح باغ جانے کے لیے بائیں ہاتھ کی طرف مڑنا ہوگا۔ وہ لاہور کے ٹریفک میں بہت اطمینان سے گھومتا پھرتا تھا جبکہ میں پہلی بار ایک بڑے شہر کی گہما گہمی سے دوچار ہو رہا تھا۔ راولپنڈی، جہاں کا میں رہنے والا تھا، اس زمانے میں لاہور کے مقابلے میں ایک چھوٹا سا سویا ہوا سا قصبہ تھا۔ برسوں بعد مجھے جرمن اورینٹ انسٹیٹیوٹ میں ایک نابینا تیونسی سکالر سے واسطہ پڑا جو عارضی طور پر وہاں پر آیا ہوا تھا۔ میں دوپہر کے وقفے میں کھانا کھانے کی خاطر باہر جا رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ وہ بھی دروازے سے نکل رہا ہے۔ میں نے پوچھا کہ اسے کہاں جانا ہے

اور اگر وہ چاہے تو میں اس کو راستہ دکھانے کے لیے اس کے ساتھ چلوں گا۔ اس نے کہا کہ وہ یونیورسٹی کے کیفے ٹیریا جانا چاہتا ہے۔ میں اس کے ساتھ وہاں تک گیا۔ اسے پتا تھا کہ مجھے ایک دوسرے ریستوراں جانا تھا اس لیے جب ہم کیفے ٹیریا میں پہنچے تو اس نے کہا: آپ بیشک مجھے یہاں پر اکیلا چھوڑ جائیں، واپسی کا راستہ میں نے نوٹ کر لیا ہے۔ میں اکیلا واپس آ جاؤں گا۔ میں حیران ہوا کہ صرف ایک بار اسے راستہ دکھانا کافی تھا جبکہ میرے دوست سیّد احمد سعید ہمدانی ہمبرگ آئے تو مجھے راستہ دکھانے کے لیے بار بار ان کے ساتھ جانا پڑتا تھا۔ وہ ہفتے بھر میں اس قابل نہ ہوئے کہ اکیلے اپنی رہائش گاہ سے اندرون شہر جا سکیں یا میرے انسٹیٹیوٹ تک پہنچ سکیں جبکہ انھیں راستے میں صرف ایک دو بار مڑنا پڑتا تھا۔ حافظ محمد اعظم نے مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا تھا اور اس زمانے میں غالباً ایم اے کی تیاری کر رہا تھا۔ اپنی روزی وہ ٹیوشن پڑھا کر کماتا تھا۔ آگے چل کر اس کو پشاور میں اندھوں کے ایک تعلیمی ادارے میں پروفیسر شپ مل گئی تھی۔

لاہور کے اس سفر کی یادگار یہ امر بھی تھا کہ سمیع اللہ قریشی کی دعوت پر، جو وہاں پر بی ٹی کرنے کے سلسلے میں مقیم تھا، میں زندگی میں پہلی بار فلم دیکھنے کے لیے ایک سینما ہاؤس میں گیا تھا۔ جماعت احمدیہ کے اراکین کو 1934ء سے فلم دیکھنے کی ممانعت کر دی گئی تھی، اس کے باوجود ہم نے لاہور میں ایک انگریزی فلم دیکھی تھی جس میں جینا لولو برجیڈا نے لیڈنگ رول ادا کیا تھا اور اس کی تصویر دیکھ کر سمیع اللہ اس پر دل و جان سے عاشق ہو چکا تھا۔ فلم کا نام تھا:

The Hunchback of Notre Dame

مسند احمد بن حنبلؒ کی تمام جلدوں کی نقل کا کام دنوں کی بجائے مہینوں پر پھیلتا چلا گیا۔ تبویب کی سکیم بنانے والوں نے کہا تھا کہ سارا کام دو تین ماہ میں اختتام کو پہنچ جائے گا۔ آخرکار جب ساری کتاب نقل ہو چکی تو ہمارا کام ختم ہو گیا اور احادیث کی تبویب کا کام ایک بورڈ کے سپرد کر دیا گیا جس کے اہم رکن مفتی سیف الرحمٰن اور مولوی خورشید احمد شاد تھے۔ ان لوگوں نے مزید دو تین سال لگا دیے۔ تب کہیں جا کر پہلی جلد ''کتاب الصلوٰۃ'' چھاپی جا سکی۔ مجھے علم نہیں ہے کہ یہ کام آگے چلایا گیا یا نہیں۔ قرین قیاس ہے کہ پہلی جلد چھپ جانے کے بعد مسودہ کہیں غائب کر دیا گیا ہوگا۔ یوں بھی اس دوران میں مرزا بشیرالدین محمود احمد پر فالج کا حملہ ہو چکا تھا اور عبدالمنان عمر جماعت ربوہ سے کٹ کر لاہوری جماعت میں جا ملے تھے (تاہم عبدالمنان عمر صاحب نے اپنے خط بمطابق 15 جون 1993ء مجھے لکھا تھا: ''قریباً ربع صدی سے ہمارا جماعت ربوہ یا جماعت لاہور کی تنظیموں سے کوئی تعلق نہیں۔'') گویا ان کی طرف سے مرزا ناصر احمد کی خلافت کو کوئی خطرہ نہ رہ گیا تھا۔ دلچسپ

امر یہ ہے کہ مسند احمد بن حنبلؒ کی تبویب کا کام اس سے قبل مصری عالم احمد عبدالشاکر کر چکے تھے اور ان کی کتاب مکے کے ایک پبلشر چھاپ رہے تھے۔ اس زمانے میں چھپ جانے والی چودہ جلدیں ربوہ کی خلافت لائبریری میں موجود تھیں۔ اس وجہ سے ربوہ میں کیے جانے والے کام کا جواز ختم ہو جاتا تھا مگر وہاں پر مقصد علمی کام کرنا تو تھا ہی نہیں، بس عبدالمنان عمر کے کام کی اہمیت کو گھٹانا تھا۔

مرزا حنیف احمد اس دوران میں تعلیم الاسلام کالج ربوہ کی یونین کے صدر بن گئے تھے اور چاہتے تھے کہ ان کی صدارت کے زمانے میں علمی مذاکرات کا سلسلہ شروع کیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے ہماری ادیبوں کی ٹولی کو ایک شبینہ محفل میں مقالات پیش کرنے کی دعوت دی۔ میرا مقالہ عربی شاعری کے بارے میں تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ سمیع اللہ قریشی اور پرویز پروازی نے کس بارے میں لکھا تھا۔ ہماری توقعات کے برعکس ربوے کے جملہ ادب نواز اس روز کالج کے ہال میں جمع تھے۔ بالخصوص اس محفل میں مستورات کی گیلری کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ میرے مقالے پر، جو بعد میں ''قندیل'' لاہور میں چھپا، غیر معمولی طور پر بہت داد دی گئی۔ جماعتِ احمدیہ کی مجالس میں مردوں کو تالیاں بجانے کی اجازت نہیں البتہ عورتیں تالیاں بجاتی ہیں۔ اس روز اتنی تالیاں بجیں کہ مردوں کی طرف سے پکارے جانے والے مرحبا کی آوازیں دب گئیں۔ محفل کے خاتمے پر جب معززین اور مقررین کو چائے اور پیسٹری کی میز کی طرف بلایا گیا تو سب سے پہلے پرنسپل جامعہ احمدیہ میر داؤد احمد میری طرف آئے۔ انھوں نے میرے مقالے کی تعریف کی مگر محفل میں ٹوپی کے بغیر آنے پر جرمانہ بھی کر دیا۔ جامعہ احمدیہ کے طلبہ کو سرِعام ننگے سر پھرنے کی ممانعت تھی۔ جو کوئی پکڑا جاتا تھا اس کو چار آنے جرمانہ ادا کرنا پڑتا تھا۔

ایک روز ایک بڑی خوبصورت آٹھ نو سالہ بچی میری کھڑکی کے سامنے آ کر رکی۔ اس نے کہا: باجی نے پوچھا ہے کہ کیا آپ ان کے لیے کالج میں ہونے والے تقریری مقابلے میں پیش کرنے کی خاطر تقریر لکھ دیں گے؟ میں نے کہا: ضرور لکھ دوں گا۔ مگر مجھے کچھ پتا نہیں کہ تمھاری باجی کون ہیں اور ان کو کس موضوع پر تقریر کرنی ہے۔ بچی نے جواب دیا: میری باجی ہر روز آپ کی کھڑکی کے سامنے سے گزرتی ہیں۔ آپ نے ان کو ضرور دیکھا ہوگا۔ نام بتانے کی مجھے اجازت نہیں ہے۔ تقریر کے لیے موضوع آپ خود چن سکتے ہیں۔ میں کل تقریر لینے کے لیے آؤں گی۔ میں نے دل میں سوچا کہ کالج کی شبینہ محفل کا یہ پہلا پھل ہے۔ میری کھڑکی کے سامنے سے کالے برقعوں میں ملبوس لڑکیوں کی ڈاریں گزرا کرتی تھیں جن کو دیکھنے کے لیے میرے ادیب دوست کالج میں چھٹی ہونے کے وقت پر جمع ہو جایا کرتے تھے مگر ہم لوگ بہت شریفانہ انداز میں لڑکیوں کو تاڑتے تھے۔ ہم

میں سے کسی نے نہ کبھی کوئی آوازہ کسا تھا نہ آنکھ ماری تھی۔ بس ہمارا دوست سعید رحمانی، جو حال میں ہی اڈیٹر جنرل کے عہدے سے ریٹائر ہوا ہے، وہ ان دنوں نیا نیا تعلیم الاسلام کالج میں انگریزی کا پروفیسر لگ کر آیا تھا اور ہم سے زیادہ بولڈ تھا۔ وہ پروازی کا تعلیم الاسلام ہائی سکول میں کلاس فیلو رہ چکا تھا اور اس نے میٹرک کے امتحان میں یونیورسٹی میں دوسری پوزیشن حاصل کی تھی۔ اوّل ان کا دوسرا کلاس فیلو منور چونڈا آیا تھا جس کے بارے میں بعد میں کچھ سننے میں نہیں آیا کہ وہ کدھر گیا اور اس نے علمی میدان میں کیا فتوحات کیں۔ سعید رحمانی میرے کمرے میں بیٹھ کر بلھے شاہ کی کافی ''ویہڑے آوڑ ساڈے بھانویں جان نہ جان'' گایا کرتا تھا مگر ربوے کی لڑکیاں بڑی پردہ دار ہوا کرتی تھیں، وہ ہمیں گھاس بھی نہیں ڈالتی تھیں۔ بس شام کو وہاں سے گزرنے والیاں جب میرے میز پر مٹی کے تیل کے دو لیمپ رکھے ہوئے دیکھتی تھیں تو کچھ اس قسم کے فقرے سننے میں آتے تھے کہ ساٹھ واٹ کے بلب کے برابر روشنی تو ہو جاتی ہوگی۔ پھر یہ ہونے لگا کہ اس بچی کی باجی کھڑکی کے سامنے سے گزرتے ہوئے پردے کا پلو سرکا کر اپنے موہنے چہرے کا دیدار کرانے لگی۔ میں اس عنایت پر دل بہلا لیتا تھا اور جب بھی تقریر کا مطالبہ آتا تھا تو اپنے سارے ضروری اور غیر ضروری کام روک کر اس کے لیے تقریر لکھنے بیٹھ جاتا تھا مگر میں نے کبھی اس کے ساتھ بات کرنے کی کوشش نہ کی نہ ہی اس نے کبھی مجھے کوئی رقعہ بھیجا۔

تقریریں لکھ کر دینے کے مطالبات لڑکوں کی طرف سے بھی آتے تھے بلکہ بعض اوقات باقاعدہ طور پر میرے جاننے والوں کی سفارشوں کے ساتھ آتے تھے۔ مولوی بشارت احمد بشیر انجمن تحریکِ جدید کے نائب وکیل التبشیر تھے، ایک بار مجھے ان کا رقعہ ملا کہ میرے سالے ہدایت اللہ کے لیے، جو اپنے سکول کے تقریری مقابلے میں شامل ہونا چاہتا ہے، ایک تقریر لکھ کر بھیجیں۔ ایک بار تو حد ہی ہو گئی۔ ایک لڑکے کا خط منٹگمری سے آیا۔ وہ اس سے قبل ربوے میں طالب علم رہ چکا تھا۔ اس نے لکھا کہ اسے ویسی تقریر لکھ کر بھیجوں جیسی میں قاضی نعیم کے لیے لکھا کرتا تھا۔

ہوسٹل میں قیام کے دنوں کی ایک اور دوستی کا ذکر بھی ناگزیر ہے۔ ہر رات کو عین دس بجے میری کھڑکی پر دستک ہوتی تھی اور میں کتابیں ٹھپ کر گیٹ کی طرف چل دیتا تھا جہاں پر مرزا خلیل احمد میرے انتظار میں کھڑے ہوتے تھے۔ وہ مرزا بشیر الدین محمود احمد کے صاحبزادے اور حکیم مولوی نور الدین خلیفہ اوّل کے نواسے تھے۔ ان کا گھر ہوسٹل کے بالمقابل تھا اور وہ اپنے گھر کی کھڑکی میں سے میرے کمرے میں جھانک کر دیکھ سکتے تھے۔ انھیں پتا تھا کہ میں سارا دن کتابوں میں غرق رہتا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ مجھے ایک دو گھنٹوں کے لیے کتابوں کے چنگل سے نجات دلانے کے لیے

آتے ہیں مگر حقیقت اس سے تھوڑی مختلف تھی۔ میں جانتا تھا کہ راتوں کی مٹر گشت مرزا خلیل احمد کے لیے بہت اہمیت رکھتی تھی۔ وہ سارا دن اپنے گھر میں گھسے خدا جانے کیا کرتے رہتے تھے۔ میں نے انھیں کبھی دن کے وقت کہیں پر آتے جاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ کبھی ان کو نماز کی ادائیگی کے لیے مسجد میں دیکھا ہو، جو ان کے گھر کے پہلو میں واقع تھی۔ ان کے کمرے کی کھڑکی کے پردے دن چڑھے تک بند رہتے تھے۔ مجھے پتا تھا کہ وہ گیارہ بارہ بجے اٹھ کر ناشتہ کرتے تھے۔ ایک دو بار وہ دوپہر کے وقت سونے کے لباس میں ملبوس مجھ سے چائے کی پتی مانگنے کے لیے آئے تھے جو ان کے گھر میں ختم ہوگئی تھی اور نوکر بازار سے لانا بھول گیا تھا۔ ان کے اس طرح گھر میں بند ہو کر رہنے کے پیچھے یہ چیز پوشیدہ تھی کہ ان کی بیوی نے، جو ان کے چچا مرزا بشیر احمد کی بیٹی تھی، خلع لے لی تھی۔ وجہ اس کی یہ بیان کی جاتی تھی کہ ان کا رشتہ لاولد رہا تھا۔ ان کی بیوی ہر قیمت پر بچے جننا چاہتی تھی۔ اس کی دوسری شادی خاندان سے باہر ہوئی تھی اور وہ صاحب اولاد بنی تھی۔ اس چیز نے مرزا خلیل احمد کی خودداری پر ایسا گہرا زخم لگایا تھا کہ وہ اس کے بعد کسی راہب کی طرح گھر میں بند ہو کر رہ گئے تھے۔ صرف رات کے وقت باہر نکلتے تھے اور ربوے کی سنسان گلیوں میں گھومتے پھرتے تھے۔ اس کہانی کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ مرزا خلیل احمد کی بڑی بہن امتہ القیوم ان کی سابقہ بیوی کے بڑے بھائی مرزا ایم ایم احمد (مرزا مظفر احمد) کے ساتھ بیاہی ہوئی تھی اور ان کا رشتہ بھی لاولد رہا تھا۔ ان کو بھی یقیناً اس بات کا رنج ہوگا مگر ان کے بارے میں سننے میں نہ آیا کہ وہ اس وجہ سے ایک دوسرے سے جدا ہونے کی بابت سوچ رہے ہیں۔

عبدالمنان عمر، جن کو خلافت سے دور رکھنا مقصود تھا، وہ مرزا خلیل احمد کے، جو اس زمانے میں اپنی دوسری بہن امتہ الرشید زوجہ میاں عبدالرحیم احمد (وکیل التعلیم) کے ساتھ رہتے تھے، ماموں تھے۔ عبدالمنان عمر کی بہن امتہ الحئی کے ساتھ مرزا بشیر الدین محمود احمد نے خلیفہ بنتے ہی اس لیے شادی کی تھی کہ اس طرح ان کا خلافت پر دعویٰ مضبوط ہوتا تھا۔ وہ اگر ایک طرف بانی جماعت احمدیہ مرزا غلام احمد قادیانی کے فرزند تھے تو دوسری طرف خلیفہ اوّل حکیم مولوی نورالدین کے داماد بھی تھے۔

ہماری شبینہ سیر و سیاحت کا آخری اڈہ گول بازار کا ایک چائے خانہ تھا جو ہمارے انتظار میں آدھی رات تک کھلا رہتا تھا۔ جب ہم چائے پی کر اٹھتے تھے تو خواجہ عبداللہ دکان بند کر دیتا تھا۔ مرزا خلیل احمد کے گھر کے آس پاس ہمیں اکثر پُراسرار افراد نظر آیا کرتے تھے جن کو وہ نظارت امورِ عامہ کے ''لونڈے'' کا نام دیتے تھے۔ یہ لوگ ساری رات ان کے گھر پر پہرہ دیتے تھے کیونکہ ''قصرِ خلافت'' کو شبہ تھا کہ رات کے اندھیرے میں عبدالمنان عمر اپنے بھانجے اور اس کی بہن سے ملنے کے

لیے آتے ہوں گے۔ عام طور سے مرزا خلیل احمد بہت محتاط تھے مگر میرے سامنے کبھی کبھی وہ اپنے رنج و غصّے کا اظہار کر دیا کرتے تھے۔ ہماری سیر کے راستے میں نواب محمد احمد (مرزا بشیر الدین محمود احمد کی بہن مبارکہ بیگم کا بیٹا) کا بنگلہ آتا تھا جہاں پر "خاندانِ نبوت" کے لڑکے لڑکیاں مل کر موسیقی سنتے اور ڈانس کیا کرتے تھے۔ چونکہ اس زمانے میں یہ بنگلہ بیرونی چار دیواری کے بغیر تھا اس لیے جو کوئی وہاں سے گزرتا تھا وہ ان لوگوں کو رنگ رلیاں مناتے اور ہلڑ بازی کرتے ہوئے دیکھ سکتا تھا۔

ان دنوں ربوے میں ایک رپورٹ نے بہت ہلچل مچا رکھی تھی جو کسی نے لندن کے سفر سے واپسی پر لکھی اور مرزا بشیر الدین محمود احمد کو بھیج دی تھی۔ اس میں بیان کیا گیا تھا کہ ان کا صاحبزادہ مرزا طاہر احمد، جو آگے چل کر خلیفۃ المسیح الرابع بنا، اور اس کا ساتھی میر محمود احمد مسجد فضل لندن کے فلیٹ میں راتوں کو پارٹیاں دیتے ہیں جن میں موسیقی سنی جاتی ہے، شراب چلتی ہے اور لڑکے لڑکیاں مل کر ڈانس کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں تفتیش کی خاطر ایک کمیشن بٹھایا گیا جس نے تمام الزامات کو غلط قرار دیا اور دونوں صاحبزادگان کو بری کر دیا۔ میں نے مرزا خلیل احمد سے پوچھا کہ وہ اپنے والد ماجد کے ساتھ لندن جانے والے گروپ میں شامل تھے اور وہاں کے حالات سے خوب واقف ہیں، کیا وہ سمجھتے ہیں کہ یہ رپورٹ بالکل بے بنیاد ہے؟ اس پر انھوں نے جواب دیا: تم ہر روز میرے ساتھ نواب محمد احمد کے بنگلے میں منائی جانے والی رنگ رلیاں دیکھتے ہو، کیا تم تصور نہیں کر سکتے کہ طاری (مرزا طاہر احمد کا گھریلو نام) لندن میں عیش نہیں کرتا ہوگا۔ اس بات کی تصدیق چند برس ہوئے مرزا طاہر احمد نے خود کر دی۔ انھوں نے ایک مجلس میں، جو احمدیہ ٹیلی ویژن پر ساری دنیا میں دیکھی گئی، بیان کیا کہ جب وہ طالب علمی کے زمانے میں لندن میں مقیم تھے تو اپنے انگریز دوستوں کے ساتھ پوری پوری رات جاری رہنے والی مجلسوں میں باتیں کیا کرتے تھے۔ جو کوئی یورپ کے حالات سے واقف ہے اس کو پتا ہے کہ یہ رات رات بھر جاری رہنے والی مجلسیں شبینہ پارٹیاں ہوتی ہیں جن میں موسیقی بجائی جاتی ہے، شراب پانی کی طرح بہتی ہے اور ڈانس ہوتا ہے۔ عام طور سے مشہور تھا کہ مرزا طاہر احمد اور میر محمود احمد لندن کے سکول آف اورینٹل اینڈ افریقن سٹڈی میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ مرزا خلیل احمد نے اس بارے میں مجھے اس وقت کہہ دیا تھا: یہ لوگ وہاں پر عیش کر رہے ہیں اور تم دیکھ لو گے کہ وہ بی اے کی ڈگری بھی لے کر نہیں آئیں گے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ اوپر والی محفل میں مرزا طاہر احمد نے خود بیان فرمایا تھا کہ وہ درسی تعلیم سے زیادہ معاشرتی مطالعے میں دلچسپی رکھتے تھے اس لیے کلاسیں اٹنڈ نہیں کرتے تھے بلکہ یورپ کی سیر و سیاحت کو زیادہ اہم سمجھتے تھے۔

میرے بارے میں یہ افواہ گرم تھی کہ مجھے بہت جلد کسی بیرونی ملک میں مبلغ بنا کر بھیجا جا

رہا ہے مگر کوئی نہیں جانتا تھا کہ لاٹری کس ملک کے نام پر پڑے گی۔ پہلی اطلاع یہ تھی کہ مجھے کینیا بھیجا جائے گا جہاں سے میرے لیے ویزا منگوایا جا رہا تھا۔ پھر اچانک جرمن مشن میں ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ ہمبرگ مشن کے نائب مبلغ مرزا لطف الرحمٰن کی تبدیلی ٹوگو کر دی گئی اور ان کی جگہ پر میری تقرری کا فیصلہ ہوا۔ البتہ اس وقت تک میرا پاسپورٹ نہیں بنا تھا۔ اس زمانے میں پاسپورٹ بننے پر ایک ڈیڑھ سال لگ جاتے تھے اور عام طور سے رشوت دینی پڑتی تھی۔ جب نائب وکیل التبشیر حسن محمد خان عارف، جن کے سپرد پاسپورٹ بنوانے کی ذمے داری تھی، پاسپورٹ فارم پر میرے کوائف لکھنے بیٹھے تو میں نے ان سے کہا کہ میرے عزیز وزارت خارجہ میں ملازم ہیں اس لیے اگر مجھے ایک ماہ کے لیے کراچی بھیج دیا جائے تو میں وہاں پر آسانی کے ساتھ پاسپورٹ بنوا سکتا ہوں۔ وہ یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور ان کی سفارش پر مجھے ایک ماہ کے لیے کراچی جانے کی اجازت مل گئی۔

کراچی میں ہمارے قیام کا انتظام وہاں کی مقامی جماعت نے کر رکھا تھا مگر میں نے بھائی جان عظیم کے ہاں رات گزارنے کو ترجیح دی۔ اگلی صبح البتہ مجھے اس فیصلے پر افسوس ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہمیں ہوائی اڈے کے لیے ٹیکسی نہ ملتی تھی۔ سب ٹیکسیاں پیچھے سے بھری ہوئی آتی تھیں۔ مجھے سڑک پر کھڑے ایک گھنٹہ ہو چلا تھا، جب میں نے زندگی میں پہلی بار ہچ ہائیکنگ کرنے کی ٹھانی۔ چند منٹوں میں ایک کار رک گئی جس کے ڈرائیور کو میں نے اپنی مشکل بتائی اور اس سے درخواست کی کہ وہ مجھے اگلے ٹیکسی سٹینڈ تک لے چلے ورنہ خطرہ ہے کہ میں اس روز ہوائی جہاز نہ لے سکوں گا۔ وہ شریف آدمی مجھے لفٹ دینے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس نے مجھے ٹیکسی سٹینڈ پر اتارا جہاں سے مجھے آسانی کے ساتھ ٹیکسی مل گئی اور میں وقت پر ہوائی اڈے پر پہنچ سکا۔ اس طرح میں 21 اکتوبر 1960ء کو پاکستان کو خیر باد کہہ کر اسی رات کو ہمبرگ میں پہنچا۔

میرے مہمان نواز جماعتِ احمدیہ کے ہمبرگ مشن کے مبلغ چوہدری عبداللطیف تھے جو 1948ء سے جرمنی میں مقیم تھے۔ میرے گھنٹی بجانے پر انھوں نے دروازہ کھولا تو میرے سامنے ایک چھوٹے قد اور اکہرے بدن والا شخص کھڑا تھا جس کی آنکھوں میں کوئی چمک نہیں تھی، نہ ہی اس کے لب و لہجے میں خلوص کی لہر تھی۔ انھوں نے اس امر پر قدرے ناگواری کا اظہار کیا کہ میں ہوائی اڈے سے ٹیکسی پر آیا تھا جب کہ انسان وہاں سے بس اور انڈر گراؤنڈ میں سفر کر سکتا ہے، جس پر بہت کم پیسے لگتے ہیں۔ مجھے ان کی بات پر حیرت ہوئی کیونکہ مجھے کہا گیا تھا کہ وہ مجھے ہوائی اڈے پر لینے کے لیے آئیں گے مگر ان کا عذر تھا کہ ان کو علم نہیں تھا کہ میں کس جہاز میں آ رہا ہوں۔ اگر اتفاقیہ طور پر میرے پاس مشن کا ایڈریس نہ ہوتا تو مجھے وہاں تک پہنچنے میں مشکلات پیش آ سکتی تھیں۔ چونکہ آدھی

رات کا وقت تھا اس لیے مجھے میرا کمرہ دکھانے کے لیے موصوف بنفسِ نفیس مشن ہاؤس کے تہ خانے میں اترے جس میں سے ہمس آ رہی تھی۔ تہ خانے میں چار کمرے تھے جن میں سے ایک سٹور کے کام آتا تھا۔ دوسرا کمرہ مہمانوں کے رہنے کے لیے تھا مگر ایسی حالت میں تھا کہ محکمہ صحت کو اس کے بارے میں پتا چل جاتا تو وہاں پر کسی کو ٹھہرانے کی اجازت نہ مل سکتی تھی۔ میری رہائش کے لیے تیسرا کمرہ تھا جس کی دیواروں اور چھت پر پلاسٹک کی فوم لگا کر تہ خانے کی سردی کو کم کرنے کی ناکام کوشش کی گئی تھی۔ تہ خانے میں ہیٹنگ کا انتظام نہیں تھا۔ صرف میرے کمرے میں بجلی کا ہیٹر رکھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ والا کمرہ بیک وقت باورچی خانے اور حمام کے کام آتا تھا۔ باتھ روم البتہ صرف اوپر کی منزل پر پایا جاتا تھا۔ اس کمرے کی نصف کھڑکی، جو میرے کندھوں کی اونچائی میں شروع ہوتی تھی اور نصف میٹر سے زیادہ نہ تھی، باغ کی طرف کھلتی تھی۔ چونکہ ہم زیرِ زمین تھے اس لیے اس کھڑکی کے سامنے ایک گڑھا سا کھدا ہوا تھا جس میں سے روشنی چھن کر کمرے میں آتی تھی۔ البتہ آسمان کو دیکھنے کے لیے انسان کو فرش پر لیٹنا پڑتا تھا۔ چارپائی شاید جنگ سے پہلے کی تھی جو کروٹ بدلنے پر چرچراتی تھی۔ میں بے حد تھکا ہوا تھا اس لیے لیٹتے ہی سو گیا۔ البتہ فجر کی نماز کے وقت میری آنکھ کھل گئی اور میں نے اوپر جا کر مسجد میں اذان دے دی۔ میرا خیال تھا کہ انسان مسجد میں رہتا ہو تو پھر ساری نمازیں باجماعت ادا کی جانی چاہئیں مگر یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ چوہدری عبداللطیف شب خوابی کے کپڑوں پر لمبا کوٹ پہنے ہوئے باہر نکلے اور گلہ کیا کہ میں نے ان کو بے وقت جگا دیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ صبح کی نماز آپ اکیلے ادا کر لیا کریں۔

آٹھ بجے ناشتہ کر کے ہم دفتر میں جا کر بیٹھے۔ لطیف صاحب ایک بھاری بھرکم رائٹنگ ٹیبل کے پیچھے اور میں ان کے بالمقابل ایک چھوٹی میز کے پہلو میں۔ مجھے بہت کچھ جاننے کا شوق تھا اس لیے سوالات کا سلسلہ میری طرف سے چلتا رہا مگر لگتا تھا کہ وہ کسی سوال کا جواب کھلے بندوں دینے کے لیے تیار نہ تھے۔ وہ بارہ برسوں سے جرمنی میں تبلیغ کر رہے تھے اور میں ''الفضل'' میں ان کی فتوحات کا حال پڑھتا رہا تھا اس لیے مجھے یہ جاننے کا شوق تھا کہ کتنی نیک روحیں ان کے ہاتھ پر بیعت کر کے جماعت میں داخل ہوئی تھیں۔ دیر تک دائیں بائیں پہلو بدلنے کے بعد آخر ان کو کہنا پڑا کہ جرمنی بھر میں ایک سو افراد ہوں گے۔ ان میں سے ہمبرگ یا گرد و نواح میں کتنے رہتے ہیں؟ مگر وہ اس سوال کا جواب دینے کے لیے تیار نہ تھے۔ دوسری عالمگیر جنگ کے دوران ہمبرگ میں نوجوانوں کی ایک جماعت نے اپنے طور پر اسلام کا مطالعہ کر کے ایک انجمن بنائی تھی۔ ان کی طرف سے ایک خط قادیان بھی گیا تھا کہ ان کو اسلام کے بارے میں لٹریچر بھیجا جائے۔ یہی وجہ تھی کہ جب

جنگ کے بعد جماعتِ احمدیہ نے یورپ کے ممالک کے لیے مبلغوں کی ایک پوری جماعت روانہ کی تو ان میں سے ایک کو ہمبرگ جا کر مشن کھولنے کا حکم ملا تھا۔ ابتدا میں شیخ ناصر احمد کو بھیجا گیا تھا مگر جلد ہی ان کی تبدیلی سوئٹزر لینڈ کر دی گئی تھی اور ان کی جگہ پر لطیف صاحب کو بھیجا گیا مگر جرمن نومسلموں اور جماعت احمدیہ کے درمیان بہت جلد اختلافات پیدا ہو گئے تھے جن کے سبب وہ لوگ احمدیہ مشن سے الگ ہو گئے تھے۔ ان کی تعداد بیس کے لگ بھگ تھی۔ اب لطیف صاحب مجھے بتا رہے تھے کہ ہمبرگ کے مشن کے ساتھ تعلق رکھنے والوں کی تعداد بیس کے قریب تھی مگر جب تک میں مشن سے وابستہ تھا میری ملاقات آٹھ افراد سے زیادہ کے ساتھ نہیں ہوئی۔ البتہ جمعے کی نماز پڑھنے کے لیے پندرہ بیس پاکستانی اور ترک مسلمان مسجد میں آ جاتے تھے۔ مگر یہ لوگ جماعتِ احمدیہ کے ممبر نہ تھے۔ اس زمانے میں ابھی ہمبرگ میں کوئی دوسری مسجد موجود نہ تھی۔

مجھے بتایا گیا کہ مجھے گزارے کے لیے ماہوار پندرہ پونڈ ملیں گے۔ یہ رقم اس زمانے میں 165 جرمن مارک کے برابر تھی، جس میں سے مجھے پندرہ مارک چندے کے دینے ہوں گے اور اگر میں کھانا ان کے ساتھ کھانا چاہوں تو مجھے 75 مارک اس کے لیے ادا کرنے ہوں گے۔ باقی رقم سے مجھے اپنے لیے کپڑے اور دیگر ضرورت کی اشیا خریدنی ہوں گی۔ ہیلتھ انشورنس کا کوئی انتظام نہیں تھا اور بیماری کی صورت میں مجھے اسی رقم میں سے اخراجات ادا کرنے ہوں گے۔

دوسرے روز لطیف صاحب میرے لیے کچھ اشیاء خریدنے کے لیے مجھے اپنے ساتھ شہر لے کر گئے۔ ہمبرگ کے موسم کے پیشِ نظر ہم نے ایک چھتری خریدی اور ایک اوور کوٹ۔ ان پر اٹھنے والے اخراجات مجھے پیشگی ملنے والی رقم سے ادا کیے گئے۔ گویا پورے مہینے کے لیے اب میرے پاس ایک مارک بھی نہ تھا۔ یہ پہلی اور آخری بار تھی کہ لطیف صاحب مجھے شہر دکھانے کے لیے لے کر گئے تھے۔ یوں بھی ان کی کوشش ہوتی تھی کہ مجھے کچھ نہ دکھایا جائے اور کسی قسم کی معلومات نہ دی جائیں۔ مجھے ایک ایک بات کرید کرید کر پوچھنی پڑتی تھی۔ اس بات کا بھی انھوں نے کوئی جواب نہ دیا کہ مرزا لطف الرحمٰن کو جرمنی سے ٹوگو تبدیل کرنے کی وجہ کیا تھی۔ انھیں جرمنی میں آئے ہوئے ڈیڑھ سال کا عرصہ ہوا تھا اور انھوں نے اس دوران میں جرمن زبان سیکھی تھی۔ میرے نزدیک یہ امر جماعت اور مشن کے مفاد کے خلاف تھا کہ ایک مبلغ کو، جس نے محنت کر کے جرمن سیکھی تھی، ایک ایسے ملک میں بھیج دیا جائے جہاں پر یہ زبان اس کے کام نہیں آ سکتی۔ گویا ڈیڑھ سال کی محنت رائیگاں گئی تھی۔ اس کے علاوہ ہمبرگ کا مشن اس کی صلاحیتوں سے محروم کر دیا گیا تھا۔ لطیف صاحب نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ ان کا اس فیصلے سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ یہ فیصلہ وکالت التبشیر کا تھا

اس لیے اس کی تعمیل کرنی پڑی تھی۔ مگر مجھے بعد میں علم ہوا کہ یہ فیصلہ ان کے ایما پر ہوا تھا۔

جب میں نے لطیف صاحب سے مشن میں میرے سپرد کیے جانے والے کام کے بارے میں پوچھا تو کہا گیا کہ آپ فی الحال زبان سیکھیں، جس کا انتظام ہمبرگ یونیورسٹی میں موجود ہے۔ البتہ اس دوران میں آپ کو مسجد کی صفائی اور باغ کی دیکھ بھال کرنی ہوگی۔ مشن کے کاموں کے سلسلے میں انھیں میری مدد کی ضرورت نہ تھی، بلکہ الٹا مجھے یہ احساس دلایا گیا کہ میں ان پر بوجھ تھا، جس کو وہ برداشت کرنے پر مجبور تھے۔ اگر یہ بات درست تھی تو پھر انھوں نے کیوں ایک مددگار بھیجے جانے کے لیے وکالت التبشیر کو لکھا تھا؟ دراصل نائب بھیجے جانے کا مطالبہ کر کے مرکز کو یہ احساس دلانا مطلوب تھا کہ جرمن مشن کامیابی کی طرف گامزن تھا۔

ہمبرگ یونیورسٹی کا سرما کا سمسٹر یکم نومبر سے شروع ہو رہا تھا۔ میں نے اپنا نام بطور مہمان طالب علم کے وہاں پر درج کرایا اور جرمن زبان کی کلاسوں میں جانے لگا، جو ہفتے میں دو روز لگتی تھیں۔ یونیورسٹی میں نام درج ہو جانے کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ دس مارک کے عوض مہینے بھر کا ٹریفک کا ٹکٹ مل جاتا تھا جس پر میں ٹراموں اور بسوں میں گھوم پھر سکتا تھا۔ میرا باقی وقت مشن ہاؤس میں گزرتا تھا جہاں پر میں صبح سے شام تک جرمن کے اسباق دہرانے میں لگا رہتا تھا۔ میں نے ایک چھوٹا سا ٹرانسسٹر ریڈیو خرید لیا تھا جو بجلی یا بیٹری کے بغیر چلتا تھا۔ اس پر میں خبریں سن لیتا تھا۔ پھر اخبار میں ان خبروں کی تفصیل ڈکشنری کی مدد سے پڑھتا تھا۔ مجھے ربوے سے روانگی کے وقت رفیق احمد ثاقب نے ایک چھوٹی سی جرمن انگریزی ڈکشنری تحفے میں دی تھی جو ہمبرگ میں میرے کام آئی۔ میرا معمول تھا کہ سات آٹھ گھنٹے لگا کر پورا اخبار پڑھ جاتا تھا۔ میں نے اپنے دل میں عہد کر رکھا تھا کہ انگریزی زبان کا اخبار نہیں خریدوں گا اور جرمن زبان پر انحصار کروں گا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ میری جرمن زبان پر گرفت دن بدن بہتر ہوتی گئی، مگر ساتھ کے ساتھ انگریزی سے دُوری پیدا ہوتی گئی۔ چنانچہ جب مجھے پروفیسر شپولر نے ڈاکٹریٹ کا مقالہ انگریزی میں لکھنے کا مشورہ دیا تو میں انگریزی سے اس قدر دور جا چکا تھا کہ مجھے انگریزی نئے سرے سے سیکھنی پڑی۔ یہاں پر میں اپنے افسانے ''کچا علم'' کا ایک اقتباس درج کر رہا ہوں جس میں تین ناموں کو درست کر دیا گیا ہے۔

''وسط دسمبر میں ڈاکٹر ہوڈوفسکی کا فون آ گیا۔ مگر چونکہ ان سے براہ راست بات نہ ہو سکتی تھی اس لیے مارگٹ ہمارے درمیان ٹیلی فون ایکسچینج کے فرائض سرانجام دے رہی تھی۔ انھوں نے پوچھا کہ کیا میں کرسمس کا تہوار ان کی فیملی کے ساتھ گزارنے کے لیے تیار ہوں۔ میری معلومات کرسمس کے بارے میں بہت محدود تھیں، البتہ میں نے سن رکھا تھا کہ جرمنی میں یہ تہوار خالص فیملی افیر

ہے، جس میں باہر کے کسی شخص کو شامل نہیں کیا جاتا۔

میں نے کہا: ''یہ تو آپ کا فیملی تہوار ہے، میں کسی دوسرے موقع پر آ جاؤں گا۔''

مگر پیشتر اس کے کہ ڈاکٹر ہوڈوفسکی میری بات کا جواب دیتے، مارگٹ نے کہا: ''ہم جرمنی میں تمہاری فیملی ہی تو ہیں۔''

واضح ہے کہ اس فقرے کے بعد میں ان کی دعوت کو رد نہ کر سکتا تھا۔

انھوں نے کہا کہ میں 24 دسمبر کی سہ پہر تک پہنچ جاؤں تو خوب رہے گا، کیونکہ اس روز ان کے بیٹے گرہارڈ کی سالگرہ ہے۔ میں نے آنے کی ہامی بھر لی، مگر مجھے بالکل پتا نہ تھا کہ مجھے گرہارڈ کے لیے سالگرہ کا کیا تحفہ لے جانا ہوگا اور کیا مجھے خاندان کے دوسرے افراد کے لیے کرسمس کے تحائف لے جانے چاہئیں یا نہیں۔

لطیف صاحب نے کہا کہ مجھے بہانہ بنا کر شامل ہونے سے انکار کر دینا چاہیے۔ ''یہ امیر لوگ ہیں، آپ ان کے لیے کیا تحفہ لے جا سکتے ہیں؟''

مجھے اس بات سے اتفاق نہ تھا۔ میں نے سوچا کوئی چھوٹی موٹی کتاب کہیں نہ کہیں سے ہاتھ لگ جائے گی۔ پھر سچ مچ سیکنڈ ہینڈ کتابوں کی ایک دکان میں مجھے بالزاک کی ایک کتاب کا جرمن ترجمہ مل گیا جس کا اس وقت تک کسی نے کور بھی نہ کھولا تھا۔ یہ کتاب، جسے دراصل میں خود پڑھنا چاہتا تھا، میں نے گرہارڈ کے لیے مخصوص کر دی۔ دیگر افرادِ خانہ کے لیے بھی اسی دکان میں نہایت عمدہ نئی نکور کتابیں کوڑیوں کے مول مل گئیں۔ سب سے بڑھ کر یہ بات تھی کہ مجھے جرمن ادیب وولفگانگ بورشرٹ کے افسانوں کا مجموعہ مل گیا۔ اس وقت مجھے ابھی پتا نہ تھا کہ بورشرٹ جنگ عظیم کے بعد پیدا ہونے والے جرمن ادب کا اولین نام تھا۔ اس کی کہانی ''اس منگل کے روز'' میرا جرمن ادب سے پہلا ترجمہ تھا جسے میں نے جرمنی میں قیام کے ابتدائی دنوں میں اردو میں ڈھالا تھا اور جسے ہفتہ وار ''قندیل'' لاہور نے خاص نوٹ دے کر چھاپا تھا۔

ڈاکٹر ہوڈوفسکی اپنی بیوی مارگٹ اور بیٹی ایویلین کی ہمراہی میں مجھے لینے کے لیے ریلوے سٹیشن پر آئے ہوئے تھے۔ ایویلین سچ مچ ایک خوبصورت گڑیا تھی۔ انھوں نے کہا:

''گھر جانے سے پہلے ہم آپ کو لیوبک کے اہم حصوں کی سیر کرا دیتے ہیں۔''

لیوبک کے بارے میں مجھے صرف اتنا پتا تھا کہ تھوماس من اس شہر کا نامور سپوت تھا۔ میں نے اس وقت تک اس کی کوئی کتاب نہیں پڑھی تھی مگر اس کے ناول ''بڈن بروک'' کے نام سے واقف تھا، جس پر اسے نوبل پرائز ملا تھا۔

ڈاکٹر ہوڈوفسکی نے کہا: ''کیوں نہ ہم اس عمارت کو دیکھتے چلیں جو''بڈن بروک'' کا لوکیل ہے اور جس میں تھوماس من کا خاندان رہائش پذیر تھا۔''

قدیمی عمارتیں، شہر کے ساتوں گرجا گھر اور زمانہ ہائے وسطیٰ کی تنگ گلیاں مجھے جادو کے زور سے بنائی ہوئی لگتی تھیں۔ پرانے وقتوں کے گھر اتنے چھوٹے تھے جیسے انسانوں کے لیے نہیں بالشتیوں کے لیے بنائے گئے ہوں۔ میں یہ جان کر حیران ہوا کہ ان میں بدستور لوگ بستے ہیں۔ ڈاکٹر ہوڈوفسکی نے مجھے اوپر کی منزلوں کی کھڑکیوں میں لگے ہوئے آئینوں کی طرف متوجہ کیا، جو اس طرح لگائے گئے ہیں کہ انسان کمرے میں بیٹھے ہوئے دیکھ سکتا ہے کہ نیچے سڑک پر سے کون گزر رہا ہے۔ انھوں نے کھڑکیوں میں رکھی ہوئی گدیاں دکھائیں، جن پر گھر کے باسی کہنیاں ٹیک کر گھنٹوں تک کھڑے رہتے ہیں اور گلی کی زندگی کا نظارہ کرتے ہیں۔

ڈاکٹر ہوڈوفسکی کا بنگلہ ایک پارک نما علاقے میں تھا جس کے پچھواڑے میں ایک ندی گزرتی تھی۔ اس سال جرمنی میں کرسمس سے پہلے ہی سردی کی لہر آ گئی تھی۔ متواتر کئی روز سے درجہ حرارت نقطۂ انجماد سے دس پندرہ ڈگری نیچے چل رہا تھا۔ میں نے بتایا کہ ہمبرگ کی جھیل آلسٹر کا پانی جمنے لگا تھا۔ ایویلین نے کہا کہ ندی پر یخ کی سطح اتنی پختہ ہو چکی ہے کہ انسان اس پر چل سکتا ہے۔ اسے امید تھی کہ وہ کرسمس کے دنوں میں اس پر سکیٹنگ کر سکے گی۔ ڈاکٹر ہوڈوفسکی نے معنی خیز نظروں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور کہا: ''کون جانتا ہے کہ اس برس سانتا کلاؤس ایویلین کے لیے کیا تحفے لائے گا؟''

اس عرصے میں ہم ان کے گھر میں داخل ہو چکے تھے۔ یورگ اور گرہارڈ دروازے پر میرا استقبال کرنے کے لیے کھڑے تھے۔

یورگ یونیورسٹی میں قانون پڑھتا تھا اور کرسمس کی چھٹیوں میں گھر آیا ہوا تھا۔ اسے انگریزی بولنے کا شوق تھا، جبکہ میں جرمن بولنے پر مصر تھا۔ یہ بات گرہارڈ کو اچھی لگی، کیونکہ اس کی انگریزی میری جرمن کی طرح ناپختہ تھی۔ اسے خوشی تھی کہ میں اس کی سالگرہ میں شامل ہونے کے لیے آیا تھا۔ وگرنہ کرسمس کی وجہ سے ہر سال اس کی سالگرہ کی تقریب کو بھلا دیا جاتا تھا۔ اس روز البتہ یہ پروگرام بنایا گیا تھا کہ سالگرہ کی تقریب الگ منائی جائے گی۔ چنانچہ ہمیں اس کے اپارٹمنٹ میں جمع ہونے کو کہا گیا جو بنگلے کے شرقی حصے میں تھا۔ گرہارڈ کو تحفوں سے لاد دیا گیا۔ وہ ابھی ان کو کھولنے میں لگا ہوا تھا کہ اس کے کمرے کے سامنے ایک فولکس واگن کار آ کر رکی۔ کاروں کی ایک مقامی فرم کا کارندہ اتر کر آیا اور اس نے گرہارڈ کو کار کی چابیاں اور کار کی ملکیت کے کاغذات پیش کیے۔ اس روز

گر ہارڈ کی اٹھارویں سالگرہ تھی اور ماں باپ نے اس کو کار تحفے میں دی تھی۔ یہ چیز اگرچہ متوقع تھی اس کے باوجود گر ہارڈ کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ وہ دوسرے سارے تحفوں کو چھوڑ کر کار میں جا بیٹھا۔ اس نے مجھے اور ایویلین کو شہر کی سیر کے لیے چلنے کی دعوت دی۔ ڈاکٹر ہوڈوفسکی نے گر ہارڈ سے آدھ گھنٹے میں واپس آ جانے کا وعدہ لے کر ہمیں جانے دیا۔

ہم واپس لوٹے تو بنگلے کے ہال میں کرسمس کا درخت سجایا جا چکا تھا۔ اس پر رنگا رنگ کے چاند، ستارے، دیو مالائی کہانیوں کے کردار، فرشتے، حوریں اور قسم قسم کے کھلونے لٹک رہے تھے۔ اس پر مستزاد سرخ و سفید موم بتیاں لگی ہوئی تھیں جو ہمارے کمرے میں داخل ہونے پر روشن کر دی گئیں۔ مکان کے اندر درخت کا لگایا جانا اور اس کا کسی دلہن کی طرح سجایا جانا میرے لیے نئی چیز تھی۔ کرسمس کے درخت کے نیچے خاندان کے ہر فرد کے لیے تحفوں کا الگ الگ ڈھیر لگا ہوا تھا۔ مجھے بھی خاندان کے جملہ افراد کی طرف سے تحفے دیے گئے تھے۔ ایویلین کو اس کی توقع کے مطابق سکیٹنگ سیٹ ملا تھا۔ اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اگر باہر اندھیرا نہ چھا گیا ہوتا تو وہ اسی وقت ندی کے یخ بستہ پانی پر سکیٹنگ کے لیے جانے کو تیار تھی۔ ڈاکٹر ہوڈوفسکی اتنے میں پیانو پر کرسمس کی دھنیں بجا رہے تھے۔ چند منٹوں کے اندر سارا خاندان مل کر کرسمس کے گیت گا رہا تھا۔ مجھے یہ رسم بہت اچھی لگی، مگر اس بات کا افسوس ہوا کہ میں ان میں سے کوئی گیت نہ جانتا تھا اور اگر جانتا بھی ہوتا تو میں ان کا ساتھ نہ دے سکتا تھا کیونکہ مجھے سرے سے گانا نہیں آتا۔"

کرسمس کے دو روز لیوبک میں گزارنے کے بعد میں تحفوں سے لدا پھندا ہمبرگ واپس لوٹا۔ لطیف صاحب نے وہاں کے پورے کوائف سننے کے بعد کہا: "ان لوگوں کے ساتھ آپ کی دوستی زیادہ دیر تک نہ چل سکے گی۔ جرمن اس سلسلے میں کچھ ایسے باذوق نہیں ہیں۔"

ان کے اندازے کے اُلٹ ہماری دوستی لمبے عرصے تک قائم رہی۔ وہ مجھے بار بار اپنے ہاں بلاتے رہے البتہ ڈاکٹر ہوڈوفسکی اور مارگٹ کے درمیان ایک نوجوان نرس کی وجہ سے اختلافات پیدا ہو گئے، جس کے نتیجے میں طلاق تک نوبت پہنچی۔ اس کے بعد میرا رابطہ ٹوٹ گیا۔

ہمبرگ کے میئر کی طرف سے سال کے پہلے ہفتے میں شہر کے باسیوں کو ٹاؤن ہال، جس کو "راٹ ہاؤس" کہتے ہیں، آنے کی دعوت دی جاتی ہے۔ اس موقع پر ہزاروں شہری میئر کو نئے سال کی مبارک باد دینے کے لیے حاضر ہوتے ہیں اور ایک لمبی قطار میں لگ کر باری باری میئر سے مصافحہ کرتے ہیں۔ لطیف صاحب اس موقع پر مجھے بھی ساتھ لے کر گئے تھے اور میئر سے میرا تعارف کرایا، جس نے مجھے ہمبرگ آنے پر خوش آمدید کہا۔

ہمبرگ میں پڑھانے والے پروفیسر برتھولڈ شپولر کا شمار چوٹی کے مستشرقوں میں ہوتا تھا۔ میں ان سے جا کر ملا اور اپنا تعارف کرایا۔ انھوں نے مجھے اپنے سیمیناروں میں آنے کی دعوت دی اور اپنے ساتھی مستشرق ڈاکٹر ہربیرٹ بسے کے ساتھ میرا تعارف کرایا۔ اس سمسٹر میں قرآن پر لیکچر ہو رہے تھے۔ پروفیسر شپولر نے قرآن کی ترتیب اور آیات کی تعداد پر اعتراض کیا اور طالب علموں کو بتایا کہ قرآن کی موجودہ ترتیب نہ تو نزول کے اعتبار سے ہے اور نہ ہی قرآن کی عبارت میں ربط موجود ہے۔ سورتوں کو محض لمبائی کے اعتبار سے آگے پیچھے جوڑ دیا گیا ہے۔ پھر انھوں نے کہا کہ آج تک مسلمان قوم آیات قرآن کی گنتی کا مسئلہ حل نہیں کر سکی جس کے نتیجے میں قرآن کی آیات کی گنتی ساری مسلم دنیا میں ایک جیسی نہیں ہے۔ بعض فرقے بسم اللہ کو پہلی آیت مانتے ہیں اور دوسرے نہیں مانتے۔ جو پہلی آیت مانتے ہیں وہ اس کا شمار کرتے ہیں، دوسرے نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ بھی بعض آیتیں ایک یا دو شمار کی جاتی ہیں۔ میں نے اس کا جواب دینا چاہا مگر انگریزی بولنے کی اجازت مانگی کیونکہ ابھی میری جرمن زبان پر دسترس اتنی اچھی نہ تھی کہ ایسے اہم سوال کا کماحقہ جواب دے سکوں۔ پروفیسر شپولر نے اس پر خوشی کا اظہار کیا مگر کہا کہ اس روز ان کے لیکچر کا وقت ختم ہو چکا ہے اس لیے وہ مجھے اگلے ہفتے آنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اگر میں پسند کروں تو وہ مجھے اس روز اپنے سیمینار کا پورا وقت دے سکتے ہیں۔ انھوں نے مجھے پروفیسر شپعالر کی کتاب پڑھنے کے لیے دی جو اس موضوع پر تھی۔

میں نے مشن ہاؤس میں آ کر لطیف صاحب کو یہ مژدہ سنایا کہ پروفیسر شپولر نے مجھے اگلے ہفتے سیمینار میں لیکچر دینے کی دعوت دی ہے۔ یہ بات سن کر ان کا چہرہ مرجھا گیا۔ انھوں نے مجھے تقریر کرنے کی ممانعت کر دی اور کہا کہ اگر پروفیسر شپولر نے تقریر کروانی ہے تو اسے چاہیے کہ انھیں دعوت دے۔ چنانچہ انھوں نے مجھ سے مشورہ کیے بغیر پروفیسر شپولر کو خط لکھ دیا۔ مجھے پتا تھا کہ موصوف ایسے موضوعات پر بولنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ ان کو عربی زبان سرے سے نہیں آتی۔ انھوں نے بی اے کرنے کے بعد زندگی وقف کی تھی۔ جس کے بعد ان کو جامعہ احمدیہ میں بہت سرسری سی تربیت دی گئی تھی۔ ان کا اسلامی لٹریچر کا مطالعہ ناقص تھا اور ایسے موضوعات پر ان کی اپنی معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں۔ چونکہ مجھے پروفیسر شپولر کے سیمینار میں جانے کی ممانعت کر دی گئی تھی اس لیے میں اگلے ہفتے وہاں پر نہ جا سکا۔

اس سے اگلے روز مجھے پروفیسر شپولر کا خط ملا جس میں لکھا تھا کہ لطیف صاحب نے ان کو اطلاع دی ہے کہ مجھے ان کے سیمینار میں جانے کی ممانعت ہے مگر وہ مجھے بتانا چاہتے ہیں کہ میں ان

کے سیمینار میں جب چاہوں آ سکتا ہوں۔ اگر میں لیکچر دینے کا ارادہ رکھتا ہوں تو وہ اس کا خیر مقدم کریں گے۔ میں نے لطیف صاحب سے کہا کہ اب وہ خواہ سر کے بل کھڑے ہو جائیں میں اگلے ہفتے پروفیسر شپولر کے سیمینار میں تقریر کرنے کے لیے جاؤں گا۔ چنانچہ میں نے یہ تقریر انگریزی میں کی جس کے نوٹس پروفیسر شپولر نے لیے اور میرا شکریہ ادا کیا۔ بلکہ اس کے بعد جب میں باقاعدہ طور پر ان کے شعبے کا طالب علم بن گیا تو انھوں نے مجھے یہ حق دے رکھا تھا کہ سمسٹر میں ان کے چودہ لیکچروں میں سے تیرہ لیکچر ان کے ہوں گے اور آخری لیکچر میرا ہوا کرے گا۔ چنانچہ جب تک میں ان کے شعبے کا طالب علم رہا انھوں نے اس معاہدے کی پاسداری کی۔ بلکہ اس وجہ سے میرے ساتھ پڑھنے والوں کا خیال تھا کہ میں پروفیسر شپولر کی نگرانی میں ڈاکٹریٹ کا مقالہ نہ لکھ سکوں گا کیونکہ میں ان کی علمیت کو متواتر چیلنج کرتا آ رہا تھا۔ مگر میں نے دیکھا کہ میرے لیکچروں میں لیے گئے نوٹس کو پروفیسر شپولر نے اپنے بعض مضامین میں میرے حوالے کے ساتھ استعمال کیا۔ پھر پروفیسر شپولر نے میری طالب علمی کے زمانے میں میرا پبلک لیکچر ہمبرگ یونیورسٹی کے مرکزی ہال میں کرایا۔ یہ اعزاز مجھ سے پہلے کبھی کسی دوسرے طالب علم کو نہیں ملا تھا۔

انہی دنوں میں ایک اور واقعہ پیش آ گیا۔ میں شروع سے ایسے علمی اداروں کی تلاش میں تھا جہاں پر سیمینار منعقد ہوتے تھے، تاکہ ان کو اسلام پر لیکچروں کی پیش کش کر سکوں۔ مجھے گوٹنگن کے قریب پہاڑی علاقے کے مقام سانت اندر یاز برگ کے ایک ادارے کا پتا چلا جہاں پر ایسے علمی موضوعات پر سیمینار ہوا کرتے تھے۔ میں نے ان کو خط لکھا، جس میں اپنا تعارف کرایا اور ان سے مستقبل قریب میں ہونے والے سیمیناروں کے پروگرام منگوائے۔ انھوں نے مطلوبہ معلومات بھیجیں اور مجھے ایک سیمینار میں تقریر کرنے کی دعوت دی، جس کا عنوان انھوں نے یہ تجویز کیا: ''اسلام ایک زندہ مذہب''۔ میں نے جب یہ خط لطیف صاحب کو دکھایا تو ان کو آگ لگ گئی، کیونکہ میں نے ان سے اجازت حاصل کیے بغیر اس ادارے سے رابطہ قائم کیا تھا۔ پھر انھوں نے کہا کہ آپ کو تو ابھی جرمن نہیں آتی، آپ کیسے وہاں جا کر جرمن میں تقریر کر سکتے ہیں؟ دوسرے روز وہاں سے خط آ گیا کہ ہمیں اپنی غلطی کا احساس خط بھیجنے کے بعد ہوا کہ آپ کو جرمنی میں آئے ابھی تھوڑا عرصہ ہوا ہے اس لیے آپ شاید جرمن میں تقریر نہ کر سکیں گے۔ آپ بیشک اپنی تقریر انگریزی میں کریں، ہمارے ہاں ترجمے کا انتظام موجود ہے۔ ہم آپ کو اس تقریر کا معاوضہ بھی ادا کریں گے۔ لطیف صاحب نے مجھے تقریر کرنے کی ممانعت کر دی، جس کے پیچھے شاید معاوضے کی رقم کی پیش کش کا بھی ہاتھ تھا۔ پھر انھوں نے اس ادارے کو خط لکھا کہ اگر آپ تقریر کرانی چاہتے ہیں تو وہ یہ خدمت بجا لانے کے لیے

تیار ہیں۔ اس پر ان کو وہاں سے جواب آیا کہ ہم آپ کو تقریر کرنے کی دعوت نہیں دے سکتے۔ ہماری دعوت ذاتی طور پر منیر صاحب کے لیے تھی۔

میں اسلام کی تبلیغ کے لیے آیا تھا اور بہت سی امیدیں اور امنگیں اپنے دل میں رکھتا تھا۔ دن رات میرا وقت اس فکر اور تلاش میں گزرتا تھا کہ تبلیغ کے مواقع پیدا کیے جائیں۔ میں ہمبرگ شہر میں اسلام پر ہونے والے ہر لیکچر میں پہنچ جاتا تھا اور حتی الامکان اعتراضات کا جواب دیتا تھا۔ میں نے ہمبرگ میں بسنے والے مسلمانوں کے ساتھ رابطہ قائم کیا اور بالخصوص ترکوں کو قرآن عربی میں پڑھانے کی ذمے داری اٹھالی۔ اخبار نویسوں کے ساتھ ملاقات اور تعارف کے مواقع پیدا کیے، جس میں اس امر نے میری مدد کی کہ میں روزنامہ "تعمیر" کا جرمنی میں نمائندہ تھا۔ مزید برآں میں اسلام پر لکھے جانے والا جرمن لٹریچر لائبریری سے لا کر اس کا مطالعہ کرتا تھا تا کہ اسلام کے خلاف لکھی جانے والی باتوں کا جواب دیا جا سکے۔ مگر ہر قدم پر لطیف صاحب نے میرے راستے میں روڑے اٹکائے۔ میری ہر تجویز کو رد کیا۔ وہ ایک پنشنر کی زندگی بسر کرتے تھے اور ان کو میری گہما گہمی ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ وہ کسی قیمت پر نہیں چاہتے تھے کہ میں اپنے طور پر تبلیغ کے مواقع پیدا کروں، جبکہ حقیقت یہ تھی کہ وہ تبلیغ اسلام کے بالکل اہل نہیں تھے۔ ان کا جرمن زبان کا لہجہ بے حد کھردرا تھا اور بولنے کا انداز پنجابی دیہاتیوں والا تھا، جس میں جرمنی میں لمبا قیام کوئی تبدیلی پیدا نہ کر سکا تھا۔

ان کے پاس چار تقریریں لکھی ہوئی تھیں جن کے موضوعات پر سردیوں کے مہینوں میں چار لیکچر دیے جاتے تھے جو مسجد احمدیہ میں ہوتے تھے۔ حاضری پندرہ اور بیس افراد کے قریب ہوتی تھی۔ لطیف صاحب کا تقریر کرنے کا انداز اناڑیوں جیسا تھا اور سوال و جواب کا سیشن ایسا ہوا کرتا تھا جیسے وہ کسی سے جھگڑ رہے ہوں۔ ان کو شاید اس بات کا علم نہ تھا کہ قرآن میں ایسے طریق سے تبلیغ کرنے کا حکم آیا ہے جو احسن ہو اور جس کے نتیجے میں کسی کی دلآزاری نہ ہو۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ ان کے کسی لیکچر کے بعد حاضرین میں سے کسی نے اس کی تعریف کی ہو۔ جو کوئی ایک بار ان کا لیکچر سن جاتا تھا وہ لوٹ کر نہیں آتا تھا اور لطیف صاحب خود کبھی کسی محفل میں شامل نہیں ہوتے تھے۔ انھوں نے کبھی کسی اخبار میں چھپنے والے اسلام دشمن مضمون کا جواب نہیں لکھا تھا، نہ ان کا کوئی مضمون کبھی کسی اخبار میں شائع ہوا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ مجھ سے جلتے تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ میری سرگرمیوں کے سبب ان سے بھی مطالبہ کیا جائے کہ وہ بھی اس طریقِ کار کو اختیار کریں۔

ہمبرگ کے علاوہ جماعتِ احمدیہ نے ایک مسجد فرینکفرٹ میں بھی بنائی تھی جس کا امام جرمن احمدی عبدالشکور کنزے تھا، جس کو میں نے ربوے کے زمانے دیکھا تھا۔ اسے وہاں سے شکا گو

بھیجا گیا تھا، جہاں پر کچھ برسوں تک کام کرنے کے بعد اس کو جرمنی بلا لیا گیا۔ ابتدا میں اس کو کچھ عرصے تک ہمبرگ میں لطیف صاحب کے ساتھ مشن ہاؤس میں رہنا پڑا تھا کیونکہ فرینکفرٹ میں بنائی جانے والی مسجد ابھی مکمل نہ ہوئی تھی۔ دونوں خاندان صاحب اولاد تھے اور مشن ہاؤس کی مکانیت بہت محدود تھی۔ لطیف صاحب نے کنزے صاحب کی فیملی کو تہ خانے میں رکھنا چاہا تھا مگر وہ لوگ اس کے لیے تیار نہ ہوئے اور انھوں نے مشن ہاؤس کے چار کمروں میں سے دو کو اپنے قبضے میں کر لیا۔ پھر عین انھیں دنوں میں مرزا لطف الرحمٰن کو ہمبرگ میں متعین کر دیا گیا۔ ان کا بستر مسجد کے ایک کونے میں ڈال دیا گیا جس کے سامنے پردہ ڈال کر اس کو نماز ادا کرنے والے حصّے سے جدا کیا گیا تھا۔ جب خدا خدا کر کے فرینکفرٹ کی مسجد بن گئی اور کنزے صاحب کو وہاں کا مبلغ بنا کر بھیج دیا گیا تو مرزا لطف الرحمٰن کو کہا گیا کہ وہ تہ خانے کے اس کمرے میں چلے جائیں جہاں پر بعد میں مجھے رکھا گیا تھا۔ ان کو یہ چیز پسند نہ تھی اس لیے وہ اپنا بوریا بستر اٹھا کر ان دو کمروں میں سے ایک کمرے میں جا گھسے جو کنزے فیملی نے خالی کیے تھے۔ لطیف صاحب کو یہ چیز بالکل پسند نہ آئی اور انھوں نے وکالت التبشیر کو شکایت کا خط لکھا کہ مرزا لطف الرحمٰن کے اس طرح ان کی فیملی کے درمیان آ کر مقیم ہو جانے کے سبب ان کی بیوی کی پردہ دری ہوتی ہے۔ پھر ان کی بیٹی امتہ المجیب بلوغت کو پہنچ رہی ہے اور وہ نہیں چاہتے کہ مرزا موصوف کی وجہ سے کوئی بدمزگی پیدا ہو۔ نیز مرزا لطف الرحمٰن ان کے احکام کی پابندی کرنے سے انکاری ہیں۔ جب مرزا لطف الرحمٰن سے جواب طلبی ہوئی تو انھوں نے لکھا کہ وہ نزلہ وزکام کے دائمی مریض ہیں اور ڈاکٹر نے کہا ہے کہ اگر ان کی رہائش کا تہ خانے سے باہر انتظام نہیں ہوسکتا تو خطرہ ہے کہ ان کی بیماری بڑھ کر سل کی صورت اختیار کر سکتی ہے اس لیے وہ لطیف صاحب کا حکم ماننے سے قاصر ہیں۔ اس پر ربوے کی طرف سے ان کے ٹوگو تبدیل کیے جانے کا حکم آ گیا اور وہ خاموشی سے ادھر چلے گئے۔

میرے ہمبرگ آنے کے کچھ عرصے بعد فرینکفرٹ مشن سے تشویش ناک خبریں آنے لگیں۔ کنزے کی بیوی قدسیہ نے اپنے خاوند کو عین مسجد کے اندر ایک مرد کے ساتھ مجامعت کرتے ہوئے پکڑ لیا تھا۔ اس نے شور مچایا کہ اس کا خاوند ہم جنس پرست ہے۔ یہ بات البتہ شکاگو کے زمانے سے اس کے علم میں تھی۔ ہمبرگ میں بھی کنزے کا اٹھنا بیٹھنا ہم جنس پرستوں کے ساتھ تھا چنانچہ اس کے ذریعے مسلمان ہونے والا امین والٹر ہم جنس پرست تھا۔ جب وہ ایک بار ہمبرگ مشن ہاؤس میں ہمیں ملنے کے لیے آیا تو میں پہلی ہی نظر میں جان گیا تھا کہ اس کا جسم مردانہ تھا مگر اس کی روح زنانہ تھی۔ لطیف صاحب بھی کنزے کی ہم جنس پرستی سے خوب واقف تھے۔ جب کنزے کی بیوی نے شور

مچایا اور اپنے خاوند کو دھمکایا کہ وہ اس کی پولیس کے پاس رپورٹ کر دے گی، کیونکہ وہ لونڈوں کو مسجد میں لا کر ان کے ساتھ لواطت کرتا ہے تو بات بڑھ گئی۔ میاں بیوی کے درمیان چپقلش پہلے سے چل رہی تھی۔ اب رپورٹیں ربوے تک پہنچ گئیں۔ وہاں سے ایک نیا مبلغ بھیجے جانے کی خبر آ گئی۔

یہ نیا مبلغ مسعود احمد جہلمی تھا جس کو کچھ عرصہ پہلے ہالینڈ بھیجا گیا تھا۔ اس کو حکم ملا کہ ہمبرگ چلے جاؤ۔ اس کی ہمبرگ میں تقرری کا حکم نامہ بھی پہنچ چکا تھا۔ میرے بارے میں ربوے نے لکھا کہ مجھے فرینکفرٹ بھیج دیا جائے کیونکہ میں اس دوران میں اچھی خاصی جرمن سیکھ چکا تھا، اس لیے اگر فرینکفرٹ میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تو میں ان سے نپٹ سکوں گا۔ مگر لطیف صاحب کی بیوی نے، جن کے بارے میں میرا مضمون ''مصباح'' میں چھپا تھا جس میں بیان ہوا تھا کہ مبلّغوں کے پہلو بہ پہلو ان کی بیویوں کا بھی ذکر ہونا چاہیے کیونکہ ان کی قربانی اپنے خاوندوں سے کم نہیں ہے، کہا کہ منیر صاحب کے ساتھ اب ہمارا گزارہ اچھا خاصا ہو رہا ہے، خدا جانے مسعود جہلمی کیسا آدمی نکلے اس لیے بہتر یہ ہے کہ اس کو آگے فرینکفرٹ بھیج دیا جائے اور منیر صاحب یہیں رہ جائیں۔ میرے لیے ان کے چنگل سے نکلنے کا سامان پیدا ہوتے ہوتے رہ گیا۔ شاید قسمت کو یہی منظور تھا اور اسی میں بہتری تھی۔

مسعود احمد جہلمی کو میں احمد نگر کے زمانے سے جانتا تھا اور اس کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتا تھا۔ وہ ایسا شخص تھا جو اپنے باپ کو بھی بیچ کر کھا جائے۔ بہر صورت اس نے کنزے کا خوب مقابلہ کیا اور مسجد کو اس کے ہاتھ سے چھڑا لیا ورنہ خطرہ پیدا ہو چلا تھا کہ کنزے کسی دوسرے گروپ کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے مسجد کو اپنے قبضے میں کر لے گا۔ اس جھگڑے میں ثالثی کے لیے ہالینڈ کے مبلغ حافظ قدرت اللہ کو جرمنی بھیجا گیا تھا جن کی رپورٹ پر کنزے کو مسجد سے نکل جانے کا نوٹس دیا گیا تھا۔

وکیل التبشیر مرزا مبارک احمد گرمیوں میں یورپ آئے جس کو جماعت کے مشنوں کے کام کی پڑتال کا نام دیا جاتا تھا مگر جو فی الواقع موصوف کی سالانہ یورپ یاترا ہوتی تھی جس کا مقصد سیر و سفر اور خریدِ اشیا تھا۔ میں اس کا ہمبرگ میں عینی شاہد ہوں۔ میرا خیال تھا کہ وہ لطیف صاحب سے اور مجھ سے ہمبرگ میں تبلیغی سرگرمیوں کی روداد جاننا چاہیں گے مگر ہوا اس کے الٹ۔ اس بارے میں مجھ سے کوئی سوال نہ کیا گیا۔ ان کو مشن کے خرچ پر ہمبرگ کے مہنگے ترین ہوٹل میں ٹھہرایا گیا۔ وہ دو بار مشن ہاؤس میں ایک دو گھنٹوں کے لیے آئے جس کے دوران کھانا کھایا گیا اور ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں۔ مشن کے کام اور تبلیغی سرگرمیوں کے بارے میں ایک بھی سوال نہ کیا گیا۔ لطیف صاحب ان

کے ساتھ بازار میں خریداری کے لیے گئے اور چونکہ ایک پرفیوم ان کو پسند نہ آئی تھی اس لیے مجھے وہ پرفیوم واپس کرنے کے لیے بازار بھیجا گیا۔ کیا میری غیر حاضری میں ان کو لطیف صاحب نے مشن کے کام کی رپورٹ پیش کی تھی؟ مجھ سے کیوں کوئی سوال نہ کیا گیا؟ کیا ان کو مشن کے کام میں کوئی دلچسپی نہ تھی؟

مگر ایک اور شخص آرنولڈ اولبرش کی کہانی اس سے بھی زیادہ دلچسپ تھی جس کے ساتھ میری ملاقات ابتدائی دنوں میں ہوئی تھی۔ اس کی شخصیت اور پیچیدہ زندگی کو سامنے رکھ کر میں نے ایک افسانہ ''پہلا مقدمہ'' لکھا تھا جو میری کتاب ''شجرِ ممنوعہ'' میں شامل ہے۔ اس کی زندگی بہت الجھی ہوئی تھی۔ اس کی ماں نے اس کی سہیلی روزے ماری کو اپنے گھر سے نکال دیا تھا جب کہ وہ حمل سے تھی۔ اس چیز کو وہ معاف نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی ماں کے نزدیک اس کے بیٹے کے نفسیاتی روگ کا سبب روزے ماری تھی۔ میں نے ماں بیٹے کے تعلقات میں پیدا ہو جانے والی مشکلات کی بنا پر یہ افسانہ لکھا تھا جس کے کردار تو موجود تھے مگر بات کو اس کے فطری انجام تک پہنچانے کے لیے مجھے کہانی گھڑنی پڑی تھی۔

اولبرش کے ساتھ میرا ملنا ربوے کے ایک پرانے دوست اسحٰق خلیل کی معرفت ہوا تھا جو نائیجیریا میں جماعت احمدیہ کا مبلغ بن کر گیا تھا مگر کسی وجہ سے اس کو واپس بلا لیا گیا تھا۔ اس نے واپسی کے راستے میں روم میں قیام کیا اور ربوے جانے کی بجائے ریل گاڑی پکڑی اور اپنے دوست کمال یوسف کے پاس کوپن ہیگن چلا گیا جو اس زمانے میں ڈنمارک میں جماعتِ احمدیہ کا مبلغ تھا۔ چونکہ اسحٰق کا ارادہ واپس جانے کا نہیں تھا اور کمال یوسف نہیں چاہتا تھا کہ وہ کوپن ہیگن میں رہے کیونکہ اس طرح اس پر الزام آ سکتا تھا کہ اس نے اپنے دوست کو ربوے کی مرضی کے خلاف اپنے پاس رکھ لیا تھا اس لیے کمال یوسف نے اسے ہمبرگ جانے کا مشورہ دیا جہاں پر اس زمانے میں ہر کسی کو آسانی کے ساتھ رہائش کی اجازت مل جاتی تھی۔ اس نے آتے ہی ہمبرگ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا اور میرے ساتھ جرمن زبان کا کورس کرنے لگا۔ جب اس نے دیکھا کہ میرے اور لطیف صاحب کے تعلقات کشیدہ ہیں تو وہ ان کو میرے خلاف مواد مہیا کرنے لگا۔ چنانچہ جب میں نے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا تو اس نے فوراً ان کے پاس جا کر رپورٹ کی اور کہا کہ انھیں اس بات کی اطلاع ربوے بھیجنی چاہیے، جس پر لطیف صاحب نے فوراً عمل کیا۔ اس بات کا علم مجھے کمال یوسف کی زبانی ہوا جو ان دنوں ہمبرگ آیا ہوا تھا۔ اس نے مجھے خبردار کیا کہ میرے خلاف کیس بنایا جا رہا ہے۔ کوپن ہیگن واپس جاتے ہوئے وہ مجھے دعوت دے گیا کہ کرسمس کے دنوں میں یوں بھی جرمنی میں پبلک لائف

بالکل تھم جاتی ہے اور ہمبرگ مشن میں کوئی کام نہیں ہوتا اس لیے اگر میں اس کے پاس آ جاؤں تو خوب ہوگا۔

میں نے لطیف صاحب سے کرسمس کے دنوں میں کوپن ہیگن جانے کی اجازت چاہی تو انھوں نے ہچکچاہٹ دکھائی۔ میں نے کہا کہ کرسمس کے دنوں میں یوں بھی مشن کا کام بند ہو جاتا ہے اس لیے اگر میں تین چار روز کے لیے کمال یوسف کے پاس چلا جاؤں تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ انھوں نے کہا کہ مرکز کی اجازت کے بغیر ہم اپنی ڈیوٹی کے ملک کو نہیں چھوڑ سکتے۔ پھر میرے اصرار پر بالآخر انھوں نے مجھے اس شرط پر اجازت دے دی کہ میں سفر اپنے خرچ پر کروں گا۔ مجھے اس بات کی پرواہ نہ تھی کیونکہ میں ہچ ہائیکنگ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ ذیل کی عبارت میرے افسانے ''بے روزگار'' سے درج کی جاتی ہے جہاں پر اس سفر کا حال بیان ہوا ہے:

''ریل گاڑی کے کرائے پر اٹھنے والے پیسے بچانے کی خاطر میں نے سفر ہچ ہائیکنگ کے ذریعہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ مجھے اس سے قبل ہچ ہائیکنگ کا کوئی تجربہ نہیں تھا اور نہ ہی میں جانتا تھا کہ سردیوں میں ہچ ہائیکنگ کا رواج نہیں ہے۔ اس بات کا اندازہ مجھے آٹوباہن پر جا کر کھڑے ہونے کے بعد ہوا۔ دور دور تک سڑک پر میں اکیلا کھڑا تھا۔ کئی روز سے دھیمی دھیمی برف باری ہو رہی تھی اور قریب قریب ایک فٹ برف پڑ چکی تھی۔ میرے لیے برف باری سے نبرد آزما ہونے کا نیا نیا تجربہ تھا۔ میں نے ہاف بوٹ پہن رکھے تھے جو اس زمانے میں میرا بوٹوں کا واحد جوڑا تھا جو راولپنڈی سے میرے ساتھ آیا تھا۔ اور واضح ہے کہ اسے برف باری کا مقابلہ کرنے کے لیے نہیں بنایا گیا تھا۔ میرے پاؤں یخ ہو رہے تھے اور مجھے خطرہ تھا کہ آدھ پون گھنٹے تک مجھے وہاں پر انتظار کرنا پڑا تو میرے پاؤں کی انگلیاں ٹھٹھر کر جم جائیں گی اس لیے میں مسلسل ناچنے ٹاپنے میں لگا ہوا تھا تا کہ خون کی گردش جاری رہے۔ میں اس اچھل کود میں اس درجہ مصروف تھا کہ مجھے ایک کار کے رکنے کی خبر تک نہ ہوئی جو ستر اسی گز کے فاصلے پر جا کر رکی تھی۔ ڈرائیور نے ہارن بجا کر مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔''

وہ مجھے بحری فیری تک پہنچا آیا تھا جس میں ریل گاڑی بھی سفر کرتی ہے۔ جہاز میں میرا تعارف ایک ڈینش نوجوان سے ہوا جو مجھے کوپن ہیگن تک اپنی کار میں لے کر گیا۔

میرے پیچھے پیچھے اسحٰق خلیل بھی کوپن ہیگن پہنچ گیا مگر صرف ایک روز ٹھہرنے کے بعد واپس لوٹ گیا۔ اس کی باتیں سن کر کمال کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے کہا تمھارے ہمبرگ لوٹنے سے پہلے تمہاری رپورٹ ربوے بھیجی جا چکی ہوگی۔ میں نے جواب دیا کہ میں لطیف صاحب کی اجازت سے آیا ہوں اس لیے رپورٹ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے مگر کمال ان کو مجھ سے بہتر جانتا تھا۔ میری واپسی

کے دس بارہ روز بعد ربوے سے جواب طلبی کا خط آ گیا جس میں لکھا تھا کہ آپ کیوں مبلغ انچارج کی اجازت کے بغیر ملک سے باہر گئے تھے۔ میں نے اس کے جواب میں لکھا کہ میں نے جانے سے پہلے لطیف صاحب سے اجازت حاصل کر لی تھی۔ کرسمس کے دنوں میں جرمنی میں ہر قسم کی سرگرمیاں بند ہو جاتی ہیں اس لیے مشن کے کام کا کوئی حرج نہیں ہوا۔ پھر وکیل التبشیر نے آخری ملاقات میں مجھے ہدایت کی تھی کہ کوپن ہیگن جانے کے لیے تیار رہوں اور ڈینش زبان سیکھوں، اس لیے میرا جانا وہاں کے حالات سے آگاہی پیدا کرنے کے لیے تھا۔ یہ خط مجھے براہِ راست ربوے بھیجنے کی اجازت نہ تھی کیونکہ جماعتی نظام میں تمام خط و کتابت مبلغ انچارج کی وساطت سے کی جاتی ہے جس کو تمام خطوط کھلے ہوئے دینے پڑتے ہیں۔ لطیف صاحب نے میرا خط پڑھا اور روہانسی شکل بنائے ہوئے تہ خانے میں میرے پاس آئے۔ انھوں نے کہا اگر یہ بات وکالت التبشیر کے علم میں آ گئی کہ میں نے آپ کو کوپن ہیگن جانے کی اجازت دے دی تھی تو میری شامت آ جائے گی اس لیے مجھ پر رحم کھاتے ہوئے یہ فقرہ کاٹ دیں اور لکھیں کہ آئندہ ایسی غلطی نہیں ہوگی۔ میں ان کی باتوں میں آ گیا اور میں نے سچ مچ اجازت ملنے والی بات کو کاٹ کر لکھ دیا کہ آئندہ شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔

ہفتے عشرے میں ربوے سے ایک دوست سلیم صدیقی نے مجھے لکھا کہ تمہاری تبدیلی نائیجیریا کی جا رہی ہے اور یہ قدم اس لیے اٹھایا جا رہا ہے کہ تم نے نظامِ سلسلہ کی خلاف ورزی کی ہے۔ میں نے مرزا رفیق احمد کو خط لکھا کہ اس بارے میں تحقیق کر کے بتائیں کہ یہ بات درست ہے یا نہیں؟ انھوں نے اپنے بڑے بھائی مرزا مبارک احمد سے، جو وکیل التبشیر تھے، اس بارے میں پوچھا تو جواب ملا کہ یہ خبر غلط ہے مگر اس خط کے ساتھ ہی ایک خط وکالت التبشیر کا ملا جس میں پوچھا گیا کہ اس شخص کا نام بتاؤں جس نے مجھے میری تبدیلی کے بارے میں اطلاع بھیجی تھی۔ گویا یہ خبر ایک راز افشا کرنے کے مترادف تھی۔ پھر چند دنوں کے بعد خط آیا کہ آپ کی تبدیلی پہلے فیصلے کے مطابق نائیجیریا کر دی گئی ہے اس لیے آپ وہاں پر جانے کے لیے تیار رہیں اور ٹکٹ ملتے ہی اس ملک چلے جائیں۔ آپ کے لیے ویزا بنوا لیا گیا ہے۔ میں نے جواباً لکھا کہ یہ تبدیلی چونکہ سزا کے طور پر کی جا رہی ہے اس لیے مجھے صفائی کا حق ملنا چاہیے۔ اس کا جواب آیا کہ آپ حکم عدولی کر رہے ہیں جس کی سزا میں آپ کو وقف سے خارج کرنے کے علاوہ سلسلۂ عالیہ احمدیہ سے نکالا جا سکتا ہے۔

میرے نزدیک یہ حکم سراسر ناجائز تھا اور میں کسی صورت میں اس کو ماننے کے لیے تیار نہ تھا۔ مجھے نظر آ رہا تھا کہ میں ایسے نظام کے ساتھ نہیں چل سکوں گا۔ اگر آج نہیں تو کل کو یہ لوگ مجھے نکال دیں گے۔ میں اگر اب ستائیس برس کی عمر میں جدا ہو جاؤں تو تعلیم مکمل کر کے اپنا مستقبل بنا

سکتا ہوں لیکن اگر مجھے دس برسوں کے بعد خارج کیا گیا تو کچھ بھی نہ کر سکوں گا۔ میرے سامنے ان بے شمار احمدی مبلغوں کی مثالیں تھیں جن کے ساتھ یہ برتاؤ کیا گیا تھا اور جو جماعت سے نکالے جانے کے بعد روٹی کے ٹکڑوں کو محتاج ہو گئے تھے۔ ان حالات میں میرے سامنے بس ایک ہی راستہ تھا کہ مشن ہاؤس کو خیر باد کہہ دوں۔ اس وقت تک میں نے جماعتِ احمدیہ سے علیحدگی کے بارے میں نہیں سوچا تھا البتہ واضح تھا کہ یہ مرحلہ جلد یا بدیر آنے والا ہے۔

مشن ہاؤس کو چھوڑنے کا فیصلہ تو میں نے کر لیا تھا لیکن میری جیب میں اس وقت صرف بیس مارک تھے اور مجھے نظر آ رہا تھا کہ مجھے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے لیے کچھ سرمایہ درکار ہوگا۔ میں نے اس سلسلے میں کوئی قدم نہیں اٹھایا تھا۔ قدرت ایسے موقعوں پر خود کوئی انتظام کر دیتی ہے۔ میں مچھلی کے ایک ریستوران میں دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے گیا تو وہاں پر میری ملاقات ایک پاکستانی تاجر سے ہوئی جس کے جرمنی آنے کا مقصد مرسڈیز کار اور الیکٹرک کا سامان خریدنا تھا۔ اس نے شکایت کی کہ اسے اس سلسلے میں مشکلات پیش آ رہی تھیں کیونکہ دکانوں میں کسی کو انگریزی نہ آتی تھی اور ان کی جرمن اس کے پلے نہ پڑتی تھی۔ اس نے پوچھا کیا میں اس سلسلے میں اس کی مدد کر سکتا ہوں۔ میں اس خدمت کے لیے تیار تھا۔ اس نے مجھے مرسڈیز کاروں کا ایک شوروم دکھایا جہاں پر اس کی پسند کی کار کھڑی تھی۔ میں نے مالک دکان سے بات کی اور کہا کہ میرا دوست فلاں کار خریدنی چاہتا ہے اور میں سودا کرا سکتا ہوں مگر میری شرط یہ ہے کہ قیمت خرید میں سے مجھے کمیشن ملے۔ وہ فوراً اس کے لیے تیار ہو گیا۔ چنانچہ جھٹ پٹ کار کا سودا ہو گیا۔ اس کے بعد میں پاکستانی تاجر کو الیکٹرک سامان کی دکان میں لے گیا جہاں پر اس نے ریڈیو، ٹیپ ریکارڈر اور فوٹو کاپی کی مشین، جو نئی نئی آئی تھی، اور دوسرا بہت سا سامان خریدا۔ ہر جگہ پر مجھے کمیشن ملتا گیا۔ شام تک میری جیب میں اتنے مارک ہو گئے کہ میں دو چار مہینوں کے لیے خود کفیل ہو گیا۔ اب میرے لیے مشن ہاؤس کو خیر باد کہنے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔

دسمبر 1969ء میں نو برسوں کے بعد میں پہلی بار لوٹ کر پاکستان جا رہا تھا۔ دسمبر کے آخری ہفتے میں جماعتِ احمدیہ کا سالانہ جلسہ ربوہ میں منعقد ہونا تھا۔ میں نے سوچا کہ قدیمی دوستوں سے ملنے کا اچھا موقع ہے۔ تاہم مجھے پتا تھا کہ لوگ وہاں پر مجھ سے سرِ عام ملنے سے کترائیں گے۔ چنانچہ بے شمار لوگوں نے مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا۔ البتہ جامعہ احمدیہ کے وائس پرنسپل ملک سیف الرحمٰن نے اپنے گھر پر آنے کی دعوت دی۔ مرزا حنیف احمد نے بھی ناشتے پر بلایا۔ مگر جب میں مقررہ وقت پر آٹھ بجے پہنچا تو موصوف ابھی نیند سے بیدار نہیں ہوئے تھے۔ مرزا رفیق احمد نے مجھے سڑک

پر چلتے ہوئے دیکھا۔ کار رکوا کر اترا اور گرم جوشی سے معانقہ کیا۔ پھر اپنی کوٹھی پر آنے کی دعوت دی۔ میں گیا تو معلوم ہوا کہ گھر میں تاش کی بازی چل رہی ہے۔ مجھے اپنے باغ کے ایک کنج میں لے جا کر بٹھایا۔ مگر آدھ گھنٹے میں ہی ملازم بیگم صاحبہ کا پیغام لے کر آ گیا کہ ان کے بغیر تاش کی بازی رکی ہوئی ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ میں اس کا جرمنی کے کسی کاروباری سے رابطہ کرا دوں، جس کے ساتھ وہ تجارت کر سکے۔ اتفاق سے مجھے ایک کمپنی کا پتا تھا جو پاکستان سے جوار کی فصل درآمد کرنے میں دلچسپی رکھتی تھی۔ میں نے مرزا رفیق احمد کو کہا موقع اچھا ہے، تم اپنی زمینوں میں جوار بونی شروع کر دو۔ وہ مجھے اپنا پارٹنر بنانا چاہتا تھا مگر میں اس کے ساتھ تجارتی اشتراک کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ میں اس کی متلون مزاجی کو جانتا تھا اور مجھے خطرہ تھا کہ اس کی تجارت جرمن کمپنی کے ساتھ بہت دنوں نہ چل سکے گی۔ مرزا خلیل احمد کی کوٹھی بن چکی تھی اور اس کی دوسری شادی بھی ہو گئی تھی۔ میں اس کے گھر پر پہنچا تو وہ بیٹھا ہوا چائے پی رہا تھا۔ میں نے کہا یہ بھی خوب رہی۔ جب میں نو برس قبل گیا تھا تو تم کو چائے پیتا ہوا چھوڑ کر گیا تھا۔ اور اب اتنے دنوں کے بعد لوٹا ہوں اور تم چائے کی پیالی کو ہاتھوں میں تھامے ہوئے بیٹھے ہو۔ گھر سے باہر نکل کر دیکھو دنیا بدل چکی ہے۔ میں نے اس سے ملتی جلتی بات مرزا حنیف احمد سے بھی کہی تھی۔ اس نے جواب دیا تھا کہ اسے ربوے سے باہر جانے کی کیا ضرورت ہے۔ اس کی زمینوں سے اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی ہے۔ باہر تو وہ لوگ جائیں جنھوں نے نوکری کرنی ہے۔ سنا تھا کہ ''خاندانِ نبوت'' کے افراد کو جماعت کی طرف سے وظیفہ ملتا ہے جو اس آمدنی کے علاوہ ہوتا ہے جو وہ خود پیدا کرتے ہیں۔

ڈاکٹر پرویز پروازی نے اپنے گھر پر ایک مشاعرہ منعقد کرایا جس میں جلسہ پر آئے ہوئے تمام معروف احمدی شعراء کو شامل ہونے کی دعوت دی گئی تھی۔ میں بھی وہاں پر موجود تھا مگر ہر کوئی ایک دوسرے سے ڈرتے ہوئے مجھ سے مصافحہ کرنے سے گھبراتا تھا۔ میں ایک کونے میں بیٹھا ہوا مشاعرہ سنتا رہا۔ حاضرین نے مجھے مکمل طور پر نظر انداز کیا۔ دوسرے یا تیسرے روز میں وکیل التعلیم کے دفتر میں یہ پوچھنے کے لیے گیا کہ مجھے کب تک جامعۃ المبشرین کا فائنل امتحان ''شاہد'' پاس کرنے کی سند جاری کی جائے گی، جس کے لیے میں نے بہت دنوں سے درخواست دے رکھی تھی۔ یہ عہدہ اس زمانے میں سابق مبلغ مغربی افریقہ نسیم سیفی کے پاس تھا۔ وہ بہت اچھے شاعر اور نفیس انسان تھے۔ آگے چل کر ان کو جماعتِ احمدیہ کے روزنامہ ''الفضل'' کا مدیر مقرر کیا گیا تھا۔ اس روز وہ پرویز پروازی کے گھر پر ہونے والے مشاعرے میں موجود تھے۔ انھوں نے معذرت چاہی کہ انھوں نے اس روز دوسروں کی دیکھا دیکھی مجھ سے مصافحہ نہیں کیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ مشاعرے

میں شامل ہونے والے سب شاعروں کو پتا تھا کہ میں کون ہوں مگر سبھی مجھ سے مصافحہ کرنے سے گھبراتے تھے کہ کہیں ان پر حرف نہ آ جائے۔ جہاں تک ''شاہد'' کی سند کا سوال تھا وہ مجھے یہ سند جاری کرنے کے حق میں تھے۔ انھوں نے ایک فائل کھول کر مجھے سند دکھائی جو ان کے کہنے پر تیار کی گئی تھی مگر اس کو جاری کرنے کے لیے ان کو جماعتِ احمدیہ کے سربراہ مرزا ناصر احمد کی منظوری درکار تھی۔ جب متعلقہ فائل موصوف کے سامنے پیش ہوئی تو انھوں نے اپنے قلم سے اس پر لکھا کہ سند جاری نہ کی جائے۔ انھوں نے مجھے وہ کاغذ دکھایا جس پر یہ فقرہ درج تھا۔ مجھے اس سند کی ضرورت اس لیے تھی کہ جرمنی میں ہر کارکن کو اپنی نوجوانی کے ہر سال کے بارے میں دستاویزی ثبوت پیش کرنا ہوتا ہے، جس سے ثابت کیا جا سکے کہ اس نے وہ سال کہاں پر تعلیم حاصل کرنے میں یا کوئی پیشہ سیکھنے کے لیے ٹریننگ لیتے ہوئے گزارے تھے۔ پھر یہ ثبوت مہیا کرنا ہوتا ہے کہ اس نے اپنے تعلیمی کورس کو کامیابی کے ساتھ تکمیل تک پہنچایا تھا۔ پنشن کے لیے صرف ان برسوں کا شمار ہوتا ہے جن کے بارے میں کاغذی ثبوت مہیا کیا جا سکے۔ میرے پاس یونیورسٹی کی ڈگریاں تو موجود تھیں مگر جامعۃ المبشرین میں گزارے ہوئے تین برسوں کا کوئی تحریری ثبوت موجود نہ تھا۔ میں نے اس بارے میں برسوں کے بعد چوتھے خلیفہ مرزا طاہر احمد کو لکھا، جس میں بین السطور یہ بات واضح کی گئی تھی کہ اگر مجھے سند جاری نہ کی گئی تو میں اس سلسلے میں عدالت کا دروازہ بھی کھٹکھٹا سکتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ وہ مجھے اس اقدام پر مجبور نہیں کریں گے۔ بات ان کی سمجھ میں آ گئی اور مجھے سند جاری کر دی گئی۔

عین اسی مہینے میں، جس میں مجھے ڈاکٹریٹ ملی، جماعت احمدیہ کے خلیفہ ثالث مرزا ناصر احمد اپنے یورپ کے دورے کے دوران ہمبرگ بھی تشریف لائے۔ ان کے ساتھ اپنے خرچ پر سفر کرنے والوں میں ایک شخص مستری فضل دین مجھے احمد نگر کے زمانے سے جانتا تھا۔ وہ مجھے آ کر ملا اور اس نے کہا کہ حضرت صاحب نے اسے خاص طور پر بتایا ہے کہ ہمبرگ میں جماعت سے بھاگے ہوئے منیر الدین احمد نے ایک بے نکاحی جرمن عورت کو گھر میں ڈال رکھا ہے اور اس سے اس کی ایک بیٹی بھی ہے۔ موصوف نے اسے مجھ سے ملتے ہوئے محتاط رہنے کی ہدایت فرمائی تھی۔ میں یہ جان کر بہت حیران ہوا کہ مرزا ناصر احمد اس قسم کے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرنے سے بھی باز نہیں رہتے۔

میں نے بچپن میں قادیان کے قیام کے دوران ایک شامی شخص کو دیکھا تھا، جو سرخ طربوش پہنتا تھا اور جس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ دمشق کا رہنے والا ہے۔ اس کا نام منیر الحصنی تھا۔ وہ کئی ماہ تک قادیان میں مقیم رہا تھا۔ اب چونکہ میں اس کے شہر میں تھا، اس لیے میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اسے تلاش کروں۔ مجھے پتا تھا کہ اس کے خاندان کے افراد کی دکانیں سوق

مدحت باشا میں تھیں۔ شام کے وقت میں نے بازار میں جا کر اس کے بارے میں پوچھا۔ منٹوں کے اندر مجھے اس کے عزیزوں کی دکان پر پہنچا دیا گیا۔ وہ لوگ مجھے اس کے مکان پر چھوڑ آئے جو شہر کی قدیمی آبادی میں تھا۔ منیر الحصنی نے، جو تھوڑی بہت اردو جانتے تھے، مجھے اپنے دیوان خانے میں لے جا کر بٹھایا جس کے نقش و نگار کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ سات سو سال پرانے ہیں۔ الحصنی دمشق کا ایک معزز علمی خاندان ہے جو سات آٹھ سو سال قبل ماوراء النہر سے ہجرت کر کے آیا تھا۔ ان کا خاندانی کتب خانہ بہت بڑا تھا۔

میرا تعارف وہاں پر ایک پاکستانی نوجوان مرزا منصور احمد سے ہوا جس کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ جماعت احمدیہ پنجاب کے صدر مرزا عبدالحق کا بیٹا ہے۔ وہ جامعہ احمدیہ کا فارغ التحصیل تھا اور عربی کی مزید تعلیم کی خاطر شام آیا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ جماعت احمدیہ کے سربرآوردہ لوگوں میں سے ایک نے اپنے بیٹے کی زندگی خدمت دین کے لیے وقف کی تھی وگرنہ عام طور سے واقفین زندگی عامیوں کے بیٹے ہوتے ہیں۔ منصور احمد مجھے ہوٹل تک چھوڑنے کے لیے آیا۔ مجھے اس کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ اس کا اپنے باپ کے ساتھ جھگڑا چل رہا تھا۔ اس نے باپ کے سامنے یہ شرط رکھی تھی کہ اگر وہ اس کو جماعت کا مبلغ بنانا چاہتا ہے، تو اسے اس کے مالی مستقبل کو مضبوط بنانے کے لیے اپنی ساری جائیداد اس کے نام کرنی ہوگی۔ جب تک یہ بات طے نہیں ہو جاتی، وہ اپنی عربی تعلیم کو جاری رکھنا چاہتا تھا۔ اس کا ارادہ تھوڑے عرصہ تک قاہرہ جانے کا تھا جہاں پر وہ الازہر یونیورسٹی میں داخلہ لے گا۔ وہ میرے ساتھ خط و کتابت کے ذریعہ رابطہ رکھنا چاہتا ہے، اس لیے اس نے مجھے قاہرہ میں جماعت احمدیہ کے صدر الاستاذ محمد البسیونی کا پتا دیا، جن کی معرفت اسے وہاں پر خط مل جایا کریں گے۔

پاکستان میں جماعت احمدیہ کے خلاف چلنے والی مہم کے نتیجے میں، جو جنرل ضیاء الحق کے زمانہ حکومت میں تیز تر ہو گئی تھی، احمدی بہت بڑی تعداد میں ملک سے ہجرت کرنے لگے تھے۔ جرمنی ان ممالک میں سے تھا، جہاں پر انھوں نے پناہ (asylum) حاصل کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ تھوڑے عرصے کے اندر اندر ہزاروں اشخاص نے پناہ لینے کی خاطر اس ملک میں درخواستیں داخل کرا دیں۔ جرمن قوم کو ہٹلر کی نازی حکومت کے زمانے میں یہ تجربہ ہوا تھا کہ یورپ کے اکثر ممالک میں ان لوگوں کو سیاسی پناہ نہیں مل سکی تھی، جن کو نازی حکومت کی بربریت کے سبب ملک چھوڑنا پڑا تھا اس لیے دوسری جنگ عظیم کے خاتمے پر جب مغربی جرمنی میں جمہوری حکومت قائم ہوئی، تو اس چیز کا خاص خیال رکھا گیا کہ قانونِ اساسی میں یہ چیز شامل کی جائے کہ اس ملک میں ان لوگوں کو پناہ دی

جائے گی، جن کو سیاسی وجوہات کی بنا پر اپنے وطن سے ہجرت کرنا پڑتی ہے۔

جب احمدیوں نے جرمنی میں پناہ لینے کے لیے درخواستیں دیں، تو علاوہ دوسرے سوالوں کے یہ سوال بھی اٹھایا گیا تھا کہ کیا ان کو سیاسی وجوہات کی بنا پر ملک سے نکلنا پڑا تھا اور کیا ان کے خلاف چلنے والی مہم کے مقاصد میں یہ چیز شامل تھی کہ احمدیوں کو ملک چھوڑنے پر مجبور کر دیا جائے؟ چونکہ جرمن حکومت کا متعلقہ ادارہ احمدیوں کو جرمنی میں پناہ دینے کے خلاف تھا، اس لیے عدالت نے اس بارے میں جرمن اورینٹ انسٹیٹیوٹ کی معرفت مجھ سے ایک رپورٹ لکھنے کی درخواست کی، جس میں اس معاملے کے تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے بتایا جائے کہ کیا احمدیوں کے خلاف پاکستان میں چلنے والی مہم کے نتیجے میں ان کو اپنا وطن چھوڑنا پڑا تھا یا اس کے پیچھے دوسرے اسباب کارگر تھے۔ عدالت نے خاص طور پر مجھے ہدایت کی کہ خود پاکستان جا کر وہاں کے حالات کا جائزہ لوں۔ اس کے علاوہ عدالت یہ جاننا چاہتی تھی کہ اس ملک میں احمدیوں کی تعداد کتنی ہے؟ کیونکہ اس بارے میں جماعت احمدیہ کے پیش کردہ اعداد و شمار غیر یقینی تھے۔

مجھے پاکستان میں ایک بہت دلچسپ صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ جماعت احمدیہ کے نمائندے مولوی فضل الٰہی انوری نے جرمن سفارت خانے میں اسلام آباد جا کر یہ بیان دیا تھا کہ احمدیوں کو پاکستان میں کسی قسم کی مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑ رہا، ان کے خلاف کوئی مہم نہیں چلائی گئی اور کوئی مذہبی یا سیاسی جماعت ان کو پاکستان سے نکلوانے کا ارادہ نہیں رکھتی۔ اس کے الٹ مجھے مختلف مذہبی جماعتوں کے نمائندوں نے صاف صاف بتایا کہ وہ پاکستان کو احمدیوں سے پاک کرنا چاہتے ہیں۔ جماعت احمدیہ کے نمائندے کا بیان صریحی طور پر ان بیانات کے خلاف تھا، جو جرمنی میں پناہ لینے والے احمدی دے رہے تھے۔ آگے چل کر اس پالیسی میں تبدیلی آ گئی تھی، کیونکہ احمدیوں کو جرمنی اور بعض دوسرے یورپی ملکوں میں پناہ ملنے لگی تھی، جس سے جماعت احمدیہ فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔ اب تک لگ بھگ چالیس ہزار احمدیوں کو جرمنی میں پناہ مل چکی ہے۔

پاکستان میں جماعت احمدیہ کے اراکین کی تعداد کے بارے میں بدستور غلو سے کام لیا جا رہا ہے۔ مجھے جماعت کے نمائندہ شفیع اشرف نے بتایا تھا کہ پاکستان میں احمدیوں کی تعداد تیس اور چالیس لاکھ کے درمیان ہے۔ یہی تعداد خلیفہ ثالث مرزا ناصر احمد نے پارلیمان کے کمیشن کو بتائی تھی۔ جب میں نے اس بارے میں احمدی صحافی ثاقب زیروی سے استفسار کیا، تو موصوف نے احمدیوں کی تعداد پینتالیس لاکھ بتائی۔ اتفاقی طور پر مجھے ساتویں دہائی کی احمدیہ مجلس مشاورت کی ایک رپورٹ مل گئی، جس میں چندہ دینے والوں کی کل تعداد پچیس ہزار بتائی گئی تھی۔ یہ جاننا چاہیے کہ جو احمدی تین

ماہ تک لازمی چندہ نہیں دیتا اس کو جماعت سے خارج کر دینے کا حکم ہے۔ اس لیے یہ فرض کر لینا غلط نہیں کہ پچیس ہزار چندہ دینے والے جماعت کے ایکٹو (Active) ممبر ہیں۔ یہ ممبر عام طور سے خاندانوں کے سربراہ ہوتے ہیں، اس لیے اگر ہر خاندان کے دس افراد تصور کر لیے جائیں، تو کل تعداد دو لاکھ پچاس ہزار بنتی ہے۔ اب اگر تصور کر لیا جائے کہ چندہ نادہندگان احمدیوں کی تعداد بھی اتنی ہی ہے، جتنی چندہ دینے والوں کی، تو احمدیوں کی کل تعداد پانچ لاکھ بنتی ہے۔ اس سے زیادہ احمدی میرے اندازے کے مطابق اس وقت پاکستان میں نہیں پائے جاتے تھے۔ میں نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ دنیا بھر میں احمدیوں کی تعداد دس لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ یہ بہت بعد کی بات ہے کہ خلیفہ رابع مرزا طاہر احمد نے ہر سال احمدیوں کی تعداد کو بڑھا چڑھا کر بتانا شروع کیا۔ ان کی 2003ء میں وفات تک، بقول ان کے، ساری دنیا میں احمدیوں کی تعداد بیس کروڑ تک پہنچ چکی تھی اور اس میں سال بہ سال اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ صرف ہندوستان میں احمدیوں کی تعداد سات کروڑ بتائی گئی۔ گویا اس ملک میں ہر دوسرا مسلمان احمدی تھا۔ ان کے جانشین مرزا مسرور احمد نے 2003ء میں بیعت کرنے والوں کی تعداد تین لاکھ چالیس ہزار بیان کی ہے۔ (یہ محض مبالغہ آرائی اور جھوٹ ہے ورنہ ریکارڈ پر اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ مرتب)

✿.....✿.....✿

علامہ خالد محمود

پیغمبرانہ پناہ گاہ ربوہ؟

قادیانیوں کے سلسلہ ربوات کی عبرتناک داستان

اللہ تعالیٰ کے پیغمبر جب دنیا میں آتے ہیں تو انھیں چاروں طرف سے مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، طاغوتی طاقتیں ان کے لیے ہر آن ایک نئی مصیبت بنتی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ اپنے بھیجے ہوئے انسانوں کی نصرت فرماتا ہے اور اس کے رسولوں کو غلبہ مل کر رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا انھیں ایسا سہارا ملتا ہے کہ باطل کے ریلے پر اٹھا جھاگ آخر ناپید ہو جاتا ہے اور جو چیز انسانوں کے لیے نفع مندر ہے، بقاء اسی کو ملتی ہے۔

آسمانی نوشتے کبھی غلط نہیں ہوتے اور اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں سے کیے وعدے کبھی غلط نہیں کرتا فلا تحسبن اللّٰہ مخلف وعدہ رسلہ ان اللّٰہ عزیز ذوانتقام (ابراہیم:47)

ترجمہ: ''سو آپ خیال نہ کریں کہ اللہ اپنے رسولوں سے کیے وعدے کا خلاف کرے گا، بیشک اللہ زبردست ہے انتقام لینے والا۔''

آنجہانی مرزا غلام احمد قادیانی نے ہندوستان میں جب نبوت کا دعویٰ کیا اور مسلمانان ہند نے تیرہ صدیوں کی یہ نامانوس صدا سنی تو جہاں یہ آواز مسلمانان ہند کے لیے ایک زبردست فتنے کا الارم تھا، وہاں ''محمد کے بروز'' کا یہ اشتعال انگیز دعویٰ مرزا غلام احمد کے لیے بھی کوئی کم خطرہ نہ تھا۔ یہ ایک ایسا جرم ہے کہ اگر اس کا مدعی پہلے مسلمان تھا اور اب دیوانہ نہیں تو اس کی سزا باتفاق فقہاء اسلام موت ہے۔ مایوسیوں کے اس گھٹاٹوپ اندھیرے میں مرزا غلام احمد قادیانی نے اعلان کیا کہ میری پناہ گاہ سلطنت برطانیہ ہے۔ جعل لی السلطنہ البرطانیہ ربوہ امن و راحہ ومستقرا حسنا فالحمد للّٰہ. (ضمیمہ حقیقت الوحی ص 46 مندرجہ روحانی خزائن ج 22 ص 668 از مرزا قادیانی)

ترجمہ: ''اللہ تعالٰی نے میرے لیے سلطنت برطانیہ کو ربوہ، امن و راحت کی (پناہ گاہ) بنایا ہے اور یہ ٹھہرنے کی اچھی جگہ ہے اور اس پر خدا کی حمد و ثناء ہے۔

اور مرزا غلام احمد قادیانی نے یہ بھی کہا کہ:

"اعملو ایها الاخوان اننا قد نجونا من ایدی الظالمین فی ظل دوله هذه المکیلة...... التی نضرنا فی حکومتها کنضاره الارض من ایام التهتان."

(آئینہ کمالات اسلام ص 517 مندرجہ روحانی خزائن ج 5 ص 517 از مرزا قادیانی)

ترجمہ: ''اے بھائیو جانو کہ ہم نے ملکہ وکٹوریہ کی حکومت کے سائے میں ظالموں کے ہاتھوں نجات پائی ہے۔ ہم اس حکومت کے سایہ میں اس طرح سرسبز ہوتے ہیں جیسے زمین، موسم بہار میں سرسبز ہوتی ہے۔

اور پھر مرزا قادیانی نے یہ بھی کہا:

"ولو لاهيبة سيف سله عدل سلطنه البرطانيه لحث الناس علی سفک دمی."

(آئینہ کمالات اسلام ص 18 مندرجہ روحانی خزائن ج 5 ص 18 از مرزا قادیانی)

ترجمہ: ''اور اس تلوار کی ہیبت نہ ہوتی جو سلطنت برطانیہ نے سونت رکھی ہے تو لوگ میرا خون کر دیتے۔''

خدا کا یہ وعدہ کیسا رہا؟

انگریزوں کو جب ہندوستان سے نکلنا پڑا اور ہندوؤں اور سکھوں نے قتل و غارت کا بازار گرم کیا تو مرزا غلام احمد قادیانی کے پیرو بھی قادیان میں نہ رہ سکے اور انھیں بھی اسی طرح وہاں سے نکلنا پڑا جس طرح مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ اور سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کو امرتسر چھوڑنا پڑا۔ ذہن میں سوال ابھرتا ہے کہ خدا کا مرزا غلام احمد سے کیا ہوا یہ وعدہ کہ سلطنت برطانیہ اس کی پناہ گاہ رہے گی، کہاں گیا؟

بات دراصل یہ ہے کہ مرزا قادیانی نے جب یہ اعلان کیا تھا کہ خدا تعالٰی نے سلطنت برطانیہ کو میرا ربوہ بنایا ہے تو اس وقت اسے علم نہ تھا ایک دن آئے گا کہ انگریزوں کو

اس ملک سے جانا پڑے گا اور اس بے بسی میں جانا ہوگا کہ گورداسپور کو بھی اپنے ماتحت نہ رکھ سکیں گے۔ ہمارا سوال یہ ہے کہ بیشک مرزا غلام احمد کو اس کا علم نہ تھا لیکن کیا مرزا غلام احمد کے خدا کو بھی اس کا علم تھا یا نہیں، جس نے یہ سہارا دیا تھا؟

وہ منظر کتنا رقت آمیز تھا جب مرزا محمود اور چودھری ظفر اللہ خان اس وقت کے گورنر پنجاب گلینی (Glaney) کو ملے تھے اور وعدے یاد دلائے تھے جو ملکہ وکٹوریہ نے ان سے کیے تھے اور جارج ششم کے بعد تک ان پر عمل درآمد ہوتا رہا اور مسٹر گلینی نے اپنی بے بسی اور معذرت ظاہر کی تھی۔ مرزا محمود زبان حال سے یہ گنگناتے ہوئے اس طرح نکلے کہ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے ۔

عمر بھر کا سہارا بنو تو بنو
چار دن کا سہارا سہارا نہیں

اور پھر مرزا محمود نے چودھری ظفر اللہ سے کہا کہ ہم بے سہارا ہو گئے ہیں، اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کہ پاکستان چلے جائیں۔ جب انگریز دوبارہ یہاں آ جائیں گے تو ہم بھی اپنے ربوہ میں آ ئیں گے۔ پھر مرزا محمود مسلمان فوجوں کی پناہ میں قادیان سے نکلے اور لاہور آئے۔ اس سفر میں مرزا محمود مسلمان فوجوں کی بہت آؤ بھگت کر رہے تھے۔ مولانا ظفر علی خان مرحوم نے جب یہ منظر دیکھا تو بے ساختہ کہہ اٹھے ۔

ذریہ البغایا کل تک تھا نام جن کا
آج ان کی چاپلوسی کیوں ہو گئی ضروری

مرزا محمود کا ایک نیا استدلال

اب جب مرزا محمود پاکستان میں آ گئے تو جھٹ ایک استدلال کیا کہ پیغمبروں کے لیے ہجرت ایک ضروری مرحلہ ہے۔ مرزا غلام احمد اپنی زندگی میں ہجرت نہ کر سکا، اب ہم اس کی طرف سے یہ ذمہ داری ادا کر رہے ہیں۔ دوسرے مسلمانوں کے لیے تو یہ ایک سیاسی عمل ہے لیکن ہمارے لیے یہ ایک دینی تقاضا تھا جو ہمارے یہاں آنے سے پورا ہو گیا۔

قادیانیوں کا دوسرا ربوہ

مرزا غلام احمد کا دعوے شروع سے مسیح موعود ہونے کا رہا ہے جس کا حاصل یہ ہے

کہ میں عیسیٰ بن مریم ناصری نہیں ہوں بلکہ اس کا مثیل ہوں اور صرف اس جہت سے مجھے عیسیٰ بن مریم کہا گیا ہے۔ حضرت عیسیٰ بن مریم جب اپنی والدہ حضرت مریم علیہا السلام کے ساتھ نکلے تھے تو ایک ٹیلے پر ٹھہرے تھے۔ یہ ایک بڑی شاداب جگہ تھی اور سامنے صاف پانی بہہ رہا تھا۔ ٹیلے کو عربی میں ربوہ کہتے ہیں۔ قرآن کریم میں اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

واوينهما الى ربوه ذات قرار و معين. (المومنون:50)

ترجمہ: ''اور ہم نے ماں بیٹے کو ٹھکانہ دیا ایک ٹیلے پر جہاں ٹھہرنے کی جگہ تھی اور صاف پانی بہہ رہا تھا۔''

قادیانیوں کا عقیدہ ہے کہ جس طرح اس مسیح کے لیے ایک ربوہ تھا جہاں اسے پناہ ملی، اسی طرح اس مثیل مسیح کے لیے بھی ایک ربوہ ہے، اسے بھی ہندوستان سے نکلنے کے بعد ایک پہاڑی علاقے میں پناہ مل گئی جہاں آگے دریائے چناب چل رہا ہے۔ سو اس طرح ضلع جھنگ کی یہ سرزمین قادیانیوں کا ربوہ بنی۔ مرزا محمود نے اس حصہ زمین کا نام ربوہ رکھا اور اسے اپنی جماعت کے لیے ایک خدائی پناہ گاہ قرار دیا۔ مرزا محمود نے اپنے اس اعلان پر جب یہ آیت پڑھی واوينهما الى ربوه تو سارے قادیانی شرنارتھی جھوم جھوم اٹھے اور انھیں یقین ہو گیا کہ اب ہمیں یہاں سے نکلنا نہ ہوگا۔ جب پناہ دینے والا خدا ہو تو پھر کون ہے جو کسی کو یہاں سے نکال سکے۔ یہ جگہ (ربوہ ضلع جھنگ) کچھ دیر تک مرزا محمود کے لیے پناہ گاہ رہی۔ 1953ء میں جب تحریک ختم نبوت اٹھی تو مرزا محمود نے اپنی جماعت سے کہا کہ فکر نہ کریں، خدا کی طرف سے ہم اس پناہ گاہ میں لائے گئے ہیں۔ یہاں ہم خدا کی حفاظت کے پہرے میں ہیں۔ پھر جب مرزا ناصر کا دور آیا اور اس نے بھی اپنے مرنے کے لیے اپنے بہشتی مقبرے کو چنا، پھر مرزا طاہر کا دور آیا اور شعائر اسلامی کی توہین کے الزام میں گرفتاری کا اندیشہ ہوا تو وہ راتوں رات اس پناہ گاہ سے نکلا اور اب یہ جگہ بھی اس کے لیے ربوہ (پناہ گاہ) نہ رہی۔

قادیانیوں کا تیسرا ربوہ

مرزا طاہر کو لندن میں پناہ ملی اور وہ یہاں اپنے سلسلے کا چوتھا سربراہ بنا۔ آج کل قادیانی جماعت کا پانچواں خلیفہ یہاں کام کر رہا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ جگہ کب تک اس کا مستقر رہے گی؟ آسمانی سربراہ جب ہجرت کرتے ہیں تو وہ کسی آزاد علاقے کا رخ کرتے

ہیں جہاں وہ ایک آزاد سربراہ کے طور پر رہ سکیں۔ بنی اسرائیل نے جب مصر سے ہجرت کی تو کس لیے؟ اس لیے کہ وہ ایک ایسی جگہ رہیں جہاں ان کی دینی سربراہی ہو۔ حضرت خاتم النبیین ﷺ نے مدینہ منورہ ہجرت کی تو کس لیے؟ اس لیے کہ آپ وہاں ایک آزاد اسلامی سربراہ کے طور پر ایک اسلامی ریاست قائم کریں۔ دوسروں کے دباؤ سے نکلنا اسی لیے تو ہوتا ہے کہ دوسری جگہ آزادی ملے۔ یہ قادیانی سلسلہ ربوات کیا ہے کہ یہ سب غلامی کے سائبان ہیں جو یکے بعد دیگرے چلے آ رہے ہیں۔ پہلے قادیان میں انگریزوں کی غلامی کا طوق تھا پھر پاکستان میں مسلمانوں کی ماتحتی اور غلامی، اور اب لندن میں پھر انگریزوں کی غلامی، کیا مرزا غلام احمد، مرزا بشیر الدین محمود، مرزا ناصر، مرزا طاہر اور مرزا مسرور ہی وہ حرماں نصیب لوگ ہیں کہ آزادی کا ایک سانس ان کی قسمت میں نہیں۔

مولوی محمد علی لاہوری کا ربوہ

1914ء میں جب قادیانیوں میں مرزا بشیر الدین کی سربراہی زیر بحث آئی تو مولوی محمد علی لاہوری اور خواجہ کمال الدین نے مرزا بشیر الدین کے سربراہ بننے کی بھرپور مخالفت کی مگر جب مرزا بشیر الدین محمود جماعت کی امارت کو اپنی خاندانی وراثت بنانے میں کامیاب ہوا تو مولوی محمد علی نے اپنا مستقر لاہور کو بنایا اور لاہور سے اپنا ترجمان پرچہ ''پیغام صلح'' جاری کیا۔ اس گروہ کے قادیانی ''لاہوری'' کہلاتے ہیں۔ قادیان سے مرزا بشیر الدین محمود اور مولوی محمد علی دونوں نکلے۔ مولوی محمد علی پہلے نکلے اور مرزا محمود 1947ء میں۔ بعدازاں 1974ء میں قادیانیوں کے ان دونوں گروہوں کو قانون اور دستور کی رو سے غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا گیا۔ برطانیہ میں لاہوری جماعت کا ربوہ، مسجد ووکنگ تھی۔ قادیانیوں کو یہاں سے بھی نکلنا پڑا اور یہاں انگریزی حکومت بھی ان کے لیے پناہ گاہ نہ بن سکی۔ قادیانیوں نے ایک بیان میں کشمیر کو بھی اپنا ربوہ بنایا ہے اس پر ہم تبصرے کا حق محفوظ رکھتے ہیں۔

❁......❁......❁

یادگار نظمیں

قادیان کی نبوت

بروزی ہے نبوت قادیاں کی
برازی ہے خلافت قادیاں کی

عداوت حق سے، باطل سے محبت
ہے اتنی ہی حقیقت قادیاں کی

ہیں احمق جس قدر ہندوستان میں
ہے آباد ان سے جنت قادیاں کی

نصاریٰ کی پرستش کے سب اسرار
سکھاتی ہے شریعت قادیاں کی

دمشق اور اندلس کے بھاگ جاگے
بٹی جس وقت لعنت قادیاں کی

مسلمانوں کی آزادی ہو نابود
الم نشرح ہے نیت قادیاں کی

لگے رونے بشیر الدین محمود
بنائی میں نے وہ گت قادیاں کی

(مولانا ظفر علی خانؒ)

فتنہ آخر زماں

اے قادیاں، اے قادیاں تیرے بڑے لنگور کو
لپٹا لیا کرتا ہے جو ہر شب نئی اک حور کو
جس نے ہنسایا ناچ کر کشمیر اور میسور کو
جس کی ترش روئی ملی نیبو کو اور اچور کو
لکھوں دمشقی گورخر یا اندلس کی مادیاں
اے قادیاں اے قادیاں اے فتنہ آخر زماں

پیسہ ترا ایمان ہے، گالی تری پہچان ہے
جنس نفاق و کفر سے چمکی تری دکان ہے
بہتاں خدا پر باندھنا تیرے نبی کی شان ہے
الہام جو بھی ہے ترا آوردہ شیطان ہے
یہ بھی خدا کا آخری اسلام پر احسان ہے
نقاش کی مٹھی میں گر پوشیدہ تیری جان ہے
اے قادیاں اے قادیاں اے دشمن اسلامیاں
اے فتنہ آخر زماں

(مولانا ظفر علی خانؒ)

اپنی اپنی قسمت

قادیان پہلے تو پاپا کا بڑا بھائی بنا
پھر وہ انگریزوں کے گھر کا معتبر نائی بنا

مذہبی صرافے میں نرخ اس کا گرتا ہی گیا
پیسے سے دھیلا ہوا اور دھیلے سے پائی بنا

دیکھ لو جا کر بہشتی مقبرے والوں کا حال
کوئی بھتنا ہو گیا، کوئی چھلپائی بنا

شرک ان پچکے ہوئے گالوں کا پوڈر ہو گیا
کفر کی اکڑی ہوئی گردن کی ٹکلائی بنا

اک نیا کذاب جب پیدا ہوا پنجاب میں
قادیاں اس طفل ناہموار کی دائی بنا

اپنا اپنا ہے مقدر اپنا اپنا ہے نصیب
ہو گیا کوئی مسلمان، کوئی مرزائی بنا

(مولانا ظفر علی خانؒ)

ارمغان قادیان

تم کو گر منظور ہے سیر جہان قادیاں
اے مسلمانو! خریدو ''ارمغان قادیاں''

کس طرح ممکن ہے، دل پر ہو کسی کو اختیار
جب ہوں دل کے چھیننے والے بتان قادیاں

جو مجاور ہیں بہشتی مقبرے کے آج کل
بیچتے پھرتے ہیں گھر گھر استخوان قادیاں

صرف غائب نحو عنقا اور سلاست ناپدید
ان سب اجزا سے مرکب ہے زبان قادیاں

لوگ حیراں تھے کہ جب پھیکا ہے پکوان اس قدر
ہو گئی پھر اتنی اونچی کیوں دکان قادیاں

جو فروشی کے لیے گندم نمائی شرط تھی
تھا بڑا ہی کائیاں بازارگان قادیاں

کیا سلوک ان سے روا رکھتے ہیں منکر اور نکیر
قبر میں خود دیکھ لیں گے منکران قادیاں

(مولانا ظفر علی خانؒ)

دور جاہلیت کی یاد

بتان قادیاں اس واسطے مجھ پر بگڑتے ہیں
کہ دور جاہلیت میں مرا دل ان پہ مائل تھا

زکوٰۃ حسن دینے میں ذرا وہ بخل کرتے تھے
مگر میں بے لیے ٹلتا نہ تھا ایسا ہی سائل تھا

پیمبر زادگی ان کی مرے آڑے تو آتی تھی
مگر میں اس نبوت کا نہ قائل ہوں نہ قائل تھا

میں رند لم یزل ہوں اس کی کچھ پروا نہ تھی مجھ کو
کہ ان کے اور میرے درمیاں اسلام حائل تھا

وہ ٹھکراتے رہے اپنے سراپا سے مجھے لیکن
مرا ہاتھ ان کی نور افروز گردن میں حمائل تھا

نگاہ رشک سے دیکھا مجھے "الفضل" نے برسوں
میں ان کے ابروئے خمدار کے خنجر کا گھائل تھا

انہیں ہے قادیاں میں آج کل دعویٰ خدائی کا
بتوں کی اس خدائی کا میں پہلے ہی سے قائل تھا

(مولانا ظفر علی خانؒ)

ربوہ

اس نامراد شہر کی ہیبت مٹائے جا
ربوہ غلط مقام ہے اس کو ہلائے جا
سنتا ہوں قادیاں کا جنازہ نکل گیا
اس کا وجود پاؤں کی ٹھوکر پہ لائے جا
اپنے خدا سے مانگ محمدؐ سے انتساب
ان کے حضورؐ عشق کے دیپک جلائے جا
آئے گی موت واقعتہً ایک دن ضرور
پھر موت کیا ہے کچھ نہیں غیرت دکھائے جا
ناموس مصطفیٰؐ کا تقاضا ہے ان دنوں
مہر و وفا کے نام پہ گردن کٹائے جا
مت ڈر کسی مسیلمہ کذاب سے کبھی
ہر ایک دوں نہاد کو راہ سے ہٹائے جا
حکام کج نہاد کا اب خوف ہیچ ہے
خوف خدائے پاک دلوں پر بٹھائے جا
مرزائیوں سے قطع تعلق ہے ناگزیر
ان کے ہر ایک راز کا پردہ اٹھائے جا
شورش قلم کی خارہ شگافی کے زور پر
نسل نوی کو خواب گراں سے جگائے جا

(شورش کاشمیریؒ)

مرزا ناصر احمد...... کنکوے باز

اپنے دادا کی نبوت کو تماشا کر دیا
ناصر احمد نے مرے صوبہ کو رسوا کر دیا

قادیانی کیا ہیں؟ اسرائیل کے لخت جگر
ان کے بل ہم نے نکالے اور نہتا کر دیا

اس وطن میں دین کے باغی ٹھہر سکتے نہیں
ہم نے اس مقصد کو ہر مقصد پہ اولیٰ کر دیا

اب چٹختی ہیں بہشتی مقبرے کی ہڈیاں
اہل ربوہ کو بہر عنوان ننگا کر دیا

خواجہ کونینؐ کی غیرت کا پرچم گاڑ کر
دیدہ و دل کو نثار راہ بطحا کر دیا

صحبت اقبالؒ کے فیضان نے شورش مجھے
شہر یار یثرب و بطحا کا شیدا کر دیا

(شورش کاشمیریؒ)

عجمی اسرائیل

کرہ ارضی کی ہر عنوان سے تذلیل ہے
قادیان! مابین ہند و پاک اسرائیل ہے

میرا یہ لکھنا کہ ربوہ کی خلافت ہے فراڈ
خواجہ کونینؐ کے ارشاد کی تعمیل ہے

دم بریدہ بشکی، یک چشم گل اس کا مدیر
مصلح موعود کے الہام کی تکمیل ہے

اہلیہ مرزا غلام احمد کی ام المومنین
ہے کہاں قہر خدا؟ قہر خدا میں ڈھیل ہے

کیا تماشا پیمبر بن گیا عرضی نویس
گفتنی اجمال ہے ناگفتنی تفصیل ہے

کاسہ لیسی کا حصارہ، مخبری کا زہرناب
ان سیاسی مغبچوں کے خون میں تحلیل ہے

قادیان والو قیامت ہوں تمھارے واسطے
میرے رشحات قلم میں صور اسرافیل ہے

(شورش کاشمیریؒ)

مرثیہ قادیان

حشر تک ماتم کرے گی سرزمین قادیاں
کیوں لیا تو نے جنم اس پر لعین قادیاں

ہے وہ ننگ آدمیت زانیوں کا سرغنہ
جس کے ہاتھوں لٹ گئی ہر مہ جبین قادیاں

اے رئیس کاذباں ہو تجھ پہ لعنت بے شمار
تو ذلیل دوجہاں ہے اے کمین قادیاں

تو کہ ہے مادر پدر آزاد اے تخم رذیل
تجھ سے ہے شیطان بھی کمتر بدترین قادیاں

اے مسیح و مہدی و پیغمبری کے دعوے دار
شکل دیکھی ہے کبھی اپنی لعین قادیاں

فتنہ دجال جس کی تو نے رکھی تھی بنا
اس کا مدفن بن رہی ہے اب زمین قادیاں

جاگ اٹھے ہیں پاسبان دین ختم المرسلینؐ
اب مٹا کر چھین لیں گے جگ سے "دین" قادیاں

(ازھر درانی مرحوم)

اکمل قادیانی شاعر کو مخاطب کر کے

غلام احمد قادیانی

غلام احمد مسیح قادیانی
ہوا کذاب پیدا قادیاں میں

امین الملک اور جے سنگھ بہادر
رہی انسانیت جس سے زباں میں

غلام احمد تھا بے شک کرم خاکی
نہ آدم زاد تھا وہم و گماں میں

بشر کی جائے نفرت تھا یقیناً
سراپا عار تھا وہ انس و جاں میں

مسیحا ٹانک وائن کا تھا رسیا
جو بکتی تھی پلومر کی دوکاں میں

تھا انگریزی حکومت کا مدح خواں
پچاس الماریاں لکھی تھی شاں میں

کیا اس کو ذلیل و خوار حق نے
کہ گندوں کی نہیں نصرت، جہاں میں

ہوا غرق خجالت اس کا بیڑا
وہی خود کمتریں تھا اس جہاں میں

مسیلمہ پھر ہوا ہے ہم میں پیدا
اور آگے سے ہے بڑھ کر اپنی شاں میں

جو چاہے دیکھنا دجال، اکمل
غلام احمد کو دیکھے قادیاں میں

(مولانا فضل احمد صاحب صدیقی)

ماآخذ

- آئینہ تلبیس ....مولانا ابوالقاسم رفیق دلاوری
- کلمہ فضل رحمانی ....قاضی فضل احمد گورداسپوری
- میں اور قادیان ....سیّد عبدالمجید شاہ امجد بخاری بٹالوی
- مشاہدات قادیان ....مولانا عنایت اللہ چشتی
- قادیانی مذہب کا علمی محاسبہ .... پروفیسر محمد الیاس برنی
- سفر ہند.......... پروفیسر محمد اسلم
- مرزا غلام احمد قادیانی کے کارنامے ....نور محمد قریشی ایڈووکیٹ
- جب پنجاب اسمبلی نے ربوہ کا نام چناب نگر رکھا..........مولانا منظور احمد چنیوٹی
- مرزائیوں کی روحانی شکارگاہ ....عبدالرزاق مہتہ
- قادیانیت سے اسلام تک ....محمد متین خالد
- احمقوں کی جنت ....جی آر اعوان
- قادیانیت ایک دہشت گرد تنظیم ....محمد نوید شاہین ایڈووکیٹ
- شہر سدوم ....شفیق مرزا
- ڈھلتے سائے ....منیر الدین احمد
- تاریخ احمدیت ....دوست محمد شاہد قادیانی
- ماہنامہ لولاک، ملتان
- ماہنامہ نقیب ختم نبوت، ملتان
- ہفت روزہ ختم نبوت، کراچی
- روزنامہ نوائے وقت، لاہور
- انٹرنیٹ پر اینٹی قادیانیت ویب سائٹس www.thelastprophet.org

www.ahmedi.org